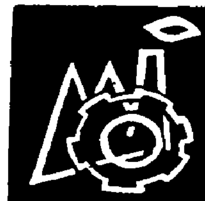
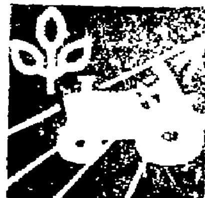
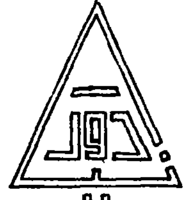






۱۸۸

۵۰
نئے پیسے



جلد ۱۸ | نمبر ۱۲

چیتر ۱۸۸۵
اپریل سنہ ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے
قیمت فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ ہارج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
یو گورنمنٹ پریس عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوانات

اپنی بات

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات سے ہندوستان اپنے ایک عظیم المرتبت فرزند، ایک پُرخلوص محبِ وطن، ایک زبردست سیاستداں، جنگ آزادی کے ایک صفِ اوّل کے رہنما، ایک عظیم انسان اور اپنی جمہوریہ کے پہلے صدر سے محروم ہوگیا۔

ڈاکٹر راجندر پرشاد ایک معزز کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جد اعلیٰ اتر پردیش سے عرصہ ہوا، بہار چلے گئے تھے اور ڈاکٹر راجندر پرشاد وہیں ضلع سارن کے ایک گاؤں میں ۳ دسمبر ۱۸۸۴ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ مزید تعلیم حاصل کرنے اور آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھنے کی غرض سے وہ انگلستان جانے کا ارادہ کر رہے تھے مگر گھر والوں نے اسے پسند نہ کیا اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے انگلستان جانے کا خیال ترک کر دیا۔ جب وہ ۱۳ برس کے تھے تو ان کی شادی ہوگئی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے دل میں طالب علمی ہی کے زمانے سے حب الوطنی کا جذبہ سرایت کر چکا تھا اور وہ اسی دور میں سودیشی اشیا کا استعمال کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے سے وہ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے اور ۱۹۰۶ء میں انھوں نے بہار میں طلبا کی ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اسی سال کلکتے میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اس میں ایک رضاکار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ پانچ برس بعد کلکتے ہی میں کانگریس کا پھر اجلاس ہوا اور اس میں وہ باقاعدہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممبر کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اب وکالت بھی شروع کر دی تھی اور کچھ ہی دنوں بعد وہ لا کالج، کلکتے میں لیکچرار بھی ہوگئے۔ پانچ برس یعنی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک وہ کلکتے میں وکالت کرتے رہے۔ پھر ۱۹۲۰ء تک پٹنے میں وکالت کی۔ وکالت کے پیشے میں وہ بڑے کامیاب ثابت ہوئے مگر اپنی قانونی مصروفیتوں کے باوجود وہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں برابر حصہ لیتے رہے۔ جب ۱۹۱۴ء میں بہار میں زبردست سیلاب آئے تو انھوں نے بہار سیوا سمتی کی تشکیل کی۔ بہار یونیورسٹی بل کی مخالفت میں بھی انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔ جب بہار یونیورسٹی قائم ہوئی تو گورنر نے انھیں یونیورسٹی سینٹ میں نامزد کیا۔ لکھنؤ کانگریس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۶ء میں انھوں نے شرکت کی۔ اس کے بعد جب مہاتما گاندھی نے نیل کے کاشتکاروں کی حالت زار سے براہ راست واقفیت حاصل کرنے کے لئے بہار کا دورہ کیا تو ڈاکٹر راجندر پرشاد ان سے ملے اور جب گاندھی جی نے اسی سلسلے میں چمپارن کا ستیہ گرہ شروع کیا تو ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بھی ان کی قیادت میں ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد ملک کے دوسرے رہنماؤں کی طرح گاندھی جی کے طریق کار اور ان کے اصولوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اسی رنگ میں رنگ گئے اور آخر وقت تک اپنے قول و فعل گفتار و کردار میں ان کے سچے پیرو بنے رہے۔ چمپارن کے بعد ڈاکٹر راجندر پرشاد گاندھی جی کے ساتھ کیرا ضلع گجرات گئے جہاں کے کسان ایجی ٹیشن کر رہے تھے۔ اب ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی زندگی وطن اور قوم کی خدمت کے لئے وقف کر چکے تھے چنانچہ گاندھی جی کی قیادت میں کوئی ایسی تحریک نہ تھی جس میں انھوں نے حصہ نہ لیا ہو۔ اسی سلسلے میں وہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۲ء تک متعدد مرتبہ گرفتار ہو کر سزایاب بھی ہوئے۔ جب بہار میں ۱۹۳۴ء کا زبردست زلزلہ آیا تو وہ جیل میں تھے مگر انھیں رہا کر دیا گیا اور انھوں نے رہائی کے بعد زلزلے کے مصیبت زدوں کے جو خدمات انجام دیے وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ جب آزاد ہندوستان میں دستور ساز اسمبلی بنائی گئی تو ڈاکٹر راجندر پرشاد اس کے صدر منتخب ہوئے اور دستور سازی میں نہایت اہم حصہ لیا۔ آزاد ہندوستان کا جمہوری نظام حکومت منظور ہونے کے بعد وہ جمہوریہ کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور اس عہدۂ جلیلہ پر ۱۲ مئی ۱۹۶۲ء تک فائز رہے۔

آج جبکہ ہندوستان کو چینی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا ہے ڈاکٹر راجندر پرشاد کی زندگی اور وطن عزیز کی خاطر ان کی قربانیاں ہمارے واسطے مشعل راہ کا کام دیں گی۔ ضرور ہے کہ اس وقت لڑائی نہیں ہو رہی ہے مگر چین کا جو رویہ رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس بات کا ہر وقت خطرہ ہے کہ معلوم نہیں وہ کس وقت پھر حملہ کر دے۔ اب تو اس بات کی بھی تصدیق ہو چکی ہے کہ چین نے تبت میں کثیر تعداد میں فوج جمع کر دی ہے اور ہماری سرحدوں پر چینی فوجیں نئی سڑکیں تیار کر رہی ہیں۔ چین کی یہ تیاریاں اس کی نیت کے فتور کو ظاہر کر رہی ہیں۔ تبت میں فوجی اجتماع کے قطع نظر یوں بھی چین کی روش نہ صرف غیر مصالحانہ بلکہ معاندانہ ہے۔ مثلاً ہندوستان تو کولمبو کانفرنس کی تجویزیں کب کی منظور کر چکا ہے لیکن چین ابھی تک انھیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ لطف یہ ہے کہ چین کے فرمانروا اس پر بھی یہ کہتے رہتے ہیں کہ اب تو ہندوستان کو چین سے براہ راست گفت و شنید کرنے میں کوئی امر مانع نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ وزیر اعظم چین نے ۳ مارچ کو اپنے ایک خط میں پنڈت نہرو کو لکھا ہے کہ دونوں ملکوں کے افسروں کے درمیان بات چیت شروع کرنے میں اب دیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے وزیر اعظم نے ۵ مارچ کو اپنے جواب میں یہ صاف صاف لکھ دیا ہے کہ چین اگر پرامن اور باعزت سمجھوتے کا دل سے خواہش مند ہے تو اسے کولمبو کانفرنس کی تجویزوں کو غیر مشروط طور سے پہلے قبول کر لینا چاہیے لیکن چین ان تجویزوں کو ماننے کے لئے اس وقت تک تیار نہیں ہوا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایک طرف وزیر اعظم چین یہ فرماتے ہیں کہ باہمی گفت و شنید شروع ہو جائے اور دوسری طرف چین نے کشمیر کے ایک حصے کے سلسلے میں جو ہندوستان ہی کا علاقہ ہے پاکستان سے سرحدی سمجھوتہ کر لیا ہے۔ یہ خوب ہے کہ چیز ہندوستان کی ہے اور اسے آپس میں بانٹ رہے ہیں دوسرے ملک! اس کے علاوہ چینی حکومت کی طرف سے کبھی کبھی دھمکیاں الگ دی جاتی ہیں۔ مثلاً چین کی وزارت دفاع کی طرف سے پہلی مارچ کے ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ "اگرچہ چین کے سرحدی محافظ، ستمبر ۱۹۵۹ء کے واقعی قبضے کے خط تک چلے گئے ہیں مگر ہم حفاظت خود اختیاری کے حق سے دست بردار نہیں ہوئے ہیں۔" یہ الزام تراشیاں، یہ دھمکیاں، پاکستان سے اس کا سمجھوتہ اور کولمبو کانفرنس کی تجویزوں کا منظور نہ کرنا اس بات کا ثبوت ہیں کہ چین اپنی شرارتوں سے نہ باز آیا ہے اور نہ اس کی امید ہے کہ وہ باز آئے گا۔ ایسے حالات میں ہمیں اپنی تیاریوں سے غفلت نہ برتنا چاہیے۔ خاکِ وطن کی پیاس بجھانے کے لئے شاعر نے اپنی جان پیش کر دی تھی۔ آج ہمیں بھی شاعر کی تقلید کرنا اور اس کے الفاظ میں یہ اعلان کرنا ہے کہ ؎

یہ سنتا ہوں کہ پیاسی ہے بہت خاکِ وطن ساقی   خدا حافظ چلا میں باندھ کر سر سے کفن ساقی

——— ایڈیٹر

آج لَو رہے اونچی بزم کے چراغوں کی

(جشنِ جمہوریت (۱۹۶۳) پر کچھ خیالات)

آل احمد سرور

وقت کے سمندر میں ایک اور موج اُٹھی
آج پھر تصور میں کتنے خواب اُبھرتے ہیں

موج جس میں شورش ہے، آرزو ہے، طوفاں ہے
جن کے بل پہ جھیلے ہیں سرد و گرم عالم کے

کل یہ مُنھ چھپا لے گی ایک سرد سینے میں
خواب جن میں جادو تھا، خواب جن میں مستی تھی

آج اس کے بربط پر وقت خود غزل خواں ہے
خواب ماہ و انجم کے، خواب اوجِ آدم کے

عمر کے سمندر میں عزمِ زندہ کی موجیں
آج کے جنوں کے خواب، کل کی حکمتِ روشن

یونہیں سعیِ پیہم کی داستاں سناتی ہیں
خواب میں حقیقت کو آب و رنگ دیتے ہیں

اک کرن کو دیتی ہیں آب و تاب سورج کی
صلح سے جو حرف آئے آبروئے زنداں پر

لمحۂ گریزاں کو جاوداں بناتی ہیں
کارزارِ ہستی میں اذنِ جنگ دیتے ہیں

آج اُن شہیدوں کی یاد آ ہی جاتی ہے
وقت کے دھندلکے سے آج کے اُجالے تک

خوں چکاں کفن جن کا جیسے حور کا دامن
سلسلہ سوالوں کا، رَت جگا خیالوں کا

جن کی جاں فشانی سے سربلند و سرفراز
زیست کے اندھیرے میں خواب جگمگاتے ہیں

باغبانیِ صحرا، لالہ کاریِ گلشن
داغ جانے والوں کے، نقش آنے والوں کا

آج اُس مغنّی کی لَے سُنائی دیتی ہے
آج لَو رہے اونچی بزم کے چراغوں کی

خار و خس کو شعلوں کا ہم نفس کیا جس نے
آج اگلی راتوں سے کچھ سوا اندھیرا ہے

ذہن کی ہر اک زنجیر جس نے توڑ کر رکھ دی
خار و خس بھی شعلوں کا امتحان لیتے ہیں

اِک شکستِ زنداں پر ہی نہ بس کیا جس نے
آج اپنے خوابوں کو ظلمتوں نے گھیرا ہے

(یہ نظم ۲۶ جنوری کے موقع پر لکھ رہا تھا مگر مکمل نہ ہو سکی۔ مکمل ہوئی تو نیا دور کے لیے پیش ہے —— سرور)

زخمِ جبیں

علی جواد زیدی

موسمِ گل میں یہ کیا خوابِ زبوں دیکھا ہے
غیر کی آنکھ میں اندازِ جنوں دیکھا ہے
ماں کے ماتھے سے ٹپکتا ہوا خوں دیکھا ہے

میری ماں، اے مری ماں! تیری محبت کی قسم
وقت کی پلکوں پہ تارا کوئی تھرّاتا ہے
تیرے ماتھے کا ہرا زخم فقط زخم نہیں
اس میں تاریخ کا ہر موڑ نظر آتا ہے

لکشمی بائی و ٹیپو و سراج و احمد[1]
تلک و گاندھی و اشفاق[2] و بھگت سنگھ و سبھاش

جیسے یہ زخم ہر اک ماتھے پہ ہے آج عیاں
جیسے ہر دل میں چبھن، جیسے ہر اک دل میں خراش

اے مری ارضِ وطن! اے مری ماں، اے مری ماں!

جیسے اس قلعے[3] کی دیوار پہ ہر چار طرف
آلِ تیمور کے ماتھے سے لہو ٹپکا ہے
کارخانوں کی مشینوں کا بھی ہے یہ عالم
جیسے مزدور کے ماتھے سے لہو ٹپکا ہے

یہ لہو ہے کہ یہ کہتا ہے کہ "اے دیدہ ورو!
"ہاں، لہو اور لہو اور لہو ہے درکار
"عارضی دورِ خزاں ختم ہو وہ کام کرو
"لہلہا اُٹھّے چمن، رقص کرے موجِ بہار"

میری ماں نے مجھے فرمان دیا "اے مرے لال!
"یہ مرا زخمِ جبیں، تیری عقیدت کا جمال
"یہ فقط زخم نہیں، یہ ہے دلوں کی جھنکار
"بھیم کا نعرۂ نو، رُوحِ ظفر کے اسرار"

ماں کی ممتا نے کہا "اے مرے فرزندِ عزیز!
"جب ہمالہ کو لگے آگ تو جاں ہے کیا چیز؟
"لے ترے ہاتھ میں دیتی ہوں عزائم کی سپر
"لے ترے ہاتھ میں دیتی ہوں وفا کی تلوار!

"آج اُس بزم میں جو امن کا گہوارا ہے
"میرے اس زخم نے انسان کو للکارا ہے

"امنِ عالم کی بھری بزم میں برپا ہے فساد
"چند خوں خوار درندے ہی تو ہیں وجہِ عناد
"ایسے خوں خوار درندوں کا فقط ایک علاج!
"لے ترے ہاتھ میں دیتی ہوں عزائم کی سپر
"لے ترے ہاتھ میں دیتی ہوں وفا کی تلوار"

---

[1] جنگِ آزادی کے مجاہد مولوی احمد اللہ
[2] اشفاق اللہ خاں
[3] دلّی کا لال قلعہ

ہمیں سے ہے

کمال احمد صدیقی

کل تھی جو بانجھ، آج وہ دھرتی ہے کشت زار
ہم نے ہر اک فضا کو بنایا ہے خوش گوار
بکھرے پڑے ہیں چاروں طرف جتنے شاہکار
یہ ہیں ہماری محنت و قوت کے راز دار
ہونٹوں پہ زندگی کے تبسم ہمیں سے ہے

برگ و گل و ثمر کا ہر اک سمت زور ہے
قوس قزح کے رنگوں کا طوفاں ہی اور ہے
ہر اک نگاہ آج نظاروں کی چور ہے
ہر ایک ریگ زار میں نہروں کا شور ہے
یہ جل ترنگ اور ترنم ہمیں سے ہے

ہر رات کو بنایا ہے غیرت دہِ سحر
کاٹی ہیں نہریں اور بنائے ہیں بجلی گھر
تب جا کے جگمگائے ہیں بازار و بام و در
بکھری ہوئی یہ نور میں ہر ایک رہ گزر
آئینہ خانۂ مہ و انجم ہمیں سے ہے

یہ کالی داس اور یہ تلسی ہیں، یہ کبیر
یہ سور داس اور یہ وارث ہیں اور یہ میر
یہ ہیں امیر خسرو و غالب، یہ ہیں نظیر
ان کے کلام ہی سے ہمارا بنا خمیر!
حسنِ خیال و فکر و تکلم ہمیں سے ہے

اپریل ۱۹۶۳ء

ہماری آبرو

سعادت نظیر

یہ سرزمیں، ہمالہ ہے پاسباں جس کا — یہ سرزمیں، قدم چومے آسماں جس کا
یہ سرزمیں، جو گنگ و جمن سے ہے شاداب — سدا بہار ہی جس سرزمیں کا عہد شباب
یہ سرزمیں، جو شہ کارِ دستِ قدرت ہے — زمانہ جس کا ہی قائل، وہ اس میں ندرت ہے
یہ سرزمیں، جو باغ و بہارِ فطرت ہے — یہ جس کے ذروں پہ بھی مہر و مہ کو حیرت ہے
یہی وہ ہے کہ جسے "ہندستان" کہتے ہیں — یہیں تو امن کے ہم پاسبان رہتے ہیں
اس ارضِ پاک پہ ہیں کیسے کیسے نقش و نگار — بقا نصیب کہیں ہے "قطب" کا "چار منار"
ہے "ناگ ارجنا ساگر" کہیں خوشی کا پیام — بنا رہے گا جو سرچشمۂ نشاطِ دوام
کہیں "الورہ" "اجنتا" کے معبدِ رنگیں — عقیدتوں کی ہیں تخلیق! اور کتنی حسیں!
کہیں ہے حسن و محبت کا نقش "تاج محل" — نظر نواز ہے ساگر میں اک سفید کنول
شگفتِ گل ہے چمن کی شگفتگی کے لیے — چراغ جلتے ہیں محفل کی روشنی کے لیے
یہ دھوپ چھاؤں دھنک اور چاندنی کا سماں — جگہ جگہ ہے مگر اس قدر نکھار کہاں
دیا ہے ہم کو اسی خاکِ دل نشیں نے جنم — اسی کی آب و ہوا میں جواں ہوئے ہیں ہم
یہی چمن تو ہے دنیا سے رنگ و بو اپنی — نہیں ہے ارضِ وطن، ہے یہ آبرو اپنی
خدا گواہ کہ ہم کو کسی سے بیر نہیں — مگر جو حد سے گزر جائے، اس کی خیر نہیں
ہم اپنی جاں پہ بہر حال کھیل جائیں گے — اور اپنی آبرو ہر طرح سے بچائیں گے
سلام تجھ پہ ہمارا ہو، اے عزیز وطن! — بہار آفریں ہو جائے اور تیری پھبن

ہم اپنا خوں بھی بہا دیں تری خوشی کے لیے
ہماری زندگی ہے تیری روشنی کے لیے

چیتر ۱۸۸۵

وقت کی آواز

شباب للت

ضرورت ہے وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی

بھری عزم و عمل کی بجلیاں ہوں جن کی رگ رگ میں
شرارِ حریت کی گرمیاں ہوں جن کی رگ رگ میں

حفاظت کر سکیں جو دیس کی کوہِ گراں بن کر
گرائیں کاشانۂ اغیار پر برقِ تپاں بن کر

بہادر نوجواں جو زیرِ خنجر مسکراتے ہوں
جو ہیبت ناک طوفانوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوں

انھیں جس وقت وہ دستِ مشیت ان کے ساتھ اٹھے
جھٹک کر توڑ دیں بھارت پہ جو کوئی بھی ہاتھ اٹھے

وہ جن سے خرمنِ اغیار نذرِ برق ہو جائے
جو غرّائیں تو دشمن کا سفینہ غرق ہو جائے

گرج اٹھیں تو پربت کی صلابت پانی پانی ہو
جو للکاریں تو جباروں کی سطوت پانی پانی ہو

جو کم زوروں کی ابلاؤں کی رکشا سے نہ منہ موڑیں
جو منہ زوروں سے ٹکرائیں تم رانوں کے سر توڑیں

وہ جن پر قوتِ بازو کی دیوی ناز کرتی ہو
شجاعت جن پہ شیدا ہو دلیری ناز کرتی ہو

جو پروانوں کی صورت شمعِ آزادی پہ جلتے ہوں
وطن کے درد جن کے سینۂ مضطر میں پلتے ہوں

وطن کی راہ میں ہر گام پر صدمے اٹھاتے ہوں
وطن کی چاہ میں جو زندگی پر کھیل جاتے ہوں

جو غداروں سے لے سکتے ہوں بڑھ کر انتقام اپنا
جو سولی تک پہنچ کر بھی کیے جاتے ہوں کام اپنا

جو تعمیرِ وطن کا حوصلہ سینے میں رکھتے ہوں
جو تزئینِ چمن کا ولولہ سینے میں رکھتے ہوں

نہ ہو جینا گوارا جن کو غیروں کے سہارے پر
لٹا دیں زندگی اپنی وطن کے اک اشارے پر

کسی کو آسرا دے دیں، کسی کا درد اپنا لیں
ہزاروں آفتیں سہہ کر نہ جو ابرو پہ بل لائیں

وطن کا پیار ٹھاٹھیں مارتا ہو جن کے سینے میں
نظر آتی ہو عظمت جن کے مرنے اور جینے میں

جو عزم و حوصلے میں شاہ ٹیپو ہوں، سکندر ہوں
کرن، بھیشم، درونا چاریہ سے مرد دلاور ہوں

جو رستم، ہرکولیس، حیدر علی، ارجن کے ثانی ہوں
ونگٹن کے، سمندر گپت کے، نلسن کے ثانی ہوں

وہ جن کے کارنامے سن کے یاد چھتر سال آ جائے
شِوا، گوبند، پورس کی شجاعت کا خیال آ جائے

وہ کامل نوجواں جن کو شعورِ حکم رانی ہو
مذاقِ سلطنت کے ساتھ خدمت کی لگن بھی ہو

عزیزانِ وطن جو حق پرستی کے پیمبر ہوں
سراسر عجز کے، ایثار کے، الفت کے پیکر ہوں

جو غیروں کی طرف امداد کی خاطر نہ تکتے ہوں
حق اپنا غاصبوں سے خود ہی بڑھ کر چھین سکتے ہوں

وہ جن کے نام پر ایوانِ باطل تھرتھراتا ہو
تصور ہی سے دشمن کا کلیجا منہ کو آتا ہو

جو ہر طاقت سے ٹکر لے سکیں انصاف کی خاطر
جو اپنی جان تک بھی دے سکیں انصاف کی خاطر

ضرورت ہے وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی

ضرورت مادرِ بھارت کو ایسی بیٹیوں کی ہے

جو خود اپنی حفاظت کر سکیں شمشیر بن بن کر
قدم ظلم و ستم کے روک دیں زنجیر بن بن کر

سراپا جاں نثاری ہوں سراپا سرفروشی ہوں
جو درگاوتی، رانی جھانسی، پدمنی ہوں، چاند بی بی ہوں

جو خود اپنا تحفظ کر سکیں دشمن کے ہاتھوں سے
گنہگاروں، سیہ کاروں کی ناہنجار گھاتوں سے

جواں ہوں ولولے جن کے، عزائم جن کے فولادی
نہ گل ہونے دیں جو ہندوستاں کی شمعِ آزادی

ضرورت آج بھارت ماں کو ایسی بیٹیوں کی ہے

اے چینی شرمو

ذوقی رامپوری

ٹ نے اکثر سچائی سے ٹکرانے کی کوشش کی ہے
ندھیروں نے دنیا پر چھا جانے کی کوشش کی ہے
کی طاقت نے حق کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے

موسیٰ سے فرعون لڑا ہے، رام سے راون بھی اُلجھا ہے
لیکن دُنیا دیکھ چکی ہے اُن کا جو کچھ حشر ہوا ہے

ت پر اترانے والو! جیت اُصولوں کی ہوتی ہے
کتنے ہی سرکش ہوں چاہت پھولوں کی ہوتی ہے
ُردمیں کب گنجائش "نامعقولوں" کی ہوتی ہے

جب بھی حق والوں کی ٹولی اپنی بات پہ اڑ جاتی ہے
باطل کے چہرے کی رنگت اک دم پھیکی پڑ جاتی ہے

لی عظمت خطرے میں ہے بھارت کے رکھوالو اُٹھو!
ہ سر پر آ پہنچا ہے، اے خود دار جوانو، اُٹھو!
د تم کے چیلو اُٹھو، اے ارجن کے بیٹو، اُٹھو!

ظالم سے گھبرانا کیسا، ظلم کی دھوپ تو ڈھل جاتی ہے
راون خاک میں مل جاتا ہے، ساری لنکا جل جاتی ہے

ت کوئی آ جائے تو ہم اپنی بانہیں پھیلاتے ہیں
ں دشمن ٹکرائے تو ہم میدان میں ڈٹ جاتے ہیں
ر، اے چینی بے شرمو! ہم سب آج قسم کھاتے ہیں

دیش کی عظمت کے دامن کو ہرگز چاک نہ ہونے دیں گے
گاندھی، گوتم کی دھرتی کو ہم ناپاک نہ ہونے دیں گے

ں اب وہ دن آئے گا، ظالم دل میں پچھتائیں گے
کا انجام بُرا ہے خود مُنہ کی کھا کر جائیں گے
ں حملہ پسپا کر کے، ویر سپاہی گھر آئیں گے

دشمن کے قدموں سے اپنی دھرتی جس دن خالی ہوگی
ہر سو ایک چراغاں ہوگا، گھر گھر ایک دیوالی ہوگی

دُعا

خاور مانکوٹی

رقص کرتی ہوئی بامِ کیلاش سے صبح کی شوخ پریاں نکلتی رہیں
ارضِ گنگ و جمن کی حسیں کھیتیاں سبز و شاداب فصلیں اُگلتی رہیں
______ زندگی کی بہاریں مچلتی رہیں

مسجدوں کی اذانوں کی آواز سے، رات کے قافلے نور پاتے رہیں
مندروں کے گجر، محفلِ خواب میں، سازِ بیداریوں کا بجاتے رہیں
______ رام و رحمٰن جلوے دکھاتے رہیں

پنگھٹوں پر یہ سکھیاں، ہمیشہ اسی ناز و انداز سے کھلکھلاتی رہیں
نوجوانوں کے تاریک ماحول میں آرزوؤں کی شمعیں جلاتی رہیں
______ پیار کی منزلیں مسکراتی رہیں

ہر نئے عہد میں سازِ بنگال پر نغمۂ ہند ٹیگور گاتے رہیں
ہر زمانے میں پیغمبری کے لیے غالب و میر و چکبست آتے رہیں
______ فکر و فن کے محل جگمگاتے رہیں

لال قلعے کی گلنار دیوار سے وقت کے دل کی دھڑکن غزل خواں رہے
عالمی امن و انصاف کی چھاؤں میں پنا سہ رنگ پرچم درخشاں رہے
______ حشر تک ارض گوتم گُل افشاں رہے

شامِ وطن

ریاض اختر ادیبی گنڈوی

اے مری شامِ وطن ! شامِ وطن ! شامِ وطن !
آ ترے گیسوئے مشکیں کی بلائیں لے لوں

کتنا سندر ہے تری شام جٹاؤں کا دھواں
جیسے ساون کی جنوں خیز گھٹاؤں کا سماں
رقص فرما ہے تری مست خرامی پہ جہاں
تیری راہوں میں ستاروں کے کنول ہیں روشن
اے مری شامِ وطن ! شامِ وطن ! شامِ وطن !

ذرّے ذرّے پہ ہوئی بارشِ عرفانِ حیات
وجد میں آنے لگی روحِ غزل خوانِ حیات
جاگ اٹھا شاعرِ رنگیں شبستانِ حیات
وا کیا تو نے درِ مے کدۂ شعر و سخن
اے مری شامِ وطن ! شامِ وطن ! شامِ وطن !

بانسری جاگ اٹھی جاگ اٹھے چنگ و رباب
بزمِ مے گرم ہوئی جاگ اٹھے شعر و شباب
تیری آنکھوں سے برسنے لگی غم سوز شراب
تو نے بدلا مرے مے خانۂ ہستی کا چلن
اے مری شامِ وطن ! شامِ وطن ! شامِ وطن !

روحِ حافظ کی قسم رقص میں پیمانے ہیں
دستِ زاہد میں بھی تسبیح کے دردانے ہیں
لبِ فطرت پہ ترے حسن کے افسانے ہیں
تیرے قدموں پہ لٹاتا ہے گہر نیل گگن
اے مری شامِ وطن ! شامِ وطن ! شامِ وطن !

ہند کی غیرت

ہزار لکھنوی

خوابِ غفلت کے جو آنکھوں پہ پڑے تھے پردے
نظمِ قدرت کا یہ احساں ہے وہ سب چاک ہوئے
یہ حقیقت ہے کہ ہم خوابِ گراں سے چونکے
شکریہ ! تم نے جگایا ہے ہمیں سوتے سے
کون بدنام کرے شکوے کو شکوا کر کے
ہم پہ احسان کیا چین نے حملا کر کے

جب تک اب اُتری سیما نہیں ہوتی ہے بحال
ذہن میں آنے نہیں دیں گے مروت کا خیال
ہم دکھائیں گے تمھیں ہند کی غیرت کا جلال
تم ہمالہ کی طرف آئے، تمھاری یہ مجال !
اپنی گستاخ جسارت کی سزا پاؤ
اپنا سر چین کی دیوار سے ٹکراؤ

حال جب تم پہ کھلا جنگ کی تیاری کا
جب ہوا علم تمھیں ملک کی بیداری کا
حوصلہ پست بالآخر ہوا غداری کا
خاک میں مل گیا ہر عزم جہاں داری کا
اپنے کردار کا انجام نظر آنے
ہر قدم موت کا پیغام نظر آ ـ

میرے ہندوستان

نسیم فاروقی

یہ تری شام یہ جھٹپٹے کا سماں   یہ دھوئیں میں گھری گاؤں کی بستیاں
پنگھٹوں پہ یہ رکھی ہوئی گاگریاں   سیڑھیوں سے اُترتی ہوئی گوریاں
جن پہ پریوں کا ہوتا ہے اکثر گماں

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

گود میں تیری ندیاں پھیلتی ہوئی   ہاتھ میں جیسے ریکھائیں تقدیر کی
جس طرف دیکھیے روشنی، دل کشی   تا حدِ نظر زندگی زندگی
شانِ جمہوریت جنت کہکشاں

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

ارضِ کشمیر کی یہ مدھر وادیاں   ڈل کے سینے پہ بہتی ہوئی کشتیاں
یہ عمارات اور یہ حسیں برجیاں   یہ کلس، یہ منارے، یہ گل کاریاں
اے مرے مرمریں تاج کے پاسباں!

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

یہ حسیں لہلہاتی ہوئی کھیتیاں   منہ اندھیرے سے جاتے ہوئے یہ کساں
شاہراہوں پہ مزدوروں کی ٹولیاں   یہ ملوں کے دہانوں سے اٹھتا دھواں
آسمانوں پہ چھائی ہوئی بدلیاں

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

ڈیم اور کارخانوں کی یہ صنعتیں   ہر طرف برق سازی کی کیفیتیں
ہیں جواں عزم اور ہیں جواں ہمتیں   لاکھ اغیار کی تجھ پہ نظریں اٹھیں
تیری دھرتی کا ذرہ ہے کوہِ گراں

میرے پیارے وطن، میرے ہندوستاں

اپریل ۱۹۶۳ء

کارواں ہمارا

نظر برنی

گوتم نے اِس زمیں پر عظمت کے گیت گائے
علم و ادب کے نغمے ٹیگور نے سنائے
ہم بھی لبوں پہ اپنے پیغام امن لائے
بد باطنوں نے لیکن یہ مکر و فن دکھائے

بیدار ہو گیا ہے عزم جواں ہمارا
اب ایک ہو گیا ہے ہندوستاں ہمارا

لعل و گہر سے اپنی ماتا کی گود بھر دو!
تم اپنا مال و دولت سب کچھ نثار کر دو!
کیا دیکھتے ہو بڑھ کر طوفاں میں اپنا سر دو!
ایمان کو حرارت، توفیق کو اثر دو!

یہ درس دے رہا ہے قومی نشاں ہمارا
اب ایک ہو گیا ہے ہندوستاں ہمارا

حملے نے اُن کے، ہم کو تیار کر دیا ہے
غفلت سے آج ہم کو بیدار کر دیا ہے
ہم "ڈھال" تھے ابھی تک "تلوار" کر دیا ہے
مکار چینیوں نے ہشیار کر دیا ہے

چٹان بن گیا ہے عزم جواں ہمارا
اب ایک ہو گیا ہے ہندوستاں ہمارا

طوفان میں پلے ہیں، طوفاں سے کیا ڈریں گے
ظلم و ستم کا بے شک ہم سامنا کریں گے
نہرو کا ہے یہ کہنا "دشمن سے ہم لڑیں گے"
نہرو کا حکم پا کر آگے کو ہم بڑھیں گے

روکے سے کیا رُکے گا سیلِ رواں ہمارا
اب ایک ہو گیا ہے ہندوستاں ہمارا

چیتر ۱۸۸۵

علمِ معانی کے تین مقامات

اِسنادِ خبری، مُسند اور مُسند الیہ

اختر علی تلہری

اب سے پہلے "علمِ معانی" شعر و ادب کی عالمانہ واقفیت کے لیے بہت ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ وہ شاعر و ادیب کبھی مستند نہیں سمجھا جاتا تھا جس کا ذوق اس کے سایے میں پروان نہ چڑھا ہو لیکن موجودہ عصر اس ضروری فن سے بے اعتنائی کا دور ہے۔ اسی بے التفاتی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آج کل کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ادب و شعر میں بے راہ روی کے آثار نظر آتے ہیں اور ان کے افکار کل ہی بے معیاریت کی سند حاصل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم معانی سے بہرہ وری ادبیت بعینہٖ اسی طرح ضروری ہے جس طرح شعر کی وزنی ناپ تول اور اسے موزونیت کی سرحدوں میں رکھ سکنے کے لیے "عروض" ضروری شے ہے یا جیسے فکر و نظر کی لغزشوں سے ذہن کو محفوظ رکھنے کے لیے منطق لازمی چیز ہے۔ یوں تو جوں توں ان کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے اور مخصوص لوگ فاعلاتن، فاعلات کی مشق نہ کرنے کے باوجود "قند و نبات" سے بھی زیادہ شیریں شعر کہہ لیتے ہیں اور "فکری مساحت" کے قوانین نہ جانتے ہوئے "مجہول" سے "معلوم" تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن عروض و منطق میں حاصل کر لینے کے بعد متعلقہ منزلیں دوگنی دلجمعی کے ساتھ طے ہوتی ہیں اور یہ اوسط انسان (اوسط درجے کے فہم و دانش کے مالک افراد) کے لیے بہت بڑی چیز ہے۔ اس سے راستے کی دشواریوں اور ٹھوکروں سے نجات مل جاتی ہے اور مسافر کے قدم اِدھر اُدھر بہکتے نہیں۔

شعر و ادب کے نقاد کے لیے تو "فنِ معانی" کے رموز و نکات سے آگاہی "تنقید" کی رو سے واجب کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالباً اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ تنقید جو فنِ معانی کے اصول و ضوابط سے بے نیازانہ گزر جانا اپنی "جدیدیت" کا نشان سمجھتی ہے ہوا میں معلق ہے اور زمین کے کسی ٹھوس حصے پر اس کے قدم قائم نہیں ہیں۔ ادب و شعر کا مزاجی اعتدال جانچنے اور پرکھنے کے لیے وہی تنقیدی نظریے موزوں ہو سکتے ہیں جن کے خمیر میں اس فن کے رموز و نکات بھی شامل ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس امر کی شناخت کہ آیا مدعا اور مقصود صحیح و مناسب الفاظ میں ادا ہو سکے ہیں یا نہیں، علم معانی پر موقوف ہے اور ظاہر ہے کہ جو تنقید اس کی نشاندہی نہ کر سکے کہ معنی و مقصود صحیح طور سے ادا ہو سکے یا نہیں وہ حقیقت تنقید نہیں ہے۔

آخر علم معانی کی تعریف یہی تو کی جاتی ہے کہ وہ ایک ایسا ملکہ (وہ قوت جس کی جڑیں نفسِ انسانی میں مستحکم طور سے قائم ہو چکی ہوں) ہے جس کے ذریعے سے ہمیں اس پر قدرت ہو جاتی ہے کہ ہم ان جزئی ادراکات کی معرفت حاصل کر لیں جو "لفظ" کے ان مخصوص حالات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بدولت "لفظ" مقتضائے حال[1] کے مطابق بنتا ہے۔ یوں تو "لفظ" کے بہت سے دوسرے حالات بھی ہوتے ہیں مثلاً صرفی تصرفات، تعلیل وغیرہ کی قسم کے لیکن یہ حالات ایسے نہیں ہیں کہ ان سے "لفظ" مقتضائے حال کے مطابق بن سکے۔

---

[1] "مقتضائے حال" علمائے فن کی اصطلاح میں ایسے امر کو کہتے ہیں جو اسے ضروری بنا دے کہ اس کلام میں جس سے اصل مراد و مقصود کے اظہار کا کام لیا جا رہا ہے کن "خصوصیات" کا لحاظ رکھا جائے۔ اسی خصوصیت کو مقتضائے حال کہا جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ آپ کا مخاطب اس "حکم" کا منکر ہے جسے مخصوص طور سے آپ اس تک پہنچانا چاہتے ہیں تو پھر آپ کا فرض ہوگا کہ آپ اس مخصوص حکم (ایقاع یا عدمِ ایقاع) کو تاکیدی شکل میں پیش کریں۔ مخاطب کا منکر ہونا "حال" ہے اور کلام کا تاکیدی شکل میں پیش کرنا مقتضائے حال۔ منہ

علم معانی کے اس افادی پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے ذیل میں اس کے بعض مقامات و بعض ابواب کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

جن حالات کے تحت "لفظ" مقتضائے حال کے مطابق بنتا ہے ان پر نظر کرتے ہوئے "علم معانی" آٹھ ابواب میں منحصر ہو جاتا ہے۔

(۱) اسنادِ خبری کے احوال و کیفیات۔ (۲) مسند الیہ کے حالات و کیفیات۔ (۳) مسند کے احوال و کیفیات۔ (۴) متعلقاتِ فعل کے احوال۔ (۵) قصر۔ (۶) انشا۔ (۷) فصل و وصل۔ (۸) ایجاز و اطناب و مساوات

ذیل میں ان ابواب میں سے پہلے تین کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔ مختصر طور سے بھی لکھا جائے تو ایک مضمون میں سارے ابواب پر بحث کی گنجائش نکل سکے گی۔

اسنادِ خبری

اسنادِ خبری کی توضیح علمائے فن نے یوں کی ہے کہ ایک کلمے کا یا اس کا جو ایک کلمے کے حکم میں مان لیا گیا ہے کسی دوسرے کلمے سے اس طرح ملا دینا کہ سننے والا اسے سن کر یہ سمجھ لے کہ ان دونوں کلموں میں سے ایک کا مفہوم دوسرے کے لیے ثابت کیا گیا ہے یا ایک کلمے کے مفہوم کی دوسرے کلمے سے نفی کی گئی ہے۔ اس صورت حال کی دو غایتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس اسناد سے خبر دینے والے کا یہ مدعا ہوگا کہ وہ مخاطب کو اس "حکم" کا (یعنی وقوعِ نسبت یا عدمِ وقوعِ نسبت کا) فائدہ پہنچائے جو اس جملے کی ترکیب (اسناد) میں مضمر ہے یا پھر مخاطب کو وہ یہ بتائے کہ میں اس حکم سے یعنی اس اسناد کے مفاد سے آگاہ ہوں۔

پہلی صورت کو علمائے معانی کی اصطلاح میں "فائدہ خبر" کہا جاتا ہے اور دوسری صورت کو "لازم فائدہ خبر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

فائدہ خبر کی ایک مثال حسب ذیل ہے:

عرب کچھ نہ تھا اک جزیرہ نما تھا — کہ پیوند ملکوں سے جس کا جدا تھا
نہ وہ غیر قوموں پہ چڑھ کر گیا تھا — نہ اس پر کوئی غیر فرماں روا تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا واں تک قدم تھا نہ آیا

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا بند میں جس "حکم" یا جن "احکام" کی خبر دی گئی ہے ان سے سامعین کی بڑی تعداد جاہل ہے۔ یا اگر دو چار ان سے واقف بھی ہوں تو فائدہ خبر میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ غالب تعداد پر ان کا قیاس کر لیا جا سکتا ہے اور پھر ان "اخبار" کی اخبار ہونے کی حیثیت سے شان بھی یہی ہے کہ ان سے ہر شخص ابتدائی حال میں ناواقف فرض کیا جا سکتا ہے۔

لازم فائدۂ خبر کی مثال کسی ایسے شخص سے جو قرآن مجید یا کسی دوسری کتاب کا حافظ ہے یہ کہنا ہے کہ "آپ قرآن کریم یا فلاں دوسری کتاب کے حافظ ہیں"۔ ظاہر ہے کہ مخاطب تو اس سے واقف ہی ہے کہ وہ اس کتاب کا حافظ ہے لہٰذا اس سے فائدۂ خبر تو ہوگا نہیں۔ اس سے مطلب صرف یہی تو ہوگا کہ آپ بھی اس کے حافظ ہونے کے واقعے پر اطلاع رکھتے ہیں۔ یہ صرف اس جملے کے "خبر" ہونے کی صورت میں۔ لیکن اگر اسی کو بصورت سوال وارد کیا جائے تو اس کی نوعیت بدل جائے گی اور وہ "انشا" کے تحت آ جائے گا۔

شوق لکھنوی مصنف مثنوی زہرِ عشق کے اشعار ذیل بھی "لازم فائدہ خبر" کی مثال میں پیش کیے جا سکتے ہیں:

اونچے اونچے مکان تھے جن کے — آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے
کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے — آج دیکھا تو خار بالکل تھے
جس جگہ کل تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم

مندرجہ بالا اشعار میں بیان کیے گئے حقائق سے کوئی شخص بھی ناواقف فرض نہیں کیا جا سکتا۔ شاعر ان سے صرف اپنی واقفیت ظاہر کر رہا ہے اور وہ اس لیے کہ عبرت کے منظر کی تخلیق کر سکے۔

کبھی کبھی ایک ایسا شخص جو "فائدہ خبر" اور "لازم فائدہ خبر" سے واقف ہوتا ہے، ان دونوں سے ناواقف قرار دے لیا جاتا ہے۔ اس بنیاد پر کہ علم و واقفیت کی جو غایت ہونا چاہیے وہ اس پر عامل نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے علم کے مقتضا کے مطابق عمل نہ کرے وہ اور جاہل "تیمیہ" دونوں برابر ہیں۔ مثلاً ایک شخص ہے جو علمِ اخلاق (Ethics) سے واقف ہے لیکن بلا تکلف جھوٹ بولتا ہے۔ اس سے کوئی کہنے والا یہ کہے کہ "جھوٹ بری چیز ہے" تو گو کہ مخاطب کو جھوٹ کے برا ہونے کا علم ہے لیکن اس علم کے مقتضا پر عامل نہ ہونے کی وجہ سے متکلم نے اسے علمِ اخلاق کی اس حقیقت سے بمنزلہ جاہل قرار دے لیا اور یہ کہا کہ جھوٹ بری چیز ہے۔ اس کی دوسری مثال مثنوی میر حسن کا وہ مقام ہے جہاں شاعر نے نجم النساء کی زبان سے بدر منیر کو سمجھاتے ہوئے یہ شعر کہا ہے:

رکے جو کوئی اس سے رک جائیے — جھکے جو کوئی اس سے جھک جائیے

واضح رہے کہ یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ بدر منیر اس قانون سے واقف نہ تھی مگر

چوں کہ بے نظیر کے معاملے میں وہ بظاہر اُس پر عمل پیرا نظر نہیں آتی تھی اس لیے نجم النسا نے اُسے اُس قانون سے انجان قرار دے لیا اور یہ کہہ دیا کہ

رُکے جو کوئی اُس سے رُک جائیے   جُھکے جو کوئی اُس سے جُھک جائیے

اِسی نوعیت کا مندرجہ ذیل بند بھی ہے جس میں حضرت علی اکبر نے فوجِ یزید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے :

میں اس کا پسر ہوں جو خدا کا ہے شناسا   فرزند ہوں اُس کا جو نبی کا ہے نواسا
جان اُس کی ہوں پانی نہ ملا جس کو ذرا سا   میں وہ ہوں پدر جس کا ہے دو روز سے پیاسا
دلدار ہوں خاتونِ قیامت کے پسر کا
ٹکڑا ہوں محمد کے کلیجے کے جگر کا   (مرزا دبیر مرحوم)

ظاہر ہے کہ حضرت علی اکبر جن اشخاص کو خطاب کر رہے ہیں وہ "فائدہ خبر" اور "لازم فائدۂ خبر" دونوں سے باخبر ہیں لیکن چوں کہ اس علم کے مقتضا پر عامل نہیں اس لیے اُنھیں بہ منزلۂ بے خبر قرار دیا گیا اور اُس کی رعایت سے خطاب کیا گیا۔

اس ضمنی نکتے کے ذیل میں یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ جب مخاطب "حکم" کے متعلق بالکل ہی خالی الذہن ہو تو اسناد میں مؤکدات (تاکید پیدا کرنے والے الفاظ) بالکل ہی نہ ہونا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں فائدۂ خبر و لازم فائدۂ خبر کا ابلاغ تاکیدی الفاظ سے قطعاً خالی ہونا چاہیے۔ لیکن اگر مخاطب حکم میں متردد ہے یعنی اُسے اِس میں شک ہے کہ طرفین اسناد مسند الیہ و مسند میں نسبت کے واقع ہونے یا نہ واقع ہونے کا حکم موجود ہے تو ایسی صورت میں اسناد کو تاکید سے قوت پہنچانا مستحسن ہے لیکن اگر مخاطب "حکم" کا منکر ہو تو اس شکل میں "حکم" کو انکار کی شدت و ضعف کے لحاظ سے مؤکد بنانا ضروری و لازمی ہے۔ پہلی قسم کو "ابتدائی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کو "طلبی" کہا جاتا ہے اور تیسری قسم کو "انکاری"۔ "ابتدائی" کی مثال ہے "خالد آ گیا"۔ "طلبی" کی مثال یہ ہے:

تو کوچۂ دلدار اگر دیکھ لے واعظ
واللہ کبھی نام نہ لے خلدِ بریں کا   (جناب شاہجہاں پوری)

"انکاری" کی مثال جگر مراد آبادی کے مندرجۂ ذیل شعر کا دوسرا مصرعہ ہے :

اے محتسب! نہ پھینک، مرے محتسب! نہ پھینک
ظالم، شراب ہے! ارے ظالم! شراب ہے!

متکلم محتسب کے انداز و روش سے یہ سمجھتا ہے کہ وہ زیرِ بحث چیز کے محترم ہونے کا معتقد نہیں ہے جبھی تو اُس کے پھینک دینے پر آمادہ ہے اور شاعر کو یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ محتسب یہ تو کیا کر رہا ہے۔ یہ شراب سی محترم چیز ہے اسے تو پھینکے دے رہا ہے۔

اس "انکاری" کی مثال میں داغ کا یہ شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے :

جو دکھاؤ بھی نہ دیکھوں رُخِ پُر حجاب ہرگز
یہ وہ آنکھ ہے کہ دیکھا نہیں جس نے خواب ہرگز

تاکید کے انداز اور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ کبھی الفاظ کے ذریعے مطلوبہ تاکید کو نمودار کیا جاتا ہے کبھی محض لہجے کی درشتی سے بیان میں تاکیدی رنگ پیدا کیا جاتا ہے کبھی محض بیان کے انداز سے مقصد تاکید حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر کلام ان تینوں سانچوں میں سے کسی سانچے میں ڈھلا ہوا محل و موقع کے لحاظ سے وارد کیا جائے گا تو وہ مقتضائے ظاہر حال کے مطابق ہوگا۔ بسا اوقات مقتضائے ظاہر حال کے مخالف ہونے کی وجہ سے وہ لازمی طور سے مقتضائے حال کے بھی مخالف ہوگا کیوں کہ مقتضائے حال "عام مطلق"[۱] ہے اور "مقتضائے ظاہر حال"[۲] "خاص مطلق"[۱] اور اس صورت میں منطقی تقاضا یہی ہوگا کہ جہاں کہیں مقتضائے ظاہر حال ہو مقتضائے حال ضرور ہو لیکن ایسا نہ ہوگا کہ جہاں مقتضائے حال

---

[۱] عام و خاص مطلق ـــــ ایسے دو مفہوم جن میں سے ایک مفہوم دوسرے مفہوم کے تمام افراد پر صادق آئے لیکن دوسرا مفہوم پہلے مفہوم کے تمام افراد پر صادق نہ آئے۔ پہلے کو "عام مطلق" کہا جائے گا اور دوسرے کو "خاص مطلق" جیسے حیوان اور انسان۔ حیوان کا مفہوم انسان کے تمام افراد پر صادق آتا ہے کوئی ایسا انسانی فرد فرض نہیں کیا جا سکتا جس پر حیوان نہ صادق آئے۔ لیکن انسان کا مفہوم حیوان کے تمام افراد پر صادق نہیں آتا جیسے گائے، گھوڑا، شیر۔ ان پر "حیوان" صادق آتا ہے لیکن انسان صادق نہیں آتا۔

[۲] مقتضائے ظاہر حال ـــــ "حال" ایسے امر کو کہتے ہیں جو کلام کو مخصوص شکل میں پیش کرنا لازمی قرار دے۔ اس کے مطابق جو کلام ڈھلا ہوا ہوگا وہ "مقتضائے حال" کے مطابق کہا جائے گا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ "حال" ظاہری طور سے تو یہ چاہتا ہے کہ کلام مخصوص شکل میں پیش کیا جائے لیکن کسی خاص مصلحت کی وجہ سے اُسے اس شکل میں پیش نہیں کیا جاتا تو وہ کلام "مقتضائے حال" کے مطابق تو ہوگا لیکن "مقتضائے ظاہر حال" کے مطابق نہ ہوگا۔ اس طرح "مقتضائے ظاہر حال" خاص مطلق ہوگا اور "مقتضائے حال" عام مطلق۔ جہاں کہیں "مقتضائے ظاہر حال" صادق ہوگا وہاں "مقتضائے حال" ضرور صادق ہوگا لیکن اس کا اُلٹا (عکس) نہیں ہوگا۔

موجود ہو وہاں "مقتضائے ظاہر حال" بھی ضرور موجود ہو۔ اسی قاعدے کے تحت کبھی "فائدۂ خبر" سے انکار کرنے والے کو "منکر فائدۂ خبر" سمجھ کر بات کی جاتی ہے مگر اس وقت جب کہ کچھ علامتیں اور نشان ایسے موجود ہوں جن سے یہ خیال کیا جا سکے کہ شخص حقیقۃً منکر خبر ہے:

وہ کہنے لگا سن کے یہ داستاں
کہ شاید تو ہے رستم پہلواں
وہ بولا کہ زنہار رستم نہیں
میں اس کا ہوں اک چاکر کم تریں (منشی موہن چند دہلوی)

سہراب اس کا منکر نہ تھا کہ مخاطب رستم نہیں ہے مگر اسے جو نشانیاں رستم کی بتائی گئی تھیں وہ مخاطب میں موجود تھیں؛ اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ وہ مخاطب کو رستم سمجھ رہا ہے۔ اسی بنا پر یہ قرار دے لیا گیا کہ سہراب بہ منزلۂ منکر ہے لہٰذا مخاطب نے اپنے جواب میں "زنہار" سے تاکید پیدا کی اور پھر اس کی مزید تاکید دوسرے مصرعے سے کر دی کہ ع "میں اس کا ہوں اک چاکر کم تریں" اور کبھی کبھی حکم کے منکر کو "غیر منکر" مان لیا جاتا ہے۔ اس صورت میں انکار کے دفعیے کے لیے ایسے شواہد و علامات موجود ہوں جن کی طرف ذرا سا التفات انکار کا استیصال کر دے:

جیسے کہ کہیے اولو الامر ہے حسین شہید
امام برحق و معصوم پاک از اجداد

ایک شخص حسین شہید کے "اولی الامر" صاحبِ امر و حکم (وہ سردار و رئیس و حاکم جس کی اطاعت خدا کی طرف سے لازم قرار دی جائے) ہونے کا انکاری ہے لیکن سودا اس کے انکار کو بہ منزلہ عدم قرار دیتے ہیں محض اس بنا پر کہ منکر ایک پڑھا لکھا منصف مزاج فاضل ہے اور اگر وہ تاریخی واقعات کی طرف رجوع کرے تو وہ اسے یقیناً سمجھ سکتا ہے کہ حسینؑ قطعی طور پر "اولی الامر" ہیں۔ اسی لیے سودا نے اسے بالکل ہی سادے طور سے غیر تاکیدی رنگ میں پیش کیا اور محض اس کے کہنے پر اکتفا کی "جیسے کہ کہیے اولی الامر ہے حسین شہید"

اسناد کی قسمیں

اسناد کی دو قسمیں ہیں: ۱۔ حقیقتِ عقلی ۲۔ مجازِ عقلی

حقیقت عقلی: فعل یا معنائے فعل (مصدر۔ اسم فاعل۔ اسم مفعول۔ صفتِ مشبہ۔ اسم تفضیل۔ اسم ظرف) کا اس شے کی طرف اسناد جس کے لیے فعل یا معنائے فعل متکلم کے نزدیک ظاہری علامات و آثار کے طور پر ثابت ہے یا اس سے واقع ہوا ہے۔ اس تعریف کے اعتبار سے حقیقت عقلیہ کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔

پہلی قسم تو وہ ہے جو واقع اور اعتقاد دونوں کے مطابق ہو جیسے کوئی خدا کا ماننے والا یہ کہے "سبزۂ و گل کو خدا نے وجود بخشا ہے"

دوسری قسم وہ ہے جو صرف اعتقاد کے مطابق ہو جیسے کوئی خدا کا نہ ماننے والا یہ کہے کہ "موسم بہار نے سبزہ و گل کو وجود بخشا ہے"

تیسری قسم وہ ہے جو صرف واقع کے مطابق ہو اور اعتقاد کے مطابق نہ ہو جیسے کوئی خدا کا منکر یہ کہے کہ "سبزہ و گل کا خالق خدا ہے"

چوتھی قسم یہ ہے کہ کلام واقع اور اعتقاد دونوں کے مطابق نہ ہو جیسے کہ ہم یہ کہیں کہ "فلاں مشہور رہ نما تشریف لے آئے" حالاں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں آئے ہیں۔ البتہ مخاطب کو اس کا علم نہ ہو کیوں کہ اگر اسے بھی اس کا علم ہوگا تو اس کا یہ علم ہی اس کا قرینہ ہو جائے گا کہ ممکن ہے ظاہری طور پر اس جملے کا جو مفہوم سمجھا جا رہا ہے وہ متکلم کا مقصود نہ ہو۔

مجازِ عقلی: فعل یا معنائے فعل کا کسی ایسے امر کی طرف اسناد جس سے وہ درحقیقت متصف نہ ہو۔ مثلاً اگر فعل معروف ہو تو غیر فاعل کی طرف اور اگر فعل مجہول ہو تو غیر مفعول بہ کی طرف اسے نسبت دینا ظاہر ہے کہ یہ "غیر" مجازی ہوگا اور اس کی طرف فعل یا معنی فعل کی نسبت کسی تعلق ہی کی وجہ سے ہوگی۔ اسی تعلق اور ملابست کی وجہ سے اسے فعل معروف میں فاعل کی جگہ اور فعل مجہول میں "مفعول بالم یسم فاعلہ" (قائم مقام فاعل) کی جگہ دی گئی ہے۔ اور یہ تعلق ہی وہ قرینہ ہوگا جس سے یہ پتا چل سکے گا کہ فعل یا معنائے فعل اپنے حقیقی مسند الیہ کی طرف منسوب نہیں ہوا ہے بلکہ اس کا انتساب مسند الیہ غیر حقیقی کی طرف ہوا ہے۔ میر حسن کا شعر ہے:

اچھلتے تھے فوارے جو اس کے واں گیا سب نکل ان کا تاب و تواں

اچھلنے کو فواروں کی طرف منسوب کیا گیا ہے حالاں کہ فوارے نہیں اچھلتے ہیں بلکہ پانی اچھلتا ہے جو فواروں کے اندر ہوتا ہے۔ اسی طرح محمد اسمٰعیل پانی پتی کا شعر ہے:

قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری
چل نکلیں گی کشتیاں تمھاری

شعر میں جاری ہونے کا انتساب نہر کی طرف کیا گیا ہے حالاں کہ حقیقتاً پانی جاری ہوتا ہے۔ (اس مقام پر اس امر کا ذکر فائدے سے خالی نہیں کہ سکاکی جو فن معانی و بیان وغیرہ میں ایک زبردست مجتہد کی حیثیت رکھتا ہے "مجاز عقلی" کو سرے سے نہیں مانتا اور جو مثالیں مجاز عقلی کے ذیل میں دی جاتی ہیں وہ انھیں استعارۂ بالکنایہ کے تحت درج کرتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں سکاکی کے خیال کی جرح و قدح سے سلسلۂ کلام دراز تر ہو جائے گا)۔

مسند الیہ کے احوال و کیفیات

مسند الیہ جملے میں اصلی چیز ہے۔ اسی کے ارد گرد بقیہ سب اجزا گردش کرتے رہتے ہیں:

ذکر : مسند الیہ کا ذکر مندرجۂ ذیل صورتوں میں کیا جاتا ہے:

۱۔ کبھی اُس کی خصوصی اہمیت کے نقطۂ نظر سے اُس کا ذکر ضروری قرار دے لیا جاتا ہے مثلاً

چشم جاناں کو دل زار نے سونے نہ دیا ۔۔۔ رات بیمار کو بیمار نے سونے نہ دیا

گویا پہلے مصرعے میں "دل زار" فاعل ہے یعنی مسند الیہ۔ "سونے نہ دیا" فعل ہے۔ "چشم جاناں" مفعول بہ۔ اسی طرح دوسرے مصرعے میں "نے" سے پہلے والا "بیمار" فاعل (مسند الیہ) اور "کو" سے متصل "بیمار" مفعول بہ یعنی مسند۔ دونوں جگہ مسند الیہ کا جملے میں ذکر اس کی بنیادی حیثیت اور حذف کے کسی داعی کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے۔

۲۔ کبھی مسند الیہ کا ذکر مدعا کی توضیح کے لیے کیا جاتا ہے:

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں ۔۔۔ میں ہوں انگشتری پیغمبر خاتم کا نگیں

دوسرے مصرعے میں ضمیر متکلم "میں" کے اعادے سے مدعا کی تاکید کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔

۳۔ کبھی سامع کے کند ذہن وغیرہ ہونے کی وجہ سے مسند الیہ کا ذکر کیا جاتا ہے:

حدیث فاطمہ کے حق میں بضعۃ منی[1] ۔۔۔ ہوئی زبان محمد سے بارہا ارشاد
حدیث یہ جو مکرر نبی نے فرمائی ۔۔۔ سو اس حدیث کے فرمانے سے یہی ہے مراد

اوپر کی مثال میں "نبی" کے ذکر سے سامع کی کند ذہنی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔

[1] فاطمہ میری پارہ جگر ہیں۔

۴۔ کبھی مسند الیہ کے ذکر سے "مدلول" کی تعظیم مقصود ہوتی ہے مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ مسند الیہ کے معنی تعظیم پر دلالت کرتے ہوں جیسے غالب کے اس شعر میں:

بھیجی ہے مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال ۔۔۔ ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

"شاہ جم جاہ" پورا مرکب توصیفی مسند الیہ ہے اور ظاہر کہ اس لفظ کے معنی سے تعظیم کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔

۵۔ کبھی مسند الیہ کا ذکر اُس سے برکت حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے جیسے:

محمد کنت کنزا[1] کی گواہی ۔۔۔ محمد عالم علم الٰہی
محمد جگ میں سالار رسل ہے ۔۔۔ محمد ماہر ہر جزو و کل ہے

اشعار بالا میں "محمد" کی چاروں مصرعوں میں تکرار برکت حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تکرار بالا سے محمدؐ کی عظمت و جلالت کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

۶۔ کبھی نفسی حظ حاصل کرنے کے لیے مسند الیہ کا ذکر کیا جاتا ہے جیسے

اُن لبوں نے نہ کی مسیحائی
ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا (خواجہ میر درد)

محبوب کے لبوں کا ذکر نفسی استلذاذ کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لطیف اشارہ اپنی محرومی کی طرف بھی ہے کہ اُن جاں بخش ہونٹوں نے اپنی مسیحائی کے باوجود ہماری مسیحائی نہ کی باوجودے کہ ہماری طرف سے اُس کی مسیحیت کو حرکت میں لانے کے لیے کوئی کمی نہیں اُٹھا رکھی گئی۔

۷۔ کبھی مسند الیہ کا ذکر کلام کو طول دینے کی غرض سے بھی کیا جاتا ہے تاکہ جلیل القدر سامع (سننے والے) کو دیر تک اپنی طرف متوجہ رکھا جائے مثلاً قرآن کریم میں اس واقعے کا ذکر کیا گیا ہے۔ باری عز اسمہ حضرت موسیٰ سے پوچھتا ہے "یہ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟" حضرت موسیٰ نے اس کے

[1] اس حدیث قدسی کی طرف اشارہ ہے "کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق لکے اعرف"۔ باری تعالیٰ کی زبان سے یہ کہا گیا ہے "میں ایک مخفی خزانہ تھا، لہذا میں نے یہ چاہا کہ میری معرفت حاصل کی جائے اس لیے میں نے خلق کو پیدا کیا تاکہ میری معرفت حاصل کی جائے مجھے پہچانا جائے۔

جواب میں فرماتے ہیں "یہ میرا عصا ہے جس پر میں تکیہ لگاتا ہوں اور اس سے اپنی بھیڑ بکریاں ہکاتا ہوں اور اس سے میرے دوسرے مقاصد بھی وابستہ ہیں۔" "قال وما تلك بيمينك يا موسىٰ قال هي عصاي اتوكؤا عليها واهش بها على غنمي ولي فيها مآرب اخرىٰ"۔

۸۔ کبھی مسندالیہ کا ذکر مخاطب کے ڈرانے کے لیے کیا جاتا ہے مثلاً شاہ نامۂ اردو کا یہ شعر ؎

یہ کہہ کر لگا کہنے پھر وہ بجیر — کہ رستم ہے مرد شجاع و دلیر

اس مقام پر مسندالیہ کا ذکر سہراب کی تخویف و تہدید کے لیے کیا گیا ہے۔ اسی طرح کے اور بہت سے دواعی اور مصالح مسندالیہ کے ذکر کے لیے تجویز کیے جا سکتے ہیں۔

حذف۔ اس میں شک نہیں کہ مسندالیہ کلام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن کبھی ایسی ضرورتیں اور مصلحتیں بھی سامنے آ جاتی ہیں جن کی وجہ سے اُسے حذف کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ اگر ایسی صورت ہو کہ مسندالیہ کا سمجھ لینا قرائن کی وجہ سے بہت ہی سہل و آسان ہو تو ایک فعلِ عبث سے بچنے کے لیے اُسے حذف کر دیا جاتا ہے۔ گویا اس مقام پر عقل و نقل میں جو قوی تر دلیل ہے یعنی عقل، اس پر اعتماد کر لیا جاتا ہے مثلاً کوئی دریافت کرے کہ "آپ کا کیا حال ہے؟" تو اس کے جواب میں کہہ دیا جائے کہ "علیل ہوں۔" تو یہاں "میں" کو اسی لیے حذف کیا گیا ہے کہ عقلی قرینے کی وجہ سے اس کا سمجھنا بہت ہی سہل ہے۔

۲۔ مسندالیہ کے حذف سے کبھی سامع کے فہم کی آزمائش منظور ہوتی ہے جیسے

نہ کیوں ہوں لاکھ مستانہ ادائیں میرے نالے میں
گدا ہے میکدہ ہوں، ہر طرح کی ہے پیالے میں (داغ)

دوسرے مصرعے کے دوسرے ٹکڑے "ہر طرح کی ہے پیالے میں" سے شراب محذوف ہے اور وہی مسندالیہ ہے۔ یعنی شراب ہر طرح کی پیالے میں موجود ہے۔ اُسے سننے والے کی فہم کی آزمائش کے لیے حذف کر دیا ہے اور اس کی صفت کے ذکر ہی پر اکتفا کی ہے۔

۳۔ کبھی مسندالیہ کو جب کہ وہ فاعل کی شکل میں ہو اُس کے مرتبے کے عالی ہونے کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ مفعول بہ کم مرتبہ ہو مثلاً

سبزہ و گل کو دیکھنے کے لیے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی (غالب)

مسندالیہ (فاعل) شعر بالا میں حذف کر دیا گیا ہے کیوں کہ چشمِ نرگس اور بینائی خدا کے مقابلے میں جو اس مقام پر مسندالیہ (فاعل) ہے حقیر و کم رتبہ ہیں۔

۴۔ کبھی مفعول بہ کی عظمت ملحوظ رکھتے ہوئے مسندالیہ (فاعل) کو حذف کر دیا جاتا ہے اور فعل کو مجہول کی صورت میں تبدیل کر لیا جاتا ہے جیسے ہم یہ کہیں "مہاتما گاندھی شہید کر دیے گئے۔" ظاہر ہے کہ یہاں قاتل ایک بطن دشمنِ انسان تھا اور مفعول بہ کے مقابلے میں کہیں حقیر، اس لیے اس کا ذکر نہ کرنا ہی مناسب سمجھا گیا۔

۵۔ کبھی مسندالیہ کو اس لیے حذف کر دیا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت اُس سے انکار کر دینا آسان و سہل ہو مثلاً صرف اتنا کہنے پر اکتفا کی جائے "چور! اور بے ایمان!" مگر اس شرط کے ساتھ کہ مخاطب کے لیے کوئی ایسا قرینہ قائم ہو کہ وہ یہ سمجھ لے کہ اس سے فلاں شخص مراد لیا گیا ہے۔ ایسا صرف اس لیے کیا جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت یہ کہا جا سکے کہ فلاں شخص اس سے مراد نہیں لیا گیا ہے بلکہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو اس سے مراد لیا گیا ہے۔

اسی قسم کی بہت سی ضرورتیں اور مصلحتیں ہو سکتی ہیں جن کی وجہ سے مسندالیہ کو حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً وقت نہ ہو اور جلدی میں کوئی شکاری کہے یا شکاری سے کوئی دوسرا کہے "ہرن!" ظاہر ہے کہ یہاں مسندالیہ غایتِ تعجیل کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے۔

مسند

مُسند وہ کلمہ ہے جو مسندالیہ کی طرف منسوب ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ اسمی اور فعلی۔ اسمی وہ ہے جس میں مُسند اسم ہو۔ فعلی وہ ہے جس میں مسند فعل ہو۔

اگر مسند اسم ہوگا تو اُس سے ظاہر ہونے والی صفت مسندالیہ کی ذات میں ثابت ہوگی اور اس مبالغے کا رنگ مدح و ذم وغیرہ میں موقع کے لحاظ سے پیدا ہو جائے گا جیسے

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

دوسرے مصرعے میں "واقعہ" مسندالیہ ہے اور "سخت" مسند ہے۔ اسی طرح مصرعۂ ثانیہ کے دوسرے ٹکڑے میں "جان" مسندالیہ ہے اور "عزیز" مُسند ہے۔ مسند دونوں جگہ اسمی ہے۔ پہلے میں مسندالیہ کی شدت کا اظہار ہوتا ہے اور

اس سے واقعے کی مذمت میں مبالغے کا رنگ آجاتا ہے اور دوسری جگہ مسند یعنی "عزیز" مسند الیہ یعنی "جان" میں مدح کا رنگ مبالغے کے ساتھ بھر دیتا ہے۔

مسند کے فعلی ہونے کی صورت میں استمراری کیفیت نہ ہوگی فعل بہرحال تین زمانوں یعنی مستقبل، حال میں سے کسی مخصوص زمانے ہی میں پایا جائےگا اور اس طرح اس میں استمراری کیفیت نہیں آسکتی۔

ہزاروں حسرتیں جاویں گی میرے ساتھ دنیا سے
شرار و برق سے بھی عرصۂ ہستی کو کم پایا

آتش کے مندرجۂ بالا شعر کے پہلے مصرعے میں بھی اور دوسرے مصرعے میں بھی "جاویں گی" اور "کم پایا" مسندِ فعلی ہیں علی الترتیب مستقبل اور ماضی کی شکل میں، اور ظاہر ہے کہ ان میں استمراری شان نہیں ہے۔

ذکرِ مسند: مسند کا ذکر مندرجۂ ذیل وجوہ کی بنا پر کیا جاتا ہے:

١۔ جب کہ ذکر سے عدول کرنے کے لیے کوئی مقتضی نہیں ہوتا تو پھر "ذکر" کی اصالت ملحوظ رکھی جاتی ہے اور مسند کا ذکر کر دیا جاتا ہے جیسے

وہ دورِ چرخ آرہا ہے اکبر کہ اہلِ تقوے ہیں زار و مضطر
بزرگ بھی طفلِ دل کو اپنے سکھا رہے ہیں گناہ کرنا

شعر مندرجۂ بالا میں "دورِ چرخ" مسند الیہ ہے اور "آرہا ہے" مسند اور دوسرے مصرعے میں "سکھا رہے ہیں" مسند ہے۔ "اپنے طفلِ دل" پہلا مفعول ہے اور "گناہ کرنا" دوسرا مفعول۔ ان دونوں میں کوئی مسند ایسا نہیں ہے جسے حذف کیا جاسکے۔

٢۔ قرائن پر اگر اعتماد کم زور ہوتا ہے تو اس وقت بھی احتیاطاً ذکر کر دیتے ہیں:

کچھ خریدا نہیں ہے اب کی سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کے بار (غالب)

شعر مندرجۂ بالا میں مسند الیہ "میں نے" ہے اور پہلا اور دوسرا مصرعہ دونوں مسند ہیں۔ ان میں سے ایک حذف کیا جاسکتا تھا لیکن قرینہ کم زور تھا۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا لہٰذا کسی کو حذف نہیں کیا گیا۔

٣۔ سامع کی غباوت پر تعریض کرنے کے لیے مسند کا ذکر کر دیتے ہیں مثلاً اگر کوئی پوچھے "تمھارا نبی کون ہے؟" تو جواب میں کہا جائے کہ "محمد ہمارے نبی ہیں"۔ ظاہر ہے "ہمارے نبی ہیں" کے ذکر کی ضرورت نہ تھی صرف محمد کہہ دینا کافی تھا۔ لیکن سامع کی غباوت پر تعریض کرنے کے لیے مسند "ہمارے نبی ہیں" کا ذکر کیا گیا۔

٤۔ کبھی مسند کے ذکر سے تخویف و تہدید کا فائدہ بھی حاصل ہو جاتا ہے:

جدھر قلب میں شاہ کاؤس تھا — اُدھر جا کے سہراب نے یوں کہا
سوارانِ ایراں کو میداں میں یا — تہ تیغ کھینچوں میں کاؤس میں

دوسرے شعر میں "میں" مسند الیہ ہے اور "تہ تیغ کھینچوں" مسند۔ اس کے ذکر سے تخویف و تہدید کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ کیوں کہ "تہ تیغ کھینچوں" میں تہدید و تخویف کا پہلو خاص ابھرا ہوا ہے۔

حذفِ مسند: مندرجۂ ذیل صورتوں میں مسند حذف کر دیا جاتا ہے:

١۔ جب مسند کا ذکر عبث ہو تو اس سے بچنے کے لیے مسند کو قرینے پر اعتماد کر کے حذف کر دیتے ہیں جیسے زید آیا اور عمرو بھی۔ اس مقام پر عمرو کا "مسند" عبث فعل کے ارتکاب سے بچنے کے لیے حذف کر دیا گیا۔

٢۔ کبھی متکلم کی خواہش ہوتی ہے کہ سامع کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ عقلی و نقلی دلائل میں سے دلیلِ عقلی یہاں اختیار کی گئی ہے محض اس وجہ سے کہ عقلی دلیل نقلی دلیل سے قوی تر ہوتی ہے مثلاً سودا کا شعر ہے:

لگے کہنے نہیں شراکت نیک — میرے سو لقمے اور تیرا ایک

یعنی میرے سو لقمے اور تیرا ایک لقمہ برابر ہیں۔ عقل پر اعتماد کر کے شعر بالا میں مسند محذوف کر دیا گیا ہے۔

٣۔ وزنِ شعر کی محافظت کی وجہ سے کبھی اختصار مطلوب ہوتا ہے اور پھر مسند بھی قریب الفہم ہوتا ہے تو اس صورت میں بھی اسے حذف کر دیا جاتا ہے:

چمن سے بھرا باغ گل سے چمن — کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن

شعر مندرجۂ بالا کے دوسرے مصرعے میں مسند محذوف کر دیا گیا ہے اس لیے کہ وزنِ شعر اس مقام پر اختصار چاہتا تھا اور پھر مسند فوراً سمجھ میں بھی آجاتا ہے یعنی کہیں نرگس و گل موجود تھے اور کہیں یاسمن۔

٤۔ کبھی مقامِ مدح میں "مسند" کو حذف کر دیا جاتا ہے جیسے غالب کے مندرجۂ ذیل شعر میں:

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالب — تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مثالِ بالا میں تعجب کا پیرایہ اختیار کر کے مدح کی گئی ہے۔ حاصل یہ ہے "ترے

یہ مسائل تصوف کتنے دقیق اور لطیف ہیں اور یہ تیرا بیان کتنا نغز و دل پسند ہے۔ اس جگہ "مسند" محذوف ہے۔

استقرا اور تلاش سے ایسے اور بہت سے مقامات مل سکتے ہیں جہاں مسند اسی طرح نکات کی وجہ سے حذف کر دیا جاتا ہے لیکن چونکہ حذف اصل کے خلاف ہے اس لیے کسی نہ کسی ایسے قرینہ کا ہونا ضروری ہے جو حذف کی طرف رہنمائی کر سکے۔

"مسند" مسند الیہ کے بعد پیش آتا ہے اس لیے کہ مسند الیہ کا ذکر فطری طور سے بہت ضروری ہوتا ہے لیکن کبھی اسے کسی اہم فائدے کی وجہ سے مقدم بھی کر دیتے ہیں۔

مسند کی تقدیم۔ اس کی مختلف وجہیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ مسند کی اہمیت مقتضی ہوتی ہے کہ اس کو ذکر میں مقدم کر دیا جائے تاکہ کسی چیز کی تقدیم جس کا حق یہ ہے کہ اسے مؤخر کیا جائے اس کے اہم ہونے پر دلالت کرے۔

شریف مکہ رہا ہے تمام عمر اے شیخ ۔۔۔ یہ میر اب جو گدا ہے شراب خانے کا

شراب خانے کی گدائی سے لوگوں کے دلوں میں عظمت کم ہوتے دیکھ کر میر اپنی اہمیت اس طرح واضح کرتے ہیں کہ سابق زمانے میں "شریف مکہ" رہ چکے ہیں۔ اسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے "شریف مکہ" کو جو مسند ہے مقدم کیا ہے۔

۲۔ کبھی تفاؤل (نیک فال لینا) کے لیے مسند کو مقدم کرتے ہیں:

تھی قحط سے پامال خلقت ۔۔۔ اس مینھ سے ہوئی نہال خلقت (محمد اسمٰعیل)

اصلی صورت یہ ہونا چاہیے تھی "خلقت اس مینھ سے نہال ہوئی"۔ "خلقت" مسند الیہ ہے اور "نہال" مسند۔ مسند یعنی نہال کو خلقت یعنی مسند الیہ پر مقدم کرنے کا فائدہ تفاؤل ہے۔

۳۔ کبھی برائی کے اظہار میں تعجیل مقصود ہوتی ہے اس لیے مسند کو مقدم کر دیا جاتا ہے:

مشعبد ہے عجب یہ پیر گردوں ۔۔۔ کہ ہر دم اس کی صورت ہے دگرگوں (خوشتر)

پیر گردوں کی مذمت میں تعجیل مقصود ہے اس لیے مشعبد (شعبدہ باز) کو جو مسند ہے پیر گردوں پر جو مسند الیہ ہے مقدم کر دیا۔

۴۔ کبھی اظہار مسرت کا مقصد جلد حاصل کرنے کے لیے مسند کو مقدم کر دیا جاتا ہے جیسے [illegible]

پہنچے نہیں سے کہ جو وہ ظالم سر بازار ۔۔۔ خدام سے کی عرض کہ حاضر ہیں گنہگار

یہ موقع ہے کہ حضرت مسلم (امام حسین کے ناصر) کے جوش کی گرفتاری کی حاکم کوفہ کو کد تھی اس لیے جب وہ پکڑ کر گرفتار کر لیے گئے اور انھیں حاکم کے روبرو لے جایا گیا تو ان کے حاضر ہونے کا پہلا ذکر کیا گیا تا کہ اظہار مسرت میں تعجیل ہو۔ "حاضر ہیں گنہگار" میں "گنہگار" مسند الیہ ہے اور "حاضر" مسند۔

۵۔ کبھی مسند کو اس لیے مقدم کرتے ہیں کہ مسند الیہ کی طرف ایک قسم کا شوق پیدا ہو جائے جیسے غالب کا یہ شعر

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر ۔۔۔ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

"جام جہاں نما" بہ ترکیب توصیفی مسند ہے اور "شہنشاہ کا ضمیر" مسند الیہ۔ مسند کو یہاں مقدم اس وجہ سے کیا ہے کہ مسند الیہ کے علم کی طرف شوق و رغبت پیدا ہو جائے۔

تنبیہ: واضح رہے کہ مسند و مسند الیہ کے سلسلے میں حذف و ذکر، تقدیم و تاخیر وغیرہ کے جن مقامات کا ذکر کیا گیا ہے انھیں میں انحصار نہیں ہے۔ کلام کے حسن و لطف سے آشنا ذوق ایسے اور بہت سے مقامات کا نشان دے سکتا ہے جن کی وجہ سے حذف و ذکر، تقدیم و تاخیر وغیرہ کا لحاظ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ بیان کردہ "احوال" میں منطقی انحصار نہیں ہے کہ ان کے دائرے سے الگ کوئی ایسی صورت تجویز ہی نہ کی جا سکے جو کلام کو ایک مخصوص شکل میں پیش کرنا ضروری قرار دے۔[1]

[1] ضرورت و وجوب اور ان کے مشتقات منطق اور فلسفے کے بیان سے تعلق رکھنے والے مفہوم میں "استحسان شدید" کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں ——— اختر علی تلہری

آج کا انسان حیوان بنتا جا رہا ہے

(سید هادی پور)

[illegible]

انسان کی حقیقت انسان کی آزاد خیالی پیدا ہوئی [illegible]

[illegible]

انسان سے مویشیوں کا کام [illegible]

[illegible]

جاتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں ہندوستان سے ثقافتی وفد چین گیا تھا جس نے وہاں کے مختلف علاقوں میں جا کر وہاں کے کسانوں اور مزدوروں کے مسائل کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ وفد کے ممبروں کو مختلف مقامات پر یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایسے کم سن بچے جنھیں اسکولوں میں ہونا چاہیے تھا کھیتوں اور کارخانوں میں کام کر رہے تھے۔ ایک گاؤں میں انھوں نے دیکھا [illegible] میں صرف ۲۷ گھنٹے اور [illegible] [illegible] [illegible] زیادہ بچے [illegible]

چین کے اس نظام اور [illegible] کو دیکھ کر [illegible] اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ہزاروں سال سے جانوروں کا کام کرتے کرتے چینی عوام میں سائنس اور انسانی ہمدردی کا جذبہ قریب قریب ختم ہو گیا ہے اور وہ جانوروں

بعد جو نظام حکومت وجود میں آیا اس کی نظروں میں انسانیت اور انسانی صفات کی کوئی اہمیت نہیں اور جو [illegible] کے زور پر عوام کو بھیڑ بکری کی طرح [illegible] ہانکتا ہے اور بین الاقوامی جھگڑوں کو طاقت اور جنگ سے ہی حل کرنا چاہتا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چین کے [illegible] ہندوستان سے چینی عوام [illegible] اگر پہلے تو [illegible] [illegible] کے ملنے کا بہانہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

> "کوئی جنگ، خاص طور سے چین سے جنگ، محض نعرہ بازی سے نہیں لڑی جا سکتی۔ ہندوستان کو اس [illegible] کے لیے خاص طور سے تیاری کرنا ہے اور عظیم قربانیاں کرنا ہیں۔"
> ـــــــــ وزیر اعظم نہرو

کام کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اس کے علاوہ [illegible] [illegible] [illegible] کر دیا اور [illegible] زندگی [illegible] محروم ہو گئے۔

آزادی، جمہوریت اور سائنس کے اس دور میں ہم یہ امید کرتے تھے کہ جاگیردارانہ نظام اور استعماریت پسند ملکوں کے اقتصادی استحصال سے نجات پانے کے بعد چینی عوام کی ان مجبوریوں پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا اور اس بنیادی مسئلے کا کوئی ایسا حل تلاش کیا جائیگا [illegible] انسانی تہذیب و تمدن کے عین مطابق ہو لیکن چینیوں کی بدقسمتی کہ انھیں آزادی ملی تو ایسی خون ریزی کے بعد جس کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ اس زبردست خون ریزی کے

کے [illegible] اس حالت میں بھی [illegible] [illegible]

ہندوستان اور چین کی سرحدی لڑائی میں یہ دیکھا گیا ہے کہ چینی [illegible] اپنے زخمی ساتھیوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں ان کی [illegible] [illegible] تفصیل تعیین کی جاتی ہیں [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] سامنے آ جائے تو اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ شیر کو مار ڈالنے کے بعد یہ چیتے اپنے غول کے ان تمام [illegible] [illegible] جو زخمی ہو جاتے ہیں۔

چین کے ان چیتوں کی طرح وہاں کے کمیونسٹ بھی اپنے گرد ہمیشہ [illegible] رکھنا چاہتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھتے ہیں۔

تذکرۂ ریاضِ حسنی*

خالدہ یوسف

تذکرۂ ریاض حسنی خواجہ عنایت اللہ خاں فتوت اورنگ آبادی کا لکھا ہوا ایک تذکرہ ہے جسے انھوں نے ۱۱۶۶ھ میں مرتب کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ ریکارڈ آفس حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ مخطوطے کے تقریباً ۲۰۰ صفحات ہیں جن میں ۹۶ شعرا کے حالات اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق شعرا کے حالات فارسی زبان میں قلم بند ہوئے ہیں لیکن ان کا صرف اردو کلام ہی ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے حالانکہ اس میں بعض ایسے شعرا کا بھی ذکر ملتا ہے جو فارسی میں طبع آزمائی کرتے تھے اور بعض اوقات تفنن طبع کی خاطر اردو میں شعر موزوں کرتے تھے۔ (اس سلسلہ میں افتخار دولت آبادی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جن کے صرف اردو اشعار ہی انتخاباً نقل ہوئے ہیں اور فارسی اشعار کو نظر انداز کیا گیا ہے۔) تمام شعرا کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے ہوا ہے۔ مخطوطہ کی ابتدا میں مولف نے ۲۶ صفحات کا طویل دیباچہ لکھا ہے جس کی ابتدا حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ دیباچہ کا پہلا ورق غائب ہے۔ باقی نسخہ مکمل ہے۔ مولف نے حمد و نعت کے بعد اپنا تعارف کرایا ہے۔

تصحیح نام

مخطوطہ میں شعرا کی فہرست سے پیشتر خود مولف کا کہا ہوا قطعہ تاریخ درج ہے:

تاریخ بنائے این ریاضِ حسنی — جستم ز فیض خاصِ آل مدنی

از روئے سرود بذل ہاتف برگفت — گلدستۂ ریحان بہار معنی

اس قطعہ میں چوتھے مصرعہ کے اعداد جمع کرنے سے ۱۱۶۹ھ نکلتے ہیں جن میں تیسرے مصرع سے بذل کی "ب" کی اعداد کا تخرجہ کرنے سے ۱۱۶۶ھ برآمد ہوتے ہیں جو تاریخ تذکرہ قرار پاتی ہے۔ یہ تاریخ اس لئے بھی صحیح کہی جا سکتی ہے کہ خود مولف نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مجموعہ نواب امیر الممالک آصف الدولہ صلابت جنگ کے عہد میں ترتیب دیا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "تحریر این مقالات کہ در دور سندکان آصف الدولہ است بود" یہ بیان خود ایک مستند ثبوت ہے۔ تاریخی لحاظ سے اس دور کا تعین اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ۱۱۷۵ھ میں صلابت جنگ کے معزول ہونے کے بعد نظام علی خاں برسراقتدار آئے۔ اس سلسلہ میں سراج الدین طالب نے لکھا ہے: "۱۱۷۵ھ میں صلابت جنگ کو قلعہ بیدر میں نظر بند کر کے امور سلطنت کا بار نظام علی خاں نے اپنی ذات پر لیا۔"[2] اس واقعہ کی مزید شہادت کے طور پر سراج الدین طالب نے اپنی کتاب سیر عالم سے یہ اقتباس پیش کیا ہے: "در سنہ خمس و سبعین و مائۃ والف بہ ارادہ جہانبانی امیر الممالک داخل قلعہ بیدر شدہ دیں جا سنزوی گردانیدند۔"[3] ان شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۱۷۵ھ میں نظام علی خاں نے امور سلطنت بالکلیہ اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ اس تاریخی واقعہ سے قبل ہی بقول فتوت، صلابت جنگ کے عہد میں یہ تذکرہ پایۂ اختتام کو پہنچا لیکن ریکارڈ آفس کے مخطوطہ میں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مذکورہ بالا قطعہ تاریخ کے نیچے سرخی سے ہندسوں میں ۱۱۷۵ھ تحریر کیا گیا ہے۔ معلوم نہیں کاتب نے سہواً ایسی غلطی کی کہ قطعہ تاریخ سے برآمد ہونے والا سن تو نہیں بلکہ ایک دوسرا ہی سن

---

[1] فتوت، ریاض حسنی ص ۱ [2] سراج الدین طالب، نظام علی خاں جلد اول ص ۹ [3] سیر عالم، حدیقۃ العالم، مقالہ ثانی ص ۲۶۹

لکھ دیا۔

تذکرہ ریاض حسنی کے سلسلہ میں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس کا نام آیا ریاض حسنی ہے یا ریاض حسینی کیونکہ ہر دو کے املا میں کافی یکسانیت ہے۔ بعض لوگ اس کو ریاض حسینی کہتے اور لکھتے بھی ہیں۔ لیکن اس غلط فہمی کا ازالہ مصنف کے تحریر شدہ قطعہ تاریخ سے ہو جاتا ہے۔ مصرع ثانی و رابع کے آخری الفاظ "مدنی" اور "معنی" ہیں جس کا ہم قافیہ لفظ "حسنی" ہی ہو سکتا ہے نہ کہ "حسینی"۔ دوسرے، لفظ "حسینی" لانے سے مصرع بھی ناموزوں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس تذکرہ کا صحیح نام ریاض حسنی قرار پاتا ہے۔

فتوت کے اس تذکرے کے محرک خواجہ محمد اکرم تھے جنھیں شعر و ادب کا بڑا ذوق تھا۔ موصوف ہی نے اس تذکرے کی ترتیب کے وقت فراہمی مواد وغیرہ میں کافی مدد دی تھی۔ ان ہی کے توسط سے مولف تذکرہ نے عبدالولی عزلت کے کتب خانے سے استفادہ کیا تھا کیونکہ محمد اکرم اس کے منتظم تھے۔ اس بارے میں فتوت کے الفاظ یہ ہیں۔ "خواجہ محمد اکرم جوان قابل و سخن فہم است و با ایں احقر اختلاط دلی دارد۔ مزاج ایں وحشی را بایں توجہش دیا کثر دواوین متقدمین و متاخرین کہ بہ زبان ریختہ گوئی مشاق تمام دارند بمطالعہ می درآورد و تذکرہ شاعران ہندوستان دکن از کتاب خانہ عبدالولی عزلت کہ ایشان منتظم بجائی ایشانست بتقریب عاریت بدست آوردہ بمطالعہ فقیر حقیر ساخت۔"[1] اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عزلت اس تذکرے کی تالیف کے وقت اورنگ آباد میں موجود نہ تھے اور اپنے کتب خانے کا انتظام محمد اکرم کے سپرد کر گئے تھے۔

خصوصیات تذکرہ

اس تذکرے سے قبل کے اورنگ آبادی تذکرے مثلاً گلشن گفتار تحفۃ الشعرا میں بالترتیب تیس اور ساٹھ شعرا کا ذکر ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فتوت نے اپنے پیشرو تذکروں کے مقابلے میں تین گنا زیادہ شعرا کا اضافہ کیا ہے۔ اسی تناسب سے اورنگ آبادی شعرا بھی زیادہ بیان ہوئے ہیں جن کی تعداد کم و بیش ترپن (۵۳) ہے اور جن کے نام یہ ہیں:

(۱) اللہ یار، مرزا اللہ یار بیگ (۲) احسن، عشق، مرزا جمال اللہ (۳) ابدال، مرزا ابدال بیگ (۴) امین، محمد امین الدین (۵) امداد، غلام حسین (۶) ارشد، سید غلام علی (۷)، اعلیٰ (۸) ایجاد، نقد علی خاں (۱۰) آصف شاکر، آصف جاہ اول (۱۱) افتخار، بیکل، عبدالوہاب (۱۲) پروانہ، شاہ ضیاء الدین (۱۳) باقی، میر محمد رفیع (۱۴) حمید خواجہ خان (۱۵) خواجہ عبدالرحمان (۱۶) خاکی، شاہ خاکی (۱۷) داؤد، مرزا داؤد (۱۸) رضا، مرزا رضا بیگ (۱۹) رسا، مرزا خاں (۲۰) رکشن، محمد واصل بیگ (۲۱) ذکا، میر اولاد، محمد خاں بلگرامی (۲۲) زانی، بیر خاں (۲۳) سراج، شاہ سراج الدین (۲۴) صفت، مغل خاں (۲۵) صابر، مرزا صابر علی خاں (۲۶) ضیا، مرزا عطا (۲۷) طپش، محمد اکبر (۲۸) عزلت، شاہ عبدالولی (۲۹) عمر متعجل (۳۰) عاصی، نور محمد (۳۱) عاشق، عاشق علی خاں (۳۲) عاجز، عمادالدین خاں (۳۳) عشرت، ابوالبرکات (۳۴) عارف، محمد عارف (۳۵) فضلی، شاہ فضل اللہ (۳۶) فتوت، خواجہ عنایت اللہ خاں (۳۷) قاسم، شاہ قاسم (۳۸) قمر، مرزا رضا بیگ (۳۹) کہن، مرزا بدرالدین (۴۰) لسان، کلیم اللہ (۴۱) محو، عثمان خاں (۴۲) متین، میر مہدی (۴۳) مرزا محمد بیگ (۴۴) مہربان، عبدالقادر (۴۵) مروت (۴۶) مہر، محمد پناہ (۴۷) نثار، وزارت خاں (۴۸) ناصر، آفتاب۔ ناصر جنگ (۴۹) ندرت، میر نجف علی (۵۰) ولی، ولی محمد (۵۱) وقار، صارم، عبدالحی خاں صمصام الملک (۵۲) ہادی، محمد ہادی (۵۳) یکرنگ، شاہ یکرنگ۔

مندرجہ بالا فہرست میں برہان پور اور گجرات وغیرہ کے ایسے شعرا بھی شامل ہیں جو اورنگ آباد میں مقیم ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ باقی ایک تینتیس شعرا دہلی، گجرات اور حیدرآباد دکن کے باشندے ہیں۔

ٹھیک اسی سن میں شمالی ہند میں قائم چاندپوری کا تذکرہ مخزن نکات مکمل ہوا۔ لیکن اس میں دکنی شعرا کی اطلاعات کا ماخذ میر تقی میر کا تذکرہ ہے۔

فتوت نے اپنے تذکرہ میں طپش، مرزا محمد اکبر اور قمر، مرزا رضا بیگ کے دواوین کا بھی ذکر کیا ہے اور اول الذکر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فارسی و اردو کا صاحب دیوان شاعر تھا لیکن موخرالذکر قمر کے متعلق صرف اس کے صاحب دیوان ہونے کا ذکر کیا ہے۔

فتوت نے اس تذکرہ میں تمید، خواجہ خاں مؤلف گلشن گفتار کے

---

[1] فتوت، ریاض حسنی ص۲۱

متعلق دو نئی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ (۱) موسیقی میں مہارت (۲) عنفوانِ شباب میں رحلت۔

اس تذکرے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ایسے اورنگ آبادی شعرا کا ذکر کیا گیا ہے جو ان کے ہم وطن تذکروں مثلاً گلشن گفتار، تحفۃ الشعرا، محلِ عجائب اور چمنستان شعرا میں مندرج نہیں ہیں مثلاً (۱) اللہ یار مرزا اللہ یار بیگ (۲) خالی خاہ حاکی (۳) خواجہ عبد الرحمن (۴) مومی عثمان خاں وغیرہ
فتوت کے تذکرے میں "ولی" ولی محمد کو دکنی لکھا ہے۔

مہربان، عبد القادر کا ذکر گلشن گفتار اور تحفۃ الشعرا میں نہیں ہے۔ لیکن فتوت نے اپنے تذکرے میں ان کے چار مختلف تخلص مثلاً فارسی میں مہربان، ہندی میں سامی مرثیہ میں غمگین اور عربی میں ایثار کا ذکر کیا ہے۔ بعد میں شفیق نے چمنستان شعرا میں فتوت کی ان اطلاعات کو بنیاد مانا ہے لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔

فتوت کی عبارت میں کہیں انشا پردازانہ شان ملتی ہے تو کہیں ان کا اسلوب بیان نہایت سلیس اور سادہ بن جاتا ہے۔ تذکرہ دیکھنے سے اس میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ فتوت کو نثر نگاری پر کافی عبور حاصل تھا۔ آصف جاہ اول کے بارے میں عبارت آرائی ملاحظہ ہو۔

"عمدۂ امرائے عظیم الشان، قدوۂ خوانینِ بلند مکاں، رکنِ رکینِ سلطنت عمدۂ حمیدِ خلافت، صاحب سیف و القلم، رافع لوائے والعلم، وزیر صائب تدبیر سپہ سالار با فرہنگ، نظام الملک بہادر فتح جنگ، در سخن گوئی از بیدل استفادہ کردہ"[۱]

یکرنگ: شاہ یکرنگ کے سلسلے میں ان کی سادہ بیانی ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتی ہے "بود با شش نجستہ بنیاد است در سخن فرس فکرش برجستہ داشت در بدیہہ گفتن خود را یگانہ عصر می انگاشت، گاہی بہ تفنن طبع فکرش بطرف زبان دکن مائل می شود"[۲]

خامیاں

اس تذکرے میں مذکورۂ خوبیوں کے ساتھ خامی یہ ہے کہ دیباچہ بہت طویل ہے یعنی تیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں کئی غیر ضروری باتیں ہیں یا محض لفاظی۔ شعرا کے حالات نہایت اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں مثلاً امین، محمد امین الدین، گھمن، بدر الدین وغیرہ کے متعلق حالات۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے مزید حالات دستیاب نہ ہوئے ہوں لیکن بعض ایسے مشہور شعرا پر بھی تفصیل سے نہیں لکھا گیا ہے جن کے حالات فتوت کی دسترس میں تھے مثلاً سراج الدین سراج، خواجہ ابو البرکات خاں عشرت اور خود مولف تذکرہ ریاض حسنی فتوت خواجہ عنایت اللہ خاں۔

جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا گیا ہے مولف نے اس تذکرہ کی بنیاد صرف اردو شاعری قرار دی ہے اور اسی پر اس تالیف کی عمارت کھڑی ہے۔ اس سلسلے میں مولف نے یہ مبالغہ آمیز بیان دیا ہے کہ ان کا تذکرہ ہندی گو یعنی اردو گو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: "ایجاد تذکرہ ہندی خالی از ندرت نیست"۔[۱] فتوت کا جملہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ انھیں خواجہ خاں حمید کے اردو گو شعرا کے تذکرہ کا علم نہ تھا جو ان کے تذکرے سے تین سال قبل مکمل ہوا تھا۔ بہر حال یہ کہا جا سکتا ہے کہ فتوت نے لاعلمی کی وجہ سے یہ غلط باور کر لیا تھا کہ ان کا تذکرہ اردو گو شعرا کا پہلا تذکرہ ہے لیکن حقیقت یہ کہتی ہے کہ اس سلسلہ میں اولیت کا شرف گلشن گفتار کو حاصل ہے۔

مولف تذکرہ، فتوت کے آبا و اجداد بدخشاں کے باشندے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد موضع اولکھ میں جو (چاندہ کے قریب ہے) بود و باش اختیار کی۔ یہاں ان کے بزرگ کسی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔ ان کے دادا خواجہ آفتاب دکن یعنی اورنگ آباد آئے اور بعض رشتہ داروں کی اقامت کی وجہ سے یہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ اس بارے میں اپنے تذکرے کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "مولد اصلی بزرگان پدری بدخشاں جنت نشاں است۔ لیکن بزرگان سجادہ نشین است در یکے موضع اولکھ (چاندہ) اقامت کرد۔ جد بزرگوار حضرت خواجہ آفتاب بہ سبب بعضے عزیزان کہ در دکن بود، اشتیاق دیدار ایشاں تقریب تشریف ارزانی ایشاں کرد۔ ازیں سبب استقرار توطن در دکن شد"[۲] فتوت کے

---

[۱] فتوت ریاض حسنی صفحہ ۵
[۲] فتوت، ریاض حسنی صفحہ ۲۲

---

[۱] فتوت ریاض حسنی صفحہ ۲

والد خواجہ عبدالرحمٰن اعتقاد الدولہ لشکر جنگ تھے[۱] سرکار آصفیہ کی سلک ملازمت میں داخل ہو کر اعلیٰ مراتب اور خطاب اعتقاد الدولہ لشکر جنگ سے سرفراز ہوئے اور جاگیر و منصب سے ممتاز کئے گئے۔ انھیں موسیقی کا بہت شوق تھا۔ کبھی کبھی فارسی شعر بھی کہا کرتے تھے۔ ان کا انتقال سنہ ۱۱۶۰ھ میں ہوا۔ اس وقت فتوت کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی[۲] فتوت کے خاندانی افراد میں ان کے دو چچازاد بھائیوں کا پتہ چلا ہے۔ ایک تو موسیٰ خاں ہیں جن کے متعلق انھوں نے دیباچہ میں عم زادہ حقیقی لکھا ہے[۳] دوسرے ظہیرالدین خاں رکارڈ آفس حیدرآباد دکن میں لشکر جنگ کے ساتھ ان کے بھتیجے ظہیرالدین کے منصب کا رکارڈ درج ہے۔ الفاظ یہ ہیں[۴] ہزار صدی ذات و خطاب خانی"

فتوت کی عمر سنہ ۱۱۶۰ھ میں زیادہ نہ تھی۔ اس وقت اندازاً ان کا سن بائیس اور پچیس سال کے درمیان ہوگا۔ اس لحاظ سے ان کی پیدائش کا سال سنہ ۱۱۳۵ھ سے سنہ ۱۱۴۰ھ کا درمیانی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ صیغہ منصب میں ملازم تھے اور فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے[۵] ریکارڈ آفس حیدرآباد دکن میں جہاں خطابات اور جاگیرات کے ریکارڈ محفوظ ہیں تلاش کرنے پر معلوم ہوا کہ انھیں دو ہزاری ذات اور خطاب خانی عطا ہوا تھا۔ چونکہ یہ منصب آبائی تھا اور وراثتاً منتقل ہوا تھا اس لئے ان کے والد لشکر جنگ کی وفات (سنہ ۱۱۶۰ھ) کے بعد ہی انھیں ملا ہوگا۔

نثر کے ساتھ فتوت کو نظم پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے اردو کلام کی اصلاح شاہ سراج سے لی تھی[۶] تذکرے میں ردیف "ت" کے تحت اپنے مختصر حالات کے ساتھ انھوں نے اپنے اردو اشعار بھی لکھے ہیں جن کی تعداد تقریباً بیاسی ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کے اشعار میں نزاکت خیال کے ساتھ ندرت بیان کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ حالانکہ مضامین پرانے ہی باندھے ہیں لیکن انداز بیان کی وجہ سے ان میں کافی کشش پیدا ہو گئی ہے۔ اپنے تخیلات کو عمدہ طریقہ سے اشعار کے روپ میں ڈھال سکتے تھے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

تجھ تبسم کا اگر غنچۂ خنداں بھولے قتل ہونے سے شہید حق کے گلستاں بھولے

کیا رہا اے دل دوانے دشت میں جانے کا لطف

لے لیا مجنوں نے اپنے ساتھ ویرانے کا لطف

لائے گی اب کے سال جھڑی مینہ کی رات دن

بادل کے ساتھ ملنے مری چشم تر گئی

مآل کار فتوت مجھے نہیں معلوم مری یہ خاک پریشان دیکھئے کیا ہو

فتوت کی رحلت سنہ ۱۲۲۳ھ میں ہوئی[۸] اندازاً ان کی پیدائش کے تعین کئے ہوئے سال سے وفات کے وقت ان کی عمر کم و بیش اسی یا تراسی سال تھی۔

"بیرونی حملے کا مقابلہ کرنا اور اپنی آزادی کا تحفظ کرنا اگرچہ ہر ملک کا اوّلیں فریضہ ہے لیکن وہ اپنی اقتصادی ترقی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ملک کی اقتصادی ترقی کی رفتار کو کم کر کے بیرونی خطرے کا مقابلہ کرنا معقول بات نہیں ہے۔ منصوبے کی اسکیموں کی رفتار سست کر دینے کے معنی یہ ہیں کہ قوم کو طاقتور بنانے میں تاخیر کر دی جائے۔" وزیر اعظم نہرو

---

۱ فتوت دیباچہ حسنی صہ ۔ تمنا، گل عجائب صہ ۱۲۰

۲ مقالات ہاشمی صہ ۲۰۳

۳ فتوت دیباچہ حسنی صہ ۲۲

۴ عبدالجبار خاں ملکاپوری محبوب الزمن جلد دوم صہ ۹

۵ فتوت، ریاض حسنی صہ ۱۶۵ (ب)، تمنا: گل عجائب صہ ۷

۶ فتوت ریاض حسنی صہ ۱۶۵

۷ مقالات ہاشمی صہ ۲۰۳



چینی جنگ بندی بے نقاب

کستوری لال اگروال

چین کے موجودہ حکمراں جو دوستی کی آڑ میں ہندوستان کے ایک بڑے علاقہ کو ہتھیا چکے ہیں اور یہاں کے امن پسند عوام کو ایک انتہائی شرمناک جنگ میں مبتلا کر چکے ہیں آج دنیا خاص طور سے ایشیا و افریقہ کے نو آزاد ملکوں کو یہ دھوکا دینا چاہتے ہیں کہ وہ سرحدی جھگڑا کو امن و آشتی سے طے کرنے پر تیار ہیں مگر ہندوستان مانتا ہی نہیں اور امریکہ و برطانیہ سے ہتھیاروں کی مدد لے کر جنگی تیاریوں میں لگا ہوا ہے۔ پیکنگ ریڈیو سے آج کل لگاتار یہی راگ لاپا جا رہا ہے اور چینی کمیونسٹ پارٹی اور حکومت کا خاص اخبار پیپلز ڈیلی آئے دن حکومت ہند کو قدامت پسند، سامراجیت پسند اور اشتراکیت دشمن وغیرہ کہہ کر اس ناپاک کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ہندوستان کو بدنام کرے اور الٹا الزام لگائے کہ ہندوستان چینی علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔

جھوٹے پرچار کا یہ ہتھکنڈا ویسا ہی ہے جو نازی جرمنی میں ڈاکٹر گوبلس نے اختیار کیا تھا۔ اس کا مقولہ تھا کہ جھوٹ بولنا ہو تو اتنا بڑھا چڑھا کر بولو کہ مبالغہ کا عنصر نکال دینے کے بعد بھی وہ دنیا کو بے وقوف بنانے کے لیے کافی ہو۔ ماؤزے تنگ کے پرچار کرنے والوں کی آواز میں آج گوبلس کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ لیکن آج کی دنیا دوسری عالمگیر جنگ کی دنیا نہیں ہے، وہ دوسری جنگ عظیم کی مصیبتیں برداشت کر چکی ہے اور اس طرح کے گمراہ کن پرچار کے چکر میں نہ پڑ کر اس تباہ کن جنگ کو دور ہی رکھنا چاہتی ہے جس کے لیے فضا تیار کرنے میں ماؤ چاؤ لاؤ کا گٹھ بندھن ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔

یہاں کچھ مستند اور مصدقہ اعداد و شمار پیش کیے جا رہے ہیں جو چینی پرچار کا پردہ فاش کر دیتے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کو یہ بتا دیتے ہیں کہ دراصل توسیع پسندی کی پالیسی کس نے اپنائی ہے۔ بھارت نے یا چین نے۔

دنیا سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ہندوستان نے آزادی حاصل کرنے کے بعد ملک کی غریبی اور بے کاری دور کرنے کے لیے پنج سالہ منصوبے چلا کر اقتصادی آزادی حاصل کرنے کا تہیہ کیا اور اس کی تمام تر کوششیں اسی مقصد کے حصول کے لیے آج تک جاری رہیں۔ آزاد ہندوستان نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ نہ وہ کسی ملک کے معاملہ میں دخل دینا چاہتا ہے اور نہ کسی کی زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ پندرہ برسوں میں ہندوستانی فوج پر اتنا ہی خرچ کیا گیا جتنا ملک کی اندرونی حفاظت کے لیے ضروری تھا۔

اس کے برعکس چین میں فوج پر شروع ہی سے بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جا رہی ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں چین کے فوجی اخراجات ۲۸۲٫۷ کروڑ یوان (ایک یوان = ۱٫۹۳ روپیہ) تھے تو ۱۹۶۰ء میں ۵۸۰ کروڑ یوان ہو گئے بلکہ بیچ میں یعنی ۱۹۵۵ء میں چینی فوج کے اخراجات ۶۵۰ کروڑ یوان یا ۱۳۰۰ کروڑ روپیہ تک پہنچ گئے تھے۔ اس طرح جہاں بھارت نے پورے پانچ سال (۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۶ء) میں ۹۵۰٫۶۷ کروڑ

روپیہ اپنے دفاع پر خرچ کئے، وہاں چین نے صرف ایک ہی سال ۱۹۵۹ء میں ۱۳۰۰ کرور روپیے اپنی اسلحہ بندی پر خرچ کر ڈالے۔ دوسرے لفظوں میں اس حقیقت کو یوں سمجھیے کہ چین نے اپنے ۱۹۵۳-۵۷ء کے پہلے پنجسالہ منصوبہ میں فوجی تیاری پر ۲۹۱۶٫۴ کرور یوان یعنی تقریباً ۵۰۰۰ کرور روپیہ خرچ کیا جب کہ بھارت نے دوسرے پنجسالہ منصوبہ میں ۴۶۰۰ کرور روپیے صنعتی ترقی پر خرچ کیے۔

ہندوستان نے ۱۹۵۱-۶۱ء کے دس سال میں کسی بھی سال اپنے دفاع پر ۲۵۷ کرور روپیہ سے زیادہ نہیں خرچ کیا جو اس کی قومی آمدنی کا صرف ۲ فی صدی ہو۔ چین اپنی قومی آمدنی کا ۶ سے ۸ فی صدی

> "ہندوستان کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ ایک جمہوری نظام حکومت کے اندر رہ کر اپنی ترقی کی کوشش کی جائے، اس لیے نہیں کہ ہم کو جمہوریت پسند ہے بلکہ اس لیے کہ جمہوریت ہی وہ چیز ہے جو ہندوستان میں ٹھیک طرح سے کام کر سکتی ہے۔ کوئی دوسرا نظام نقصان رساں ثابت ہوگا۔" —— وزیر اعظم نہرو

فوجی تیاری پر خرچ کر رہا ہے۔ حالاں کہ اس کی فی کس آمدنی صرف ۵۰ یوان یا تقریباً ۷۰ روپیے ہے جو یقیناً ہمارے مقابلے میں کم ہے۔

ان چند ٹھوس حقیقتوں کے پیش نظر کسی بھی سمجھدار انسان کو یہ دھوکا نہیں دیا جا سکتا کہ جنگ پسندی کی پالیسی ہندوستان کی ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ چین تخریب کے راستہ پر چل رہا ہے اور ہندوستان تعمیر کے راستے پر۔ اب یہ حقیقت بھی دنیا سے چھپی نہیں رہ گئی ہے کہ چین کی کمیونسٹ حکومت نے پچھلے دس بارہ سال میں فوج اور ہتھیاروں پر اتنی کثیر رقم خرچ کر دی ہے کہ چین کی اقتصادی حالت خراب ہو گئی۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں اور قحط کی سی حالت برسوں طاری رہتی ہے ابھی

حال کی بات ہے جب چینی فوجیں ہمالیہ کی پہاڑیوں پر ادھم مچا رہی تھیں کینٹن میں ۱۰ ہزار کسانوں نے بھوک مارچ کیا اور کمیونسٹوں نے روٹی مانگنے والے ان بے قصور لوگوں کو جیل خانوں میں بند کر دیا۔ ایسے اتفاق وہاں آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن چینی حکمرانوں نے اپنے چاروں طرف جو فولادی دیوار کھڑی کر رکھی ہے اس کے نتیجہ میں دنیا کے کانوں تک یہ چیزیں نہیں پہنچ پاتی ہیں۔ زراعت کی طرح صنعت میں بھی چین کی چھلانگیں لگانے کی پالیسی ناکام رہی۔ کبھی چینی عوام کو کھیتوں سے اکھاڑ کر کارخانوں میں بھیجا جاتا ہے تو کبھی انھیں شہروں سے نکال کر گاؤں کی طرف بھگایا جاتا ہے۔

گھریلو مورچہ کی یہ پراگندہ خیالی اتنی بڑھی کہ چینی حکمرانوں نے ہمالیہ کے پہاڑوں پر سر دے مارا لیکن ہندوستان اس جنون کی تہہ کو پہنچ چکا ہے وہ جانتا ہے کہ چینی کمیونسٹ ہمالیہ کے سنگلاخ برفیلے اور ویران علاقوں میں یہ ناپاک مقصد لے کر آئے ہیں کہ وہ برہم پتر کی گھاٹی سے ہوتے ہوئے خلیج بنگال میں اتریں اور وہاں سے جنوب مشرقی ایشیا کے ان تمام ملکوں کو اپنے خونی پنجہ کی گرفت میں لے لیں جہاں چینی آبادی اور کمیونسٹ پارٹیاں چین کی فوجوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے پہلے ہی سے تیار بیٹھی ہیں۔ چناں چہ ہندوستان کے بیدار عوام چین کے ناپاک ارادوں کو ہمالیہ کے تاریک غاروں میں ہمیشہ کے لیے دفن کرنے کی ٹھان چکے ہیں۔



افسانہ

کیپٹن پرساد

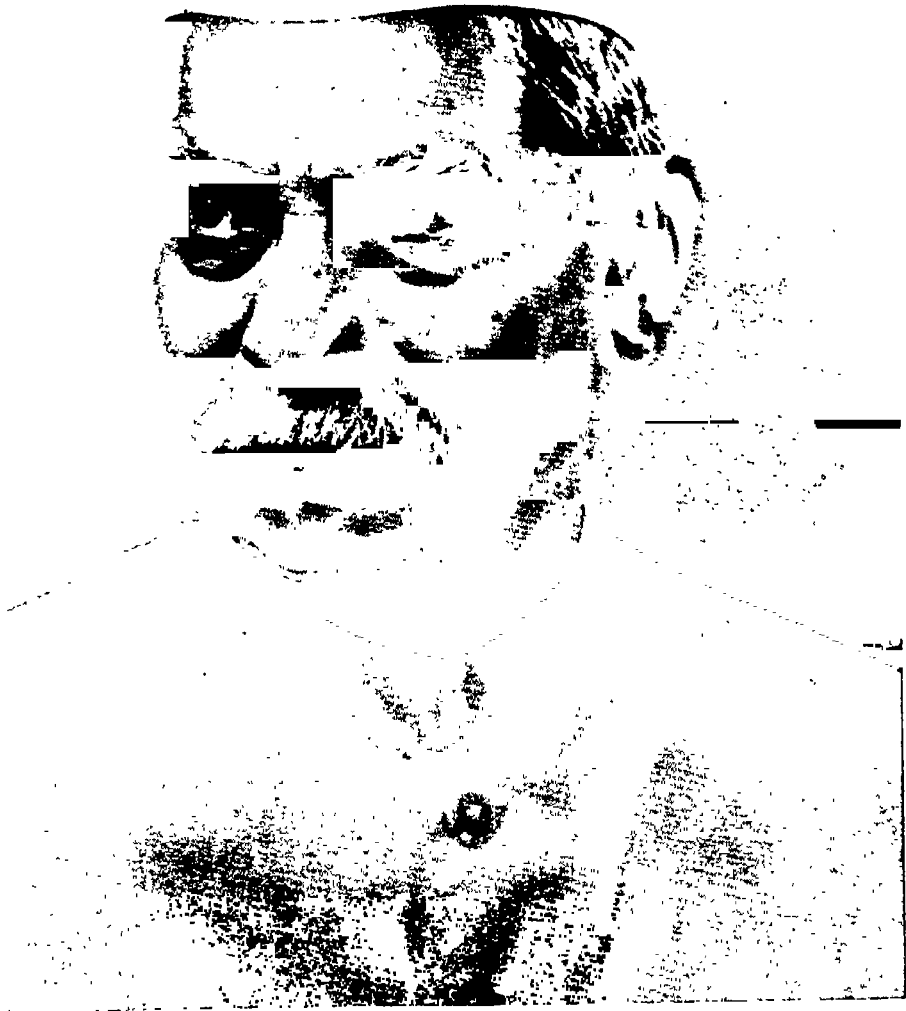
ستیش بترا

کلب میں معمول کی طرح رونق تھی۔ ہلکا ہلکا آرکسٹرا بج رہا تھا جس کی دھن میں چند جوڑے ہال کی ڈھکی ہوئی خوابیدہ روشنیوں میں ناچ رہے تھے۔ میں، مہندر، چودھری اور مول چندانی، کیپٹن پرساد کے انتظار میں بار کے ایک کونے میں اپنی مخصوص میز کے گرد بیٹھے تھے۔ کیپٹن پرساد ہماری اس چھوٹی سی محفل کی جان تھا۔ فقرہ بازی ہو رہی تھی اور ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہماری میز پر سے قہقہے بلند ہوتے۔ لیکن یہ قہقہے کیپٹن پرساد کے بغیر کھوکھلے معلوم ہو رہے تھے جیسے ان میں برجستگی اور بے ساختہ پن نہ ہو، وہ رونق اور بھرپور مزاح نہ ہو جو ایسے قہقہوں کی جان ہوتا ہے۔

اور پھر دروازہ کھلا اور کیپٹن پرساد داخل ہوا۔ ہم اسے دیکھتے ہی ہیلو پرساد کہتے چلا اٹھے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اس کے چہرے پر محض ایک مریل سی مسکراہٹ اٹھی اور فوراً دم توڑ گئی۔ وہ ہمارے ہیلو کے جواب میں ایک بے جان سا ہاتھ ہلاتا ہماری میز کے گرد خالی پڑی ہوئی پانچویں کرسی میں آ کر دھنس گیا۔ ہم سب اس بات کے منتظر تھے کہ اس کے آنے سے محفل رونق پر آئے گی لیکن کیپٹن پرساد بالکل خاموش تھا۔

کیپٹن پرساد کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ وہ بھرتی کا مقامی افسر تھا۔ اس کی شادی ایک بہت بڑے گھر میں ہوئی تھی۔ سسر بڑے با اثر آدمی تھے اور ان کے ایک ہی لڑکی تھی۔ اس کے لمبے تکونے چہرے پر نہایت گھنی رانا پرتاپ شاہی مونچھیں تھیں جو اس کی ساری شخصیت پر چھائی ہوئی تھیں۔ اگرچہ وہ فوجی افسر تھا لیکن وہ ہمیشہ غیر فوجی لوگوں میں ہی اٹھنا بیٹھنا زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا "دن بھر تو فوجی افسروں سے دفتر میں واسطہ پڑتا ہی رہ، یہ کیا ضروری ہے کہ شام میں بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ گزاری جائے" میرا خیال تھا کہ چونکہ کلب کے اکثر افسر اس سے بلند عہدہ کے ہوتے سے ملنے اور ان کے ساتھ بیٹھنے میں ایک کمتری کا احساس ہوتا تھا۔ شاید وہ ان سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا۔

کیپٹن پرساد کو شاعری کا بھی بہت شوق تھا۔ اگرچہ وہ خود شعر کہتا تھا لیکن اسے اردو اور ہندی کے بڑے بڑے شعرا اور کویوں کا یاد تھا اور وہ کبھی کوئی غزل گا کر اور کبھی موقع کے مطابق شعر پڑھ کر ہم دھاک جمایا کرتا۔ اگرچہ ہم میں سے کسی کو بھی اس فن کی سوجھ بوجھ ان اشعار کے معنی بھی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ لیکن مہندر بڑی فراخدلی سے چلایا کرتا۔ ایسے موقعوں پر مول چندانی، چودھری اور میں بھی محفل جمانے کی خاطر "واہ واہ" میں شامل ہو جاتے۔ دراصل مہندر نے صدر میں ایک خوبصورت اسٹور کھولا تھا اور وہ کیپٹن پرساد کی دوستی کا چاہتا تھا لہٰذا اسے ہر حال میں کیپٹن پرساد کی خوشنودی حاصل کرنا۔ ایک مشہور دوائیاں بنانے والی فرم کا نمائندہ تھا اور چودھری شہر کیمسٹ تھا اور کیپٹن پرساد کا ایک بڑا گہرا دوست ملٹری اسپتالوں کے خریدنے والے دفتر میں کسی نمایاں جگہ پر فائز تھا اور میں ان سب لوگ پہنچ چکا تھا۔ اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ ہمارے تعلقات ایک سے کس قدر گہرے تھے! لیکن ان سب سے الگ یہ کیپٹن پرساد کی زنا



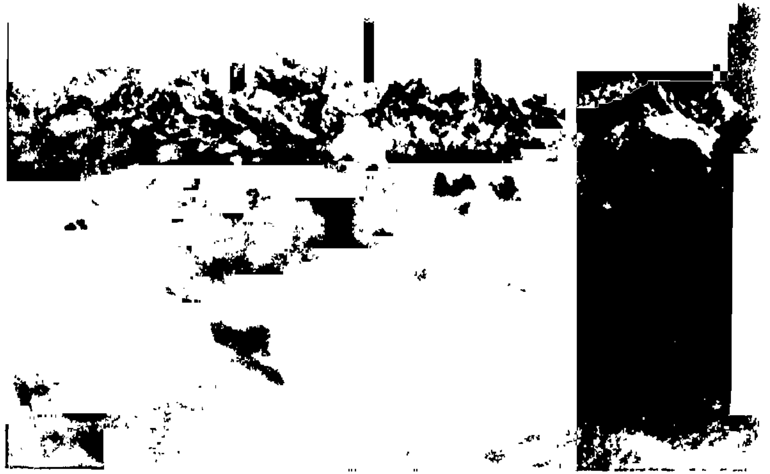
ڈاکٹر راجندر پرشاد

ایک مخلص محبِ وطن —— ایک زبردست سیاست داں —— ایک عظیم انسان اور جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر

ولادت: ۳ر دسمبر ۱۸۸۴ء —— وفات: ۲۸ر فروری ۱۹۶۳ء

توانگ (نیفا) میں:

چینی حملہ آوروں کے
باشندے اپنے گھروں
نے اپنے گھر چھوڑ دیے
ماتحتی میں رہیں یا ان
ہندوستان کا جھنڈا
سے وہاں لوٹے ہیں کہ
نہ رکھنے پائے گا۔



ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں، جن کے دامن میں توانگ واقع ہے





توانگی اپنے اپنے کاموں میں پھر لگ گئے



... جانے کے بعد

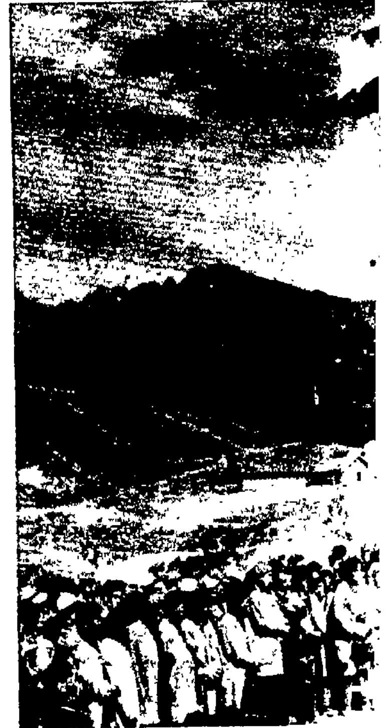
... (نیفا) کے
... نے جب حملہ کیا تو انھوں
... آوروں کی
... توانگ میں
... اس عزم
... سرزمین پر قدم

توانگ کے رہنے والے جب اپنے گھروں کو واپس آئے تو ان کا خیر مقدم کیا گیا۔

... جا رہا ہے

توانگ کے رہنے والوں نے یہ عزم کر لیا ہے کہ دشمن اب ان کی
سرزمین پر قدم نہ رکھ سکے گا







وزیر اعظم نہرو جوانوں کے درمیان

تھی جو ہم سب کو ایک دھاگے میں پروئے ہوئے تھی۔

کیپٹن پرساد ہمیں اکثر فوجی مہموں کے قصے سنایا کرتا۔ وہ کوریا، نیفا اور کشمیر کے محاذوں پر لڑ چکا تھا اور حال ہی میں غازہ سے لوٹا تھا جہاں وہ ہندوستان سے بھیجی گئی یو۔ این۔ او کی حفاظتی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس کی باتوں میں بلے صدرس تھا اور وہ واقعات کو اس تفصیل سے بیان کرتا کہ سننے والے کو گمان ہوتا گویا وہ بھی اس کے دستے کا کوئی فرد ہو جس نے جنگلوں میں پہاڑوں اور صحراؤں میں اس کے ہمراہ دشمن سے قدم قدم پر جنگ کی ہو۔

کیپٹن پرساد کے بیان کئے ہوئے وہ قصے تو خاص کر بڑے دل چسپ اور رنگین ہوتے جن میں رنگون، سنگاپور، ٹوکیو اور قاہرہ کے نائٹ کلبوں کا ذکر ہوتا۔ ان قصوں کو سناتے وقت کیپٹن پرساد کی آنکھوں میں ایک چمک آجاتی اور موہچندانی، مہندر، چودھری سب اپنی اپنی کرسیاں اور قریب گھسیٹ کر، اپنی اپنی سانس روکے ہوئے ان قصوں کو نہایت دل چسپی سے سنتے۔ اس وقت مول چندانی بھول جاتا کہ گھر میں ایک موٹی سی عورت جو اس کی بیوی تھی، گھڑی پر آنکھیں جمائے کسی گھریلو ہتھیار سے مسلح اس کی آمد کی منتظر ہوگی۔ مہندر کو جو ابھی کنوارا تھا نہایت شدت سے اس بات کا احساس ہوتا کہ ایسے نائٹ کلب اپنے شہر میں کیوں نہ ہوئے اور مجھے چودھری کو جس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمنے لگتیں بظاہر ایسے قصوں سے کوفت ہونے لگتی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ وہی سب سے زیادہ توجہ سے ان قصوں کو سنا کرتا۔ ہر ایسا قصہ ختم ہونے پر وہ اپنی ران پر یا پھر میز پر زور سے ہاتھ مارتا اور کہتا "او کپتان کے بچے!" ان الفاظ سے یہ فیصلہ کرنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا کہ یہ الفاظ حسد سے بھرے تھے یا حقارت سے!

عموماً اس میز پر کلب کے بیرے بھی بہت دل چسپی لیتے اور سرگوشی میں ایک عجیب پھرتی دکھلاتے۔ اگرچہ ان میں سے کوئی بھی ظاہری طور پر سامنے کھڑا نہ رہتا لیکن ذرا سی آواز دینے پر بھی نہ معلوم کن پردوں کے پیچھے کوئی چھپا ہوا بیرا آرڈر لینے کے لئے فوراً نمودار ہو جاتا۔ اس کی شاید ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم لوگ ٹپ زیادہ دیتے تھے اور یا پھر کیپٹن پرساد کے رونگٹے کھڑے کرنے والی مہموں کی باتیں!

کیپٹن پرساد اپنے ہی کسی خیال میں غرق، سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور ہم سب حیرت سے اس کی طرف تک رہے تھے۔

"کیوں پرساد، خیریت تو ہے!" میں نے پوچھا اور اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ دیکھ کر ہم سب کو بڑی تسلی ہوئی۔

"بیرا!" چودھری نے آواز دی۔ "پرساد صاحب کے لیے ڈبل وہسکی!"

تھوڑی دیر میں بیرا نے گلاس سامنے لا کر رکھ دیا۔

"چیرز"! مہندر نے کہا اور ہم سب نے اپنے اپنے گلاس اٹھائے۔ کیپٹن پرساد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ہم سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھا لیا اور پھر "چیرز" کہتے ہوئے جلدی سے ایک گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے گلاس میز پر واپس رکھ دیا۔

"کیوں کیپٹن صاحب کیا بات ہے۔ آج آپ موڈ میں نہیں!" موہچندانی نے پوچھا۔ پرساد ابھی تک خاموش تھا۔

"کیپٹن صاحب کیا قصہ سنایا تھا آپ نے اس روز 'سیونارا' کا!" مہندر نے کسی جاپانی دوشیزہ کی مہین آواز میں ہاتھ کی ایک دلفریب جنبش سے نقل اتارتے ہوئے کہا۔ سب ہنس دیے۔

"ارے جانے دے! جانے دے! مجھے یہ جاپانی برمی اور چینی لڑکیاں لے ڈوبیں گی!" چودھری نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

"مہندر تو ڈوبنے کے لئے تیار رہتا ہے!" مول چندانی بول اٹھا۔ فضا میں قہقہے بکھر گئے۔ کیپٹن پرساد اب بھی خاموش تھا۔

"کیپٹن صاحب! آپ اس روز اس مصری رقاصہ کا قصہ سنانے کے لئے کہہ رہے تھے! کیا نام تھا اس کا؟" مول چندانی نے فرمائش کے انداز میں کہا۔

"ارے بھائی تم لوگ تو ہر وقت لڑکیوں کے چکر میں ہی رہتے ہو!" چودھری کے لہجہ میں ناپسندیدگی کا اظہار تھا لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی کرسی قصہ سننے کی غرض سے کیپٹن پرساد کے اور قریب سرکا لی تھی۔

"اب یاد آیا اس مصری لڑکی کا نام رخسانہ!" مہندر بے اختیار بول اٹھا: "رخسانہ ہی تھی نا کیپٹن صاحب جو نیل کے کنارے کسی ریسٹوران میں ملی تھی آپ کو! جس نے ریسٹوران کی نیلگوں روشنی میں آپ کو کسی بیرے کے ہاتھ خط بھجوا کر خود آپ کو اپنی میز پر بلوایا تھا!"

مول چندانی اشتیاق کے مارے میز پر جھک گیا۔ میں اپنا گلاس اٹھائے کیپٹن پرساد کی طرف نہایت دل چسپی سے دیکھ رہا تھا اور چودھری

کے کان کیپٹن کے لب کھلنے کے لئے منتظر تھے ۔

"پھر کیا ہوا تھا کیپٹن پرساد ؟" مہندر نے پوچھا: "اس نے آپ سے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں کہا : کیپٹن پرساد نے ایک ایک لفظ علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہوئے کہا ۔ اور پھر وہ خاموش ہو گیا گویا اسے مہندر کا سوال نہایت ناگوار گزرا ہو ۔ ہم سب حیرت سے اس کی طرف تک رہے تھے ۔

کیپٹن پرساد نے میز پر سے گلاس اٹھا لیا اور اس سے کھیلنے لگا گویا وہ کوئی اہم بات کہنے والا ہو ۔

"دوستو ۔ آج مجھے ایک اعتراف کرنا ہے !" ہماری دلچسپی بڑھنے لگی ۔ شاید یہ الفاظ بھی کسی انوکھی کہانی کا آغاز تھے !

"میں کبھی قاہرہ نہیں گیا اور نہ میں نے آج تک دریائے نیل دیکھا ہے میں نہ کبھی رنگون گیا ہوں اور نہ کبھی سنگا پور ۔ نہ میں کسی مصری رقاصہ رخسانہ کو جانتا ہوں نہ ایرانی دوشیزہ خانم کو' نہ میں رنگون کی یا ۔ ماسے کبھی ملا ہوں اور نہ سنگا پور کی می می چیانگ سے میرا کوئی واسطہ رہا ہے ۔ میں آپ کو آج تک فریب دیتا رہا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ میں نے اپنے آپ کو فریب کے ملمع شدہ پردے میں چھپائے رکھا ہے ! اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کو ہونٹوں سے لگا لیا اور اسے ایک ہی گھونٹ میں خالی کر کے میز پر رکھ دیا ۔

"آپ یہ بھی سن کر حیران ہوں گے کہ میں نے کشمیر کی کسی لڑائی میں بھی حصہ نہیں لیا حالانکہ میں آپ کو اس لڑائی کے کئی قصے سُنا چکا ہوں ۔ میں اُس وقت مہو چھاؤنی میں محاذ سے سیکڑوں میل دور ایک فوجی کورس کر رہا تھا ۔ نہ میں نے افریقہ کی لڑائی میں کوئی حصہ لیا ہے اور نہ میں نے کوریا میں کوئی جنگ لڑی ہے ۔ میں کشمیر، نیفا اور کانگو ضرور گیا ہوں لیکن صرف اس وقت جب جنگ ختم ہو چکی تھی ۔" اس کے ان الفاظ میں سخت طنز تھا ۔

بیرا نے خالی گلاس اٹھا لئے ۔

"میں آج تک کسی جنگی مہم میں شریک نہیں ہوا ہوں ۔ نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ بھوک، پیاس، سردی، گرمی کیا ہیں اور جان جوکھوں میں ڈالنا کسے کہتے ہیں ! میرا تجربہ صرف ان فوجی مشقوں تک محدود ہے جو میں نے میدان جنگ سے سیکڑوں ہزاروں میل دور کسی کیمپ میں محض چند دنوں کے لئے حاصل کیا ہے !"

"لیکن پرسوں ایک واقعہ نے مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہے ۔ پرسوں دوپہر کو میں دفتر کے سامنے میدان میں کھڑا نئے بھرتی ہونے والے جوانوں کو دیکھ رہا تھا ۔ وہ سب نکر یا انڈر ویر اور بنیان پہنے فوجی معائنہ کے لئے کھڑے تھے ۔ بہت سے دوسرے نوجوان میدان کے باہر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے ۔ آپ نہیں جانتے کہ بھرتی ہوتے وقت کسی بھی نوجوان کو اپنا نام لکھوانے کے لئے کتنا پکا ارادہ کرنا پڑتا ہے ۔ میں نے کئی بار ان نوجوانوں کو دیکھا ہے جو بڑا حوصلہ کر کے بھرتی کے دفتر پہنچ تو گئے لیکن کچھ دیر میدان کے قدم وہیں ڈگمگانے لگتے ہیں اور وہ چپ چاپ وہاں سے کھسک جاتے ہیں ۔"

ہم کیپٹن پرساد کی باتوں کو نہایت دلچسپی سے سُن رہے تھے "میں رنگروٹوں کی لائنوں میں گشت لگا رہا تھا کہ یکایک میری نگاہ دو بچوں پر پڑی جو لائن میں سب سے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے تھے ۔ ان دونوں بچوں کے کندھوں پہ سے اسکول کے جزدان لٹک رہے تھے ۔ بڑا لڑکا شکل سے نو دس برس کا ہوگا اور چھوٹا سات آٹھ سال کا ۔ دونوں بھائی معلوم ہوتے تھے اور وہ کسی بات کے لئے دبی زبان سے جھگڑا کر رہے تھے ۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے دفتر کے پاس ایک اسکول ہے اور اس سے کبھی کبھار بچے بھرتی کا تماشا دیکھنے چلے آتے ہیں لیکن میں نے آج تک کسی کو اس بیباکی سے میدان کے اندر رنگروٹوں کی لائن میں گھستے نہیں دیکھا تھا ۔ میں ان کے پاس گیا ۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر چپ چاپ بالکل فوجی انداز میں سادھان کھڑے ہو گئے ۔ میں نے انھیں جب میدان سے باہر کھڑا ہو کر تماشا دیکھنے کے لئے کہا تو بڑے لڑکے نے نہایت اکڑ کر ایک عجب شان سے جواب دیا "نو سر ۔ ہم بھرتی ہونے آئے ہیں !" یقین مانئے میں ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا ! کیا عزم تھا ان کے چہروں پر ۔ چھوٹا لڑکا بولا: "ہم بھی بھرتی ہوں گے ! ہمارے پتا جی بھی مورچہ پر چینیوں سے لڑنے گئے ہیں !" آفرین ہے ان ماں باپ کو جن کے وہ سپوت ہیں ! میں نے اسی طرح رعب دار آواز میں ان کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا "تم ۔ تم فوج میں کیا کرو گے ؟ تم دونوں تو ابھی بندوق بھی نہیں اٹھا سکتے ۔ میری بات سُن کر بڑا لڑکا تو کچھ سٹپٹا گیا لیکن چھوٹا میری آنکھوں میں آنکھیں

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۵ پر)

کشمیری زبان اور ادب

ایک سرسری جائزہ

موتی لال ساقی

کشمیری زبان کی ابتدا کب ہوئی اور اس کے وجود میں آنے کے کیا اسباب تھے، اس کا ماخذ کیا ہے۔ یہ سب باتیں ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ اب تک اس بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کا بیشتر حصہ محض قیاس آرائیوں پر مبنی ہے۔ عبدالاحد آزاد مرحوم (۱۹۰۴ء - ۱۹۴۸ء) نے تواریخ شعراء کشمیر[1] ضرور مرتب کی مگر زبان کی ابتدا، اس کی ساخت، قواعد اور صوتیات کے بارے میں انھوں نے بنیادی تک نہیں دی۔ کشمیری زبان بولنے والوں کی تعداد کے متعلق بھی ابھی تک یہ تحقیق نہیں کی گئی کہ ان کی تعداد کتنی ہے۔ آزاد مرحوم نے نہ جانے کس بنیاد پر کشمیری بولنے والوں کی تعداد ڈیڑھ کروڑ بتائی ہے حالانکہ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق کشمیری بولنے والوں کی تعداد چوبیس لاکھ سے تجاوز نہیں کرتی۔

کشمیری زبان کی ابتدا

کشمیری زبان کی ابتدا کے متعلق دو باتیں کہی جاتی ہیں:۔
(۱) کشمیری سنسکرت سے نکلی ہے۔ (۲) کشمیری عبرانی سے نکلی ہے۔ یہ دوسرا نظریہ محض قیاس آرائیوں کا ایک نتیجہ ہے۔ اس کا نہ تو کوئی تاریخی ثبوت ہے اور نہ عقلی۔ کشمیری کے بارے میں ایک اور نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ کشمیری "درد"[2] زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس بارے میں سرجارج گریرسن رقمطراز ہیں:

"کشمیری ایک مخلوط زبان ہے جس کی بنیاد "درد" گروہ کی ایک زبان ہے۔"[3] مگر محققین اور مورخین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ کشمیری کا اصلی ماخذ سنسکرت یا سنسکرت کی ہی کوئی شاخ ہے۔

ماہر لسانیات جناب سنیتی کمار چٹرجی لکھتے ہیں:

"کشمیری زبان کی ابتدا دسویں صدی عیسوی میں دیگر آریائی زبانوں کے ساتھ ساتھ ہوئی اور اس کا ماخذ بھی سنسکرت کی ہی ایک شکل ہے۔"[4]

شری وی۔ کے۔ گوکک (V.K. GOKAK) لکھتے ہیں:

"...Kashmiri, Hindi Urdu are from Sanskrit through Prakrit dialects of Sanskrit"

"آسامی، بنگالی، گجراتی، کشمیری، ہندی اردو سب سنسکرت ہی سے یا سنسکرت کی پراکرت بولیوں سے نکلی ہیں۔"[5]

شری جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

---

[1] یہ کتاب مرحوم آزاد نے ۱۹۴۳ء اور ۱۹۴۸ء کے درمیان مرتب کی تھی مگر ان کی وفات کے دس سال بعد ۱۹۵۸ء میں منظر عام پر آسکی۔

[2] کشمیر کے شمالی علاقے میں بولی جانے والی ایک زبان۔ اس علاقے کو "دردستان" کہتے ہیں چنانچہ اسی نسبت سے اس زبان کا نام "درد" پڑ گیا ہے۔

[3] A Grammar of Kashmiri Language

[4,5] Literature in Modern Indian Languages (PAGE PP 9, 10)

"موجودہ ہندوستانی زبانیں سنسکرت سے پیدا ہوئیں اور وہ زبانیں یہ ہیں: ہندی، اردو، پنجابی، سندھی، کشمیری وغیرہ[1]"

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہی نظریہ صحیح قرار پاتا ہے کہ کشمیری زبان کا ماخذ سنسکرت ہی ہے۔ یوں بھی کشمیر زمانۂ قدیم سے سنسکرت کے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں سنسکرت کے وہ اہلِ قلم اور عالم پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے نام کو چار دانگ عالم میں مشہور کیا۔ کون ہے جو وشنو شرما[2] کھیمندر[3] (آٹھویں صدی عیسوی) ابھنو گپت[4] آٹھویں صدی عیسوی) کلہن[5] (بارھویں صدی عیسوی) اور تین تخلی کے نام سے واقف نہیں، یہی نہیں بلکہ ہندوستان اور لنکا، افغانستان، برما اور جنوب مشرقی ایشیا کے دیگر ممالک میں کسی بھی طالب علم کی تعلیم کو اس وقت تک مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ کشمیر میں دو تین سال رہ کر تعلیم حاصل نہ کرتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ یہاں کی دو مشہور یونیورسٹیوں وجیشور اور شارد ا میں تعلیم صرف سنسکرت میں دی جاتی تھی اس سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُس وقت بھی یہاں کے لوگ کوئی زبان بولتے ہوں گے تو وہ یا سنسکرت ہوگی یا سنسکرت سے بہت قریب کوئی زبان۔ اس کے علاوہ کشمیر کے گرد و نواح میں بولی جانے والی سبھی زبانوں مثلاً پہاڑی، گوجری، پنجابی، ڈوگری وغیرہ کا ماخذ بھی سنسکرت ہی ہے۔ غرض، ان حالات میں کشمیری زبان کا ماخذ صرف سنسکرت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

چند نام

عزیز کشمیری صاحب نے صرف چند ناموں اور رواجوں کا سہارا لے کر کشمیری کا رشتہ عبرانی سے جوڑا ہے[6]۔ ان کا سارا نظریہ ڈاکٹر نذیر احمد کی کتاب Jesus in Heaven on Earth کے گرد گھومتا ہے۔ انھوں نے اپنے نظریے کو استحکام بخشنے کے لیے یہاں کے کچھ دیہاتوں کے نام گنائے ہیں جو عبرانی ناموں کے ساتھ میل کھاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ آج بھی کشمیر کے بیشتر دیہاتوں کے نام سنسکرت سے ہی ماخوذ ہیں اور معمولی تبدیلی کے ساتھ رائج ہیں۔ میں یہاں پر چند نام درج کرتا ہوں جو صرف ہمارے لہجے کے فرق کو ظاہر کرتے ہیں ورنہ ان میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

قدیم صورت	جدید صورت	قدیم صورت	جدید صورت
بانسالہ	بانہال	سجے ون	زیون
وتستا	ولستا	کنشک پور	کانس پور
سویہ پور	سوپور	درہ گولا	درہ گل
کانر	کانز	داکھہ گام	واگام
گدسیتو	گوڈہ ستھو	شن ین	شوپئین

کچھ نام جن کا "ش" لہجے کے فرق کی وجہ سے "ہ" سے بدل گیا ہے۔

کھون موش	کھون موہ	راموش	راموہ
کے موش	کیموہ	کروشش	کردہ

کچھ مزید الفاظ جو براہ راست سنسکرت سے آئے ہیں اور مستعمل ہیں:۔

سنسکرت یا پراکرت	کشمیری	سنسکرت یا پراکرت	کشمیری
ششتر	ششتر	جاماتر	زرمتر
گچھ	گژھ	وچن	وژن
کاشٹھ واڑ	کشتواڑ	کھار	کھار
ترک	ترک	تولک	تولہ
گوپ اگرہار	گوپ کار	اکھشر	اچھر
ہون	ہون	مشر	متھر
راجپوری	راجوری	پکھش	پچھ

مندرجہ بالا الفاظ اِس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کشمیری کا تعلق براہ راست سنسکرت یا اس کی کسی شاخ سے ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین "براچڈ اپ بھرنش"[7] کا نام دیتے ہیں۔ صوتیات، نحوی ساخت

---

[1] Discovery of India (P. 158.)

[2] پنچ تنتر کے مصنف [3] سنسکرت زبان کا مشہور شاعر [4] فلسفی اور سنسکرت کا زبردست عالم [5] سنسکرت کا زبردست شاعر۔ اور راج ترنگنی کا مصنف [6] پانینی کے بعد سنسکرت کا مشہور قواعد نویس [6] کشمیری زبان اور عبرانی صفحہ ۲۵۲ مصنف عزیز کشمیری۔

[7] تاریخ زبان اُردو۔

اور قواعد کے لحاظ سے بھی کشمیری سنسکرت کے قریب تر ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشمیری زبان میں معمولی سا فرق ہو۔ یہ فرق یہاں اسلام کے آنے کے ساتھ ہی شروع ہوا کیونکہ مسلمانوں کے گھرانوں میں فارسی کا بول بالا تھا اور ہندو گھرانے سنسکرت ہی سے مانوس تھے اس لیے کہ ان کی مذہبی کتابیں سنسکرت ہی میں تھیں۔ بہر حال کشمیری زبان کی تحقیق کے سلسلے میں ہندوؤں کی زبان کو ہی زیادہ مستند قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ اپنے ابتدائی دور (نویں و دسویں صدی عیسوی) میں یہ زبان ہندوؤں کی گود میں پروان چڑھی اور جوان ہوئی۔ زبان کے اس فرق کا اعتراف سرجان گریرسن کو بھی ہے :-[1]

"Kashmiri, specially spoken by Musalmans, borrows freely from Persian, and (through Persian) from Arabic. In works written by Musalmans there are passages of which vocabulary is more Persian than Kashmiri."

(کشمیری، خاص طور سے وہ جیسے مسلمان بولتے ہیں، فارسی سے بڑی آزادی سے الفاظ لیتی ہے اور (فارسی کی معرفت) عربی سے۔ مسلمانوں کے تصنیفات میں ایسی عبارتیں ملتی ہیں، جن کے الفاظ کشمیری سے زیادہ فارسی ہیں)

عزیزی کشمیری صاحب حضرت عیسٰی کے وارد کشمیر ہونے کی روایت کو اپنے نظریے کا سنگ میل قرار دیتے ہیں۔ اگر اس روایت کو درست بھی تسلیم کیا جائے (حالانکہ ایسا نہیں ہے) تو بھی یہ بات قبول نہیں کی جا سکتی کہ کشمیری کا ماخذ عبرانی ہے۔ اگر حضرت عیسٰی کشمیر آئے بھی ہوں تو یہاں کے لوگ اُس وقت کوئی نہ کوئی زبان بولتے ہوں گے اور یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے کہ وہ عبرانی نہ ہوگی بلکہ سنسکرت یا سنسکرت ہی کی کوئی شاخ رہی ہوگی۔ دراصل سنسکرت کا اثر تو اتنی مدت تک رہا کہ کشمیری کے ابتدائی ادب مثلاً مہانے پرکاش (کشمیری کی ابتدائی شکل کا نمونہ) اور للہ واکھیہ (للہ عارفہ کے کلام کے مجموعہ) پر بھی اُس کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، اُن "واکھیوں"[1] کی بحر سنسکرت "چھند" سے ماخوذ ہے اور خیالات "شیوازم"[2] کی غمازی کرتے ہیں۔ چھان بین کرنے سے ہر کسی پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ آج بھی کشمیری میں سنسکرت اور دیگر پراکرتوں کے پچاس فی صد الفاظ اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں۔

قدیم کشمیری ادب

کشمیری میں سب سے پہلا لکھنے والا کون تھا اور کشمیری میں لکھی گئی پہلی کتاب کا نام کیا تھا، اس بارے میں ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شتی کنٹھ (تیرھویں صدی عیسوی) کشمیری زبان کا پہلا شاعر ہے اور اس کی کتاب مہانے پرکاش[3] کو قدیم ترین ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ دوسری طرف سرجان گریرسن کا خیال ہے کہ للہ عارفہ (وفات سنہ ۱۳۳۵ء) کے للہ واکھیہ کشمیری زبان کا ابتدائی نمونہ ہے۔ بہر حال، مہانے پرکاش اور للہ واکھیہ کا مقابلہ کرنے کے بعد ماننا پڑتا ہے کہ مہانے پرکاش ہی کشمیری میں لکھی ہوئی قدیم کتاب ہے کیونکہ اس کتاب کی زبان للہ واکھیہ سے زیادہ سنسکرت آمیز ہے اور آج کی زبان سے مقابلتاً بہت مختلف ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد شتی کنٹھ کی علمیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

للہ عارفہ کے کلام پر فارسی کا ہلکا سا اثر ہے مگر اُس کی زبان آج کی زبان سے بہت قریب ہے۔ اُس میں جو فلسفہ حیات پیش کیا گیا ہے اُس پر "شیوازم" کے ساتھ ساتھ وحدت الوجود کا بھی ہلکا سا اثر ہے۔ مختصراً للہ عارفہ کا کشمیری میں وہی مقام ہے جو والمیک

---

[1] A Dictonary of Kashmiri Language (pt.) Published by Royal Asiatic Society of Bengal.

---

[1] کشمیری شاعری کی ایک مقامی صنف۔ [2] ہندو مت کی ایک شاخ جس کا مبلغ ابھنو گپت تھا۔ [3] یہ کتاب شاردا رسم الخط میں لکھی ہوئی ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ ریسرچ لائبریری سری نگر کے کتب خانے میں موجود ہے۔

کو سنسکرت میں چاندورداس کو ہندی میں اور محمد قلی قطب اور ولی دکنی کو اردو میں حاصل ہے۔

للہ عارفہ کے بعد ہماری نظر شیخ نورالدین (۱۳۷۷ء۔ ۱۴۳۸ء) پر جاکر ٹھہرتی ہے۔ اُن کا کلام بھی سنسکرت سے کافی متاثر ہے اور بحر بھی سنسکرت "چھند" سے ماخوذ ہے۔ مواد کے لحاظ سے اُن کا کلام، جو کلام شیخ العالم کے نام سے چھپ چکا ہے بہت وزن دار ہے مگر یہاں ہمیں للہ عارفہ جیسی فنی چابک دستی نظر نہیں آتی۔ اس کمی کے باوجود بھی کلام شیخ العالم صوفی و مُلّا، رند اور پارسا سبھوں کی پیاس بجھانے کے لیے کافی ہے۔

حبہ خاتون (۱۵۵۰ء ۔ ۱۶۰۶ء) کے ساتھ کشمیری شاعری کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے اور ارنہ مال (۱۷۰۰ء ۔ ۱۷۵۳ء) پر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں فارسی کا طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ اسی اثر کے تحت ان دونوں کے کلام میں فارسی ترکیبیں و الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ ان دو شاعرات نے پہلی بار ہماری شاعری کو غنائیت اور موسیقیت سے مالامال کر دیا۔ ان دونوں کا کلام غزل کے زمرے میں آنے کے بجائے "وژن"[1] کے زمرے میں آتا ہے۔ زمانے کے دست بُرد سے ان کے کلام کا بہت کم حصہ بچ سکا ہے تو بھی کلام حبہ خاتون اور کلام ارنہ مال ہمارے لیے ایک سوغات سے کم نہیں۔

انیسویں صدی کا شعری ادب

محمود گامی (وفات ۱۸۵۵ء) ہمارے چوتھے دَور کا سب سے بلند شاعر ہے۔ محمود کے زمانے میں فارسی نے کشمیر میں اپنے قدم اچھی طرح جمائے تھے۔ فارسی کشمیر کی سرکاری زبان بھی اور ذریعہ تعلیم بھی۔ محمود فارسی کا ماہر تھا چنانچہ اُس کے کلام میں فارسی غزل کا اثر جگہ جگہ نظر آتا ہے اور ہمیں پہلی بار غزل کی سوندھی سوندھی خوشبو ملتی ہے۔ غزلیات محمود کے علاوہ لیلیٰ مجنوں اور شیریں خسرو (فارسی مثنویات) کو بھی محمود گامی نے کشمیری روپ عطا کیا۔

محمود گامی کے بعد بہت سے شعراء بیچ میں آتے ہیں مگر اُن کی حیثیت پانی کے بلبلوں سے زیادہ نہیں۔ یہ شعرا نہ تو ہماری کسی خاص فلسفہ حیات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں اور نہ اِن کا کلام فنی لحاظ سے قابل قدر ہے۔ البتہ اِس دَور کا سب سے اہم شاعر رسول میر (انیسویں صدی عیسوی) ہے۔

رسول میر کو اگر کشمیر کا حافظ کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ اُس کے کلام پر فارسی کی گہری چھاپ ضرور ہے مگر ہر جگہ میر کا انفرادی انداز نمایاں ہے۔ اس کا کلام تغزل سے بھی بھرپور ہے اور نادر تشبیہات سے بھی مرصع ہے۔ کشمیری شاعروں میں آج تک کسی بھی شاعر کو رسول میر کی جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔

رسول میر کے علاوہ اس زمانے کے شعرا میں وہاب کھار (۱۸۵۱ء ۔ ۱۹۱۲ء) دانہ محمود (انیسویں صدی عیسوی) اور اسد میر (انیسویں صدی عیسوی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ننده رام پرمانند (۱۷۹۱ء ۔ ۱۸۷۹ء) کرشن رازدان (۱۸۵۶ء ۔ ۱۹۲۵ء) اور لکھمن جو بلبل (۱۸۱۲ء ۔ ۱۸۸۴ء) کے نام ایک علیحدہ زمرے میں آتے ہیں کیونکہ ان کی شاعری عام شعرا سے قطعاً مختلف ہے۔ ان تینوں شعرا کی شاعری بھگتی کے رس سے معمور ہے اور کشمیری شاعری کے ایک خلا کو پورا کرتی ہے۔ مسلمان شعرا میں سے شعرا کے اس زمرے میں عبدالاحد نادم (وفات ۱۹۱۱ء) کا نام آتا ہے۔ اُن کا سارا کلام نعتیہ ہے۔

مقبول شاہ کرالہ واری (۱۸۲۰ء ۔ ۱۸۷۶ء) ان سب لوگوں سے علیحدہ ہیں۔ اُنھوں نے بہت کچھ لکھا ہے مگر اُن کی صرف ایک مثنوی گلریز جو کشمیری میں ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے، ان کو بقائے دوام کے دربار میں جگہ دلانے کے لیے کافی ہے۔

کشمیری شاعری بیسویں صدی میں

اب عبدالاحد آزاد (۱۹۰۴ء ۔ ۱۹۴۸ء) کا دَور شروع ہوتا ہے۔ بعض لوگ اِس دور کو غلام احمد مہجور (۱۸۸۵ء ۔ ۱۹۵۲ء) کا دَور قرار دینے پر مُصر ہیں مگر میں اِس دور کو آزاد کے ہی دور سے منسوب کروں گا کیونکہ اس کے بعد ہماری شاعری نے جو روش اختیار کی وہ آزاد کے قریب اور مہجور سے دور رہی ہے۔ مہجور بنیادی طور پر جمال کا شاعر

---

[1] کشمیری شاعری کی ایک مقامی صنف۔

ااور زندگی بھر رومان کی وادیوں میں بھٹکتا رہا۔ جب بھی اُس نے زندگی قریب تر آنے کی کوشش کی تو اس کے کلام کی ساری جاذبیت اور ...بش جاتی رہی۔ رومانی شعرا کے زمرے میں مہجور کو ایک بلند مقام حاصل ہے مگر اُسے ناقدِ حیات قرار دینا ایک بہت بڑی غلطی ہے۔ مہجور ...م نے کلامِ پیام اور سلامِ مہجور کے نام سے کئی کتابچوں پر مشتمل ...ایہ ہمارے لیے چھوڑا ہے۔

مہجور کے مقابلے میں آزاد کی شاعری جلال اور جمال کا ایک ...زار کا نامہ ہے۔ اُس نے حقیقی معنوں میں شاعری کو زندگی سے قریب ...دیا اور ہمیشہ اپنی بساط کے مطابق انقلابی آہنگ اور سوز و گداز عطا ...آزاد موت کو سکون اور بے حسی کا نہیں بلکہ حرکت زندگی اور کشمکش ...کا ترجمان تھا۔ ترانۂ شعرائے کشمیر کے علاوہ سنگر مال (شاعری) ...م کے سات کتابچے ہمارا ایک قیمتی ورثہ ہیں۔

غلام نبی دلسوز (۱۹۱۹ء - ۱۹۴۲ء) بھی اس دور کا ایک اہم ...ا تھا مگر قبل از وقت موت نے اُسے اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح ...اجاگر کرنے کی فرصت نہیں دی۔

ہندوستان میں ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنم ہوا۔ کشمیر ...۱۹۳۹ء میں مسلم کانفرنس نیشنل کانفرنس میں بدل گئی۔ چنانچہ اس ...کے تحت ۱۹۴۲ء میں کشمیر میں بھی انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ...ڈالی گئی۔ کشمیر کے ادیبوں نے اب یہ اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ ادب ...محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ کاروانِ حیات کا رہبر بھی ہے۔ یہ احساس ...ارتقا کرتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء کے بعد شاعروں کا ایک باشعور ...گروہ ہمارے سامنے آگیا اور اس نے بہت کم وقت میں کشمیری ادب ...میں اپنا مقام بنالیا۔ نئے دور کے ان کشمیری شعرا کی فہرست میں دینا ناتھ ...نادم، رامانند ساگر، پریم ناتھ پردیسی، شاہد، سوم ناتھ زتشی، ساگر، رحمان ...راہی، ...، روشن، غلام نبی فراق، غلام حسن بیگ عارف، غلام رسول ...نازکی، غلام نبی خیال، مظفر عازم، مکھن لال بیکس، چمن لال چمن، رشید نازکی ...، بیتاب، ریحہ سوپوری، حلیم کاشمیری، دشیو ناتھ وشواس، غلام نبی ...عارض، عبدالستار رنجور وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نئے دور کے ...اثرات سے ماسٹر زندہ کول جیسا صوفی منش شاعر بھی متاثر ہوا۔

کشمیری نثر

یوں تو کشمیری نثر کی ابتدا انجیل مقدس کے ترجمے سے ہوتی ہے مگر اس کی باقاعدہ ابتدا تارا چند بسمل (۱۹۰۵ء - ۱۹۴۸ء) کے ڈرامے ستیہ وتھ (۱۹۳۰ء) سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک ہمارا نثری ادب کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ البتہ ۱۹۴۹ء میں کونگ پوش کے اجرائے ساتھ ہی نثر نگاری باقاعدہ طور پر شروع ہوگئی اور اب کشمیری میں ناول، تنقید، افسانہ، ڈرامے، مقالات سبھی لکھے جارہے ہیں۔ آج کے اچھے نثر نگاروں میں نادم، غلام محی الدین حاجنی اور منشی نرودش کا نام سرفہرست آتا ہے۔

تنقید

کشمیری میں تنقید کی ابتدا آزاد مرحوم کی کلیات مقبول کی اشاعت کے ساتھ ہوتی ہے۔ آزاد کے بعد اس ضمن میں دینا ناتھ نادم، رحمان راہی، شمیم احمد شمیم، پروفیسر حاجنی، جیالال کول، محمد یوسف ٹینگ، موتی لال ساقی، پروفیسر پشپ اور منشی نرودش کے نام آتے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں امین کامل، غلام نبی خیال اور ہری کشن نے کچھ اچھا مواد بہم کیا ہے۔

مختصر افسانہ

اب سے تقریباً چودہ سال پہلے ہمیں کشمیری میں مختصر افسانے کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں کچھ لکھنے والوں نے عالمی ادب اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اس طرف توجہ کی۔ کشمیر میں سب سے پہلی کہانی نادم صاحب نے جوابی کارڈ کے عنوان سے لکھی۔ نادم صاحب کے بعد اس سلسلے میں اختر محی الدین، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، بنسی کول عاجز، اُمیش کول، صوفی غلام محمد، دیپک کول، منشی نرودش، عزیز ہارون کے نام قابل ذکر ہیں۔

ناول

کشمیری میں سب سے پہلا ناول ۱۹۵۵ء کے بعد منظر عام پر آیا اور پھر بعد میں اس میں برابر اضافے ہوتے رہے۔ اختر محی الدین، علی محمد لون، امین کامل کا نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔

[illegible] کشمیری [illegible] شاہی میں لکھے [illegible] ۱۹۳۸ء [illegible]

[illegible]

رسالے

[illegible]

۶	سندون ساز	(از:۔ رحمان راہی)
۷	یادن [illegible]	(از:۔ کامل وہاردن)
۸	[illegible]	(از: ناجی منور)
۹	[illegible]	(از:۔ [illegible])
۱۰	پراکاش	(از:۔ غلام نبی خیال)
۱۱	حباب	(از:۔ فانی)
۱۲	رباعیات	(از:۔ عارف)
[illegible]	مضراب	(از:۔ محی الدین توانا)
۱۴	رباعیات [illegible]	(مترجم:۔ غلام نبی خیال)
۱۵	کاشر شاعری	(مرتب:۔ پروفیسر حاجنی)
[illegible]	آزاد	" :۔ [illegible]
۱۹	[illegible]	([illegible])
۲۰	حبہ خاتون	([illegible])

[illegible] شرح [illegible]

۲	[illegible] نیت	(از:۔ [illegible])
۳	[illegible] شاعری	(مترجم:۔ غلام [illegible])

ناول

[illegible]	[illegible] انسان	(از:۔ علی محمد لون)
۱	[illegible] رنگ	(از:۔ اختر محی الدین)
۲	[illegible] گاش	(از:۔ امین کامل)

مختصر افسانہ

۱	ست سنگر	(از:۔ اختر محی الدین)

[illegible] کتاب پر ساہتیہ اکاڈمی انعام مل چکا ہے۔

[illegible]

ڈال کر نہایت تندہی سے [illegible]
دشمن کی دو گولیاں نشانہ [illegible] ہیں۔

[illegible] سے خفیہ نکلا۔

[illegible]

کہاں [illegible] تھے [illegible]
قدرت نے [illegible] میدان جنگ سے [illegible] تھا

[illegible]

[illegible] کا قلب سے باہر جا چکا تھا!

پنشن اور ہوا خوری

سید شہنشاہ حسین

نیب مرض سے پنشن کا ڈسنا بھی۔ اس کے مریض بڑی بات نہ ہی سے بڑی باتیں "ہوا خوری" کر کے نکالتے ہیں۔ کمزوری کی راتوں کی تپش کے بعد لنگڑے پیر سے جھٹکے سے گھسٹتے جھوک کر پاؤں دیتے ہوتے ہیں۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے لطف [illegible] بستر سے بھونچال کی طرح اٹھتے ہیں اور دفتر داروں کی [illegible] کرتے ہوئے منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہیں۔

عام طور سے یہ مرض پچاس سال کی عمر کے بعد لاحق ہوتا ہے اور جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے مرض بھی بڑھتا جاتا ہے (ادھر یہ دیکھا جانے لگا ہے کہ نوجوان بھی اس مرض کا شکار ہو رہے ہیں) ایسے مریض اکثر مرغان صبح کی طرح ایک [illegible] ہوا خوری کی ٹولیوں میں اکٹھا ہونے کے عادی ہوتے ہیں۔ مرض کی شدت آخر میں تنہائی پسند بنا دیتی ہے فرداً یا ٹولیوں دونوں کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ سیاروں کی طرح یہ بھی ایک مدار پر گردش کرتے ہیں [illegible] ساتھ زبان بھی چلتی رہتی ہے کیونکہ [illegible] بڑا ایک اور مرض بھی ہے [illegible] کہاں کی "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں"
تاریخ بحث سے بھی کوئی غرض نہیں ہوتی بس نقطۂ نظر کی آنچ پر گرم کر دی [illegible] کوئی کسر نہیں کہ وہی حضرت اس نقطۂ نظر کی موافقت میں کل اظہار خیال فرما رہے ہوں۔ لیکن جو بھی بحث ہوتا لازمی ہے کیونکہ ان کے ساتھی اپنی پہلی والی بھول کر "حمایت تو مخالفت" کے مصداق۔ یہی دلیلیں غیر شعوری طور پر پیش کر رہے ہوں گے جو پہلے ان کے خلاف پیش ہو چکی تھیں۔

۲

ایسے ہی نئے مریضوں میں میرے ایک عم بزرگ تھے۔ مجھ سے بارہ تیرہ سال بڑے اور میرے والد سے تقریباً اتنے ہی چھوٹے۔ ملازمت کی میعاد بخیر و خوبی مکمل کر کے جب وطن واپس آئے تو میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ غیر ارادی طور سے رفتہ رفتہ ہم دونوں کے بزرگی اور خوردی کے تعلقات دوستی میں تحلیل ہونا شروع ہوئے۔ لیکن بزرگی کا درجہ قائم رہا۔ خوش قسمتی سے ان کی ہر خواہش میرے لئے ایک حکم کا رتبہ رکھتی تھی۔ یہ تو [illegible] جانتے کہ پنشن [illegible] حضرات یہ سمجھتے ہوں کہ کسی صبح کو نہ ٹہلے تو اس روز کی پنشن ضبط کر لی جائے گی۔ عام طور سے ہوتا یہی ہے کہ آج ریٹائر ہوئے اور کل صبح سے ہوا خوری کو نکلنے لگے۔

چنانچہ میرے بزرگ دوست بھی یہ فرض خود ساختہ و پرداختہ روز صبح نہایت مستعدی سے ادا کرنے لگے اور برابر مجھے بھی دعوت خرام دیتے رہے۔ [illegible] تک [illegible] حوالے کرتا رہا۔ مگر ایک دن ان کے غیر معمولی اصرار کے آگے مجھے جھکنا پڑا (جس کو وہ مکمل رضامندی سمجھے) اور

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

میری سب سے بڑی دلیل کہ "سویرے آنکھ نہیں کھلتی" ایک جہاں دیدہ کے دشمن کی نظروں میں بھلا کیا وقعت رکھ سکتی تھی؟ دوسرے ہی دن

صبح کاذب سے بھی پہلے باہر کے دروازے کی زدوکوب سے میری آنکھ کھلی کوئی آفت ناگہانی نہ تھی (یا تھی ؟) بلکہ میرے محب بزرگ میرے وعدۂ ضعیف کے ایفا کے لئے تشریف لائے تھے حوائج ضروری سے فارغ ہونا کیسا۔ ان کے لگاتار "دق الباب" کی شدت سے گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا نیند میں چلنے والے مریض کی طرح اٹھا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد جب جی بحال ہوا تو محسوس کیا کہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ مجھے تولید صبح کا منظر نہیں کھینچنا ہے۔ یہ کسی شاعر سے پوچھیئے۔ اور نہ سویرے کی تازہ ہوا کے فوائد بیان کرنا ہیں۔ یہ کسی ڈاکٹر سے پوچھیے۔ نئی دنیا سے میرا مطلب یہ تھا کہ شہر کی کیفیت ہی کچھ نرالی لگ رہی تھی۔ عجیب سناٹا تھا۔ بیچ سڑک پر ہم لوگ اس اطمینان سے چل رہے تھے کہ گویا اپنے گھر کا آنگن ہے۔ نہ رکشوں کے دھکوں کا ڈر تھا نہ موٹر سے کچل جانے کا۔ دوکان کے سامنے برآمدوں میں تو خیریت سے نہ دن کو چل سکتے تھے اور نہ اس وقت دن کو دوکان داروں کے کاموں میں حارج ہوتے کیونکہ ان کا سامان اکثر برآمدوں میں پڑا ہوتا ہے اور اس وقت ان بے گھروں کی نیند کیسے پریشان کرتے جو کل کے تھکے مادر گیتی کی آغوش سے ابھی اٹھے بھی نہ تھے۔ صبح کی ہواخوری کی ان کو کیا ضرورت؟ میں نے ان پر رشک کیا۔

ایک نرالا پن یہ بھی تھا کہ سڑک پر آدمی کم اور کتے زیادہ نظر آ رہے تھے۔ جن میں سے بعض غراتے ہوئے ہم لوگوں کی مزاج پرسی کے لئے بڑھتے مگر میرے ساتھی کی چھڑی کی ایک ہی جنبش ان کی دموں کو ان کی ٹانگوں کے اندر پہنچا دینے کے لئے کافی تھی! اس وقت سمجھ میں آیا کہ "واک" اور واکنگ اسٹک لازم و ملزوم کیوں ہیں! پہلے کوئی نوجوان اگر پوچھتا کہ ان سب صبح کے ٹہلنے والوں کو آخر اس تیسری ٹانگ کی کیا ضرورت؟ تو میں صحیح جواب تو کیا دے سکتا مگر ان کی سمجھ میں آجانے والا یہ سوالیہ جواب پیش کرتا کہ ہر ایکٹر کو لمبے لمبے بال رکھنے اور نائی سے گریز کرنے کی کیا وجہ؟ بہر حال جب ہم آبادی سے کچھ دور پہنچے تو بعض ایسی صورتیں دیکھیں جو کچھ مانوس سی لگیں۔ یہ تھے کچھ ریٹائرڈ حضرات۔ عرصے سے ان کی زیارت ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان کے گھر سے نکلنے کا وقت ــ علاوہ بدرجۂ مجبوری ــ بس یہی تھا، صبح صادق سے پہلے۔ کیا کیا تغیرات پائے ان کی وضع اور قطع میں! ظاہر ہے کہ یہ سب بزرگ ہستیاں اب اور بزرگ ہو چکی تھیں۔ پہچاننے کے بعد بھی اکثر اس شش و پنج میں پڑ جاتا کہ وہ وہی ہیں یا ان کے کوئی بڑے بھائی پیدا ہو گئے!

۳

یوں ملا تھا مجھے پہلا سبق اس چلتے پھرتے صباحی اسکول میں . . .

زمانے نے تیری زندگی کے اوراق لکھتے لکھتے آخری باب "ضعیفی" کا آغاز کیا۔ میں بھی پنشن یافتہ گروہ میں شامل ہوا۔ بے فکری و بیکاری کے ساتھ ساتھ احساس کمتری بڑھنا شروع ہوا اور تندرستی گھٹنے لگی۔ "لذت خواب سحر" کا مزا بھول گیا اور "صبح کرنا شام کا" میرے لئے بھی ایک مرحلۂ عظیم بنکر سامنے آگیا۔

اس عمر میں نئے دوست پیدا کرنا محال ہوتا ہے۔ پرانے احباب ملک عدم چل بستے ہیں۔ یہ تو ہے نہیں کہ: "دوست، بازار سے لے آئے اگر چھوٹ گیا"! نوجوانوں پاس اتنا وقت کہاں کہ بڈھوں کی طرف متوجہ ہوں۔ یوں بھی بڑھاپے اور جوانی میں ازل سے ایک قسم کی "ٹھنڈی جنگ" ہے کیونکہ طرفین جنگ کا اعلان تو درکنار اس "ٹھنڈی جنگ" کا اعتراف تک نہیں کرتے۔ گو ہے یہ واقعہ کہ ہر بڈھا لاشعوری طور پر جوانوں سے رشک کرتا ہے اور ہر جوان بڈھوں کی چال ڈھال اور وضع قطع کو بہ نظر تمسخر نہ سہی تو ایک نظری تحقیر سے ضرور دیکھتا ہے۔

آخر ایک دن سمجھ میں آیا کہ "در جنوں بیکار نتواں زیستن"۔ لہٰذا ان گراں بہا فرصتوں کو مشغولیت میں تبدیل کرنے کے لئے تفریحات تنہائی و اشغال ارزاں ایجاد یا اختیار کرنا پڑے۔ تلاش امن و سکون میں کچھوے کی طرح اپنے ہی میں گھس کر پرانی عادتوں اور خصلتوں میں نہایت بے رحمی سے ترمیم و تنسیخ کی۔ اور اب تو فخریہ طور پر کہہ سکتا ہوں کہ:

من ازاں رنج گراں بار چہ لذت یابم کہ بہ اندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

اسی ذہنی آواگون کے تحت تفریحات ترک شدہ کی برسی مناتے ہوئے ایک صبح چپکے سے ٹہلنے نکل ہی گیا! اور اب آپ سے کیا چھپائیں اب تو یہ حد ہے۔ روز صبح تڑکے میرے منہ دھوتے وقت کی کھنکاریں مرغ صبح کی اذان سے زائد ــ دوسروں کی نیندیں حرام کرنے لگی ہیں اور بھتیجے بھانجے میرے محبوس خیالات کی رہائی کو بکواس کا لقب دیکر مجھ سے کنائیاں کاٹنے لگے ہیں۔

آشنا را حال اینست وائے بر بیگانہ!

میرے اشغال ارزاں میں سے اب ایک یہ بھی ہے کہ "ہوا خوری" کے دوران دوسرے ٹہلنے والوں کے حلیے سے اندازہ کروں کہ کون ابھی دنیا کی

کار آمد ہستیوں میں سے ہے اور کون میری طرح بیکاری کا ٹھیکہ دار ہو چکا ہے!
یقین ملیئے "گھوڑی ہی نشن کے بعد یہ کوئی مشکل کھیل نہیں رہتا۔ دور ہی سے پتہ چل جاتا ہے کہ "وہ آ رہا ہے بیچارہ پنشنر"! لیکن ایکسٹرا اسٹنٹ۔ ریٹائرڈ گزیٹیڈ آفیسر اور ایک سکیل ریٹائرڈ کلرک کے درمیان ریٹائر ہونے کے بعد بھی وہ پرانی وسیع خلیج باقی رہتی ہے جو ملازمت کے زمانے میں دونوں کے مابین رہا کرتی تھی۔

ہاں۔ اس نفسیاتی کھیل کو مشکل بنانا ہو تو یہ بتانا ذرا مشکل ہوگا کہ یہ بیچارہ جو ہر نفس گزشتہ کی میت لئے "زمین پر اپنی ناتواں ٹانگیں گھسیٹتا آپ کی طرف آ رہا ہے" بھلا کس محکمہ سے تعلق رکھتا ہوگا؟ اس کو ریٹائر ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہوگا؟ پنشن جاری ہو گئی کہ ابھی بھی "اے۔ جی" (A.G) کے دفتر والوں کی سست قلمی سے بے حی ہو رہا ہے؟ قرضدار ہو گیا؟ بچوں کی شادیاں کر چکا؟ اپنے وجود کا ثبوت دینے کے لئے کوئی اور کام کرنے کی ہمت رکھتا ہے یا امراض کے بوجھ اور زمانے کی بے اعتنائی سے اتہائی مجرم کی طرح بقیہ قید حیات کی میعاد پوری کرنے پر راضی بہ رضا ہو چکا؟ یہ ہے ذرا مشکل کھیل۔ کافی مشق چاہیئے۔ مگر ملیٹری اور پولیس پنشنرز کی تشخیص تو بہت ہی آسان ہے۔

۵

ایک فوجی پنشنر تو میرے ہی محلے کے ہیں جن کے ساتھ صبح کو ٹہلنے کی کوئی ہمت ہی نہیں کرتا۔ کسی زمانے میں میرے ہم مکتب تھے۔ اس وقت ہی ان کی بالیدگی قد و قامت ہم لوگوں کے لئے باعث رشک تھی۔ مگر ان کے ذہن کے ٹھٹھر جانے سے اوسط برابر ہو گیا تھا۔ پانچ میل کی ریس گھوڑے کی طرح دوڑ کر ہمیشہ جیت لینے سے کئی میڈل بٹور لئے تھے۔ البتہ ان کا عکس ان کے امتحان کے نتیجوں میں۔ بصورت صفر۔ اکثر دکھائی دیتا رہا۔ حساب تو خاص طور سے ان کے لئے ہوا تھا۔ ہائی اسکول سے پہلے ہی میرا ان کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ ہم لوگوں کی دنیائیں الگ الگ قسمیں اور ہیں۔ فوجی قاعدوں کے بموجب بڑھاپے سے کچھ پہلے ہی پنشن پا گئے۔ جیسے ان کی عمر "مارک ٹائم" (Mark Time) کر رہی ہے۔ خضاب سے عمر کے کچھ سال "اباؤٹ ٹرن" (About Turn) ہو جاتے ہیں۔ ہاں عقل تو کب کی "ہالٹ" (Halt) ہو چکی ہے۔ میرے ہم عمر ہیں مگر زوال جسمانی اور تفاوت ذہنی کی وجہ سے میں ان کا بزرگ ہو گیا ہوں!
ماشاءاللہ سے ابھی بھی اتنے تندرست ہیں کہ ان کی ہوا خوری کے میدان کے حدود اربعہ بہت ہی وسیع ہیں۔ کمپنی باغ کی طرف جایئے تو وہ ملیں گے۔ سکندر باغ کی طرف ان کا دورہ ہو۔ چوک سے امین آباد جائیں تو ڈالی گنج ہو کے! یعنی یہ کہ مثلث کے دونوں پہلو تیسرے پہلو سے زائد ہو کر بھی ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے! جب ہی تو ان کی ہوا خوری کے دائرے میں کوئی خاص نہیں ہوتا۔ ان سے پوچھ لیجئے کہ فلاں جگہ سے فلاں جگہ کتنی دور ہے موٹر کے میٹر کی طرح بالکل صحیح بتا دیں گے۔ کیونکہ ان کی ٹاپ گیر (Top gear) کی چال چار میل فی گھنٹہ کے حساب سے گھنٹوں قائم رہ سکتی ہے۔ کلائی پر پڑی سی گھڑی بندھی ہے۔ حساب لگا کر صحیح فاصلہ بتا دیتے ہیں۔ ہاں اگر حساب لگانے میں غلطی ہو جائے تو دوسری بات ہے۔

سوء اتفاق سے ایک دن ہوا خوری کے دوران ان کی گھڑی خراب ہو گئی۔ بنے تلے راستے پر جا رہے تھے۔ جب کوئی "سنگ میل" ملا گھڑی کو گھورا۔ سمجھے کہ آج کچھ معاملہ ڈھیلا ہے۔ اپنی سست رفتاری پر جا بجا ملامت لگاتے ہوئے، اسپ پا کو "قدم" سے "پوئی" میں ڈال دیا۔ پھر بھی بھول گئی، تب جا کے سمجھے کہ اصل معاملہ کیا تھا!

(۶)

پولیس پنشنر تو دور ہی سے چمکتا ہے۔ وہ اینٹھی ہوئی مونچھیں۔ اڑا اڑا سا خضاب۔ وہ پرانی اکڑ کا شائبہ۔ ہاتھ میں بیت۔ بیت میں تسمہ۔ اندھا بھی پہچان لے! مگر یہ حضرات ہوا خوری کے دوران ذرا کم دکھائی دیتے ہیں۔ بھلا انھیں "واک" سے غرض؟ انصاف کیجیے، پریڈ، گشت اور دلیل میں عمر کٹنے کے بعد کون دشمن عقل مزید چلنے کے ارمان باقی رکھ سکتا ہے؟

دوسری دنیا میں بھی اگر ایک جگہ سے دوسری جگہ کے فاصلے زیادہ ہوئے تو شاید ان بیچاروں کے لئے جنت بھی دوزخ ہو جائے گی۔ کیا عجب کہ وہ درگاہ رب العزت میں کچھ اس طرح کی عرضی پیش کر دیں۔

"بارالٰہی۔ کر دے فدوی کو من بھایا عیش "عطا" حسب وعدہ مبارک اور بایں طور کہ عنایت ہو جائے ایک جلد آئی۔ بی۔ سی (A.B.C) اور ایک عدد معذ نامچہ۔ معہ دو ایک جونیر (Junior) فدویوں کے۔ جو بجا لائیں سب فرائض منصبی مجھ بندۂ آرام طلب کے۔ اور اگر نہ ہو کوئی امر تفتیش طلب بندگان نیک کی اس پرسکون جائے رہائش میں، تو اے معبود! کر دے تبادلہ اس فدوی کا دوسری جگہ!"

ملک کا بچاؤ

اور

ہمارا فرض

امن پسند ہندوستان پر ایک پڑوسی ملک، چین کے اچانک و زبردست حملے نے ہمارا رخ موڑ دیا ہے اور ہم جو خلوص اور سچائی کے ساتھ تعمیری سرگرمیوں میں لگے ہوئے تھے مجبور ہو گئے ہیں کہ ہم ملک کے بچاؤ کے لیے فوجی تیاریاں کریں اور اس پیمانے کی تیاری کریں کہ اب ہمارے ملک کی طرف کوئی آنکھ نہ اٹھا سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ہماری سرحدوں کی حفاظت کا سب سے زیادہ بوجھ ہماری فوجوں کے جوانوں ہی کو اٹھانا ہے اور انھوں نے انتہائی مشکل اور حوصلہ شکن حالات میں چینی حملہ آوروں کا مقابلہ بھی کیا ہے اور شجاعت و مردانگی کی داد بھی دی ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہو کہ ان سپاہیوں کے لیے ہر طرح کا جنگی سامان مہیا کیا جائے اور ان کے آرام و آسائش کی تمام سہولتیں فراہم رہیں۔

ظاہر ہے کہ اس مقصد کے لیے مالی وسائل تلاش کرنا ہیں خواہ وہ روپے کی شکل میں ہوں یا غیر ملکی زرمبادلہ کی شکل میں۔ مالی وسائل کی فراہمی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ پیداوار بڑھائی جائے اور اپنی ضروریات اور مصارف کو کم کر کے ہم روپیہ بچائیں اور حکومت کو عطیے اور قرض دیں۔ لہذا ہم میں سے ہر ایک کا چاہے وہ امیر ہو یا غریب، بوڑھا ہو یا جوان، کسان ہو یا صنعتی مزدور یہ فرض ہے کہ آگے بڑھے اور اس نیک کام میں پورا پورا تعاون کرے۔

قومی دفاعی فنڈ

مالی وسائل کی فراہمی کے سلسلے میں پہلا قدم نیشنل ڈیفنس فنڈ کا قیام ہے۔ اس کا مقصد ملک کے لوگوں کو اس بات کا موقع فراہم کرنا ہے کہ وہ رضاکارانہ طور پر مادر وطن کی حفاظت اور اس کی آزادی کے لیے چندہ دیں۔ وزیر اعظم اور دوسرے رہنماؤں کی اپیلوں پر چندے آ بھی رہے ہیں اور اس طرح تمام چندے اور عطیات خواہ روپے کی شکل میں ہوں یا سونے اور سونے کے زیورات کی شکل میں ہوں، اس فنڈ میں جمع کر دیے جاتے ہیں۔ نیشنل فنڈ میں دیا جانے والا ہر عطیہ اور چندے کا ہر روپیہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے لیکن سونے اور سونے کے زیورات کے عطیہ کی خاص اہمیت ہے کیوں کہ اس سے ہمارے جوانوں کو اسلحہ اور دیگر سامان جو بیرونی ملکوں سے منگانا پڑتے ہیں، فراہم کرنے میں غیر ملکی زرمبادلہ مہیا ہوتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ چندوں خاص کر سونے اور سونے کے زیورات کے عطیوں کا سلسلہ جاری رہے۔

نیشنل ڈیفنس فنڈ میں چندہ کسی بھی ڈاک خانہ کے ذریعہ بھیجا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے منی آرڈر کمیشن نہیں لیا جاتا۔ ریزرو بینک یا اسٹیٹ کو اپریٹو بینک یا ممتاز کمرشیل بینکوں کی شاخوں میں چندہ جمع کیا جا سکتا ہے۔ شہریوں کی باضابطہ کمیٹیوں کے عہدہ داروں کو بھی چندہ اور عطیہ دیا جا سکتا ہے۔ سرکاری نوکر اپنے دفتر سے کہہ سکتے ہیں کہ ہر ماہ ان کی تنخواہ سے چندہ کی رقم وضع کر لی جائے۔ کارخانے میں کام کرنے والے بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں۔ البتہ اس بات کا ہمیشہ یقین کر لینا چاہیے کہ چندہ اور عطیہ صحیح آدمیوں اور اداروں کے ہاتھ میں پہنچتا ہے۔

نیشنل ڈیفنس بانڈ

اس میں شک نہیں کہ جو بھی چندہ دیا جاتا ہے وہ حب الوطنی کے

جذبے سے سرشار ہو کر دیا جاتا ہے اس لیے اس کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے لیکن ضرورت حقیقتاً اس کی ہے کہ حکومت کو بڑی بڑی رقمیں قرض دی جائیں۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے ہماری بچتوں میں اضافہ ہوگا۔ دوسرے یہ کہ مالی وسائل کو تیزی سے بڑھانے اور اس جنگ کو جو ایک بے شرم اور بے اصول دشمن کی جانب سے ہم پر تھوپ دی گئی ہے جیتنے میں مدد ملے گی۔ اس مقصد کے لیے نیشنل ڈیفنس بانڈ، ڈیفنس ڈپازٹ سرٹیفکٹ اور نیشنل ڈیفنس سرٹیفکٹ کے نام سے چھوٹی بچت کے سرٹیفکٹوں کے نئے سلسلے شروع کیے گئے ہیں اور انعامی بانڈ جاری کیے گئے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم دل کھول کر ان میں روپیہ لگائیں اور ایک آزاد اور خود دار قوم کی طرح انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اس فریضہ کا اپنے آپ کو اہل ثابت کریں جو ہم پر اس وقت عاید ہوتا ہے۔ ذیل میں مذکورہ بالا بانڈوں اور سرٹیفکٹوں کی نمایاں خصوصیتیں درج کی جا رہی ہیں۔

(۱) ۴½ فی صدی نیشنل ڈیفنس بانڈ ۱۹۷۲ء

ان بانڈوں پر جو ۱۰۰ روپے کی اکائیوں میں جاری کیے گئے ہیں ۴½ فی صدی سود ملتا ہے۔ سود ہر چھ مہینے پر واجب الادا ہوتا ہے۔ بانڈ کا روپیہ تاریخ اجرا سے دس سال کے بعد واجب الادا ہوگا۔ بانڈ کی خریداری کے لیے درخواستیں ریزرو بنک آف انڈیا کے دفتروں اور اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی شاخوں اور ذیلی بنکوں میں لی جاتی ہیں۔

(۲) ۴½ فی صدی دس سالہ ڈیفنس ڈپازٹ سرٹیفکٹ

یہ سرٹیفکٹ ۵۰ روپے کی اکائیوں میں جاری کیے گئے ہیں۔ ان پر ۴½ فی صدی سود ملے گا جس کی ادائیگی سالانہ ہوگی۔ اصل رقم تاریخ خریداری سے دس سال بعد واجب الادا ہوگی۔ سود کی رقم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ ایک شخص ۲۵۰۰۰ روپے کے اور مشترک خریدار ۵۰۰۰۰ روپے کے سرٹیفکٹ خرید سکتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں وہ رقم شامل ہوگی جو ٹریزری سیونگز ڈپازٹ سرٹیفکٹ میں لگائی گئی ہو۔

ان سرٹیفکٹوں کی خریداری کے لیے روپیہ ریزرو بنک آف انڈیا کے سبھی دفتروں، اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی شاخوں اور ذیلی بنکوں میں جو گورنمنٹ ٹریزری کا کام کرتے ہوں اور خزانوں اور ذیلی خزانوں میں قبول کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مستند ایجنٹوں کی معرفت بھی یہ سرٹیفکٹ خریدے جا سکتے ہیں۔

(۳) ۱۲ سالہ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکٹ

یہ سرٹیفکٹ ۵ روپے، ۱۰ روپے، ۵۰ روپے، ۱۰۰ روپے، ۵۰۰ روپے، ۱۰۰۰ روپے، ۵۰۰۰ روپے اور ۲۵ ہزار روپے کے ہوتے ہیں۔ اصل رقم ۱۲ سال کے بعد واپس ہوتی ہے۔ ۱۲ سال کے اندر سرٹیفکٹ پر ۷۵ فیصدی رقم اور ملتی ہے یعنی ۱۰۰ روپیہ کا سرٹیفکٹ ۱۷۵ روپے کا ہو جاتا ہے۔ ان سرٹیفکٹوں پر زائد ملنے والی رقم بھی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتی ہے۔ ان سرٹیفکٹوں میں ایک آدمی زیادہ سے زیادہ ۲۵۰۰۰ روپیہ (سابقہ پوسٹل سیونگز سرٹیفکٹوں کی رقم کے) اور دو شخص مشترکاً ۵۰۰۰۰ روپے لگا سکتے ہیں۔

(۴) پریمیم پرائز بانڈ ۱۹۷۲ء

یہ بانڈ بیرر بانڈ کی شکل میں جاری کیے گئے ہیں۔ ان کی خریداری کے لیے کسی درخواست کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ ریزرو بنک آف انڈیا کے دفتروں اسٹیٹ بنک آف انڈیا کی شاخوں اور ذیلی بنکوں، خزانوں، ذیلی خزانوں اور ڈاک خانوں سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اصل رقم بکری کی تاریخ سے پانچ سال بعد مع ۱۰ فی صدی پریمیم کے واپس ملے گی۔ اس طرح واجب الادا ہونے پر ۵ روپے کا بانڈ ۵ روپے ۵۰ نئے پیسے کا اور ۱۰۰ روپے کا بانڈ ۱۱۰ روپے کا ہو جاتا ہے۔

پریمیم کے علاوہ ۱۹۶۴ء میں دو مرتبہ قرعہ اندازی ہوگی۔ ہر قرعہ اندازی میں ۵ روپے کے بانڈ پر ۵۶۸ انعامات اور ۱۰۰ کے بانڈ پر ۲۴۳ انعامات دیے جائیں گے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔ دونوں بانڈوں پر سب سے بڑا انعام ۵۰ ہزار روپے کا ہوگا۔

۱۰۰ روپے قیمت کے بانڈ

ایک انعام	۵۰۰۰۰ روپے	۵۰۰۰۰ روپے
۲ انعامات	۲۵۰۰۰ روپے	۵۰۰۰۰ روپے
۵ انعامات	۱۰۰۰۰ روپے فی انعام	۵۰۰۰۰ روپے
۱۰ ″ ″	۵۰۰۰ روپے فی انعام	۵۰۰۰۰ روپے
۷۵ ″ ″	۲۰۰۰ روپے فی انعام	۱۵۰۰۰۰ روپے
۱۵۰ ″ ″	۱۰۰۰ روپے فی انعام	۱۵۰۰۰۰ روپے

بر

۲۲ ۵۰۰۰۰ روپے

۵ روپے قیمت کے بانڈ

نعام	۱۵۰۰۰ روپے کا	۱۵۰۰۰ روپے
ات	۱۰۰۰ روپے فی انعام	۲۰۰۰۰ روپے
″	۵۰۰ روپے فی انعام	۵۰۰۰۰ روپے
″	۲۰۰ روپے فی انعام	۵۰۰۰۰ روپے
″	۱۰۰ روپے فی انعام	۲۰۰۰۰۰ روپے
″	۵۰ روپے فی انعام	۱۵۰۰۰۰ روپے
۵		۵۰۰۰۰۰ روپے

انعام کی تعداد اور رقم محدود نہیں ہو گی بلکہ بانڈوں کی بکری
تھ ساتھ بڑھتی جائے گی۔

غیر فروخت شدہ بانڈ انعامات سے مستثنیٰ ہوں گے اور جملہ انعامات
فروخت شدہ بانڈوں ہی پر دیے جائیں گے۔

پریمیم اور انعام دونوں کی رقم انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہو گی۔

بہرحال ملک کی دفاعی ضرورتوں کے پیش نظر مالی وسائل کی
کی مختلف اسکیموں میں بڑے پیمانے پر بچتوں کی آمد کا سلسلہ جاری
کے لیے جیسا کہ شری مرارجی ڈیسائی نے اپنی تقریر میں کہا ضروری
ہم پیداوار بڑھائیں اور انتہائی کفایت شعاری سے کام لیں۔
ت شعاری کا سبق ہم کو قوم کے باپو سے اپنی جنگ آزادی کے دوران
۔ اب جب کہ ہمیں اپنی آزادی کو جسے ہم نے طویل جدوجہد کے بعد
ی بڑی قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے محفوظ رکھنا ہے۔ کفایت شعاری
س سبق کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

ں کو بڑھنے نہ دیا جائے

یہی نہیں بلکہ آج ہماری اقتصادیات کے ہم آہنگی کے ساتھ چلنے
ں پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے ہم میں سے ہر ایک کو
لہ پوری چوکسی سے کام لے اور اقتصادی ڈھانچہ کی ہم آہنگی
رار رکھنے میں تعاون کرے۔ قیمتوں کی سطح کو برقرار رکھنے کی ذمہ داری
ارسی گھر کی عورتوں، مزدوروں، بیوپاریوں اور تجارت پیشہ

لوگوں پر ہے۔ ذخیرہ اندوزی اور منافع بازی کا تدارک پوری قوت سے
صارفین تاجروں اور صنعت کاروں کو کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں یہ لوگ
حکومت سے کچھ کم اہم رول نہیں ادا کر سکتے۔

فضول خرچی کی روک تھام

اسی کے ساتھ ہم میں سے ہر ایک کو ہر قسم کے طمطراق، نمود و نمائش
اور فضول خرچیوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس بات کا خاص طور سے
خیال رکھنا چاہیے کہ تہواروں اور دوسری تقریبوں اور شادی بیاہ کے
موقعوں پر انتہائی سادگی برتی جائے۔ کسی ایسے کام میں روپیہ نہ لگایا جائے
جس سے ملک کی طاقت بڑھانے میں مدد نہ ملتی ہو۔ اپنی روزمرہ کی زندگی
میں ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ کس چیز کے بغیر ہم اپنا کام چلا سکتے
ہیں تاکہ قوم کو کسی ایسی چیز سے محروم نہ رہنا پڑے جس کی اس کو ضرورت ہے۔

سونا

مالی وسائل کی فراہمی کے سلسلے میں چندوں اور عطیوں میں سونا
اور سونے کے زیورات دیے جانے پر جو زور دیا جاتا ہے اس کے بارے
میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا روپیہ کافی نہیں ہے جو خاص طور سے
سونا مانگا جاتا ہے۔ اگر ہم تھوڑی سی توجہ کریں تو بات آسانی سے ہماری
سمجھ میں آجائے گی۔ صرف روپیہ دینا اس لیے کافی نہیں ہے کہ روپیہ
ہندستانی سکہ ہے جو ہندستان کے اندر اور چند پڑوسی ملکوں ہی میں چلتا
ہے لیکن سونا ایک ایسی چیز ہے جس کا تبادلہ کسی بھی غیر ملکی سکے سے آزادی
کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سونا دے کر ہم بیرونی ملکوں سے
اہم چیزیں خاص کر فوجی سامان اور دوسری ضروریات خرید سکتے ہیں۔
سونا دنیا کے تمام ملکوں میں ایک بیش بہا قومی اثاثہ تسلیم کیا جاتا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر ملکوں نے ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے اندرون
ملک پایا جانے والا سونا اس ملک کی حکومت کے ہاتھوں اور مرکزی بنک
میں محفوظ ہو جائے اور عوام کے ہاتھوں میں نہ رہے۔ لیکن ہمارے یہاں
معاملہ جداگانہ رہا ہے۔ اس ملک کے لوگوں میں سونا خریدنے اور اپنے پاس
رکھنے کا شوق اس قدر زیادہ رہا ہے کہ یہاں سونے کا نرخ ہمیشہ دنیا
کے بازاروں سے دگنا رہتا تھا۔ اسی شوق کے نتیجہ میں یہاں بہت سا سونا

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۴ پر)

بلند دروازے کا سنِ تعمیر

نیا دور لکھنؤ (اسپشل نمبر، اگست ۱۹۶۲ء) میں میرا ایک مضمون بعنوان "اکبر اپنی تعمیرات کے آئینے میں" شائع ہوا تھا۔ "بلند دروازہ" کے بیان میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ یہ دروازہ ۱۶۰۲ء میں اکبر کی دکن کی فتوحات کی یادگار میں بنوایا گیا تھا۔ اس پر ایڈیٹر نیا دور نے ایک اختلافی نوٹ لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ بلند دروازہ پر ایک کتبہ ہے "رشک طاق سپہر بلند"۔ اس کتبہ سے بہ حساب ابجد ۹۰۳ھ یا ۱۵۰۵ء کی تاریخ نکلتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دروازہ اسی سن میں بنوایا گیا ہوگا۔ ۲۔ مشرق و مغرب (بنگال اور گجرات) میں اکبر کو جو زبردست فتوحات حاصل ہوئی تھیں ان کی یادگار میں یہ دروازہ بنوایا گیا تھا۔ ۳۔ مشرقی جانب کے کتبہ سے ۱۰۱۰ھ میں اکبر کی صرف آمد سیکری ظاہر ہوتی ہے، بلند دروازہ کی تعمیر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اکبر نے ۱۰۱۰ھ (مطابق ۱۶۰۱ء) سے تقریباً ۱۶ برس پہلے سیکری کی سکونت ترک کر دی تھی اور سیکری ۱۶۰۱ء میں ایک غیر آباد شہر ہو چکا تھا۔ اس وقت ایسی جگہ بلند دروازہ بنوانے کی وجہ کوئی نہیں معلوم ہوتی۔

ایڈیٹر نیا دور کے اس اختلافی نوٹ کی بنیاد غالباً ڈاکٹر نند لال چٹرجی کی کتاب (GLORIE OF UTTER PRADESH) ہے۔ لیکن جیسا کہ میں آگے کی سطروں میں عرض کروں گا محض اس کتاب کی بنیاد پر بلند دروازہ کا سن تاریخ ۱۵۰۵ء قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

۱۔ ای۔ ڈبلو۔ اسمتھ نے آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی طرف فتح پور سیکری کی عمارات کا مفصل جائزہ لیا ہے اور اس کے نتائج چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ جلد چہارم مطبوعہ الہ آباد ۱۸۹۸ء کے دوسرے باب میں بلند دروازہ کا مفصل بیان ہے صفحہ ۱۰ پر بلند دروازہ پر پائے جانے والے کتبات کی فہرست ہے۔ اس میں مندرجہ بالا کتبہ کا ذکر نہیں ہے۔ اسمتھ صاحب اور ان کے ساتھی ہر عمارت کی ایک ایک اینٹ کا جائزہ خوردبین سے لیتے تھے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ کتبہ ۱۵۹۸ء میں بلند دروازہ پر موجود نہیں تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ کتبہ آج بلند دروازہ پر موجود ہے تو بھی وہ تاریخی اعتبار سے قطعاً لا اعتبار ہوگا۔ (قطب مینار پر بھی "پرتھی" یعنی پرتھوی راج کا نام بعد ہی میں کندہ کیا گیا تھا۔) اس کے علاوہ بلند دروازہ میں نے خود دیکھا ہے لیکن مجھے یہ کتبہ کہیں نظر نہیں آیا۔ پرسی براؤن (PERCY BROWN) ہیول (HAVELL) اور دوسرے ماہرینِ فنِ تعمیر بھی بلند دروازہ کا سن تعمیر ۱۶۰۲ء ہی لکھتے ہیں۔

۲۔ گجرات ۱۵۷۳ء میں پہلی مرتبہ فتح ہوا تھا۔ ۱۵۰۵ء میں گجرات کی بغاوت فرو کی گئی تھی۔ البتہ اکبر کی فتوحات کا سلسلہ ۱۶۰۱ء تک جاری رہا اور قلعۂ اسیر گڑھ کی تسخیر (۱۶۰۱ء میں) اس سلسلہ کا شاندار اختتام تھا۔

فتح پور سیکری کی تعمیر کا کام ۱۵۶۹ء میں شروع ہوا اور ۱۶۰۱ء تک جاری رہا[1] حالانکہ ۱۵۸۰ء میں اکبر نے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنا لیا اور وہ وہاں ۱۵۹۸ء تک رہا بعد ازاں وہ آگرہ منتقل ہو گیا۔ محض اس لیے کہ فتح پور سیکری مغل سلطنت کا پایۂ تخت نہ رہا اس وجہ سے بالکل ویران ہو گیا تو یہ قیاس نہیں ہے کیوں کہ اگر پایۂ تخت نہ رہنا ہی ویرانی کا باعث ہے تو یہی بات ہم دہلی، آگرہ اور لاہور کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔ مزید برآں سیکری کی فوجی اہمیت ہمیشہ رہی کیوں کہ بھرت پور اور راجپوتانہ کا راستہ سیکری سے ہو کر جاتا تھا۔

علاوہ بریں فتح پور سیکری ہی میں شیخ سلیم چشتی کا مزار مبارک ہے ظاہر ہے کہ ایسی جگہ مرجع خلائق ہوتی ہے۔ اس کے ویران اور غیر آباد ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر یہ مقام ۱۶۰۱ء میں ویران ہی ہو چکا تھا تو اکبر اس ویرانے میں آیا ہی کیوں؟

جامع مسجد سیکری ۷۲-۱۵۷۱ء میں تعمیر ہوئی۔ جامع مسجد کے تین دروازے تھے، شمالی جنوبی اور مشرقی۔ جنوبی دروازہ کی جگہ پر بعد میں "بلند دروازہ" کی تعمیر ہوئی۔ مسجد اور بلند دروازہ کی تعمیر میں کچھ وقفہ تو ہونا چاہیے۔

---

[1] The Moghal Architecture of Fatehpur Sikri, Part III, Allahabad, 1897 By W. E. W. (Smith)

ڈاکٹر نند لال چٹرجی نے اپنے دلائل میں سر طامس ولیم بیل (THOMAS WILLIAM BEA) کی کتاب مفتاح التواریخ (نول کشور پریس، کانپور) کا جو ۱۸۶۰ء کے بعد لکھی گئی ہے، حوالہ دیا۔ انھوں نے بلاک مین (BLOCK MANN) کا نام بھی لیا۔ دراصل پروفیسر بلاک مین نے مفتاح التواریخ کی بنیاد پر ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال (اگست ۱۸۷۴ء) میں ایک مضمون پڑھا تھا جو اسکی روداد میں شایع ہو چکا ہے[1]

لہٰذا اب ہمارے سامنے صرف ایک شہادت ہے مفتاح التواریخ۔ مفتاح التواریخ کے الفاظ حسب ذیل ہیں :۔

"دروازہ کلاں فتح پور کہ مشہور بہ بلند دروازہ است در سنہ نہصد و دسہ تعمیر یافتہ۔ تاریخ آں ازیں مصرع استخراج می یابد "شدہ طاق سپہر بلند" بر بازدی دروازہ مذکور ایں عبارات و ابیات فارسی و عربی منقوش است کتبہ فارسی اینست حضرت شاہنشاہ بارگاہ ظل اللہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ فتح ملک دکن و اندیس کہ خاندیس بود نمود در سنہ ۴۶ الٰہی موافق سنہ ۱۰۱۰ھ بہ فتح پور رسید۔ ت آگرہ فرمودند۔" (ص ۱۰۱)

جیسا کہ میں پیشتر عرض کر چکا ہوں اور اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ مصرع "شدہ رشک طاق سپہر بلند" بلند دروازہ پر موجود نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتا تو کتبہ فارسی کے ضمن میں بیل صاحب اس کو ضرور نقل کرتے۔ دوسرا پورا مصرع ہے "شدہ رشک طاق سپہر بلند" جب ہم اس سے تاریخ نکالیں گے تو کچھ اشارات ضرور ہونا چاہیے کہ ہم "شدہ" کو چھوڑ کر اعداد شمار کریں۔ بیل صاحب نے اور کچھ نہیں لکھا یا بتایا ہے اور "شدہ" کے علاوہ چار لفظوں سے ۹۸۳ھ اخذ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ بیل صاحب کا بیان مبہم ہے کہ یہ مصرع بلند دروازہ پر ہے بھی یا نہیں۔

بیل صاحب کو تاریخ کہنے میں اچھا خاصا کمال حاصل تھا۔ گمان غالب ہے کہ یہ مصرع تاریخی خود انھوں نے ہی کہا تھا کیوں کہ معاصرین کی کسی کتاب میں (ابھی تک) یہ مصرع میری نظر سے نہیں گزرا۔ نہ بدایونی کی منتخب التواریخ میں نہ ابوالفضل کے اکبرنامہ اور آئین اکبری میں۔ طبقات اکبری مصنفہ نظام الدین احمد بھی اس سلسلہ میں خاموش ہے۔

بیل صاحب نے اپنے ماخذ کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے کہ بلند دروازہ سنہ ۹۸۳ھ یعنی ۱۵۷۵-۷۶ء میں تعمیر کیا گیا۔

ایسی صورت میں ایک کتبہ تاریخی جو بلند دروازہ پر موجود ہے یعنی ۱۰۱۰ھ (مطابق ۱۶۰۲ء) اس پر اعتماد کرنا زیادہ بہتر ہے جب تک کہ کوئی ٹھوس ثبوت ہمیں نہ مل جائے کہ بلند دروازہ سنہ ۹۸۳ھ میں تعمیر ہوا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ اس کی تعمیر سنہ ۱۶۰۲ء میں ہوئی۔ میں اپنی رائے بدلنے کو ہمہ وقت تیار ہوں اگر کچھ محققین اس پر اور روشنی ڈال سکیں۔

[1] Journal and Proceedings of Asiatic society of Bengal, 1874, P. 1747.

ملک کا بچاؤ اور ہمارا فرض

(بسلسلہ صفحہ ۴۱)

...کر رکھا گیا ہے اور اسے کسی کار آمد یا پیداواری مقصد میں نہیں لگایا ہے۔ بہر حال اب ہمارے لیے ایک اچھا موقع ہے کہ ہم اس دبے سونے کو نکالیں اور دنیا کے بازار میں اس کی جو قیمت ہے اس کے مطابق سونا یا نڈ جس پر معقول سود بھی ملتا ہے خریدیں۔ اس طرح جو سونا اور سونے کے زیورات ریزرو بنک آف انڈیا پہنچیں گے غیر ملکی زرمبادلہ حاصل کرینگے۔ پھر اس کی مدد سے جیسا کہ پہلے کہا گیا محاذ پر جوانوں کیلیے ہتھیار اور دوسرا سامان حاصل کیے جاسکیں گے جس کی مادر وطن کے وقار اور آزادی کی حفاظت کے لیے اس وقت سخت ضرورت ہے۔

مراسلہ

نوراللغات اور فرہنگِ آثر

نوراللغات پر جو اعتراضات فرہنگِ آثر میں درج ہیں ان میں سے بعض کے جوابات طاہر صاحب (خلف حضرت نورالحسن صاحب مؤلف نوراللغات) کی طرف سے رسالہ نیا دور لکھنؤ بابت اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء میں بطور مراسلہ بعنوان "حضرت آثر لکھنوی اور نوراللغات" شایع ہوئے ہیں۔ ایک آزاد اور غیر جانبدار شخص کی حیثیت سے محض بر بنائے خدمت زبان، اعتراضات اور طاہر صاحب کے جوابات کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ طاہر صاحب کے اعتراضات اور میرا تبصرہ حسب ذیل ہے :-

اعتراض نمبر (۱)۔ جناب آثر نے بعض الفاظ اور محاورات وغیرہ کے بارے میں لکھ دیا کہ یہ لفظ یا محاورہ نوراللغات میں درج نہیں مثلاً الٹی آنتیں گلے پڑنا۔ آنکھ لگنا۔ آنکھ بدلنا۔ آنکھ جھپنا (چھپنا ؟) وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ الفاظ علی الترتیب نوراللغات کے صفحات ۳۰۰، ۳۷، ۱۵۲ اور ۱۵۰ پر درج ہیں۔

تبصرہ۔ نوراللغات مطبوعہ نیر پریس پاٹا نالہ لکھنؤ نومبر سنہ ۱۹۲۴ء کے ان صفحات پر جن کا حوالہ ہے زیر نظر الفاظ کا کہیں نام و نشان نہیں[۱]

اعتراض نمبر (۲)۔ فرہنگِ آثر میں کئی جگہ کسی فارسی محاورے یا مقولے کے متعلق بھی (جو عام طور سے اردو میں رائج بھی نہیں ہیں) آثر صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ نوراللغات میں درج نہیں، مثلاً "گر یار اہل ست کار سہل است" اول تو نوراللغات اردو کا لغت ہے جس میں ہر فارسی محاورے کے درج ہونے کی ضرورت نہیں۔ پھر حضرت آثر نے مذکورہ مقولے کا اردو میں کوئی استعمال بھی تو نہیں بتایا اور صرف یہ فرما دیا کہ میر نے اس کا ترجمہ اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

تبصرہ: آثر صاحب نے میر کا شعر بھی درج کر دیا تھا۔ میر نے اپنے شعر میں محاورے کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے یعنی یار رستہ جھٹ ہے۔ زباں دراز دشنام گر ہے۔ نوراللغات میں کثرت سے فارسی کے ایسے الفاظ و محاورات

---

[۱] یہ الفاظ نوراللغات کے اسی ایڈیشن میں بالترتیب ص۳۹۶، ص۵، ص۱۱۱ اور ص۱۱۲ پر درج ہیں۔ ایڈیٹر

درج ہیں جو اسی صورت اردو میں عام طور سے مستعمل نہیں اور مثال یا سند بھی پیش نہیں کی گئی، مثلاً۔ آب آہن۔ آب آہن تاب۔ آب آئینہ۔ آب آبگیں۔ آب تیر۔ آب تیغ۔ آب خجلت۔ آب خجالت۔ آبداں۔ آب سیاہ وغیرہ۔

اعتراض نمبر (۳)۔ اعتراض کرتے وقت حضرت آثر نے اکثر فارسی کے مستند لغات پر نظر نہیں ڈالی اور نوراللغات میں مندرج الفاظ کے بارے میں فرہنگِ آثر میں یہ لکھ دیا کہ فارسی لغات میں درج نہیں یا سند نہیں پیش کی گئی۔ مثلاً آب آتش رنگ کے معنی نوراللغات میں درج ہیں "شراب سرخ۔ اشک خونیں"۔ آثر صاحب نے اپنی فرہنگ میں لکھ دیا کہ اشک خونیں کی طرف اشارہ بہت مشتبہ ہے کوئی سند بھی پیش نہیں کی اور فارسی لغات میں بھی آب آتش رنگ کے معنی اشک خونیں نہیں ملے۔ فارسی لغات میں در اصل ان کے وہی معنی دیے ہیں جو نوراللغات میں درج ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ ہفت قلزم: "از شراب لعلی و اشکِ خونیں باشد"۔ فرہنگ آنند راج میں درج ہے۔ آب آتش رنگ و اشک خونیں۔ (صائب)

زخاک افسردہ تر و زباد سرگرداں ترم باشم علاج درد من از آب آتش رنگ می آید

تبصرہ: کیا بہار عجم فارسی کا مستند لغت نہیں ہے؟ اس کا اندراج ملاحظہ فرمائیے۔ آب آتش رنگ۔ شراب سرخ۔ میرزا صائب ؎

زخاک افسردہ تر و زباد سرگرداں ترم صنما علاج درد من از آب آتش رنگ می آید

اشک خونیں کا کہیں ذکر بھی نہیں۔ یہی شعر طاہر صاحب نے بادنیٰ تغیر درج کیا ہے اس میں سرگرداں ترم باشم ہے[۱]۔ لغات کشوری کا اندراج دیکھئے۔ آب آتشیں۔ (ف) تیز و تند شراب؛ اشک خونیں کا یہاں بھی تذکرہ نہیں[۲]۔

طاہر صاحب نے صائب کا شعر بظاہر اشک خونیں کی تائید میں پیش کیا ہے افسردگی و سرگشتگی کا علاج تیز و تند شراب (آب آتش رنگ) سے ہوگا یا آنسو بہانے سے۔

یہی تبصرہ آب ارغوانی کے متعلق ہے بہ معنی اشک سرخ۔ اس کے

---

[۱] کتابت اور ریڈنگ کی غلطی ہے۔ اصل میں صائب لکھا ہے۔ ایڈیٹر

[۲] شعر تو اشک خونیں کی تائید میں نہیں پیش کیا جا سکتا مگر ہفت قلزم اور فرہنگ آنند راج کا جو حوالہ دیا گیا ہے کہ ان میں "آب آتش رنگ" کے معنی "اشک خونیں" بھی دیے گئے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا۔ ایڈیٹر

ذیل میں جن کتابوں کا حوالہ دیا ہے ان کی عبارت بھی نقل نہیں کی گئی۔[1]
ان تمام باتوں کو جانے دیجئے۔ سوال یہ ہے کہ آب آتش رنگ یا آب ارغوانی کیا اردو میں بہ معنی اشک سرخ استعمال ہوئے ہیں؟ میرا جہاں تک مطالعہ ہے جواب نفی میں ہے۔ بار ثبوت انھیں کے فرمودات کے بموجب ظاہر صاحب پر ہے۔

اعتراض نمبر ۴۔ لم پرا کے متعلق فرہنگ آثر میں لکھا ہے کہ لکھنؤ میں کوئی نہیں بولتا۔ حالانکہ اگر لکھنؤ کے کبوتر بازوں سے پوچھا جائے تو وہ بتا دیں کہ لم پرا وہ کبوتر ہے جس کے پر دراز ہوں۔ رشک لکھنوی نے نفس اللغہ میں لم پرا بہ معنی دراز پر دیا ہے۔

تبصرہ۔ اثر صاحب کی عبارت یہ ہے "میرے کان اس سے آشنا نہیں اور اس کی صحت بہت مشتبہ ہے جب تک کسی لکھنؤ والے کی تحریر سے مثال نہ پیش کی جائے"۔ میں آثر صاحب کا ہمنوا ہوں۔ کیا اچھا ہو اگر لکھنؤ کے کبوتر بازوں کی ٹکڑی پیش کرنے کے بجائے طاہر صاحب نفس اللغہ کا اصل نسخہ اڈیٹر صاحب نیا دور کو دکھا دیں کیونکہ مشہور یہ ہے کہ چند ابتدائی حروف کے علاوہ اس کتاب کا مکمل نسخہ معرض وجود میں نہیں۔ نفائس اللغات ضرور ہے مگر اسکے مولف ایک بلگرامی بزرگ ہیں۔

اعتراض نمبر (۵)۔ اثر صاحب نے اپنے شعر جا بجا مثال میں پیش کئے ہیں یہ نازیبا ہے۔

تبصرہ۔ اگر صاحب نور اللغات کے لئے اپنے والد ماجد حضرت محسن کاکوروی کے اشعار سند میں پیش کرنا جائز تو حضرت آثر پر ایسی پابندی کیوں لگائی جائے۔

اعتراض نمبر (۶)۔ مستشرقین یعنی فیلن پلیٹس کے حوالے بڑے وثوق سے دیے گئے ہیں حالانکہ ثبوت اہل زباں کے کلام سے دینا چاہیے۔

تبصرہ۔ فیلن وہ شخص تھا جس کی کتاب لغت کی تیاری میں سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ کے علاوہ متعدد ماہرین زبان اردو شریک تھے۔

اعتراض نمبر (۷)۔ آبشار مونث ہے نہ کہ مذکر۔

[1] کتابیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اڈیٹر

تبصرہ۔ آثر صاحب نے وضاحت کے ساتھ یہ اعتراف کرکے کہ صاحب نور اللغات اور جلال وغیرہ نے اس کو مونث قرار دیا ہے اتنا اضافہ کیا ہے کہ جن لوگوں نے آبشار دیکھا ہے وہ اس کو مونث نہ کہیں گے۔ پانی کا حجم اور زور شور سے بلندی سے گرنا اس کی تانیث کے منافی ہیں۔ تذکیر کی تائید میں انھوں نے طلسم فصاحت مولفہ محمد حسین جاہ سے ایک مثال بھی پیش کی ہے۔ اس سے تذکیر و تانیث مختلف فیہ تو ہو ہی گئی۔ شکسپیر کی ڈکشنری کا اندراج بھی اس کے مختلف فیہ ہونے کی تائید میں ہے۔ پلیٹس نے بھی اسے مذکر اور مونث دونوں طرح لکھا ہے۔

ایک اور محاورہ "چڑیاں چگ گئیں کھیت" کے سلسلے میں اوپر میں ایک عبارت نقل کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آثر صاحب کی عبارت لفظاً بہ لفظ نقل کر دی گئی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ حضرت آثر نے لکھا تھا کہ ہاں ایک بات اور ہے۔ صحیح چڑیاں بہ کسر اول۔ "اس مثل میں بضم اول پڑھیے تاکہ چڑیاں اور چگ میں صوتی توازن قائم رہے۔"

اثر صاحب اس تغیر کو اس مثل تک محدود کر دیتے ہیں مگر طاہر صاحب اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔

اعتراض نمبر (۸)۔ بعض جگہ حضرت آثر نے کچھ کا کچھ دیکھا اور کچھ کا کچھ لکھ دیا مثلاً "بالم کھیرا" کے بارے میں لکھتے ہیں "بالم کھیرا" ایک قسم کا سفیدی مائل چھوٹا کھیرا ہے۔ فیلن سے میری تائید ہوتی ہے۔ فیلن نے بالم کھیرے کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے A Superior white cucumber.

تبصرہ۔ اثر صاحب نے فیلن کی عبارت نہیں نقل کی صرف حوالہ دے دیا ہے۔ کیا عمدہ سفید کھیرا عام بے ہنگم بے ڈول ہرے کھیرے سے بہتر نہیں ہوا؟ بالم کے معنی ہی مرد محبوب کے ہیں۔ نور اللغات میں صرف اتنا اندراج تھا ایک قسم کا بڑا کھیرا۔ اثر صاحب نے بالم کھیرے کے خصوصیات بیان کر دیئے اور تائید میں فیلن کا حوالہ دے دیا۔

محمد مجتبیٰ شمس آبادی

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

اتر پردیش میں ہوم گارڈس کی بھرتی ـــــ آل انڈیا این۔ سی۔ سی ٹریننگ کیمپ ـــــ خواتین کا جذبۂ عمل ـــــ ایک محبِ وطن خاندان ـــــ صنعتی مسائل کے لیے اعلیٰ طاقتی رابطہ کمیٹی ـــــ زراعت اور مواصلات کی رقموں میں اضافے ـــــ زرعی پیداوار کے نشانے میں اضافے ـــــ کولڈ اسٹوریج کی سہولتیں ـــــ گوشالوں کو مالی امداد ـــــ مذہبی اہمیت کے شہروں میں شراب کے لیسنسوں پر پابندی ـــــ انجینیرنگ ڈپلومے۔ روڈویز کے قواعد ملازمت ـــــ

وزیر اعلےٰ شری سی۔ بی گپتا نے ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں بتایا کہ حکومت ہند کی ہدایات کے مطابق اترپردیش میں عنقریب ہوم گارڈ کا ایک دستہ بنایا جائے گا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ آیندہ سال ریاست میں سول ڈیفنس فورس کی ٹریننگ پر تخمیناً ۱۰ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔

وزیر اعلےٰ نے کہا کہ اتر پردیش میں پی۔ آر۔ ڈی اسکیم پہلے ہی سے چل رہی ہے لیکن ہوم گارڈ کی اسکیم حکومت ہند نے حال ہی میں شروع کی ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ہوم گارڈ شہری علاقوں کے علاوہ دیہی علاقوں میں بھی بلاک کی سطح پر قائم کیے جائیں گے۔

ایک ضمنی سوال کے جواب میں وزیر اعلےٰ نے کہا کہ ہوم گارڈ ایک آئینی تنظیم ہوگی جس کا دائرۂ عمل پوری ریاست پر مشتمل ہوگا ضرورت پڑنے پر ہوم گارڈ کو باہر بھی بھیجا جاسکے گا۔ انھوں نے کہا اس کے برعکس پی۔ آر۔ ڈی کا دائرۂ عمل صرف دیہی علاقوں تک محدود رہے گا خواتین کو بھی ہوم گارڈ میں کام کرنے کا موقع دیا جائے گا۔

وزیر اعلےٰ نے کہا کہ حکومت نے این۔ سی۔ سی۔ پی۔ آر۔ ڈی اور ہوم گارڈ دستوں کو ٹریننگ دینے کے لیے فوجی افسروں کی تقرری پر غور کیا تھا اور ان میں سے کچھ تقرریاں بھی کی گئی ہیں۔

ایک دوسرے ضمنی سوال کے جواب میں وزیر اعلےٰ نے کہا کہ جتنی رائفلیں دستیاب ہوں گی اتنے ہی لوگوں کو رائفل کی ٹریننگ دی جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ٹریننگ دینے کے لیے حکومت لائسنس یافتہ افراد کی رائفلیں حاصل کرنے کے سوال پر بھی غور

ـــــــــــ

مدراس۔ یو۔ پی۔ دہلی اور پنجاب کی کیڈٹ کور ڈائرکٹوریٹ اس سال موسم گرما میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے آل انڈیا این۔ سی کیمپ لگائیں گے۔

یو۔ پی کیڈٹ کور ڈائرکٹوریٹ دہرہ دون ریلوے اسٹیشن تقریباً پانچ میل دور واقع ڈی۔ اے۔ وی کالج پریم نگر دہرہ دون میں کیمپ منعقد کرے گا۔

لڑکوں کے کیمپ آئندہ ۲۰ مئی اور لڑکیوں کے آئندہ ۲۶ کو شروع ہوں گے۔ یہ کیمپ بالترتیب ۱۴ اور ۱۲ دن کے ہوں گے دوسری ریاستوں کے ڈائرکٹوریٹ جو کیمپ منعقد کریں ان میں سے ہر کیمپ کے لیے یو۔ پی کیڈٹ کور ڈائرکٹوریٹ آٹھ اور آٹھ لڑکیاں بھیجے گا۔ آٹھ لڑکوں میں این۔ سی۔ سی رائفل کے سینیر ڈویژن آرمی ونگ کے تین اور سینیر ونگ ڈویژن نیول ایر ونگس کے ایک ایک کیڈٹ ہوں گے۔ آٹھ لڑکیوں میں سینیر ڈ کی پانچ اور این۔ سی۔ سی رائفلس کی تین کیڈٹ ہوں گی۔

اس امر سے متعلق بعد میں اعلان کیا جائے گا کہ یہ کیمپ اور کہاں منعقد ہوں گے۔

ـــــــــــ

اُتر پردیش میں ہر طبقہ کی خواتین ان جوانوں کو سامان آسا

فراہم کرنے میں پیش پیش ہیں جو ہماری سرحدوں کی حفاظت کر رہے ہیں اور بلندیوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ ان خواتین نے سیوا سمتی کی تنظیم کی ہے جس کی اتر پردیش کے ضلعوں میں ۳۲ شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔

یہ معمولی عورتیں جن کے دلوں میں خدمت کی سچی لگن ہے اور جو اس امر سے بھی بے خبر ہیں کہ وہ کوئی غیر معمولی کام انجام دے رہی ہیں۔ ان کے پر خلوص جذبۂ عمل کا اندازہ ان مثالوں سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک خاتون نے اپنا سارا جیب خرچ سمتی کے دفتر آنے جانے میں خرچ کر دیا اور سردی کے موسم میں اپنے لیے ایک ساری بھی نہیں خرید سکی یا وہ خاتون جس نے کسی جوان کے لیے ایک جرسی بننے کی خاطر اپنے خاندان کے لیے کوئی سوئٹر وغیرہ نہیں بنایا یا وہ خاتون جس نے دفتر میں تمام دن کام کرنے کے بعد بھی چیزیں گننے اور کمبل بھیجنے میں مدد دینے کے لیے وقت نکال لیا۔

ضلع جون پور کے ایک محب وطن خاندان کے چشم و چراغ شری جگدیش پاٹھک نے مادر وطن کی حفاظت کے لیے اپنی قربانی پیش کر کے وفاداری اور وطن پروری کی تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

شری جگدیش پاٹھک بدلا پور ڈویلپمنٹ بلاک میں نو ٹیدا کے قریب موضع خالص پور (ڈاکخانہ لیدوکا، تحصیل شاہ گنج ضلع جون پور) کے رہنے والے تھے۔ ان کی عمر ۲۳ سال کی تھی۔ تین برس قبل وہ ہندستانی فوج میں شامل ہوئے تھے۔ جب چینیوں نے ہماری شمالی سرحدوں پر شرمناک اور بہیمانہ حملہ کیا تو یہ بھی مادر وطن کی حفاظت کے لیے محاذ جنگ پر گئے۔ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں پر غیر معمولی سردی اور پہاڑی علاقے کے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے ہمارے جوانوں نے چینی حملہ آوروں کا جس پامردی اور شجاعت کے ساتھ مقابلہ کیا وہ تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ یہیں ایک گھمسان کی لڑائی میں شری جگدیش پاٹھک لاپتہ ہو گئے۔

مادر وطن پر خود کو نثار کر کے شری جگدیش پاٹھک نے اپنے اس خاندان کا نام روشن کر دیا جو ہمیشہ سے محب وطن رہا ہے۔ شری جگدیش کے والد کا نام شری مکتی ناتھ پاٹھک ہے جنھوں نے ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں نمایاں عملی حصہ لیا۔ ان کے چچا شری اودے راج پاٹھک کو جدوجہد آزادی کے سلسلے میں وصنیا مئو کے تاریخی واقعہ میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی۔

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری چندر بھان گپتا نے ۲ مارچ کو یہ اعلان کیا کہ اتر پردیش کے صنعت کاروں کو صنعتوں کے چلانے اور فروغ دینے میں جو مسائل درپیش ہوتے ہیں ان کو حل کرنے کے لیے ایک اعلیٰ طاقتی رابطہ کمیٹی بنائی جائے گی۔

مجوزہ کمیٹی میں، وزیر اعلیٰ نے کہا، مختلف متعلقہ محکموں جیسے مالیات منصوبہ بندی، بجلی، صنعت اور زراعت وغیرہ کے سکریٹریوں پر مشتمل ہوگی۔ کمیٹی کا جلسہ مہینہ میں ایک بار ہوگا جس میں صنعت کار اپنی دقتیں اور مسائل رکھ سکتے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے جو دو روزہ ریاستی صنعتی کانفرنس کے افتتاحی جلسہ میں تقریر کر رہے تھے یہ بھی اعلان کیا کہ صنعتوں کو دی جانے والی بجلی کی شرح کو پڑوس کی دوسری ریاستوں کی شرح سے بڑھنے نہیں دیا جائے گا۔

شری گپتا نے صنعت کاروں سے کہا کہ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ سرمایہ کی کمی سے اتر پردیش کی صنعتوں کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے اور اگر ضرورت ہوئی تو ریاستی صنعتی کارپوریشن اور اتر پردیش مالیاتی کارپوریشن جیسی تنظیموں کو مزید سرمایہ بہم پہنچایا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ صنعت کاروں کا بھی فرض ہے کہ وہ تمام سرکاری بقایا بیباق کر دیں۔

اس سے پہلے مختلف ذیلی کمیٹیوں کی رپورٹوں پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے اس پر زور دیا کہ جہاں تک ممکن ہو نجی گفت و شنید کے ذریعہ صنعت کے لیے زمین حاصل کی جائے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بھی ضروری ہے کہ بے گھر کسانوں میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ وہ بھی اس صنعتی کارخانہ میں ساجھی دار ہیں جس کے لیے ان کی زمینیں لی گئی ہیں۔

وزیر اعلیٰ کے مشورہ پر کانفرنس نے یہ سفارش کی کہ جہاں کہیں صنعتی اغراض کے لیے زمین کا جبری حصول ضروری ہو بے گھر کسانوں کو زمین کے معاوضہ کے ساتھ کارخانہ میں بغیر کوئی پونجی لگائے ان کی زمین کی مالیت

کے ۵ فی صدی کے برابر حصے دیے جائیں۔

کانفرنس کو بتایا گیا کہ سیلس ٹیکس کے سوال پر غور کرنے کے لیے حکومت ایک کمیٹی مقرر کر چکی ہے اور اس کمیٹی کے جلسے بھی ہو چکے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ کمیٹی جلد ہی اپنی عبوری سفارشات اور قطعی رپورٹ پیش کر دے گی۔

کانفرنس نے خام مال سے متعلق ذیلی کمیٹی کی رپورٹوں پر بھی غور کیا اور حکومت سے اپیل کی کہ وہ اتر پردیش کے لیے کوئلہ۔ لوہا۔ فولاد۔ درآمد شدہ کپاس اور دوسرے ضروری خام مال کے غیر منصفانہ الاٹمنٹ کی بے ضابطگیوں کو دور کرانے کے لیے پوری پوری کوشش کرے۔ کانفرنس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اتر پردیش کو اس کے رقبہ اور آبادی کے تناسب سے خام مال کا بہت کم کوٹہ ملتا ہے اور یہ اس کی صنعتی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

چھوٹی صنعت کے وزیر شری پھول سنگھ نے اس سے اتفاق کیا کہ اتر پردیش جیتنی بڑی ریاست کے لیے خام مال کا الاٹمنٹ واقعی بہت کم ہے۔ انھوں نے کانفرنس کو یقین دلایا کہ وہ خام مال کے الاٹمنٹ کے سوال پر جلد ہی مرکزی حکومت سے رجوع کریں گے اور اس بات کی پوری کوشش کریں گے کہ اتر پردیش کے ساتھ انصاف ہو۔

کانفرنس کے مذاکرات کو ختم کرتے ہوئے وزیر منصوبہ بندی شری ہرگووند سنگھ نے اس امر پر زور دیا کہ صنعت کار اپنے نقطۂ نظر کو بدلیں تاکہ پروڈیوسر۔ کارخانہ دار اور صارفین سبھی کے مفاد کا تحفظ ہو اور کسی کو بھی شکایت کا موقع نہ رہے۔

اتر پردیش کے وزیر منصوبہ بندی شری ہرگووند سنگھ نے یو۔پی ودھان سبھا میں بتایا کہ گو ہنگامی حالات کے نتیجہ میں ریاست کے تیسرے منصوبہ کی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے تاہم توجیہات میں ردوبدل کر دیا گیا ہے۔ بیشتر صورتوں میں پہلے کی مقرر کی ہوئی رقمیں گھٹا دی گئی ہیں۔ لیکن کچھ مدیں ایسی بھی ہیں جن کی رقموں میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ تفصیلات بتاتے ہوئے وزیر منصوبہ بندی نے کہا کہ مرکزی امداد سنہ ۶۴-۱۹۶۳ء میں ۷۰ کروڑ روپیہ سے گھٹا کر ۵۷٫۹۶ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں سال مذکور کا منصوبہ بندی کا مجموعی خرچ ۱۰۳٫۴۸ کروڑ روپئے سے گھٹا کر ۹۲ کروڑ کر دیا گیا ہے۔

زراعت: رسل و رسائل و مواصلات۔ اطلاعات اور پبلسٹی کے لیے رقمیں بڑھا دی گئی ہیں۔ ابتداً زراعت کے لیے ۱۶۷۴٫۸۵ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا تھا۔ اب یہ رقم بڑھا کر ۱۷۱۴٫۶۷ لاکھ روپیہ کر دی گئی ہے۔ رسل و رسائل و مواصلات کے لیے ۳۵۲٫۶۰ لاکھ روپیہ مقرر کیا گیا تھا۔ اب بڑھا کر ۶۵۵٫۶۲ لاکھ روپیہ کر دیا گیا ہے۔ اطلاعات اور پبلسٹی کی رقم ۹۱٫۶۹ لاکھ روپیہ سے بڑھا کر ۱۵۱٫۶۹ لاکھ روپیہ کر دی گئی ہے۔

امداد باہمی اور اجتماعی ترقی کی انتہائی رقمیں ۱۳۱۵٫۴۳ لاکھ روپیہ سے گھٹا کر ۱۰۶۹٫۸۸ لاکھ روپیہ۔ آبپاشی اور بجلی کی رقمیں ۲۵۱۰۱٫۹۱ لاکھ روپیہ سے گھٹا کر ۳۰۱۰٫۹۱ لاکھ روپیہ۔ صنعتوں اور معدنیات کی رقم ۴۷۰٫۱۹ لاکھ روپیہ سے گھٹا کر ۳۷۴٫۹۷ لاکھ روپیہ۔ اور سماجی خدمات کی رقم ۲۴۳۴٫۵۲ لاکھ روپیہ سے گھٹا کر ۱۸۹۸٫۶۲ لاکھ روپیہ اور متفرق کاموں کی رقمیں ۶۱۰٫۰۵ لاکھ روپیہ سے گھٹا کر ۴۸۰٫۹۳ لاکھ روپیہ کر دی گئی ہیں۔

اتر پردیش میں تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے آخر تک زراعتی پیداوار کا نشانہ ۱۲۵ لاکھ ٹن سے بڑھا کر ۱۸۲٫۱۶ لاکھ ٹن کر دیا گیا ہے۔ یہ اعلان وزیر زراعت شری چرن سنگھ نے ودھان سبھا کے سوالات کے وقفہ میں شری نرسنگھ نرائن پانڈے کے ایک سوال کے جواب میں کیا۔

انھوں نے بتایا کہ اس مقصد کے لیے کابینہ کی سطح پر ایک زراعتی پیداوار کمیٹی بنائی گئی ہے جو وزیر اعلےٰ۔ وزیر زراعت۔ وزیر آبپاشی وزیر امداد باہمی اور وزیر ترقی پر مشتمل ہوگی۔ یہ کمیٹی زراعت سے متعلق معاملات میں اعلےٰ سطح پر فوری فیصلے کرے گی۔

وزیر زراعت نے مزید بتایا کہ ایک دوسری کمیٹی بھی بنائی گئی ہے جس میں زراعت۔ آبپاشی امداد باہمی اور مالیات کے سکریٹری اور محکموں کے افسران اعلےٰ شامل ہیں اور ڈولپمنٹ کمشنر اس کے ہیں۔

اس کمیٹی کا کام زراعتی پیداوار کے کاموں پر مربوط طریقہ سے غور و خوض کرنا۔ ٹھوس فیصلے کرنا۔ ان کے عملدرآمد پر نظر رکھنا۔ ان کی رفتار ترقی کا جائزہ لینا۔ اور کابینہ کی متعلقہ کمیٹی کو اس سلسلے میں برابر اطلاع دیتے رہنا ہوگا۔

ریاستی حکومت کے محکمۂ زراعت نے آلو کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے خیال سے تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے دوران کولڈ اسٹوریج کی صنعت کو ترقی دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

چنانچہ ۶۳-۱۹۶۲ء میں درج ذیل مقامات پر کولڈ اسٹوریج کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ ضلع الہ آباد میں اجوا بانار۔ سراؤ اور سرائے عاقل۔ ضلع اٹاوہ میں اوریا۔ ضلع وارانسی میں گوپال گنج مغل سرائے۔ راجہ کا تالاب اور سارناتھ۔ ضلع جونپور میں کیراکٹ۔ مرھاؤ اور جلال پور۔ ضلع غازی پور میں یوسف پور۔ ضلع بلیا میں بیریا۔ ضلع فیض آباد میں مسودھا اور گوشائیں گنج۔ ضلع پرتاپ گڑھ میں پرتاپ گڑھ اور لال گنج۔ ضلع سلطان پور میں مسافر خانہ۔ ضلع گورکھپور میں سردار نگر اور بنسی گاؤں۔ ضلع بستی میں بسبیس۔ شورات گڑھ اور بلبیر۔ ضلع دیوریا میں احاطہ اور بھشتی۔ ضلع اعظم گڑھ میں مئو اور دوہری گھاٹ۔ مرزاپور سیتاپور۔ اناؤ اور رائے بریلی۔

جو لوگ ان ضلعوں میں کولڈ اسٹور بنانا چاہتے ہیں ان کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ مجوزہ فارم پر اپنی درخواست ڈپٹی ڈائرکٹر آف ہارٹی کلچر (ویسٹ) آگرہ کو روانہ کریں۔ درخواست کا فارم ڈپٹی ڈائرکٹر مذکور کے دفتر سے ایک روپیہ ادا کرکے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

حکومت اترپردیش نے ایسی گئوشالاؤں کو مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے جو ڈھائی سو دنوں میں حد سے حد ۵۰ گایوں سے ۱۰۰۰ من دودھ پیدا کرتی ہوں۔ یہ امداد ۵۰۰ سے ۱۰۰۰ من تک دودھ پیدا کرنے پر ۲ روپیہ فی من ۱۰۰۰ سے ۲۰۰۰ من تک ڈھائی روپیہ فی من اور ۲۰۰۰ من سے زیادہ دودھ پیدا کرنے پر ۳ روپیہ فی من کے حساب سے دی جائے گی۔

حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے کہ ایسی رجسٹرڈ گئوشالاؤں کو کہ جنھیں اب تک دو ہزار روپیہ سالانہ کے حساب سے پانچ سال کی مدت کے لیے کفالتی امداد دی جا چکی ہے آئندہ ایسی کوئی مالی امداد نہ دی جائے گی لیکن اس میں وہ دس گئوشالائیں شامل نہیں ہیں جنھوں نے اپنے یہاں دودھ کی پیداوار میں اضافہ کیا ہے اور افزائش نسل کے سلسلہ میں بھی نمایاں ترقی دکھائی ہے۔ چنانچہ ان دس گئوشالاؤں کو آئندہ پانچ سال تک حکومت کی جانب سے کفالتی امداد حاصل ہوتی رہے گی۔

حکومت اترپردیش نے فیصلہ کیا ہے کہ ہردوار۔ رشی کیش اور بندرابن میں دیسی شراب۔ ولایتی شراب اور بھنگ کی دکانوں کے موجودہ لائسنسوں کی میعاد ختم ہو جانے پر نئے لائسنس نہیں دیے جائینگے وارانسی شہر میں گنگا کے متوازی نقشہ بندی کا ایک علاقہ بنایا گیا ہے جس میں نہانے کے گھاٹ۔ مندر اور مذہبی اہمیت کے دوسرے مقامات شامل ہیں جہاں موجودہ لائسنسوں کی میعاد ختم ہو جانے پر دیسی شراب ولایتی شراب تاڑی کی تمام دکانیں بند ہو جائیں گی۔

میسور مدھیہ پردیش اور بہار کی حکومتوں نے ایڈہاک بورڈ آف انجینیرنگ یو۔ پی رڑکی ۱۹۵۹ء تک کے امتحانات کے نتائج پر دیے گئے ڈپلوموں اور اسٹیٹ بورڈ آف ٹکنیکل ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ یو۔ پی کے سول۔ الیکٹریکل اور میکنیکل انجینیرنگ کے ڈپلوموں کو اپنے یہاں کی ماتحت ملازمتوں میں بھرتی کے لیے تسلیم کر لیا ہے۔

اس رعایت سے جن اداروں کے سابق طلبا کو فائدہ پہنچے گا ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

گاندھی انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ۔ مظفر نگر۔ ڈی۔ این ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ میرٹھ۔ سول انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ بلیا۔ سول انجینیرنگ اسکول الہ آباد۔ کے۔ این ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ رڑکی۔ ڈی۔ جے انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ بردست۔ ایم۔ بی انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ گورکھپور اور گورنمنٹ لیدر انسٹی ٹیوٹ کانپور۔

نقد و تبصرہ

انشائے ماجد (حصہ اول)

از: مولانا عبدالماجد دریابادی۔ ناشر: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

قیمت (مجلد) پانچ روپیے

تیسرا اڈیشن ہے مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے کچھ نئے اور کچھ پرانے ادبی مضامین کا۔ اس میں کچھ مقالے ہیں، کچھ مقدمے اور چند مختصر تبصرے۔ یہ مجموعہ اس سے پہلے مقالات ماجد کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔

عبدالماجد دریابادی ملک کے مشہور عالم دین ہی نہیں بلکہ مسلم الثبوت ادیب اور ناقد ہیں۔ اردو ادب میں ان کا ایک خاص مقام ہے اور وہ ایک مخصوص طرز انشا کے مالک ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مضامین ان کی انشا پردازی، ان کی ناقدانہ نظر، ان کی علمیت اور ان کے مخصوص طرز کی آئینہ داری کر رہے ہیں۔ بعض مختصر تبصروں کے سلسلے میں (جو کتاب کے آخر میں ہیں) البتہ یہ کہنا ہے کہ انھیں اس اڈیشن میں نہ شامل کیا جاتا تو مناسب ہی تھا کیونکہ اکثر کتابوں کے جو پتے درج ہیں وہ بہت پرانے ہو چکے ہیں (اور ان پر یہ کتابیں اب دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ نئے پتے لکھ دینا تو بہر حال ضروری تھا۔ ایک رسالہ (جس پر تبصرہ ہے) وہ تو کب کا بند بھی ہو چکا ہے۔ کتاب کے بعض مقالات کے عنوان یہ ہیں: غالب کا ایک فرنگی شاگرد۔ پیام کبیر۔ اردو کا ایک بدنام شاعر۔ الفاظ کا جادو۔ جھوٹ میں سچ۔ بہار کی بہار (ص ۔ ع)

ترغیبات جنسی

از: حضرت نیاز فتح پوری۔ ناشر: نسیم بکڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ

قیمت: چار روپیہ پچاس نئے پیسے۔

یہ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن ہے جسے نسیم بکڈپو، لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ اردو کے مشہور ادیب جناب نیاز فتح پوری نے تقریباً ہر موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انسان کے شہوانی میلانات پر تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک بسیط تبصرہ کیا گیا ہے اور زمانۂ قدیم سے اس وقت تک مختلف ممالک اور مختلف انسانوں کے جنسی رجحانات پر سائنٹفک انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ص ۔ ع)

تاریخی جائزے

از: ڈاکٹر محمد یسین۔ ناشر: ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ

قیمت: تین روپیے

ایسے بہت سے موضوعات ہیں جن پر اردو میں کم لکھا جا رہا ہے۔ موضوعات میں سے ایک موضوع تاریخ ہے۔ ڈاکٹر محمد یسین نے جو لکھنؤ یونیورسٹی میں زمانۂ وسطیٰ کی تاریخ کے ریڈر ہیں اردو کی یہ بڑی خدمت شروع کی وہ اس زبان میں تاریخی موضوعات پر لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان ہی قسم کے مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے بعض کے عنوانات یہ ہیں: اکبر اپنی تعمیرات کے آئینے میں۔ مشرقی فن تعمیر۔ اسلام شاہ۔ قطب مینار کا قدیم ہندوستان البیرونی کی نظر میں۔ مغل فن مصوری۔ ہندوستان بابر کی نظر میں۔ ان سبھی مضامین میں ڈاکٹر یسین نے بڑی تحقیق و تفتیش سے کام لیا ہے البتہ ایک مضامین (مثلاً ابوالفضل اور اسلام شاہ) میں ان کے قلم سے بعض الفاظ یا جملے ایسے انداز میں نکل گئے ہیں جن پر ایک حلقہ کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ مضمون ایسے بھی ہیں جن کا تاریخ سے زیادہ تعلق نہیں مثلاً عمر خیام کے حیات پر مضمون۔ (ص ۔ ع)

مہ لقا

از: ڈاکٹر ثمینہ شوکت۔ ناشر: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار مینار، حیدرآباد (دکن)۔ قیمت: دو روپیہ پچاس نئے پیسے

چندا بائی مہ لقا (۱۷۶۸ء ۔ ۱۸۲۴ء) ارض دکن کی ایک رنگین شخصیت تھی۔ ننھیال کی طرف سے وہ سادات بارہہ کے خاندان سے تھی مگر حالات نے اس کی ماں اور اس کی خالاؤں کو رقص و سرود کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ اورنگ آباد پھر حیدرآباد پہنچ گئیں۔ وہاں پہنچتے ہی وہ امرا حیدرآباد کی منظور نظر بن گئیں۔ حیدرآباد ہی میں چندا بائی پیدا ہوئی اور عنفوان شباب ہی میں اپنے حسن و جمال، مہارت موسیقی، ادبی ذوق کی وجہ سے اتنی مشہور ہو گئی کہ نظام الملک نظام علی خاں والی دکن نے اسے رکھ لیا۔ ان کی وفات کے بعد سکندر جاہ اور پھر بعض امرا سے اس کے تعلقات رہے اور ہر طرف سے خطابات اور سیم و زر کی اس پر بارش ہوتی رہی۔ ایک حسین موسیقی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اردو کی شاعرہ بھی تھی اور مذہب سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ دکن کی اس دلچسپ ہستی کی ایک مختصر سوانح حیات اور ایک مجموعۂ کلام شایع ہوا شایع بھی ہو چکے ہیں۔ مگر نہ یہ سوانح حیات مکمل اور معتبر تھی اور نہ مجموعہ۔ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے کافی تحقیقات کے بعد زیر نظر کتاب مرتب کی ہے جس میں چندا بائی کے صحیح خاندانی واقعات، اس کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات، چندا بائی کے عادات و خصائل، تعلیم و تربیت اور شاعری سبھی چیزوں کا تفصیلی

طور سے جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں چندا بائی کا مکمل کلام جو مختلف ماخذوں سے حاصل کیا گیا ہے، شامل ہے۔ کتاب میں کتابت کے اغلاط کئی جگہ ملتے ہیں۔ کئی مقامات پر لفظ "سن" لکھا ہے مگر اعداد نہیں ہیں۔ ایک آدھ جگہ کچھ الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً صفحہ ۲۳۔ ۲۴ پڑھنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چندا اس سے پہلے نظام الملک والئ دکن کی ملازم ہوئی مگر ص ۶۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظام علی خاں اور سکندر جاہ کے زمانے میں راجہ راؤ رنبھا کی بھی ملازم تھی۔ اگر وہ ان دونوں والیان ملک کی ملازم تھی تو انھیں کی زندگی میں (اور وہ بھی علی الاعلان) کسی دوسرے امیر ریاست کی ملازم کیسے ہو سکتی تھی؟ بہر حال، کتاب نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ قابل قدر بھی کیونکہ بڑی جستجو اور کاوش کے بعد اسے مرتب کیا گیا ہے۔ (ص۔ ع)

زمانے کی آنکھ از: پی۔ سی۔ آزاد۔ ناشر: ساہتیہ کلا اکاڈمی۔ ۲۸/۲۵ سول لائن۔ بریلی۔ قیمت: تین روپے۔

پی۔ سی۔ آزاد صاحب، سابق ایم۔ ایل۔ سی اتر پردیش کے مشہور سیاسی اور سماجی کارکن ہونے کے علاوہ اردو کے شاعر، صحافی اور افسانہ نگار بھی ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے وہ عروس سخن کے بھی شیدائی ہیں اور لیلائے وطن کے بھی سودائی۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر وہ کئی مرتبہ جیل گئے۔ مگر "چکی کی مشقت" کے ساتھ ادبی دلچسپیاں جاری رہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ قدرتاً ان کے ان تمام افسانوں میں حب وطن اور سماجی اصلاح کا جذبہ کارفرما ہے اور چونکہ آزاد صاحب خود جنگ آزادی کی معرکہ آرائیوں میں شریک رہے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری ملتی ہے اور ان کے کردار وہ جیتے جاگتے کردار ہیں جن سے ہمیں اپنی زندگی میں اکثر واسطہ پڑتا ہے۔ (ص۔ ع)

تذکرۂ جگر از: محمود علی خاں (جامعی) شایع کردہ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ نئی دہلی۔ قیمت: ۳ روپے۔

حضرت جگر مرادآبادی پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن ان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے خیال ہے کہ ان پر لکھنے کا سلسلہ عرصہ تک باقی رہے گا۔ تذکرۂ جگر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ زیر نظر کتاب میں شاعر کے ادبی مقام کے تعین پر زور دے کر اس کی نجی زندگی اور کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف کو جگر مرحوم کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اور اس لحاظ سے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ذاتی علم اور مشاہدے کی بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں کلام جگر پر مختصر سا تبصرہ بھی ہے جو بقول مصنف اس لئے شامل کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو جگر کے کلام کے بارے میں رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔ اس کتاب کا بیشتر حصہ جگر صاحب کی زندگی میں لکھا گیا تھا مگر وہ اس وقت شایع نہ ہو سکا تھا۔ کتاب کی اشاعت کے وقت ان کی وفات ہو چکی تھی اس لئے بعض ابواب کا بعد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ (ر۔ غ۔ ا)

مضراب از: شباب للت، ملنے کا پتہ: کرشنا برادرز، پبلشرز، کانگڑہ (پنجاب) قیمت: تین روپے۔

مضراب شباب للت کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس میں نظم، غزل، رباعی اور قطعہ وغیرہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ مجموعہ کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شباب غزلوں سے زیادہ نظموں کے شاعر ہیں اور اسی صنف سخن میں ان کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ مجموعہ میں کئی نظمیں ہیں جو یقیناً اس المناک حادثہ کی دین ہیں جس نے للت کی طبیعت کو سوز و گداز اور دل کو دردمندی بخشی ہے۔ ان کی نظموں کا تاثر اسی سوز و گداز اور دردمندی کا رہین منت ہے۔

معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ یہ مجموعہ صوری خوبیوں کا بھی حامل ہے۔ عمدہ کتابت طباعت کے ساتھ ساتھ خوبصورت گردپوش نے کتاب کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ (ر۔ غ۔ ا)

سفینۂ و ساحل از: عزیز وارثی، ناشر: مکتبہ شان ہند۔ دہلی نمبر ۶۔ ملنے کا پتہ: (۱) دفتر بیسویں صدی، دریا گنج دہلی (۲) انجمن اتحاد وارثیہ لال کنواں دہلی اور (۳) مکتبہ قصر اردو، اردو بازار، دہلی۔ قیمت: چار روپے۔

سفینۂ و ساحل عزیز وارثی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۱ء میں شایع ہوا تھا۔ زیر نظر کتاب اسی مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ترمیم و اضافہ کے بعد شایع ہوا ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں نظمیں بھی شامل ہیں جن میں زور بھی ہے اور سلاست بھی۔ عزیز صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اصل جوہر غزلوں میں نکھرتا ہے۔ ان کی غزلوں میں رنگینی، نازک خیالی اور تصوف کے مسائل کے علاوہ حالات حاضرہ کا عکس بھی ملتا ہے۔ کلام اغلاط زبان و بیان کے اسقام سے پاک ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری میں مقصدیت پائی جاتی ہے اور انداز بیان بھی دلکش ہے۔ مجموعہ کی طباعت میں نفاست اور اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ کتابت عمدہ۔ چھپائی صاف ستھری۔ آرٹ پر چھپا۔ مجلد گردپوش۔ (ر۔ غ۔ ا) (باقی)

سُنیے !!!

یہ روپیہ نکالنے کا وقت نہیں ہے
پوسٹ آفس سیونگس بینک اکاؤنٹس سے
روپیہ نکالنا
قوم کی دفاعی کوششوں کو
کمزور کردے گا
جو روپیہ سرکاری تمسکات میں لگا ہے
وہ بالکل محفوظ ہے
ضبطی کا کوئی خطرہ نہیں ہے
ضرورت پڑنے پر فوری ادائیگی
یاد رکھیے
میدان جنگ میں تعطل
جنگ کا خاتمہ نہیں ہے
دغا باز دشمن گھات میں ہے
ہر روپیہ جو آپ بچاتے اور لگاتے ہیں
ایک جان بچا سکتا ہے ایک انچ زمین بچا سکتا ہے
اپنی کوششوں میں ڈھیل نہ ڈالیے

ملک کے دفاع کو ایک لمبی اور تلخ جنگ
کے حساب سے مضبوط بنائیے

نظامت اطلاعات اترپردیش نے جاری کیا

Regd. No. A-319



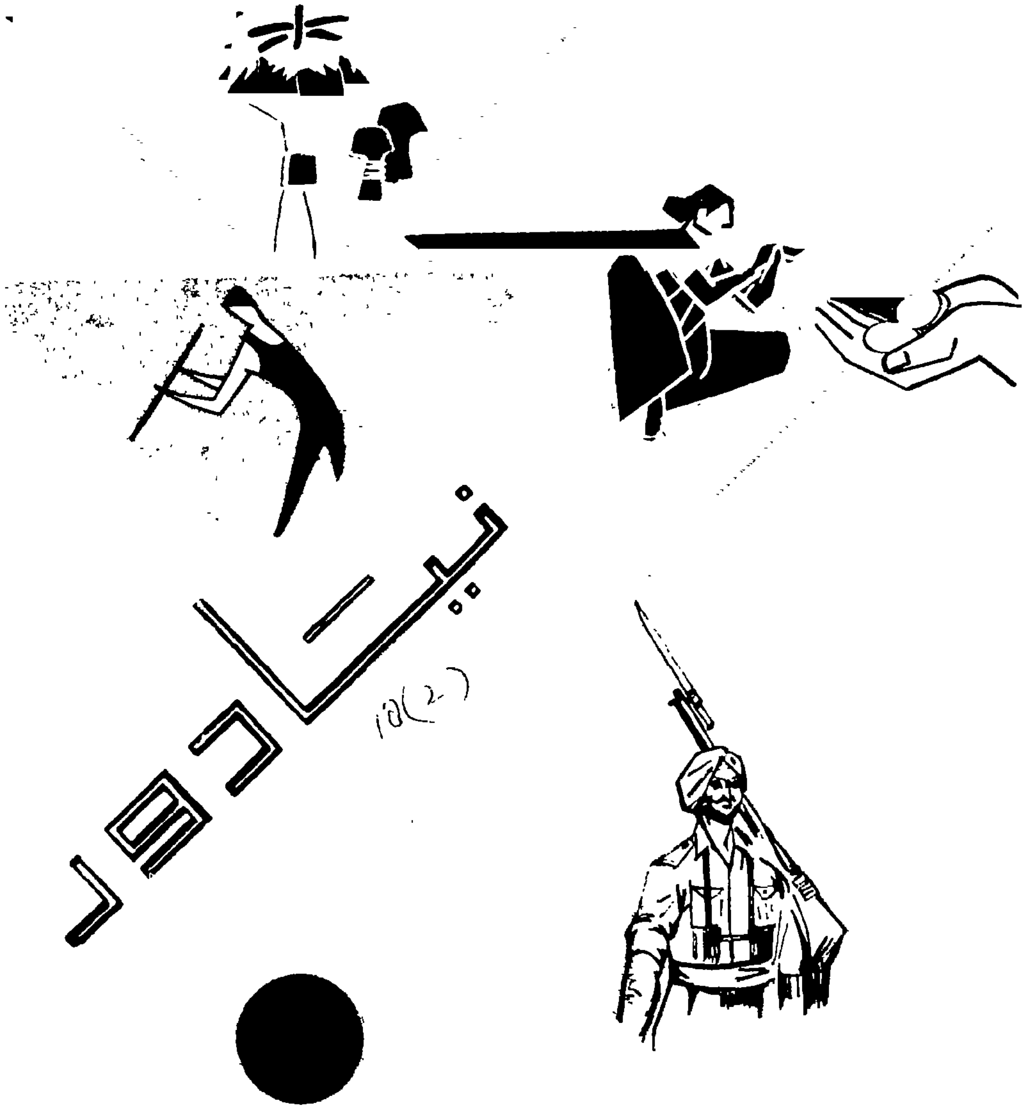
کیا میں بھی کچھ کر سکتی ہوں؟

دیش کو مضبوط بنانے اور دیش کی حفاظت کے لیئے بھارتی عورتیں بہت کچھ کر سکتی ہیں۔ عورتوں کی مقامی سنستھاؤں کے ذریعے دفاع کے کام میں حصّہ لیں۔ ابھی بہت سے کام کرنے والے ہیں۔ قومی دفاعی فنڈ میں عطیئے دیں۔ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کے لیئے کہیں۔ ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدیں۔ ذاتی کوششوں سے ایسا نظم و ضبط اور رویہ اختیار کریں جو دوسروں کے لیئے مثال ہو۔

- کچھ بھی ضائع نہ جانے دیں۔ بے دریغ اور بلا سوچے سمجھے چیزیں خریدنا بند کریں۔ بڑھے چڑھے دام نہ دیں۔
- سونا نہ خریدیں۔ اپنا سونا ملک کے مفاد کے لیئے دیں۔
- کام کوئی بھی ہو، محنت اور لگن سے کریں۔ ذرا زیادہ توجہ اور اہلیت کے ساتھ کیئے گئے ہر کام سے قوم کو تقویت پہنچتی ہے۔ بھارت کو مضبوط بنائیں۔
- بے دلی، بے رُخی چھوڑیں اور کچھ کر کے دکھائیں۔

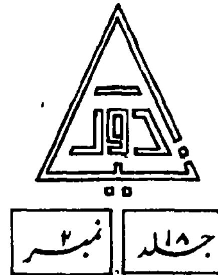
چوکس رہیں — قوم کی تیاریوں میں ہاتھ بٹائیں

DA-62/F1



ویشاکھ ۱۸۸۵
مئی سنہ ۱۹۶۳ء

۵۰
نئے پیسے



جلد ۱۸ | نمبر ۲

ویشاکھ ۱۸۸۵
مئی سنہ ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلیو۔ ہارج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان اور چین کی سرحد پر اگرچہ ابھی تک تعطل ہے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ چین کا آگے چل کر کیا رویہ رہے گا۔ اس نے ابھی تک کولمبو کانفرنس کی تجویزوں کو منظور نہیں کیا ہے۔ اور یہ وہ طرزِ عمل ہے جس کی وجہ سے چین کی نیت پر اگر شک کیا جاتا ہے تو بالکل بجا ہے۔ کولمبو کانفرنس میں شریک ہونے والے ممالک، غیر جانب دار اور ناوابستہ ملک تھے۔ انھوں نے یہ کوشش کی تھی کہ کسی طرح چین اور ہندوستان میں سرحدی معاملات پر براہِ راست گفت و شنید شروع ہو جائے۔ ہندوستان چونکہ خواہ مخواہ کسی سے لڑنا نہیں چاہتا اور وہ باعزت سمجھوتے اور صلح کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے، اس لیے اس نے یہ تجویزیں منظور کرلیں۔ لیکن چین کی نیت میں فتور ہے اس واسطے وہ ان تجویزوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا ہے۔ ایسی صورت میں ہندوستان کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ اپنی تیاریاں برابر جاری رکھے اور فوجی نیز اقتصادی حیثیت سے وہ اتنا طاقتور بن جائے کہ دشمن پھر اس کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ رک جانے کے باوجود "ایمرجنسی" یا "ہنگامی حالات" کا نفاذ ابھی تک ہے۔ ایمرجنسی قائم رکھنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ابھی حالات اعتدال پر نہیں آئے ہیں اور ہمیں غفلت نہ برتنی چاہیے۔ اس "ایمرجنسی" میں اپنی فوج کو طاقتور بنانے کے لئے ہمیں دفاعی فنڈ میں دل کھول کر چندہ تو دینا ہی ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ سماج دشمن یا ملک دشمن حرکتوں سے بھی احتراز کرنا چاہیے اور جو لوگ دانستہ یا نادانستہ ان حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں انھیں بھی ایسی باتوں سے باز رکھنا چاہیے۔ یہ سماج دشمن یا ملک دشمن حرکتیں کیا ہیں اور سماج دشمن افراد کون ہیں؟ سب سے پہلے عوام میں کم ہمتی یا خوف و ہراس پیدا کرنے والوں کو لیجیے۔ جو لوگ گھر بیٹھے دشمن سے مرعوب ہو جائیں اور دوسروں کو بھی دشمن سے مرعوب کرانے کی کوشش کریں وہ ملک دشمن ہیں اور ان کی اس قسم کی باتیں سماج دشمنی کی مترادف ہیں۔ تاریخ کے اوراق ایسی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں جب کسی ملک میں کم ہمتی پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی فوج کو شکست ہو گئی۔ دوسری طرف ایسے بھی واقعات ملیں گے جب ہمت برقرار رکھنے کی وجہ سے وہ ملک آخر میں کامیاب ہو گئے جن کی فتح کی بظاہر کوئی امید ہی نہ تھی۔ دور کیوں جائیے پچھلی جنگِ عظیم کو لیجیے۔ لڑائی کے شروع میں برطانیہ کو مسلسل شکستیں ہو رہی تھیں جرمن ہوائی جہاز لندن اور انگلستان کے دوسرے شہروں پر پوری طاقت سے بمباری کر رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ بھی ان حملوں کی تاب نہ لا کر ہتھیار ڈال دینے والا ہے۔ مگر اہلِ برطانیہ نے اس عالم میں بھی ہمت نہ ہاری اور مایوسی میں بھی وہ امید کی کرن دیکھتے رہے اور اپنی فتح پر انھیں یقین رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدائی کامیابیوں کے بعد جرمنی کی فوجی طاقت جواب دینے لگی اور انجام کار فتح انگریزوں کی ہوئی۔ اسی طرح روس میں ہٹلر کی فوجیں پہلے آندھی اور طوفان کی طرح بڑھنا شروع ہوئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمن فوجوں کا یہ سیلاب روس کے سپاہیوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ مگر نہ روسی فوج میں بددلی پیدا ہوئی اور نہ روسی عوام کی ہمتیں پست ہوئیں۔ آخر لینن گراڈ اور اسٹالن گراڈ جرمن فوجوں کے لئے سدِ سکندری ثابت ہوئے اور جس تیزی سے جرمن فوج کی ندی چڑھی تھی اسی طرح اترنے لگی۔ افواہیں پھیلانا یا افواہوں پر یقین کرلینا بھی سماج دشمنی ہے۔ کچھ لوگوں کو لڑائی کے زمانے میں لطف آتا ہے کہ وہ بے سر پیر کی باتیں کرتے رہیں۔ دوسرے بہت سے لوگ ان باتوں کو صحیح سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں سے بھی بیان کرتے ہیں۔ اس طرح ایک افواہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گشت کرتی چلی جاتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں بددلی اور خوف و ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں افواہیں پھیلانا تو برا ہوتا ہی ہے بعض صحیح باتوں کی اشاعت بھی نامناسب ہوتی ہے۔ مثلاً اپنی فوج کی نقل و حرکت یا جنگی کارخانوں کی جائے وقوع یا جنگی تیاریوں کے بارے میں ہر ایک سے اس طرح کی باتیں کرنا کہ سپاہیوں سے بھری ہوئی ٹرینیں اس ریلوے اسٹیشن سے اس ریلوے اسٹیشن کو جایا کرتی ہیں یا فلاں شہر میں جنگی سامان تیار کرنے کا ایک نیا کارخانہ کھل رہا ہے یا فلاں کارخانے میں یہ سامان تیار ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ باتیں نیک نیتی سے کر رہے ہوں مگر اس کی کیا ضمانت ہے کہ سننے والا دوسرے سے نہ کہے گا اور دوسرا تیسرے سے نہ بتائے گا اور اس طرح جو بات راز کی تھی وہ عام نہ ہو جائے گی۔ یاد رکھئے کہ منہ سے نکلی ہوئی پرائی بات۔ اسی طرح چور بازاری کرنا یا ناجائز نفع کمانا بھی ملک دشمنی ہے۔ اگر آج تاجر چور بازاری کرنے لگیں گے اور اشیا کی قلت کی وجہ سے یا کسی اور موقع سے فائدہ اٹھا کر چیزوں کو زیادہ نرخ پر بیچنے لگیں گے تو عوام میں پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ ہم اپنے مزدوروں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ موجودہ ہنگامی حالات میں ہڑتال نہ کریں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے سامان کی تیاری میں رکاوٹ پڑے۔ ہم اپنے کسانوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کی کوشش کریں لیکن یہ سوچیے کہ مزدور اور کسان جب پورے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کے بعد یہ دیکھے گا کہ تاجروں نے ہر چیز کے دام بڑھا دیے ہیں تو اس کسان یا مزدور کی کیا حالت ہوگی؟ کیا وہ اسی خلوص کے ساتھ محنت کرتا رہے گا؟ ہمارے وزیرِ اعظم ایک نہیں متعدد بار کہہ چکے ہیں کہ لڑائی صرف میدانِ جنگ میں نہیں لڑی جاتی بلکہ کارخانوں اور کھیتوں میں بھی لڑی جاتی ہے۔ پھر جب ہم اپنے ان دو مورچوں کو کمزور کر دیں گے تو دوسرے مورچے پر کہاں تک لڑتے رہیں گے؟ جب ہماری فوج کو غذا اور سامان نہ پہنچے گا تو وہ کب تک جنگ جاری رکھ سکے گی؟ اس لئے ضروری ہے کہ چور بازاری اور بے جا منافع خوری سے باز رہا جائے تاکہ ہمارے عوام، ہمارے کسان اور ہمارے مزدور سب مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے حتی الامکان اپنا فرض بجا لاتے رہیں۔ طالب ہوں یا سرکاری ملازم، ان سب کو بھی اس کی احتیاط رکھنا چاہیے کہ ان کے کسی فعل سے ملک کی فوجی اور اقتصادی تیاریوں میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ اگر ہمارے ملک کے کچھ افراد اپنی ذمہ داریوں کو اب بھی نہ سمجھیں تو یہ وطن دشمنی ہوگی۔ ایسے ہی غیر ذمہ دار اور گھر کے دشمن عناصر کے لئے شاعر کہہ گیا ہے ؎

خلوصِ شوق نہ جوشِ عمل نہ دردِ وطن — یہ زندگی ہے الٰہی کہ زندگی کا کفن!

امید سحر

ہندوستان

(اختر اریبوی)

اے وطن ! محبوبِ جاں تیری زمین و آسماں   شوق کے جذبات قدموں پر ترے ہیں گل فشاں
تیرے جلوے ناز فرما گلستاں در گلستاں   تیری تنویریں ہیں رقصاں کہکشاں در کہکشاں

تیری تہذیبِ درخشاں بن گئی نورِ جہاں
دل نوازی میں جہاں گیری تری عظمت نشاں

اے تجلّی زارِ معنی ! وادیِ ایمن ہے تو   بس گیا جو حُسن کے پھولوں سے وہ دامن ہی تو
صورت و معنی کے نظّاروں کا اک مخزن ہے تو   منبعِ جذباتِ الفت، عشق کا خرمن ہے تو

اے بہشت آرزو ! جنّت نشاں گلشن ہے تو
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن ہندوستاں !

جلوۂ صد رنگ کی تیرے تمدّن میں بہار   آبِ گنگ و جمن کی بن گئے ہیں آبشار
ہے فضائے ہند ہر پہلو سے رحمت در کنار   تیری جلوہ گاہ میں تسکینِ قلبِ بے قرار

مر مٹوں گا تیری عزّت کے لیے دیوانہ وار
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن ہندوستاں !

زندگی قرباں وطن پہ ہو تو رشکِ زندگی   جذبۂ شوقِ شہادت رُوح کی تابندگی
جان دے کر ہی شہیدوں کو ملی پائندگی   اُن کی قسمت کے ستاروں کو جواں رخشندگی

اعترافِ عشق ہے میری وفا آمادگی
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن ہندوستاں !

چشمِ دشمن اس طرف اٹھی ہے پھوڑی جائے گی   چال بازوں کی کلائی بھی مروڑی جائے گی
ظلم کی دیوار ہر جانب سے توڑی جائے گی   یہ خطا کی قوم قوت سے جھنجھوڑی جائے گی

موجِ سغرورِ ستم ہمت سے موڑی جائے گی
اے وطن، میرے وطن، پیارے وطن ہندوستاں !

تنبیہ

بشیشور پرشاد منور لکھنوی

چین! یوں ضبط طبیعت پہ کیے بیٹھا تھا — دیکھ کر ڈھنگ ترے ہونٹ سیے بیٹھا تھا
دل خاموش کو پہلو میں لیے بیٹھا تھا — ہاتھ اپنے ہی گریباں میں دیے بیٹھا تھا
بن گیا حرفِ غلط صلح و صفائی کا سبق
ساتھ بھائی کے یہ کیا خوب ہے بھائی کا سلوک

کیوں ہنود کی روش تجھ کو پسند آئی ہے — یہ حکومت ہے تری یا کوئی سودائی ہے
آگ تو نے جو شرارت کی یہ برسائی ہے — ایشیا بھر کے لیے باعثِ رسوائی ہے
جن و عفریت کا لشکر ہے یہ لشکر تیرا
پھر گیا کیوں یہ بگولوں کی طرح سر تیرا

تیری وحشت میں ہے وسعت کسی ویرانے کی — روح قالب میں ترے ہے کسی دیوانے کی
تیرگی اُف رے ترے دل کے سیہ خانے کی — تجھ کو تمیز نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تجھ کو آتا ہے مزہ کیوں یہ ستم ڈھانے میں
آ گیا کیا کسی عیار کے بہکانے میں

اپنے ہمدرد پہ محسن پہ یہ حملہ تیرا — اپنے معصوم پڑوسی پہ یہ حربہ تیرا
شیطنت خیز ہے کتنا یہ وطیرہ تیرا — حیرت انگیز نہایت ہے وطیرہ تیرا
شرم آتی ہے ترے نام سے حیوانوں کو
رنج ہے تیرے ان اطوار سے انسانوں کو

اب بھی ہے وقت کہ لے ہوش سے تو کام ذرا — اک اُچٹتی سی نظر جانبِ انجام ذرا
سُن تو جمہوریتِ ہند کا پیغام ذرا — گر رہِ صلح، بس اب راستۂ سلم ذرا
خوابِ شاہنشہیِ دہر ترا خواب ہے
تیری ہیئت کا جو دریا ہے وہ پایاب ہے

اب ترے مکر کے پھندے میں ہم آنے کے نہیں — تیری جانب قدمِ صلح اُٹھانے کے نہیں
تیرے آگے سرِ تسلیم جھکانے کے نہیں — تجھ سے ہم ہاتھ رفاقت کا ملانے کے نہیں
آمریت تری اے چین! مُبارک تجھ کو
تیرا ایمان، ترا دین، مُبارک تجھ کو

اپنا ہر مرد جواں تیرے مقابل ہے آج — قوم کے لشکرِ جرار میں شامل ہے آج
رہ روِ راہِ عمل آگے منزل ہے آج — بچے بچے کی حمایت ہمیں حاصل ہے آج
سر کچلنا ہے انھیں مفسدہ پردازوں کا
آ کے دیکھے تو کوئی حوصلہ جانبازوں کا

منتشر ہو گیا شیرازہ پریشانی کا — اب کہیں ذکر نہ ہو بے سر و سامانی کا
پاس سا پاس ہے کچھ غیرتِ انسانی کا — دینی جوش ہے ایثار کا، قربانی کا
مال کیا، جان بھی قربانِ وطن ہوتی ہے
سرفروشوں سے فزوں شانِ وطن ہوتی ہے

کی ہے خالق نے عطا غیرتِ خوددار ہمیں — کر نہ پائے گی ہراساں تری للکار ہمیں
دے رہی ہے یہ صدا عظمتِ کردار ہمیں — بابِ فردوس بنے جنگ کے آثار ہمیں
ہم کو رکھنا ہے روایاتِ کہن کی حرمت
جیت کر جنگ بڑھائیں گے وطن کی حرمت

ہیں ترے قافلۂ ظلم کے سالار کہاں — ہیں ترے راہ بران دنی و خوار کہاں
بول ہے خون کی پیاسی تری تلوار کہاں — تیرے حامی ہیں کہاں تیرے مددگار کہاں
ایک ہی زد میں اُڑا دیں گے پرخچے تیرے
خود تری جان کے دشمن ہیں طریقے تیرے

زور و طاقت پہ تجھے ناز عبث ہے اے چین — اپنی عظمت پہ تجھے ناز عبث ہے اے چین
اس جسارت پہ تجھے ناز عبث ہے اے چین — اس شجاعت پہ تجھے ناز عبث ہے اے چین
سانپ بن کر ترا پندار ہی ڈس لے گا تجھے
اپنے خوں خوار شکنجے میں یہ کس لے گا تجھے

مان لے بات ہماری، ترے محسن ہم ہیں — ہو نہ آمادۂ خواری، ترے محسن ہم ہیں
سُن اگر جان ہے پیاری، ترے محسن ہم ہیں — اب نہ پھر جنگ ہو جاری، ترے محسن ہم ہیں
اس قدر دیدۂ عالم میں سیہ کوش نہ بن
باز آ جنگ سے احسان فراموش نہ بن

ویشاکھ ۱۸۸۵

مئی ۱۹۶۳ء

حُبِّ وطن

ساحر بھوپالی

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیری چاہت میں رہتا ہوں ہر دم مگن　　میرے نغموں میں ہے تیرا ہی بانکپن
میرے دل میں سمایا ہے سودا ترا　　میرے دل کو ہے بس ایک تیری لگن
میں ہوں بلبل ترا، تو ہے میرا چمن

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیرے دم سے امر ہے کہانی مری　　تجھ پہ قربان ہے زندگانی مری
تیری گودوں میں کھیلا ہے بچپن مرا　　تیرے سائے میں سنوری جوانی مری
تیری چاہت سے سرشار ہے میرا من

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیری سج دھج زمانے میں سب سے جدا　　ساری دنیا کی تجھ پر بہاریں فدا
تجھ میں مسجد بھی، مندر بھی، گرجا بھی ہیں　　ہے ہر اک ذرہ دیوتا تری خاک کا
موہ لیتی ہے دل تیری بانکی پھبن

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تجھ میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہیں　　سب ہیں اک قوم، وہ آپس میں بھائی ہیں
تو ہے گہوارہ انسانی تہذیب کا　　جتنے مذہب ہیں سب تیرے شیدائی ہیں
تجھ میں بہتی ہیں مل جل کے گنگ و جمن

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

جس کی موت آئے وہ تجھ پہ حملہ کرے　　کس میں ہمت ہے جو تجھ کو رسوا کرے
تیرے دشمن کو سُولی ہمالہ پہ دوں　　تاکہ دنیا بھی عبرت سے دیکھا کرے
تجھ پہ صدقے لٹا دوں میں تن من اور دھن

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

تیری عزت کی خاطر او میرے چمن　　گھر سے باندھے ہوئے نکلوں سر سے کفن
ہاتھ میں تیغ اور لب پہ للکار ہو　　خونِ دشمن سے ہو تر بہ تر پیرہن
پھر ذرا کوئی دیکھے مرا بانکپن

میرے ہندوستاں، میرے پیارے وطن

جواب

ناجی انصاری بستی

اٹھائی آخر نظر یہ کس نے سوادِ ہندوستاں کی جانب
یہ کس نے دیکھا بری نظر سے حریم امن و اماں کی جانب
یہ کون یلغار کر رہا ہے زمین جنت نشاں کی جانب
یہ کس کی آنکھوں میں خوں کے چھینٹے ہیں دیکھ کر گلستاں کی جانب

یہ زرد فاموں کے تیر آخر ہمارے سینوں پہ کیوں لگے ہیں
شمال کی سمت سے برابر یہ وار کیوں ہم پہ ہو رہے ہیں

ہمالیہ ہے اداس و حیراں کہ دوستی کا صلا یہی ہے؟
خموش ہے آب زرد گنگا کہ جذبۂ ارتقا یہی ہے؟
جہاں میں اک شور ہے کہ شاید فریب کی انتہا یہی ہے؟
صدائے جمہور اٹھ رہی ہے کہ حدِ اخلاص کیا یہی ہے؟

یہ چیرہ دستی، یہ خود پرستی، فنا کے سانچے میں ڈھل نہ جائے
ہوس کا عفریت آتشِ حریت سے ٹکرا کے جل نہ جائے

یہ سامراجی فریب تا چند اپنے پیروں سنبھل سکے گا
ہوا و حرص و ہوس کا پودا جہاں میں کس طرح پھل سکے گا
فنا پرستوں کا زور کب تک بساطِ عالم پہ چل سکے گا
چراغ باطل جہاں میں اب تک نہ جل سکا ہے نہ جل سکے گا

ہوس پرستو! ستیزہ کارو! نہ چین سے تم کبھی رہ سکو گے
ہمیشہ تم زرد رو رہے ہو، ہمیشہ تم زرد رو رہو گے

ہم اپنے روشن چراغ لائیں، تم اپنا ماضی ادھار لاؤ
ہم اپنا نورِ یقین لائیں، تم اپنے دل کا بخار لاؤ
ہم اپنا عزمِ بلند لائیں، تم اپنا قومی شعار لاؤ
ہم اپنے رنگیں گلاب لائیں، تم اپنے دامن میں خار لاؤ

ہمارا پرچم رہے گا اونچا، تمہاری بے طرح ہار ہوگی
مقابلہ کر کے دیکھ لینا شکست بھی شرمسار ہوگی

ڈھکیل دیں گے تمہیں یقیناً ہم اپنی سرحد کے پار اک دن
تمہاری ناپاک سازشوں کا بکھیر دیں گے غبار اک دن
جواں ہمارے اتار دیں گے تمہارا سارا بخار اک دن
اشوک و بدھ کے وطن کی عظمت پہ آئے گی پھر بہار اک دن

یہ زور دستی، یہ شورہ پشتی کبھی چلی ہے نہ چل سکے گی
تمہارے مدفن کے واسطے یاں زمیں بھی دو گز نہیں ملے گی

جذبِ وطن

سراج لکھنوی

ہمیشہ ہند کے دریاؤں پر رواں ہے بہار   ہر ایک گام پہ جمنا کی روح ہے بیدار
یہ مرغ زار، چمن زار اور یہ گل زار   بہار سلسلہ در سلسلہ قطار قطار

جو دیکھتا ہے اُسے زندگی سی ملتی ہے
شعور جاگتا ہے روشنی سی ملتی ہے

ہے یہ نمائشِ فطرت کہ مصر کا بازار   یہ آفتاب کی کرنیں یہ جلوۂ کہسار
عجب نظام ہے جھرنوں کی ایک سی رفتار   ہر ایک ذرّہ ہے رنگینیوں کا آئینہ دار

ہر ایک شے میں تناسب، جمال لاثانی
قدم قدم پہ تصدق، بہار سامانی

بہت دنوں تو شناسا ہوئے شمال سے   رہے ہیں مدتوں ہم دور اپنی منزل سے
سنبھال پائے ہیں آزادیوں کو مشکل سے   جو زحمتیں ہوئیں پوچھو ہمارے ہی دل سے

مگر یہ عہد شکن پنچ شیل کا حامی
لکھی ہوئی ہے مقدر میں اس کے ناکامی

عبث ہے فوج کی کثرت پہ چینیوں کو غرور   ہوئے ہیں اپنی ستم رانیوں کے نشے میں چور
حسد کی آگ بھی سینوں میں ان کے ہے مستور   یہ بات سچ ہے کہ نیت میں اس کی کچھ ہے فتور

بطور نذر کے تھوڑی زمین لیں ہم سے
یہ چاہتے ہیں کہ کچھ حصے چھین لیں ہم سے

کسی طرف بھی اسے بھاگنے کی راہ نہ دو   کرے جو امن کو برباد اسے پناہ نہ دو
کراہنا بھی جو چاہے تو اذنِ آہ نہ دو   بس اب مزید اسے فرصتِ گناہ نہ دو

دماغ ٹھیک ہو، بدظن کو اک سبق دے دو
ہمیشہ کے لیے دشمن کو اک سبق دے دو

ہوا پلٹ گئی اب رخ کو موڑنا ہوگا   شکستہ قلب ہیں جو ان کو جوڑنا ہوگا
تجھے اب اپنا طلسم آپ توڑنا ہوگا   سن او کہ اب تجھے سرحد کو چھوڑنا ہوگا

ہوس زیادہ کی ہے اور نہ تجھ سے کم لیں گے
زمین چھین کے اک ایک انچ دم لیں گے

یہیں ہیں تلسی و ٹیگور و کالی داس و کبیر   یہیں ہیں غالب و انشا و مصحفی و میر
انھیں کی مملکتِ شاعری میں ہے توقیر   کہاں ہے ان کی مثال اور کہاں ہے ان کی نظیر

کبھی غروب نہ ہوں گے وہ آفتاب ہیں یہ
ہیں انتخاب زمانے میں لاجواب ہیں یہ

یہ انجمن ہے وہ جس انجمن کا مثل نہیں   یہ رنگ و بو ہے کہاں اس چمن کا مثل نہیں
اب ایسے مدرسۂ علم و فن کا مثل نہیں   جہان بھر میں ہمارے وطن کا مثل نہیں

غلط ہیں دعوے ذرا سا بھی احتمال نہیں
اب اُس کے نقشے میں ترمیم کا سوال نہیں

رہے ہمیشہ سے ہم امن کے علم بردار   یہی سکون ہمارا، یہی ہمارا قرار
کسی سے دب کے نہ سودا کریں گے ہم زنہار   ہر ایک فرد، وقارِ وطن پہ ہوگا نثار

یہ رنگ و بو کا فسانہ چمن کی بات ہے یہ
یہ جان و تن کی ہے بازی وطن کی بات ہے یہ

عقیدتیں ہیں وہی اور کہانیاں ہیں وہی   ہمارے دیس کی رنگیں نشانیاں ہیں وہی
چہل پہل ہے وہی شادمانیاں ہیں وہی   ہنوز گنگ و جمن کی روانیاں ہیں وہی

ہم اس لڑائی کو بھی ایک خواب سمجھے ہیں
اسے بھی سطحِ نظر کا حباب سمجھے ہیں

زندگی کا گیت

اکبر مرادھولوی

دورِ نو ہے زندگی کا گیت گائے جائیے

سختیِ آلام و غم پر مسکراتے جائیے گردشِ دوراں کو آئینہ دکھاتے جائیے
حادثاتِ دہر کو ٹھوکر لگاتے جائیے اپنا دمِ غم اپنی ہمت آزماتے جائیے

نغمۂ عزم و یقیں کی لَے بڑھاتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کا گیت گاتے جائیے

کشتیِ عمرِ رواں طوفاں سے دوچار ہے ورطۂ غم سے نکلنا پھر بھی کیا دشوار ہے
شرط اتنا ہے کہ کوشش آزمودہ کار ہے جو صلہ ہو موجزن دل میں بیڑا پار ہے

خوف کیا موت سے آنکھیں لڑاتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کا گیت گاتے جائیے

ختم ہوں گے جادۂ غم کے مراحل ایک دن دور ہوگی راہ کی اک ایک مشکل ایک دن
رنگ لائے گا یقیناً جذبۂ دل ایک دن ہر استقبال خود آئے گی منزل ایک دن

ہر قدم پر کارواں کا دل بڑھاتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کا گیت گاتے جائیے

دل پہ افسونِ الم کچھ دیر چلتا ہی ضرور حالِ غم انسان کا لیکن سنبھلتا ہی ضرور
عالمِ تاریک شب کروٹ بدلتا ہے ضرور بات سچ ہے ڈوب کر سورج نکلتا ہے ضرور

ہر جہت سے ہر افق پر مسکراتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کا گیت گاتے جائیے

لطف جب ہے آتشِ نفرت بجھا کر چین لیں دوزخِ ماحول کو جنت بنا کر چین لیں
زندگی میں چین کی دولت لٹا کر چین لیں بربریت کو ہر قیمت مٹا کر چین لیں

جورِ استبداد کی بنیاد ڈھاتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کا گیت گاتے جائیے

رات دن بیکار کیوں آرام کی باتیں کریں زندگی میں زندگی کے کام کی باتیں کریں
آئیے اب محنت اور آرام کی باتیں کریں اپنے ہر آغاز پر انجام کی باتیں کریں

یہ پیامِ اکرم ہر محفل سناتے جائیے
دورِ نو ہے زندگی کے گیت گاتے جائیے

ضرورت ہے وطن کو......

راجیندر نرائن سکسینہ بسمل

اجل کا نام سن کر جن کو عادت ہو نہ ڈرنے کی تمنا ہو جنھیں جوہر دکھا کر رن میں مرنے کی
جو ٹھانے ہوں وطن کے واسطے جی سے گزرنے کی قسم کھا لیں جو حملہ آوروں کو دور کرنے کی

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

سروں میں ہو نہ جن کے گیسوئے شب رنگ کا سودا نہ سکا ہو نہ گل رویانِ شوخ و شنگ کا سودا
نہ رہتا ہو جنھیں بزمِ ربابِ چنگ کا سودا جو ہو تو ہو وطن کے دشمنوں سے جنگ کا سودا

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

جو توپوں کی گرج اور شور سن کر قہقہے ماریں جو بڑھ کر دشمنوں کی صفت صف لشکر کو للکاریں
ضرورت پر اٹھا لیں اپنے ہاتھوں میں جو تلوار بہائیں جنگ کے میدان میں جو خون کی دھاریں

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

رگوں میں جن کی بجلی کی طرح وہ خون جاری ہو کہ جس میں رنگِ خودداری ہو جوشِ جاں نثاری ہو
دلوں میں عزم ہو اور عزم میں وہ استواری ہو کہ جس سے کوہ کی بنیاد محکم قول ہاری ہو

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

جنھیں روکے نہ الفت باپ ماں کی آن پر جانے سے جنھیں رکھے نہ کوئی باز قوت آزمانے سے
وفا کی راہ میں قربان ہونے سر کٹانے سے وطن کے خشک لب کو خون کا شربت پلانے سے

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

جنھیں ارمان ہو دریا خون سے دشمن کے بہا جائیں جنھیں حسرت ہے ان کے بعد ان کے نام رہ جائیں
وطن کے واسطے جو برچھیاں سینے پہ سہ جائیں جو اک افسانہ بن جائیں جو اک افسانہ کہہ جائیں

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

رواں ہو جن کی رگ رگ میں ابھی تک خونِ آبائی دکھا دیں جو کہ بھارت ایک پہلو دیس ہے اب بھی
جو دشمن کو ہٹا کر چھین لیں اس سے زمیں اپنی جو دنیا میں جما دیں دھاک اپنے زورِ بازو کی

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

زیادہ جان سے جن کو وطن کو مان پیارا ہو ارادہ جن کا پکا حوصلہ بھی جن کا اونچا ہو
زباں پر جن کے چرچا ہو تو بس حبِ وطن کا ہو وطن ہو زندگی جن کی وطن ہی جن کی دنیا ہو

وطن کو آج ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے

انتباہ

عشرتؔ کرت پوری

خطرے میں ہے وقارِ وطن، جاگتے رہو
نرغے میں ہے بہارِ چمن، جاگتے رہو
وابستہ تم سے عظمتِ ہندوستاں بھی ہے
اے وارثانِ گنگ و جمن! جاگتے رہو
غفلت میں تم پہ یہ کہیں شب خوں نہ مار دے
دشمن بہت ہے وعدہ شکن، جاگتے رہو
رہزن ہے سرحدوں پہ تمھاری کھڑا ہوا
اے پاسبانِ کوہ و دمن! جاگتے رہو
یہ شعر و فن کی دولتِ نایاب لٹ نہ جائے
اے ساکنانِ شہرِ سخن! جاگتے رہو

فسانۂ شمشیر و قلم

عفتؔ بانو زیبا

یہ کون ہمالہ تک آیا، کیوں شور سرِ کہسار اٹھا؟
رندوں نے بھی ساغر توڑ دیے، ساقی نے کہا تلوار اٹھا
یہ موجِ صبا، یہ خندۂ گل، یہ حسنِ چمن، یہ صبحِ وطن!
ان سب کو بچانے کی خاطر، شمشیر بکف فن کار اٹھا
چونکا ہے ضمیرِ ہوش و خرد، دشمن کا نہیں اب کوئی خطر
پہلو میں نرالے عزم لیے دیوانہ اٹھا، ہشیار اٹھا
گاندھی کا چمن، گوتم کا وطن، اور تیری نگاہوں کا مسکن
ہاں دیکھ سنبھل جا اے رہزن! اب غلغلۂ پیکار اٹھا
یہ وقت غزل گوئی کا نہیں، دے فکرِ سخن کو روپ نیا
زیبا ہو یہی پیغام ترا، فرزندِ وطن! تلوار اٹھا

آہنگِ حق

علی عباس عابدی

مہ و خورشید ہوں تنویر کے محتاج آخر کیوں
ہمارے ہاتھ ہوں شمشیر کے محتاج آخر کیوں
ہمارے خواب ہوں تعبیر کے محتاج آخر کیوں
ہمیں ہر خواب کی تعبیر بن جانا بھی آتا ہے

فضائے دہر کی باطل پرستی کا نہیں شکوہ
زمانے کے مذاقِ چیرہ دستی کا نہیں شکوہ
ہمیں تاریکیِ نخوت پرستی کا نہیں شکوہ
اندھیرے میں ہمیں تنویر بن جانا بھی آتا ہے

ہمیں اندیشۂ باطل نہ فکرِ پائمالی ہے
گریں گی بجلیاں کتنی نشیمن ڈالی ڈالی ہے
سمجھتے ہیں بظاہر وہ کہ ترکش اپنا خالی ہے
وہ کیا جانیں کہ ہم کو تیر بن جانا بھی آتا ہے

مدد لے کر سفینہ ہم کو کھینا ہی نہیں آتا
سہارا ناخدا کا ہم کو لینا ہی نہیں آتا
ہمیں تقدیر پر الزام دینا ہی نہیں آتا
ہمیں خود مشعلِ تقدیر بن جانا بھی آتا ہے

ریختی اور انشا

گیان چند

جس طرح زندگی کے اکثر شعبوں میں مردوں نے خواتین کی سرپرستی کا ذمہ لے رکھا ہے اسی طرح شاعری میں بھی بعض مردوں نے مستورات کی نمائندگی شروع کر دی۔ غزل کے معنی ہیں (مردوں کا) عورتوں سے باتیں کرنا۔ ریختی میں بظاہر عورتیں مردوں سے باتیں کرتی ہیں لیکن اس کی ایجاد یا فروغ میں مستورات کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ یہ تو چند شوقین مزاج من چلے شعرا نے خواتین کا منہ چڑانے کے لیے اختراع کی تھی۔ متعدد اصناف سخن میں سے اردو کے طبع زاد اصناف دو ہی تو ہیں۔ رزمیہ مرثیہ اور ریختی۔

مرزا قادر بخش صابر نے تذکرۂ گلستان سخن میں رنگین اور نازنیں کے ترجمے میں ریختی کی ایجاد کا سہرا انشا کے سر باندھا ہے لیکن جب رنگین اور انشا دونوں اس پر متفق ہیں کہ ریختی رنگین کی طبع رنگیں کا کرشمہ ہے تو پھر اس دعوے کو جھٹلانا مدعی سست اور گواہ چست کے مصداق ہے۔ رنگین نے مجالس رنگیں اور دیوان دوم کے دیباچے میں ریختی کی ایجاد کا دعویٰ کیا ہے[1]۔ ایک قطعے میں برملا کہتے ہیں

زبس ہے ریختی ایجاد رنگیں   اسی خاطر کہا کرتا ہے اکثر
ہوا انشا بھی اب کہنے لگا ہے   یہ خوش اس چیونٹی کو بھی لگے پر

انشا اس دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ دریائے لطافت میں میر غفر غینی کی زبانی رنگین سے اس طرح دوستانہ چھیڑ کی ہے: " اور شہدپن جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے، اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور ان کے ساتھ منہ کالا کرے۔

ڈاکٹر زور نے 'اردو شہ پارے' میں دکن و شمال کا قضیہ کھڑا کر کے دعویٰ کیا ہے کہ اور اصناف کی طرح ریختی بھی شمال سے پہلے دکن ہی میں ظہور پذیر ہوئی جیسا کہ ہاشمی بیجاپوری کے کلام سے مترشح ہے۔ ذرا گہرائی میں جا کر دیکھنے کی ضرورت ہے کہ یہ دعویٰ کہاں تک صداقت پر مبنی ہے۔

ہندی میں رادھا اور کرشن کی محبت ایک آدرش کے روپ میں پیش کی گئی ہے۔ کرشن کو سرتاج خوباں مان کر رادھا کی جانب سے اظہار عشق ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہندی کی عشقیہ شاعری میں عورت کو فعال عاشق اور مرد کو محبوب کے طور پر پیش کرنے کی روایت قائم ہو گئی ہے۔ اردو کی ابتدائی شاعری فارسی کی نہیں ہندی کی مقلد ہے۔ دکنی شاعری میں ایسے نمونوں کی کمی نہیں جن میں عورت مرد کے لیے اظہار شوق کرتی ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے تو ہاشمی بیجاپوری سے پہلے قلی قطب شاہ کے اس قسم کے کلام کو ریختی کا نام دیا[2]۔

---

[1] بہ حوالہ تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب از سید محمد مبین نقوی ص ۱۰-۱۱۔ [2] تاریخ زبان اردو طبع دوم ص ۱۹۲۔

قلی قطب شاہ کے کلام میں متکلم ضمیر 'ہوں' کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کلیات میں 'ہوں' صرف ریختی میں آیا ہے"۔

لیکن صرف عورت کی زبانی اظہارِ عشق کو ریختی نہیں کہہ سکتے ورنہ ہندی کی ریت کال کی تمام شاعری ریختی ہو جائے گی اور امیر خسرو کی ریختے کی غزل۔

ع سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ریختی کا پہلا نمونہ قرار پائے گی۔ لیکن عورت کی طرف سے اظہارِ عشق کے علاوہ کچھ اور بھی خصائص ہیں جن سے ریختی عبارت ہے۔ وہ یہ ہیں:

۱۔ عشق کی بجائے ہوس کا بیان۔ جنسی فعل اور جنسی بدعنوانیوں پر توجہ مرکوز رکھنا۔

۲۔ مستورات کے رسوم۔ توہمات اور رشتوں کا قرار واقعی بیان۔

۳۔ عورتوں کے مخصوص روزمرہ اور محاوروں کا بیان۔ اس بارے میں یہاں تک تقید ہے کہ ریختی میں صنفِ قصیدہ کے علاوہ فارسی عطف و اضافت کو قطعاً بار نہیں کیوں کہ عورتوں کی روزانہ گفتگو میں ان کا استعمال نہیں ہوتا۔[1]

اگر یہ عناصر نہ ہوں تو ریختی' ریختی نہیں بھاشا کی شاعری یا عظمت اللہ خاں کا گیت ہو کر رہ جائے گی۔ ہاشمی کی غزلوں میں یہ تمام عناصر نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں کسی حد تک دھینگا مشتی، ہاتھا پائی، زور زبردستی اندھیرے اجالے کا بیان ہو۔ مثلاً ؎

رضا گر مجھ کوں دیتے ہو کروں گی گھر میں جا وارد	اگر مجھ ہوئے گی فرصت صبح پر آؤں گی چھر
مجھے پکڑے ہیں کی چھوڑو ادے دیکھو ہاں مار دوں گی	خدا کی سوں میں منتی ہوں ٹی بو کو پکار دوں گی
اجڑ گئے ہیں کیا ظلم کرتا پڑوسی کوئی دیکھیں گے	سنجھے تک چھوڑے یا سے جو پروا جا اٹھا دوں گی

پتے جھوٹ موٹ باتاں کر بولاک لائے ہیں تمنا	میری بیزار ہو نے سے سوا اس کئی کوں لاؤ نگی
لے دو دن دل برا کر تو لی کی ادا جی لپا جلندی چنڈا	کہ میں تحقیق آئی ہوں بتجھ ملنے انعام میں

ان اشعار کی فضا ریختی کے بہت پاس آ جاتی ہے لیکن ریختی کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔ ان میں محبت نچلی سطح پر ہے لیکن صریح عریانی نہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ریختی کے دوسرے عناصر یعنی نسوانی زبان اور نسوانی رسوم مفقود ہیں۔ انھیں عناصر کے دم سے ریختی کی لسانی اور ادبی اہمیت ہے۔ جس کلام میں یہ نہ ہوں انھیں ریختی کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔

صنف ریختی کا تصور اس کے سماجی پس منظر کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سماج کے انحطاط کی پیداوار ہے۔ ایک بیماری کی علامت ہے۔ معاشرے کے جسم کا ایک پھوڑا ہے۔ اسے لکھنؤ کے مخصوص حالات نے جنم دیا۔ ہاشمی کے عہد میں وہ حالات کہاں تھے جن کے لیے انیسویں صدی کے نصف اوّل کا ادوم بدنام ہے۔ اس ماحول میں طوائف کی بڑی اہمیت تھی۔ اہلِ طرب کے بغیر لوازماتِ امارت نامکمل سمجھے جاتے تھے۔ بقول شررؔ امیروں کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے۔[2] نواب سعادت علی خاں کو یقین تھا کہ شہر کی آبادی طوائفوں کے دم سے ہے اس لیے کسی طوائف کو لکھنؤ چھوڑنے کی اجازت نہ تھی۔ رؤسا کی بیگمات کا حال بھی کچھ بہتر نہ تھا۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں سے ان کے اخلاق کا اندازہ ہوتا ہے۔ فریبِ عشق میں یوں پردہ فاش کیا ہے ؎

رنڈیاں گو کہ ساری آفت ہیں	بیگمیں اور بھی قیامت ہیں
کھلتا ہر اک پہ ان کا حال نہیں	کون ان میں ہے جو چھنال نہیں
ڈھونڈھتی پھرتی خود حسین ہیں یہ	ہم سے دو لی تماشہ بین ہیں یہ

"فوجی حیثیت سے یا دفاع کے نقطۂ نظر سے آج جن ملکوں کا دنیا کے بڑے ملکوں میں شمار ہے وہ وہی ملک ہیں جو صنعتی حیثیت سے ترقی کر چکے ہیں اور جو سائنسی اور متعلقہ تحقیقات کے سلسلے میں ترقی کر رہے ہیں۔" وزیرِ اعظم نہرو

[1] بڑی تلاش سے جان صاحب کے یہاں دو شعر ایسے ملے ہیں جن میں فارسی اضافت آگئی ہے یہ خلافِ اصول ہیں۔

خضرِ دل بھی ہے بھٹکتا آ کے میری مانگ میں	دیکھنے میں راستہ سیدھا ہے یہ ظلمات کا
حق ہے حق نے بھیجے بندوں کی ہدایت کے لیے	آلِ پیغمبر کے حق قرآن پیغمبر حدیث

[2] گذشتہ لکھنؤ طبع اول ص ۲۷۵

اس فضا نے ریختی کو جنم دیا۔ وہ لکھنؤ میں پروان چڑھی اور اس کی دیکھا دیکھی دلی میں بھی دو ایک شعرا نے اسے اپنا فن بنا لیا۔ انشا کا ریختی کا کلام لکھنؤ میں وجود میں آیا اور انھوں نے ریختی میں ایک مکمل دیوان تصنیف کیا۔

ریختی کے اشعار کی ہیروئن (عاشق) معزز بیگمات میں سے نہیں اکثر چھوٹی اُمت کی ہوتی ہے۔ ریختی میں اسے بہت شوخ چشم، چھچھوری اور چونچال دکھایا جاتا ہے۔ انشا کے دیوان کی فرضی شاعرہ کہتی ہے۔ ؎

بلا سے اگر آئی ہولی کہارو　　نہ مجھ سے کرو بولی ٹھولی کہارو

آپ کو اندازہ ہوا کہ یہ محترمہ سوسائٹی کے اس طبقے سے ہیں جہاں کہاروں کو بھی رسائی ہے۔ اس شعر کو کسی قدر سوقیانہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ریختی میں طبقۂ متوسط کی خواتین کے اقوال و افعال کا تذکرہ ہوتا ہے۔

عشق کا مذاق ریختی میں بھی ملتا ہے لیکن یہ خالص جنسیاتی جذبات

باجی تم چاہتی ہو بندی سے جیسا اخلاص　　ابھی تو کنواریوں میں نوج ہوا یسا اخلاص
ایسی نہ چالیں چل تو ہو چاؤ بھری جھوک میں　　آپس میں ہو ان کے رشتا۔ پڑ بندہ گا نا بات کرو

ریختی کی بنیاد جن جذبات پر رکھی گئی ہے ان کے تحت یہ ناگزیر ہے کہ کلام میں عریانی نہ آئے۔ انشا کے یہاں بھی جا بجا فحش ہے لیکن جان صاحب اور رنگین سے کم۔ انشا کے یہاں جان صاحب کی مانند کھلے مغلظات نہیں۔ ہاں معنی کے لحاظ سے یہ بھی خوب کھل کھیلے ہیں۔ بعض جگہ ایسی دور کی تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں کہ بادی النظر میں شعر کے معنی پر میاں نہیں جاتا لیکن غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ اس پردے میں کیا کیا راز فاش کر دیا ہے۔ بعض اشعار میں نسبتاً صراحت سے کہہ گئے ہیں۔ ؎

مردوا مجھ سے کہے ہے چلو آرام کریں　　جس کو آرام دہ بیٹھے بٹھائے آرام ہو نوج

انشا کی شاعری میں یوں ہی شوخی۔ ظرافت معاملہ بندی۔ تیکھے پن اور انوکھے پن کی فراوانی ہے۔ ریختی کے لیے یہ انداز اور بھی

> ”ہندوستان اپنی عزت اور اپنی آزادی کی بقا کے لیے جنگ کرے گا اور اُس وقت تک یہ جنگ جاری رکھے گا جب تک اُس کی سرزمین کا ایک ایک انچ چین کے قبضے سے واپس نہ لے لیا جائے۔“ ——— وزیر اعظم نہرو

اور جسمانی بھوک پر مبنی ہوتا ہے جیسا کہ ذیل کے شعر میں ہے۔ ؎

کوئی کمبخت ہمارا نہیں یہ دل ہوئے　　کر ملا دیوے کسی ساتھ ہمیں آج کے روز

صلائے عام ہے۔ لیکن ایک جگہ انشا نے عشق کی تاثیر بڑے فطری انداز میں دکھائی ہے۔

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہوں بہت سا لیکن　　کیا کروں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا

دوگانا اور زناخی کے رشتے بڑے خلوص اور بہناپے کے ہوتے تھے۔ شاعروں نے انھیں بھی آلودہ کر دیا۔ امرا کے دیوان خانے میں جو اہل نشاط ہوتیں انھیں دوگانا اور زناخی کے نام سے مخاطب کر کے رکیک اشعار سناتے اور ان کے جواب میں لب شیریں سے گالیاں سنتے اور لطف لیتے۔ ریختی گویوں کا یہ بھی ایمان ہے کہ یہ رشتے دراصل استلذاذِ ہم جنسی کی خاطر قائم کیے جاتے تھے۔ رنگین نے اپنے دیوان کی ابتدا میں دوگانا کے یہی معنی بتائے ہیں۔ ایک مثنوی میں اس کا مفصّل بیان بھی کیا ہے۔ انشا کے کلام سے بھی دوگاناؤں کے پوشیدہ تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔ ؎

راس آتا ہے۔ دیکھیے۔ ؎

ہزاروں ہو دو دوگویاں کی پروں نے بچھاڑا ہے　　نہیں یہ لکھنؤ اک راجہ اندر کا اکھاڑا ہے
تیزی کٹیلی آنکھ میں ہے بیگما کے جو　　سو دھار میں چھری کی نہ چاکو کی نوک میں
صدقے آدا رکے تیری۔ جو پکارا میں نے　　تو غضب آن سے کچھ تو نے کہا۔ جی باجی

ذیل کے اشعار میں دیکھیے ان کا تخیل کہاں کہاں دوڑتا ہے۔ بیگم کو رات میں کہیں کھسک جانے کا نسخہ بتلاتے ہیں۔ ؎

تکیوں کو دھر کے اپنے بدل اٹھ پلنگ سے　　اپنا لحاف ان پہ اڑھا۔ اپنا شال ڈال

یادگار کے لیے نشانی مانگتے ہیں تو شوخی سے جلد بازی کر کے کیسا عجب تجویز کی ہے۔ ؎

انشا کو اور اپنی نشانی نہ دے اری　　مٹ سے نکال دے نہیں۔ لا۔ ازار بند

چور مکان میں نقب دیتا ہے لیکن وہ شاد چور مال کا متلاشی نہیں۔ ؎

ہمسائی میں کو نجل ہوئی کل رات کو انشا　　گھس اس کے زنانے میں گیا چور نگوڑا

جس طرح غزل میں عاشق ناصح سے ڈرتا ہے اسی طرح ریختی میں صاحبزادی

آتوں جی سے گھبراتی ہے۔ ذیل کے شعر میں کیا اطرح جذبہ پایا جاتا ہے ؎

مارے لئے کیا ہی کو دسکتے   جا دے اپنے جو گھر آ تو

ریختی میں غزل کے برخلاف رسوم و رواج کا کافی بیان ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے نقشے اور توہمات کا ذکر جان صاحب کے یہاں بھرپور موجود ہے مگر انشا نے بھی اس پہلو کو سرے سے نظر انداز نہیں کیا مثلاً

سیل کے کونڈے اسی کے آج ہی کیا اے دوا   ہے چھوٹا سا جو لڑکا تیری گودی کا پلا
کچھ نہیں معلوم پوچھو کون سا میلا ہو آج   جاتیاں ہیں جو کھچا کھچ ڈولیوں ڈولیاں

غزل میں خد و خال کا ذکر، عورتوں کے لباس و آرائش کا بیان معیوب قرار دیا گیا ہے لیکن ریختی کے لیے یہی حسن ہے۔ اس کی بدولت اگلے زمانے کے گھریلو ساز و سامان کی ایسی تفصیلیں محفوظ ہو گئی ہیں جو اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں مثلاً

گوکھرو۔ لہر بنت۔ ڈاک۔ ستارے کیا چیز   اس سے ہو جاتی ہے کمبخت گنواری انگیا
چبھتی ہو یہ گنواری سلسل کی اوڑھنی   لا دے دہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی

انشا نے مستورات کے توہمات کا بھی بیان کیا ہے۔ اس سوسائٹی میں جب کہ مردوں کی روش ضرورت سے زیادہ آزادانہ تھی بیویوں کو سوتوں اور رقیب عورتوں کا ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا تھا۔ ان کے توڑ کے لیے ٹونوں ٹوٹکوں کی ہمیشہ ضرورت لاحق رہتی تھی! انشا ان سے باخبر ہیں۔ ؎

ہے جنگالی ہوئی دوالی کی   قہر اک اس کے پاندان میں لونگ
سوتنیں کمبخت جو وہ بیر دوڑاتی رہیں   ہم سے آخر کیا ہوا اپنا کیا پاتی رہیں

ریختی میں غزل سے ایک اصولی فرق ہے کہ اس میں اشعار عورت کی زبان سے ادا کرائے جاتے ہیں۔ انشا نے کئی جگہ اس بنیادی امر کو ملحوظ نہیں رکھا جو قابلِ گرفت ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہو گئے ہیں جو مرد کی زبانی ہیں مثلاً

بلائیں میں نے جو لیں ان کی کل چٹاخ چٹاخ   تو کس مزے سے کہا بیگما نے چل گستاخ
آ ڈھلی میرے ساتھ سا دے تجھے دم   بکھ نہ کر دو تم ہر اس خون نہیں کچھ

خیر یہ شعر تو ایسے ہیں جن کا موضوع ریختی سے میل کھاتا ہے۔ ذیل میں چند ایسے اشعار درج کیے جاتے ہیں جنھیں ریختی سے دور کا لگاؤ نہیں ؎

اوس پھولوں پہ پڑے تو نہ سمجھیو انشا   یہ کسی کے لیے ہے آنسوؤں سے روتی صبح
یہ اتفاق ہے نہ بنے یا بنی رہے   پر آدمی کو چاہیے دل تو غنی رہے

مندرجہ بالا اشعار اور ان کے امثال کو دیکھ کر سوچنا پڑتا ہے کہ ان پر ریختی کا اطلاق کیوں کر کیا جائے۔

انشا نے ریختی میں طرح طرح کی تشبیہیں استعمال کیں جو غزل کی طرح فرسودہ نہیں، ان سب میں ندرت اور جدت پائی جاتی ہے چند مثالیں یہ ہیں۔ ؎

نئے دھانوں کی سی کھیتی کی طرح اے انشا   ڈہڈہی اور ہری ہوں تو بھلا تجھ کو کیا
کیوں پڑے تھلکا نہ جی میرے کلیجے میں بھلا   ہے تمھارا روپ یا جیسے سونے کا ڈلا
کیوں پگھل پڑے نہ ہو روپ یہ کہاں کا تو   سونے روپے کو گلا دیوے سہاگا جیسے

ریختی میں عورتوں کی زبان نظم کی جاتی ہے۔ روزمرہ اور محاورے کا بانکپن سب سے بہتر طریقے سے گالیوں میں رونما ہوتا ہے۔ انشا نے اس موضوع سے فائدہ اٹھایا۔ کئی اشعار میں محض گالیاں اور کوسنے ہی بھرے ہیں۔ ان کے مقابل بعض اشعار میں دعائیں ہیں۔ ان سب میں مستورات کے محاوروں کا حق ادا کیا ہے۔

جو مجھے ٹوکے سوالہی کرے   ہوتے سوتے کو اپنے کھائے پھاڑ
جو ہم کو چاہے اس کا خدا ن بھلا کرے   دودھوں نہائے اور وہ پوتوں پھلا کرے

ریختی میں دوسری اصناف کی نسبت دیسی الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس میں بیگمات کی زندگی کا ہر پہلو پیش کیا جاتا ہے۔ ان کی بول چال کا ہر محاورہ قصداً نظم کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ریختی میں غریب اور غیر مانوس الفاظ بھر جاتے ہیں۔ جان صاحب کے یہاں خاص طور پر یہ عیب پایا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ کی بھرمار ہے جو کسی خاص محلے یا خاص طبقے میں رائج ہیں اور جنھیں عرف عام کی سند ہرگز نہیں ملی۔ ان کی افراط سے شعر گنجلک ہو جاتا ہے۔ انشا اس عیب سے مبرا ہیں۔ ان کے اشعار عموماً سلیس ہیں۔ انھوں نے جس قسم کے الفاظ اور محاوروں کو فروغ دے کر زبان کو مالا مال کرنا چاہا ہے ان میں سے مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں: بستار۔ اڑنچھو۔ نین متی۔ چوٹی دار آہیں۔ کھٹ چالیں۔ ان کرتا۔ اکل کھری۔ بندر۔ تھلکتی چاندنی۔ دھاڑ کی دھاڑ۔ لونڈوں گھیری۔

انشا کے یہاں بہت کم ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کے معنی متعین نہیں یا جو ادبی حیثیت نہیں رکھتے مثلاً ادکنی۔ ارتلا۔ کڑبڑے۔ کلکلا

کرنا وغیرہ۔ جیسا کہ اس سے پہلے صراحت کی گئی ہے ریختی میں یہ بھی پابندی رہتی ہے کہ فارسی عطف و اضافت ہرگز نہ آنے پائے۔ حیرت ہے کہ ایک شعر میں انشا سے چوک ہوئی اور فارسی اضافت باندھ گئے۔

تم کو تو دھیان ہی آٹھ پہر ہو کہ مجھے رت نیا روز ہر اک ماہِ شب افروز ملے

انشا نے دیوان ریختی میں بعض بڑی دشوار گزار اور سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی کی اور نباہ گئے۔ اسی طرح بعض نامانوس بحریں بھی استعمال کیں۔ ان عروضی تجربات میں وہ ہر جگہ کامیاب رہے لیکن ایک دو مقامات پر وزن میں کچھ سقم رہ گیا ہے مثلاً

یہ کیا تجھے بنے خواہی نہ خواہی مجھ سے بجنا واہی تباہی
فعلن فعولن فعلن فعولن فعلن فعلن فعلن فعولن

یہ پوری غزل فعلن فعولن فعلن فعولن کے وزن میں ہے لیکن دوسرے مصرع کا رکن ثانی سہواً محض فعلن رہ گیا ہے۔

سنی کسی سے جو بحر تقارب اسے کر لیا گھنگھروؤں کا تفنن
کہ توڑ ہے اپنے سبق پر یہ کہہ کر فعولن فعولن فعولن فعولن

یہ پوری غزل مندرجہ بالا وزن میں ہے لیکن مطلع کے دونوں مصرعوں میں آخری رکن فعَل رہ گیا ہے جو جائز نہیں۔

نظر آویں بیراس میں پڑھنے کے گن جیسے کھیل میں بھی لگی ہو یہ دھن
فعولن فعولن فعولن فعَل فعولن فعولن فعولن فعَل

انشا جیسے عالم سے اس کی توقع نہ تھی۔ ممکن ہے سہو کاتب ہو۔

انشا ریختی کہنے والے شعرا کی صف اول میں بیٹھتے ہیں۔ اس صف میں چار اشخاص ہیں۔ سعادت یار خاں رنگین، انشا، میر یار علی جان صاحب اور مرزا علی بیگ نازنین دہلوی۔ عموماً جان صاحب کو قافلہ سالار[1] سمجھا جاتا ہے لیکن قادر بخش صابر نے تذکرہ گلستان سخن میں اور عبدالغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں نازنین کو جان صاحب پر ترجیح دی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جان صاحب کی ریختی ضخامت میں دوسروں سے بہت زیادہ ہے لیکن اس میں تین نقائص بہت نمایاں ہیں۔ اول تو فحش اس کثرت سے اور اتنے کھلے ہیں کہ تہذیب کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہے۔ دوسرے انھوں نے نامانوس مقامی الفاظ اس آزادی سے استعمال کیے ہیں کہ کلام کی معنویت جاتی رہی ہے۔ سلاست کی جگہ تعقید اور گنجلک پن نے لی ہے۔ تیسرے یہ کہ رعایت لفظی ایسی بے طور ہیں کہ جی گھبرا جاتا ہے لیکن رسوم و رواج اور نسوانی معاشرت کی جو جزئیات ان کے یہاں ہیں وہ اوروں کے یہاں نہیں۔ نازنین کا دیوان غالباً شائع نہیں ہوا لیکن ان کا جو کچھ متفرق کلام ملتا ہے وہ اعلیٰ درجے کا ہے۔ زبان صاف ستھری، خیالات میں تنوع اور شاعری کا مزہ ہے۔ رنگین کے دیوان میں غزل کے علاوہ ادبی اصناف ملتے ہیں انھوں نے معاشرت کے مختلف شعبوں پر خیال آرائی کی ہے۔

انشا کا ریختی کلام جان صاحب اور رنگین سے ضخامت میں کم ہے۔ زبان کے لحاظ سے ان کے کلام کی صفائی میں شبہ نہیں لیکن خیالات میں وہ بوقلمونی نہیں جو جان صاحب یا رنگین کے یہاں ہے۔ ان کے یہاں عورتوں کے توہمات، رسوم، تیوہاروں، ملبوسات اور رشتوں ناتوں کی وہ تفصیلات نہیں جو جان صاحب کی خصوصیت ہیں۔ انشا ریختی میں بھی زیادہ تر عشق اور معاملہ بندی تک محدود رہے۔ جان صاحب اور نازنین خالص ریختی گو شاعر ہیں۔ رنگین نے ریختی کے علاوہ بہت کچھ کہا ہے لیکن ان کی بقیہ غزل گوئی کی کوئی اہمیت نہیں۔ انشا کے یہاں دیوانِ ریختی ایک ضمنی پیداوار ہے جو محض تفنن طبع کی خاطر وجود میں آیا ہے۔ ان کی شہرت ریختی سے نہیں ریختے سے ہے۔ عام طور پر لوگوں کو یہ علم بھی نہیں کہ انشا نے ریختی میں ایک مکمل دیوان چھوڑا ہے۔ تذکروں اور تواریخ ادب میں انشا کی ریختی کا ذکر یا تو بالکل نہیں یا برائے نام ہے حالاں کہ انشا ریختی کے میدان میں ناکامیاب نہیں۔ جب ہم انشا کی سیرت کی یاد کرتے ہیں تو فوراً خیال آجاتا ہے کہ یہ مزاج ریختی کے لیے موزوں ترین تھا۔ انشا کی شوخی طبعی اور لکھنؤ کا رنگین ماحول گویا بارود کو چنگاری مل گئی۔ نتیجہ ریختی کا دیوان تھا۔

---

[1] یہ کہنا کہ لکھنؤ نے ریختی کو جنم دیا (ص۱۰) ایک ایسا دعویٰ ہے جو محتاج ثبوت ہے۔ "قافلہ سالار" تو سعادت یار خاں رنگین اور انشا کو کہا جا سکتا ہے اور یہ دونوں دراصل دلی ہی کے تھے۔ لکھنؤ میں صرف جان صاحب کا نام اس سلسلے میں آتا ہے۔ ان کے علاوہ یہاں اگر دوسرے ریختی گو شعرا تھے بھی تو ان کے نام تک نہیں معلوم ——— (ایڈیٹر)

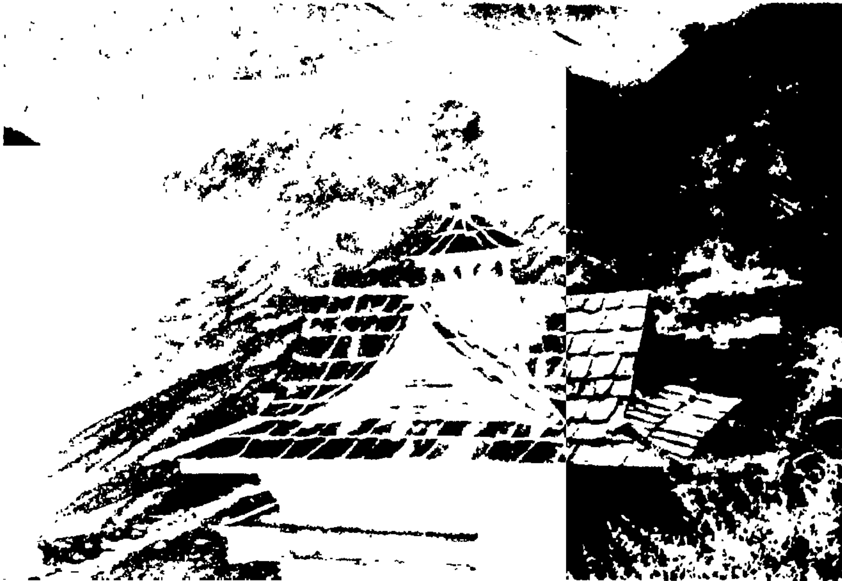
وسطی سیکٹر میں

بھارت اور چین کی سرحد

> ہندوستان اور چین کو وسطی سیکٹر میں ۳۵۰ میل لمبی سرحد ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے۔ یہ سرحد پنجاب، ہماچل پردیش اور اُتر پردیش کی حدوں کو چھوتی ہے۔ ذیل کے مضمون میں سرحدی علاقوں کی قدیم تاریخ، وہاں کے رسم و رواج، وہاں کے باشندوں کی طرزِ معاشرت پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وسطی سیکٹر کے یہ تمام علاقے انتہائی قدیم زمانے سے ہندوستان کے جُز ہیں اور ان کے بارے میں چین کے دعوے یکسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔

کے نوبالاچاری

وسطی سیکٹر میں بھارت وچین کی درمیانی سرحد ۳۵ میل لمبی ہے اور شمال سے جنوب کی طرف بڑھے اور مسلسل پہاڑی سلسلوں سے



باشہر کا ایک پرانا مندر جو ایک مخصوص قسم کے قدیم فنِ تعمیر کا نمونہ ہے

گذرتی ہوئی پنجاب، ہماچل پردیش اور اترپردیش کی شمالی سرحد بناتے ہوئے انھیں تبت کے علاقے کے نگری کھورسوم یا آری ضلع سے جدا کرتی ہے۔ ان ریاستوں کے یہ سرحدی علاقے کلی طور پر ہمالیائی نظام کا حصہ ہیں۔

پنجاب میں

ریاست پنجاب میں سرحدی رقبہ ضلع کانگڑہ کے کلو سب ڈویژن

کے علاقے اسپیتی وزیری پر مشتمل ہے۔ ڈھائی ہزار مربع میل رقبے والے اس علاقے کے نقاط وقوع ہیں شمال میں ۳۲ درجے پانچ منٹ سے لیکر ۳۲ درجے ۴۲ منٹ تک اور مشرق میں ۷۷ درجے ۴۰ منٹ سے لیکر ۷۸ درجے ۴۹ منٹ تک۔ اس وادی کے اطراف میں اوسطاً ۱۸ ہزار فیٹ بلند کوہستانی سلسلے چلے گئے ہیں جو مانسون کو روک لیتے ہیں۔ اس کے شمال و مشرق میں لنگ لا اور پارنگ لا نامی دو درے ہیں۔ موسم سرما میں اسپیتی ندی میں برف جم جاتی ہے اور اس کے اوپر سے تبت جانا ممکن ہو جاتا ہے۔ اصل پہاڑی سلسلوں سے عارضی طور پر ذیلی پہاڑ نکل کر وادی میں چلے آتے ہیں جن کے باعث صرف ایسی تنگ کھائیاں رہ جاتی ہیں جن میں سے اسپیتی ندی اور اس کی معاون یعنی پن، لنگٹی اور شیلا گذرتی ہیں۔

آب و ہوا۔ موسم سرما میں شدید برف باری ہوتی ہے جنکے سبب گھروں سے باہر نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ باقی دنوں میں گلیشیروں وغیرہ کا پانی پگھل کر نالوں کی شکل میں اسپیتی اور اس کے



لاہول کی کچھ عورتیں

معاونوں میں آتا ہے وادی کا ارتفاع اور بارش کی کمی کی وجہ سے نباتات میں بہت کمی ہے۔ وادی کے اوپری نصف حصے میں ایک بھی درخت دکھائی نہیں دیتا۔

باشندے۔ پوری وادی میں کل چھ ہزار باشندے آباد ہیں جو "جیلوک پا" طبقے کے لامائی بودھ مت کے پیرو ہیں۔ اکثر چھوٹے بیٹے لاما بن جاتے ہیں۔ یہاں کئی ایک مٹھ ہیں۔

مردوں کے لباس میں پورے سر کو چھپانے والی ٹوپی، موٹے اونی کپڑے کا ڈھیلا سا فراک، جس کو کمر میں ایک لمبی پٹی سے باندھ لیا جاتا ہے، اوپر سے کپڑے کے اور نیچے سے چمڑے کے بنے ہوئے جوتے، لوہے کا ایک چمکدار پائپ، کمر بند سے لٹکتا ہوا ایک چاقو، ایک چقماق کا پتھر، ایک دھاتی چمچہ اور چابیوں کا ایک گچھا شامل ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے ساتھ کوٹ کے اندر ایک دھاتی پیالہ، تمباکو کی ایک تھیلی اور سکھائی ہوئی بارلی کی کچھ مقدار ہوتی ہے۔ کلو وادی کے مقابلے میں اسپیتی وادی کے مرد زیادہ زیورات پہنتے ہیں۔

قدیم تاریخ۔ اسپیتی وادی زمانہ قدیم میں ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھی جن کا خاندانی نام "سیتا" تھا۔ لداخ کی تاریخ سے

اسپیتی کا ایک زمین دار اور اس کا بچہ

ثابت ہے کہ نویں صدی میں اسپیتی وادی لداخ کا حصہ تھی۔ دسویں صدی میں وہ علاحدہ ریاست بن گئی لیکن سترھویں صدی

میں اُسے دوبارہ لداخ میں شامل کرلیا گیا۔
۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے اسپیتی ولاہول کو لداخ سے لیکر پنجاب کا حصہ بنا دیا۔

ہماچل پردیش میں

ہماچل پردیش میں سرحدی علاقہ باشہر کی سابقہ ریاست پر مشتمل ہے جو شمال میں ۳۱ درجے سات منٹ سے ۳۲ درجے پانچ منٹ تک اور مشرق میں ۷۷ درجے ۲۲ منٹ سے ۷۹ درجے تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کا ارتفاع اسپیتی کے مقابلے میں کم ہے۔ تاہم اس میں زیادہ خطرناک پہاڑی ڈھلانیں اور کھائیاں ہیں جو سیدھے ستلج کی تہ تک چلی جاتی ہیں۔ ستلج درۂ شپکی سے ایک میل شمال میں اس ریاست میں داخل ہوتی ہے اور مغرب کی طرف بہتی ہوئی ایک طرف وسطی ہمالیہ کی ڈھلانوں سے آنے والا پانی لے جاتی ہے تو دوسری طرف اسپیتی پہاڑیوں کے بہاؤ کو اپنے ساتھ لے لیتی ہے۔ یہ ندیاں ہمیشہ پانی سے بھری رہتی ہیں پر تب بھی بہتی ہیں اور بارش میں تو سیلابی بن جاتی ہیں۔ باشہر سے جمنا کی دو معاون ندیاں پبّر اور روبن نکلتی ہیں۔
جنگلی جانوروں میں چیتے اور ریچھ عام طور پر دیکھنے میں آتے ہیں۔

باشندے۔ ایک لاکھ افراد کی آبادی کی اس ریاست میں راجپوت حکمراں تھے۔ باقی کانیت نام کے لوگ تھے جو اصل میں تو راجپوت ہی تھے لیکن بیواؤں سے شادی کرکے انھوں نے اپنی ذات کھو دی تھی۔ ریاست کا بڑا مذہب ہندومت ہے اور جگہ جگہ مندر ملتے ہیں۔
پہاڑی لوگ چار کلیوں والا کوٹ، شلوار اور کاجی پہنتے ہیں اور کپڑے کے کمربند باندھتے ہیں۔ کان میں بالی، گلے میں کنٹھی اور پاؤں میں چھلے پہنتے ہیں۔

قدیم تاریخ۔ باشہر کا شمالی ضلع کناور [illegible] بیان کئے ہوئے کِنّر قبیلے کے مسکن یا "کِنّر دیش" کی بدلی ہوئی صورت

ہے۔ ۱۸۰۳ء میں گورکھاؤں نے اس ریاست پر قبضہ کرلیا لیکن ۱۹۱۵ء میں انگریزوں نے گورکھاؤں سے جنگ کے بعد ٹہری گڑھوال، گڑھوال اور الموڑا کے ساتھ اس کو بھی اپنی عملداری میں شامل کرلیا۔

اتر پردیش میں

اتر پردیش میں سرحدی علاقہ کماؤں ڈویژن پر مشتمل ہے جو اتر کاشی (سابقہ ٹہری ریاست) گڑھوال اور الموڑا ضلعوں پر محیط ہے۔

ٹہری گڑھوال۔ ٹہری گڑھوال ہمالیہ کا حصہ ہے جس میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی ڈھلانیں اور بلندیاں وادی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ سرحدی بندھاری سلسلے سے نکلنے والی ڈھلانوں کی سمت عام طور پر شمال مشرق سے جنوب مغرب کی طرف ہے اور ان کی بلندیاں ۱۸ تا ۲۰ ہزار فیٹ ہیں۔ گڑھوال کے مانند یہاں بھی ان گنت گلیشیر ہیں۔ درۂ سانگ چوک اور درۂ ملنگ لا سے تبت کو راستے جاتے ہیں۔ اس علاقے میں گنگا اور یمنا دونوں کا منبع ہے۔ جڑ گنگا اور بھاگیرتھی کے سنگم پر بھیروں گھاٹی اور گنگوتری ہندوؤں کے مقدس مقامات ہیں۔

جغرافیائی تفصیل۔ اس علاقے کے نباتات میں تنوع ہے جیسا کہ ہمالیائی نباتات میں ملتا ہے۔ استوائی نباتات سے لیکر اس کے برفانی نباتات تک ساری قسمیں یہاں دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہاں گھنے جنگلوں کی بہتات ہے۔ پہاڑی ڈھلانوں پر کاشت کاری کی جاتی ہے اور دریاؤں میں پائی جانے والی ریتیلی جگہوں میں بھی فصلیں اگائی جاتی ہیں۔
جنگلی جانوروں میں شیروں، کالے ریچھوں، بارہ سنگھوں دھبے دار ہرنوں اور بھیڑوں کی بہتات ہے۔ ٹہری گڑھوال میں دو ہزار چھ سو گاؤں ہیں جن میں ساڑھے چار لاکھ لوگ

گڑھوال۔ ٹہری گڑھوال [illegible] گڑھوال (جسے برٹش



گڑھوال اور الموڑہ کے چند رہنے والے مصروفِ گفتگو

گڑھوال بھی کہا جاتا رہا ہے) بھی ایک دم اونچے ہونے والے پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے، جو اصل سرحدی بندھاری سلسلوں سے نکل کر ایک دوسرے کے ساتھ گہری اور تنگ کھائیاں بناتے ہیں۔ ان میں نندہ دیوی اور بدری ناتھ کے سلسلے زیادہ اہم ہیں۔ پچیس پچیس میل تک ان کی مشرقی و مغربی سمتیں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ نندہ دیوی کے ایک کونے پر نندہ کوٹ کی چوٹی ہے تو دوسرے کونے پر ترشول کی جبکہ بدری ناتھ کے دونوں طرف بدری ناتھ اور کیدارناتھ سے نکلے ہوئے کوہستانی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک اور بھاری سلسلہ کوہ دھولی گنگا اور وشنو گنگا کے طاسوں کو جدا کرتا ہے۔ اس سلسلے کی سب سے اونچی چوٹی کامیت ہے جو ۲۵۴۴۷ فٹ اونچی ہے اور بندھاری سلسلے کے قریب واقع ہے۔

اس حلقے میں کئی چھوٹی چھوٹی جھیلیں، گلیشیر اور گرم پانی کے چشمے ہیں۔ اس علاقے میں دھولی گنگا، وشنو گنگا اور اس کے معاونوں یعنی پنڈار اور مندا کنی سے پانی آتا ہے۔

گڑھوال کے ۴۲۰۰ گاؤں میں کوئی ساڑھے چھ لاکھ کی آبادی ہے۔

الموڑا۔ الموڑا میں برف پوش سر بفلک پہاڑی سلسلے پھیلے ہوئے ہیں جن میں سے قدرتی حسن اور جغرافیائی اہمیت کے لحاظ سے نندہ دیوی قابل ذکر ہے۔ اس علاقے کا یہ سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ یہ اور اس کی نواحی چوٹیوں کے مشرق میں پنچ شولی کا پہاڑی سلسلہ ہے جس کی بلند ترین چوٹی ۲۲۶۶۱ فیٹ پر ہے۔ اس میں کالی ندی کی معاونوں سے پانی آتا ہے جو نیپال اور الموڑا کی درمیانی سرحد بناتی ہے۔ الموڑا سے تبت کو جانے والے دروں میں سے سات خاص طور پر اہم ہیں۔

الموڑا سب سے زیادہ آباد ہے۔ اس میں سات لاکھ نوے ہزار لوگ پانچ ہزار تین سو گاؤں میں بستے ہیں۔

ہندو روایات۔ ٹہری گڑھوال، گڑھوال اور الموڑا کے تینوں ضلعوں کا سکند پران میں "کیدار کھنڈ" کے نام سے ذکر ملتا ہے اور یہ تینوں ضلعے ہندوؤں کے مقدس مقامات ہیں۔

کماؤں کا اصل نام "کورم چل" وشنو کے دوسرے اوتار کی علامت ہے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ یہیں پر دیوتا اور دیویاں، رشیوں اور منیوں سے بات کرتے تھے۔ یہیں پر پانڈو، جن کے تذکرے اب بھی پہاڑی لوگوں کے ناچوں اور گیتوں میں ملتے ہیں، اندر کے سورگ کی تلاش میں پہنچے تھے۔ یہیں لنگور پہاڑیاں ہیں جہاں ہنومان جی نے گھور تپسیا کی تھی اور آج بھی ہزاروں لاکھوں ہندو اپنی مکتی کی تلاش میں کیدارناتھ اور بدری ناتھ کی یاترا کرتے ہیں۔ یہاں پر وشنو مندروں کے مقابلے میں شیو مندر زیادہ ہیں۔

باشندے۔ ٹہری ریاست کی آبادی میں راجپوت اور ڈوم لوگ شامل ہیں۔ گڑھوال اور الموڑا میں بھیٹ اور ڈوم لوگ بستے ہیں۔ ان کے علاوہ ٹہری گڑھوال کے علاقہ نیلا لنگ جڑانگ میں اور گڑھوال کے علاقے نیتی مان میں کچھ بھوٹیا لوگ رہتے ہیں۔ الموڑا کی شمالی پٹیوں میں ان کی تعداد چالیس ہزار

کے قریب ہے۔ یہ موٹے توا نا لوگ بڑے ہوشیار تاجر ہوتے ہیں۔ موسم گرما میں وہ سرحدی علاقوں تک تجارت کرنے چلے جاتے ہیں لیکن موسم سرما میں بھارت کے کم سرد علاقوں میں نشیب کی طرف چلے آتے ہیں۔ یہ بھی ہندو ہیں اور ایک کے اوپر ایک کپڑے پہنتے ہیں۔ سب سے اوپر کوٹ یا کھال کا لبادہ ہوتا ہے جو گھٹنوں تک پہنچتا ہے پاجامے بھی اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

پرانے تجارتی تعلقات۔ کوئی سات ہزار بھوٹیا لوگ ان علاقوں اور تبت کے درمیان تجارت کرتے ہیں۔ عام طور پر غذائی اجناس، تانبا، لوہا، تباکو، چینی اور چاندی کے زیورات برآمد کئے جاتے ہیں۔ درآمد کی جانے والی اشیاء میں بورکس، نمک، اون، یاک کی دُمیں، خچر، بھیڑیں اور بکریاں شامل ہیں۔

ہر علاقے کے تاجروں کا گروہ اپنے خاص راستوں ہی پر سے تبت جاتا اور خاص مقاموں پر تجارت کرتا چلا آیا ہے۔ ان تمام مقاموں پر تجارت ستر کے اصول پر ہوتی تھی یعنی جس سے کوئی چیز خریدی ہے تو اسی کے ہاتھ کوئی چیز بیچے۔ باشہر کے باشندے ایک قدیم معاہدے کے تحت محصول تجارت سے مستثنیٰ کر دئے گئے تھے اور ڈوبنگ برا، سانحسی اور گرباٹوک میں تجارت کیا کرتے تھے۔ اسپتی اور لاہول کے لوگ عموماً رڈوک اور تاشی تونگ میں تجارت کرتے تھے جو بیشتر پشمینہ یعنی نرم اون کی اشیاء سے متعلق ہوتی تھیں۔ ٹہری گڑھوال کے لوگ پولنگ، ٹولنگ اور نبرا کے مقاموں پر تجارت کرتے تھے۔ الموڑا کے تاجر گلاکوٹ میں تجارت کرتے تھے۔ تجارتی محصول ایک بستی سے دوسری بستی میں مختلف ہوا کرتا تھا۔ ڈرما اور بیان کے تاجروں پر زیادہ محصول لگایا جاتا تھا۔ اس روایتی تجارت کی ۱۹۵۴ء کے معاہدے میں توثیق کی گئی اور بھارت سے تبت جانے والے قدیم تاجروں کے سفر کے راستے اور تبت میں ان کی منڈیاں مقرر کی گئیں۔

حد بندی۔ وسطی سیکٹر میں بھارت و چین کی سرحد کی بھارتی حد بندی گیا چوٹی سے شروع ہوتی ہے اور اسپتی اور پرے ندیوں کے طاس کے درمیان سے پندھاری سلسلے پر سے گزرتی ہوئی کورک گاؤں سے ایک میل جنوب میں پرے ندی کو کاٹتی ہوئی ستلج کے مغربی و مشرقی معاونوں کے درمیان سے گزرنے والے پن دھاری سلسلے پر چڑھ جاتی ہے اور ستلج کو اس کے موڑ پر پار کرتی ہوئی ذاسکر سلسلے سے گذرنے لگتی ہے اور بالآخر درّہ شپکی اور درّہ رشم دھارنگ جا پہنچتی ہے۔ اس کے بعد وہ ستلج اور گنگا کے طاسوں کو جدا کرنے والے پن دھاری سلسلے سے گزرتی ہے۔ یہاں سے ٹھگا، تا سنگ چوک، منا، نیتی، تیخون، کنگری بنگری، ڈرما اور لیپو لیکھ درّوں پر سے ہوتی ہوئی بھارت، نیپال و تبت کی سرحدوں کو ملاتی ہے۔

دوسرے اور سیکٹروں کے برعکس اس سیکٹر میں چینی حد بندی بہت حد تک بھارتی حد بندی کے مشابہ ہے لیکن وہی پھدکنی چال چلتی ہوئی چوٹی سے چوٹی اچکتی پھرتی ہے۔ اسپتی میں وہ ساٹھ مربع میل کے دعوے دار ہیں۔ اسپتی درّے کے پاس ان کی حد بندی درّہ شپکی سے چار میل مغرب کی طرف ہے اور جنوب میں درّہ نلنگ جرٹنگ اور درّہ منا کو بھی تبت میں شامل کر لیتے ہیں۔ بارہ ہوتی کے رقبہ میں ۳۵ میل لمبے اور ۵ تا ۸ میل چوڑے علاقے پر دعویٰ کر کے وہ بارہ ہوتی، ٹن جنگ، شل شل اور کنگری اور بنگری درّوں کو بھی اپنی عملداری میں لینا چاہتے ہیں۔



اردو کا ایک نادر الوداعی سپاس نامہ

ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی

مارٹن رچرڈ گبنس (۱۸۱۲ء تا ۱۸۶۳ء) کے نام سے آزادیٔ ہند کی تاریخ سے دل چسپی رکھنے والے سبھی واقف ہوں گے۔ اودھ پر ۱۸۵۶ء میں کمپنی کا قبضہ ہو جانے کے بعد وہ برٹش کمیشن کا ایک رکن مقرر ہوا اور ۱۸۵۶-۵۷ء کے جاڑے کے موسم میں اس نے فائننشل کمشنر کی حیثیت سے پورے اودھ کا دورہ کرکے اس بندوبست کی جانچ کی جو سمری سٹلمنٹ کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے اس کی بہت سی خرابیاں صحیح کرکے اصلاحات کی تجویزیں کمپنی کے افسران کے سامنے رکھیں۔ غالباً اسے اس جوالا مکھی کا اندازہ ہو گیا تھا جو اودھ والوں کے دلوں میں چھپا تھا اور مئی ۱۸۵۷ء میں پھوٹنے والا تھا۔ اس کی مشہور و معروف تصنیف The Mutinees in Oudh (دی میوٹنیز ان اودھ) ان کی کتابوں میں سے جو اس پورے لٹریچر میں جو انگریزوں نے اس جنگ کے متعلق تیار کیا تھا، بڑی اہم اور سب سے زیادہ پُر از معلومات ہے۔

اسی خاندان کا ایک مایۂ ناز فرزند مسٹر جان پانٹن گبنس بھی تھا جو ہندوستان میں ۲۷ برس ملازمت کرنے کے بعد ۱۸۵۲ء میں دہلی سے اپنے وطن واپس چلا آیا۔ ملازمت کے آخری سات سال میں وہ سشن جج شاہجہان آباد (دہلی) کے عہدے پر سرفراز رہا۔ اس کی انصاف پسندیٔ، ہندوستان کی تہذیب اور یہاں کے تمدن سے دل چسپی، بنی نوع انسان سے ہمدردی، ہندوستانیوں کی تعلیم کی ترقی اور اردو زبان سے کما حقہ واقفیت کا ثبوت وہ الوداعی سپاس نامہ اور بیش قیمت چاندی کا قلمدان ہے جسے دہلی والوں نے اسے رخصت کرتے وقت پیش کیا تھا۔ یہ دونوں چیزیں ابھی تک جان گبنس کے پوتے مسٹر [illegible] گبنس کے پاس لندن سے کچھ دور ہائی وی کمب (بکنگھم شائر) میں محفوظ ہیں۔ مسٹر جے گبنس نے راقم الحروف کی درخواست پر سپاسنامے کا فوٹو اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز کی لائبریری کو دے دیا ہے۔[1]

قلمدان پر مندرجہ ذیل تاریخ بڑی ہی عمدہ نستعلیق میں کھدی ہے۔

جج دادگر جان پانٹن ز دہلی   بنام نکو شد بہ انگلینڈ رخصت
بہ شکریہ تاریخ برِ یادگاری   نوشتیم ہائے ہائے غم ہائی فرقت
۱۸۵۲

اس سپاسنامے میں جس کا سائز ۶ × ۸.۲ ہے ۱۵ اوراق ہیں۔ حاشیوں کو علیحدہ کرکے یہ سپاسنامہ ۳ × ۵ کے حوض میں لکھا گیا ہے۔ ہر صفحہ میں ۹ سطریں ہیں۔ ہر صفحہ پر طلائی کام ہے اور لوح خاص طور پر مذہّب اور مطلا ہے۔ سپاسنامہ کی عبارت ۶ اوراق پر مشتمل ہے اور بقیہ اوراق دستخطوں اور مہروں سے بھرے ہیں اور یہی سپاسنامے کا سب سے بیش قیمت جزو ہے۔ ورق ۷ سب پر سب سے اوپر محمد صدر الدین خاں بہادر کی مہر ہے جو غالباً مفتی صدر الدین آزردہ (متوفی ۱۸۶۸ء) ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ کمپنی کی طرف سے دہلی میں صدر الصدور اور مفتی تھے۔ جولائی ۱۸۵۷ء میں قاضیوں مفتیوں اور عالموں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا جو فتویٰ شائع ہوا تھا اس میں مفتی صدر الدین کی بھی مہر تھی لیکن اس مہر پر مفتی بھی لکھا ہے۔ بعد میں مفتی صدر الدین نے اس مہر

[1] ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی مزید ریسرچ کے لئے لندن گئے ہوئے ہیں اور یہ مضمون انھوں نے لندن ہی سے ہماری درخواست کے لئے بھیجا ہے۔ (ایڈیٹر)

[2] صادق الاخبار دہلی مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۵۷ء نیشنل آرکائیوز دہلی و سوتنتر دلی (ہند) مصنفہ ڈاکٹر ایس اے اے رضوی (لکھنؤ ۱۹۵۷ء) صفحہ

سے انکار کیا اور سے جعلی بتلایا۔ غالباً مفتی صدر الدین نے اس فتوے پر وہ مہر لگائی جو عام طور پر فتووں پر لگاتے ہوں گے اور اس سپاسنامے پر وہ مہر ہے جو وہ عام طور پر کاغذات پر لگاتے ہوں گے۔ اسی ورق پر سر سید احمد خاں کے دستخط بھی ہیں۔ جو اس وقت منصف درجہ اول مقام شاہجہاں آباد اور صرف سید احمد خاں تھے۔

شعرا میں سب سے اہم مہر ملک الشعرا خاقانی ہند محمد ابراہیم خاں بہادر ذوق کی ہے۔ موصوف نے مہر کے اوپر خاکسار اور نیچے "استاذ سلطانی" اپنے ہاتھ سے لکھا ہے (ورق ۹ ب)۔ اسی ورق پر ان کے ایک صاحبزادے محمد اسمٰعیل خاں کی چھوٹی سی مہر ہے جس کے اوپر انھوں نے حقیر پر تقصیر" اور نیچے "ابن خاقانی ہند ملک الشعرا استاد حضرت بادشاہ دہلی" اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ ورق ۱۱ ب پر ندیم الدولہ خلیفۃ الملک حافظ محمد داؤد خاں مستحکم جنگ بہادر کی مہر ہے جس کے اوپر "احقر العباد" اور نیچے "استاد زادہٗ سلطانی" ہاتھ سے لکھا ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی عمر اس وقت بیس سال کی رہی ہوگی۔ اس زمانے میں وہ دہلی کالج کے طالب علم بھی تھے۔ انھوں نے اپنی مہر سپاسنامے کے آخر میں لگائی ہے اور مہر کے اوپر "العبد المذنب" "الاحقر ابن کالج مدرسہ" اور نیچے "ولد مولوی محمد باقر دہلوی مدرس سابق مدرسہ واعظ دہلی و تحصیلدار و سررشتہ دار سابق" اپنے ہاتھ سے لکھا ہے۔ ذوق کے ان کے صاحبزادوں اور شاگرد رشید کی موجودگی میں مرزا اسد اللہ خاں غالب کا جن کے متعدد دیرینہ دوست تھے، نہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ابو ظفر الدین محمد نظام الدین خلف الصدق میاں کالے صاحب شیخ المشائخ دہلی نے اپنی مہر ورق ۹ ب پر لگائی ہے۔ میر امیر علی نبیرۂ سید ذکریا شاہ شیخ مشائخ اور میر داؤد نبیرۂ سید ذکریا شاہ شیخ المشائخ کی مہریں ورق ۹ الف پر ہیں۔ صحافیوں میں امداد حسین مہتمم مطبع جعفری اور موتی لعل پنڈت مہتمم سابق دہلی اردو اخبار نے اپنی مہریں ورق ۸ الف پر لگائی ہیں۔ ڈاکٹر چمن لعل نے جو ۱۸۵۲ء میں دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کی دوستی کی وجہ سے ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی مار ڈالے گئے تھے، اپنے دستخط ورق ۸ الف پر انگریزی میں کئے ہیں۔

ورق ۱۱ ب پر دہلی کالج کے اساتذہ کے دستخط ہیں جن میں سے حسبِ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:۔

(۱) ماسٹر رام چندر جو ۱۸۵۲ء میں عیسائی ہوگئے تھے۔ گارساں دتاسی نے لکھا ہے کہ ان کے عیسائی مذہب قبول کر لینے پر اس سال کے ماہ جولائی میں دہلی میں خاصی ہلچل مچ گئی تھی۔ وہ پنڈت تھے اور اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ ماسٹر رام چندر اس وقت دہلی کالج کے ریاضی کے مدرس اول تھے اور ریاضی کی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں میں سے ایک الجبرا پر ہے، ایک علم ہندسہ پر اور ایک علم الحساب پر۔ انھوں نے ایک کتاب اصول ہیئت پر بھی تصنیف کی تھی۔ وہ کچھ عرصہ تک دو رسالے بھی نکالتے رہے جس میں ایک محب ہند ہے۔ ان کی ایک اور مشہور تصنیف تذکرۃ الکاملین ہے جس میں یونان، روم، قدیم یورپ، ایران اور ہندوستان کے مشاہیر علم و فضل کے مختصر حالات درج ہیں۔ (۲) پنڈت رادھا کشن مدرس دوم علم ریاضی دہلی کالج (۳) کریم الحسن مدرس سوم فارسی دہلی کالج اور (۴) مولوی ذکاء اللہ مدرس دوم ریاضی دہلی کالج متوفی ۱۹۱۰ء جو ماسٹر رام چندر کے شاگرد بھی تھے اور جنھیں علم ریاضی سے خاصی دلچسپی تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے لکھا ہے کہ مولوی ذکاء اللہ نے بعض ایسی مبسوط کتابیں لکھی ہیں کہ ان کے حجم کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص ایسی بڑی کتاب لکھنے کے لئے کیسے فرصت پاتا تھا۔ اردو کے بہت کم ایسے مصنف ہوں گے جنھوں نے مولوی ذکاء اللہ کی طرح مختلف مضامین پر اتنی کثیر کتابیں لکھی ہوں۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصنیفات کی تعداد تقریباً ۱۴۳ ہے جن میں تاریخ ہندوستان کی متعدد جلدیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ اس سپاسنامے پر اس زمانے کے سرکاری عہدہ داروں، راجاؤں مہاراجاؤں کے ایجنٹوں، شاہزادوں، شہزادیوں کے ایجنٹوں اور بہادر شاہ کے دربار کے دوسرے متوسلین اور اہم لوگوں کی مہریں اور دستخط ہیں۔ ان میں مہاراجہ ہندو راؤ بہادر کے مہتمم کے ایجنٹ کشور لال وکیل مہاراجا بابا ہندو راؤ بہادر، پنڈت گنگا پرشاد مختار عام جوزف اسکنر صاحب بہادر و کپتان جیمس اسکنر صاحب بہادر، پنڈت جوالا ناتھ خزانچی سرکار راجہ ناہر سنگھ بہادر والی بلب گڈھ، مجتبیٰ لعل ملازم مہاراجہ ہلکر بہادر اندور والے کی مہریں اور دستخط خاص طور پر اہم ہیں۔ راجہ بہادر سنگھ نے اپنی مہر

کہ اوپر یہ عبارت بھی درج کر دی ہے: "الحق اوصاف داد گستری انچہ ایں تحریر ازدرشان ہیجنس حاکم بسیار کم"۔ ساہوکاروں میں رام چند داس ساہوکوٹہ والا خلف لالہ بخشی رام ساکن دہلی، متھرا داس سائک رام ساہو خزانچی دہلی، نراین داس ساہو دہلی خلف رام جی مل ساہو گودام والا بہ بسنگھ چودھری صرافہ دہلی نے اپنی مہریں لگائی ہیں اور کچھ نے اپنے دستخط بھی کئے ہیں۔ گردھر لال خلف لالہ کشن چند ساہو نے اپنے دستخط انگریزی اور اردو دونوں میں کئے ہیں اور اپنی اردو مہر لگائی ہے۔ کچھ ساہوکاروں نے گجراتی اور اردو دونوں میں دستخط کئے ہیں لیکن مہریں سب کی اردو میں ہی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد بخش سوداگر دہلی، حاجی محمد قطب الدین سوداگر دہلی اور شیخ احمد سوداگر دہلی نے بھی مہریں لگائی اور دستخط کئے ہیں۔

افسران میں رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر دہلی، نند لال صدر امین دہلی محمد حسین دہلوی قائم مقام اسسٹنٹ سرائے تال علاقہ آگرہ، امان علی خاں تھانہ دار لاہوری دروازہ، پیاری لال وکیل تکمہ صدر الصدور، پنڈت ہیرا لال سابق وکیل کمپنی، بہادر شاہ کے دربار کے متوسلین میں سے راجہ لک رام فدوی محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی، راجہ دیبی بہادر سنگھ فدوی محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی، رتن لال خلف الصدق رائے لاڈلی داس محافظ دفتر عدالت سلطانی، ذو الفقار الدولہ معین الملک میرزا محمد علی خاں بہادر غالب جنگ، سیف الدولہ معین الملک سید غلام عباس خاں صلابت جنگ بہادر، معز الدولہ اعتماد الملک محبوب علی خاں بہادر وغیرہ کی مہریں اور دستخطیں خاص طور پر اہم ہیں۔

سپاس نامہ بڑی ہی سادہ اور دہلی کی روزمرہ میں لکھا گیا ہے۔ اس کی سلاست اور روانی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ بیجا عربی اور فارسی کی ترکیبوں اور جملوں سے پرہیز کیا گیا ہے۔ جان گبنس کے اوصاف اور ان کی خدمات کو پیش کرنے میں مبالغے سے زیادہ کام نہیں لیا گیا ہے۔ اب اسی زمانے کے رسم الخط میں سپاس نامہ ملاحظہ فرمایئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم و بہ نستعین
حامداً و مصلیاً۔

ای سخاوت شعار، عدل پناہ
جان باشن گبنس عالی جاہ

(۱ ب) چونکہ بسبب پیش آنی بعض بعض امورات ضروریہ کی اپنے قصد مراجعت طرف وطن مالوف کی کیا ہی، اس خبر وحشت انگیز حسرت افزا کی سننی سی ہم رؤسائے شہر (۲ الف) شاہجہان آباد بلکہ تمام رعایائی شہر دہلی کی دلوں پر جو جو غم و الم گزرتی ہیں طاقت نہیں کہ معرض بیان میں آسکے زبان قلم میں شگاف پڑ گیا ہی کس طرح احاطۂ تحریر میں لاسکے اور کیوں نہ ہو جو کچھ ہو سو تھوڑا ہی ایسا حاکم عادل انصاف پرور داد گستر نیک سیرت سخاوت طینت عقیل و فہیم ذکی الطبع، صاحب دیانت و امانت بردبار و حلیم اگر چراغ لیکر ڈھونڈیں گی تو نہ پاویں گی۔ خیال مفارقت خدمت کا ہر دم دل کو مجروح کرتا ہی اور اس پر یاد انصاف و حق پرستی اور حسن اخلاق نمک پاشی کرتی ہی۔ (۲ ب) جیسا کہ ایک زمانے میں تمام اہالی شہر آپ کی محاسن صفات سی مستفیض و بہرہ یاب ہو کر شاداں و فرحاں شکر گزار ہوتی تھی ویسا ہی اب آپ کی سوانح حسنات کو یاد کر کر کی محزون و غمگین ہوتی ہیں۔ اب بے اختیار یہی زبان پر آتا ہی کہ وہ راحت و آرام جو کہ آپکی زمانے میں پائی اگر ان ایام میں مبدل بہ تکلیف و بے آرامی ہوتی تو بہت سہل تی بہ نسبت اس مصیبت و عذاب کے جو کہ مفارقت خدمت عالی سی دلوں پر گزرتا ہی۔ نعوذ باللہ من الحور بعد الکور (۳ الف) مدت ستائیس سال کہ آپ وارد ہندوستان ہوئے علی الخصوص سات برس کی عرصہ ہی کہ آپ عہدۂ کمشنری دار الخلافہ شاہجہان آباد پر منصوب ہیں تمام رعایائی شہر آپ کی داد گستری اور عدل پروری سے شکر و ممنون اور اس قدر زیر بار منت و احسان ہی کہ سر نہیں اٹھا سکتی۔ صرف ہم لوگوں کی آرام و آسائش کی لئی آپنی طبع نازک پر بار محنت اٹھا کر اپنی تکلیف اور رنج گوارا کی۔ آپ کی کثرت توجہ التفات اور مزید تحقیقات سی ممکن نہ پایا کہ مستحق اپنی حق سے (۳ ب) محروم رہ جائی اور داد خواہ اپنی داد کو نہ پہونچی۔ اکثر جہلائی اہل ہند کا قول تھا کہ سرکاری محکموں میں اہل کاروں کو اختیار تمام اور مداخلت کلی حاصل ہوتے ہیں اور یہ خیال خام ان کی دلوں پر ایسا نقش کالحجر ہو رہا تھا کہ کوئی صورت اس کی مٹنی کی سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن سبحان اللہ آپنی کس لطافت سی اونکی اس قول کو بالکل نقش بر آب کر دکھایا کہ وہ لوگ خود لاجواب ہو گئی۔ مداخلت تو بہت دور ری دست

در پیشی مقدمہ سوائے وکلائے جانبین کی کوئی قت دم مارنی کی بہی (۴ الف) نہیں ہوتی۔ زیادہ تر قابل مدح و توصیف یہ امر ہے کہ فیصلہ مقدمات میں آپ نے صرف الفاظ ظاہر عبارت ہی پر قانون کی کچھ خیال نکیا بلکہ اصل غرض اور منشار قانون کی طرف بہی غور کی اور بموجب اسکی حکم و احکام جاری کئی کہ یہ دلیل قاطع و برہان ساطع ہے کمال تبحر اور دقیقہ فہمی علم اصول قوانین پر۔ زبان فارسی میں جیسی چاہیئے ویسی مہارت و استعداد آپ کو پائی گئی کہ اکثر صاحبوں سی بطور خود رسم ارسال و ترسیل مراسلات بطور اہل فارس بہی جاری رہی (۴ ب) حقیقت میں زبان اردو مستعملہ خواص اہل ہند موافق محاورہ روزمرہ کی اس خوبی و لطافت اور فصاحت و سلاست سی آپ کو ادا کرتی ہوئی دیکھا کہ بہتیری اس ملک کی بہی اس نعمت سی محروم اور اس کو جیسے نابلد ہیں گے بلکہ ایسا سنا گیا کہ آپ کو درباب فیصلہ مقدمات شلخوانی و اجرائی حکم احکام وغیرہ میں حاجت اہل عملہ کے اصلا نہیں ہوتی۔ ترتیب کاغذ و انتظام دفتر حسب سررشتہ اور موافق قوانین مجاریہ کی جیسا کہ چاہیئے دیسا ہی محکمۂ عالی میں دیکھا گیا۔ پابندی قوانین و اب (۵ الف) و آداب خصوص وقت اجلاس ہیبت و جلالت ہر بار دربار قابل دیکھنی کے ہی اور باوجود اس جاہ و جلال کی حلم و بردباری بہی آپ کی اس رتبہ پر کہ اپنی وقت پر مرتکب جرم و عذرخواہ سی وہ درگذر اور چشم پوشی عمل میں آتی ہی کہ مصداق لطف کرم و رحم اتم اور مظہر کظم غیظ و عفو تمام واضح و آشکار ہوتا ہی کہ تفصیل ہر ایک کی اسجگہ مورث تطویل ہی۔ کاغذ متحمل گنجائش نہیں۔ مع کہ کمالات و اوصاف ذات بابرکات (۵ ب) کی احاطۂ تحریر سی باہر ہیں۔ حلم و تحمل اور حسن اخلاق اور قدردانی اہل کمال اور قیام مزاج و استقلال امر طبعی اور جبلی معلوم ہوتا ہی۔ تواضع و انکسار بخوف خدائی تمام ہی اپنی مقام پر بیشتر پایا۔ خیرات و مبرات سے اکثر فقرا و غربا متکبر پائی جاتی ہیں۔ تہذیب اہل ہند اور ترویج علوم عموماً اور خصوصاً ترقی مدرسہ اور پرورش طالبعلمان مدرسہ میں آپنی بڑی سعی و کوشش کو کام فرمایا۔ حقیقت یہ ہی کہ وہ وہ اوصاف و کمال جو کہ لوازم حکام تصفیہ شعاری ہیں آپ کی ذات جامع الکمالات (۶ الف) میں کما حقہ مجتمع پائی۔ المختصر کہ یہاں میں اس راحت و آرام کی جو کہ آپکی نظم و نسق و انتظام سی اس ملک میں خاص و عام نی پائی رؤسا و رعایا بجز اسکی اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ شکر ہی اوس خدا کا جسنی ہمیں ایسی حاکم کی زیر حکم اس راحت و آسایش میں رکھا لیکن پہر بی ساختہ یہی زبان سی نکلتا ہی کہ سراسر مقام حسرت و افسوس ہی کہ ایسا حاکم عادل علم دوست عقیل و مہتمم منتظم و کارگذار خیرخواہ سرکار و رعایا کی سرکار انصاف دثار حق پرست سخاوت شعار حلیم الطبع نیک طینت قدرشناس اہل تمیز و کمال اپنے (۶ ب) مداحان خیراندیش کو چھوڑ کر عازم وطن اصلی ہو اور داغ حسرت و ناکامی دلوں پر یادگار چھوڑ جاوی۔ بلکہ آپ جیسی صاحب خلاق صاحب وفاق سی بکسر محل تعجب ہی کہ ایسی خیرخواہ و عاگو رعایا کی ترک کرنے کو کیونکر دل صفا منزل نے گوارا کیا مگر اس امر کو بجز کم قسمتی ہماری ملک والوں کی اور کیا تصور کیا جائے۔ زیادہ تر محل حسرت و حرمان یہ ہی کہ ہم کو اتنی استطاعت و دست قدرت نہیں کچھ چارہ نہیں بن آتا جو ایسی یگانۂ عصر و یکتائی دہر کو روک سکیں۔ اب دعا ہے جناب الہٰی میں کہ آپ بخیر (۷ الف) و عافیت وطن اصلی تیں پہونچ کر سرگرم عیش و کامرانی ہوں اور اللہ تعالیٰ بمدارج عالیہ فائز رکہی اور عمر طبعی کو پہونچاوی تبع مطالب و مقاصد موافق مرضی کی حاصل ہوتی رہیں چشم زخم حوادث روزگار و مضرت رسانی اعدای بدکردار کی سی اپنی ظل حمایت میں محفوظ و مصون رکھی۔ آپکی محاسن و مکارم تو دم زیست تک ہم لوگوں کی ہماری لئی تمہاری یادگار داغ مفارقت صفحہ دل پر نشانی کافی و وافی ہی لیکن ہم لوگوں کی طرف سے یہ قلمدان بطور یادگاری اور اظہار احسانمندی و مودت (۷ ب) قلبی خدمت عالی میں گذرانا جاتا ہی۔ اگر اس ہدیۂ محتقرہ کو زیب قبول بخشئی تو اخلاق حمیدہ سی کچھ بعید نہیں اور کمال احسان اخیر ہی۔

ان اللہ یحب المحسنین

مرزا نے چور پکڑا

اق ارش

آدھی رات کا عمل ہوگا۔ جو سڑک کے پہرے دار ٹینڈیوں کی جنگ زرگری نے مرزا کی نیند اچاٹ کر دی۔ گھر کے سناٹے پر بدلو کے خراٹوں کا آرہ چل رہا تھا۔ باہر روند کے جوانوں کی سیٹیاں بارہ رہ کے "جاگتے رہو" کی پکار تھی۔ گئی شام کی جھپکی کا کیف اُتار پر اور حواس میں ابھی انتشار تھا جو دالان میں کچھ کھڑ کا اور اچانک مرزا کو سمجھائی دیا کہ گھر میں کوئی ہے اور ہو نہ ہو چور ہے۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ پیشانی کی چینوں میں نمی آگئی۔ اب چور آگے آگے، اور مرزا کا واہمہ پیچھے پیچھے۔

مرزا۔ "اے، وہ چلا — وہ گیا — وہ — وہ پہنچا صدر دالان میں — بدلو — او بدلو — (چھن سے کچھ گرا) ہائے ہائے پھوڑ دیا — پھوڑ دیا — پاجی کے بچے نے ولایتی شیشے کا گلاس پھوڑ دیا — ٹھک گئی نہ بارہ گنڈے کی — ایں! یہ اب تک وہاں کیا کر رہا ہے! وہ نکلا — وہ گیا — وہ گھسا باورچی خانے میں — بدلو — (کھنچے ہو حلق سے) بدلوا — مردک کی نیند کو نظر بھی تو نہیں لگتی کسی کی — بدلو"۔

بدلو۔ (نیند میں)۔ "جی"۔

مرزا۔ "ابے کیا سانپ سونگھ گیا؟ اور کر جھپکی میں ہماری برابری"۔

بدلو۔ "نہیں تو۔ میں سمجھا پینک کی جھوک میں آپ بڑ بڑا رہے ہیں"۔

مرزا۔ "ارے چپ! بدلو گھر میں کوئی ہے"۔

بدلو۔ "ہونے دیجیے"۔

مرزا۔ (جھلا کر)۔ ارے ہشیار ہو۔ گھر میں کوئی ہے۔ سُن کیا ہو رہا ہے۔ ہائے ہائے جواب تو دے"۔

بدلو۔ "سب سُن رہا ہوں میاں سونے دیجیے"۔

مرزا۔ "کیا کہا سونے دیجیے۔ ابے وہ تیرا چچا پیے جا رہا ہے بھری پتیلی دودھ کی۔ نمک حرام سے کہا تھا دھونی پر سے اٹھا کے چھینکے پہ رکھ دے۔ ہو گئی نہ مجبوں نبوں فاتے کی ہبنی۔ ہائے کیا طباق سا چوڑا چکلا بالائی کا پرت جما تھا۔ کچھ نہ چھوڑا نصتی نے۔ سب کا سب زہر مار کر گیا ملاعون۔ جیسے اس کے نانا نے ترکے ہی تو چھوڑا تھا۔ بدلوا، اٹھ۔ نہیں تو دیکھ غل مچاتا ہوں"۔

بدلو۔ (ہشیار ہو کر)۔ "مچائیے نہ تو یہ بھی بھلی آپ سے تو۔ سونا دوبھر کر دیا۔ ہمارا تو حساب کر دیجیے میاں۔ باز آئے ہم ایسی نوکری سے۔ دو رہی ہے ڈنڈوت ہے"۔

مرزا۔ "ارے ٹینٹوا کھینچ کے بول۔ لے وہ پہنچ گیا بیوی کی صحنچی میں۔ ہائے ہائے! ان کی کوٹھری بھی تو وہیں ہے"۔

بدلو۔ "اس میں کیا دھرا ہے؟ ڈھاک کے خالی تین پات"۔

مرزا۔ "کیا بکتا ہے۔ ان کے جہیز کا سارا سامان جو اما پڑا ہے: تن بھانڈا، زیور گہنا، کپڑا لتا، کیا نہیں ہے وہاں"۔

بدلو۔ "ہوگا صاحب۔ اتنے دن ہوئے ہم کو اس ڈیوڑھی میں خاک پھانکتے۔ ہم نے کچھ دیکھا ہو تو سامنے کی پھوٹیں۔ برتن کبھی دیکھنے چاٹ چاٹ کے برابر کر دیے۔ تیتن کا اترا، بستی کا لتا ایک آدھ دو پٹارہ گیا تھا، وہ گلہری نے توم توم کے اپنا گھونسلا سنوار لیا، آپ سامان ہانکے جا رہے ہیں

(اتنے میں کھنا نا کرکے کچھ برتن گرے۔)

مرزا۔ "سن تو نے؟ گھس گیا نہ بیوی کی کوٹھری میں۔ کھنکھنا کے برتن گرے ہیں۔ (کچھ یاد کرکے) ارے بدلو! بیوی کہاں ہیں؟"

بدلو۔ "اور سینئے یہ مجھ سے پوچھنے کی بات ہے"

مرزا۔ "تجھ سے نہیں تو اور کس سے۔ میں کہتا ہوں تو نوکر ہے کہ میں؟"

بدلو۔ "اور میں پوچھتا ہوں آپ میاں ہیں کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

مرزا۔ (بات کاٹ کے) "ان کی سخن چی میں جو ہے کہ نئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بدلو۔ "میرا اس میں کیا بیچ۔ وہ جانئے آپ جانیں اور آپ کی بیوی جانیں۔ اس گھپنے میں غلام کی بازی نادار ہے"

مرزا "پھر وہی تیکھا توڑی کی باتیں!"

بدلو۔ "نہ کروں تو کیا کروں۔ بات ہی آپ کچھ ایسی لپیٹواں کہتے ہیں کہ خواہ مخواہ کے نہیں بے فضول کا جواب دینا پڑتا ہے"

مرزا۔ "پھر بھی پھوٹے منھ سے نہ نکلا کہ بیوی کہاں ہیں"

بدلو۔ "یہ آدھی رات کو بیوی کا کیا ہوگا؟"

مرزا۔ "تجھے کیا۔ مجھے ابھی ولائتی چاہئے۔ اس ناپاک کے تکے بوٹی کرکے بیل کو دوں تا پیٹ نہ بھرا تو داہنے ہاتھ کا کھانا حرام"

بدلو۔ "الاتی دلاتی تو میں جانتا نہیں۔ آپ اب کی بات اب بھول جائیں تو میرے پاس اس کا کیا علاج۔ حضور گھر میں جو رکھا سہلا ہے وہ صندوق میں، صندوق میں ٹھرکا ہے ہاتھ بھر کا قفل۔ قفل کی چابی ہے بیوی کے کمر بند میں، اور پینک میں آپ کو دھیان نہیں ہا، بیوی سرشام سے سدھاری ہیں اپنے میکے۔ جو ہے یہاں سے پکے اڑھائی کوس! کہیے تو لپک کے مانگ لاؤں"

مرزا۔ "مجھے اکیلا چھوڑ کر"

بدلو۔ "کیوں کیا ہوا؟ میں جو کیلا جاؤں گا"

(دور سے پھر کھٹ پٹ سنائی دی۔)

مرزا۔ "سن سن! دیکھ سامان لوٹ پوٹ رہا ہے۔ بدلو ایک کام کر۔ اٹھ کے چپکے سے کنڈی تو لگا دے کوٹھری کی۔ بند تو کر پاجی کو"

بدلو۔ "واہ میاں، اور جو اس نے بھنبھوڑ کھایا مجھے، تو؟ کیا ٹھیک ہے اس کا"

مرزا۔ "ہائے کم بخت سورماؤں میں پل کے اتنا بزدل!"

بدلو۔ "میری کیا خطا۔ خربوزے کو دیکھ کے خربوزے نے رنگ پکڑا ہے"

مرزا۔ "تو یہاں پڑے پڑے خربوزہ تربوز کیے جا۔ وہاں وہ سامان کی گٹھری باندھ چکا۔ کوئی دم میں اڑن چھو ہوا چاہتا ہے۔ قسم ہے نانا ابا کی ارواح کی، گھر کی ایک کنکری بھی ادھر سے ادھر ہوئی، تو یاد رکھنا بدلو، اس وقت تو خیر سنتا ہوں، بیوی کے آتے ہی نکلوا کے ولایتی تجھے چورنگت کیا تو مرد کا جایا نہ کہنا"

بدلو۔ "کیا کہنا حضور کی ولائتی کا۔ وہی نہ جو قبضہ ٹوٹی، زنگ کھائی، ڈورا اتری، میلا جھڑی گودڑ میں لپٹی چھینٹوں سے کسی کسی صندوق میں پڑی کلے ہے؟"

مرزا۔ "ہے نہ آخر کے تیلس ٹکے کا پیادہ۔ بارہ برس بلبلوں میں رہ کے کوا جب بھی بولا قیں ہی بولا۔ چل تو کیا جانے سیفلے، سپاہی کے ہتیار کا گن۔ اب سیدھی طرح سے اٹھ کے پنجوں کے بل جا، اور چپکے سے کوٹھری کی کنڈی چڑھا کے جنگا تو دے سالے پردیسوں کو باندھ کے مشکیں پاجی کی کر دے پولیس کے حوالے"

بدلو۔ "کیا تلواں بات کہی ہے حضور نے اس وقت۔ چور گھسے آپ کے گھر میں، جو کھم اٹھائیں اڑ دسی پڑ دسی! خیر جان پہ کھیل کے کنڈی تو میں چڑھائے دیتا ہوں۔ پردیسوں کو جگانے کے لیے غل غپاڑا آپ مچائیں"

مرزا۔ "یوں ہی سہی۔ تو پھر اٹھ، جلدی کر۔ میں یہیں سے پڑے پڑے سیر دیکھتا ہوں، کوئی اینڈی بینڈی بات آ پڑی تو بس مجھے آیا ہی سمجھنا"

بدلو۔ "اتنا اور سن لیجیے، اس بچے دھکڑ کے بعد غلام لبی تلنے کا تو کل کی خبر لے گا"

مرزا۔ "ہاں۔ بات واجبی ہے"

(بدلو دبے پاؤں گیا اور کوٹھری کی زنجیر چڑھا دی۔)

مرزا۔ "بات تیرے کی۔ اب جا کے دم میں دم آیا۔ ہاں بدلو دیکھ لیا ہے اچھی طرح؟ کنڈی مضبوط ہے؟ لات وات مار کے توڑ نہ دے"

بدلو۔ (دہل کے) "جی کنڈی لوہے کی نہیں، کانچ کی ہے۔ لات کیسی بات کے جھٹکے سے ٹوٹ سکتی ہے۔ خطا معاف، آپ کی باتیں سن کر گدھوں کو بھی تپ چڑھتی ہے میاں!"

مرزا۔ "تو پھر پکارتا ہوں شیخ رمضان علی اور منشی ماتا دین کو۔"

بدلو۔ "میری جان آپ کچھ بھی کیجیے۔ غلام تو اب دھوپ چڑھے تک کی خبر لانے رخصت ہوتا ہے۔"

ٹھیرو تو سہی۔ ایک چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ میں غل مچاتا ہوں تو تم بھی ساتھ دے۔ (چلا کر) پکڑ لیا ہے! پکڑ لیا ہے۔ چور! چور! چلیے شیخ جی! چلیے منشی جی!

(دیوار بیچ شیخ رمضان علی کے گھر میں۔)

شخانی۔ "سُنتے ہو! اے بھئی سُنتے ہو؟ نمین کے اتا اٹھو تو۔ پڑوس میں کوئی پکڑا گیا ہے۔ مرزا جی چلا رہے ہیں۔ تمہارا نام لے لے کے پکار رہے ہیں۔ اٹھو تو جلدی سے۔"

شیخ جی۔ (بھرائی آواز) "اے بھئی تم ہی ذرا آواز دے دو کہ تو کیا ہوگا۔"

شخانی۔ "لو اور سنو مرد دفے کی باتیں! میں عورت ذات ہو کے تو آواز دوں اور تم پیچھے مرد ہو کے دبکے پڑے رہو۔"

(مرزا کی آواز پھر آئی۔)

مرزا۔ "چلیے شیخ جی جلدی آیئے۔ میں غصے کے مارے آپے سے باہر ہوں ہات پاؤں بے قابو ہو رہے ہیں۔ جلدی آیئے۔ پکڑ لیا ہے۔"

شخانی۔ اے لیجیے وہ پھر سٹ مار گئے۔ اُدھر مرزا جی کے گلے پھٹے جا رہے ہیں چیخ چیخ کے۔

شیخ جی۔ (جھلا کے) "استغفر اللہ۔ پڑے پڑے اس وقت تم نے اچھی لیس لگائی۔ اب اٹھوں کپڑے پہنوں فکر کروں ہتیار لگاؤں۔"

شخانی۔ "اوئی کپڑوں کا کیا ہوگا؟ نگوڑی ڈھال تروار کی کیا ضرورت ہے کہیں لام پہ جانا ہے؟ کون سا رن پڑا ہے۔ یوں تہمد سے چلے جاؤ۔"

شیخ جی۔ اور رعب ڈالنے تم آؤ گی؟ اس عورت نے جب بات کی ہو گی دہی جس کا سر نہ پیر۔ چلو پانی دو لوٹے میں ذری چوکی تک ہو آؤں۔"

شخانی۔ "یہ تو وہی مثل ہوئی کہ شکار کے وقت......

(مرزا کی چیخ پکار نے شخانی کی بات کاٹ دی۔)

مرزا۔ "شیخ جی جلدی آیئے۔ پھڑ پھڑا رہا ہے۔ تڑائیاں لے رہا ہے۔"

(پڑوس میں یہ ہو رہا تھا۔ ادھر مرزا صاحب کے دروازے کی زنجیر زور سے کھڑکی اور کسی کی گرجتی ہوئی آواز آئی "یہ آدھی رات اُدھر آدھی رات اُدھر کیا بلوہ مچا رکھا ہے؟ محلہ بھر جاگ اٹھا۔ دفعہ (۳۴) میں چالان ہو جائے گا۔")

بدلو۔ "کون؟ شیخ جی؟ ٹھیریے دروازہ کھولتا ہوں"

دروازہ کھلا۔ کسی نے کرخت لہجے میں کہا "شیخ جی! اچھا تو یہ بھی شریک جرم ہیں۔ ہم ہیں گھاسی خاں ولد حولدار۔ یہ تم لوگوں نے کیا غدر مچا رکھا ہے۔ سارے میں بھگدڑ پڑ گئی"

بدلو۔ "اجی آیئے حولدار صاحب۔ میں ہوں بادل خاں۔ آپ ہی کی کمی تھی۔ مطلب یہ کہ آپ ہی کی بڑی ضرورت تھی۔"

حولدار۔ "کوئی واردات؟"

بدلو۔ "واردات سی واردات حولدار!"

حولدار۔ سرقہ، نقب زنی، قفل شکنی، مداخلت بے جا وغیرہ آخر کیا بات؟"

بدلو۔ "اجی یہ نہ وہ۔ مگر پکڑا گیا۔ بڑا پرانا نمبری پکڑا گیا۔"

حولدار۔ "کس دفعہ کا ہے؟"

بدلو۔ "مطلب یہ کہ کون سی جھول کا ہے؟ تو حولدار صاحب اچھا بتا کتا......"

حولدار۔ "نہیں جی مطلب یہ کہ کس دفعہ میں چالان کرنا پڑے گا۔"

بدلو۔ "کوئی ایک حولدار تم سوں دفعیں لگا لو۔ اچھا پورا جوان...... یعنی ڈیڑھ دو سیر کی جھڑن دو دو کی پتیلی ایک سانس میں چڑھا گیا۔"

حولدار۔ ہاں ہاں سمجھ گئے ہم۔ مطلب یہ کہ نابالغ نہیں۔ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے۔ "سوچتے ہوئے" بس تو اٹھا کے سنتر کو نمٹی کرا یا دفعہ.... ٹھیرو دفعہ کا معاملہ گرفتاری کے بعد دیکھا جائے گا۔ کسی نہ کسی میں تو گھٹے ہی گا۔ ہاں تو کیا نام تمہارا بادل چلو موقع واردات پر اور اپنے اپنے بیان لکھاؤ۔ ہتکڑی ساتھ نہیں ہے۔ چلو حوالات تک سنتر کو آگے آگے دھر کے چلوں گا۔"

بدلو۔ (کسی کو آتے دیکھ کر) "کون منشی جی؟ آیئے۔ میاں کے گھر واردات ہو گئی۔"

منشی۔ "مبارک ہو۔ فرزند ہوا کہ بیٹیا؟"

بدلو۔ (ہنس کر) "دونوں نہیں منشی جی پولیس کی واردات۔"

منشی۔ "لے بھائی ہمیں کیا خبر۔ ہم تو مرزا جی کی پکار پر نکل پڑے۔"

مرزا۔ (آتے ہوئے) "اب مجھے پھنسا کے چل دیا۔"

بدلو۔ "نہیں میاں۔ یہ آگئے! ورنہ حولدار خاں صاحب گھاسی خاں اور یہ منشی ماتادین بھی ہیں۔"

مرزا۔ "اور شیخ رمضان علی؟"

بدلو۔ "چار جامہ کسوا رہے ہوں گے۔ جب تک اڈہ بھی نہ بن لیں کہیں نکل سکتے ہیں!"

حولدار۔ "ملزم کہاں ہے؟"

شیخ جی۔ (آتے ہوئے) "حاضر ہوں!"

حولدار۔ "یعنی کہ آپ لوگ کھڑے دیکھ رہے ہیں گرفتار نہیں کرتے۔ یا ہم کو بڑھنا پڑے گا۔"

بدلو۔ "حولدار صاحب یہ تو دیوار بیچ کے پڑوسی شیخ رمضان علی ہیں۔ میاں نے چھینٹے پڑ جانے، وہ کو آئے ہیں بیچارے۔ ملزم تو اس کوٹھری میں بند ہے۔ کہیے تو کھولوں؟"

حولدار۔ "نہیں نہیں۔ بالکل بے ضابطہ بات۔ کوٹھری میں کنڈی ہے؟"

بدلو۔ "ہے تو سہی۔ مگر ہونا نہ ہونا سب برابر۔"

حولدار۔ "ملزم کے فرار ہونے کا خطرہ؟"

بدلو۔ "ہو سکتا ہے۔ اب سنیے کہ میاں کو تو ہمارے آتی ہے تو نہیں۔ دن دوپہر کو اونٹ نہیں سوجھتا۔ منشی جی دو پچپن سال میں پلٹن سے چکے لیے۔ شیخ جی ان سے جو چاہو گواہی دلوا لو۔ باقی خیریت۔ اب میں ہوں اور آپ ہیں۔ کھولوں کوٹھری کے پٹ؟"

مرزا۔ "ہے ہے بیوی کو بھی آج ہی اُٹھ کے جانا سوجھا تھا۔"

حولدار۔ "چلو کچھ پروا نہیں۔ بخت لگاؤ۔ کیا نام کہ مرزا جی آپ یہاں دروازے پہ رہیں۔ نکلتے ہی گردنی دیں۔"

مرزا۔ "حولدار صاحب مجھے تو اس بدلو کے پیچھے ہی رہنے دیجیے۔ میں نمازی آدمی جانے جاتے اور نہیں ٹھوک ہی دے۔ بدلو کنڈی کھولے، وہ نکلے، منشی جی ڈانٹیں۔ شیخ جی ہاتھ ڈالیں، اور میں دھڑام سے اس کو گرا دوں۔ وہ کولا لاٹھی ٹھوک کر زمین پہ، اور آپ اپنی پولس کی ترکیب سے گرفتار کرلیں۔"

بدلو۔ "میاں کیا کہنا۔ ایمان سے آج تو یہ حکم دے رہا ہے کہ آپ چوک کے چور رہے پہ......"

حولدار۔ "چپ رہیں سب صاحبان۔ گرفتاری کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ جب ہم کہیں "ایک" کنجی ہو جاؤ۔ جب ہم کہیں "دو" پینترے پہ آجاؤ۔ اور جب ہم کہیں "تین" بھڑ سے کنڈی گرے اور پٹ سے ملزم گرفتار۔ چلو ـــ تیار؟ ـــ ہوگئے؟ ـــ ریڈی۔"

بدلو۔ "کیا ہے میاں پیچھے سے کہنیاں تو نہ ماریے۔"

مرزا۔ "ابے تجھ کو پچ کئے لے جس میں آگئے رہے۔"

حولدار۔ "ایک!"

بدلو نے ہاتھ بڑھایا۔

حولدار۔ "دو!"

بدلو نے کنڈی ڈھیلی کی۔

حولدار۔ "تین!"

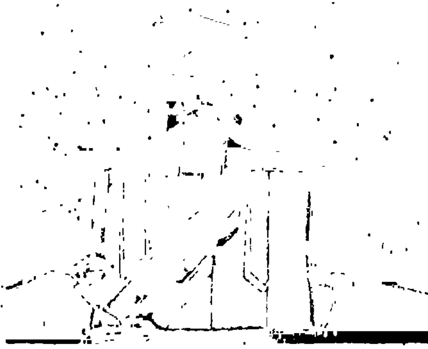
مرزا۔ "لینا بدلو ـــ شیخ جی جانے نہ پائے" کوٹھری سے "میاؤں میاؤں" کرتا ایک موٹا تازہ بلا نکل کے بھاگا۔ "ابے بدلو! یہ کیا؟"

بدلو۔ "ہوتا کیا۔ اس قطامہ گھسیٹن بھٹیاری کا بلا تھا۔"

مرزا۔ "اور ـــ اور وہ چور؟"

بدلو۔ "چور دور کیسا۔ حضور آپ کی بی چنیا بیگم تھیں۔"







ٹیگور کا آرٹ

دیوندر اسّر

آڑے ترچھے خطوط، بکھرے بکھرے رنگ، عجیب شبیہیں، مسخ چہرے، روپ بہروپ، جیسے رنگوں اور ریکھاؤں نے ہر جانی پہچانی صورت سے بغاوت کر دی ہو، رنگوں اور ریکھاؤں کی ایک ایسی دنیا جس میں مکمل انتشار ہو، چہرے جو اس دنیا میں اجنبی ہوں، پرندے جنھیں اڑتے کسی نے نہیں دیکھا۔ لیکن غور سے ٹیگور کی تصویریں دیکھیے۔ یہ چہرے اجنبی نہیں، بلکہ ہمارے جانے پہچانے ہیں اور سالہا سال سے ہمارے تخیل کی بلندیوں میں پرواز کر رہے ہیں۔ یہ محسوس کرتے ہی ہم پر یہ حقیقت بھی روشن ہو جائے گی کہ یہ دنیا اجنبی دنیا نہیں، بلکہ حقیقی دنیا ہے جس میں ہم خود اجنبی ہو کر رہ گئے ہیں، اپنے آپ سے بچھڑ کر بھٹک رہے ہیں، دل کا سکون اور روح کی شانتی کھو بیٹھے ہیں، اور یہ تصویریں لایعنی، مسخ اور عجیب نہ ہو کر ہماری جبلتوں، ہمارے محسوسات اور ہماری لاشعوری خواہشوں کی آئینہ دار ہیں اور ہمارا رشتہ انسانوں کے اس گروہ سے جا ملتا ہے جو ہزارہا سال قبل غاروں میں اپنی تخلیقی قوت کو تصویروں کا روپ دے رہا تھا اور فطرت کی گود میں پروان پا رہا تھا۔ انسان کے مسلسل ارتقا میں ہم نے کئی خواب دیکھے جو حقیقت میں بدل نہیں پائے لیکن جو حقائق سے زیادہ حقیقی ہیں۔ ٹیگور کا آرٹ اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے۔

ذہن کے لاشعوری گوشوں میں پوشیدہ جبلتوں کی عکاسی کے باعث ٹیگور نے ایک قسم کی باطن نگاری کو جنم دیا ہے۔ جو یورپ کے جدید فن کاروں میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ لاشعور کے اس تصور میں ٹیگور، فرائیڈ کے بجائے ژونگ[1] کے نظریے کے زیادہ قریب

---

[1] فرائیڈ کے خیال میں انسانی زندگی کا محرک جنسی جذبہ ہے۔ جو لاشعور میں اظہار کے لئے تڑپتا رہتا ہے۔ فرائیڈ کے نظریات میں لاشعور کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اس کے خیال میں ہمارے بیشتر رجحانات کا سرچشمہ لاشعور ہے اور بہت کم رجحانات شعوری ہوتے ہیں۔ جو رجحانات کبھی شعور میں داخل ہی نہیں ہوتے یا جن کو دبا دیا جاتا ہے وہ مل کر لاشعور کو ترتیب دیتے ہیں۔ ادب اور فن کی تخلیق ان دبے ہوئے جذبات کے اظہار کا آلۂ کار (CATHARSIS) ہے۔ (بقیہ نوٹ صفحہ ۹۲ پر)

فنی حسن کے باعث اُس کی عکاسی کی ہے۔

ٹیگور کا ذہن ایک عظیم تجربہ گاہ تھا جس میں خواب اور تصورات متشکل کرنے کا مسلسل عمل جاری رہتا تھا۔ اسی باعث اُن کی تصویروں میں سرویلزم[۱] کی جھلک ملتی ہے۔ بچے کے ذہن کی سی کیفیت کا عمل اُن کی تصویروں میں کئی جگہ ملتا ہے۔ خارجی مناظر کو سیدھے سادے انداز میں چند رنگوں کے ذریعہ ہی پیش کرنا اس بات کا شاہد ہے کہ ان کی تصویروں میں خارجیت اور داخلیت کا امتزاج ملتا ہے۔ جب سدھیر خاستگیر ۱۹۳۱ء میں ٹیگور کی تصویر بنا رہے تھے تو ٹیگور نے کہا تھا "میرا باہری چہرہ تو بہت لوگوں نے بنایا، لیکن میری روح کو کسی نے پیش نہیں کیا۔ تم میری روح کی عکاسی کرنے کی کوشش کرنا"۔ خارجی اشکال میں روح کی گہرائیوں کی عکاسی کرنا ٹیگور کے فن کا کمال ہے۔

تخیلی جانوروں کی کسی خوفناک مبالغہ آمیز تصویریں درحقیقت اس احساس کی ترجمان ہیں کہ یہ جانور کسی ناقابل بیان وجہ کے باعث اپنے وجود کے امکان کو کھو بیٹھے ہیں مگر انھیں مصور کے قلم نے حقیقت کا فن کارانہ پیکر عطا کر دیا ہے۔ یہ وہ پرندے ہیں جو محض ہمارے خوابوں میں پرواز کرتے ہیں، جو اپنا آشیانہ ریکھاؤں سے بناتے ہیں اور رنگوں سے بھرتے ہیں اور فن کار کے کینوس پر ان کی روح کو نجات ملتی ہے۔ ٹیگور کی تصویروں میں تمثیلی انداز زیادہ نمایاں ہے اور انھیں اُن کے عنوانات سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ٹیگور نے خود لکھا ہے کہ "میری تصویریں اس دنیا سے متعلق نہیں اور نہ کسی دوسری دنیا سے۔ وہ ایسے جانور ہیں جنھوں نے نہ جنم لیا ہے اور نہ لیں گے"۔ اس لئے ٹیگور کی تصویریں ابھی تک

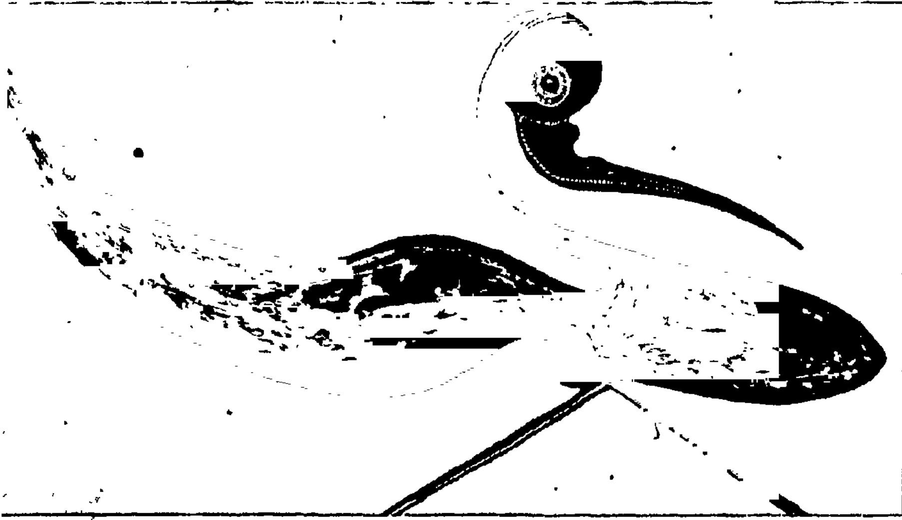


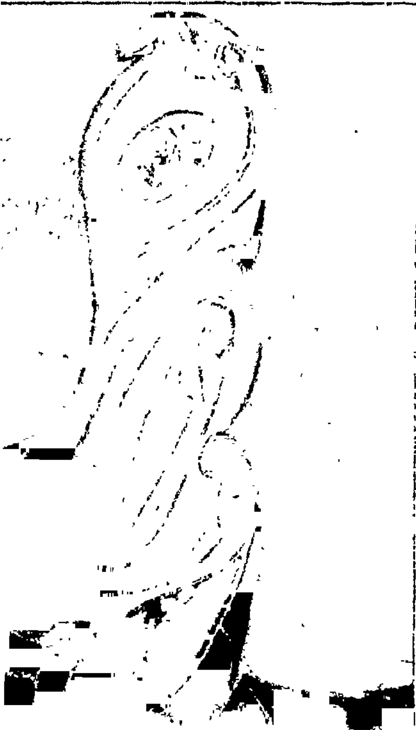
ہے۔ لاشعور کی ترجمانی اُن کے لئے کسی ایک فرد واحد کی نہیں بلکہ ساری نوع انسانی کی ہے۔ لاشعور کی بنیاد جنس نہیں بلکہ تخلیق کا جذبہ ہے جو ہمہ گیر نفسی قوت کا مظہر ہے۔ اسی لئے ٹیگور کی شبیہوں میں خوابوں میں کھوئے ہوئے انسانوں کی حساس نزاکت اور محویت ہے اور شاعرانہ فینٹسی کے باعث ریکھاؤں میں لطافت ہے۔ ٹیگور نے فینٹسی یا فارم کو خارجی حقیقت کی مشابہت کے باعث پیش نہیں کیا ہے بلکہ اُس کے تخلیقی اور

(بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۷) ژونگ کے خیال میں بنیادی جبلت جنسی نہیں بلکہ ہمہ گیر نفسی قوت ہے۔ اجتماعی لاشعور کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ژونگ نے کہا ہے کہ اجتماعی لاشعور کسی مخصوص انسان کا لاشعور نہیں بلکہ وہ نوع انسانی کا مشترکہ لاشعور ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف ممالک میں دیو مالا کی تخلیق کا سرچشمہ اجتماعی لاشعور ہی ہے۔ ژونگ کی نظر میں تمثال (سمبلز) نہ صرف لاشعوری ہوتے ہیں بلکہ دیو مالا اور لوک گیتوں کی تصویروں کی طرح ابتدائی بھی ہوتے ہیں۔

[۱] سرویلزم انسانی ذہن کے اُن سربستہ حقائق کی ترجمانی ہے جسے خارجی دنیا کے رسوم وقیود کے باعث ظاہر ہونے کا موقع نہیں ملتا اور وہ لاشعور کے تہ خانے میں نمودار ہونے کے لئے تڑپتے رہتے ہیں۔ یہ حقائق خواب کے ذریعہ تمثیلی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سرویلزم ان میں معنی خیز اہم سمبلز (تمثال) کی تنظیم ہے جو بظاہر بے ربط، منتشر اور غیر منظم نظر آتے ہیں لیکن جن میں گہرا ربط اور وحدت ہے۔ اس کی رو سے اعلیٰ تر حقیقت لاشعور میں جاگزیں ہے۔ پیشتر اس کے کہ شعور کے کسی سطحی اور خارجی معیار سے مسخ ہو اُسے گرفت میں لانا ضروری ہے۔

ٹیگور کی مصوّری کے چند نمونے







اُتر پردیش کی د

ہندوستان کی شمالی سرحد پر چین کے
بڑے پیمانے پر دفاعی تیاریاں شروع کر دی ہیں
چندہ ہی نہیں دے رہے ہیں بلکہ لڑکے اور لڑکیاں
اُتر پردیش، شری سی۔ بی۔ گپتا نے پہلے نوجوانوں پر
بلیا کے رائفل کلب



وریا میں پرادیشک رکشا دل کے کڈٹوں کو رائفل اور بندوق چلانے کی ٹریننگ دی جا رہی ہے



وزیر اعلیٰ شری سی۔ بی۔ گپتا بلیا کے رائفل ٹرین

پرادیشک رکشا دل غازی پور کے کیڈٹوں کی پریڈ کا ایک منظر

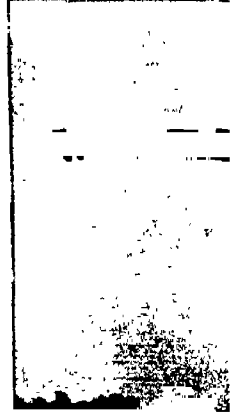




مرکزی وزیر مالیات شری مرارجی ڈیسائی لکھنؤ کی ریزرو پولیس لائین میں،
پرانتیہ شکشا دل کے بحری بازو کے کیڈٹوں کی سلامی لے رہے ہیں

ماریا سا

اترپر یش نے ملک کی حفاظت کے لیے
یش ے دفاعی فنڈ میں دل کھول کر
بچت ں کر رہے ہیں۔ وزیر اعلیٰ
ے یدا کرنے کے لیے خود رائفل چلاکر



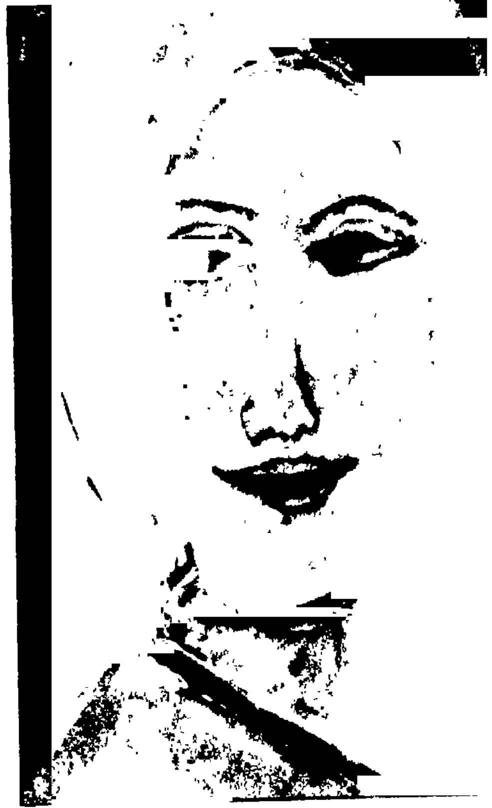
ح رائفل چلاکر کر رہے ہیں



مظفر نگر کے این، سی، سی کے لڑکیوں کے دستے کا مارچ پاسٹ

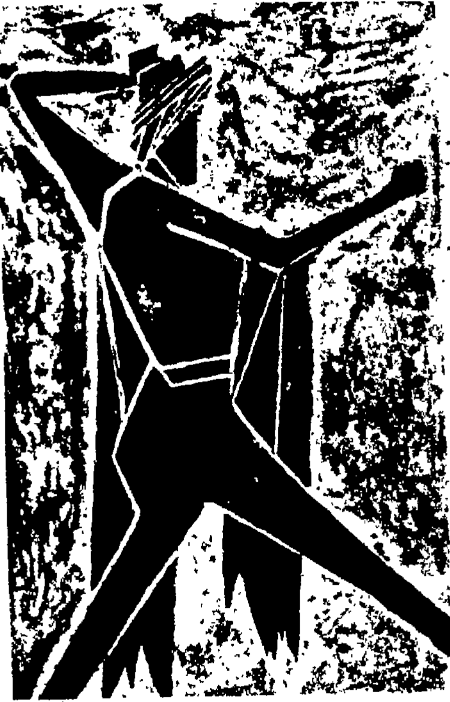
تیلوری مصوّری کے چند نمونے





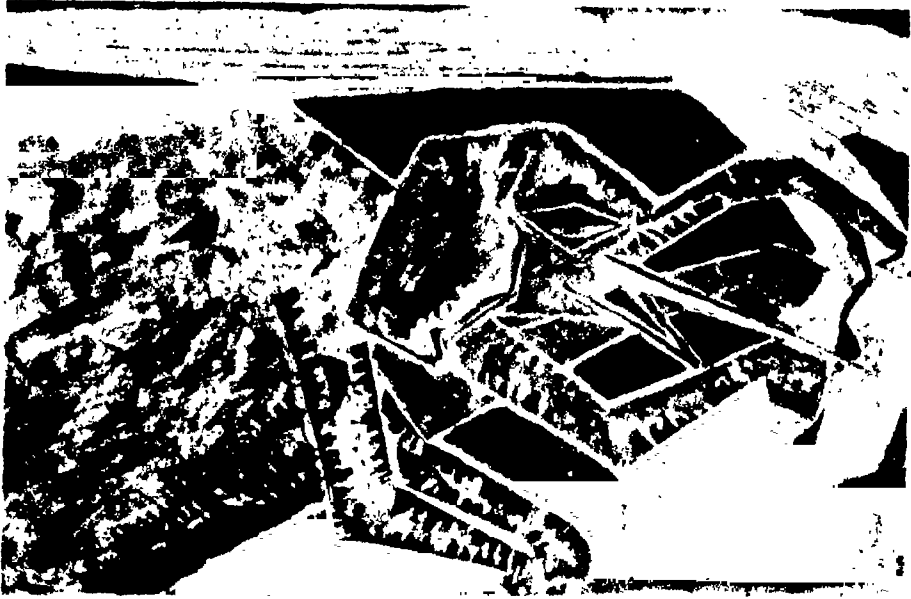






معمہ بنی ہوئی ہیں۔ ٹیگور نے کہا ہے کہ ”میری تصویروں کے معنی مجھ سے نہیں اُن ہی تصویروں سے پوچھیے۔“

یہ امر کافی تعجب خیز ہے کہ ٹیگور کا آرٹ جو اُن کے لئے نجی مشغلہ تھا اُن کی زندگی میں ہی سنجیدہ فنی بحث کا موضوع بن گیا۔ ٹیگور کے آرٹ کا آغاز بھی کم تعجب خیز نہیں۔ اپنے مسودوں پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے جو کچھ وہ حذف کرتے یا درست کرتے تھے اُن ہی کو وہ صفحے میں بکھرے ہوئے خطوط میں ڈھال دیتے تھے۔ حسن کے پرستار ٹیگور کی طبعِ نازک پر ٹیڑھی میڑھی لکیریں اور بھدے نشان گراں گذرتے تھے۔ ان لکیروں اور نشانوں کے حسین نمونے بنا کر اُنھوں نے تصحیح کیے ہوئے مسودوں کے بھدے پن کو مٹانے کی کوشش کی۔ دھیرے دھیرے ان نمونوں کا حُسن اُنھیں جاذب نظر آنے لگا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال سما گیا کہ مسودے کے باہر بھی ایسا کام کیا جا سکتا ہے اور یہی کام بعد میں آرٹ کے دائرے میں شمار ہونے لگا۔ حسن کی اس نئی تخلیق سے متاثر ہو کر ٹیگور نے کہا: ”میں ریکھاؤں کے سحر کا پرستار ہو گیا ہوں۔ مجھے یہ علم ہو گیا ہے کہ جو غیر منظم ہے اور اپنے میں غیر اہم ہے لَے اُسے حقیقت بنا دیتی ہے۔“ اِن کوششوں میں اشیا یا زندگی کی نمائندگی کرنے کی کوئی شعوری خواہش شامل نہیں تھی۔ اِن تصویروں کی بنیاد تربیت یا تنظیم نہیں۔ روایت یا ارادے کے زیرِ اثر ٹیگور نے تصویر کشی نہیں کی۔ یہ تصویریں کسی کی اپنی روانی میں ہی نہیں بلکہ ان کی ریکھائیں کسی غیبی سحر کے زیرِ اثر انسانی ذہن کے لامتناہی سفر میں دور تک کسی انجانی منزل کی جانب کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی حساس اور علامتی تصویریں اپنی اپیل میں ہمہ گیر

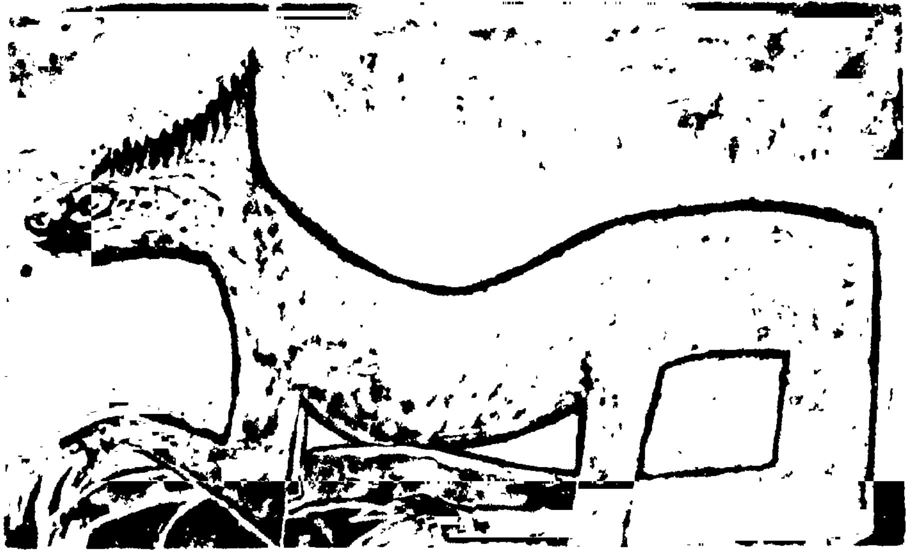


ہیں۔ یہ تصویریں ٹیگور کی شاعرانہ انسانیت پرستی کی اندرونی لگن کو رنگ اور ریکھا کے روپوں میں پیش کرتی ہیں۔ زندگی کے اسرار و رموز سے جو حیرت پیدا ہوتی ہے ٹیگور نے پورے خلوص سے اُسے اپنی تصویروں میں پیش کر دیا ہے۔

جہاں تک فن کی تکنیک کا سوال ہے ٹیگور جدتی تھے۔ اُن کی قریباً سب تصویریں فونٹین پن سے سرے سے بنائی گئی ہیں۔ اُنھوں نے فونٹین پن روشنائی اور ہلکے رنگوں کا استعمال کیا ہے۔ رنگنے کا جو بھی سامان اُنھیں مل جاتا وہ اُسے استعمال میں لے آتے۔ پانی سے نہ مٹنے والی سیاہیاں، چمڑے کے کام میں آنے والے رنگ، واٹر اور پوسٹر کلر اور کبھی کبھی بیربوٹیوں اور پھولوں کی پنکھڑیوں کا رس بھی ٹیگور استعمال کرتے تھے۔

ٹیگور نے اپنے دور میں مصوری شروع کی جب ماضی پرستی کا جادو اپنے عروج پر تھا۔ ہمارے مصور ہندوستان کی تواریخ کے سنہرے اوراق کو تصویروں میں پیش کرنے کے جذبے سے سرشار تھے۔ وہ موضوع اور مواد کی رو سے ہی تجدید پرست نہیں تھے بلکہ اُنھوں نے اجنتا، مغل اور راجپوت طرزوں کو اپنانے کی کوشش بھی کی۔ اُس دور میں تخلیقی رنگ کے بجائے جذباتی رنگ زیادہ غالب تھا۔ ٹیگور نے اِن سب سے انحراف کرکے اپنے لیے نئی راہ تراشی۔ اُنھوں نے اپنے وجدان کو اپنا راہ نما بنایا۔ اور لاشعور کی تہوں میں پوشیدہ جذبات کو رنگوں میں ڈھال کر ہندوستانی مصوری میں اظہاریت کو روشناس کرایا۔

اُن کی تصویروں کی پہلی نمائش پیرس کی آرٹ گیلری پگال میں ہوئی اور آرٹ کی دنیا میں سنسنی پھیل گئی۔ ٹیگور کا شمار یورپ کے ممتاز فن کاروں میں ہونے لگا۔ اُن کی تصویریں اور خاکے ان کی ہمہ گیر جینیس کا نیا رُخ پیش کرتی ہیں۔ ٹیگور کی فنی چابکدستی کا یہ کم ثبوت نہیں کہ اپنے تجدد کے باوجود بھی اُن کی تصویریں الہام کی حامل ہیں۔ تنظیم اور ڈیزائن کے بغیر بھی ان میں توازن، ربط، لے اور ہم آہنگی ہے کیونکہ ٹیگور کے آرٹ کے پیچھے کچھ انسپریشن اور تخلیقی لگن



کارفرما ہے۔ اُن میں نئے فارم تخلیق کرنے کا شدید جذبہ تھا اور وہ تخلیقی عمل میں ایک روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔

ٹیگور کی تصویریں کسی داخلی سرچشمے کے تیز رو دھارے کے قطعی صفحۂ قرطاس پر منعکس ہوتی نظر آتی ہیں۔ ٹیگور نے آرٹ میں ادبی اور شاعرانہ موضوعات کو پیش نہیں کیا اور نہ اُنھوں نے حسین چہروں یا جموں یا لینڈ اسکیپ یا نظاروں کی تصویرکشی کی بلکہ اُنھوں نے رنگوں کو ان کے تمام حسن اور تنوع کے ساتھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ حقیقت کی ایک نئی تفسیر ذہن میں آشکار ہوتی ہے۔ رنگوں کو زندہ کر دینا اور رنگ، ریکھا اور تصویریت کو ایک وحدت عطا کرنا ٹیگور کے فن کا کمال ہے۔ اُنھوں نے رنگ اور ریکھا کے روایتی طرزوں کو چھوڑ کر نئی طرز اختیار کی جس سے وہ ہر چیز کی پوشیدہ تصویری شکل کو رنگ اور ریکھا کی گرفت میں لا سکیں۔ اس طرح اُنھوں نے ہندوستانی آرٹ کو اپنے محدود دائرے سے نکال کر وسعت اور گہرائی عطا کی۔

ٹیگور کے آرٹ کا اپنا مخصوص مقام ہے۔ اُن کی تصویریں اُن کی شاعری کی طرح رفعت اور گہرائی کی حامل ہیں۔ حالانکہ اُن کی شاعری اور مصوری میں بنیادی فرق ہے۔ ان کی شاعری اُن کا مذہب تھی جب کہ مصوری محض ایک مشغلہ۔ لیکن ٹیگور کی یہ بات صحیح ہے کہ ان کی مصوری ریکھاؤں میں ان کی شاعری ہے یہ اسی لیے ممکن ہے کہ دونوں اصناف میں اُن کا فلسفۂ حیات یکساں طور پر جاری ہے۔ اس کے باوجود ٹیگور یہ محسوس کرتے ہیں کہ زبان میں اظہار اور اپیل کی وسعت مصوری سے کم ہے۔ اسی لئے ٹیگور آخری دم تک ایک جینیس فن کار کی طرح اظہار کے نت نئے الفاظ اور روپ تلاش کرتے رہے اور ہر روپ میں اُنھوں نے اپنی شخصیت کو امر بند کیا ہے اور فن کو لازوال بنایا ہے۔ ٹیگور ایک شاعر اور مصور کی تخلیقی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"میری صبح گیتوں بھری تھی، میری شام رنگوں بھری۔"

اور یہ حقیقت ہے کہ ٹیگور کی شاعری صد رنگ پھولوں سے مزین تھی اور اُن کے رنگوں میں الفاظ کی جادو بھری موسیقی تھی۔

ہند مسلم فنِ تعمیر

محمد حبیب

تعمیر ایک ایسا موضوع ہے جس کی تعریف کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہر شخص اس بات کا کم از کم دھندلا سا تصور ضرور رکھتا ہے کہ تعمیر سے کیا مراد ہے۔ تعمیر سے منشا جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں، محض عمارت نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی درست نہیں کہ تعمیر کا اطلاق صرف اول درجہ کی عمارت پر ہی ہوتا ہے۔ بٹلر (Butler) کہتا ہے۔ "ہر اس چیز کی طرح جو زندگی کو بہتر بنانے کے لیے تخلیق کی جاتی ہے تعمیر کا مقصد بھی ایک شکل کو پیش کرنا ہے۔ عمارت دیکھنے والے کے تخیل پر اثر انداز ہوتی ہے لیکن تخیل پر اثر ڈالنے والی یہ چیز جمالیاتی ہوتی ہے۔ عمارت [illegible] ہوتی ہے اور جب بھی اس کا تصور ہو [illegible] ضروری ہے کہ وہ جمالیاتی حیثیت سے تکمیل [illegible] ہو۔"[1] یہ کہ کون کون سی عناصر جمالیاتی تخیل پر سب سے زیادہ اثر ڈالتی ہیں اور یہ کہ کن کن عمارتوں کو بہترین تعمیر قرار دیا جا سکتا ہے، یہ ایسا سوال ہے جس [illegible] تخیل سے اختلاف کے ساتھ ساتھ اختلاف [illegible] ہر عہد اور ہر ملک میں [illegible] دستیاب مواد، آب و ہوا، مذہب اور دیگر مقامی خصوصیات ملکی تعمیرات پر اثر انداز ہوئے۔

ہند مسلم فنِ تعمیر

کچھ مغربی نقادوں نے مسلم تعمیرات کی شان و شوکت کو بازنطینی اور دیگر [illegible] ماخذوں کا رہین منت اور تمام مسلم تخلیقات کو محض تقلیدی قرار دیا ہے۔ جی۔ ڈی۔ لافوائے (Dieulafoy) اور اس کے ہم خیال دیگر مورخین کو فینا (Phaena) جو دمشق اور بصرہ کے درمیان واقع ہے، کے (Praetorium) میں جس کی تعمیر ۱۶۹ء میں ہوئی تھی زمانہ مابعد کی مساجد کا اولیں نمونہ نظر آتا ہے۔ دیگر حضرات جن کی تخئیل نسبتاً زیادہ زرخیز ہے، نعلِ اسپ سے مشابہ قوس (arch) کو بھی آرمینیا سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ محراب یا امام کی سجدہ گاہ کے بارے میں یہ فرض کیا جاتا ہے کہ اسے مذبح (niche) [illegible] قبطیوں کے لال گرجا کے گنبد اور محراب سے نقل کیا گیا ہے۔ ری۔ وائے را (Rivoira) ساسانیوں کی محراب سے متعلق واقفیت کو [illegible] سے ماخوذ قرار دیتا ہے۔ ام صلادین (M. Saladin) کا بھی خیال ہے کہ عربوں نے ساخت (massing) درجہ بندی اور تعمیراتی منصوبہ کاری کے تصورات بالائی نیل در تھیبس (Thebes) کے قدیم مندروں سے اخذ کیا ہے۔ لیکن یہ سب حضرات جو مسلمانوں کی تخلیقی صلاحیتوں سے انکار کرنے میں باہم متفق ہیں آپس میں اس بات پر شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں کہ مسلم فنِ تعمیر کا مشترکہ ماخذ کون ہے۔[2]

ورودِ ہند سے پہلے مسلمانوں نے مختلف ملکوں میں جنھیں انھوں نے اپنا وطن بنایا مسجدیں، مدرسے اور مقبرے تعمیر کیے اور ان عمارتوں میں ان مواد اور روایات کو بھی کام میں لائے جو انھیں ان ممالک میں دستیاب ہو سکیں نیز جدت و اختراع سے بھی کام لیا۔ اس طرح وہ

---

[1] A.S.G. Butler, 'The Substance of Architecture'. quoted by C.H. Reilly in 'An Outline of Modern knowlege.'

[2] C.F. Shaikh Ahmad, Muslim Architecture, Lahore, 1941 [illegible] 3-6

ایک واضح طرزِ تعمیر (جس کو اسلامی یا عربی کہا جاتا ہے اور جسے آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے) کی تخلیق کرنے میں کامیاب ہوئے۔ مگر جہاں تک ہند۔ مسلم طرزِ تعمیر کا تعلق ہے صورتِ حال مختلف ہے۔

ہیول (Havell) اس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ ہندوستانی فن کے ہر عہد میں ہر طاقت ور تخلیقی تحریک کا باعث ــــ خواہ وہ بودھی ہو، جینی ہو، ہندو ہو یا مسلم ــــ روایتی ہندوستانی تہذیب رہی ہے۔ اس تہذیب کی تخلیق سرزمینِ ہند میں آریوں نے کی تھی اور وہ مغل عہد سے پہلے بلند ترین فن کارانہ مظاہر کی حامل ہو چکی تھی۔ اس تہذیب نے جس طرح دیگر ادوار پر اپنے اثرات ڈالے اسی طرح اس نے مسلم دور کے عظیم ترین فن پاروں کو بھی متاثر کیا۔ مسلمانوں نے ہندو عبقریت کو اسلامی عقائد کو پُرشکوہ بنانے کے لیے استعمال کیا۔[۳۵] ہم ہیول (Havell) کے جذبات و احساسات سے ہمدردی تو کر سکتے ہیں لیکن وہ تاریخ کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے۔

فرگوسن (Fergusson) ہندی مسلم فنِ تعمیر کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "جہاں گیر اور شاہ جہاں کی عمارتوں میں "ہندو اثرات" کا کہیں نشان بھی نہیں ہے"۔[۳۶] گر یہ کہنا بھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تصورات کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے اور مسلم فنِ تعمیر کا انتہائی نقطۂ عروج جب ہی حاصل کیا جا سکتا ہے جب کہ ہندو اثرات کو، جنھوں نے ہندی مسلم فن کو مرکب اسلوب کو متاثر کیا ہے، پورے طور پر رد کر دیا جائے، تاریخی حقائق سے انکار کرنا ہے۔

جان مارشل (John Marshall) کے الفاظ میں "بنی نوع انسان کی تاریخ میں شاذ و نادر ہی ایسی دو تہذیبوں ــــ جو اتنی عظیم اور ترقی یافتہ ہوں اور جو ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوں جتنی کہ ہندو اور مسلم تہذیب ــــ کے اتصال اور آمیزش کا منظر نظر آتا ہے"۔[۳۷]

اس ہند۔ مسلم طرزِ تعمیر کا آغاز کب ہوا، اس کے متعلق یقینی طور سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ۱۱۹۳ء سے بارھویں صدی عیسوی کے نویں عشرہ تک کی کوئی مسلم عمارت ہندوستان میں موجود نہیں ہے۔ غزنویوں نے لاہور میں کچھ کم دو سو برس تک فرمانروائی کی۔ اس دور میں انھوں نے چند مسجدیں اور محلسرائیں یقیناً بنوائی ہوں گی لیکن نہ تو تاریخ اور نہ آثارِ قدیمہ سے ان پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غوری سلاطین نسبتاً کم ستمارن تھے۔ ان کی کوئی بھی قابلِ ذکر یادگار ہم تک نہیں پہنچی ہے بہر حال تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ ہے کہ بارھویں صدی عیسوی تک مسلم فنِ تعمیر وسط ایشیا، ایران میں اپنی ترقی کے تمام مدارج طے کر چکا تھا۔ یہ حقائق تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں کہ ہندوستانی معماروں کو سلطان محمود غزنوی غزنیں لے گیا تھا اس لیے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کریں، فنِ تعمیر کی ہندو روایات ہندوستان سے باہر یقیناً پہنچ چکی ہوں گی۔

ہند۔مسلم تعمیرات کا ابتدائی دور

تاریخی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں ہندی مسلم فنِ تعمیر کی تاریخ ۱۱۹۳ء اور ۱۲۰۶ء کے مابین شمالی ہند کی مسلم تسخیر سے شروع ہوتی ہے۔ لال کوٹ (پرانی دلی، پرتھوی راج کی راجدھانی) کے کھنڈروں پر ایک شہر ابھرا جو مسجدوں، محلسراؤں اور میناروں سے مزین تھا اور جس کو ہندو معماروں نے فاتحین کی نئی نسل کے ذوق کے مطابق، ایک ایسے طرز پر تعمیر کیا تھا جو بنیادی طور پر ہندوانہ لیکن جس پر ہلکا سا اسلامیت کا پردہ تھا۔ البتہ ابتدائی سلاطینِ دلی کے بڑے بڑے محلات مثلاً

---

[۳۵] E.B. Havell, 'Indian Architecture', London, 1913, (Preface)

[۳۶] Fergusson, 'History of Indian and Eastern Architecture', London, (1910, II) p 288

[۳۷] John Marshall, 'The Monuments of Muslim India', The Cambridge History of India,' Cambridge, 1928, III, pp 568

قصر سبز، قصر لعل، قصر سفید (جن کا تذکرہ حسن نظامی نے تاج المآثر اور منہاج السراج (طبقات ناصری) نے کیا ہے) کے کوئی آثار آج موجود نہیں ہیں۔

قطب الدین ایبک نے ۱۲۰۶ء تک سلطان شہاب الدین غوری کے نائب کی حیثیت سے حکومت کی اور اس کے بعد کم و بیش چار سال تک خود مختار سلطان کی حیثیت سے فرمانروائی کی۔ قطب الدین ایبک صرف سلطنت دہلی کا ہی بانی نہ تھا بلکہ وہ ہندی مسلم فن تعمیر کا بھی بانی تھا اور اس کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ ان میں سے چند کا مختصر ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مسجد قوت الاسلام قلعہ رائے پتھورا کے کھنڈروں پر ۱۱۹۵ء میں قطب الدین ایبک نے مسجد قوت الاسلام کی تعمیر کا آغاز کیا۔ اس مسجد کی خاص چیز اس کی منقش محرابیں ہیں۔ یہ ایک بلند کرسی پر بنی ہوئی ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے اس کے تین طرف دروازے ہیں۔ اس مسجد کا نقشہ کچھ ایسا ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف سے دیکھنے میں یہ مسجد ہندوانہ معلوم ہوتی تھی۔ اس مسجد کی اولین تعمیر بڑھتی ہوئی شہنشاہیت کے لیے ناکافی ثابت ہوئی اور بعد میں سلطان التمش، بلبن اور علاء الدین خلجی نے اس کی توسیع کی۔

اڑھائی دن کا جھونپڑا۔ اجمیر کی ایک مشہور مسجد کا نام ہے اڑھائی دن کا جھونپڑا۔ اس مسجد کی تعمیر ۱۲۰۰ء میں قطب الدین ایبک نے کی تھی بعد میں سلطان التمش نے اس کو جالیوں سے حسین تر بنا دیا۔ ان کارناموں کے انجام دینے میں ہندوستانی صناع اپنے آقاؤں سے بھی بازی لے گئے۔ فرگوسن (Fergusson) کا قول ہے کہ "نہ قاہرہ میں اور نہ ایران میں کوئی ایسی عمارت ہے جو صرف اپنی جملہ تفصیلات کے اتنی حسین ہو اور نہ اسپین یا شام میں کوئی ایسی عمارت ہے جو سطح کی آرائش کے حسن میں ان (دہلی اور اجمیر کی مسجدوں) کی ہمسری کر سکے۔"[ے]

قطب مینار۔ حسین اور پرشکوہ قطب مینار ہندوستان میں اسلام کے اولین دار السلطنت کی واحد نشانی ہے۔ اس کی تعمیر کا آغاز قطب الدین ایبک نے کیا تھا اور التمش نے اسے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ قطب مینار احساسات اور بناوٹ میں اس قدر ہندوانہ ہے کہ عرصہ تک ماہرین آثار قدیمہ اس کے فنی ماخذ اور اس کے بانی کے بارے میں کسی اطمینان بخش نتیجہ پر پہنچنے میں قاصر رہے۔

بلبن کا مقبرہ۔ ہند مسلم فن تعمیر کی ارتقاء کی تاریخ میں التمش کی وفات (۱۲۳۶ء) سے علاء الدین کی تخت نشینی (۱۲۹۶ء) تک ایک المناک خلا ہے۔ صرف ایک قابل ذکر عمارت جو اس دقفہ میں فن تعمیر کی ترقی پر روشنی ڈالتی ہے بلبن (۱۲۶۶-۱۲۸۶ء) کا مقبرہ ہے جو قلعہ رائے پتھورا کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ بدقسمتی سے اس کی آرائش کا آج نام و نشان بھی موجود نہیں ہے لیکن محرابوں کی موجودگی جو سائنسی اصول پر بنی ہوئی ہیں اس دور میں فن تعمیر کی واضح ترقی پر دلالت کرتی ہیں۔

خلجی تعمیرات

علاء الدین خلجی نے دہلی کے باہر قیام کیا اور ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جس کو ضیاء الدین برنی "شہر نو" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ قطب صاحب جاتے ہوئے اس کے کھنڈر جا بجا نظر آتے ہیں۔ شیخ ضیاء الدین برنی کے دقائع اور امیر خسرو کی نظموں سے معلوم ہوتا ہے کہ علاء الدین کی یہ دہلی بہت ہی پرشکوہ اور حسین تھی۔

ہند مسلم فن تعمیر کی تاریخ میں خلجی شہنشاہیت کا عروج ایک بہت ہی اہم دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاء الدین بہت ہی عالی حوصلہ اور باذوق سلطان تھا۔ برنی کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ علاء الدین ذوق لطیف اور نفاست طبع سے بہرہ ور نہ تھا۔ علاء الدین جنگ اور سیاست فنون لطیفہ

ے As at 5 (page 576)

ے Fergusson, History of Indian and Eastern Architecture, London 1910, II p. 214

ھ سر سید احمد خاں : آثار الصنادید۔ اشاعت دوم۔ نول کشور پریس۔ ص

اور فن تعمیر میں اپنے پیشرؤں پر ہی برتری حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس کی تمنا اور جدوجہد یہ بھی تھی کہ اس کے اخلاف بھی ان میدانوں میں اس کی ہمسری کرنے سے عاجز رہ جائیں۔ وہ سفید سنگ مرمر کا ایک فتح مینار تعمیر کرنا چاہتا تھا جو بلندی اور حجم میں قطب مینار سے دوگنا ہو۔ لیکن جس طرح اس کا فاتح عالم بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اسی طرح اس کا مجوزہ مینار بھی پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ ہاں، اس کے اس نامکمل مینار کے کھنڈر، اس کے عزائم کی بلندی اور انسانی جدوجہد کی بے مائیگی کی طرف آج بھی اشارہ کر رہے ہیں۔

علائی دروازہ۔ علاء الدین نے ۱۳۱۱ء میں علائی دروازہ کی تعمیر کی۔ یہ دروازہ مسجد قوت الاسلام کے اس حصہ میں کھلتا تھا جس کی توسیع علاء الدین نے خود کی تھی۔ علائی دروازہ ہندی مسلم تعمیرات کا ایک بیش بہا ورثہ ہے۔ اس دروازہ میں ہم کو ہندوستانی چابکدستی اور صناعی کا نقطۂ عروج نظر آتا ہے۔ اس عمارت کے تمام حصوں میں مکمل تناسب اور تعمیراتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہی اس کی کلیدی خصوصیت ہے۔

مسجد جماعت خانہ۔ یہ مسئلہ اب بھی کسی حد تک متنازعہ ہے کہ نظام الدین اولیا کی درگاہ میں یہ مسجد کس نے تعمیر کی۔ لیکن یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے اس کی تعمیر کرائی تھی اور آگے چل کر تغلق اور مغل دور میں اس میں مزید اضافے اور تبدیلیاں ہوئیں۔ سنگ سرخ کی بنی ہوئی یہ مسجد پٹھان طرز تعمیر[۹] کا بہترین نمونہ اور ہندوستان کی غالبًا اولین مسجد ہے جو تمام تر مسلم تصورات کے مطابق تعمیر کی گئی ہو۔[۱۰]

تغلق دور عمل

تخت دہلی کے خلجیوں کے ہاتھ سے نکل کر تغلقوں کے ہاتھ میں پہنچنے کے بعد فن تعمیر ایک نئے اور سادہ دور میں داخل ہوا۔ اس کی پہلی نوجوان شان و شوکت کے دن بیت چکے تھے۔ تزئین کے فیاضانہ اظہار اور تفصیلات کی تونگری (richness) نے بے داغ سنجیدگی بلکہ مرتاضانہ سادگی کے لیے جگہ خالی کر دی۔ یہ تبدیلی انقلابی معلوم ہوتی ہے، اگرچہ قابل تحسین نہیں قرار دی جا سکتی ہے۔ ہم عصر تاریخوں سے اس تبدیلی کے محرکات کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منگول حملہ کا خطرہ اور ملک میں ایک مسلسل جنگی حالت نے رائے عامہ کو علاء الدین خلجی کی اندھا دھند حماقتوں اور قطب الدین مبارک شاہ کے نفرت انگیز اخلاقی جرائم کے خلاف برافروختہ کر دیا تھا۔ تغلقوں کا مذہبی کٹرپن، سرکاری خزانہ کی خراب حالت اور کفایت شعاری کی ضرورت، آئے دن زلزلوں کا آنا، اور محمد بن تغلق کے زمانہ میں دارالسلطنت کا دولت آباد میں منتقل ہونا اور ماہر صناعوں اور کاریگروں کا منتشر ہو جانا وغیرہ وہ خاص اسباب تھے جن کی وجہ سے دور تغلق کے صناعوں اور کاریگروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ فن تعمیر میں اپنے پیشرؤں کی تقلید کر سکیں۔ بہرحال اس دور کی چند تعمیرات یہ ہیں: —

تغلق آباد۔ سلطان غیاث الدین تغلق (۲۵-۱۳۲۱ء) نے تغلق آباد کے مورچہ بند شہر کو ایک پہاڑی سلسلہ پر آباد کیا تھا۔ شاید ہی کسی قدیم مورچہ بند شہر کے کھنڈر اتنے مرعوب کن ہوں جتنے کہ تغلق آباد کے۔ اس کے اونچے اونچے مینار، موٹی موٹی دیو ہیکل دیواریں، عضب آلود فصیلیں، بڑے بڑے برج، ڈھالو دخل، ان سب سے ایک ناقابل تسخیر قوت اور شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ شاید حضرت نظام الدین اولیا کی بددعا "یا بسے گوجر یا رہے اجڑ" اپنا رنگ دکھا کر رہی۔

مقبرہ۔ غیاث الدین تغلق کا سادہ لیکن نہایت قوی ہیکل مقبرہ کسی جھیل میں ایک کنول کے پھول کی طرح، ایک جزیرہ پر بنا ہوا ہے۔ ایک تنگ راستہ اسے قلعہ سے ملاتا تھا۔ یہ مقبرہ اپنی بناوٹ کی انتہائی سنجیدگی اور نقاشی اور آرائش میں اپنی سادگی کی وجہ سے علائی دروازہ اور التمش کے مقبرہ سے قطعی مختلف ہے۔ یہ مقبرہ اس ردعمل کو ظاہر کرتا ہے جو عہد ماقبل کے اسراف اور نمائش کے خلاف اس دور میں پیدا ہو چکا تھا۔ جو لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ محمد بن تغلق کے عہد میں جو تغلق

۹۔ مغل عہد سے پہلے کی ہند مسلم تعمیرات عام طور سے مگر غلط طور پر "پٹھان" تعمیر کہا جاتا ہے بہرحال اب اس عہد کی تعمیرات کے لیے کوئی نیا نام تجویز کرنا بہت بعد از وقت چیز ہوگی۔

۱۰۔ Zafar Hasan, Memoirs of Archaeological Survey of India No. 10 Page 14

طرزِ تعمیر مروج تھا، اس کا مانند نہ تھا۔ اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس دور کی عمارتوں کی سطح کی سادگی، زاہدانہ وضع اور موٹی موٹی ڈھالو یا اہرامی دیواریں ان سب کا آغاز غیاث الدین تغلق کے زمانہ میں ہوا تھا جس کو بہ ظاہر اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔[11]

شہر جہاں پناہ۔ محمد بن تغلق نے اپنے دورِ حکومت کے پہلے دو سالوں میں عادل آباد کے چھوٹے قلعہ اور شہرِ جہاں پناہ کی تعمیر کی۔ عادل آباد حقیقتاً تغلق آباد ہی کا ایک ضمیمہ تھا اور طرزِ تعمیر اور نقشہ میں قریب قریب اسی کے مثل ہے۔ دہلی اور سری کے آس پاس کے علاقہ کو گھیر کر جہاں پناہ کی تعمیر کی گئی تھی۔ اس شہر کی موٹی چہار دیواریاں (جن میں سے کچھ ۳۵ فیٹ موٹی ہیں)، آج کچھ جگہوں پر بدقت معلوم کی جا سکتی ہیں۔ ایک برجی دار مینار نما عمارت جو بیج منزل (جہاں نما یا وجے منڈل[12] کہتے ہیں) آج بھی موجود ہے جو اپنے نفس اسپ مشابہ قوسوں اور ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی محرابوں کی وجہ سے قابلِ ذکر ہے۔ وجے منڈل کے پیچھے ایک بے نام مربع مقبرہ ہے جو اپنے داخلی اور خارجی حسنِ تناسب کے اعتبار سے تغلق عہد کی کسی بھی عمارت سے فروتر نہیں ہے۔

سلطان فیروز تغلق۔ فیروز تغلق مغلوں سے پہلے سب سے بڑا عمارت ساز گزرا ہے۔ اس کے دورِ حکومت نے نسبتاً زیادہ پُرامن زمانہ پایا اور عمارتوں کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ شمس سراج عفیف نے فیروز شاہ تغلق کے بسائے ہوئے شہروں اور بنوائے ہوئے قلعوں، محلوں، مسجدوں، مقبروں اور دیگر عمارتوں کی ایک لمبی فہرست پیش کی ہے اور فرشتہ نے اس سے بھی لمبی فہرست پیش کی ہے۔ شہر فیروز آباد کے علاوہ اس نے جونپور، فتح آباد اور حصار فیروزہ کی بنیاد ڈالی اور انھیں آباد کیا۔ اس نے اپنے پیشرو سلاطین کی تعمیر کردہ بہت سی عمارتوں کی بھی مرمت کی اور دوبارہ بنوایا۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ وصف بہت ہی کم یاب تھا۔ فیروز تغلق کی ان عمارتوں میں جو دست بردِ زمانہ سے بچ گئی ہیں سب سے زیادہ قابلِ ذکر کوٹلہ فیروز شاہ ہے جو ایک مورچہ بند محل ہے اور جس کو شہر فیروز آباد کے اندر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے صحن میں جو یادگاریں سب سے زیادہ اپنی اصل حالت پر قائم رہ گئی وہ ہیں جامع مسجد اور ایک اہرامی شکل کی عمارت جس کے اوپر اشوک کا ایک ستون نصب ہے۔[13]

حوض خاص پر علاء الدین خلجی کی قدیم تر عمارتوں کے کھنڈروں پر نسبتاً چھوٹی چھوٹی لیکن زیادہ دلچسپ عمارتوں کا ایک سلسلہ مدرسہ اور مقبرہ موجود ہے۔ مدرسہ تقریباً کھنڈر ہو چکا ہے اور مقبرہ جس کو فیروز شاہ نے اپنے لیے بنوایا تھا بالکل بوسیدہ ہے۔ اس کی بے تکلف اور پُروقار سادگی ہمیں تحسین و آفرین کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔ ہندوانہ ستون اور مسلم محراب کا موثر اختلاط اور ان کی غیر معمولی نقاشی انھیں حد سے زیادہ دلچسپ بناتی ہے۔

خانِ جہاں کا مقبرہ۔ خانِ جہاں تلنگانی (متوفی ۱۳۶۸-۹ء) فیروز تغلق کے وزیرِ اعظم کا یہ مقبرہ تاریخی اور فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے بہت ہی دلچسپ ہے۔ اور وہ حضرت نظام الدین اولیا کی درگاہ سے تھوڑا سا جنوب میں ہٹ کر واقع ہے۔ یہ مقبرہ فنِ تعمیر میں ایک جدت کا آغاز کرتا ہے۔ دہلی میں اس سے پہلے کے بنے ہوئے تمام مقبروں (جو کہ مربع ہیں) کے برعکس اس مقبرہ کا وہ کمرہ جس میں کہ قبر ہے ہشت پہلو ہے اور اس کے اوپر صرف ایک گنبد ہے اور ایک نیچے برآمدے سے گھرا ہوا ہے۔ لودیوں اور سیدوں نے اسی تلنگانی مقبرہ کے نقشہ پر اپنے مقبرے بنوائے ہیں۔

لال گنبد۔ یہ عمارت کبیر الدین اولیا کا مقبرہ ہے جسے مقامی لوگ لال گنبد کہتے ہیں اور جو غالباً نصیر الدین محمود شاہ (۱۳۸۹-۹۲ء) کے عہدِ حکومت میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ مقبرہ عہدِ خلجی کے رنگین اور جاندار طرزِ تعمیر کے احیاء کا مظہر ہے جو نصف صدی سے زائد ٹکسال باہر رہ چکا تھا۔

---

[11] تغلق آباد اور مقبرہ غیاث الدین تغلق کا تفصیلی بیان سرسید احمد خاں کی آثار الصنادید میں ملتا ہے۔

[12] آثار الصنادید نول کشور پریس

[13] تفصیلات کے لیے دیکھیے J. A. Page, 'Memoirs of The Archaeological Survey of India' (A Memoir on Kotla Firoz Shah) No. 52

کالی مسجد۔ فیروز شاہ تغلق کے عہد کی تمام مسجدیں نقشہ اور وضع میں حیرت انگیز طور پر یکساں ہیں لیکن کالی (کلاں) یا سنجر مسجد جس کو خان جہاں کے بیٹے جوناں شاہ نے تعمیر کرایا تھا بناوٹ اور خاکہ میں بالکل مخالف ہے۔ اس مسجد کی نماز گاہ کے سامنے کا حصہ بجائے کھلے ہونے کے زاویہ قائمہ پر کاٹتی ہوئی محراب دار گلیوں (arcades) کے ذریعہ چار حصوں میں منقسم ہے۔ دیکھنے میں یہ مسجد سادہ لیکن بہت دبیز ہے اور اس کے اوپر کئی گنبد ہیں۔

تغلق طرز۔ تغلق عہد کی عمارتیں جاندار، مردانہ، مضبوط، مقصد میں پرخلوص اور تصنع سے پاک ہیں۔ ان کے دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک ہیبت اور خوف پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ تغلق سلاطین راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ذوق حسن سے بے بہرہ نہ تھے اور نہ ان کے لیے ہندوستانی ماحول سے فرار ہی ممکن تھا۔ جمالیاتی اثر کو بڑھانے کے لیے انھوں نے متضاد رنگوں کا استعمال کیا۔ اس دور کی عمارتوں کے نقشے اور بناوٹ کے تعین میں جس ذہنیت نے حصہ لیا وہ زیادہ تر ہندوستانی تھی۔ یہ بات بدیہی ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلم احساس فن زیادہ سے زیادہ ہندوستانی ہوتا گیا۔[۵۲]

سیدیوں کے مقبرے۔ باوجودیکہ لال گنبد سے فن تعمیر میں ایک نئی جدت کا آغاز ہو چکا تھا، عمومی طور پر تغلق طرز تعمیر سلطنت دہلی کے افغان خانوادوں کے اختتام تک مروج رہا۔ سید دور کے بہترین عمارتوں کے نمونے بادشاہوں اور امراء کے مقبرے ہیں۔ وہ تلنگانی مقبرہ کی وضع اور طرز کی تقلید کرتے ہیں اور ہر نقش دوم نقش اول سے بہتر ہوتا چلا گیا ہے۔

اس عہد میں مبارک شاہ کے مقبرہ کے وسطی گنبد کو بنیادی طور پر بلند کیا گیا اور گلدستوں کا اضافہ ہوا اور کلس (Finial) کی جگہ محرابی لالٹین (lantern) نے لے لی۔ برآمدہ کی اونچائی کو بھی بڑھایا گیا۔ محمد شاہ کے مقبرہ کے معماروں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور تحتی چھتریوں اور گلدستوں کے ایک اور سلسلہ کا اضافہ کیا۔ آرائش میں اضافہ کرنے کے لیے مینا کار نیلے کھپرنے، سطح کی بہت ہی گنجان اور نفیس نقاشی، کنول کے پھول کا کلس اور دوسرے ہندوستانی ابراری علامات" (motifs) وہ جدید ہیں جو سید دور کی عمارتوں کے امتیازی خصوصیات کہے جا سکتے ہیں۔[۵۳]

لودی عمارتیں

لودیوں کے عروج کے ساتھ ہندی مسلم فن تعمیر ایک نہایت دل کش ہندوستانی طرز تعمیر کا حامل بن گیا۔ پٹھان پورے طور پر ہندوستانی بن چکے تھے اور ہندو روایات (بشرطیکہ اثباتی طور پر خلاف اسلام نہ ہوں) ان کی نظروں میں قابل اعتراض نہ رہے تھے۔ مگر لودیوں نے کسی نئی دہلی کی تعمیر نہیں کی۔ پھر بھی، بہلول لودی کا مقبرہ اس دور کی عمارتوں کا بہترین نمونہ ہے جو آج بھی موجود ہے۔ یہ ایک اوسط درجہ کا ایک منزلہ مقبرہ ہے۔ ڈھالو چھت سب سے پہلے اسی مقبرہ میں ہم کو نظر آتی ہے۔ فنی حیثیت سے اس چھت کا تکملہ ہم کو فتح پور سیکری میں ترکی سلطانہ کی محلسرا میں دکھائی پڑتا ہے۔

سلطان سکندر لودی نے اپنی راجدھانی، دہلی سے اپنے نو آباد کردہ شہر آگرہ منتقل کر دی۔ لیکن اس کے باوجود اس کی خواہش یہی تھی کہ وہ دہلی میں مدفون ہو۔ جہاں چہ صفدر جنگ کے قریب ہی ایک شکستہ چہار دیواری کے اندر، جو سکندرہ سے زیادہ وسیع ہے، سلطان سکندر لودی کا مقبرہ ہے۔ اس عمارت کے اندر، اور باہر مختلف رنگوں کے مینا کار کھپرے مختلف طرزوں (patterns) سے استعمال کیے گئے ہیں۔ اس سے آرائش میں تونگر تر اور نسبتاً بے دریغ نمائش والی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم خصوصیت اس مقبرہ کی یہ ہے کہ اس میں دو گنبد بنائے گئے ہیں۔ مغل فن تعمیر کی ارتقاء میں اس جدت

---

۵۲ John Marshall, The Monuments of Muslim India, The Cambridge History of India, Cambridge, 1928 ۵۸۹-۹۶

۵۳ The Monuments of India ۵۹۴-۹۵

اور مقبرہ کی چہار دیواری نے بہت ہی اہم حصہ لیا ہے۔[11] لودی طرزِ تعمیر میں صرف اتنی ہی بات نہیں ہے کہ وہ تغلق عہد کی سادگی، سنجیدگی اور ڈھالو محرابوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے بلکہ وہ پٹھان اور مغل عہد کو جوڑنے والی کڑی بھی ہے۔ مغل حکمرانوں کو لودیوں کی سلطنت ہی نہیں ملی بلکہ ان کے فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر سے بھی وہ بہرہ اندوز ہوئے۔

سوریوں کا عبوری دور

مغل سلطنت کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں بابر نے ڈالی لیکن خود بابر نے ہندوستان کے تعمیراتی روایات پر اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ بابر کے بیٹے اور جانشین ہمایوں نے تخت ہند کھویا بھی اور دوبارہ حاصل بھی کیا لیکن ہمایوں کے تخت کھونے اور تخت حاصل کرنے کے درمیانی وقفہ میں افغانوں کا ایک اور خاندان جو تاریخ میں سوری کے نام سے مشہور ہے ملک پر قابض رہا۔ ہندوستان کے سیاسی افق پر شہاب ثاقب کی طرح نمودار ہو کر شیر شاہ نے سیاست، ملکداری، فنون اور فنِ تعمیر کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دے۔ یہ مختصر لیکن شاندار عہد حکومت ہندی مسلم فنِ تعمیر کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

شیر شاہ نے ایک نئے دہلی شہر کی تعمیر کی جس کی بنیاد اس کے حریف سلطنت ہمایوں بادشاہ نے "دین پناہ" کے نام سے ڈالی تھی۔ شیر شاہ کا یہ شہر زمانہ مابعد میں شیر گڑھ کے نام سے مشہور ہوا اور آج اسے پرانا قلعہ کہتے ہیں۔ شیر شاہ کی دہلی کی فصیل کے اندر مسجد قلعہ کہنہ اور ایک اور سنگِ سرخ کی بنی ہوئی عمارت جسے شیر منڈل کہتے ہیں آج بھی موجود ہے۔ شیر منڈل شکل میں ہشت پہلو اور حقیقتاً "شیر منزل" کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ اسے غلطی سے ہمایوں کی لائبریری کہا جاتا ہے۔

مسجد قلعہ کہنہ۔ ملکداری کی طرح فنِ تعمیر میں بھی ہم جذبۂ قومیت کو برسرِ کار دیکھتے ہیں۔ مغلوں کو سوریوں کی یہ ایک ایسی دین ہے جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ باہر سے صاف ستھری، متناسب گنبد دار اور نکیلی محرابوں والی مسجد قلعہ کہنہ مسلم تعمیر معلوم ہوتی ہے لیکن اندر خوش گوار ہندوانہ فضا چھائی ہوئی ہے۔ فرگوسن کا یہ قول کہ پٹھانوں نے جناتوں کی طرح تعمیریں کی لیکن اس کو سنار دنیا کی طرح اختتام کو پہنچایا جتنا اس مسجد کے طرزِ تعمیر پر منطبق ہوتا ہے اتنا کسی اور پر نہیں ہو سکتا۔

شیر شاہ کا مقبرہ۔ ہندی مسلم فنِ تعمیر کی ارتقا میں، سہسرام میں واقع شیر شاہ کے مقبرہ کی دین اتنی اہم ہے کہ اس پر زیادہ زور دینے کی ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔ شیر شاہ کے مقبرہ سے ہمایوں کے مقبرہ تک ارتقا کا ایک سلسلہ ہے اور ہمایوں کا مقبرہ تاج محل اور شیر شاہ کے مقبرہ کے درمیان جوڑنے والی کڑی ہے۔ شیر شاہ نے اپنے اس مقبرہ کی تعمیر کا آغاز خود کیا تھا لیکن اس کی تکمیل اس کے بیٹے سلیم یا اسلام شاہ کے عہد میں ہوئی۔ یہ مقبرہ ایک مصنوعی جھیل کے بیچ میں بنا ہوا ہے۔ اس کے پس منظر کا دل کش خاکہ، اس کی عظمت اس کا مردانہ حسن اور نفیس فن کاری دیکھنے والوں پر اپنا ایک خاص اثر چھوڑتی ہے۔

شیر شاہ کی وفات (۱۵۴۵ء) سے ۱۵۶۴ء تک جب کہ اکبر نے قلعہ آگرہ کی بنیاد ڈالی ہمایوں کے مقبرہ کو مستثنیٰ کر کے فنِ تعمیر کی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔

مغل عہد

ہمایوں کا مقبرہ۔ بابر کی طرح ہمایوں نے بھی ہم عصر فنِ تعمیر پر اپنا کوئی براہِ راست اثر نہیں چھوڑا لیکن اس کی وفات کے آٹھ برس بعد اس کی بیوہ حاجی بیگم نے اس کا جو مقبرہ تعمیر کرایا وہ نہ صرف ہندوستان میں مغل فنِ تعمیر کے جاذبِ نظر نمونوں میں سے ایک ہے بلکہ وہ ہندوستان میں مغل طرزِ تعمیر کے ارتقا میں بھی ایک بہت ہی اہم منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔[12]

یہ مقبرہ ہندوستان میں مغلوں کے ان مقبروں میں پہلا مقبرہ ہو جس میں باغ ہو اور جو تاج محل کا قابلِ نقل کسی حد تک ابتدائی نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وضع بناوٹ اور روح میں ہمایوں کا مقبرہ ایشیا

---

[11] The Monuments of India ص۱۹۹.

[12] Percy Brown, Indian Architecture (The Islamic Period) Bombay. ص۹۴

کے دو تعمیراتی روایات 'ہندوستانی اور ایرانی' کی آمیزش کی ایک مثال ہے ہیول اس کو شیر شاہ کے مقبرہ کی ایرانی نقل قرار دیتا ہے۔[18] سرسید احمد خاں اس عمارت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور کسی شاعر نے اس عمارت کی یوں تعریف کی ہے۔ ؎

ہر کہ خواہد کہ ببیند شکل فردوس بریں   گو بیا ایں قصر و ایں باغ ہمایوں ببیں[19]

جہانگیری محل۔ اکبر کی تخت نشینی کے ساتھ فن تعمیر ایک خوش گوار دور میں داخل ہوا اور زیادہ سے زیادہ ہندوستانیت مطمح نظر قرار پائی۔ قلعہ آگرہ کے اندر اکبر کی تعمیر کردہ صرف ایک عمارت جہاں گیری محل بحالہ موجود ہے۔ جہاں گیری محل اس عبوری منزل کی نشاندہی کرتا ہے جو ہندو محلسراؤں کی تعمیر (جس کا ایک نمونہ گوالیر کے مان مندر محل میں جو پندرھویں صدی عیسوی کی تعمیر ہے پایا جاتا ہے) اور سولھویں صدی عیسوی کے ایک مسلم فرماں روا کے خانگی ضروریات کے مابین پائی جاتی ہے۔

اس طبقہ سے متعلق اکبر کے بنوائے ہوئے دو اور قلعے (موزچہ بند محل) ایک لاہور میں اور دوسرا الہ آباد میں پائے جاتے ہیں۔ لاہور کی محلسراؤں کے بنانے والے کاری گروں کی قوت متخیلہ آرائشی صناعی میں آگرہ کے صناعوں سے زیادہ طاقت ور معلوم ہوتی ہے۔ الہ آباد کے قلعہ (موزچہ بند محل) کی تعمیر کا آغاز ۱۵۸۳ء میں ہوا تھا۔ یہ قلعہ گنگا جمنا کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ موزچہ بند محل آگرہ کے محل سے بڑا ہے۔ زنانہ محل جو قلعہ کے اندر تباہی سے بچی ہوئی واحد عمارت ہے' اس کا تونگر طرز اکبر کی روز افزوں دولت و طاقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اکبر کا وہ قلعہ جو اس نے ۱۵۷۰ء میں اجمیر میں تعمیر کرایا تھا بیشتر دیگر عمارتوں سے بالکل مختلف ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قلعہ اکبر کے بڑھتے ہوئے حدود سلطنت کے ہراول کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا۔

فتح پور سیکری۔ اکبر کی سب سے بڑی تعمیراتی کارروائیوں کا آغاز ۱۵۶۹ء میں ہوا جب اس نے آگرہ کے قریب فتح پور سیکری کی بنیاد ڈالی۔ یہ شہر اکبر کی عمارت سازی اور ریاست دانی کی ایک حیرت انگیز یادگار ہے۔ جگہ کی تنگ دامانی اتنی بھی اجازت نہیں دیتی کہ پتھروں میں رنگین افسانوں کے مظہر اور خوابوں کے اس شہر کے تعمیراتی شہ پارں کا اختصار کے ساتھ بھی ذکر کیا جاسکے۔

موٹے طور پر سیکری کی عمارتیں دو طبقوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں' مذہبی اور دنیوی۔ فتح پور سیکری کی جامع مسجد جو مسجد حرام کی نقل ہے اور سنگ مرمر اور مینا کاری سے از حد مزین ہے' ہندوستان کی کسی بھی مسجد سے فروتر نہیں ہے۔ مسجد کے صحن میں سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا شیخ سلیم چشتی کا مزار مغلوں کی حسین ترین عمارتوں کا ایک نمونہ ہے۔ اس عظیم مسجد کے جنوبی پھاٹک کو بلند دروازہ کہتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ یقیناً اسم با مسمیٰ ہے کہ وہ ہندوستان کا بلند ترین دروازہ اور دنیا کے عظیم ترین دروازوں میں سے ایک ہے اور تمام ہندوستان کے مکمل ترین تعمیراتی کارناموں میں شمار ہونے کا سزاوار ہے۔[20]

دنیوی عمارتوں میں میں جودھا بائی کا محل سب سے بڑا ہے لیکن سب سے دل کش اور خوش وضع راجہ بیربل کا محل اور ترکی سلطانہ کی محل سرا ہے۔ یہ دونوں محلسرائیں اندر باہر شروع سے آخر تک اقلیدسی نیز دیگر کندہ کیے ہوئے نقوش (patterns) سے منقش (Carved) ہیں۔ بعض حالتوں میں مثال کے طور پر خوابگاہ اور بی بی مریم کی کوٹھی میں نقاش کے برش نے سنگ تراش کی چھینی کی جگہ لے لی ہے۔ ستون' دیواریں اور اندرونی چھتیں دیواری تصاویر (frescos) سے مزین ہیں۔[21]

پنج محل اور دیوان خاص میں ہندی مسلم فن تعمیر کے طالب علموں فن کاروں اور آثار قدیمہ سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے دل چسپی کا خاصہ مواد موجود ہے۔ فن تعمیر کے کسی بھی مکتب کے لیے یہ ضروری ہے کہ

---

۱۸ Havell, Indian Architecture, London, 1913, chapt. IX, ص ۱۶۰

۱۹ سرسید احمد خاں:۔ آثار الصنادید' اشاعت دوم نول کشور پریس ص ۳۰

۲۰ Fergusson, History of Indian and Eastern Architecture, London, 1910, ۲۹۲

۲۱ R. F. Chisholm, Journal of the Royal Society of Arts, January 1911, ص ۱۴۳

تعمیراتی اور آرائشی عناصر میں مکمل تناسب اور مطابقت ہو۔ پروفیسر لے تھابی (Lethaby) کا کہنا ہے کہ "اگر ہم عمدہ عمارت اور اعلیٰ درجہ کی تعمیر میں امتیاز کرنا چاہتے ہیں تو عضویاتی (Organic) اتحاد ہی اس کی کسوٹی ہوگا۔" اکبری تعمیرات اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

سکندرہ۔ آخری عمارت جس سے اکبر کا ذاتی تعلق تھا وہ آگرہ کے قریب سکندرہ میں اس کا مقبرہ ہے۔ اس عمارت کا آغاز اس نے خود کرایا تھا لیکن اسے اس کے بیٹے جہانگیر نے ۱۶۱۳ء میں مکمل کرایا۔ اس مقبرہ میں پانچ مربع منزلیں ہیں اور جیسے جیسے یہ منزلیں اوپر اٹھتی گئی ہیں ان کا حجم چھوٹا ہوتا گیا ہے۔ (اس عہد کی صرف ایک عمارت پنج محل (جو سیکری میں ہے) اس سے مشابہ ہے۔ پنج محل کی تعمیر بودھی وہار کے وضع پر کی گئی ہے) مقبرہ کی بالائی منزل پر روایتی گنبد یا چھتری کی عدم موجودگی سے قیاس آرائیوں کا دروازہ کھل گیا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ مقبرہ ایک بے سرا جسم ہے۔ لیکن بالائی منزل کو غور سے دیکھنے سے یہ نکتہ سمجھ میں آتا ہے کہ آفتاب پرست اکبر کے مقبرہ (Cenotaph) کو ایک خاص مقصد سے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سورج کی کرنوں کے لیے کھلا رہے۔

یہ مقبرہ مغلوں کے بہت ہی حوصلہ مندانہ تخلیقات میں سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو تو یہ عمارت فنی نقطۂ نظر سے ناموزوں اور غیر پرکشش معلوم ہو لیکن جہانگیر نے اپنے باپ کا جو مقبرہ بنوایا وہ اکبر کے ذوق اور اس کے کردار سے پوری پوری مناسبت رکھتا تھا۔ سکندرہ اکبر کا فن ہی نہیں بلکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس کا طرز تجویہ ہے اس سے اکبر جیسے تیز طبع شہنشاہ کا فنی ذوق اور اس کا انتخابی (eclectic) اور ہمہ گیر (cosmopolitan) کردار پورے طور پر منعکس ہوتا ہے۔

اعتماد الدولہ۔ آگرہ میں جہانگیر کے عہد کی دوسری مشہور عمارت اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ اعتماد الدولہ ایک معزز درباری اور جہانگیر کی ملکہ نورجہاں کا باپ تھا۔ نورجہاں نے اس مقبرہ کی تعمیر ۱۶۲۸ء میں کرائی تھی۔ اس مقبرہ کو کئی جہتوں سے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نہایت مزین بے داغ سفید سنگ مرمر کا یہ مقبرہ مغل فن تعمیر پر نسوانی اثرات کی فتح عظیم کا مظہر ہے اور اس میں وہ حسن ہے جو بہت ہی کم ملتا ہے۔ نورجہاں کی یہ تخلیق اپنے اندر ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے اور فن تعمیر میں نئے رجحان کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ نیا رجحان دور اکبری کی ہندوستانیت سے متاثر طرز تعمیر سے دور اور شاہجہاں کی ایرانیت سے متاثر طرز سے قریب تر نظر آتا ہے۔ اس مقبرے کی جواہرات کی مبنت کاری (pietra dura inlay) گوشوں کے مینار، کنار دریا کا انتخاب، چمنوں اور سبزہ زاروں نے یقیناً معمار تاج کو الہام کی روشنی بخشی ہوگی۔[۱۱۲]

سنگ مرمر کا دور

شاہجہاں کی تخت نشینی سے ہندی مسلم فن تعمیر کا دور تغزل شروع ہوا۔ اکبر کی طرح شاہجہاں بھی عمارت سازی کا لامحدود حوصلہ رکھتا تھا۔ لیکن اس کے مزاج اور اکبر کے مزاج میں فرق تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہجہاں کا عہد سنگ سرخ کے دور کے برخلاف، سنگ مرمر کا دور تھا۔ اس کے عہد میں طرز تعمیر میں ایرانیت بڑھ گئی اور اکبری روایات تعمیر کو صدمہ پہنچا۔

آگرہ کی عمارتیں۔ شاہجہاں نے آگرہ کے قلعہ میں بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ ان میں اہم ترین خاص محل، شیش محل، مثمن برج، دیوان خاص، دیوان عام اور موتی مسجد ہیں۔

خاص محل یا حرم شاہجہانی جس کو آرام گاہ مقدس بھی کہتے تھے "اپنے نازک حسن سے جس میں اس کی وہ خوش وضعی بھی شامل ہے جو صرف مشرق ہی میں پائی جاتی ہے"[۱۱۳] آج بھی اپنی گذشتہ شان و شوکت کی یاد دلاتا ہے۔ دیوان خاص جس کو فارسی تاریخوں میں غسل خانہ کے

---

۱۱۱ Cf. E. W. Smith, Mughal Architecture of Fatehpur Sikri, Allahabad, 1894

۱۱۲ W. R. Lethaby, Medieval Art, ص ۱۲، ۱۳

۱۱۳ Cf. N. L. Chatterji, Itamaduddaula's Tomb at Agra, Journal of Indian History, Trivandrum, August, 1954.

نام سے یاد کیا گیا ہے دور شاہجہانی کی ایک خوش وضع ترین عمارت ہے جو کل کی کل رنگین پتھروں سے مرصع اور سفید سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔
اس کی بناوٹ شاہجہانی عہد کے بہترین طرز کا نمونہ ہے[26] موتی مسجد سفید سنگ مرمر کی ایک بے داغ عمارت ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف ڈھالو ہوتی ہوئی ایک بلند جگہ پر بنی ہوئی ہے جہاں سے شاہی عمارتوں کا منظر اچھی طرح نظر آتا ہے۔ اس کے وسطی کمرہ کے اوپر تین خوب صورت گنبد ہیں جو ستونوں کی تین قطاروں پر ٹکے ہوئے دوسرے بے یارڈ ٹیلر (BAYARD TAYLOR) کے فصیح لفظوں میں "سیمیں حباب کی طرح نظر آتے ہیں۔"

تاج محل۔ تاج محل ایک ایسی یادگار ہے جو ہندی مسلم فن تعمیر کی ارتقا میں "کامل لمحہ" کی نشاندہی کرتی ہے[27] اس عجیب و غریب یادگار کے عمومی تصور کو ہم شاہجہاں کے دماغ سے منسوب کر سکتے ہیں لیکن یہ استاد احمد لاہوری کا ذہن رسا تھا جس نے شاہجہاں کے تصور کو ایک ایسی مکمل تعمیر کا لباس عطا کیا[28] تاج محل ممتاز محل کا مقبرہ ہی نہیں ہے بلکہ اگر اس کا شاعرانہ تجزیہ کیا جائے تو وہ خود ممتاز محل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کوئی عمارت بھی اس کے بیکسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لاہور کی عمارتیں۔ شاہجہاں کے زمانہ میں قلعہ لاہور کی اندر کی محلسراؤں میں بھی قلعہ آگرہ کی محلسراؤں کی طرح تبدیلیاں کی گئیں۔ اکبر کی تعمیر کردہ سنگ سرخ کی بہت سی محلسراؤں کی جگہ زیادہ پسندیدہ طرز کی محل سرائیں تعمیر کی گئیں۔ زیادہ تر احاطہ کے جنوبی حصہ کی طرف اس قسم کی عمارتیں مثلاً دیوان عام، خواب گاہ، شیش محل، مثمن برج اور نولکھا بنوائی گئیں۔ زمانہ مابعد میں ان میں سے کچھ عمارتوں میں مزید تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے[29]

دہلی کا محل۔ آگرہ میں گیارہ سال حکومت کرنے کے بعد شاہجہاں کی یہ خواہش ہوئی کہ وہ دہلی کو اپنی راجدھانی بنائے چنانچہ شہر شاہجہان آباد کی بنیاد ۱۶۳۸ء میں ڈالی گئی۔ اس شہر کا موجود بند محل یعنی قلعہ معلیٰ یا لال قلعہ اس کی امتیازی خصوصیت تھی۔ غالباً آگرہ کا موجود بند محل (قلعہ آگرہ) دہلی سے زیادہ خوش نما ہے اور تاریخی حیثیت سے زیادہ دلچسپ ہے۔ یوں بھی آگرہ کی شاہجہانی تعمیرات دہلی کی شاہجہانی تعمیرات سے زیادہ سنجیدہ اور خوش ذوقی میں بڑھی ہوئی ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود دہلی کی محلسرا (قلعہ معلیٰ یا لال قلعہ) مشرق میں بلکہ غالباً ساری دنیا میں شاندار ترین محلسرا ہے[25] اس کے خاکے کا ہر ہر خد و خال منظم اور با اصول ہے۔ اس کا زیادہ حصہ شکل میں مربع ہے لیکن پورے خاکہ میں شاید ہی کہیں کوئی ترچھی لکیر یا خط منحنی ہو مشرقی دیوار سے ملی ہوئی محلسراؤں پر بہترین اور بھرپور فن کاری کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

دیوان عام کا بڑا ہال صحن کے مشرقی حصہ کی خاص چیز ہے۔ اس صحن میں نوبت خانہ سے داخل ہو سکتے ہیں۔ ہال کا اندرونی حصہ ستونوں کے ذریعہ تین بازوؤں میں منقسم ہے۔ اس کا سامنے کا مغربی حصہ دندانہ دار (ENGRAILED) محرابوں کو سہارا دینے والے دس ستونوں سے آراستہ ہے۔ عقبی دیوار کے وسط کی ایک خالی جگہ میں سنگ مرمر کا ایک قبہ (BOLDACHIN) جڑا ہوا ہے جس کو نشیمن ظل الٰہی کہتے ہیں۔ اسی جگہ پر تقریباً ستّر سال تک موقع پر مشہور تخت طاؤس رکھا جاتا تھا۔ یہ جواہرات سے مرصع تخت تباہ ہو چکا ہے لیکن اس کی تصویریں مغلوں کی "خورد تصاویر" (MINIATURE PAINTING) میں آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

رنگ محل جس کی وجہ تسمیہ اس کی سابقہ رنگین آرائش تھی شاہی حرم کا سب سے بڑا محل تھا۔ شاہجہاں کے وقت میں اس کو امتیاز محل

---

۲۵ Fergusson, History of Indian and Eastern Architecture, London, 1913, II, ص ۳۰۸

۲۶ ایضاً

۲۷ Percy Brown, Indian Architecture, (The Muslim Period), ص ۱۱۶

۲۸ Cf. Authors article, Architect of the Taj, Modern Review, Calcutta, March 1935

۲۹ Percy Brown, Indian Architecture, (The Muslim Period) ص ۱۱۱ - ۱۱۰ (پرسی براؤن صفحہ ۲۹)

کہا جاتا تھا۔ عبدالحمید لاہوری اس محل کے بارے میں لکھتا ہے کہ "خوبی اور رتبہ میں تخت ہشت طبق آسمان سے برتر ہے اور رنگ و نور میں بہشت موعودہ کے محلوں سے فزوں تر ہے۔"[۳۰] رنگ محل کی ایک خصوصیت نہر بہشت ہے جو اس سے ہو کر گزرتی ہے۔ اس کا وقوع اور بناوٹ اپنے آس پاس کی عمارتوں کی تعمیراتی خصوصیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اس نہر کے اندر فرش پر سنگ مرمر کا ایک اتھلا حوض ہے۔ اس حوض کے وسط سے چاندی کا بنا ہوا کنول کا نازک تنہ نکلتا ہے۔ اس تنہ کے اوپر کنول کے پھول سے معطر پانی بلبلے پیدا کرتا ہوا اچھلتا ہے۔ حوض کی وضع ایک بہت بڑے کنول کے پھول جیسی ہے۔ اس کی پنکھڑیاں ایک سوراخ دار ڈھانچہ کے اندر اتنے حسن اور نفاست سے بنائی گئی ہیں کہ اس سے متاثر ہو کر سرسید احمد خاں نے یہ الفاظ لکھے تھے: "پانی کا گرنا اور اس حجاب آب میں سے گل بوٹوں کا لہراتا ہوا دکھائی دینا ایک عالم طلسمات ہے"۔[۳۱]

دیوان خاص کو شاہ محل بھی کہا جاتا تھا۔ فرگوسن کا خیال ہے کہ "اگر یہ عمارت شاہجہاں کی تمام عمارتوں میں حسین ترین نہیں تو سب سے زیادہ مزین یقیناً ہے۔ یہ نسبتاً دہلی اور آگرہ کے مقابلہ میں آرائش میں یقیناً زیادہ تونگر ہے۔ ہاں وضع اور بناوٹ میں اتنی خوش منظر نہیں ہے۔"[۳۲] اس ہال کی چھت کے چاروں طرف یہ مشہور شعر لکھا ہوا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

جامع مسجد۔ شہر شاہجہان آباد کے اندر لیکن قلعہ معلیٰ کے باہر ایک پہاڑی پر مسجد جہاں نما یا جامع مسجد کی تعمیر ہوئی تھی۔ اس کی تکمیل ۱۶۵۰ء میں ہوئی۔[۳۳] اس کا بلند محل وقوع ایک حاکمانہ منظر پیش کرتا ہے۔ اس مقدس عمارت کا نقشہ اور خاکہ داخلی اور خارجی دونوں جہتوں سے پورے طور پر منطقی ہے۔ یہ دنیا کی ایک حسین ترین اور خوش منظر ترین مسجد اور شاہجہانی شہ کاروں میں ایک شاہکار ہے۔ سنگ سرخ کے پس منظر میں سنگ مرمر و سنگ موسیٰ کا استعمال ایک عجیب و غریب جمالیاتی اثر پیدا کرتا ہے۔ اس مسجد کے وسطی ہال کے چوتھے در پر یہ کتبہ ہے:

گر ز طاق و قبہ مقصود است جوئی نشان
ہیچ نتوان گفت غیر از کہکشان و آسمان
فرد بودے قبہ گر گردوں نبودے نیلگون
طاق بودے طاق گر جفتش نبودے کہکشان

اورنگ زیب

جو بھی اسباب ہوں، خواہ ذاتی ہوں یا سیاسی یا دونوں، سترھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تعمیراتی تخلیقات کی تعداد بہت ہی گھٹ گئی۔ ان کا معیار بھی پہلے کے مقابلہ میں بہت گرا ہوا ہے۔ جو عمارتیں اورنگ زیب کے زمانہ میں تعمیر بھی ہوئیں وہ اس کے مذہبی تصورات اور اس کی سخت مزاجی کو پورے طور پر ظاہر کرتی ہیں۔

اورنگ زیب نے ۱۶۶۲ء میں قلعہ معلیٰ کی عمارتوں میں بے داغ موتی مسجد کا اضافہ کیا۔ موتی مسجد اپنے نام کی لاج رکھنے کی پوری اہل ہے اور خوش ترین وضع کی سنگ مرمر کی ایک منتخب تعمیر ہے۔

لاہور کی جامع مسجد یا بادشاہی مسجد جس کی تعمیر ۱۶۷۴ء میں ہوئی "ایک بہت ہی عمدہ عمارت اور مغل طرز تعمیر کا جدید ترین نمونہ ہے۔"[۳۴] شہنشاہ اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ درّانی کا مقبرہ اس کے بیٹے اعظم شاہ نے ۱۶۷۸ء میں اورنگ آباد کے نسبتاً ویران شہر میں جس کو دکن کا دہلی کہنا نامناسب نہ ہوگا، تعمیر کرایا تھا۔ عمومی طور پر یہ مقبرہ فن تعمیر کے گرتے ہوئے ذوق اور روبہ انحطاط معیار کا مظہر ہے۔

خود اورنگ زیب، ایلورا غار کے ٹھیک اوپر خلد آباد کے چھوٹے پُروے میں، شیخ زین الدین کے مقبرہ کے صحن میں مدفون ہے اور اس کے ساتھ تیموری جاہ و جلال بھی فنا کی ابدی نیند سو رہا ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۹ پر)

---

۳۰ Fergusson History of Indian and Eastern Architecture, II, ۳۰۹

۳۱ آثار الصنادید۔ باب دوم صفحہ ۱۰۹ ۳۲ آثار الصنادید۔ باب دوم۔ صفحہ ۱۱

۳۳ آثار الصنادید۔ باب سوم صفحہ ۳۰

۳۴ Fergusson, II, ۳۱۱

۳۵ Fergusson, II, ۳۲۵, also see Percy Brow

راجہ نول رائے وفا

کوثر چاند پوری

نول رائے کائستھوں کے سیکسینہ چکوا اور پراستا خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اٹاوے کا باشندہ اور موروثی قانون گو تھا۔ شروع میں نول رائے راجہ رتن چند کا ملازم تھا۔ رتن چند سید عبداللہ خاں صوبۂ الہ آباد کا دیوان تھا۔ جب سید عبداللہ کے منصب اور اقتدار میں اضافہ ہوا اور وہ "بادشاہ گری" کے مرتبہ پر پہونچ گیا تو رتن چند کو "راجہ" کہا جانے لگا۔ نول رائے نے رتن چند ہی کے توسط سے ترقی کی۔ رتن چند نے ۱۷۲۰ء میں اُس پر التفات کیا۔

سیر المتاخرین کے بیان کے مطابق نول رائے ابتداً صفدر جنگ وزیر کی سرکار میں کسی معمولی ملازمت پر مامور تھا۔ پھر حسن کارکردگی اور اخلاص کی بنا پر ترقی کرکے[1] صفدر جنگ کا دیوان یعنی بخشی ہوگیا۔ یہ عروج نول رائے نے اپنی ذاتی قابلیت اور تجربہ کی بنا پر حاصل کیا ورنہ کوئی اور ملازم ترقی کے اتنے مدارج طے نہیں کرسکتا۔

احمد شاہ کے عہد حکومت میں صفدر جنگ الہ آباد اور اودھ کی صوبہ داری پر نامزد ہوا اور ۱۱۵۵ھ میں اپنی آدھی فوج نول رائے کی ماتحتی میں دے کر خود عظیم آباد چلا گیا اور بعد کو مہابت جنگ کی مہم کے پیش نظر نول رائے کو بھی طلب کیا۔ وہ صوبہ کا مناسب انتظام کرکے اپنی فوج کے ساتھ صفدر جنگ کے پاس چلا گیا۔[2]

اردو کے جن ابتدائی تذکروں میں نول رائے کا ذکر ملتا ہے ان میں انھیں راجہ نہیں لکھا گیا نہ ترقی مدارج کی جانب کوئی اشارہ کیا گیا ہے البتہ اُن کے بڑے بھائی دیوان گلاب رائے کو امیر الامرا نجیب الدولہ کا دیوان مدار المہام لکھا گیا ہے۔ اس وقت نول رائے گنگا پار کے بعض پرگنوں میں تحصیل کے کام پر متعین تھا اور عمر کے اعتبار سے جوان تھا۔[3]

میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعراء میں مخزن نکات ہی کے حوالہ سے نول رائے کا ذکر کیا ہے اور جس طرح قائم چاند پوری نے مخزن نکات میں ان کے علم و عمل، ہوش گوش اور عقل و فراست نیز لطافتِ مزاج کی تعریف کی ہے اسی طرح میر حسن نے بھی ان اوصاف میں انھیں سراہا ہے۔ میر حسن نے اتنا اور اضافہ کیا ہے کہ اُن کے چھوٹے بھائی نجیب الدولہ کے مدار المہام ہیں لیکن خود نول رائے اکتساب علم اور کتب بینی میں مصروف رہتا ہے، طبیعت کے اعتبار سے وہ دردمند اور عاشق مزاج ہے فارسی اور ریختہ دونوں میں شعر کہتا ہے۔[4]

قائم چاند پوری کا تذکرہ ۱۱۶۸ھ میں اور میر حسن کا تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان مکمل ہوا ہے اور نول رائے

سپاہی، سیاست داں اور شاعر

[1] سیر المتاخرین جلد سوم صفحہ ۸۷ [2] تاریخ اودھ۔ حصہ اول صفحہ ۹۹

[3] مخزن نکات صفحہ ۷۲ [4] تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۸۸

۔۔۔ زندہ ۔۔۔ جس صورت میں دونوں تذکرہ نگاروں
۔۔۔ موقع ۔۔۔ نول رائے کی زندگی اور حالات کے سلسلے میں
۔۔۔ ہمت اور ترقی ۔۔۔ بھی ۔۔۔
۔۔۔ میرحسن کے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔
۔۔۔ نے اپنے تذکرہ ۔۔۔ بہت پہلے سے ۔۔۔
۔۔۔ ان کے یہاں نول رائے سے متعلق بالکل ۔۔۔
۔۔۔ باتیں دستیاب ہوتی ہیں اور ان کے ۔۔۔ منصب کا بالکل
پتہ نہیں چلتا ۔۔۔ راجہ کی بجائے ۔۔۔ کا لفظ استعمال کیا
ہے۔ میرحسن نے جو کچھ لکھا ہے ۔۔۔ تذکرے کو سامنے
رکھ کر لکھی ہے یہاں ۔۔۔ منصب لکھے ہیں جو قائم
۔۔۔ میرحسن سے نول رائے کے حالات میں
۔۔۔ معتبر ۔۔۔ ہے ۔۔۔ واضح ہوتا
ہے کہ میرحسن کے ۔۔۔ ترتیب کے وقت نول رائے زندہ
تھا۔ اس صورت میں ۔۔۔ میرحسن کے ۔۔۔ کا یہ قیاس غلط
قرار پاتا ہے ۔۔۔ اور ۔۔۔ کے درمیان لکھا
گیا۔ غالباً میرحسن نے بھی اپنی کتاب کا مواد بہت پہلے جمع کرکے
رکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود اخیر نے مخزن نکات سے
استفادہ کیا ہے جو ۔۔۔ میں مرتب ہوا ہے مگر ان معلومات
۔۔۔ اضافہ نہیں کیا جو نول رائے کے متعلق انھیں مخزن نکات
سے حاصل ہوئی تھیں۔

۔۔۔ میں راجہ نول رائے کو اودھ میں اپنی
نیابت ۔۔۔ گیا۔ نول رائے نے نہایت ہوشمندی اور
مستقل مزاجی سے اس عہدے پر کام کیا۔ اس کے منہ سے جو بات
نکل جاتی تھی اسی پر جما رہتا تھا۔ مغلوں اور ہندوستانیوں میں
کوئی فرق نہ کرتا تھا اور فوج میں نمایاں اضافہ کرلیا تھا۔ چنانچہ
اس کی سرکار میں پانچ ہزار خوش اسپہ اور جواسپہ سوار ملازم تھے۔
۔۔۔ تعداد ۔۔۔ ہزار تھی۔ پیادوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ فوج

کا ہر شعبہ ماہرین فن سے بھرا ہوا تھا۔ کسی زمیندار کی سرکشی کی اطلاع
ملتے ہی وہ خود موقع پر پہونچ کر اس کی گوشمالی کرتا تھا۔ ملازمین کو
ماہوار دست بدست نقد تنخواہ تقسیم کراتا تھا۔ تحصیل میں اور بہت سی
آسانیاں کردی تھیں۔ غرض رعایا اس کے عہد میں بہت خوش تھی۔[۵۲]

صفدر جنگ نے قائم خاں بنگش کے ملک پر بھی اپنی جانب سے
نول رائے ہی کو حاکم مقرر کردیا تھا۔ نول رائے نے قنوج میں قیام
کیا تھا جو فرخ آباد سے پنتالیس میل پر واقع ہے اور صوبۂ اودھ
نیز الہ آباد کے وسط میں بھی ہے۔ وہاں وہ موتی محل میں رہتا تھا
جس کا نام تبدیل کرکے اس نے "رنگ محل" کردیا تھا۔ صفدر جنگ
نے فرخ آباد کی پوری ریاست کو خالصہ میں شامل کرلیا تھا۔ مگر شہر فرخ آباد
(جو مع بارہ مواضعات کے) عہد فرخ سیر سے افغانوں کا آل تمغا
تھا قائم خاں کی والدہ "بی بی صاحبہ" کے نام بحال رکھا گیا تھا۔

اس زمانہ میں قنوج میں چوروں اور ڈاکوؤں کا بہت زور
تھا شہر کے باشندے سرشام ہی سے اپنے گھروں کے دروازے بند
کرلیا کرتے تھے۔ نول رائے کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے دروازے
بند کرنے کی شدید مخالفت کردی اور اعلان کردیا کہ اب جو شخص دروازہ
بند کرے گا وہ مجرم قرار پائے گا۔ دوسری طرف کوتوال کو بھی سخت
ہدایت کردی گئی کہ اپنے فرائض پوری ہوشیاری اور سرگرمی سے
انجام دے۔ اس انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوری کی وارداتیں بند
ہوگئیں اور جب تک راجہ وہاں برسر اقتدار رہا کسی کا کوئی نقصان
نہیں ہوا۔[۵۳]

نول رائے نے یہ غلطی البتہ کی کہ وہاں کے پٹھانوں پر سختی شروع کردی
جس کو وہ برداشت نہیں کرسکے۔ قائم خاں کی والدہ جن کو پہلے گرفتار
کرلیا گیا تھا رہا ہوچکی تھیں۔ انھوں نے افغانوں کو اور مشتعل
کیا اور اپنے سوتیلے لڑکے احمد خاں کو جو صفدر جنگ کے رفقا میں
تھا پیغام بھیجا کہ تمہارے باپ اور اس کے ہم قوم افغانوں کی
عزت و آبرو برباد ہوچکی ہے، ایسی صورت میں تم جو کچھ کرسکتے ہو وہ
کرو۔ اسی قسم کے اشتعال انگیز پیغامات آس پاس کے پٹھانوں

---

[۵۱] تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۰۰

[۵۲] تاریخ اودھ حصہ اول صفحہ ۱۱۱ [۵۳] تاریخ اودھ حصہ اول صفحہ ۱۵۲

کو بھی بھیجے گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام طور پر نول رائے کے خلاف پٹھانوں میں برہمی پھیل گئی اور انھوں نے اُس سے لڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ نول رائے نے صفدر جنگ کو ان تمام حالات کی اطلاع دیدی۔ صفدر جنگ نے ہدایت کی کہ میرے پہنچنے تک پٹھانوں سے جنگ نہ کی جائے۔ خداگنج کے مقام پر جو قنوج سے بیس میل ہے نول رائے کا پڑاؤ تھا۔ لشکر کے گرد خندقیں کھودوی گئی تھیں اور ان پر توپیں بھی نصب کردی گئی تھیں لیکن راجہ نے اپنے فوجیوں کو لڑنے کی سخت ممانعت کردی تھی۔ صفدر جنگ نے ۲۰ شعبان ۱۱۶۳ھ کو تیس ہزار فوج اپنے ہمزلف نصیرالدین حیدر بیگ کی ماتحتی میں راجہ کی مدد کے لئے بھیجی۔ لیکن ابھی یہ کمک پہنچی نہ تھی کہ پٹھانوں نے اچانک حملہ کردیا۔ راجہ کا معمول تھا کہ پوجا کرنے سے پہلے باہر نہیں نکلتا تھا۔ اسے خبر کی گئی کہ پٹھان، سیدوں کو مار کر اندر آگئے ہیں مگر راجہ اس اطلاع کے باوجود پوجا کے لئے بیٹھ گیا۔ دوسری اطلاع پر وہ ہاتھی پر سوار ہوا اور دو تیر چلّہ میں رکھ کر بولا: "مار ور سارے کنجڑوں کو" وقت نہایت نازک تھا۔ راجہ غنیم کے نرغہ میں آچکا تھا پھر بھی دلیری کے ساتھ مقابلہ پر جما ہوا تھا۔ فیلبان نے چاہا کہ ہاتھی کو کسی طرف نکال لے جائے مگر نول رائے نے اس کی کمر پر لات مار کر ہاتھی بڑھانے کا حکم دیا۔ اسی دوران میں ایک آفریدی پٹھان نے راجہ کے گولی ماردی اور وہ چل بسا۔ بہت سے مسلمان سردار بھی راجہ کیساتھ مارے گئے۔ فیلبان نے راجہ کی لاش کو قنوج پہنچادیا۔ نواب بقاء اللہ، راجہ کے بیوی بچوں اور اس کی لاش کو لے کر پہلے محسن پور اور پھر جاجمؤ گئے جو کان پور سے چھ میل گنگا کے کنارے پر واقع ہے۔ یہاں ۱۲ رمضان ۱۱۶۳ھ مطابق ۴ اگست ۱۷۵۰ء کو راجہ کی لاش صندل کی لکڑیوں میں رکھکر جلادی گئی۔[1]

راجہ حکومت وقت کی طرف سے لڑ رہا تھا اور یہ جنگ وطن کی سالمیت ہی کے لئے تھی۔ اُس کا مقابلہ کرنیوالے باغی تھے لیکن اس کی موت پر خوشی بھی منائی گئی اور ماتم بھی کیا گیا۔ جہاں عطائی پور کے ایک بھاٹ نے انعام کے لالچ میں راجہ کو برا بھلا کہا اور اس کی موت پر اظہارِ مسرت کیا وہاں ایک مسلمان شاعر نے اسے شہیدِ وطن کی حیثیت سے بہت شاندار طریقہ پر خراج عقیدت پیش کیا۔ اس نے تاریخ وفات نظم کی جس میں راجہ کی دلیری، جانبازی اور وفاداری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نہایت اچھے انجام کی خبر دی گئی تھی۔

روان کرد خونِ یلان جو بجو
ادا کرد حقِ نمک مو بہ مو
ز یزداں رسیدند حور و ملک
بیاور بر اے نول سرخ رو
۱۱۶۳ھ

اس کے مقابلہ میں اس حریص بھاٹ بھبوتی ساکن عطائی پور پرگنہ قائم گنج کی وہ "نظم" ہے جس میں اول سے آخر تک چاپلوسی اور انعام کا لالچ کارفرما ہے اور فن سے غلط کام لینے کی کوشش میں راجہ کو پاجی تک کہہ دیا گیا ہے۔

عجب وہ صاحبِ قدرت ہے جس نے جگ سنبھارا ہے
خدا ہی پاک مولا ہے وہی پروردگارا ہے
کھڑا باندھا کمر کس کر غنیم اوپر سے لشکر
لگے اس کے عجب چکر غروری کا خمارا ہے
نول سے مردِ غازی کو نہ پوچھی بات پاجی کو
نول سے مردِ غازی کو پہونچ گولی سے مارا ہے
چلیں تیریں سناسن سے چلی گولی سنا سن سے
کٹیں بکتر جھنا جھن سے بڑی تلوار دھارا ہے
بھبوتی نام ہے میرا عطائی پور میں ڈیرا
یہی ہے مؤ کا کھیڑا سنتلے گنگا کنارا ہے

اس پر احمد خاں اس قدر خوش ہوا کہ پورا موضع عطائی پور بھبوتی کو انعام میں دے دیا۔

امدادی فوج بھیجنے کے بعد صفدر جنگ بھی دہلی سے روانہ ہوگیا تھا۔ وہ دوسری منزل ہی پر تھا کہ نول کے حادثہ کی خبر

---

[1] تاریخ اودھ حصہ اول صفحہ ۲۰۷

ملی ۔ اسے شدید صدمہ ہوا اور افسوس کے ساتھ کہا کہ راجہ نے کمک کا بھی انتظار نہ کیا۔ اگر ذرا ٹھہر جاتا تو ان دہقانوں کو کبھی فتح نصیب نہ ہوتی ۔

نول رائے صاحب اولاد تھا۔ تاریخ میں ایک جگہ پسران نول رائے کا ذکر آیا ہے مگر نام معلوم نہیں ہو سکے ۔ ظاہری اولاد کے علاوہ اس نے معنوی یادگار بھی چھوڑی ۔ چنانچہ منشی دیبی رائے اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں کہ راجہ نول رائے نے اردو اور فارسی کے دو دیوان چھوڑے تھے ۔ معلوم نہیں اب یہ کہیں ملتے ہیں یا نہیں ۔ فارسی کلام ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ اردو اشعار کا مختصر سا انتخاب جو صرف پچپن اشعار پر مشتمل ہے مخزن نکات میں موجود ہے ۔ انھیں میں سے ۲۵۔ اشعار میر حسن نے منتخب کر لئے ہیں ۔ دو شعر ایسے بھی لکھے ہیں جو مخزن نکات میں نہیں ہیں ؎

رفیق ہرزہ گو ہے دشمن جاں ملا رہزن کو ہے نالہ جرس کا

کس تیغ برق جلوہ کو دیکھا کہ اب تلک
ان بن ہے التیام سے زخمِ کہن کے تئیں

مخزن نکات کے مصنف قائم چاند پوری لکھتے ہیں : "مقبول خاطر ارباب صفا لالہ نول رائے متخلص بہ وفا جوانیست نوخاستہ بجمیع صفات آراستہ و پیراستہ ۔ جدتِ ذہن و جودتِ فہم اصابت رائے و لطافت مزاج بمرتبۂ اتم دارد "

میر حسن لکھتے ہیں : ۔ " از تذکرۂ محمد قائم چنان ظاہر گشت کہ جوانے ست نوخاستہ بہ زیورِ علم و عمل آراستہ ، ہوش و گوش و فہم و ذکا ، صاحب علم و حیا ، لطافتِ مزاجش از گل زیادہ ، مانند بلبل دل از دست دادہ " آگے چل کر میر حسن راجہ کی عاشق مزاجی اور دردمندی کی جانب بھی اشارہ کرتے ہیں : " طبع دردمند داشت عاشق مزاج بود "

ظاہر ہے کہ غزل گوئی کے لئے سوز و گداز ، رومان پسندی اور آشفتہ مزاجی سے بڑی کوئی صلاحیت نہیں ۔ غزل میں ان عناصر کے بغیر اثر اور دل نشینی کی کیفیت پیدا نہیں ہوا کرتی ۔ وفا کے بعض اشعار میں وہ چبھن موجود ہے جو اس کے " دل دردمند " ہی کی دین معلوم ہوتی ہے ۔ اُس کے کلام کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے عہد میں وہ ایک ممتاز غزل گو رہا ہوگا ۔ تذکروں میں بھی اس کے متعلق بہت اچھے خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے اپنے مقدمہ میں وفا کے یہ پانچ منتخب کئے ہیں :

حسنِ عمل پہ اپنے نہ بھول اس قدر کہ شیخ
واں کے معاملہ کی کسی کو خبر نہیں

دکھ نہ دے اس قدر وفا کے تئیں
آخرش وہ بھی جان رکھتا ہے

بس کہ اپنے انقلابِ بخت سے ڈرتے ہیں ہم
بسترِ گل پر بھی لرزاں ہی قدم دھرتے ہیں ہم

کل کا وعدہ کر لیا ہے اس نے اے محرم تو کیا
یاں تو بیتابی سے دل کی آج ہی مرتے ہیں ہم

نہ کشتی پار ہی بہہ کر گئی اپنی نہ وار آئی
ہوئے ہیں غرقِ دریا اس گھڑی جب بین دھار آئی

اب مخزن نکات میں مندرج چند شعر دیکھئے ؎

عارض پہ تمہارے یہ پسینا ہیرے کا ہے لعل پر نگینا
اس غم میں بھی اگر رہا سلامت پتھر سے بھی سخت ہے یہ سینا

کہیے کس سے دل احوال اپنا پڑا ہے یاں ہمیں جنجال اپنا
خجل ہوں ابر طوفاں بار کتنے نچوڑوں ٹک اگر رومال اپنا

ہوئے گا دل سے محو غمِ یار کب تلک
کیوں ہم نشیں یہ جاوے گا آزار کب تلک

کہنے لگا وہ سُن کے مرا نالہ و فغاں
یارب جیا کرے گا یہ بیمار کب تلک

شیخ کچھ فرق ہے تیرے ہی نظر آنے میں
ورنہ ہے ایک وہی کعبہ و بت خانے میں

کل دل کو لیا مکر گئے آج بس آپ کا اعتبار دیکھا

ہے جلوہ گر وہ ہم میں پر آلودگی سے دور
جس طرح عکس آب میں ہو ماہتاب کا

دنیا تو دل نہ آپ کو مقصود تھا ولیک
جب مل گئی یہ آنکھ میں ناچار ہو گیا

کوچہ عشق کی ہے راہ خطرناک وفا
جو قدم یاں تو رکھے یار تو ہشیاری سے

اپنی ہی چشم کے تئیں تاب نظر نہیں
ورنہ وہ آفتاب کہاں جلوہ گر نہیں

جوں اشک نہ پھر اٹھا زمیں سے
یارب میں گرا ہوں کس نظر سے

آنے کا میرے وہ سن کے چرچا
نکلا نہ تمام روز گھر سے

عشق میں امتیاز رتبہ نہیں
خاک پائے ایاز ہے محمود

گر مانگتا ہے جی کے تئیں دیجئے وفا
کیا چیز ہے کہ دوست سے انکار کیجئے

حباب آسا نہ بھول ہستی پر اپنی
کہ غافل کیا بھروسہ ہے نفس کا

ایک راہ کوئے زلف سو سربستہ اے وفا
ہم آہ کس طرف کے تئیں لیں سراغِ دل

نوبت غمِ فراق میں پہونچی ہے جاں تلک
ظالم شکیب و صبر پھر آخر کہاں تلک

دل نہ کرنا تھا اس طرح سے خراب
عاقبت وہ تیرا ٹھکانا تھا

پھول بہتے لبِ دریا جو نہ دیکھے ہوں تو آ
ساتھ آنسو کے ہیں یاں قطرۂ خوں ناب رواں

کشت اپنی نہ ہوئی سبز فلک سے گاہے
ہے وفا آٹھ پہر گو چہ دولاب رواں

عدم کے جانیے کیا جیفنا ہے عزیزاں کے
کہ کوچ اُدھر ہی کو ہے صبح و شام اپنا بھی

بیچے ہے یک نگاہ پہ دل کے تئیں وفا
لینا ہو گر تمہیں تو کچھ اتنا گراں نہیں

ایک دم تدبیرِ رفتن کی نہ ہم اے وائے جہل
عمرِ صد سالہ گنوائی فکرِ نام و ننگ میں

شعلہ زن ہے ہمیشہ داغ اپنا بجھ نہیں جانتا چراغ اپنا

یہاں تلک از خویش رفتہ ہوں کہ مدام آپ کرتا ہوں میں سراغ اپنا

ساتھ تجھ سے کی اگر مہر و وفا کی ہم نے
عفو کر عفو کہ اے شوخ خطا کی ہم نے

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۹ پر)

آزادیِ خیال کی پامالی

کرشنانند رائے

چین نے صدیوں تک بہت سے سیاسی انقلابات اور بہت سے شاہی خاندانوں اور شہنشاہوں کا عروج و زوال دیکھا ہے اور استداد زمانہ کے ساتھ انسانی قدروں اور کلچر کا خزانہ جمع کیا ہے لیکن چین کی کمیونسٹ حکومت اس کلچر کی لطافت، انسانی ہمدردی رواداری اور پختگی کو آج بے دردی کے ساتھ منظم طور سے نیست و نابود کر رہی ہے اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام زندگی لایا جا رہا ہے جس میں آزادی خیال کی کوئی گنجائش نہیں اور جس میں مٹھی بھر اناج کے لیے انسان کو اپنی خودداری کو بیچنا پڑتا ہے۔ روایتی اقدار حیات اور آزادی فکر کو سلب کر کے وہاں انسان کو جبراً ایسی تعلیم دی جا رہی ہے کہ انسان انسان نہ رہے گا بلکہ محض ایک مشینی ڈھانچہ بن کر رہ جائے گا اور اس کو اسی طرح سوچنا ہوگا جس طرح چین کی کمیونسٹ پارٹی چاہے گی اور وہی کرنا ہوگا جو چین کی کمیونسٹ پارٹی حکم دے گی۔ ذہنی تبدیلی کا یہ عمل زندگی اور کلچر تعلیم اور تفریح کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے حکومت نے انھیں اپنے پرچار کا کامیاب ذریعہ بنا لیا ہے۔

اس برصغیر کے ۷۰ کروڑ عوام کے نقطہ نظر کو زبردستی تبدیل کرنے کے لیے مختلف طریقے اپنائے گئے ہیں۔ اس کے لیے جلسے اور بحث مباحثے منعقد کیے جاتے ہیں، اجتماعی مقدمے چلائے جاتے ہیں اور لوگوں کو اجتماعی طور سے پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنا محاسبہ کریں اور اپنے عیب تلاش کریں۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کے نقطۂ نظر کے مخالفین کا پتہ لگا کر ان کی سرکوبی کی جا سکے اور بقیہ لوگوں کو حکومت کا انداز فکر اختیار کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکے۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان محض ایک کٹھ پتلی بن کر رہ جاتا ہے۔ وہاں کے حکمرانوں کو واقعی اور خیالی دشمنوں کے خلاف مہم چلانے کا خبط سا ہو گیا ہے۔ وہاں کے لوگوں کو مورچوں جلسوں اور مظاہروں میں جبراً حصہ لینا پڑتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چینی عوام کی عادتوں، رسم و رواج اور انداز فکر کے خلاف بھی اسی قسم کی مہمیں چلائی جاتی ہیں۔ وہاں کے بھولے بھالے عوام کو یہ کام یکساں طور پر لگاتار کرنا پڑتے ہیں۔ وہاں مختلف تنظیمیں، انجمنیں اور ادارے خوشامد، زور زبردستی غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے اس وقت تک برابر اپنی کوششوں میں لگے رہتے ہیں جب تک کہ ہر فرد کا جسم اور دماغ آمریت کے اصولوں کے تابع نہ ہو جائے

چین میں اسکولوں اور کالجوں کو بھی حکومت کے پروپیگنڈہ کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ چینی کمیونسٹوں کے نزدیک تعلیم کا مقصد سیاست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور اسی لیے چین کے تعلیمی نظام میں نظریاتی تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں تعلیم پر کمیونسٹ پارٹی کا پورا کنٹرول ہے۔ ابتدائی درجوں سے ہی کمیونزم کے سبق پڑھائے جاتے ہیں اور اس کے بعد مارکسزم اور لینن ازم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ قواعد کی ایک معمولی سی کتاب کو بھی اشتراکی تعلیم کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ طلبا ڈارمیٹریز (ایسا ہال جس میں بہت سے طلبا رہتے ہوں) میں

رہتے ہیں اور وہ آپس میں بھی ایک دوسرے کے خیالات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ دوسروں اور خود اپنی ذات پر تنقید کے ذریعہ فرد پر اجتماعی طور سے دباؤ ڈالا جاتا ہے اور اس طرح براہ راست جبر کے بغیر ہی لوگوں میں خیالات کی یکسانی پیدا کی جاتی ہے۔

اصولی تعلیم اور ذہنی تبدیلی کا یہ کام کمیونسٹ پارٹی کے بہت زیادہ معتبر لوگوں کے ہی سپرد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ جو خصوصی تربیت یافتہ ہوتے ہیں عوام میں گھل مل کر ان کے طرز فکر کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح دھمکی اور لالچ ترغیب اور جبر، تقریروں اور جلسوں کے ذریعہ عوام کو چین کی نئی جمہوریت اور اشتراکیت کے اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہے اور ان کو ایسا انداز فکر اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جو چینی کمیونسٹوں کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہو۔

ذہنی تبدیلی کا یہ عمل ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں جاری ہے۔ آرٹ، ادب، مصوری اور تفریح غرضیکہ سبھی شعبوں میں نئی تعلیم کی ضرورت پر زور دیا جاتا ہے۔ بہت سے کلاسیکی چینی آپیرا کو اشتراکی رنگ دینے کے لئے دوبارہ لکھا گیا ہے۔ وہاں فرصت کے اوقات میں بھی اشتراکی اصولوں کی تعلیم دی جاتی ہے بہت سے چینی جنھوں نے بیرونی ممالک میں تعلیم پائی ہے وہ سب کچھ بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں جو انھوں نے مغربی ممالک میں سیکھا ہے۔ ان لوگوں کو دوبارہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ ایسی تعلیم جو مارکسزم سے شروع ہو کر ماؤزم پر ختم ہو جاتی ہے۔

اعلی آدرشوں کو تلخ حقائق میں بدلنے اور انسانی ذہن کو اسیر کرنے کی اس کوشش نے چین میں ظلم، بیزاری اور مایوسی کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ اس نظام میں زندہ دلی اور باعزت زندگی کا کوئی مقام نہیں ہے۔ وہاں کی روزمرہ زندگی میں خوف و ہراس کا غلبہ ہے اور ہر شخص کو اپنی حفاظت کی فکر ہے۔ خوف و ہراس کے اس پس منظر میں چینی کمیونسٹ کے المیہ کو دیکھا جا سکتا ہے جہاں ایک مطلق العنان حکومت نے انسانی ذہن کو غلام بنا لیا ہے۔



ہند مسلم فن تعمیر

(بسلسلہ صفحہ ۴۹)

ہندی مسلم فن تعمیر کے یہ چند جواہرات ہیں جن کا تذکرہ کیا گیا۔ لیکن آج اکثر عمارتوں کے صحن موجود ہیں اور نہ انھیں جوڑنے والے دالان، نہ آب رواں ہے اور نہ شگفتہ باغات۔ وقت اور ارضی وسماوی آفات نے انھیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے مگر اس کے باوجود

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

راجہ نول رائے وفا

(بسلسلہ صفحہ ۴۷)

عقدہ پر عقدہ کئے چرخ نے مضبوط اگر
اک گرہ رشتۂ مقصود سے وا کی ہم نے
ڈر ہے اس وقت کا ظالم کہ بھول منہ سے
جس گھڑی روبفلک ہو کے دعا کی ہم نے

درد نے دل کے سرموئے تفاوت نہ کیا
اپنے سے کتنے ہی دارو دوا کی ہم نے

اگر وفا کا اردو یا فارسی دیوان دستیاب ہو جائے تو اُسے چھاپ کر اردو کے سرمایہ میں یقیناً اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ماں کی پکار

شجاعت علی صدیقی

جب اس نے پہلی بار سنا کہ مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے شمو نے فوج میں اپنا نام لکھوا لیا ہے تو اسے پہلے بالکل یقین نہ آیا۔ لیکن جب گھر میں بڑے زور شور سے شمو کو ٹریننگ میں بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں تو اسے یقین کرنا ہی پڑا۔ ہر وقت گم سم رہنے والا، سب سے الگ تھلگ رہنے والا شمو آخر فوج میں جا کر کیا کرے گا؟ اس میں تو بس بہت تیز طرار، زندہ دل اور جوشیلے جوانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ شمو تو ان چیزوں کی ضد ہے۔ بالکل ہی! اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی پہنچنے پر بھی اس میں وہ شوخی اور زندہ دلی نہیں آئی تھی جو اس عمر کے دوسرے لڑکوں میں ہوتی ہے۔ نہ اسے کسی کھیل سے مطلب تھا اور نہ سیر و تفریح سے۔ کالج جانا اور وہاں سے واپس آ کر اپنے کمرے میں پڑے رہنا۔ برسوں سے اس کا یہی طریقہ تھا۔ لیکن جس دن خود شمو نے اس سے اپنے انٹرویو اور اس میں کامیابی کا حال سنایا تو وہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اس کی کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ لیکن شمو سنجیدہ تھا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ آخر اسے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

"آپا میں سمجھتا ہوں کہ یہ موقع میرے لئے ہی آیا ہے۔" وہ اتنا خوش تھا جیسے اسے منہ مانگی مراد مل گئی ہو۔ "کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟ آخر آپ چپ کیوں ہیں؟"

"نہیں شمو تم ٹھیک کہتے ہو۔" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی

شمو اس وقت کسی ضروری کام سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ کتنا بدل رہا تھا۔ اس میں اتنی تیزی اور پھرتی کیسے آگئی تھی؟ وہ حیرت سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ پھر بہت دیر تک وہ اسی کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

شمو اس کا خالہ زاد بھائی تھا اس سے عمر میں چھ سات سال چھوٹا۔ خالو جان اور خالہ بی کی وفات کے بعد وہ شہر آ گیا تھا اور انہی کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ یہیں اس نے تعلیم حاصل کی تھی اور یہیں اس نے بچپن سے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ اس وقت نہ جانے کتنی باتیں اسے یاد آ رہی تھیں۔ خالہ بی کی زندگی میں ہی شمو کتنا شریر تھا۔ نچلا بیٹھنا جانتا ہی نہ تھا۔ ہر ایک سے خواہ مخواہ کی چھیڑ چھاڑ کیا کرتا تھا لیکن خالہ بی کے بعد جب وہ آ کر ہم لوگوں کے ساتھ رہنے لگا تو یہی شمو ایک دم بدل گیا۔ نہ جانے اس کی شرارتیں کہاں کھو گئیں۔ وہ بیاخاموش رہنے لگا جیسے کوئی بوڑھا اپنی عمر کی تمام بہاریں ختم کر چکا ہو اور اس کی ساری دلچسپیوں سے بے نیاز ہو گیا ہو۔ اپنے ساتھیوں کے بہت مجبور کرنے پر کبھی کبھی کسی کھیل وغیرہ میں شریک بھی ہو جاتا تو اس کا دھیان کہیں اور ہوتا۔ دل لگا کر نہ کھیلنے پر اکثر ساتھی اس پر جھنجھلا اٹھتے لیکن شمو کی پھیکی مسکراہٹ دیکھ کر ان سب کی شوخیاں بھی غائب ہو جاتیں۔ یہ پھیکی مسکراہٹ شمو کے ہونٹوں پر کچھ اس طرح بس گئی تھی کہ کبھی اسے کھل کر ہنسنے نہ دیتی۔

شمو کے بچپن کی باتیں اسے اس طرح یاد آ رہی تھیں جیسے ابھی کل ہی کی بات ہو۔ بڑی دیر تک وہ انہیں خیالات میں کھوئی رہی۔ پھر کمرے سے اٹھ کر برآمدے میں آ کھڑی ہوئی۔ دھوپ اچھی طرح پھیل گئی تھی۔ باہر چبوترے پر پڑوس کے امین میاں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور اپنے پاس کھڑے ہوئے کچھ لوگوں کو اپنے تبصرے کے ساتھ خبریں سنا رہے تھے

"ملک کو جوانوں کی ضرورت ہے۔"

"فوجی طاقت بڑھائی جائے گی۔"

"دھوکے باز چینیوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے آج پوری قوم ایک ہے۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے شمو کا مسکراتا ہوا چہرہ کھنچ آیا ان دنوں اس میں کتنی تبدیلی آ گئی تھی۔ کہاں بجھی بجھی سی آنکھیں اور ستا ہوا بے رونق سا چہرہ اور کہاں اب عزم اور حوصلوں سے جگمگاتا ہوا بارونق چہرہ!

پھر اسے خالو جان اور خالہ بی یاد آ گئیں۔

خالو جان نے زمینداری ختم ہونے کے بعد ایک بہت بڑا فارم بنا لیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ دیہات میں رہا کرتے تھے۔ شمو ان کا بڑا لاڈلا لڑکا تھا۔ اس کی امی کہا کرتی تھیں کہ خالہ بی کی شادی کے وقت خالو جان کی عمر پینتالیس سے اوپر رہی ہوگی۔ پہلے ایک لڑکا ہوا۔ وہ جاتا رہا۔ پھر ایک لڑکی ہوئی وہ بھی بچپن ہی میں گزر گئی۔ اور پھر شمو پیدا ہوا۔ شمو کوئی تین سال کا تھا کہ خالو جان بیمار پڑے۔ پہلے تو دیہات ہی میں دوا ہوتی رہی لیکن جب مرض بڑھتا ہی گیا تو شہر آکر بڑے بڑے ڈاکٹروں کا علاج شروع کیا گیا مگر فائدہ کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر ایک دن خالہ بی اور شمو کو تنہا چھوڑ کر خالو جان نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ بڑے صبر اور استقلال کے ساتھ خالہ بی نے یہ صدمہ برداشت کیا۔ انھیں شمو کے مستقبل کی فکر تھی۔ اس کی تعلیم اور تربیت کے لئے انھوں نے کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ اسی لئے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انھوں نے فارم کا کام سنبھالا اور خود ہی اس کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ خالہ بی کے لئے وہ فارم اتنا کافی تھا کہ گاؤں میں رہتے ہوئے بھی ان کے شہری ٹھاٹ باٹ تھے۔ انھوں نے اپنی انتھک کوششوں سے خالو جان کے زمانے والا رکھ رکھاؤ قائم رکھا اور اس میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیا۔

اسی طرح دن گزرتے رہے۔ شمو نے گاؤں کے جونیر ہائی اسکول سے آٹھواں درجہ نمایاں کامیابی کے ساتھ پاس کیا۔ اس وقت اس کی عمر دس گیارہ سال کی رہی ہوگی۔ اس کی کامیابی پر خالہ بی بہت خوش تھیں اور خوشی میں وہ بڑی دھوم دھام سے میلاد شریف کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ ان کے گھر کا سارا سکون مٹی میں مل گیا وہ شمو کو اعلیٰ تعلیم دلا کر ایک مثالی انسان بنانے اور اسے شاد و آباد دیکھنے کے سارے ارمان اپنے ساتھ لے کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ یہ حادثہ ایسا تھا جس کی ایک ایک بات شمو کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے شمو کی آواز ایسی ہوتی جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ اسکی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑتے اور کئی دن تک ایسا لگتا جیسے اسکے ہوش و حواس جاتے رہے ہوں۔

شمو نے اسے بتایا تھا کہ ان دنوں آس پاس کے دیہاتوں سے روزانہ ڈاکوؤں کی لوٹ کھسوٹ کی خبریں آرہی تھیں۔ جانے کتنے گھروں میں انھوں نے آگ لگا دی تھی اور کتنوں کو انھوں نے بڑی بے رحمی سے گولیوں کا نشانہ بنا دیا تھا۔ ان خبروں سے اسکے گاؤں میں بھی بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ لوگوں نے باقاعدہ کمیٹیاں بنا کر باری باری سے راتوں کو جگنا اور پہرہ دینا شروع کر دیا تھا۔ اس تیاری کی وجہ سے ڈاکوؤں نے اس کے گاؤں کا رخ نہیں کیا اور گھبرائے ہوئے لوگوں میں اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن ایک رات عشا کی نماز پڑھ کر خالہ بی اوپر والے کمرے میں ہی بیٹھی کچھ حساب کتاب دیکھ رہی تھیں اور وہ کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ نوکر چاکر بھی سردی کی وجہ سے اپنی اپنی کوٹھریوں میں دبکے ہوئے تھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا گلی کی طرف سے کچھ ڈاکو اوپر چڑھ گئے اور آہستہ آہستہ چلتے وہ خالہ بی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ انھیں دیکھتے ہی خالہ بی چلائیں ان کی چیخ کے ساتھ ہی فائر بھی ہوئے۔ شمو نے ڈر کے مارے اپنے آپ کو لحاف میں لپیٹ لیا۔ خالہ بی کی چیخ اور فائر کی آواز سے نوکر جاگ کر دوڑے۔ شور و غل سن کر گاؤں کے اور لوگ بھی مدد کے لئے شمو کے گھر کی طرف لاٹھیاں اور بندوق وغیرہ لے کر دوڑ پڑے۔ ڈاکوؤں نے اپنے آپ کو گھرا ہوا دیکھا تو اندھا دھند فائر کر کے بھاگنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے ایک گولی خالہ بی کے لگ گئی۔ فوراً انھیں اسپتال لے جانے کا انتظام کیا گیا۔ شمو بھی ان کے ساتھ تھا۔ بڑی کوششیں کی گئیں لیکن خالہ بی کو ہوش نہ آیا اور دوسرے ہی دن ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر وہ ابدی نیند سو گئیں۔ بے چارہ شمو دم بخود تھا۔ اپنی پیاری ماں کی بے پناہ محبت اور ان کے پیار سے محروم ہو گیا تھا۔ ڈاکو مال و دولت لے جانے میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن اس کی زندگی کی سب سے قیمتی چیز ختم کر گئے۔ ماں جو دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے! بے چارہ شمو اسی سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

خالہ بی کے انتقال کے بعد امی شمو کو اپنے ساتھ لے آئیں اور فارم کی دیکھ بھال اور گھر کا انتظام خالو جان کے زمانے کے ایک پرانے اور ایماندار منشی توفیق کے سپرد کر دیا گیا۔

اس حادثہ کو تقریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ لیکن شمو کے دل میں اس کا زخم اتنا گہرا لگا کہ اس کی تکلیف سے وہ اب بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ زخم پرانا ہو کر جیسے اور بھی تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ ہم سب بھائی بہنوں نے

اسے ہر طرح بہلائے رکھنے اور اس کی دلجوئی کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا لیکن شمو کی اداسی نہ گئی۔ وہ بات بات پر رنجیدہ ہو جایا کرتا تھا۔ ہمارے کانوں نے کبھی اس کا قہقہہ نہیں سنا۔ ہماری آنکھوں نے کبھی اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نہیں دیکھی جو جوان دلوں میں دھڑکنیں پیدا کر دیتی ہے۔

وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "نسیمہ آپا۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں زندہ کیوں ہوں۔ آخر میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

میں اسے سمجھاتی: "شمو تم بالکل پگلے ہو۔ نہ جانے کیا کیا سوچتے رہتے ہو۔ بالکل بیکار سی باتیں۔ اپنی تعلیم ختم کر لو پھر دیکھنا کامیابی کس طرح تمہارے قدم چومتی ہے!"

ایک عجیب سی دکھی پھیکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل جاتی اور وہ کہتا: "نہیں آپا۔ جو بیٹا اپنی ماں کی پرورش کرا پنی جان کے خوف سے کہاں میں بک جائے اور ڈاکو اس کی ماں کی زندگی ختم کر دیں اس کا جینا ہی بیکار ہے۔ وہ کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔"

یہ باتیں کرتے کرتے اس کا چہرہ ایک دم سفید ہو جاتا اور آنکھیں بھیگ جایا کرتیں۔ ہمیشہ سے اس کا یہی دستور تھا کہ یونیورسٹی سے واپسی کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلا آتا اور وہاں یا تو کوئی کتاب پڑھتا رہتا یا پھر بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوچتا رہتا۔ زندگی اور اس کی چہل پہل سے اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ جب کبھی وہ اس کے کمرے میں جاتی یا وہ خود اس کے پاس آ کر بیٹھتا تو یا تو خاموش رہ کر فرش اور دیواروں کو تاکتا رہتا یا پھر بہت ہی روکھی پھیکی اور بے جان سی باتیں کیا کرتا۔

شمو کی نہ جانے کتنی باتیں اسے یاد آتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کا کوئی تسلسل نہیں تھا۔ واقعات اس طرح ابھر رہے تھے جیسے وہ سنیما کے پردے پر ایک کے بعد دوسرا اسین دیکھ رہی ہو۔

اسے ایک اور بات یاد آئی۔ امی نے شمو کو اپنے پاس بلا کر بڑی محبت سے اس سے کہا تھا: "شمو بیٹے اپنے خالو میاں کے دوست ڈاکٹر فاروقی کو تم جانتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"ان کی لڑکی ناہید نے اس سال بی اے پاس کیا ہے۔"

"جی۔" شمو نے مختصر سا جواب دیا۔

"ناہید بڑی خوبصورت، سگھڑ اور بہت پیاری لڑکی ہے۔"

شمو خاموش بیٹھا رہا۔

امی نے اسے چپ دیکھ کر اپنی بات پوری کی۔ "میں چاہتی ہوں کہ تمہاری شادی کا پیغام وہاں بھجوا دوں۔"

امی کا خیال تھا کہ شمو شرم سے سر جھکا لے گا اور بہت آہستہ سے کہے گا: "خالہ جان جیسی آپ کی مرضی۔ آپ تو میری امی کے برابر ہیں۔" لیکن امی کا خیال غلط نکلا۔ ان کی باتیں سن کر شمو کو نہ جانے کیسی چوٹ لگی۔ جیسے اسے کسی نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے کرسی کا سہارا لے لیا جیسے وہ اس سہارے کے بغیر گر جائے گا لیکن اسی غمگین، مردہ دل اور خاموش شمو میں ایک دم سے تبدیلی آ گئی تھی۔

نعرے لگاتا ہوا اسکولی لڑکوں کا ایک بہت بڑا جلوس نکل رہا تھا۔

"جاگ اٹھا ہے ہندستان۔ جاؤ جاؤ سا ز دعان!"

"چینی غنڈو، دور ہٹو، سیفا لداخ ہمارا ہے۔"

"جو ہم سے ٹکرائے گا۔ چور چور ہو جائے گا!"

اس دن جب شمو نے آ کر کہا تھا کہ وہ ٹریننگ کے لیے جا رہا ہے تو اس کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ وہ بالکل نیا شمو تھا۔ ہنستا، کودتا اور قہقہے برساتا ہوا شمو۔ حوصلوں کی بلندی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی کشش تھی اور اس کے قدم اس طرح اٹھ رہے تھے جیسے وہ واقعی میدانِ جنگ میں ٹہل رہا ہو۔

قریب کے اسٹیشن سے آتی ہوئی کسی ٹرین کی آواز سے نسیمہ چونک پڑی...۔ کھڑ کھڑ کھڑ... اور انجن کی ایک تیز سیٹی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی اسکے خیالات اسے اس گاڑی پر لے گئے تھے جس پر گھر کے سب لوگ آج شمو کو خدا حافظ کہہ کر آئے تھے۔ اب وہ اس گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی گاڑی شمو کو بٹھائے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ اسٹیشن پر اسٹیشن چھوٹتے جا رہے ہیں۔ کھیت، باغ، ندی، نالے لہلہاتے میدان اور راہ سر زمین سب کو چھوڑتی ہوئی گاڑی بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ ایک ایک

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۶ پر)

اترپردیش شاہراہ ترقی پر

سرکاری عملہ اور فوجی ملازمت ـــــ فوجیوں کے لیے کمبل ـــــ فوجی جوانوں کی بہبودی کے لیے شہری کونسلوں کا فیصلہ ـــــ شہری علاقوں میں زمین اور عمارتوں پر ٹیکس کی تشخیص کے قواعد ـــــ صنعتی اور زرعی کاموں کے لیے بجلی کنکشن ـــــ دوکانیں کھولنے اور بند کرنے کے اوقات ـــــ غداروں کی بحالی کے اقدام ـــــ اس سال بدری ـ کیدار یاترا نہ کرنے کا مشورہ ـــــ متفرقات

ایک عام قاعدہ کے تحت ریاستی حکومت کے درجہ اول اور دوم کے ملازمین کو فوجی ملازمتوں پر جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ماتحت گزیٹیڈ افسروں کو اس کے لئے اجازت دی جا سکتی ہے۔ غیر گزیٹیڈ عملہ کو آسانی کے ساتھ فوجی ملازمتوں کے لئے درخواستیں بھیجنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

یہ ان فیصلوں میں سے چند ہیں جو ریاستی حکومت نے ان ملازمین کے سلسلہ میں کئے ہیں جو موجودہ ہنگامی حالات میں فوجی ملازمت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔

حکومت یہ محسوس کرتی ہے کہ ہنگامی حالت میں بھی بہتر نظم و نسق کی اہمیت ہوتی ہے اس لئے ایسے کیڈروں میں جن میں پہلے ہی سے ناکافی عملہ ہے تو اس میں مزید کمی نہیں کی جانا چاہئے۔

حکومت کا خیال ہے جہاں کسی ملازم کو بغیر کسی دشواری سے فوجی ملازمت پر جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور جہاں یہ سمجھا جائے کہ ملازم اپنے شہری عہدہ کے مقابلہ میں فوج میں زیادہ کارآمد ثابت ہوگا تو اس کو فوج میں جانے کی اجازت دے دینا چاہئے۔ اس طرح جن کیڈروں میں عملہ زیادہ ہے وہاں افسروں کو بغیر کسی نقصان کے فوجی خدمات کے لئے اجازت دی جا سکتی ہے۔

اترپردیش ریاستی کھادی اور دیہی صنعت بورڈ کے اون کی پیداوار کے مرکز ١٩٦٣-١٩٦٤ء کے دوران فوجیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک لاکھ کمبل سپلائی کریں گے۔ ان مرکزوں نے گزشتہ سال مسلح فوجیوں کے لئے ٧٥ ہزار کمبل تیار کئے تھے۔

بورڈ کے ایک جلسہ میں جو یہاں ودھان بھون میں ہوا۔ اون کی ترقی کے لئے فنڈ اور خام مال کو مناسب طور سے کام میں لانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ مرکزوں کے لئے اون کے حصول میں درپیش دقتوں کو دور کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس سلسلہ میں پیشگی روپیہ دیا جائے تاکہ سیزن میں اون خریدا جا سکے۔ بورڈ نے مقررہ نشانہ کو پورا کرنے کے لئے اور زیادہ کرگھے فراہم کرنے پر غور کیا۔

بورڈ نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ پہاڑی اون اسکیم کے تحت ترقی اور تجارتی سرگرمیوں کو علاحدہ کر دیا جائے اور اون کاتنے والوں کو مناسب قیمت پر اون سپلائی کیا جائے اور انھیں ان کی اجرت فوراً ادا کی جائے۔ بورڈ نے یہ محسوس کیا کہ اونی دھاگا کی موجودہ ضروریات پوری کرنے کے لئے کتائی کے اور مرکزوں کا قیام ضروری ہے۔

بورڈ نے تیل ۔ چمڑہ ۔ تاڑ گڑ ۔ دستی کاغذ ۔ چونے کا پتھر ۔ گوبر گیس ۔ کھادی ا[illegible] ن کی صنعتوں کے فروغ کیلئے ١٩٢١٠٥٩٢١١١[illegible] روپیہ کی لاگت کی مختلف اسکیموں کے لئے منظوری دی۔ گزشتہ سال ان اسکیموں کے لئے ٩٥٨ر١٨١ روپیہ دیا گیا تھا۔

اترپردیش شہری کونسل نے مردہ ۔ گمشدہ یا فوج میں کام کرنے

والے جوانوں کے خاندانوں کے بارے میں موضع وار معلومات بہم پہنچانے اور ان کی مشکلات اور ضرورتوں کا پتہ لگانے کے سلسلہ میں اتر ضلع پریشدوں کے چیرمیوں اور سولجرس۔ سیلرس اور ایرمین بورڈوں کے ضلعوں کے تمام واحدوں سے تعاون کی درخواست کی ہے۔ شہری کونسل اتر پردیش میں جوانوں کے خاندانوں کی بہبودی سے متعلق کام زیادہ منظم اور وسیع پیمانہ پر انجام دینا چاہتی ہے۔

کونسل نے جوانوں کے بچوں کے لئے کتابوں اور ان کے خاندانوں کو دواؤں کی فراہمی کے لئے ہر ضلع مجسٹریٹ کی تحویل میں ۲۰۰۰ روپیہ دیا ہے۔ کونسل ان معاملات پر بھی غور کرے گی جہاں بڑے پیمانہ پر امداد کی ضرورت ہے۔

حکومت اتر پردیش نے یو۔ پی (شہری علاقے) زمین اور عمارت ٹیکس ایکٹ کے تحت ریاست کے شہری علاقوں میں زمین اور عمارتوں پر ٹیکس کوڈ کی تشخیص کرنے کے قواعد وضع کئے ہیں ان قواعد کے مطابق "اسسمنٹ اتھارٹی" کو جو ایکٹ کے تحت مقرر کی گئی ہے ٹیکس کی تشخیص کی عارضی فہرستیں تیار اور شائع کرنے۔ عذرداریاں طلب کرنے اور تشخیص کو قطعی کرنے کے اختیارات دئے گئے ہیں۔

ان قواعد کے تحت عارضی تشخیص کی فہرستیں تیار کرنے میں ان فہرستوں کو کام میں لایا جائے گا جو شہری علاقوں میں لوکل اتھارٹیز نے تیار کی ہیں جن میں تشخیص شدہ زمین اور عمارتیں اور ان کی سالانہ مالیت کی تفصیلات دی گئی ہیں لیکن ریاستی حکومت کی "اسسمنٹ اتھارٹی" ان فہرستوں کو از سر نو تیار کرا سکتی ہے۔ ان فہرستوں کی تیاری کے لئے "اسسمنٹ اتھارٹی" اپنے زیر اختیار علاقہ کو سب ڈویژنوں میں تقسیم کر سکتی ہے۔

کسی عمارت میں اگر ایک سے زیادہ حصے ہیں اور ان کا مالک ایک ہی ہے تو اگر مالک مکان چاہے تو عارضی تشخیص کی فہرست تیار کرنے کے وقت مکان کے ہر علاحدہ حصہ کو جس کا راستہ بھی علاحدہ ہو الگ مکان سمجھا جا سکتا ہے بشرطیکہ ایسا کرنے سے کسی حصہ کی تشخیص مالیت ٹیکس کی مقررہ کم سے کم حد سے کم نہ ہو جائے۔

کسی عمارت میں اگر ایک سے زیادہ حصے ہوں لیکن ان کے مالک مختلف ہوں تو ایسے ہر حصہ کو اس صورت میں علاحدہ عمارت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ اس کی جداگانہ ملکیت کے بارے میں تسلی بخش ثبوت یعنی عدالت کی ڈگری یا رجسٹری شدہ دستاویز بہم پہنچایا جائے

اتر پردیش میں چھوٹی صنعتوں کی ترقی اور غذائی پیداوار میں اضافہ کرنے کی فوری ضرورت کے پیش نظر ریاستی حکومت نے صنعتی اور زراعتی کاموں کے لئے بجلی کے کنکشن کی منظوری میں آسانیاں دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

موجودہ ہنگامی حالت سے جو صورت حال پیدا ہوئی ہے اس کا جائزہ لینے کے بعد حکومت اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اگر اتر پردیش میں بجلی پیدا کرنے کی تمام مشینیں چلائی جائیں تو اتر پردیش کی صنعتی اور زراعتی ترقی کے لئے کچھ اور بجلی مل سکے گی۔

لہذا حکومت نے اپنے اس حکم کو منسوخ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کے مطابق صنعتی کاموں کے لئے انفرادی معاملوں میں ۲۵ ہارس پاور تک بجلی منظور کرنے کے لئے کچھ ضلع مجسٹریٹ کو دئے گئے اختیارات واپس لے لئے گئے تھے۔

ان ضلع مجسٹریٹوں کو صنعتی کاموں کے لئے ہر انفرادی معاملہ میں ۲۵ ہارس پاور اور نجی ٹیوب ویل کے لئے ۱۰ ہارس پاور تک بجلی کنکشن منظور کرنے کے لئے پھر سے اختیارات دیدئے گئے ہیں۔ لیکن وہ ہر ضلع کے لئے بجلی منظور کرنے کی جو انتہائی حد مقرر کی گئی ہے اس سے زیادہ بجلی نہیں منظور کر سکیں گے۔ بجلی کی انتہائی حد کی ضلع وار تفصیل درج ذیل ہے۔

میرٹھ ۔ ۱۰۰۰ ہزار کیلوواٹ مظفر نگر ۔ ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ علی گڑھ ۱۰۰۰ کیلوواٹ ۔ بلند شہر ۔ ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ مراد آباد ۱۰۰۰ کیلوواٹ دہرہ دون ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ سہارنپور ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ متھرا ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ مین پوری ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ ایٹہ ۵۰۰ کیلوواٹ بجنور ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ بدایوں ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ رام پور ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ شاہجہانپور ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ پیلی بھیت ۵۰۰ کیلوواٹ ۔ فرخ آباد

.. ۵ کیلوواٹ۔ اٹاوہ .. ۵ کیلوواٹ۔ الموڑا .. ۵ کیلوواٹ۔ نینی تال .. ۵ کیلوواٹ۔ ہردوئی .. ۵ کیلوواٹ۔ لکھیم پور کھیری .. ۵ کیلوواٹ۔ سیتاپور .. ۵ کیلوواٹ۔ الہ آباد ... ۲ کیلوواٹ۔ وارانسی ... ۲۰ کیلوواٹ آگرہ ... ۱ کیلوواٹ اور بریلی ... ۱ کیلوواٹ۔

الہ آباد اور وارانسی کے معاملہ میں یہ حد ان علاقوں کے لئے مقرر کی گئی ہے جن کو مقامی بجلی کمپنیاں بجلی سپلائی کرتی ہیں اور آگرہ اور بریلی کے معاملہ میں ان علاقوں کے لئے ہے جن کو ریاستی بجلی بورڈ سے بجلی ملتی ہے۔

دکانوں اور تجارتی اداروں کے قواعد ۱۹۶۲ء کے تحت اترپردیش میں تمام دکانیں اور تجارتی ادارے صبح دس بجے کھلیں گے اور شام کو آٹھ بجے بند ہو جائیں گے۔ اس قاعدہ کے تحت اب پورے سال بھر دکانوں کے کام کرنے کے اوقات دس گھنٹے رہیں گے۔ اس سے پہلے یہ اوقات گرمی میں ۱۵ اور جاڑے میں ۱۲ گھنٹے تھے۔

ایسی دکانیں جو غلہ منڈیوں میں واقع ہیں اور اناج دال اور تلہن کا تھوک بیوپار کرتی ہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہوں گی۔ یہ دکانیں صبح ۶ بجے کے بعد کسی وقت بھی کھولی جا سکیں گی۔

قواعد کے تحت دکانوں کے ملازمین کے لیے ہفتہ وار تعطیل کے علاوہ چار عام تعطیلات یعنی ہولی پریوا، مہاتما گاندھی کا جنم دن، دیوالی پریوا اور کارتک پورنیما مقرر کی گئی ہیں۔ علاوہ ازیں قواعد میں یہ تفصیل بھی دی گئی ہے کہ خواتین ملازمین کو کس شرح سے زچگی کی مراعات دی جائیں۔ یہ مراعات ایک روپیہ یومیہ یا روزانہ اجرت کا اوسط، ان میں سے جو بھی زیادہ ہو کی شرح سے دی جائیں گی۔ یہ ادائیگی زچگی کے چھ ہفتہ پہلے اور اس کے چھ ہفتہ بعد تک کی جائے گی۔

دکانوں کے نئے قانون کے مطابق جس کے تحت یہ قواعد بنائے گئے ہیں خواتین ملازمین کو کچھ اور مراعات دی گئی ہیں ان کے لیے رات میں کام کرنا ممنوع قرار دے دیا گیا ہے اور خاتون ملازم کو باقاعدہ وقفوں کے ساتھ آرام کرنے کے علاوہ اپنے بچہ کی دیکھ بھال کے لیے آدھ آدھ گھنٹہ کے لیے دو بار چھٹی ملے گی۔

نئے قانون کے تحت جو گزشتہ دسمبر میں نافذ ہوا ہے پہلے جرم کے لیے جرمانہ کی رقم ۵۰ روپیہ سے بڑھا کر ۱۰۰ روپیہ اور قید کی مدت چھ مہینہ سے بڑھا کر ایک سال کر دی گئی ہے۔

وزیر محنت شریمتی سوچیتا کرپلانی نے ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں ایک سوال کے جواب میں کہا سونا کنٹرول آرڈر کی وجہ سے سناروں میں جو بیروزگاری پیدا ہو گئی ہے اس پر حکومت کو تشویش ہے اور وہ متاثر افراد کی بحالی کے لیے ہر ممکن اقدام کر رہی ہے۔

شریمتی کرپلانی نے مزید بتایا کہ روزگار دفتروں سے کہا گیا ہے کہ وہ متاثر سناروں کو روزگار دلانے کے معاملہ کو اولیت دیں۔ علاوہ ازیں سناروں کو صنعتی امداد باہمی انجمنیں یا چھوٹی صنعتیں قائم کرنے میں مدد دینے کے سوال پر بھی غور کیا جا رہا ہے اور تکنیکی تربیت کے اداروں میں داخلہ کے سلسلہ میں سناروں کے بچوں کو اولیت دی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سناروں کے بچوں کو محکمہ تعلیم کے ذریعہ تعلیم دوسری سہولتیں بھی بہم پہنچائی جا رہی ہیں۔

ضمنی سوالوں کے جواب میں شریمتی کرپلانی نے کہا کہ اترپردیش میں ایسے سناروں کے اعداد و شمار اکٹھا کیے جا رہے ہیں جو سونا کنٹرول آرڈر سے متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسے سناروں کی تعداد ۱۰۰۰ ہے جنھوں نے کانپور روزگار دفتروں میں اپنے نام درج کرائے ہیں۔

حکومت نے اس سال گزشتہ سال کے تجربات اور موجودہ صورت حال کی روشنی میں بدری ناتھ اور کیدارناتھ کی یاترا کے سوال پر دوبارہ غور و خوض کیا ہے۔

رشی کیش سے جوشی مٹھ ہو کر بدری ناتھ کو جانے والا موٹر کا راستہ بہت لمبا ہے۔ یہ راستہ یک طرفہ سواریوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس راستہ پر موٹر گاڑیاں بہت دھیرے دھیرے چلتی ہیں۔ یاترا کے زمانہ میں ٹریفک رک جانے، پہاڑوں کے کھسکنے اور موٹر گاڑیوں کی کمی کی وجہ سے مسافروں کو اکثر پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

سڑکوں کو سنہ ۱۹۶۱ء میں چوڑا کرنے اور ان کو بہتر بنانے کی بھرپور کوششیں شروع کی گئیں۔ پہاڑوں میں کام کا سیزن بہت مختصر ہوتا ہے۔ اس لیے سڑکوں کو چوڑا کرنے اور ان کو بہتر بنانے کے کام کو گرمی کے مہینوں میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کام میں جو بھاری مشینیں استعمال کی جا رہی ہیں ان سے ادبھی رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں یاترا کے زمانہ میں جو افسوس ناک حادثے ہوئے تھے وہ خوش قسمتی سے سنہ ۱۹۶۲ء کے یاترا سیزن میں نہیں ہوئے تاہم اس کام کو جلد از جلد پورا کرنا اشد ضروری ہے۔ لہٰذا یاتریوں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۹۶۳ء میں بدری ناتھ کے لیے اپنا سفر ملتوی کر دیں۔

مذکورہ دشواریوں کے پیش نظر یاتریوں کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ موجودہ سیزن میں بدری ناتھ کی یاترا نہ کریں۔

متفرقات

قومی ضبط و نظم کی اسکیم۔ مرکزی حکومت کی قومی ضبط و نظم اور جسمانی تربیت کی اسکیم اتر پردیش کے ہائر سیکنڈری اسکولوں میں آئندہ تعلیمی سال سے شروع کی جائے گی۔

یہ اطلاع وزیر تعلیم شری جگل کشور نے ودھان سبھا میں سوالات کے وقفہ میں دی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ریاست کے جسمانی تربیت کے انسٹرکٹروں کو ریفریشر کورس کے لیے ان مرکزوں میں بھیج دیا گیا ہے جو مرکزی حکومت نے شروع کیے ہیں۔ یہ انسٹرکٹر تین ماہ کی تربیت مکمل کرنے کے بعد اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں تربیتی پروگرام شروع کریں گے۔

یہ تربیتی مرکز پنجاب میں ننگلا اور اتر پردیش میں میرٹھ میں قائم کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ پنجاب میں ججھر اور ہماچل پردیش میں چیال میں بھی ایک ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔

کسان کو انعام۔ حکومت اتر پردیش نے کاشی پور ضلع نینی تال کے شری جے۔ این۔ بالی کو گزشتہ ربیع مہم میں فی ایکڑ ۵۰ من ۱۰ سیر سے زیادہ گیہوں پیدا کرنے پر ۱۵۰۰ روپیہ کا انعام دیا ہے۔ شری بالی کی گیہوں کی فی ایکڑ پیداوار کمایوں منطقہ میں سب سے زیادہ تھی۔

ماں کی پکار

(بسلسلہ صفحہ ۵۲)

دلکش مناظر سامنے آتے ہیں لیکن شموان سب سے بے نیاز بالکل خاموش بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق ہے۔ اتنے اطمینان سے بیٹھا ہے جیسے اپنے ڈرائنگ روم میں آرام کرسی پر بیٹھا ہو۔ ڈبہ میں بیٹھے دوسرے مسافروں کی باتیں بھی اسے متوجہ نہ کر سکیں۔ اس کے کانوں میں ایک چیخ گونج رہی ہے۔ یہ اس کی ماں کی چیخ ہے جو ڈاکوؤں سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ اپنی نیم وا آنکھوں سے وہ دیکھ رہا ہے جیسے اس کی ماں سفید کپڑے پہنے سرحد پر کھڑی ہیں۔ چینی ڈاکو ان کی طرف بڑھ رہے ہیں اور وہ اسے پکار رہی ہیں۔

"شمو بیٹے مجھے بچاؤ"۔

شمو نے پلیٹ فارم پر کہا تھا: "نسیمہ آپا۔ میرا ٹرینگ کا پیریڈ بڑی مشکل سے کٹے گا۔ میرا دل سرحد پر پہنچنے کے لیے بے چین ہے۔ ماں مجھے پکار رہی ہے۔ میں اپنی جان دے کر اپنی ماں کی عزت بچاؤں گا"۔

نیچے لڑکے نعرے لگا رہے تھے:

"جو ہم سے ٹکرائے گا۔ چور چور ہو جائے گا"۔

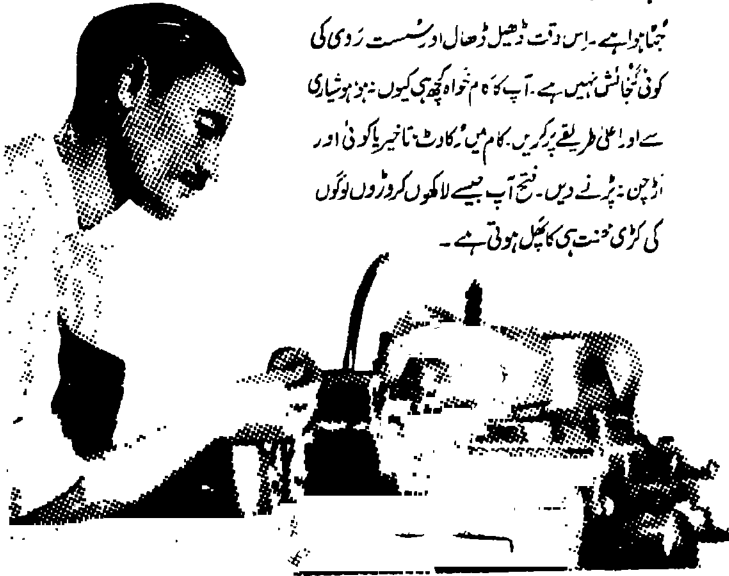
"چینی غنڈو دور ہٹو۔ نیفا اور لداخ ہمارا ہے"۔

اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ان کتابوں کو دیکھنے لگی جنھیں شمو اسی کے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

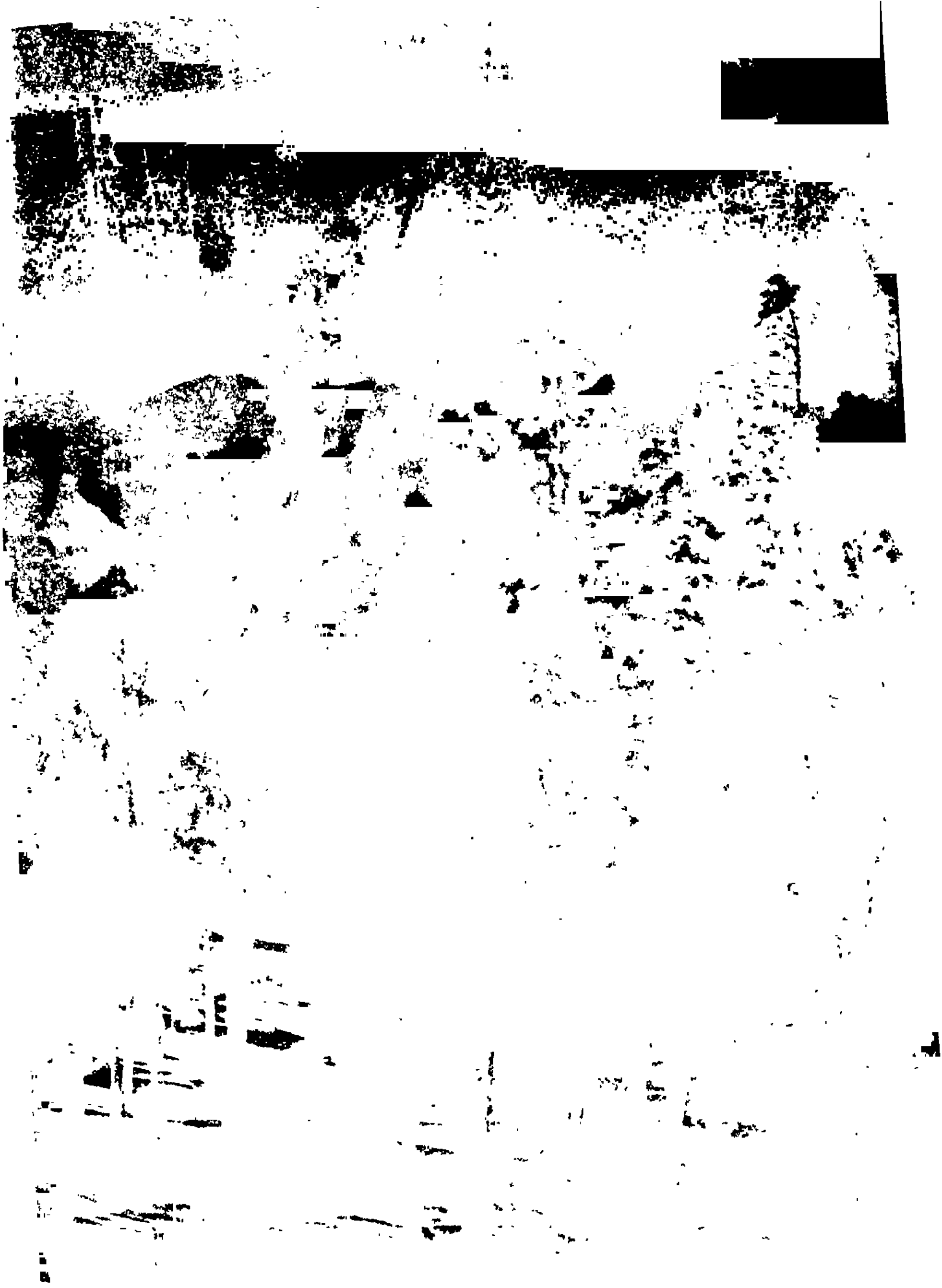
آپ چاہے کچھ بھی کیوں نہ کرتے ہوں . . . .

آپ کا کام
دیش کے لئے
کیا گیا کام ہے

آپ، آپ کا کام، آپ کی زندگی، سبھی کچھ اس بھارت کا حصہ ہے، جو آج اپنی قوت اور ہیبت بڑھانے کے لئے جی جان سے جٹا ہوا ہے۔ اس وقت ڈھیل ڈھال اور سست روی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آپ کا کام خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہوشیاری سے اور اعلیٰ طریقے پر کریں۔ کام میں رکاوٹ، تاخیر یا کوئی اور اڑچن نہ پڑنے دیں۔ فتح آپ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگوں کی کڑی محنت ہی کا پھل ہوتی ہے۔



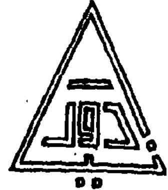
جی توڑ محنت کریں
زیادہ پیداوار اور مضبوط دفاع کے لئے



اُتردیش کے ضلع الموڑہ سے ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کا ایک منظر

نیا دور

۵۰
نئے پیسے



جلد ۱۸ | نمبر ۴

آشاڑھ ۱۸۸۵
جولائی ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
امیہ بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلیو۔ ہاج
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

ہندوستان کی شمالی سرحد پر گو اب کچھ عرصے سے باقاعدہ جنگ نہیں ہو رہی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم اپنے وطن کی حفاظت کے مسئلے سے بے پروا ہو جائیں اور ملک کو جو نئے مسائل درپیش ہو گئے ہیں ان سے بے نیازی برتنے لگیں۔ چین کا حملہ دراصل کوئی وقتی چیز نہ تھی جو ختم ہو گئی ہو۔ اس حملے نے کئی حقیقتیں ہمارے سامنے اجاگر کر دی ہیں اور ان میں سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ چین، جس کا ہم نے ہر موقع پر ساتھ دیا، جس کی ہم نے انجمن اقوام متحدہ میں تائید کی، جسے ہم نے بھائی سمجھا اور جس کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے میں ہم پیش پیش رہے، انجام کار مار آستین ثابت ہوا اور ہمیں یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا کہ چین کے حکمراں وہ "بردہ فروش" ہیں جو "مارہی ڈالیں جو یوسف برادر ہو وے۔"

دنیا میں اس وقت آزادی اور مساوات کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی آزاد ہو رہا ہے اور دنیا کے طاقت ور ترین ممالک اسے مساوی درجہ دیتے ہیں۔ رنگ و نسل کی بھی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور "سفید فام" و "سیہ فام" انسانوں کی تفریق مٹ رہی ہے۔ جو ممالک ایک دوسرے سے نظریاتی اختلاف رکھتے ہیں وہ بھی جنگ کے ذریعے اپنے مسائل کا تصفیہ نہیں کرنا چاہتے اور نہ اپنے نظریات کو تسلیم کرانے کے لیے تشدد کا استعمال مناسب سمجھتے ہیں۔ غرض تقریباً ہر ملک امن و امان کا حامی ہے، کسی دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا اور خوشی اور سکون سے اپنی اقتصادی حالت درست کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان امن پسند ممالک کی صف اول میں ہے۔ وہ نہ صرف خود صلح و آشتی کے راستے پر گامزن ہے بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اسی راہ پر چلنے کا پیغام دیتا رہتا ہے اور اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی ہے کہ ہر متنازعہ فیہ مسئلے کا حل باہمی گفت و شنید سے نکالا جائے۔ یہاں تک کہ جب بھی فضائے عالم پر خطرات کے بادل چھائے، ہندوستان نے امن کی آواز دی اور اس کی اس آواز نے اثر کا کام کیا۔ اسی طرح ہندوستان نے ہر موقع پر ہر ملک کے سامنے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ ساتھ ہی ساتھ جب کسی ملک نے کوئی غلط اقدام کیا تو اسے ٹوک دیا۔ ایک ایسا ملک جس کا یہ طریقہ اور شعار رہا ہو، یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے کوئی دشمنی پر آمادہ ہو جائے گا اور وہ بھی اس حد تک دشمنی کہ اس پر باقاعدہ حملہ کر دے۔ لیکن چین نے اس پر حملہ کر کے یہ دکھا دیا کہ آزادی اور انصاف کے اس دور میں بھی دنیا میں ایک ایسا ملک موجود ہے جسے "حکایت مہر و وفا" تو نہیں یاد ہے لیکن "قصۂ سکندر و دارا" حفظ ہے۔ دنیا سمجھتی تھی کہ "چنگیزیت" کا عہد کبھی کا ختم ہو گیا ہے مگر موجودہ چین نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ چنگیزی اور ہٹلری روایات کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہتا ہے بلکہ توسیع پسندی اور ملک گیری کی داستان میں ایک نئے خونیں باب کا اضافہ کرنے کا خواہش مند ہے۔ ہندوستان پر اس کا حملہ ہی اس مسلک کی آئینہ داری نہیں کر رہا ہے بلکہ چین کے حکمرانوں نے اپنے ملک میں جو نظام قائم کیا ہے وہ بھی بنیادی طور سے اسی حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہی نہیں کہ چین کے فرمانرواؤں نے دوسرے پرامن ملکوں کو محکوم بنانے اور اپنی قوت کا سکہ جمانے کے لیے ایک بہت بڑی فوج تیار کر لی ہے بلکہ انھوں نے چین کے سارے سماج کو ایک فوجی رنگ دے دیا ہے اور حالت یہ ہے کہ آج چین کا ہر فرد اپنی شخصی آزادی کھو بیٹھا ہے۔ چین کی فوجی مشین کا ایک پرزہ بنا ہوا ہے۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہ گئی ہے اور وہ ایک غلام سے بدتر زندگی بسر کر رہا ہے۔ لطف یہ ہے کہ چین کے حکمرانوں نے اپنے اس ملک کا نام "عوامی جمہوریہ چین" رکھا ہے۔ کیا "برعکس نہند نام زنگی کافور" کی اس سے بہتر کوئی مثال ہو سکتی ہے؟ جب ایسا بقہ ایسے پڑوسی سے پڑ گیا ہو تو ظاہر ہے کہ سرحد پر خواہ جنگ ہو یا نہ ہو، خواہ خاموشی ہو یا جوکتا رہنے اور صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنے کی ضرورت ہے اور یہ تیاری اس وقت مکمل ہو سکتی ہے جب ہماری فوجی اور اقتصادی دونوں قوتیں مضبوط ہوں۔ ہندوستان نے اپنی مدافعت کے لیے (جارحیت کے لیے نہیں) یہ تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ وہ بعض دوست ملکوں سے فوجی امداد بھی قبول کر رہا ہے لیکن اس امداد کے سلسلے میں ایک بات تو ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ "پائے مردی ہمسایہ" سے بہشت میں پہنچنا "عقوبت دوزخ" کے برابر ہے۔ کسی کے سہارے زندہ رہنا زندگی کی علامت نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنی آزادی کی حفاظت کرنا ہے تو اس کے لیے ہمیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہوگا۔ ہمیں آزادی کی دیوی کے درشن بڑی قربانیوں کے بعد نصیب ہوئے ہیں۔ توانا اور تندرست رہنے کے لیے اس دیوی کو ابھی ہمارے خون کی، ہمارے خلوص کی، ہماری محنت کی، ہمارے ایثار کی، ہماری پامردی کی، ہمارے عزم کی اور ہمارے ارادے کی ضرورت ہے۔ راہ پرخار ہی سہی لیکن وقت کا تقاضا اور وطن کی پکار ہے کہ ہم اسی صورت میں خوش رہیں۔ کبھی کبھی بعض حلقوں سے آواز آتی ہے کہ اب ہنگامی حالات کی ضرورت نہیں رہ گئی لیکن یہ حلقے یہ کہتے وقت بھول جاتے ہیں کہ چین کے قول و فعل کا کوئی اعتبار نہیں اور جب وہ ایک مرتبہ گفتگو کرتے کرتے یکایک حملہ آور ہو سکتا ہے تو دوسری مرتبہ بھی یکایک حملہ کر سکتا ہے۔ جو خبریں موصول ہوتی ہیں ان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ چین کی نیت صاف نہیں ہے۔ وزیر اعظم ہند نے حال ہی میں ایک پریس کانفرنس میں چین کی ان تیاریوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور بتایا ہے کہ تبت میں چین کے فوجی اجتماع پائے جاتے ہیں اور ایسی سڑکیں بھی بنائی گئی ہیں جن کی مدد سے چینی بہت کم وقت میں ہندوستان کے خلاف بڑی کثیر فوج اکٹھا کر سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں ہنگامی حالات ختم کر دینا خودکشی کے مترادف ہے۔ یہ ہنگامی حالات بے وجہ قائم رکھنا تو ضرور اچھا نہیں مگر جب وجہ موجود ہے اور خطرہ بدستور قائم ہے تو ان حالات کو ختم کر دینے کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔ بلکہ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہم تحفظ وطن کے لیے اور زیادہ کمربستہ ہو جائیں اور اپنے آپ کو جلد ہی اتنا طاقت ور بنا لیں کہ کوئی ہماری طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اور اگر دیکھے تو اسے دنداں شکن جواب ملے۔ ہم زمین کو روندتے ہوئے، صفوں کو چیرتے ہوئے، "بڑھے چلو، بڑھے چلو" یہ وقت کی پکار ہے۔

[illegible]

میرا وطن

میکشؔ اکبرآبادی

اوّلیں انساں کا مسکن ، اصلِ شیخ و برہمن
زیورِ ساقِ ہمالہ ، تشقۂ گنگ و جمن
حسنِ فطرت کا یہ گلشن ، میری محنت کا چمن
جنّتِ کشمیر کا تاج اور اجنتا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

ہے یہ گوتم کی اہنسا ، ہے یہی ارجن کا بان
رام و سیتا کا تقدّس ، سور و تلسی کا بیان
گاندھی اور نہرو کا دل ہے ، میر و غالب کی زبان
چشتی اور نانک کا گھر ہے ، کرشن رادھا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

میں نے جھیلے اس میں دُکھ سکھ ، میں نے کھیلے اس میں پھاگ
یہ مری برہا کا آنسو ، یہ مری خوشیوں کا راگ
میری ماں کی ماتا ہے ، میری بہنوں کا سُہاگ
میری ماں بہنوں کا ، میرے باپ دادا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

سازِ عشرت چھیڑ دیتے ہیں یہاں دیپک کا راگ
دشمنوں کے واسطے گلزار برساتے ہیں آگ
حُسن کو تلوار کر دیتا ہے شاخِ گُل کو ناگ
چاند بی بی ، لکشمی بائی کا ، رضیا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

اِس کی لَے سے کی ہے حاصل میرے بچپن نے اُمنگ
اِس کی دُھن سے پائی ہے میری جوانی نے ترنگ
حُسن نے اِس کے بھرا ہے میرے خونِ دل میں رنگ
میری لیلا ، میری سلما ، میری اُوشا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

میں نے اپنے خون سے سینچا ہے اس گلزار کو
سنبل و ریحاں سمجھتا ہوں میں اس کے خار کو
دیکھنے دوں گا نہیں اس کی طرف اغیار کو
اس وطن کو میں نہ بننے دوں گا اعدا کا وطن
یہ وطن میرا وطن
پیارا وطن

جولائی سنہ ۱۹۶۳ء

اے مرے ہندوستاں

سید صدیق حسن کاذوی

اے مرے ہندوستاں! اے کشورِ جنت نشاں
اے کہ تیری سرزمیں ہے گلستاں در گلستاں
تیری عظمت کا نگہباں یہ شمالی پاسباں
دیو پیکر، دیو قامت ہے تو یہ کوہِ گراں
اس کے سینے میں ہیں لیکن نرمیاں ہی نرمیاں
اس کی چشمِ ناز میں سوئی ہوئی ہیں بجلیاں
ایسی دل آویز اس کی تمکنت کی داستاں
جیسے دلہن کی ادائیں جیسے کیوپڈ کی کماں
رات میں تاروں کی ضو اور برف والی چوٹیاں
ہے اُفق پر کہکشاں اک اور زیرِ کہکشاں
یوں چلی آتی ہیں اتراتی یہ تیری ندیاں
چشمۂ حیواں سے جیسے لائی ہوں سیرابیاں
تیرے جھرنوں کی زباں پر ایسی میٹھی بولیاں
جیسے مطرب کا ترنم، جیسے ماں کی لوریاں
تیرے کہساروں میں ہے کچھ ایسی دلکش داستاں
جیسے مستقبل کے سپنے، جیسے منزل کے نشاں
وسعتِ دل کے لیے ہیں اک پیامِ جاوداں
تیرے میدانوں کی تا حدِ نظر پہنائیاں
مالوے کی رات ہو یا صبحِ کاشی کا سماں
ہیں یہ سب تیرے لپکتے حسن کی رعنائیاں
تیرے جلووں کے فسانے داستاں در داستاں
دل کشی جیسی یہاں ہے، دل کشی ایسی کہاں
اے حریمِ عاشقاں، اے جلوہ گاہِ مہوشاں
اے مرے ہندوستاں، اے کشورِ جنت نشاں!

اے مرے ہندوستاں، اے درد دل کے رازداں
اے رواداری کے پیکر، اے حریمِ مخلصاں
آشتی و امن جس کا آج قائل ہے جہاں
تھا ہمیشہ سے تری تعلیم کا روشن نشاں
کتنے گزرے ہیں یہاں جن کی مبارک ہستیاں
کرتی ہیں اب بھی کتابِ دل کی تفسیریں بیاں
ان وفا کیشوں کا گوتم قافلہ سالار ہے
وہ اہنسا کا پیمبر، مصدرِ امن و اماں
ہے انھیں میں مخلص عالی نظر، والا صفات
بحرِ عرفاں کا شناور نانکِ جنت مکاں
ان میں سے ہے شمعِ محبت کا وہ پروانہ کبیر
آج بھی ہے ضو فشاں گھر میں جس کا آستاں
جس پہ ہیں دونوں فدا، اہلِ حرم اور اہلِ دیر
ہے انھیں میں مقدس سرگروہِ خواجگاں
اور انھیں میں ہے محبت کے جہاں کا تاجدار
ہے نظام الدین جس کا نامِ نامی جاوداں
تا ابد ان میں رہے گا نام موہن داس کا
مسلکِ ہندوستاں کا تھا جو سچا ترجماں
وہ اخوت کا منادی، وہ محبت کا سفیر
زیر دستوں کی سپر، چارہ گرِ بے چارگاں
ہے بہار اندر بہار اب بھی انھیں کے نام سے
اتحادِ باہمی کا گلستاں بے خزاں
امنِ عالم کی ضمانت ہے یہ تیرا پنچ شیل
اے مرے ہندوستاں، اے درد دل کے رازداں

اے مرے ہندوستاں، ایثار کی روحِ رواں
صف شکن فرزند تیرے کارواں در کارواں
گو اہنسا کا رہا ہے تو ہمیشہ پاسباں
تھی مگر کس دن شجاعت کی کمی تیرے یہاں
سیکڑوں نے جسم وار جن کی روایت زندہ کی
جن کا خونِ گرم ہے تاریخ کی روحِ رواں
نام ٹیپو کا زباں پر آ رہا ہے بار بار
وہ دکن کا نام ور، وہ سرگروہِ مخلصاں

ق

جس نے توڑی فرنگی جبرِ استبداد سے
جس کی تیغ شعلہ افشاں تھی کہ برقِ بے اماں
ملک کی خاطر ہو جب بے لوث قربانی کا ذکر
نام نانا کا نہ آئے یہ بھلا ممکن کہاں
اور منگل پانڈے بیرک پور کا ہیرو جو تھا
جنگ آزادی کی جس نے ابتدا کی بے گماں

ق

خشک لکڑی ٹوٹ جاتی ہے لچک سکتی نہیں
بے لچک تھا اس کا استقلال یعنی لے جواں
اور وہ جھانسی کی رانی، وہ دھنی تلوار کی
"فخرِ مردانِ مجاہد" نازشِ ہندوستاں
احمد اللہ جو کہ فیض آباد کے فرزند تھے
صفحۂ تاریخ کی سرخی ہے جن کی داستاں
اور فضل الحق جو خیر آباد کے دل بند تھے
انڈمن میں جن کی تربت پر ہے شبنم در فشاں
تھا بھگت سنگھ ان جواں مردوں میں اور اشفاق بھی
کارنامے ان کے ہیں تاریخ کے روشن نشاں
ان سبھوں نے تیرے قدموں پہ نچھاور کی ہے جاں
اے مرے ہندوستاں، ایثار کی روحِ رواں

اے مرے ہندوستاں، اے پیکرِ عزمِ جواں
تیرے مستحکم ارادے جیسے اک کوہِ گراں
ایک تاریخی حقیقت، اک درخشاں یادگار
رسم جو برسے یہیں کی، اس کا ثانی ہے کہاں
وہ مبارک خاک جس کا نام ہے جگدیش پور
سرفروشی کا وہاں ہے اک مقدس آستاں
بات کل کی ہے کہ جب جلیانوالہ باغ میں
عزم کا تیرے ہوا تھا ایک خونیں امتحاں
کہہ رہا ہے پیرِ کہنہ سال ڈنڈی مارچ کا
آج تک خونِ شہیداں کب ہوا ہے رائیگاں
گردشِ افلاک ٹھہری، پھول برسانے لگی
گاندھی جی کا زباں پر نام بھی آیا جہاں
اس کی جرأت اک کہاوت، اس کی ہمت اک مثال
ان کے جیون کی کہانی اک انوکھی داستاں
اور ان کے بھی علاوہ حریت کی راہ میں
کتنی بھولی منزلیں ہیں کتنے گم کردہ نشاں
لے کے اٹھارہ سو ستاون سے نوے سال تک
حق کی خاطر کیسی کیسی دی گئیں قربانیاں
تب کٹی ہے ہجر کی شب، تب ہنسی ہے صبحِ وصل
تب وطن کا دل ہوا ہے شاد کام و شادماں
کس کی ہمت ہے کہ ہم سے یہ اجالے چھین لے
کس میں طاقت ہے کہ ہم کو دے سکے تاریکیاں
گلشنِ ہندوستاں کے طائرانِ نغمہ سنج
مختلف ہیں جن کے نغمے مختلف ہیں بولیاں
وقت پڑنے پر یہ سارے عندلیبانِ چمن
گلستاں کی آن کی خاطر ہوتی ہیں ہم زباں
دیکھنا ہے اہلِ گلشن کا جو ناموس ہے
حرف آجائے نہ اس پر پھر نصیبِ دشمناں

شہیدوں کا گیت

(ایک زیرِ تصنیف منظوم ڈرامے کا، عورتوں اور مَردوں کی فوج پر مشتمل جنگی کورس)

شہاب جعفری

یہ مٹی بلوان سپاہی
اے راہی ہمراہی
اپنا لہو پہچان سپاہی
اے راہی ہمراہی

اس میں ممتا کے سُکھ ساگر، اس میں دُودھ کی دھاریں
گدرائے موسم اور اُمنگوں کی چھکارتی ڈاریں
پربت سے بھی اونچی جائے آج لہو کی تان، سپاہی
اے راہی ہمراہی

چھم چھم چھم پرچم لہرائے،
ٹھن ٹھن رن باجے
کھن کھن ہر بوند لہو کی کھنکے اور تن جاگے
مگن مگن من بھرے جھومے
ہم کھیتے دھنوان، سپاسی
اے راہی ہمراہی

ہم دھرتی کی آن کے ساتھی ـــــ ناتا بھول نہ جانا
جب جب جیت کا راگ بجانا،
میرے درد بھی گانا!
سنبھل ہو مرنے والے ساتھی کا جیون بلدان، سپاہی
اے راہی ہمراہی

قافلۂ بہار

کاظمی بانو ضیا

ہمالیہ کی بلندی سے دیکھتی ہوں میں
کہ چل پڑا ہے نیا قافلہ بہاروں کا
ہر ایک راہ میں رنگینیوں کا عالم ہے
سجا دیے ہیں سحر نے قدم قدم پہ چمن
نئی حیات کے سورج کا خیر مقدم ہے

عیاں ہے قافلے والوں سے شانِ خودداری
چمک رہی ہیں نگاہیں دمک رہی ہے جبیں
ہر ایک ذرّہ درخشاں ہے مہر و مہ کی طرح
کہ آسمان سے آنکھیں ملا رہی ہے زمیں

مجھے بہار کے اس قافلے سے اُلفت ہے
کہ بانٹتا ہے فضاؤں کو رنگ و بوئے حیات
حرم سے اس کو تعلق نہ دَیر والوں سے
مری زمین کی خاطر ہے یہ گلوں کی برات

کہاں نصیب زمانے کو ایسی یک رنگی
ہر ایک گُل ہے گلوں سے نظر ملائے ہوئے
کسی کا رنگ جدا ہے کسی کا رُوپ جدا
مگر سب ایک ہی خوشبو میں ہیں نہائے ہوئے

حیات جاگ اُٹھی ہے مرے گلستاں کی
کسی ہوا سے بھی سر اس کا جھک نہیں سکتا
سموم راہ میں حائل ہو یا خزاں لُوٹے
یہ کاروانِ تمنا ہے رُک نہیں سکتا

ہمالیہ کی بلندی سے دیکھتی ہوں میں

ہندوستان

زیدی جعفر رضا

یہ وہ ہندوستاں ہے کہ "جنت نشاں" اس کو کہتا ہے سارا جہاں دوستو
نوعِ انساں نے دُنیا میں پہلے پہل آنکھ کھولی ہے آکر یہاں دوستو

خم پہ خم جام پر جام دیتی ہوئی، کیف میں ڈوبی ڈوبی سی شامِ اودھ
زندگی کے معرّ گیت گاتی ہوئی صبح کاشی کی رعنائیاں دوستو

بھیگی بھیگی دکن کی یہ راتیں جواں جیسے گھنگرالے گیسو ہوں گھنشام کے
رقص کرتے اجنتا کے یہ شوخ بُت جیسے رادھا کی انگڑائیاں دوستو

رنگ کے نِت نئے، روپ کے خوش نما پھول خوشبو لٹاتے ہوئے
مسکراتا ہوا، دل لُبھاتا ہوا، مہکا مہکا ہوا گلستاں دوستو

پیکرِ حسن بن کر تھرکتی ہوئی، جیسے جنت سے حوریں اُتر آئی ہوں
دوش پر لے کے گاگر مچلتی ہوئی پنگھٹوں کی یہ پنہاریاں دوستو

لہلہاتی ہوئی فصل کی گود میں یہ کسانوں کی الھڑ جواں لڑکیاں
جس طرح نیلے آکاش میں ہو سجی چاند تاروں کی دل کش دکاں دوستو

رام و گوتم کے جیسے مقدس پُرش جنم لیتے رہے ہیں برابر یہاں
مرکزِ علم و تہذیب ہے آج بھی خطۂ پاکِ امن و اماں دوستو

ہاتھ میں حق پسندی کا پرچم لیے، ولولے، حوصلے عزمِ محکم لیے
سوئے منزل مچلتا ہوا شان سے قافلہ امن کا ہے رواں دوستو

حق و باطل کی جنگیں ہوئیں جب کبھی پاک دھرتی کے آنچل کی آغوش میں
صبر کی تیغ چمکی اس انداز سے اُڑ گئیں ظلم کی دھجیاں دوستو

نور کی چادریں ہر طرف ہیں بچھی ظلمتوں کا بسیرا کہیں بھی نہیں
پی کے سرشار ہیں جامِ حبِّ وطن مادرِ ہند کے نوجواں دوستو

یہ وہ ہندوستاں ہے کہ جنت نشاں اس کو کہتا ہے سارا جہاں دوستو

تصحیح: شمارہ جون ۱۹۶۲ء میں ص ۳۲ پر جو نظم شایع ہوئی ہے وہ جناب زیدی جعفر رضا کی ہے۔ غلطی سے نام سروش صدیقی چھپ گیا۔

نوائے وقت

سروش پشاوری

وطن کو کوششِ پیہم سے نیک نام کریں
نوائے وقت یہی ہے کہ مل کے کام کریں

سفر طویل ہے منزل بھی ہے کٹھن درپیش
ہم اپنے قافلے کو اور تیز گام کریں

خیال آنے نہ دیں پستیوں کا دل میں کبھی
ہم اپنے ذہنِ رسا کو فلک مقام کریں

فسردہ روحوں کو پیغامِ شادمانی دیں
غمِ حیات کے ماروں کو شادکام کریں

بھریں خیال کی وسعت شعورِ انساں میں
غبارِ بغض مٹانے کا انتظام کریں

اُڑائیں رنگِ خزاں اس کے پتے پتے سے
وطن میں جشنِ بہاراں کا اہتمام کریں

مفادِ قوم کی خاطر لگائیں بازیٔ جاں
ہے جس میں سب کی بھلائی ہم ایسے کام کریں

جو سرفروش ہیں اُن کو بٹھائیں آنکھوں پر
وفا پرستوں کا اس طور احترام کریں

کسی کو بھی نہ ہو گنجائشِ ملال کبھی
وطن کا ایسے طریقے سے انتظام کریں

پڑے نہ چہرۂ دُنیا پہ جنگ کا سایہ
قیامِ امن کی ہم کوششیں مدام کریں

مٹائیں ظلمتِ ہستی ہجر کے داغوں سے
کچھ ایسی طرح چراغاں کا اہتمام کریں

نظر نہ آئے وطن میں کوئی بھی افسردہ
مسرتوں کا بہر طور فیض عام کریں

حسین اُمیدوں کے دل کو فریب دے دے کر
غمِ حیات کی تاریک شب تمام کریں

لگائیں صفحۂ ہستی پہ مُہرِ رنگِ وفا
ہمیشہ رہنے کا دُنیا میں انتظام کریں

ہر ایک سمت نظر آئے روشنیٔ حیات
سحر کے نور سے روشن چراغِ شام کریں

نوجوانوں سے خطاب

شارق میرٹھی

اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

رہیں لب پہ آزادیوں کے ترانے
کرو یاد تم لکشمی کے فسانے
چلو اب ہمالہ کی عزت بچانے
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

وطن کا سہاگ آج لٹنے نہ پائے
چراغ اپنی عظمت کا بجھنے نہ پائے
کبھی یہ پرچم ہند جھکنے نہ پائے
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

مٹانے نہ پائے کوئی گلستاں کو
جلانے نہ پائے کوئی آشیاں کو
تمھاری ضرورت ہے ہندوستاں کو
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

جھلک اپنی عظمت کی ان کو دکھا دو
غرور اپنی ٹھوکر سے ان کا مٹا دو
ہمالے سے تم دشمنوں کو بھگا دو
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو

قسم ہے شہیدوں کے رنگیں کفن کی
قسم ہے تمھیں شانِ گنگ و جمن کی
قسم ہے تمھیں خاکِ پاکِ وطن کی
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

الورہ کی عصمت بچانی ہے تم کو
اجنتا کی عظمت بچانی ہے تم کو
ہمالہ کی رفعت بچانی ہے تم کو
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

تر و تازگی بخش دو تم چمن کو
عطا رنگ کر دو گل و یاسمن کو
تمھارا لہو چاہیے اب وطن کو
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

لٹا دو وطن پر زر و سیم و دولت
دکھا دو زمانے کو اپنی شجاعت
کٹے سر مگر جانے پائے نہ عزت
اُٹھو نوجوانو ، اُٹھو نوجوانو !
بڑھو نوجوانو ، بڑھو نوجوانو !

شیخ علی بخش بیمار

حنیف نقوی

اردو کے بعض ناقدین نے ہندوستان کی فضائے شعری کو بگاڑنے کے سلسلے میں جاگیردارانہ نظام اور درباری ماحول کو خاص طور پر مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ اور یہ خیال بڑی حد تک درست بھی ہے کیونکہ اردو ادب کو حسن و عشق کی بے بنیاد داستانوں اور ستایشِ اربابِ اقتدار کے مبالغہ آمیز مضامین کا دفتر بے معنی بنانے میں سلاطین و نوابین کی سرپرستی و حوصلہ افزائی کو کافی دخل رہا ہے۔ درباروں کی اس سرپرستی کی بدولت عشق و محبت کے پاکیزہ اقدار کے ابلاغ اور مسائلِ حیات کی ترجمانی کے بجائے رندی اور ہوسناکی اور تکلف و تصنع ہمارے ادب کی سرشت میں داخل ہوئے اور سوز و گداز، سادگی و سلاست اور حسنِ معنی کے مقابلے میں نشاط و طرب کے مضامین، مبالغہ آرائی اور الفاظ کی طلسم بندی قابلِ ترجیح قرار پائے غرضیکہ مختلف عیوب اردو شاعری کی رگ و پے میں سرایت کر گئے جن کی وجہ سے وہ آج تک بدنام ہے۔ لیکن جب ہم اسی ماحول کے اثرات پر ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو اس حقیقت کا اعتراف بھی ناگزیر ہو جاتا ہے کہ اگر اس دور کے ادب کو جو کہ موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے ایک بیش قیمت تاریخی و تہذیبی ورثے کی حیثیت رکھتا ہے، یہ سہارے نہ ملتے تو شاید ہمارے اظہار و بیان کے سرمایے میں بہت سے گھرانے گراں مایہ کی کمی رہ جاتی اور لسانی ذہنی ارتقا کی وہ منزل جس پر آج کے ادیب و شاعر گامزن ہیں اس قدر واضح اور روشن نہ ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ اسی ماحول نے سوداؔ، میرؔ، ناسخؔ، آتشؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، انیسؔ و دبیرؔ، داغؔ اور امیرؔ جیسے فن کاروں کو جنم دیا اور پروان چڑھا کر معراجِ کمال تک پہنچایا اور اسی نظام نے شاعروں اور ادیبوں کو فکرِ معاش سے بے نیاز کر کے خدمتِ لوح و قلم کے مواقع فراہم کئے۔

دہلی و لکھنؤ مرکزی حیثیت رکھنے والے درباروں کے علاوہ ذوقِ سخن کی ترویج و تعمیم میں دیسی ریاستوں نے بھی نہایت اہم حصہ لیا۔ رام پور، بھوپال، ٹونک اور حیدرآباد ایک زمانے تک شعر و ادب کے مرکز بنے رہے۔ لیکن ادیبوں اور فن کاروں کی قدرشناسی میں جو کارنامہ رام پور نے انجام دیا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے دوسری ریاستوں کی خدمات سے کہیں زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ دلی کی بربادی کے بعد لکھنؤ بسا تھا اور جب عروسِ ادب کے لئے لکھنؤ کا ماحول سازگار نہ رہا تو رام پور ہی نے اسے اپنے آغوشِ التفات میں جگہ دی اور اس طرح دلی اور لکھنؤ کے بعد سرزمینِ ادب پر ایک نئے اسکول کی بنیاد پڑی جس کا مطمحِ نظر سابقہ اسکولوں کے ادبی رجحانات میں ہم آہنگی اور یکسانیت پیدا کرنا تھا۔

اگرچہ رام پور اسکول کا عروج خاص طور پر نواب کلب علی خاں کے عہد میں ہوا لیکن اس سے پہلے بھی وہاں بساطِ شعر و ادب دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی تھی۔ نواب یوسف علی خاں ناظمؔ خود بھی ایک خوش گو شاعر تھے اور شعر کے قدردان بھی۔ ان کے والد نواب محمد سعید خاں تو ڈپٹی کلکٹری کے زمانے ہی میں اربابِ علم و ادب کی

قدر شناسی میں وہ حیثیت حاصل کر چکے تھے جو مومن جیسے خود نگر شاعر کو دلی سے ان کے مستقر (سہسوان) تک کھینچ لائی تھی۔ رام پور کی نوابی حاصل ہو جانے کے بعد اس ذوق ادب نوازی کا رنگ اور بھی چمکا۔ چنانچہ مختلف مقامی و غیر مقامی شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ ہو کر زمزم خسروانہ سے مستفید ہوتے رہے۔ انھیں میں سے ایک شیخ علی بخش بیمار بھی ہیں۔

بیمار کی شخصیت اگرچہ محتاج تعارف نہیں لیکن تعارف تشنۂ تفصیل ضرور ہے۔ بعض تذکروں اور تاریخوں میں ان کا ذکر آگیا ہے لیکن نہایت اختصار کے ساتھ۔ پیش نظر مضمون اسی تشنگی کے ازالے کی ایک کوشش ہے۔

ولادت و وفات: بیمار سنہ ۱۲۰۴ھ میں قصبہ آنولہ مضافات بریلی میں پیدا ہوئے تعلیم و تربیت سے فراغت کے بعد کسب معاش کی خاطر لکھنؤ کا رخ کیا۔ کچھ عرصے تک وہاں قیام کر کے سنہ ۱۲۵۶ ہجری مطابق ۱۸۴۰ء میں رام پور پہنچے اور تقریباً پندرہ سال تک اس سرزمین پر شعر و ادب کی خدمت کر کے ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۱ ہجری (غالباً ۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۵۴ء) کو ستر سال کی عمر میں وفات پائی۔[1]

وطن کے سلسلے میں اختلاف: بیمار کا آبائی وطن قصبہ آنولہ ضلع بریلی تھا لیکن اکثر تذکرہ نگار اس کے خلاف بیان دیتے ہیں۔ کوئی سنبھل کو وطن قرار دیتا ہے کوئی رام پور کو اور کوئی بریلی کو۔ اختلاف بیانات کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) عبدالغفور خاں نساخ باشندۂ رام پور لکھتے ہیں۔[2]

(۲) قادر بخش صابر سنبھل کا متوطن ٹھہراتے ہیں۔[3]

(۳) جارج فانتن فرانسیسی نے لکھا ہے کہ "متوطن قدیم بریلی مگر در رام پور وطن گزید"۔[4]

(۴) امیر مینائی کے بیان کے مطابق بیمار کا وطن شہر بانس بریلی تھا۔[5]

(۵) عبداللہ خاں ضیغم نے باشندگان رام پور و بریلی سے تصدیق کے بعد بریلی کی وطنیت کے حق میں فیصلہ دیا ہے۔[6]

(۶) لالہ سری رام غالباً امیر مینائی کے اتباع میں شہر بانس بریلی کو بیمار کا وطن قرار دیتے ہیں۔[7]

(۷) نواب نور الحسن خاں کلیم رقمطراز ہیں کہ "بیمار از خاک پاک آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی است"۔[8]

(۸) نواب علی حسن خاں کا بیان ہے کہ "از مشاہیر سخنوران سنبھل ضلع مرادآباد بود"۔[9]

(۹) سید امتیاز احمد اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ "بیمار سنبھل مرادآباد کے رہنے والے تھے"۔[10]

(۱۰) راز یزدانی رام پوری کی تحریر کے مطابق "یہ خاندان سہسوان ضلع بدایوں کا رہنے والا تھا"۔[11]

ان تمام بیانات میں صرف نواب نور الحسن خاں کا یہ بیان کہ "از خاک پاک آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی است" بہ درجہ اولیٰ صحیح ہے۔ جارج فانتن، امیر مینائی، عبداللہ خاں ضیغم اور لالہ سری رام کی روایات بھی اس بنا پر کہ آنولہ ضلع بریلی ہی کا ایک حصہ ہے قرین صحت تسلیم کی جا سکتی ہیں۔ نساخ نے غالباً رام پور میں پندرہ سالہ قیام اور وفات کی وجہ سے باشندۂ رام پور لکھ دیا ہے۔ البتہ سنبھل کو وطن قرار دینے کے اسباب بعید از فہم ہیں کیونکہ نہ تو کسی تذکرے سے سنبھل میں بیمار کے کسی خاندانی تعلق کا پتہ چلتا ہے اور نہ کبھی ورود و قیام ہی کا سراغ ملتا ہے۔ اسی طرح راز صاحب کا قول بھی جیسا کہ ایک ملاقات کے دوران موصوف سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ نواب نور الحسن خاں اور نواب علی حسن خاں کے بیانات کا اختلاف سب سے زیادہ تعجب خیز ہے کیونکہ یہ دونوں تذکرہ نگار حقیقی بھائی بھی تھے اور دونوں کے تذکروں کا مقام و زمانۂ تصنیف بھی ایک ہی ہے۔

دربار رامپور تک رسائی: نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کی وفات کے بعد ان کی صاحبزادی شمسہ تاجدار وارث تخت و تاج قرار پائیں

---

[1] انتخاب یادگار ص ۲۸ [2] سخن شعرا [3] گلستان سخن ص ۱۰۳ [4] تذکرۂ شعرائے رامپور مخطوطہ رضا لائبریری ص ۱۳ [5] انتخاب یادگار ص ۷ [6] تذکرۂ یادگار ضیغم مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد ص ۲ [7] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۶۵۲ [8] طور کلیم ص ۱۹ [9] بزم سخن ص ۴ [10] ماہنامہ نگار مومن نمبر [11] راہ رو پیچھا ماحول شعر و سخن مشمولہ ماہنامہ نگار شمارہ ستمبر سنہ ۱۹۵۰ء

لیکن روہیلوں نے خاتون فرمانروا کی بالادستی قبول نہ کی، لہٰذا حکومت وقت کی جانب سے مجبوراً ۱۲ اگست ۱۸۰۱ء کو زمام سلطنت نواب غفار مرحوم کے برادر عم نواب محمد سعید خاں کے سپرد کردی گئی۔ ڈپٹی کلکٹری کے زمانے میں حکیم سعادت علی خاں آنولہ والے سے نواب صاحب کے خصوصی تعلقات ہوگئے تھے۔ چناں چہ مسند نشینی کے فوراً بعد ہی انھیں افواج ریاست کا جنرل مقرر کردیا۔ حکیم صاحب غالباً ہم وطنی کی بنا پر بیمار کو رام پور بلا لیا اور انھیں کے توسط سے وہ متوسلین ریاست میں شامل ہوگئے۔

تلمذ کا مسئلہ۔ بیمار کا عہد شباب لکھنؤ میں گزرا اور شاید وہیں وہ مصحفی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ مصحفی کا سنہ ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں انتقال ہوگیا، لکھنؤ میں اس کے بعد انھوں نے کسی سے اصلاح لی، اس سلسلے میں کوئی معتبر تاریخی شہادت نہیں ملتی۔ نیاز صاحب نے انتقاد[1] یا ملاذل میں آپ کو واضح طور پر مومن کا شاگرد لکھا ہے۔ سید امتیاز احمد نگار کے مومن نمبر میں تلامذۂ مومن کے ذیل میں بیمار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> طور کلیم، بزم سخن، خمخانۂ جاوید میں مصحفی اور غفلت کے شاگرد بتائے گئے ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کی تحقیق ہے کہ قدرت اللہ شوق کے شاگرد ہیں۔ اڈیٹر نگار نے "نظام شاہ" کے تذکرے میں انھیں مومن کا شاگرد لکھا ہے۔[2]

راز یزدانی غفلت کی شاگردی کے قائل تھے۔ وہ بیمار کو مصحفی کے تلامذہ میں بھی شامل نہیں کرتے اور اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مصحفی نے اپنے کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں کیا جب کہ بہت سے دوسرے شاگردوں کے حالات اور کلام کے نمونے قلمبند کیے ہیں۔[3]

اس اختلافی مسئلے میں جہاں تک مومن کی شاگردی کا تعلق ہے، میرے ایک استفسار کے جواب میں نیاز صاحب کا یہ ارشاد کہ "بیمار کو میں نے مومن کا شاگرد کیوں لکھا اب یہ بالکل یاد نہیں۔ غالباً یہ بات غلط ہے"[4] حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ حسرت کی تحقیق کے مطابق شوق کی شاگردی کا معاملہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے کیونکہ نہ تو کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تائید ہوتی ہے اور نہ اس کی روشنی میں کہ شوق کا انتقال ۱۲۲۴ھ / ۱۸۰۹ء میں ہوا ہے[5] جب کہ بیمار کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، یہ بات قابل یقین ہے۔ حسرت کی اصل تحریر میری نظر سے نہیں گزری اس لیے کوئی قطعی فیصلہ تو نہیں دیا جا سکتا تاہم اگر اس دعوے میں صداقت کا امکان بھی ہے تو صرف اس قدر کہ بیمار نے ابتدائے مشق کا کچھ کلام انھیں دکھا لیا ہوگا۔

مصحفی سے تلمذ پر تقریباً تمام تذکرہ نگار متفق ہیں۔ ایسی صورت میں راز صاحب کے شبہات پر اعتبار کرلینا درست نہ ہوگا کیونکہ مصحفی کے تذکروں میں بیمار کا نام نہ آنے کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ان کا پہلا تذکرہ عقد ثریا تو بیمار کی ولادت سے تقریباً پانچ سال قبل (سنہ ۱۱۹۹ھ) کی تصنیف ہے اور صرف شعرائے فارسی کے حالات و کلام سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا تذکرہ (تذکرۂ ھندی گویان) بھی اس زمانے (سنہ ۱۲۰۹ھ) تک ترتیب تالیف کے آخری مراحل طے کر چکا تھا جب کہ بیمار عمر کی پانچویں منزل سے گزر رہے تھے۔ البتہ ریاض الفصحا کی ابتدا از روئے تصریح دیباچہ سنہ ۱۲۲۱ھ میں اور اتمام حسب تحریر مصنف سنہ ۱۲۳۳ھ میں ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ اس وقت تک مصحفی اور بیمار کے درمیان استادی و شاگردی کا رشتہ ہی استوار نہ ہوا ہو یا بہ صورت دیگر بیمار کا کلام زبان و بیان کی پختگی کے اس معیار تک نہ پہنچا ہو جو مصحفی کے پیش نظر رہا ہے۔ اس تذکرے میں صرف ۲۶۴ مرحوم و موجود شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ اس وقت لکھنؤ اور مضافات لکھنؤ ہی میں ایسے شعرا کی تعداد یقیناً اس سے کہیں زیادہ ہوگی جو بالکل نظرانداز کردیے گئے ہیں۔ اب رہا غفلت ساکن رام پوری سے مشورۂ سخن کا سوال تو اس سلسلے میں گمان غالب یہ ہے کہ یہ تعلق جذبۂ اکتساب سے زیادہ سیاسی مصالح کا رہین منت رہا ہوگا۔ بیمار جس وقت رام پور پہنچے ہیں تو وہاں غفلت کا طوطی بول رہا تھا اور عام شعرا کی ایک تعداد کثیر کے علاوہ خاندان شاہی کے کئی افراد ان کے دامن تلمذ سے وابستہ تھے۔ دربار سے اپنی وابستگی کو پائندہ تر بنانے کے لیے بیمار نے بھی ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا لیکن یہ ضرور ہے کہ کہنہ مشقی کے باوجود انھیں غفلت کی دبستانی سے کافی فائدہ پہنچا۔ چنانچہ ایک قطعے میں ان کے فیضان اصلاح کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

---

[1] ص۲۲ [2] نگار شمارہ ستمبر ۱۹۵۸ء [3] مکتوب بنام راقم الحروف [4] دیباچۂ دستور الفصاحت ص۳۰

نہ صلاح جانب غفلت لے بیمار اگر ہوتی — تو کبھی بھی نہ کہتا شعر کو تجھ جیسے نادان کل

ایک دوسری غزل میں اس طرح استاد کے حضور میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:

جانتا ہے معجزہ بیمار غفلت کا سخن — کون ہے دنیا میں ایسا معتقد استاد کا

ادبی خدمات: بیمار جب رام پور پہنچے تو وہاں انھیں بوستانِ خیال کے نظم کرنے کی خدمت تفویض ہوئی۔ یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے داستانِ مذکور کی کوئی جلد نظم کی یا نہیں مگر وہ تقریباً پندرہ سال تک اسی خدمت پر مامور رہے۔ اس لئے یہ امر قرین قیاس ہے کہ کچھ جلدیں ضرور نظم کی ہوں گی۔ اس قیاس کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ رضا لائبریری رام پور میں ان کے کلام کا جو مجموعہ محفوظ ہے وہ بہت مختصر اور نامکمل ہے۔ جا بجا ردیفوں کے لئے سادہ ورق چھوٹے ہوئے ہیں۔ ایسے دور میں جب کہ غزل ہمارے ادب پر چھائی ہوئی تھی اور روز و شب شاعروں کی محفلیں جمتی رہتی تھیں، ان اوراق کا سادہ رہ جانا اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ بیمار ضرور کسی دوسرے کام میں منہمک رہے ہوں گے جس کی وجہ سے وہ روش عام کے مطابق اپنے دیوانِ غزلیات کی ردیف وار تکمیل نہ کر سکے۔ یہ کام بوستانِ خیال کا نظم کرنا ہی ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں قادر بخش صابری تو صراحت ارشاد رکھتے ہیں کہ

"کوئی جلد بوستانِ خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب اردو میں نظم کرتا تھا۔ معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا یا نہیں"[1]

لیکن لالہ سری رام کا بیان ہے کہ

"بوستانِ خیال کے کچھ حصوں کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا"[2]

بہرحال نہ تو اس ترجمے کی کوئی جلد شائع ہوئی اور نہ اب ان قلمی مسودات ہی کا کہیں پتہ چلتا ہے۔ اگر اس نظم کی تکمیل ہو جاتی تو یہ بیمار کا ایک گرانقدر کارنامہ ہوتا۔ ان کے باقیات میں اس وقت صرف "طلسم بیضا" کے نام سے ایک قدیم طرز کی داستان اور ایک مختصر سا دیوانِ غزلیات محفوظ ہے۔ اس بیاض سے پہلے کا کلام خود انھیں کے ہاتھوں دانستہ یا نادانستہ طور پر برباد ہو گیا جیسا کہ نواب علی حسن کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے۔

"چندیں دیوانِ غزلیات و قصاید فراہم آورد و پریشان ساخت"[3]

لالہ سری رام کا بیان بھی یہی ہے کہ

"کئی دیوان مرتب کئے مگر سب پریشان ہو گئے"[4]

بزم سخن کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیمار نے قصیدے بھی کافی تعداد میں کہے تھے لیکن موجودہ دیوان میں صرف ایک قصیدہ ملتا ہے۔ غزلیات اور اس قصیدے کے علاوہ اس مجموعے میں ایک نعتیہ تضمین، ایک خمسہ اور چھ رباعیاں شامل ہیں۔

رنگِ سخن: بیمار کے کلام کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداً لکھنوی رجحاناتِ شاعری کے دلدادہ تھے اور اس اسکول کے ممتاز شاعر ناسخ لکھنوی کی روش کو اپنانا چاہتے تھے لیکن شاید انھیں بہت جلد ہی اپنی غلط روی کا احساس ہو گیا اور آہستہ آہستہ اس رنگ کے نقوش مدھم ہوتے گئے۔ چنانچہ چند مخصوص غزلوں کے برعکس اکثر غزلیات میں داخلیت کا عنصر غالب ہے اور مضامین کی متانت، سنجیدگی، زبان و بیان کی سادگی و سلاست سے ہم کنار نظر آتی ہے۔ خارجی کیفیات کی ترجمانی اور صنعتوں کے استعمال میں بھی اعتدال پسندی کا رجحان کارفرما ہے۔ سطور ذیل میں بیمار کے چند ناقدین اور تذکرہ نگاروں کی رائیں نقل کی جاتی ہیں جن سے ان کے طرزِ کلام، انفرادی خصوصیات اور شاعرانہ عظمت کا اندازہ لگانے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔

(۱) امیر مینائی کا ارشاد ہے کہ "بیمار مردِ خوش فکر، خوش مذاق حسنِ کلام سے مشہور آفاق تھے"[5]

(۲) قادر بخش صابری لکھتے ہیں کہ "ان کے کلام میں الفاظ کی چستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے باہر ہے"[6]

(۳) نواب نور الحسن خاں کی رائے ہے کہ "صاحبِ زبانِ معز اور استادِ قیامت کا رامت"[7]

---

[1] گلستانِ سخن صفحہ [illegible] [2] خزانۂ جاوید جلد اول صفحہ [illegible] [3] بزم سخن صفحہ ۲۶ [4] خزانۂ جاوید جلد اول صفحہ [illegible] [5] انتخاب یادگار صفحہ [illegible] [6] گلستانِ سخن صفحہ [illegible] [7] طور کلیم صفحہ [illegible]

(۴) نواب علی حسن خاں تحریر فرماتے ہیں کہ "بیمار از طائر خیالش بالاتر از گمان است۔ قوت بیان و لطف زبان او اگر از میر و مصحفی بیش نیست، ایہم فروتر نتوان گفت کہ کمتر است۔ ہاں تقدم زبانی و تجدد زبانی چیزے دیگر است"[۸]

(۵) لالہ سری رام کا قول ہے کہ "بیمار نے طبیعت مضمون خیز اور زبان نہایت صاف و شیریں پائی تھی۔ سوز و درد کے مضامین بالخصوص نہایت موثر و دلکش پیرائے میں نظم کرتے تھے"[۹]

(۶) نیاز فتحپوری ایک مضمون میں رقم طراز ہیں کہ بیمار نہ صرف خوش گو اور پرسوز شاعر تھے بلکہ ان کے کلام میں ایک زور بھی تھا جو بہت کم نظر آتا ہے۔ ان کا ایک مطلع ہے ؎

کون پرساں ہو حالِ بسمل کا خلق منھ دیکھتی ہے قاتل کا

میرے نزدیک بیمار کا یہ شعر ان اشعار میں سے ہے جو داد سے مستغنی ہیں اور جن کی کیفیت کا بیان الفاظ سے باہر ہے[۱۰]

(۷) محمد علی خاں اثر رام پوری کی نظر میں "بیمار کا کلام پختہ اور استادانہ ہے۔ وہ مضمون آفرینی کے دلدادہ تھے۔ زبان شستہ اور صاف تھی لیکن کلام کو جا بجا صنائع بدائع سے مرصع کیا ہے اور ابہام و تلمیح سے بہت کم شعر کہے ہیں۔ البتہ جہاں زبان کے صاف شعر لکھے ہیں وہ بلاشبہ بجید دل آویز اور پسندیدہ ہیں ان کے کلام کے خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اکثر اشعار میں جو مضمون پیدا کیا ہے وہ مثالوں اور دلیلوں سے مستحکم ہے"[۱۱]

(۸) کلب علی خاں فائق رام پوری "رام پور کا ادبی مرکز" کے عنوان سے ایک مقالے میں بیمار اور ان کے دو رام پوری شاگردوں (نظام و بیمار) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان لوگوں نے پرانی راہوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ نکالا۔ زبان کی تراش خراش اور سلاست کو علمی جامہ پہنا کر واردات عشق و محبت میر نظام الدین ممنون اور جرأت کی سی کے میں ڈالے گئے۔ بیمار کا کلام مدون ہو کر سامنے نہ آسکا اور بیشتر تلف ہو گیا۔ معاصرین ان کی سحر بیانی کے معترف تھے اور انھیں طرز نو کا بانی سمجھتے تھے۔ موجودہ کلام جو ہمارے سامنے ہے، اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ غلط راستوں کو چھوڑ کر ایک نیا راستہ تلاش کر رہے تھے اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے"[۱۲]

ارباب فن کے ان تبصروں کو غور سے دیکھا جائے تو بیمار کا شاعرانہ مقام کافی بلند ہو جاتا ہے۔ اگر ایک کامیاب غزل گو کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے ممتاز اور نمایاں خصوصیات موقوف ہوں گے اس کے ذوق کی پاکیزگی، فکر کی توانائی، زبان و بیان کی قدرت، استادانہ ہمہ گانی، معنی آفرینی، زور کلام، جدت پسندی، ندرت اسلوب، نظری سادگی پر جہاں تک بیمار کے قدیم ناقدین کا تعلق ہے انھوں نے ان کے کلام میں ان تمام اجزائے ترکیبی کی نشاندہی کی ہے، بالخصوص صنف غزل میں اس وقت تک کسی شاعر کو کامیاب نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے یہاں جذبے اور تخیل کا مناسب امتزاج نہ ہو۔ بیمار کے کلام میں ان دونوں عناصر کا ایسا تال میل نظر آتا ہے جس نے ان کے اشعار میں بیکراں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ ان کی فطرت میں ایک قسم کا سوز ہے جس سے تخیل گرمی حاصل کرتا ہے اور شعر شدت اثر کا مکمل نمونہ بن جاتا ہے۔

تلامذہ: بیمار کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا۔ رام پور اور دوسرے مقامات پر ان کے بے شمار شاگرد تھے، مگر سید محمد ذکریا شاہ نظام رامپوری (متوفی ۱۲۸۹ھ)، احمد علی رسا رامپوری (متوفی ۱۳۰۳ھ) اور منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی (متوفی ۱۳۲۹ھ) کے علاوہ کوئی درجۂ استادی کو نہ پہنچا۔ تذکرۂ انتخاب یادگار میں بیمار کے تقریباً تمام رامپوری تلامذہ کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بیشتر تذکروں میں صرف نظام رامپوری یا تسلیم سہسوانی کا نام نظر آتا ہے۔ لالہ سری رام کا قول ہے کہ تلامذہ بیمار میں تسلیم سہسوانی نے درجۂ امتیاز پایا۔[۱۳] محمد علی خاں اثر رام پوری اپنے تعارفی مضمون علی بخش بیمار میں لکھتے ہیں کہ "تذکرۂ خمخانۂ جاوید

---

۸ بزم سخن صـ۲۵ ۹ خمخانۂ جاوید جلد اول صـ۱۴۶ ۱۰ انتقادیات جلد اول صـ۲ مقالہ بعنوان "نظام رامپوری" ۱۱ ماہی اردو ادب علی گڑھ
۱۲ ماہنامہ نگار لکھنؤ شمارہ مارچ ۱۹۵۲ء ۱۳ خمخانۂ جاوید جلد اول صـ۶۸۴

میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ شاعری میں اس کا مقصد معانی کا اظہار نہیں ہے بلکہ یہ کہ شاعری میں اس کے ذریعہ ابہام کی کیفیت پیدا ہو اور معانی کی مختلف صورتیں نکلتی ہوں، تو یہ حسن کلام ہے لیکن اس کے برخلاف نثر میں اگر ایک جملے میں کئی معنی ہوں تو یہ نثر کا عیب ہے۔ یہاں تو "ہے کجی عیب، مگر حسن ہے ابرو کے لئے" والی بات ہے۔ نثر میں جو بات کہی جائے وہ صاف طریقے سے کہی جائے۔ یہ اس کا اولین مطالبہ ہے۔ یہاں میں نثر اور نظم کا مقابلہ کسی کو برتر یا کمتر ثابت کرنے کے لئے نہیں کر رہا ہوں کیونکہ ان میں کمتر کوئی بھی نہیں، اور نہ ان کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ نثر کے اپنے مطالبے اور اپنے آداب ہیں اور نظم کی اپنی دنیا ہے۔ اس کی محفل کا اپنا نظم ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ادب کی شاخ ہونے کے رشتے سے دونوں کے اندر بعض ادبی خصوصیات مشترک ہیں اور ان ہی مشترکہ خصوصیات کی بنا پر اُن کی ادبی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ ادبی حقیقت نگاری کے اُصول دونوں پر حاوی ہیں اگرچہ ان کا اظہار مختلف ہوتا ہے۔ ادبی معیار، ان میں تخصیص نہیں کرتے۔ میتھیو آرنلڈ کے قول کے مطابق ادب کا معیار یہی ہے کہ ایک ایک جملے یا مصرعے میں حقیقت اس طرح بیان ہو جائے کہ ازل و ابد کی طنابیں کھنچ جائیں۔

اس لحاظ سے دونوں میں کسی کی خصوصی حیثیت نہیں ہے۔ الفاظ کی اہمیت نظم میں بھی ہوتی ہے اور نثر میں بھی لیکن نثر میں چونکہ معنی اور مفہوم کو وضاحت سے سمجھنے کا معاملہ ہے اس لئے الفاظ کی ذرا سی بے احتیاطی معنی کا خون کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک لفظ اس جملے کے ترنم اور اس کی روانی میں اضافہ کرتا ہو، جملے کی ساخت کو خوبصورت بناتا ہو لیکن اگر معنی میں ابہام پیدا ہو جائے اور بات پورے طور پر واضح نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نثر اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں انشائے لطیف کامیاب نہ ہو سکا اور وہ نثر کے بجائے شعر سے زیادہ قریب ہو گیا۔

نثر میں الفاظ اور ان کے استعمال پر بھی بڑی قدرت ہونا چاہیئے۔ یہ قدرت برسوں کی ریاضت کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر ان لفظوں کو جملوں کی لڑی میں پرونا پڑتا ہے جس طرح اچھی نثر معانی اور مطالب پر اثر انداز ہوتی ہے اسی طرح بھونڈی نثر معنی اور مطلب کو گنجلک کرتی ہے۔ اچھی نثر لکھنا مشکل کام ہے اسی لئے ہر زبان میں نثر کے صاحب اسلوب ادیبوں کی بڑی کمی ہوتی ہے۔ ادبی نثر کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ادب کے تقاضوں کو پورا کرے۔ یہاں بھی نثر کو بھرپور زندگی اور اس کے تجربوں سے سرشار کرنے کی ضرورت ہے۔ سچے جذبات ادبی نثر میں روح پھونکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کاروباری اور معلوماتی نثر میں جذبات کے بجائے خارجی حقیقتوں کو نظر کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں بات صاف، صحیح، واضح اور واقعات پر مبنی ہونا چاہیئے۔ سائنس، تاریخ، طب، فلسفہ، وغیرہ میں نثر کا حسن، اس کی جامعیت اور قطعیت میں ہے۔

ادبی نثر میں ادیب کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ ادب کے جملہ خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کہے۔ اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ بڑی مرصع زبان لکھے، اس میں شکوہ الفاظ ہو یا پوری نثر تشبیہ استعارے سے آراستہ ہو، بلکہ اس میں موضوع اور موقع کی مناسبت سے زبان اور الفاظ استعمال کئے گئے ہوں۔ یہاں مجلسی زبان بھی استعمال ہو سکتی ہے اور گھریلو بول چال بھی۔ یہاں اگر ناول میں کردار نظر آتے ہیں تو ہر کردار اپنے طبقے، اپنے مزاج اور اپنے ماحول کی مناسبت سے زبان بولتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو نثر کا درجہ نثر کے طور پر گر جائے۔ اگر کسی غنڈے کے منہ میں شرفا کی زبان دے دی جائے اور پڑھے لکھے لوگ جاہلانہ انداز میں بات کرنے لگ جائیں تو اس کی ادبی حیثیت میں فرق پڑ جائے گا۔

نثر کا تعلق اس کے موضوع سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ سفرنامے، خطوط، ڈائری، سوانح حیات، داستانیں، ناول، تنقید، فلسفہ، تاریخ، ڈرامے وغیرہ سب نثر میں لکھے جاتے ہیں لیکن اس کے مختلف انداز اور ڈھنگ ہوتے ہیں۔ ہر ایک کا انداز اپنا ہوگا۔ کسی میں نثر کا لہجہ بیانیہ ہوگا تو کہیں عالمانہ انداز میں بات کی جائے گی۔

نثر کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اس کے ذریعہ ادبی تخلیقات کی گئیں وہاں اس نے علوم انسانی کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ سائنس، فلسفہ، تاریخ، سیاست، معاشیات اور

جغرافیہ وغیرہ کی تصانیف نظم میں نہیں بلکہ نثر میں لکھی گئیں کیونکہ
نفاصت و تفصیل کے ساتھ خیالات کا اظہار اور منطقی استدلال یہ سب
چیزیں نثر ہی کے ذریعہ زیادہ ممکن ہیں۔

نثر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ادبی نثر دوسری
سادہ نثر۔

سادہ نثر کا مقصد مختلف علوم کے متعلق سادہ زبان میں اپنے
خیالات کا اظہار کرنا ہے لیکن ادبی نثر میں وہ تمام لوازمات ضروری
ہیں جو نثر کو ادب کا ایک حصہ بناتے ہیں اور ادب کے تمام مطالبات
کو پورا کرتے ہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نثر کے ادبی تخلیقات نظم کے
مقابلے میں زیادہ آسانی سے لکھے جا سکتے ہیں لیکن یہ خیال غلط ہے۔
ادبی نثر اپنے مطالب و معانی کے اظہار کے لئے وہ مخصوص اسلوب اختیار
کرتی ہے جو اس کے لئے نہ صرف موزوں ہو بلکہ پڑھنے والے کو بھی
متاثر کرے۔ یہاں نثر لکھنے والے کو اسی تخلیقی عمل سے گزرنا پڑتا
ہے جو فن کا تقاضا ہے اور یہ کام آسان نہیں۔ کیونکہ شاعر اپنے
احساسات، جذبات اور خیالات کے اظہار کے لئے جہاں الفاظ کی
مدد لیتا ہے وہاں اسے موسیقی اور ترنم وغیرہ سے بھی نسبت ہوتی ہے۔
یہاں نثر کے سلسلے میں صرف الفاظ ہی نثر لکھنے والے کی مدد کرتے ہیں اور
ان ہی کے ذریعہ اسے اپنے احساسات جذبات اور خیالات کا اظہار
کرنا پڑتا ہے۔

ہم اجمالی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اچھی نثر کے دو اہم اجزا ہیں خیال
اور بیاں۔ اگر نثر لکھنے والے ان دونوں کی طرف یکساں اور ضروری توجہ
دیں تو خارجی واقعات اور داخلی کیفیات میں ربط اور تسلسل ہوگا۔
نثر میں خیالات اور بیانات کا ربط بے حد ضروری ہے۔ نظم میں اس قسم
کا ربط نہ ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ نظم میں یہ کمی وزن اور ترنم سے پوری
ہو جاتی ہے۔ گویا وزن اور ترنم ایسی ڈور ہے جس میں الفاظ پرو دئے
گئے ہیں۔ یہ کام نثر میں صرف خیالات اور بیانات کے تسلسل سے ہی
ہو سکتا ہے۔ یہاں پر جملوں کی ساخت میں ایک منطق بھی ہوتی ہے
جو شعر کی طرح چھپی نہیں رہتی بلکہ ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں
ایک بات بھی ضروری ہے کہ نثر لکھنے والے کے سامنے خیالات واضح
ہوں یعنی وہ جو بات کہنا چاہتا ہے وہ پورے اور صاف طور پر اس کے
ذہن میں پائی جاتی ہو کیونکہ اچھی نثر اسی وقت لکھی جا سکتی ہے
جب ذہن صاف ہوتا ہے۔ اُس وقت خیالات اپنے لئے خود الفاظ
فراہم کر لیتے ہیں۔ لیکن خیالات گنجلک ہوں گے تو الفاظ کا انتخاب بھی
موزوں نہ ہوگا۔ زبان کی تعریف یہ ہے کہ وہ زندگی کا انکشاف کرے
نہ کہ اس کو چھپائے۔ اچھی نثر اس سلسلے میں ہماری مدد کرتی ہے۔ یہاں
الفاظ اپنی مخصوص نشست میں نظر آتے ہیں۔ انھیں آپ ادھر اُدھر
نہیں کر سکتے۔ ہاں خیال اور الفاظ کے درمیان میں ایک ایسا ربط
پیدا کرنے کی ضرورت ہے جہاں مطالب و معانی بھی اپنی پوری
کیفیت کے ساتھ ادا ہوں تاکہ فنی ہیئت اور اسلوب بھی حسن و خوبی
کے ساتھ سامنے آئیں۔ یہاں خیالات کو موثر بنانے کے لئے معجزات
سے کھیلنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خیالات کی صحت، رفعت اور ان
کا تسلسل ضروری ہے۔ اس طرح جملے ہی نہیں بلکہ فقرے بھی
بڑی چستی کے ساتھ سامنے آتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا جھول نظر
نہیں آتا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ نظم کی طرح نثر میں بھی ایک
آہنگ ہوتا ہے۔ مگر یہ آہنگ خاصی ریاضت کے بعد حاصل ہوتا
ہے۔ جس طرح اچھا شعر کہنا مشکل ہے اسی طرح اچھی نثر لکھنا بھی
آسان نہیں۔ اس میں بھی لکھنے والے کو اپنی شخصیت سمونی پڑتی ہے
اور زندگی کا خون دے کر اس کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ مولانا ابوالکلام
آزاد نے غبار خاطر میں ایک جگہ چڑیا کی شکل و صورت کا نقشہ کتنی
خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے کہ نظروں کے سامنے نہ صرف منظر بلکہ
اس کی ساری کیفیت پھر جاتی ہے۔

"چھریرا بدن۔ نکلی ہوئی گردن۔ مخروطی دُم اور گول گول آنکھیں۔ ایک عجیب
طرح کا بولتا ہوا بھولا پن۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں مگر نگاہیں
گویا ہوگئی ہیں۔ ہر مرتبہ گردن موڑ کے میری طرف دیکھتی بھی جاتی ہے۔ گویا
پوچھ رہی تھی کہ درد تو نہیں ہو رہا ــــ"

دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب میں ہمیں اس کے مختلف نمونے
ملتے ہیں جیسے داستان، ناول، افسانہ، انشائیہ، خطوط، سوانح حیات
وغیرہ۔ اور موجودہ زمانے میں ڈرامے بھی نثر میں لکھے جانے لگے ہیں۔

کشمیری شالوں کی کہانی — تاریخ کی زبانی

جلالی شاہ جہاں پوری

قدرت نے کشمیر کی ہمہ لالہ و گل سرزمین کو اگر ایک طرف حسین مناظر، پُرکیف و خمار آگیں ماحول اور نمو خیز و صحت بخش آب و ہوا سے نوازا ہے تو دوسری طرف ساکنانِ خطۂ گل کے تخیل کو صناعت فکر کی دولت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ دراصل، صنعت اور کشمیر دو الگ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں اور اہالیانِ کشمیر کی صناعیاں اُن کے اُس ذوقِ جمال کی نشان دہی کرتی ہیں جو اُن کو اس فردوسِ نظر اور جنت نشان خطہ میں بطور ورثہ کے ملا ہے۔ اگرچہ کشمیری مصنوعات کی تعداد ان گنت ہے لیکن جس صنعت خاص نے کشمیری صناعیوں کو شہرت دوام بخشی اُس کا نام شال ہے۔

جہاں تک کشمیری شال صنعت سازی کی قدامت کا سوال ہے، یہ کہنا کافی ہے کہ راجہ ہرش کی سوانح حیات کے مصنف "بانا" نے بھی یہاں کی خوب صورت اور نظر نواز شالوں اور اُن کے حسین و جمیل ڈیزائنوں کی دل کھول کر تعریف کی ہے لیکن تاریخ کی زبان بتاتی ہے کہ اس صنعت کی ترقی کی بنیاد تیرھویں صدی کے آغاز میں پڑی اور پندرھویں صدی میں اُن نو وارد سمرقندی صناعوں کی وجہ سے اس صنعت کو چار چاند لگ گئے جن کو سلطان زین العابدین تیموری قید و بند سے رہائی کے بعد اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مغلوں کے صنعت پناہ عہد میں کشمیری صناعیاں شباب کو پہنچیں

کشمیری شالوں کو اُن کی خوش نمائی اور نفاست کے لحاظ سے جو شہرت پہلے حاصل ہوئی آج بھی وہ اُسی شہرت کی حامل ہیں۔ چنانچہ صرف مغل سلاطین ہی کشمیری شالیں سلاطین عالم کو بطور تحفہ نہیں بھیجتے تھے بلکہ آج بھی کئی غیر ملکی سربراہوں کو اُن کی آمد کے موقع پر کشمیر کی قدیم اور بیش قیمت شالیں بطور تحفہ پیش کی جاتی ہیں۔ ابھی ۲۸ جنوری ۱۹۶۱ء کو ادیوگ بھون کی طرف سے شاطوش نام کی ایک نایاب اور بیش بہا شال ملکۂ برطانیہ الزبتھ دوم کو سیاحتِ ہند کے موقع پر پیش کی گئی تھی۔ اس شال کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ڈھاکہ کے شہرۂ آفاق ململی تھان کی طرح انگوٹھی کے حلقہ سے آر پار ہو جاتی تھی جب کہ اس کی لمبائی تین گز اور چوڑائی ساٹھ انچ تھی۔ اس موقع پر دوسری شالوں کے بھی مختلف قدیم نمونے ملکہ کے معائنہ کے لئے رکھے گئے تھے۔ کافی نام کی شال کا ایک نمونہ بھی جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں تیار کیا جاتا تھا، پیش کیا گیا تھا۔ اول الذکر شال ایک سال میں دو کاریگروں کی شبانہ روز محنت کے بعد تیار ہوتی تھی اس کے سب سے زائد قدرداں پیرس کے سلاطین و امرا تھے۔ ان شالوں کی قیمت سیکڑوں سے گذر کر ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ چنانچہ فرانس کے سرکاری میوزیم میں کشمیری ساخت کی دو ایسی شالیں آج بھی موجود ہیں جن کا طول آٹھ گز اور عرض دو گز ہے لیکن وزن صرف ۳½ تولہ فی شال ہے، اور قیمت قدیم سکہ میں فی شال ڈھائی لاکھ روپے ہے۔ بہ قول ڈبلیو، ڈی، بلنٹ[1] اِن دونوں شالوں کی نفاست و خوش نمائی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ فرانس اور اطالیہ کی حالیہ بین الاقوامی نمائشوں میں ہند کے قدیم مصنوعاتی نوادر کے جو نمونے پیش کئے گئے تھے اُن میں مختلف قسم کی بیش قیمت شالیں بھی تھیں۔ خود ہندوستان کے

---

[1] ہندوستان کی پولٹیکل اکانومی کے مصنف امرناتھ بالی نے بلنٹ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد کا ایک انگریز سیاح اور مورخ لکھا ہے، اور ہندوستان کی صنعت و تجارت کے مصنف عبدالاحد بہاری نے فرانس کا ایک سوداگر اور سیاح بتایا ہے جس نے مشرقی دنیا کی کئی مرتبہ سیاحت کی تھی۔

عجائب خانوں اور ہند کے سابق والیانِ ریاست کے پاس بھی کشمیری شالوں کے نادر نمونے موجود ہیں۔

اکبری عہد سے پہلے کشمیری شالوں کی صرف تین چار قسمیں تھیں لیکن اکبر کی ایجاد پسند اور اختراع دوست طبیعت نے گوناگوں رنگوں کی متناسب آمیزش سے نئی نئی گل کاریوں کے اعلیٰ اور جاذب نظر نمونے پیش کئے۔ کسی رنگ آمیزی کا نتیجہ نارنجی، برنجی، قرمزی، کاہی اور ارغوانی رنگوں میں نمودار ہوا تو کسی رنگ آمیزی نے عنابی، عسلی، نخودی، جگری اور زمردی رنگینی اختیار کی جس کی پوری کیفیت آئینِ اکبری میں بہ تفصیل موجود ہے۔

پہلے صرف سادہ کار شالوں کا رواج تھا لیکن اکبر کا جمالیاتی ذوق اس باب میں بھی جدّت پسند اور تنوع آمیز نکلا چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے کہ:

"شال زردوزی وکلابتون......... فروغ خاطر اوست"

اکبر نے لاہور، آگرہ، فتح پور اور گجرات وغیرہ میں شال بافی کے کارخانے قائم کیے تھے جن میں کشمیر و ملحقات کے اعلیٰ ترین صناعوں کو ملازم رکھا گیا چنانچہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ

"از توجہ گیتی خداوند گوناگوں قماش چہرہ برافروخت، واستادانِ کارپرداز و ہنرمندانِ نادرہ کار بطرف کشمیر آمدہ ہنگامہ آموزش گرم ساختند و بیش گاہِ حضور و در شہر لاہور و فتح پور و احمد آباد و گجرات کارنامہا پدید آمدند۔ بہ گوناگوں تصویر نقش دگرہ و شگرف طرح ہا روائی گرفت و عام نوردانِ کالاشناس بہ شگفت آمدند و قدردانی نادرہ کار۔ ان زود یاب ایں مرز نیز آموختند۔"

یعنی اکبر کی توجہ خاص سے طرح طرح کی صنعتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ کشمیر کے ہنرمند اور نادرہ کار استادوں نے لاہور، فتح پور، احمد آباد اور گجرات وغیرہ میں جمع ہو کر بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے اور طرح طرح کے ایسے نادرہ کار کپڑے تیار کیے کہ فن کارانِ جہاں ان کو دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے اور ان نادرہ کار و چابکدست صناعوں کی قدر و منزلت کی بنا پر اس فن کو ان جگہوں پر بڑی ترقی حاصل ہوئی۔

اکبر کے ذوقِ صنعت گری نے ان جگہوں کے علاوہ خود سرزمین کشمیر میں بھی اس صنعت کے متعدد کارخانے قائم کیے تھے۔ شاہجہاں نے بھی گجرات کی صوبہ داری کے زمانہ میں اس صنعتِ خاص کو فروغ دینے کے لیے متعدد سرکاری کارخانے قائم کیے جن میں کشمیر و ملحقات کے صدہا مشہور عالم صناعوں کو بلا کر گراں قدر مشاہروں پر ملازم رکھا گیا۔

جس رنگ میں سلاطین رنگے ہوئے تھے عمائدین سلطنت کا اسی رنگ میں رنگنا ایک اصولی بات تھی۔ ان سرآمدۂ روزگار امراء میں ایک نمایاں ہستی خان خاناں کی بھی تھی جو علمی سرپرستی کے ساتھ ملکی صنعت و حرفت کی بھی خاص مربی تھی۔ اس فدائے صنعت نے لاکھوں کے سرمایہ سے ایک دارالحرفت قائم کیا تھا جس میں کشمیر کے یکتائے روزگار صناع، صدہا کی تعداد میں کام کرتے تھے۔ ان صناعوں کی نگرانی میں ذہین افراد کو زردوزی، زربفت اور شال بافی کا کام سکھایا جاتا تھا۔ اسی دارالحرفت سے متعلق ایک میوزیم بھی تھا جس میں صناعانِ کشمیر کے تیار کردہ صنعتی نوادر بطور نمونہ اور نمائش موجود رہتے تھے۔

شال بافی اگرچہ کشمیر کی خاص صنعتوں میں شمار ہوتی رہی ہے لیکن لفظ شال کشمیری زبان کا لفظ نہیں بلکہ یہ ایک کاشغری لفظ ہے جس کے معنی تختۂ کلاں کے ہیں خواہ وہ کاغذ کا تختہ ہو یا کسی اور چیز کا مگر مرزا حیدر[1] حاکم کشمیر نے پشمینہ کے تھان کے لیے یہ لفظ مخصوص کر دیا۔

کشمیری شال اعلیٰ قسم کے نرم اور ملائم اون سے جو بالعموم پشمینہ کہلاتا تھا تیار کی جاتی تھی۔ یہ اون اگرچہ خاص کشمیر میں دستیاب ہو جاتا تھا لیکن اعلیٰ درجہ کا اون یا پشمینہ تبت اور مشرقی لداخ کے بلند خطوں کی شال نامی بھیڑوں سے حاصل کیا جاتا تھا بعض محققین کے نزدیک اس کا یہ نام انھیں شال نامی بھیڑوں کے اون کی وجہ سے پڑا اور یہ وجہ تسمیہ سابق کی نسبت بڑی حد تک قرین قیاس معلوم ہوتی

[1] مرزا حیدر کاشغری جس نے کشمیری صنعتوں کے ارتقا میں بڑا حصہ لیا ہے دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں کشمیر کا حاکم تھا اور لداخی پشم کی درآمد کشمیر میں ٹھیک ۹۵۰ھ میں شروع ہوئی تھی۔

ہے۔ لداخی بھیڑوں یا بکروں کی پشم بہت اعلیٰ قسم کی مانی گئی ہے اور یہ دو قسم کی ہوتی ہے۔ جلد کے قریب بہت باریک اور ملائم' اور باہر کی طرف موٹی۔ باریک پشم اس وقت بھی کم یاب اور گراں قیمت تھی اور بالعموم سلاطین اور امرا' کی فرمائشوں کی تعمیل میں صرف ہوتی تھی۔

لداخی پشم کی درآمد مرزا حیدر کے زمانہ ہی سے شروع ہوگئی تھی اور مرزا ہی نے اپنی جدت طبع کی بنا پر مختلف اون کے متبادل تانوں بانوں سے شالی چادریں تیار کرنے کی ہدایت جاری کی تھی۔ اس نئی طرح انداز سے جو شالیں تیار ہوئیں وہ بہتر اور اعلیٰ ثابت ہوئیں اور مرزا کی ہدایت کی مناسبت سے ان شالوں کا نام "شاہ پسند" رکھا گیا۔ تجربہ سے کاشغری بکروں کا اون لداخی نسل کے بکروں یا بھیڑوں سے عمدہ ثابت ہوا تھا اس لئے صنعت دوست اور اختراع پسند مرزا نے لداخی بکروں کے علاوہ کاشغری نسل کے بکرے بھی منگوائے مگر کشمیر کی آب و ہوا اُن کو راس نہ آئی۔ بدیں وجہ کشمیر اور اس کے ملحقہ علاقوں کے بھیڑ بکروں کے اون پر اکتفا کرنا پڑی۔ لیکن مرزا نے باریک اور موٹا اون الگ رکھنے کی ہدایات جاری کیں تاکہ تیار شدہ مال آمیزش سے پاک و صاف رہے۔ باریک اون کی شالوں پر "نوطرز نوظہور اعلیٰ اعلیٰ" منوگرام کی صورت میں کشیدہ کیا جاتا تھا اور مرزا ہی کے حکم سے ان منوگرام کشیدہ شالوں کا نام "الوان" رکھا گیا تھا۔ شال کی پیمائش کا معیار ۳ ½ گز طول اور ۱ ½ گز عرض مقرر کیا گیا تھا۔ آخر میں طول و عرض کا یہی معیار قرار پایا۔ مرزا کے علاوہ دوسرے جدت پسند طبائع نے بھی لداخی اور کشمیری پشم کی آمیزش سے تین اعلیٰ قسم کی شالی چادریں تیار کرائیں' اعلیٰ' اوسط' ادنیٰ۔ بعد کو اس اون کی بھی دو قسمیں ہوئیں جن میں سے ایک قسم تو ئی کہلائی اور آج بھی اس کا یہی نام ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ کشمیری سامان کی نکاسی اور برآمد میں اگر کبھی کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی تو قدرت نے غیب سے خریدار پیدا کر دیا۔ ایک مرتبہ (مغل عہد میں) پشمینہ کا کافی سامان تیار ہوگیا مگر وہ فروخت نہ ہوسکا اتفاق سے اُنھیں دنوں ایران کے کچھ تاجر زعفران کی خریداری کے سلسلے میں کشمیر گئے۔ وہاں اُنھوں نے یہ سامان جو دیکھا تو ایسا مسحور ہوئے کہ اُنھوں نے اپنے مطلوبہ سامان کے علاوہ نہ صرف تمام تیار شدہ مال خرید لیا بلکہ آئندہ سال کے لئے گراں قدر زر بیعانہ بھی دیتے گئے۔ غرض فطرت کی ایسی حوصلہ افزائی کے نتیجہ میں پہلے سے بھی اعلیٰ اور عمدہ قسم کا مال تیار ہونے لگا۔ سادہ کار شالوں کے ساتھ زردوز اور بیل دار شالیں بھی تیار ہونے لگیں۔ طول کی طرف ایک جو کے قریب سبز اور عرض کی جانب دونوں سروں پر گرہ گرہ کے فاصلہ سے سرخ زنجیرہ کا رواج پڑا۔ جب اس قسم کا حسین و سبک اور دل کش و دیدہ زیب سامان زعفران کے تاجروں کے ذریعہ ایران پہنچا تو وہاں کے نفاست پسندوں نے اُسے بے حد پسند کیا اور شاہان و امرائے ایران کے استعمال کے لیے زردوز اور بیل دار شالیں بڑی کثرت سے وہاں پہنچنے لگیں۔

مرزا حبیب اللہ بیگ[۱] کی ایجاد پسند اور کرامت اللہ بیگ کی اختراع دوست طبیعتوں کی جدت طرازیوں نے دو رنگی بیلیں بہ طرز مختلف ایجاد کیں اور اسی کے ساتھ ذکور و اناث کے مختلف ذوق کی مناسبت سے مختلف اللون شالیں بھی تیار ہونے لگیں۔ مردوں کے لئے صوفیانہ خصوصاً سفید رنگ اور عورتوں کے لئے سرخ' زرد' بسنتی' نیلے اور فیروزی رنگ مخصوص ہوگئے۔ رفتہ رفتہ سابق بیل کو بڑھا کر دامن دار شالیں تیار کی جانے لگیں[۲] اور اِن دامنوں پر کچھ اس دل فریب انداز سے سوزن کاری شروع ہوئی کہ گلستانِ کشمیر کی تصویر نظروں کے سامنے پھرنے لگی۔ اس کے بعد دامن دار جوڑوں کے گوشوں پر ترنج کا اضافہ ہوا۔ چونکہ کثرت استعمال سے شالوں کا درمیانی حصہ پھٹ جاتا تھا اس لیے اِس نقص کو دور کرنے کے لیے اکبری دور کے مشہور شال باف خواجہ غلام رسول نے شال کا دور' الگ اور درمیانی حصہ علاحدہ بننا شروع کیا۔ اسی کے ساتھ پشمینہ کی جامہ وار بھی تیار کی جانے لگی۔ اسی زمانہ کے ایک اور مشہور شال باف میر محسن نے ایک نئی قسم کی شال تیار کی جس سے چغے اور گلوبند وغیرہ تیار کیے جاتے تھے۔ کشمیری شالوں کی عام مقبولیت سے متاثر ہو کر علی خاں نیازی نے سوزن کار شال تیار کی۔ اسی شال باف کے

---

[۱] مرزا حبیب اللہ بیگ سولھویں صدی عیسوی میں کشمیر کے بہت مشہور و معروف شال باف گذرے ہیں۔ نغد بیگ اور نغز بیگ کے ناموں سے بھی یہ مشہور ہیں۔ کرامت اللہ بیگ ان ہی نغد بیگ کے ایک مشہور شاگرد تھے۔ ان ہی استاد و شاگرد نے دو رنگی بیل ایجاد کی تھی۔ [۲] دامن دار شالوں کی ایجاد کا زمانہ سولھویں صدی کا نصف آخر ہے۔

ہم کو
مٹا سکے
یہ
زمانے میں
دم نہیں



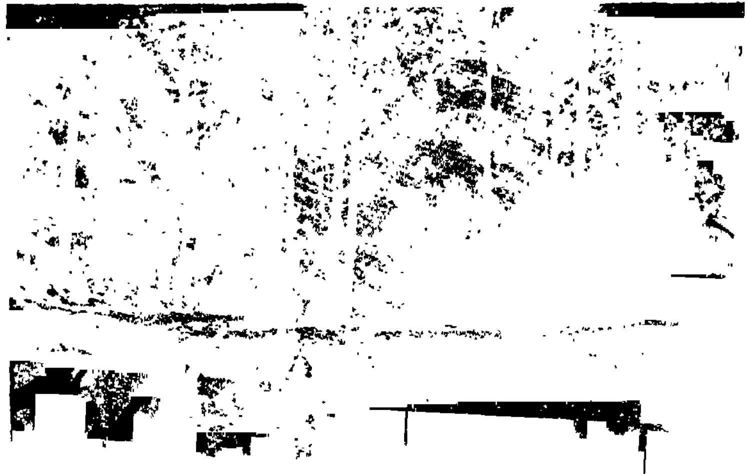


(اوپر) وزیرِاعظم نہرو تیز پور (نیفا) میں بارش کے باوجود ہندوستانی فوج کی ایک بکتر بند یونٹ کا معائنہ کر رہے ہیں۔

(بیچ بائیں) گورنر اُتر پردیش فوجی ٹریننگ پانے والے ایک دستے کے گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہے ہیں۔

(نیچے) وزیرِ دفاع رانی کھیت میں کمایوں رجمنٹل سنٹر میں رائفل ٹریننگ دیکھ رہے ہیں۔

ہندوستان
کی
دفاعی
تیّاریاں







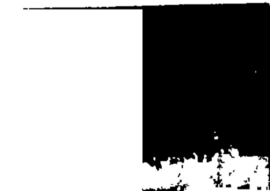
لکھنؤ میں لڑکیوں کو رائفل ٹریننگ دی جا رہی ہے

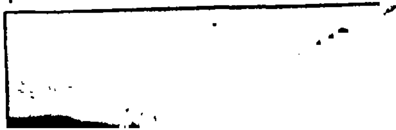
لکھنؤ میں لڑ

شیشہ

فرسٹ

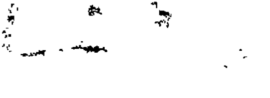
سنگینوں سے حملہ کرنے کی تربیت















گرلز کلب میں عورتیں بندوق چلانا سیکھ رہی ہیں



...ک ...س کا ایک کلاس

تلوار اٹھا

...ا ...ٹریننگ

جسمانی ورزش کا ایک مظاہرہ





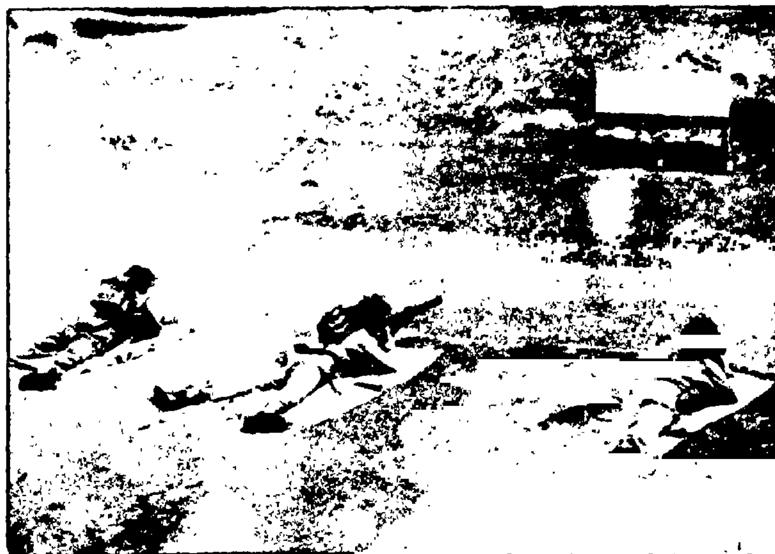


دہلی میں خواتین رائفل چلانے کی تربیت حاصل کر رہی ہیں



تحفّظ وطن کے لیے حلف لیا جارہا ہے

نشانے بازی کی مشق



ہاتھ کی بنی ہوئی ایک لاثانی شال شاہزادہ معظم نے اپنے دورِ حکومت میں وینس کے ایک سیاح ڈاکٹر فرجی کو ہدیہ کے طور پر عطا کی تھی۔ سروالٹر اسکاٹ جیسے مشہور انگلستانی ناول نگار نے بھی اپنی ایک ناول میں اسی سوزن کار شال کے حسن و خوبی کا ذکر بڑے استعجاب سے کیا ہے۔

اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں مغلوں کے مشہور باغات، نسیم باغ، نشاط باغ، چنار باغ اور شالیمار باغ کی رعایت سے چار مختلف رنگوں کے مربع ٹکڑے جوڑ کر ایک مربع رومال نما شال بنائی گئی تھی جو "چار باغ" کے نام سے مشہور ہوئی۔ درج ذیل شعر میں "چار باغ" سے اسی رومال نما شال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

باغباں بالا نہاں در پیرہن
بے گماں بر دوش دارد چار باغ[1]

فرخ سیر کا زمانہ مغلیہ سلطنت کا عہدِ زوال کہلاتا ہے لیکن اس دورِ زوال میں بھی "تافتہ" نام کی ایک نہایت باریک شال تیار ہوئی اور اسی کے ساتھ ایک عجیب و غریب شال بھی بنائی گئی جو اتنی باریک اور سبک تھی کہ پوری شال انگشتری کے حلقہ سے گذر جاتی تھی۔ اس رعایت سے "شالِ انگشتری" اس کا نام رکھا گیا۔ مغرب میں یہی شال "رنگ شال" کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس شعر میں انگشتری سے اسی شال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ؎

یارِ من دارد دو تا انگشتری
ایں یکے بر دوش آں دیگر بدست[2]

محمد شاہ رنگیلے کے رنگین عہد میں شال بافی کی ایک خاص طرح ڈالی گئی اور یہ شال "شاہ پسند" اور "بوتہ محمد شاہی" ناموں سے مشہور ہوئی۔ عہد ابدالی میں سید یحییٰ بغدادی کو جو سلسلۂ جیلانیہ کے ایک مشہور بزرگ گذرے ہیں، عبداللہ خاں[3] صوبہ دار کشمیر نے محمد شاہی شالیں نذر کی تھیں۔ سید صاحب موصوف نے مصر پہنچ کر اُن میں سے دو شالیں خدیو مصر کی خدمت میں پیش کیں اور خدیو کی جانب سے اُن میں سے ایک شال نپولین کی ملکہ کو پیش کی گئی۔ ملکہ کو یہ شال اوڑھے دیکھ کر فرانس کے شوقین طبع اور قدر دانانِ فن اس قسم کی شالوں کے گرویدہ بن گئے اور ایک فرانسیسی سوداگر یوسف نامی نے خود اپنی نگرانی میں اُس وقت کے مشہور شال باف اور نقاش محمود کے ذریعہ نئے نئے قسم کے نقشے اور نمونے تیار کرائے۔

ایرانی قدر دانوں کی فرمائشات کی تکمیل میں اہلِ ایران کی جمال پسندی کا لحاظ کرتے ہوئے خطِ باریک، جال دار، اور بوتہ کلاں وغیرہ ناموں سے اعلیٰ ترین شالیں تیار ہوئیں اور اسی کے ساتھ ایسی باتصویر شالیں بھی تیار کی گئیں جن کو ہندی مشاہیر کے شکار، برات اور خاص مذہبی مناظر سے آراستہ کیا گیا تھا مثلاً رام چندر جی کی برات کا منظر، دروپدی کے بیاہ کا سین اور قدیم راجاؤں کی نشست کا انداز۔ بعض شالوں میں کسی راجہ کو لشکر کے ساتھ شکار کھیلتا بھی دکھایا گیا تھا۔

کشمیری شالوں کی دو اور قسمیں "کانی" اور "آملی" ناموں سے بھی مشہور ہوئیں۔ کانی شال میں پہلے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو بُن کر اس طرح جوڑ دیا جاتا تھا کہ اُن کی سیون کا پتہ چلانا بھی مشکل تھا۔ آملی شال پشمینہ پر سوزن کاری کر کے تیار کی جاتی تھی۔ کشمیری شال کی شہرت خوش وضع ڈیزائنوں اور خوش نما رنگوں کی متناسب آمیزش اور سوزن کاری کے باریک کام کی وجہ سے ہوئی۔

اگرچہ عام کشمیری شالیں بھی دنیا کے دوسرے ملکوں کی شالوں سے نسبتاً عمدہ اور اعلیٰ مانی گئی ہیں لیکن پشمینہ کے بڑے بڑے رومال بنانے میں صناعانِ کشمیر نے اپنی صناعتِ ذہنی اور اختراعِ دماغی کے جوہروں کو سب سے زیادہ نمایاں کیا اور اس سلسلہ میں سب سے قیمتی اور اعلیٰ ترین وہ رومال ہے جو کشمیر کے آخری حاکم شیخ محمد امام الدین کے عہد میں مرزا اسد نے چالیس ہزار کی لاگت سے تیار کیا تھا اور جس کو مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی مہاراجگی کے زمانہ میں لارڈ ڈلہوزی کی وساطت سے ملکہ وکٹوریہ کو

---

[1] یہ شعر خواجہ امیرالدین وکیل عدالت کشمیر متوفی ۱۹۰۵ء کا ہے۔ [2] یہ شعر مرزا کام گار کا ہے۔ مولانا تاجور نجیب آبادی نے ان کو فرخ سیر کا ہم عصر بتایا ہے۔ [3] عبداللہ خاں ۱۱۲۱ھ میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا تھا۔ اسی زمانہ میں شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے سید یحییٰ بغدادی نام کے ایک بزرگ کشمیر بھی تشریف لے گئے تھے جن کی خدمت میں عبداللہ خاں نے چند قیمتی شالیں بطور نذر پیش کی تھیں۔

ہدیۃً بھیجا تھا۔ ڈوگرہ دورِ حکومت میں اس صنعتِ خاص کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی لیکن بچے کھچے صناع یا صناعوں کے مخصوص خاندان اس صنعت کو کسی نہ کسی طرح زندہ رکھے رہے۔ چنانچہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں صنعتی خاندان کے ایک مشہور صناع شیخ ابیھنے شالی سوزن کاری میں تعجب انگیز جدتیں پیدا کیں۔ شیخ موصوف کی سوزن کاری کچھ اس قسم کی تھی کہ ایک جانب کی سوزن کاری کا عکس دوسری جانب کچھ اس انداز سے دکھلائی دیتا تھا کہ وہ ایک علاحدہ سوزن کاری معلوم ہوتی تھی۔ اسی مناسبت سے سوزن کار نے اس کا نام عکسی رکھا تھا۔ اس عکسی شال کی عام مقبولیت سے شیخ کے دل میں ایک نیا جذبہ اور حوصلہ پیدا کر دیا اور اُس نے دو رُخہ سوزنی کا نکالا اور پھر اسی سوزنی کار نے منبت کا رزدو رخہ تیار کیا۔ اس دو رُخہ میں صناع کے اختراعی ذہن نے یہ صفت خاص رکھی تھی کہ شال کے دونوں رُخوں پر ایک سا کام معلوم ہوتا تھا۔ اس سحر نما شال کے بعد ایک دوسرے خاندانی صناع نے قدیم اور رنگ ریزی ڈیزائن "چار باغ" کو اپنی صناعتِ ذہنی کی مدد سے ہفت رنگ کے مختلف ٹکڑوں کو اس طرح سے جوڑا کہ ایک رخ پر مختلف رنگ اپنی بہاریں دکھلاتے تھے اور دوسرے رُخ پر اسکا ذاتی ایک رنگ نمایاں رہتا تھا۔

کشمیری شالوں کی لطافت و نفاست سے متاثر ہو کر غیر ملکی سیاحوں نے اُن کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ برنیر لکھتا ہے کہ "خطۂ کشمیر کے صناعوں کے تحیر خیز اور استعجاب انگیز صنعتی نمونے مغل سلاطین کی صنعتی سرپرستی کے نتیجہ میں قدم قدم پر دیکھنے میں آتے ہیں اور ان صنعتی نوادر کو دیکھنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ قدرت نے عروسِ کشمیر کو مغل سلاطین کی آغوشِ تربیت میں صرف زیورِ صنعت سے آراستہ کرنے کے لئے بنایا تھا۔" آگے چل کر یہی سیاح اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ "کشمیری ساخت کے صنعتی نوادر دیکھ کر صناعانِ عالم کی عقلیں ورطۂ حیرت میں پڑ جاتی ہیں اور بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مشینوں کی امداد کے بغیر کشمیری صناع ایسی حسین و جمیل اور بصارت نواز شالیں کس طرح تیار کر لیتے ہیں۔"

ارمنڈورے نامی سیاح کشمیری شالوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کشمیری صناعوں کے اختراعی ذہن کی بدولت شالوں کے ایسے نادر روزگار نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جن کو دیکھ کر خود عقل بھی تھوڑی دیر کے لئے بادیۂ تحیر میں پڑ جاتی ہے۔ ڈیزائنوں میں ایسی دل کشی کہ باید و شاید! ان بے عدیل صناعوں کی یہ صنعت کاری ایسی بے مثال ہے کہ اس سے بہتر شاید روئے زمین پر نہ ہوتی ہوگی۔" یہی سیاح مزید استعجاب کے عالم میں لکھتا ہے کہ "میں نے ایک مرتبہ ایک بہت باریک شال دیکھی جس پر کشیدہ کار صناعوں نے انگور کی بیل ایسے سحر نما انداز سے بنائی تھی کہ وہ سوزن کاری کے نمونے کے بجائے مصورانہ گل کاری معلوم ہوتی تھی۔"

بیلن نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ پارچہ بافی" مطبوعہ ۱۸۳۵ء کے صفحہ ۵۶ پر کشمیری شالوں اور زردوز کپڑوں کی فردوس نظری سے متاثر ہو کر بڑے پُر جوش انداز میں لکھا ہے کہ "کشمیر کے کشیدہ کار اور شال باف صناعوں کے جو فن کارانہ نمونے دیکھنے میں آتے ہیں وہ انسانی دست کاری نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پریوں نے تیار کئے ہیں یا قدرت کے صناع کیڑوں نے ایک خوش نما جال اپنے چاروں طرف بُن کر تیار کیا ہے۔"

ایک انگریز سیاح ڈارلنگ جو کشمیری کشیدہ کاریوں اور شالوں کے متعدد نمونے لے کر انگلستان پہنچا تھا لکھتا ہے کہ "میں دسوں قسم کے کشمیری شالوں کے اعلیٰ نمونے لے کر انگلینڈ آیا ہوں۔ کیا یورپ کے صناع بھی ایسے بیش بہا نوادر تیار کر سکتے ہیں؟"

بشاری مقدسی نے ہند کے تجارتی شہروں کے حالات کے بیان میں اور ابن الفقیہ ہمدانی نے اپنی مشہور تصنیف کتاب البلدان اور ابن خرداذبہ نے ہندی مصنوعات اور خام اشیاء کی برآمدی فہرست میں صنعت پناہ کشمیر کے خوش رنگ و خوش وضع قالینوں اور نظر نواز شالوں کا ذکر بڑے لطف سے کیا ہے۔ ان کی رائے کے مطابق کشمیر کی نظر فریب اور شاہ پسند مصنوعات یعنی بوقلموں قالین، کارچوب کا صد رنگ سامان اور زرنگار رنگ شالیں عربوں کی وساطت سے مشرق و مغرب کے دور، دراز گوشوں تک پہنچا کرتی تھیں۔

ذوق اور اقبال

محمد انصار اللہ نظر

زمانے نے فلکِ گرداں پر ایک سے زیادہ آفتاب و ماہتاب کا تصور نہیں کیا لیکن شمالی ہند میں ولی دکنی نے شعرائے اردو کے جس سلسلہ کی بنیاد رکھی اس نے آسمان سخن پر کئی مہر و ماہ پیدا کر دکھائے۔ یہ سلسلہ اس طرح ہے:۔ اقبال شاگرد داغ، شاگرد ذوق، شاگرد نصیر۔ شاگرد مائل۔ شاگرد قائم۔ شاگرد سودا۔ شاگرد حاتم۔ شاگرد ولی۔ اسی سلسلہ کی ایک شاخ حکیم مومن خاں سے ہوتی ہوئی حسرت اور اصغر تک پہنچتی ہے، اس طرح:۔ حسرت شاگرد تسلیم، شاگرد نسیم، شاگرد مومن شاگرد نصیر۔ اردو کی تاریخ میں ایسا عظیم الشان دوسرا کوئی سلسلۂ شعراء نہیں ہے۔

شمالی ہند میں اردو شاعری کی ابتدا "تفریح و تفنن طبع" سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ ذو معنین الفاظ کے استعمال کا شوق بڑھا اور ایہام گوئی کو رواج ہوا یہاں تک کہ اس کو "ایہام گوئی" ہی کا دور قرار دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ "ایہام گوئی" دلچسپ بھی ہے اور کچھ مشکل بھی[1] لیکن جب اسی کو اصل شاعری سمجھ لیا جائے تو نہ صرف اس صنعت سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے بلکہ خود شاعری بے کیف اور بے لطف ہو جاتی ہے مگر سودا نے علم بدیع کی افادیت کو سمجھا اور اس کے صحیح محل استعمال کو جانا۔ ان کے قصائد میں عجیب غریب صنعتوں کا استعمال ملتا ہے اور ان صنعتوں سے شعر کی کیفیت اور دلکشی دوبالا ہو جاتی ہے اور یہی علم بدیع کا مقصود ہے۔ سودا کے کلام نے آنے والی نسل کو متاثر کیا، یہاں تک کہ ان صنعتوں کو ہی اصل شاعری سمجھ لیا گیا۔ آتش کے زمانہ تک "بندش الفاظ" کو اتنی اہمیت حاصل ہو گئی کہ شاعری کو بھی "مرصع سازی" سمجھا گیا۔ ناسخ کے کلام کی بھی یہ حالت ہے کہ شعر سنتے ہی لطف بندش، حسن تشبیہ و استعارہ وغیرہ پر داد دینے کو بے اختیار جی چاہتا ہے لیکن اکثر مضمون کی طرف خیال بھی نہیں جاتا۔ اس زمانہ میں ذوق نے بڑا کام کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ابتداءً خود ذوق بھی نفس شعر کو کما حقہٗ اہمیت نہ دیتے تھے لیکن بہت جلد انھوں نے بات کو پا لیا اور اب وہ شعر میں اگر کچھ چاہتے تھے تو وہ "مضمون ادق"[2] تھا۔[3] ہاں اس مضمون کی ادائیگی وہ علم بیان و معانی اور بدیع کے

---

[1] حکیم مومن خاں نے بھی اس صنعت کو چمکایا ہے لیکن اس سلسلہ میں انھوں نے ایسی فن کاری سے کام لیا ہے کہ اس سے شعر کا حسن کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔ ان کے مقطعے خصوصاً اہم ہیں جہاں لفظ مومن اپنے لغوی معنوں میں بھی نظم ہوا ہے اور تخلص بھی ہے۔

[2] ایک دو غزلہ میں ذوق کہتے ہیں۔ پڑھ غزل اے ذوق کوئی گرم سی اب تو نہ جا جانب مضمون، طرز تفتہ جاناں چھوڑ کر

[3] اس موقع پر ذوق کا ایک یہ مقطع خصوصاً قابل غور ہے ؎

یہ بحر و قوافی غزل کے بدل کر رقم اک غزل کر کہ اے ذوق جس میں
نہ ہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق جو نی الجملہ کچھ ہو تو مضمون ادق ہو

اصولوں کی مدد سے اس طرح کرنا چاہتے تھے کہ بات مشکل سے مشکل ہونے کے باوجود عام فہم ہو۔ ذوق کے کلام کی یہ وہ خصوصیت ہے جس سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ ان کے یہاں دقیق، علمی اور فلسفیانہ خیالات ہیں ہی نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد ذوق کے کلام پر اس طرح رائے زنی کرتے ہیں: "انھیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب اور پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستے سے پلا دیا۔ اسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے کہتے ہیں کہ ان کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے ہونٹوں میں خدا نے عجیب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ ان سے ترکیب پا کر نکلے ہیں خود بخود زبانوں پر ڈھلکے آتے ہیں جیسے ریشم پر موتی۔" (دیباچہ دیوان ذوق ص۳۲)

ذوق نے شعوری طور پر بدیع و معانی سے توضیح معانی کا کام لیا ہے اس کے لیے سب سے بہتر ثبوت خود ان کا کلام ہے[1]۔ ذوق کے بعد داغ (شاگرد ذوق) کے شاگرد اقبال نے بیان و بدیع و معانی سے اپنے کلام کو نہایت دلکش اور واضح اور دل جیب بنا دیا۔

سید عابد علی عابد کے یہ بیانات ملاحظہ ہوں:

"اقبال شروع ہی سے صنعت گری اور آرائش کو اسلوب شعر گوئی کا ایک جزو لازم تصور کرتے تھے البتہ اس بات کا مزید دھیان رکھتے تھے کہ صنعتیں توضیح معانی میں خارج نہ ہوں اور بے تکلف اور برجستہ استعمال کی جائیں۔" (شعر اقبال ص۱۵۹)

"اقبال کے کلام میں اکثر و بیشتر تشبیہات و استعارات کا مقصد محض آرائش کلام نہیں بلکہ توضیح معانی ہے۔" (شعر اقبال ص۲۳۳)

ذوق کی وفات پر اُن کے متعدد معاصرین نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ان پر شاعری کا خاتمہ ہو گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے بھی مضمون کی ادائیگی کے لیے صنعتوں کے استعمال میں اس قدر فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ شعر اقبال کا یہ اقتباس دیکھئے:

"یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
ہمت ہو پرکشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
بالائے سر رہا ہے تو نام اس کا آسماں
زیر پر آ گیا تو یہی آسماں زمیں

چاروں مصرعوں کے پہلے ٹکڑوں کا آہنگ اور بالخصوص حروف علت میں الف کشیدہ کی تکرار پیرداز کے تسلسل اور اس کی بلندی کا سراغ دیتی ہے یہ نیلگوں فضا، ہمت ہو پرکشا، بالائے سر رہا، زیر پر آ گیا۔ یہ ٹکڑے صرف ہم قافیہ نہیں ہم وزن بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ محض توارد اتفاق نہیں، شعوری صنعت کی آخری منزل یہ ہے کہ پڑھنے والے کو اس وقت تک محسنات شعر کی موجودگی کا شعور نہیں ہوتا جب تک کوئی تجزیہ کر کے نہ بتائے البتہ ذوق سلیم الفاظ و کلمات کی ترتیب اور نشست میں ایک آہنگ خاص ضرور دیکھتا ہے جو معانی سے قطعاً نقلت تام رکھتا ہے۔" (ص۲۳۲)

شعر کے لیے زبان وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اعلیٰ خیالات اور علمی مضامین کی ادائیگی کے لیے زبان میں وسعت ہونا ناگزیر ہے! ابتدائی دور میں جب اردو شاعری کا مقصد "تفنن طبع" تھا زبان ریختہ نے کفایت کی لیکن سودا نے اسی زبان کو علمی اور ادبی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور اس مقصد کے تحت انھوں نے فارسی سے کافی استفادہ کیا۔ سودا کے بعد ذوق نے بھی اپنے کلام میں مختلف محاورات، روزمرہ اور ضرب الامثال کو نظم کر کے محفوظ کر دینے کی کوشش کی تاکہ زبان کی وسعت میں کمی نہ پیدا ہو سکے۔ ذوق نے متعدد علوم و فنون کے مسائل، اور ان کی اصطلاحات کو بھی شعر کے سانچے میں ڈھال کر عام کرنے کی کوشش کی

---

[1] ذوق کے ایک قصیدہ کے یہ شعر بھی سنیئے۔

تا حقیقت کے لیے لطف سخن ہووے مجاز — صنعتیں ہوں اس سے پیدا با مرام و بے مرام
تاکریں روشن معانی و بیاں سحر بدیع — جن سے ایراد معانی ہو بہ تحسین الکلام (دیوان ذوق مرتبہ آزاد)

تاکہ زبان واقعی علمی اور ادبی کاموں میں استعمال ہو سکے[5]۔ انھوں نے فارسی محاورات اور تراکیب ہی کو اردو میں منتقل نہیں کیا بلکہ فارسی کے بعض بہترین اشعار کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا[6] اور عربی کے مختلف اقوال کو بھی نظم کیا[7]۔ ذوق نے یہ کام شعوری طور پر کیا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ خود اپنے اس کارنامے پر فخر بھی کرتے تھے[8]۔

اقبال نے بھی اپنے کلام میں فارسی الفاظ و محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے اور پرشکوہ الفاظ اُن کی شاعری ایک خصوصیت ہیں۔ اقبال، فارسی سے اس قدر متاثر تھے اور اردو کی کم مائگی کا انھیں اس قدر احساس تھا کہ انھوں نے بعد میں زیادہ تر فارسی ہی میں شعر کہنا شروع کر دیے۔ چنانچہ اُن کی معرکۃ الآرا تصانیف اسرارِ خودی رموزِ بے خودی وغیرہ فارسی ہی میں ہیں۔ یوں بھی اقبال کی اکثر اردو نظموں میں فارسی کے اشعار ملتے ہیں۔

ذوق بھی ابتداءً جرأت سے متاثر ہوئے تھے[9]۔ اقبال سے پہلے داغ کی شاعری کی "دھوم" تھی۔ جس طرح ذوق، شروع میں جرأت سے متاثر ہوئے

---

[5] اس سلسلے میں قصائد ذوق کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میں نے نیا دور کے پچھلے شماروں میں ذوق کے قصائد سے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات و مضامین کو مرتب کر کے شائع بھی کر دیا ہے جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ذوق نے کیسے کیسے علمی مضامین کو شاعری کا موضوع بنا دیا ہے۔

[6] مثال کے طور پر یہ شعر سنیے:

او چوں خورشید است ما چوں سایہ ایم	ہم چوں نور و سایہ ما ہمسایہ ایم (عطار)
میں وہ نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں	میں ہوں تمھارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں (ذوق)
عشق اول در دل معشوق پیدا می شود	تا نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا می شود
بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا	کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نہ کرے (ذوق)

اس موقع پر آزاد کے یہ دو بیانات بھی قابل لحاظ ہیں۔

"ایک دن عرفی کے قصیدہ نعتیہ کے اشعار پڑھ کر طبیعت میں ذوق و شوق پیدا ہوا:

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را	ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

...... قلم بر داشتہ یہ اشعار لکھے پھر فرصت نہ ہوئی ...... یہیں لکھ دیتا ہوں

پھرا دیا جلوہ نے ترے چشم صنم کو	چکرا دیا غمزہ نے ترے طوفِ حرم کو"

(دیوان ذوق ص ۱۵۹)

"...... استاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا ...... کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر لیے

مے دو سالہ و محبوب چاردہ سالہ	ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر" (ایضاً ص ۲۱۹)

[7] چند شعر ملاحظہ فرمائیں:

جوشِ روئیدگی سبزہ پہ یاد آتی ہے	آیت انبتہا اللہ نباتاً حسنا
ہم تو سنتے تھے کہ کل حسود باماد	ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش اہل کرم
سچ ہے الحب لحد سنتا اسے ذوق	کچھ اس کی دعا سے ہوتی ہے

[8] خود لکھتے ہیں:

بان دیکھنے کوئی رُوں اہل ولایت کی	محبت ذوق کو اک کیسہ ہے شاہ ولایت سے

اور ایک موقع پر شکایت بھی کرتے ہیں تو یہی کہ:

بجز نثار علی شاہ کون جانے ذوق	تری زباں کا مزا تیری شعر خوانی میں

[9] آزاد لکھتے ہیں: "نوجوان ولی عہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ ادھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ ان کی غزلیں ان ہی کے انداز میں بناتے تھے۔" (دیباچہ دیوان ذوق ص ۲۹)

اُسی طرح ذوقؔ کے شاگرد' داغؔ سے اقبالؔ متاثر ہوئے اور ان کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہو گئے۔ چنانچہ اقبالؔ کے ابتدائی کلام پر داغؔ کے اثرات حاوی نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کے ابتدائی کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

دل کی بستی عجیب بستی ہے   لوٹنے والے کو ترستی ہے
تابِ اظہارِ عشق نے لے لی   گفتگو کو زباں ترستی ہے
ہمیں ڈالا ہے آسمانی سمجھے   کس کی رہ کا غبار ہونے کو
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد   مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

داغؔ ہی نہیں بلکہ داغؔ کی نسبت سے اقبالؔ کے دل میں ذوقؔ کے لیے جذبۂ احترام پیدا ہونا اور اُن سے متاثر ہونا ضروری تھا چنانچہ سید عابد علی عابدؔ لکھتے ہیں :۔

" اقبالؔ نے علوم شعری پر عبور حاصل کرنے کے لیے صرف داغؔ ہی کے کلام کا بہ غور مطالعہ نہیں کیا بلکہ جس دلبستان شعر سے داغؔ کا تعلق تھا اس کے ممتاز ترین نمایندہ شعرا کا کلام بھی ان کے زیرِ مطالعہ
(شعرِ اقبالؔ ص۱۳۰)

عابدؔ صاحب نے اقبالؔ کے بعض اشعار کے مقابل ذوقؔ کے شعر بھی نقل کیے ہیں جن سے اقبالؔ کا ذوقؔ سے متاثر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اقبالؔ کے ایک شعر ؎   ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیل بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

کے متعلق وہ حاشیہ پر لکھتے ہیں :

" اقبالؔ داغؔ کے شاگرد تھے اور داغؔ ذوقؔ کے اور ذوقؔ کے مشہور قصیدے میں یہ شعر پایا جاتا ہے ؎

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ   کہ جیسے جائے کوئی فیلِ مست بے زنجیر"

ذوقؔ غزل گو اور قصیدہ نگار تھے لیکن انھوں نے رباعیات اور قطعات اور مثنوی بھی لکھیں۔ اقبالؔ نے بیشتر نظمیں لکھیں لیکن غزلوں سے بھی دامن بچا نہ سکے اور جیسا کہ بتایا گیا ہے' ابتدائی دور میں ان کی غزلوں کا انداز داغؔ سے بہت مشابہ تھا۔ لیکن بعد میں مقصدیت غالب آ گئی اور یہی اقبالؔ کا اپنا رنگ ہے۔

غدر سے پہلے بھی مزاحیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں لیکن اُسے کوئی علمی اور ادبی حیثیت حاصل نہیں تھی اس لئے ذوقؔ نے اس پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ لیکن طنز و مزاح کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ذوقؔ نے اپنے مقصد کے لیے اس سے بھی وقتاً فوقتاً فائدہ اُٹھایا ہے۔ اُن کی ایک رباعی ہے[۱۰] :

یہ کہہ کے ملائک ہیں فلک پر روتے   اے کاش کہ انسان سے ہم بھی ہوتے
غفلت میں بھی یہ نہیں ہے اتنا ہشیار   شیطاں کو جلا دیتا ہے سوتے سوتے

اس مزاح میں طنز کی آمیزش رباعی کی افادیت کو دوبالا کر رہی ہے۔ اقبالؔ نے بھی اس روش کو اختیار کیا مگر وہ اس سلسلے میں اکبرؔ الٰہ آبادی سے خاص طور پر متاثر ہوئے اور اکبرؔ ہی کے انداز میں بہت کچھ کہا۔ مثلاً ؎
انداز میں بہت کچھ کہا۔ مثلاً

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں   مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلّے   واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

ذوقؔ کے دل میں قوم کی زبوں حالی کا درد تھا اور اس کا ذکر وہ موقع بہ موقع کر جاتے ہیں۔ مثلاً

دین و ایماں ڈھونڈھتا ہے ذوقؔ کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

حالات بتا رہے ہیں کہ وہ زمانہ بعد والے دور سے یقیناً بہتر تھا لیکن اس کے باوجود ذوقؔ کو یہ شکایت ہوئی۔ امتدادِ زمانہ سے قوم کی حالت اقبالؔ کے زمانے میں بہت کافی بگڑ چکی تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں یہ شکایت زیادہ شدید ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں :

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے امت بے چاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

ذوقؔ نے ایک قطعہ میں اپنے دور کے مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ قطعہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

جن کو اس وقت میں اسلام کا دعویٰ ہے کمال   دیکھتا ہوں یہ اب اے ذوقؔ میں ان کا احوال

---

[۱۰] مولانا امام بخش صہبائی اس غزل سے متعلق کہتے ہیں "ظاہر میں یہ کلام بطور ہزل کے ہے اور واقع میں سراسر فائدہ اور پند ہے"

جہاں تک اقبال کا تعلق ہے، مسلمانوں کی حالت اور اُن کے درد کا علاج اُن کے خاص موضوع ہیں۔ اقبال کے یہاں اس کیفیت کے نو بہ نو نقشے ملیں گے۔ اس سلسلہ میں اُن کی نظم "جوابِ شکوہ" کا مطالعہ خصوصاً اہم ہے۔ اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں خدا کے حضور میں اپنی قوم کی تباہ حالیوں کو پیش کیا ہے اور ایک شعر یہ بھی کہہ گئے ہیں۔

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر   اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

یہی بات ذوق نے ایک غزل میں کہی ہے اور خوب کہی ہے۔

مجھ سا مشتاقِ جمال ایک نہ پاؤ گے کہیں   گرچہ ڈھونڈوگے چراغِ رخِ زیبا لے کر

پیری مریدی اور تصوف کے منفی پہلو پر اقبال نے بہت زور دیا ہے۔ ذوق نے بھی اس موضوع پر قلم اُٹھایا ہے لیکن غزل کے محدود دائرہ میں بات کہنا چاہتے تھے اس لیے کہیں کہیں تو بات کھُل کر کہہ گئے ہیں ورنہ بیشتر اوقات صرف اشارے اور کنائے میں بات کہی ہے۔ شعر پیش ہیں۔

اُن کو بے پر عرشِ اعظم پہ اڑاتے ہیں مرید   کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پیروں کے پر

شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصانِ خدا   خدمتی اُن کے ہیں جو زمرہ خدام میں خاص

اقبال نے اپنے کلام میں بنیادی طور پر "خودی" پر زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک کسی کے سامنے احتیاج لے کر جانا انتہائی مذموم ہے اور خودی کی انتہا یہ ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ذوق نے بھی اسی خودی کو بہت اہمیت دی ہے۔ چند شعر دیکھئے۔

کیوں حال زبوں اپنا بیاں کرتا ہے ان سے   اے ذوق ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گردابِ بلا میں ہم   کہ بہتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

نہ کیجو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اپنے دراز اے ذوق   کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

اقبال بھی اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی   جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب   وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی تاب

اقبال نے انسان کو اشرف المخلوقات کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ وہ انسان کو کائنات کی تمام چیزوں کے وجود کا سبب بتا کر اُسے مرتبۂ بلند کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات   تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے   جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

ذوق کی تعلیم بھی یہی ہے۔ وہ بھی صاف اعلان کرتے ہیں۔

جو کچھ کہ ہے دنیا میں وہ انساں کے لیے ہے   آراستہ یہ گھر اسی مہماں کے لیے ہے

مقاماتِ خودی کے اظہار کے لیے اقبال نے "شہباز" اور "شاہین" کو بہ طور علامت کے استعمال کیا ہے اور ان علامتوں کو ان کی شاعری میں خصوصی اہمیت ہے۔ اقبال کے ہر ناقد کے لیے اُن پر بحث کرنا ناگزیر ہے۔ لیکن اقبال سے پہلے شہباز کی سیرت کے اس روشن پہلو کو ذوق نے بھی محسوس کیا تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

ہوتے سیرت سے ہیں مرداں دلاور ممتاز   ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل

اب اقبال کے یہ شعر سنیئے جن میں شاہین کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں   اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں   کہ شاہیں کے لیے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی

ان اشعار کے علاوہ اقبال کی نظم "شاہین" بھی اس سلسلہ میں دیدنی ہے۔ ذوق نے شہباز کے علاوہ ایک حقیر سی مخلوق یعنی مچھر تک کو شجاعت کے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی   جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

بعض شعروں میں ذوق نے شیر کا حوالہ دیا ہے۔ ایک شعر ہے۔

پھیرتا ہے سیلِ حوادث سے کہیں مردوں کا منھ   شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں

اقبال کے نزدیک ہر شے میں خودی ہے اور اپنی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ کہتے ہیں۔

ہم گہر نے صدف کو توڑ دیا   تو ہی آمادۂ ظہور نہیں

اس موقع پر ذوق کے یہ شعر بھی قابلِ لحاظ ہیں۔

ہے آپ ہی آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف   ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

نہیں گوش شنوا باغِ جہاں میں غافل   ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی کرتا

بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر دیکھ کہ تجھے   ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا

خودی کے سلسلے میں ایک مسئلہ تسخیرِ فطرت کا ہے۔ یعنی خدا نے تمام کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ انسان اپنی قوتِ جسمانی سے بھی فطرت کو تسخیر کر سکتا ہے اور قوتِ عقلی سے بھی۔ اس کے علاوہ ادیاہ

اور انبیاء نے روحانی قوت سے بھی فطرت کو مسخر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اقبال کے یہ تین مصرعے ان مختلف قوتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ ؎

اے بے خبر کوشش پیہم کی جزا دیکھ
از زمین شعلہ زاد سجدہ کند خاک را
ماہ از انگشت او شق می شود

تسخیر کے مختلف مقامات ذوق کے اشعار کا بھی موضوع بن چکے ہیں۔ ؎

(ع) تھی وہ انگشت نبیؐ جس نے کیا ماہ کو شق

ہے مسجود ملائک یہ ظلوم اور جہولا — یعنی انسان ہی بحیثیت ضعیف الخلقت
بنا آدمی کو ذوق ایک جز ضعیف — اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لیے
بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی — جز ضعیف محرم اسرار کل ہوا

یہاں ہم اقبال اور ذوق کے بیان میں ایک نمایاں فرق محسوس کریں گے۔ ذوق کے ہر شعر سے ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی فضیلت اور اس کا شرف ذاتی اور اصلی نہیں بلکہ خالق کا عطا کردہ ہے۔ اور خالق و مخلوق کا یہی فرق ہر موقع پر ان کے سامنے رہا۔ اُن کے خیال میں کوئی بڑے سے بڑا ولی اور بزرگ بھی اپنی ولایت اور بزرگی کے باوصف خود خدائی کا دعویٰ نہیں کر سکتا ورنہ وہ اپنی ولایت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اقبال نے اس کے برعکس خودی پر زور دیتے ہوئے اکثر انسان کو "مختار کل" قرار دے دیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو ان حدود سے بھی تجاوز کر گئے ہیں ع

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ذوق نے ان حدود کا ہمیشہ پاس کیا ہے بلکہ ایک موقع پر انھوں نے "انانیت" پر اس طرح طنز بھی کی ہے۔ ؎

حق تو یوں ہے یہ انانیت عجب غماز ہے — قصہ پہنچایا زبان دار پر منصور کا

اثبات خودی کا ایک اور مقام مسئلہ خیر و شر[۱۱] ہے۔ اقبال کے نزدیک تخلیق انسانی کا مقصد حصول لذت نہیں بلکہ خودی کا تحقق کمال اور نشو و نما ہے۔ اصل مشیت الٰہی اور فطرت میں خیر و شر کچھ نہیں بلکہ خودی تسخیر فطرت میں مصروف ہوتی ہے تو خیر و شر کا امتیاز پیدا ہوتا ہے۔ خودی معیار خیر و شر ہے۔ ؎

خود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل — جو ہو نشیب میں پیدا قبیح و نامحبوب

"خیر و شر کا امتیاز عقل سے ہوتا ہے۔ شر کے ازالہ کا نام خیر ہے شر کا مقابلہ مردانہ وار کرنا چاہیے کیونکہ اس سے خودی کی تکمیل ہوتی ہے۔"

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

خیر و شر کی اس معرکہ آرائی[۱۲] کو ذوق نے مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے۔ ؎

مقدم صدق پر ہو کذب گرچہ صدق لائق ہے — کہ پہلے صبح کاذب یاں ہے پیچھے صبح صادق ہے
حلس فن کا کھٹکا ہے بغل میں موجود — دیکھ گل دعوئ نازک بدنی خوب نہیں
زیادہ دشمنی ہے اہل کرم سے کج رو چرخ — یہ تاک ہے جھکا دوں شاخ ثمردار کو توڑ دوں

لیکن ذوق ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ

نہ ہوئے وہ ترک سجدہ ابلیس سے آدم — عدو کی سرکشی سے فرق تک نہ ہو کم میرا
جہاں میں عیش و عشرت ہے سوا چند دن کم کا — اگر ہو عید کا کل دن تو تیرہ ہو محرم کا
پیش دشمن نہ گذر حق سے نہیں پاک کو آنچ — بلکہ ہے آتش نمرود گلستان خلیلؑ
اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکساروں سے — تعجب کیا کہ ابلیس لعین دشمن ہے آدم کا

خودی کا ایک مقام مسئلہ جبر و اختیار ہے۔ انسان کی ایک نسبت خدا سے ہے جہاں وہ مجبور ہے۔ دوسری نسبت کائنات سے ہے جہاں مختار ہے اور اسے قوت تخلیق بھی ہے۔ ذوق نے ایک ہی شعر میں انسان کی دونوں حیثیتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ؎

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے — کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

اقبال نے اس سلسلہ میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ فعل تخلیق میں انسان کو خود خدا کا شریک بنا دیا ہے۔ تخلیق کا ایک تعلق مادیات اور عالم جسمانی سے ہے اور یہاں انسان مجبور ہے۔ کوہ و دریا شجر و حجر کی تخلیق صرف خدا کا حق ہے لیکن عالم جسمانی اور عالم مادی میں نظم و ترتیب پیدا کرنا انسان کا حصہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔ ؎

---

[۱۱] اس سلسلہ میں ہمارے پیش نظر مولانا عبدالسلام ندوی کی اقبال کامل مطبوعہ ۱۹۴۸ء ہے۔

[۱۲] اس پر اقبال کا مصرع یاد آتا ہے ع رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

خودی میں عقل و عشق کا بھی مسئلہ آتا ہے۔ اقبال عقل کے مقابلہ میں عشق کو ترجیح دیتے ہیں۔ ؎

بے عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے   عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

ذوق بھی عشق کی اہمیت کے قائل ہیں۔ صرف چند شعر نقل کرتا ہوں۔

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلیے   یہی چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلیے

عشق ہو لے ذوق وہ کافر کہ جس کے ہاتھ سے   شیخ صنعاں سا مسلماں تہ بہ زنار بنے

اس شعر پر اقبال کا شعر بھی یاد آتا ہے۔ ؎

حسن کی تاثیر پر غالب نہ آسکتا تھا علم   اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

اسی طرح اقبال کا ایک مشہور شعر ہے۔ ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق   عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہی مضمون ذوق نے بھی باندھا ہے۔ ؎

گر پڑا آگ میں پروانہ دم گرمی شوق   سمجھا اتنا بھی نہ کم بخت کہ جل جاؤں گا

اب چند متفرق اشعار نقل کرتا ہوں جن سے اندازہ ہوگا کہ بعض اوقات اقبال کا انداز فکر ذوق سے کتنا قریب ہو جاتا ہے۔

اقبال۔ مجھے پھونکا ہے سوز قطرۂ اشک محبت نے   غضب کی آگ تھی پانی کے چھوٹے سے شرارے میں

ذوق۔ ہمارے سینہ میں دو آہ آتشیں ہو ذوق   کہ برق دیکھے تو فی النار والسقر ہو جائے

اقبال۔ چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے   جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے

ذوق۔ کوئی ہے کافر کوئی مسلماں جدا جدا ہر کسی کی ہے راہ   جو اس کے نزدیک رہبری ہو وہ اس کے نزدیک رہزنی ہے

اقبال۔ خودی کیا ہے راز درون حیات   خودی کیا ہے بیداری کائنات

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے   نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

ذوق۔ جسے کہتے ہیں بحر عشق اس کے دو کنارے ہیں   ازل نام اس کنارے کا ابد نام اس کنارے کا

اقبال۔ جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود   کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ذوق۔ پرے جا کر بھی دنیا سے بھی گر ڈھونڈو دنیا میں   تو خالی خاک آدم سے نہ چپہ بھر زمیں نکلے

اقبال۔ پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر   مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

ذوق۔ نازک کلائیاں مری توڑیں عدو کا دل   میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

مختلف نظامہائے حکومت اور سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش اس صورت میں ذوق کے زمانے میں نہ تھی جو آج ہے سیاسی اور اقتصادی شعور بھی اس پیمانے پر نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے ذوق کے یہاں ان مسائل پر بحث نہیں کی گئی ہے اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اقبال کے سامنے ملکی اور قومی تنظیم کا مسئلہ بڑی اہمیت اختیار کر چکا تھا اس لیے انھوں نے جدید مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔[۱۱] پھر بھی ذوق کے سامنے ایک معیار ضرور تھا اور وہ یہ کہ انسان اپنے اصولوں کا پابند ہو اور صحیح معنی میں انسان ہو۔ چناں چہ ان کے یہاں اس قسم کے اشعار کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ ؎

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے   ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے

ہم ہیں غلام ان کے جو ہیں فلک کے بندے   اس کو یقین جانو گر ہو خدا کے بندے

صوفی ہو کہ ہو مسکش قائل مرے دونوں ہیں   پر مذہب و مشرب سے غافل مگر دونوں ہیں

نے زہد سے ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو   ہیں بادہ کش عشق و مئے آشام محبت

اخوان شیاطیں ہیں یہ مست مے پندار   کیا حضرت آدم کی بھی اولاد یہ خر ہے

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلیے

---

[۱۱] اقبال خود لکھتے ہیں   تری نگاہ میں ہے معجزات کی دنیا   مری نگاہ میں ہے حادثات کی دنیا
لیکن یہ سمجھنا چاہیے کہ اقبال معجزات کی دنیا کے منکر نہیں۔ وہ اپنے مقصد کے تحت اس دنیا سے زیادہ حادثات کی دنیا کو اہمیت دیتے ہیں کیوں کہ یہی حیات و ممات کی دنیا بھی ہے۔

مغربی سنکٹ

(بسلسلہ صفحہ ۱۸)

سرحدی جھگڑے کے قطعی تصفیے تک چینی فوجوں کا تخلیہ کیا ہوا علاقہ غیر فوجی منطقہ رہے گا جس میں باہم اتفاق سے سول حکومت کا ذریعے انتظام کیا جائے گا۔ بھارت نے یہ تجویز مان لی ہے اور اپنی امن پسندی ثابت کر دی ہے لیکن چین نے انھیں ماننے سے صاف انکار کر دیا ہے۔

افسانہ

وطن کے سپوت

جنید شرفی

"تین بار میرے قریب سے ہو کر موت لوٹ چکی ہے"۔
کرتار سنگھ نے بڑی امید سے سوچا "شاید میں ابھی نہیں مروں گا"۔
اس نے آنکھیں کھولنی چاہیں مگر اس کا چہرہ سوج گیا تھا، پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ جسم تو اس کا زخموں سے چھد ہی گیا تھا! کرتار سنگھ نے آنکھیں کھولنے کی پھر کوشش کی، اور پلکوں کے کنارے سے دیکھنے کے لیے راستہ بنا لیا۔ اسے ہر چیز دھندلی معلوم ہو رہی تھی، جیسے رنگوں کا جال پھیل گیا ہو۔ نیلے، پیلے اور جامنی!

"اف!" اپنے دل میں گرو کی بانی کو دہرایا۔

"میری آنکھیں سلامت ہوں، ہاتھ پیر بھی! ایک بار پھر میں زرد چہرے اور چپٹی ناک والوں سے دو دو ہاتھ کر سکوں"۔

کرتار سنگھ نے دھندلی آنکھوں سے دیکھا۔ سفید کوٹ سفید ساڑھیاں باندھے، ڈاکٹر اور نرس ادھر سے ادھر دبے دبے قدموں سے چل رہے ہیں۔ دواؤں کی تیز بو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ ذرا اور کوشش کی تو اسے خیمے کی دیوار نظر آئی جو ترپال سے بنی ہوئی تھی، اس کے کان میں ہلکے ہلکے قدموں کی آواز آرہی تھی۔ ویسے مکمل سکون تھا۔ بہت سارے جوان اسٹریچر پر پڑے تھے لیکن سب کے سب خاموش تھے جیسے کہ انہیں ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس ہو۔ ڈاکٹروں اور نرسوں کی مستعدی دیکھ کر کرتار کو بے حد خوشی ہوئی۔ کتنا اونچا آدرش ہے ان لوگوں کا کتنا محبت بھرا دل ہے!

پانچ دن پہلے وہ محاذ پر تھا۔ اپنی کمپنی کے ساتھ دشمنوں کو روکنے کی جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ دشمن شدید گولہ باری کر رہے تھے ایک ایک قدم بڑھانا مشکل ہو رہا تھا۔ سرنگوں اور بموں کے دھماکے سے معصوم بچے کی طرح زمین کانپ رہی تھی۔ گولیاں جوانوں کے سروں کے اوپر سے گذر رہی تھیں حیات اور موت کے درمیان کتنی ہیبت ناک جنگ چھڑی ہوئی تھی، مگر جوانوں کا دل ایک خاص جذبہ سے سرشار تھا وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھے۔ ان کے افسر کا حکم تھا کہ دشمنوں کو جہاں تک بھی ممکن ہو سکے روکا جائے۔ چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

زندگی کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ چوپائے کی طرح زندہ رہا جائے، موت کے بعد بھی زندگی شروع ہوتی ہے۔ امر زندگی یہ زندگی تو کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ اور پھر دیس کی حفاظت میں اس کا بھی حصہ ہوگا۔ کرتار سنگھ نے اپنی رائفل کو بوسہ دیا۔ اسے اس بوسے سے اتنی راحت اتنی مسرت ہوئی کہ مسکرانے لگا۔

سومیش بھاٹیہ لائنس مین نے دشمنوں کی تعداد کے بارے میں اشارہ کیا۔ کرتار سنگھ کے دستے میں چوبیس جوان تھے۔ کیپٹن دینیش نے جو شری اتر پردیش کا تھا، ذہین، ہوشیار اور بانکا نوجوان جس کی شاید ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی، جس کے خواب سنہرے تھے، جس نے اپنے گاؤں میں کتنی کنواریوں کے دل میں سپنا جگایا ہوگا، سب کچھ بھول کر

اپنے دیس کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا۔ اس نے سب جوانوں کو دیکھا اور تیز آواز میں بولا:

"جوانو! دشمن ہم سے تعداد میں زیادہ ہے۔ ایک چیز جو ہمیں ان سے ممتاز کرتی ہے وہ ہے ہماری ہمت اور ہمارے دیس باسیوں کی پوری طاقت، وہ سب ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہم تعداد میں کم ہیں لیکن ہمارا ایک جوان دس کے مقابلے میں کافی ہے اس طرح ہم دو سو چالیس ہیں۔ ہم خندق سے باہر آکر ان کا مقابلہ کریں گے۔"

یہ کہہ کر دینیش کرتار سنگھ کے پاس آیا۔ وہ دستے کا پرانا سپاہی تھا اور تجربے کار بھی۔

"کرتارے ——" وہ اپنی ملائم آواز میں بولا

کرتار سنگھ نے اسے دیکھا اور بولا۔ "آپ جو بھی حکم دیں گے وہی ہوگا۔"

ایک بار پھر دشمنوں نے بھاری تعداد میں گولہ باری شروع کی۔ اور یہ سمجھنا آسان تھا کہ دشمن کے سپاہی چوکی کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ دینیش کے بنائی ہوئی مخصوص ذہنی تکنیک کے تحت جوان خندق سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ جوان بڑی ہوشیاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ہر جوان اپنی جگہ پر زیادہ سے زیادہ جواں مردی دکھلانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کرتار سنگھ اپنی تجربہ کار آنکھوں سے "سچویشن" کا مطالعہ کر رہا تھا کہ یکایک اس کے قریب ایک گولہ آکر پھٹا، وہ منہ کے بل گر پڑا۔ اس کے چاروں طرف دھوئیں کا بادل پھیل گیا۔ اس نے جب سانس لینے کی کوشش کی تو اس کے گلے میں عجیب قسم کی جلن محسوس ہوئی اور کھانسی آنے لگی۔ گولیوں کی سنسناہٹ ہی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پہلو بھی نہ بدلا جا سکا اور اسے ایسا درد محسوس ہوا کہ سسکی سی کرنے لگا۔ چلنے کی صلاحیت تو تھی ہی نہیں۔ بڑی مشکل سے اس نے ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنے چہرے کے قریب لایا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ خون اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ اس کی وردی بھی خون سے تر تھی۔ گولے کے ریزوں نے اس کے سارے جسم کو صدمہ پہنچایا تھا۔

"اُف! آہ!!" اس کے منہ سے تکلیف کی آواز نکلنے والی ہی تھی کہ اس نے اسے وہیں دبا دیا۔ "دوسرے جوانوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی —— دینیش ہمارا نوعمر کیپٹن کتنی جواں مردی سے اپنے دشمنوں کے خلاف لڑ رہا ہے —— دھرتی ماں تو نے کیسے کیسے سپوت پیدا کیے ہیں!"

جب اسے اپنے خون کا عجیب ذائقہ محسوس ہوا تو اسے گھن معلوم ہوئی۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں —— اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

پھر آہستہ آہستہ اسے ہوش آنے لگا۔ اب بھی گولیوں اور گولوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سر کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر جوانوں کے بارے میں سوچا۔ "کیا وہ سب بچ گئے ہوں گے —— دشمن بہت تیزی سے گولہ باری کر رہا ہے۔" اس نے گرو سے پرارتھنا کی!

آنکھوں میں گرد پڑ گئی تھی جس کی وجہ سے کڑواہٹ ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا۔ وہاں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ اسے دو گھنٹے پہلے کا گذرا ہوا واقعہ یاد آگیا۔ "کیپٹن دینیش نے ضرور اپنے ساتھیوں کو نکال لیا ہوگا۔" کرتار سنگھ نے سوچا۔ یکایک اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے کنارے کوئی کھڑا ہے۔ "یہ اپنی طرف کا ہے۔" اس نے کسی طرح آنکھیں کھول کر دیکھا۔

"ارے!" اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

وہ کیپٹن دینیش تھا جو اسے بچانا چاہتا تھا۔ کیپٹن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"کرتارے ہمارے جوان شہید ہو گئے، لیکن انھوں نے دشمنوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ایک ایک جوان اتنی ہمت اور جواں مردی سے لڑا کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔ کسی نے بھی پیٹھ نہیں دکھائی! اور وطن پر قربان ہو گئے! کرتارے! وقت بہت کم ہے۔ ہمیں جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ آؤ! میں تمھیں سہارا دوں۔ اگرچہ میں خود بھی زخمی ہوں

لیکن میرے زخم تمھارے مقابلہ میں معمولی ہیں۔"

"نہیں نہیں کیپٹن یہ نہیں ہوسکتا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بہادر آدمی ہیں۔ کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بزدلی دکھائی کہ پہلے ہی زخمی ہوگیا۔ مگر ظالم چینیوں سے بدلہ ضرور لوں گا ایک ایک جوان کا بدلہ۔ دھوکے بازوں کی جیت انھیں تھوڑی دیر کے لیے خوش کرسکتی ہے۔۔۔۔ لیکن کب تک کیپٹن؟" وہ اتنی تیز آواز میں دھاڑا کہ زخم سے خون بہنے لگا۔ دینیش کے جسم سے بھی کافی خون نکل گیا تھا مگر اس نے کرتار سنگھ کو بازوؤں میں سنبھالا۔

کرتار سنگھ چیخا: "کیا کرتے ہیں کیپٹن! آپ تو خود زخمی ہیں، مجھے چھوڑ دیجیے۔ آپ خود محفوظ مقام پر چلے جائیے۔"

مگر دینیش نہ مانا اور کرتار سنگھ کو ساتھ لیے چل پڑا مگر اسے کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں تھا حالاں کہ زخم اور بوجھ کی وجہ سے اس کا سارا جسم دکھ رہا تھا۔ آخر ایک مقام پر دونوں گر پڑے کافی خون نکل جانے سے دینیش کا چہرہ زرد ہوگیا تھا۔ کرتار سنگھ بولا:

"آپ نہیں مانے کیپٹن! آپ اپنی تکلیف چھپانا چاہتے ہیں۔ بیشک آپ جیسے بیٹے پر بھارت ماتا کو فخر ہے۔ اپنی جان کی پروا نہ کرکے مجھے بچانا چاہتے ہیں۔ اب ایسی حالت میں ہم دونوں موت کو گلے لگا لیں گے۔ مجھے ایک بات آج معلوم ہوئی کہ یہ موت بھی کتنی ڈرپوک اور بزدل ہے!" زور سے ہنسا۔

وہ پھر بولا: "مگر کیپٹن اس وقت زندگی پیاری معلوم ہو رہی ہے۔ اگر مرگیا تو میری روح کو چین نہ ملے گا۔ میں ناپاک دشمنوں سے بدلہ نہ لے سکوں گا اور یہ کتنی ذلیل بات ہوگی۔"

نقاہت سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اور اسے ہوش نہ رہا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ اسٹریچر پر پڑا تھا۔ ڈاکٹر اس کے زخموں کی ڈریسنگ کر رہا تھا اب بھی اسے بہت تکلیف تھی۔

"ڈاکٹر!" وہ اپنی کمزور آواز میں بولا۔ "کیپٹن دینیش کیسے ہیں۔ وہ اچھے ہیں نا؟ وہ۔۔!"

"ہاں جوان! وہ تمھیں یاد کر رہا تھا۔"

"اچھا! اچھا ان سے کہہ دیجیے کہ کرتار اچھا ہے۔ وہ زندہ ہے اور مکار دشمن سے اپنے ایک ایک جوان کا بدلہ لینے کے لیے زندہ رہنا چاہتا ہے۔"

ڈاکٹر نے اسے بولنے سے روکنا چاہا مگر کرتار سنگھ کہتا رہا "ڈاکٹر! بس مجھے جلد اس قابل بنا دیجیے کہ ایک بار پھر کیپٹن دینیش کی کمان میں دشمنوں کے چھکے چھڑانے اور مقدس سرزمین کو ان کے ناپاک قدموں سے پاک کرنے کے لیے مورچہ پر جا سکوں۔"

اور پھر اسے اپنے دستے کے جوانوں کا خیال آگیا: "یہ ہیں وطن کے سپوت جنھوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔"

اس کے چہرے پر فخر اور غرور کی ایک خاص کیفیت نمودار ہوئی اور وہ بڑبڑایا: "ہم ظالم چینی حملہ آوروں کو کچل کر رکھ دیں گے۔ بزدل، ذلیل چینیوں کو!"



"دل بندی سے علاحدہ رہنے کی ہندوستان کی پالیسی سے دنیا کو فائدہ پہنچا ہے لیکن بہرحال ہندوستان جمہوریت آزادی اور ہر طرح کے تنازعات کو پرامن طور پر حل کیے جانے کا حامی ہے۔ ہم مفاہمت اور امن کیلیے کوشاں رہتے ہوئے جمہوریت، آزادی، پرامن تبدیلیوں اور دنیا کی طاقتوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی بنیادی قدروں کو اپنانے کا عہد کرچکے ہیں۔" ——— رادھا کرشنن (صدر جمہوریہ ہند)

چین کا محنت کش طبقہ

پرساد

سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے بعد چینی کمیونسٹ پارٹی نے ورکر کو "حکمراں طبقے" کا درجہ دیا اور اعلان کیا کہ "ورکر ہی خاندان کے سیاہ و سفید کا مالک ہے"۔ ساتھ ہی تمام شہروں میں ورکروں کے ثقافتی محل "کھڑے کیے گئے" اور تفریحی کلب بنائے گئے۔

مگر جیسے ہی "لمبی چھلانگ" کی مہم چلی ورکروں کی زندگی مجموعہ آفات بن گئی۔ انھیں وہ مزدوری ملنے لگی جو گذارے کے لیے بھی ناکافی تھی۔ کام کرنے کے حالات خراب ہوتے گئے، اور ہر قدم پر پارٹی کی نگرانی بڑھتی چلی گئی۔

محنت کش بچے۔ چین میں مزدوروں کو عمر کے اعتبار سے تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اپرنٹس ورکر، ٹکنیکل ورکر اور ٹیکنی شین۔ پہلے زمرے میں ۱۲ سے ۱۶ سال کی عمر تک کے بچوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ ابتداً ان کی اوسط ماہانہ اجرت ۲۱ تا ۲۶ جے ایم پی (چینی سکہ) یا ۵۰ تا ۸۵ روپے ہوا کرتی تھی۔ پیکنگ اسٹیٹ کونسل نے ۱۹۵۶ء میں اسے بہت زیادہ قرار دے کر ۲۴، ۲۹ اور ۳۴ روپے کی حدیں قائم کر دیں۔ اس کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی ختم کر دی گئیں اور انھیں اپنی خوراک بھی خریدنے پر مجبور ہونا پڑا۔

کسی ٹکنیکل اسکول سے ڈپلوما حاصل کرنے والے اپرنٹس ٹکنیکل ورکروں کو ۳۵ تا ۴۰ روپے ماہانہ دیے جاتے ہیں۔ ایک یا دو سال کے بعد "لائق اعتبار" ورکروں کو پہلا گریڈ دیا جاتا ہے۔ ٹیکنی شینوں پر ۱۹۵۸ء تک زیادہ مہربانی تھی۔ لیکن اس سال ورکروں کی زمرہ بندی ختم کر دی گئی تو ان کی بھی حالت خستہ ہو گئی۔ انھیں ایک دو دو سال زیر تربیت رکھا جاتا ہے۔ اس مدت کے ختم پر پارٹی کے وفادار ورکروں کو اسسٹنٹ ٹیکنی شین مقرر کیا جاتا ہے اور ۵۳ تا ۶۷ روپے کی اجرت دی جاتی ہے۔

سیاسی بنیادوں پر تنخواہیں۔ چین میں کسی بھی فیکٹری کی تنظیم کو یہ اختیار حاصل ہے کہ سیاسی معیاروں کے مطابق ورکروں کی تنخواہوں پر نظر ثانی کرے۔ کوئی ورکر، چاہے وہ کتنا ہی لائق کیوں نہ ہو، اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا یا اونچی اجرت نہیں پا سکتا جب تک کہ وہ پوری طرح کمیونسٹ نہ ہو۔

عوام کے کیے ہوئے کام پر اجرت میں اور عام ورکروں کو ملنے والی اجرت میں بہت بھاری فرق ہوتا ہے مثلاً لویانگ میں تیار کیا ہوا تنگ مان ہونگ — ۵۴ ٹریکٹر، روس ساختہ اسٹالن ۸۰ ٹریکٹر اور برطانیہ ساختہ فرگوسن۔ ۵۳ ٹریکٹر کو جوڑنے اور صاف کرنے کے لیے ڈیڑھ ہزار گھنٹوں کا کام درکار ہے اور اس کے لیے چار ہزار روپے اجرت دی جاتی ہے۔ لیکن ورکروں کو دی جانے والی اجرت ۶ آنے پیسے فی گھنٹہ ہوتی ہے اور اس حساب سے زیادہ سے زیادہ ۲۲۰ روپے ہوتی ہے۔ فیکٹریوں کے باہر کلینگ کا کام کرنے والے میکینکوں کی اجرت ۲۰ تا ۲۸ روپے ہے

لیکن حقیقت میں انھیں روزانہ ایک روپیہ ۶۰ نئے پیسے ہی ملتے ہیں۔

لباس کے لیے کوپن۔ فیکٹریوں میں ۱۹۵۸ء سے پہلے کام کا لباس، دستانے، چشمے اور جوتے فیکٹری کی طرف سے دیے جاتے تھے لیکن "لمبی چھلانگ" کی مہم شروع ہوتے ہی ورکروں سے یہ ساری سہولتیں چھین لی گئیں۔ انھیں لباس کے لیے اب کوپن لینا ہوتا تھا جس کے تحت ایک آدمی کو سال میں صرف ۲ فیٹ کپڑا ملتا تھا جو پاجامے کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکتا تھا۔ دستانوں، جوتوں اور کام کے لباس کے لیے اجرتوں ہی کے کوپن دیے جاتے تھے۔ ایک مستری کو ربڑ کے جوتے حاصل کرنے کے لیے کئی مہینوں تک اجرت کوپنوں کے ۳۲ پوائنٹ یعنی تنخواہ کے پورے ۲۰۔۴ روپے جمع کرنا ہوتا ہے۔

ورکروں سے کام لینے کے لیے چینی کمیونسٹوں نے نئے نئے طریقے نکالے ہیں جن میں ایک طریقہ مقررہ وقت سے زیادہ کام لینا ہے۔ ایک نیا نعرہ یہ لگایا گیا ہے کہ "کاروبار پھیلاؤ، جنگ کی طاقت بڑھاؤ، نئی تکنیکیں معلوم کرو اور دولت کے نئے ذرائع پیدا کرو۔" اس سلسلے میں کام کا ایک عجیب و غریب ڈھنگ نکالا گیا۔ فیکٹریوں میں اکٹھا کام لینے کی جگہ ورکروں کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ کم لوگ زیادہ کام کریں۔ مثلاً ایک انجینیرنگ ریپیر فیکٹری کو لے لیجیے۔ اس میں فورجنگ، ویلڈنگ، ایرا اور کاسٹنگ جیسے علاحدہ ورک شاپ بنا دیے گئے۔ ورک شاپ کو چند گروہوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر گروہ چند قسموں پر مشتمل ہوتا تھا یعنی ہیٹل شاپ کو آٹوموبیل، ٹریکٹر اور چند دوسرے زمروں میں تقسیم کیا گیا۔ ہر گروہ کے ذمے کئی طرح کے کام تھے۔ ان ذمہ داریوں کے علاوہ ورکروں کو دوسری ذمہ داریاں بھی پوری کرنی پڑتی تھیں۔ اسے محنت کا موثر استعمال سمجھا جاتا تھا۔

زیادہ کام لینے کا ایک طریقہ یہ بھی نکالا گیا کہ کئی شفٹیں چلائی جائیں جنھیں "دوپہر کی جنگ" "رات کی جنگ" اور "صبح سے شام تک کی جنگ" جیسے نام دیے جاتے ہیں۔ لیکن شفٹوں میں اضافے سے اجرتوں میں اضافہ نہیں ہوتا۔ صرف رات کی جنگ لڑنے والوں کو چاول کا دلیہ دیا جاتا ہے اور اس کے لیے چاول عوامی طعام خانوں میں روزانہ کی خوراک سے کم کرکے بچایا جاتا ہے۔

تین ضمانتیں اور ایک انعام۔ چینی کمیونسٹوں نے ایک اور نظام بھی شروع کیا ہے جسے "تین ضمانتیں ایک انعام" اور "ایک سزا ایک معافی" والا نظام کہا جاتا ہے۔ اپنے کام کے سلسلے میں ورکر تین ضمانتیں دیتا ہے "کام کرنے کی، پیداوار بڑھانے کی اور کوالٹی بڑھانے کی۔" اب اگر کام میں تاخیر ہو یا مقررہ معیار سے کم کام ہو تو اسے سزا ملتی ہے۔ سامان یا مال کو کسی حادثے کے سبب اگر نقصان پہنچ جائے تو ورکر کو اس کی تلافی کرنی پڑتی ہے۔ انعام صرف ان خوش نصیبوں کو دیا جاتا ہے جو نظریاتی طور پر بیدار سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ورکر کی مہارت کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔

پارٹی کا کنٹرول۔ فیکٹریوں اور کانوں پر کنٹرول وہاں کی پارٹیوں اور لیگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہر فیکٹری میں پارٹی کمیٹی اور لیگ کمیٹی ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر ورک شاپ اور گروپ میں بھی پارٹی اور لیگ کی سطح کی تنظیمیں ہوتی ہیں۔ یہ تمام ادارے ورکروں کی بات چیت اور ان کے کام پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور ہڑتالیں ہونے نہیں دیتے۔

ہر مہینہ ایک چھوٹا سا گروہ ورکروں کا موازنہ کرتا ہے۔ ہر تین مہینے میں ایک بار فیکٹری اور سال میں ایک بار پارٹی کمیٹی ان مزدوروں کے ساتھ انصاف کرتی ہے۔ ہر ورکر کے گلے میں تنظیمی عملے کا پھندہ پڑا رہتا ہے۔ اس کے خلاف کی ہوئی کارروائیوں اور اس کے کاموں اور بات چیت کا پورا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔

ملیشیا کی تشکیل۔ ورکروں پر کنٹرول کے لیے ایک اور آرگنائزیشن "ملیشیا" کام کرتی ہے اور پارٹی ورکروں کو بریگیڈ، کمپنی، پلاٹون اور اسکواڈ کی صورت میں منظم کرتی ہے۔ انھیں کام شروع کرنے سے پہلے اور اس کے بعد پریڈ کرنی ہوتی ہے اور سونے سے پہلے سب کی حاضری لی جاتی ہے۔ اس کا مقصد اس تنظیم کو فوجی مزاج دینا، کام میں فوجی پھرتی پیدا کرنا اور اجتماعی زندگی کو

جنم دینا ہوتا ہے۔

جو اس معاملے میں پیچھے رہ جاتا ہے اس کی بریگیڈ کے سامنے لعنت ملامت کی جاتی ہے جو اس کے راشن میں کمی کر دی جاتی ہے اور جب کوئی ورکر احتجاج کرتا ہے تو اس کے اور اس کے خاندان کا راشن روک دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنی تنخواہ میں اضافہ کا مطالبہ کرتا ہے تو اسے "ذات پرست" یا "خود پرست" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

میاں بیوی اکٹھا رہ کر کام کرنا چاہیں تو انھیں مریض عشق اور سرمایہ دارانہ فلسفہ نواز کہہ کر طعنہ دیا جاتا ہے اس کے سبب ورکروں کو تنزلی، تنخواہ میں کمی یا زیر تربیت عرصے میں اضافے وغیرہ کی سزائیں بھگتنی پڑتی ہیں۔ اگر کسی ورکر نے راست بازی اور کھرے پن سے بات کی تو دوسرے دن اسے ایک بہت ہی دور افتادہ دیہات میں بھیج دیا جاتا ہے۔

چین کی ٹریڈ یونینیں۔ مزدوروں کی فلاح و بہبود کا خیال کرنا ہر جگہ کی ٹریڈ یونینوں کا روایتی فرض ہوتا ہے لیکن کمیونسٹ چین میں ایسا نہیں۔ وہاں ٹریڈ یونینوں کو مزدوروں کی بہبود کے بجائے پارٹی کی پالیسیوں کو فروغ دینے سے ہی سروکار ہے۔

ایک اور فرق یہ بھی ہے کہ آج کے چین میں ٹریڈ یونینیں مزدور کی زندگی کے ہر پہلو سے جس میں خالص نجی معاملات بھی شامل ہیں حصا(؟) ہیں۔ چینی مزدور کو پارٹی کی کڑی نگرانی کے تحت رکھا جاتا ہے اور اس کی نجی زندگی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ پارٹی ٹریڈ یونینوں کو اس کی ہر حرکت کی نگرانی کے لیے استعمال کرتی ہے۔

پارٹی کے آلۂ کار کے طور پر ٹریڈ یونینوں کے کردار کو چین میں کھلے بندوں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ پیکنگ کے ایک اخبار ڈیلی ورکر نے اپنی ۱۹ ستمبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ پارٹی ٹریڈ یونینوں کی ہمیشہ بحیثیت کل قیادت کرتی ہے اور ٹریڈ یونینیں پارٹی کے معاونین کے فرائض ادا کرتی ہیں۔

چال چلن سے متعلق فائلیں۔ چین میں ٹریڈ یونینوں کا کام ملازمین اور مزدوروں کے چال چلن اور حرکات و سکنات سے متعلق مکمل اطلاعات کی فائلوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔ ڈیلی ورکر کی ۳۰ اکتوبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں ٹریڈ یونینوں کے کام کے اس اہم پہلو کا واضح طور پر حوالہ دیا گیا ہے۔ چینی ٹریڈ یونینوں کا مقدم طور پر مزدوروں کی خانگی سرگرمیوں پر مسلسل نگرانی اور کنٹرول رکھنے کا ذکر بھی اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

ٹریڈ یونینوں کی نگرانی سے جو کہ درحقیقت پارٹی کی نگرانی ہے مزدوروں سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز بچ نہیں پاتی حتیٰ کہ شادی جیسے ذاتی معاملات بھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

ملازمین اور مزدوروں کو گھر جانے کی چھٹی سے متعلق چین کی وزارت محنت کے لیبر پروٹیکشن بیورو نے حال ہی میں جو قوانین نافذ کیے ہیں ان میں مزدور کی زندگی پر رکھے جانے والے کڑے کنٹرول کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں اس موضوع کے بارے میں پیکنگ کے اخبار کنگ جن جی پاؤ کے مدیر کی طرف سے دی گئی وضاحتیں خصوصی دل چسپی کی حامل ہیں۔ انھیں لیبر پروٹیکشن بیورو کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ۱۹ دسمبر ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں سوال و جواب کے سلسلے کی صورت میں شایع کیا گیا جس میں سوال کا جواب کہ اگر کوئی مزدور گھر جانے کے لیے چھٹی لینا چاہتا ہو تو اسے کن شرائط کو پورا کرنا چاہیے، درج ذیل ہے:۔

چھٹی کی شرطیں۔ اگر کوئی مزدور گھر جانے کی چھٹی لینا چاہتا ہو تو اسے مندرجہ ذیل تین شرطوں کو پورا کرنا چاہیے:۔

وہ مستقل مزدور ہو اور اس نے لگاتار ایک سال بلا رکاوٹ نوکری کی ہو، وہ اپنے والدین اور شریک حیات کے پاس نہیں رہ سکتا یا والدین کے پاس رہنے کی صورت میں اپنے شریک حیات کے پاس نہیں رہ سکتا اور وہ سرکاری چھٹیوں میں اپنے خاندان کے پاس نہیں جا سکتا۔

ایک دوسرے سوال کے جواب میں مدیر نے لکھا ہے کہ جب کوئی مزدور اپنی بیوی کے پاس رہتا ہے تو وہ گھر جانے کی چھٹی کا مستحق نہیں ہو سکتا کیوں کہ اگر ایسی صورتوں میں گھر جانے کی چھٹی عطا کی جائے تو بہت زیادہ لوگ ایسی چھٹی کے مستحق ہوں گے اور اس سے سرکار پر مزید بوجھ

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۸)

مراسلہ

ریختی کی جنم بھومی اور انشا کے چند شعر

ماہنامہ نیادور لکھنؤ کی مئی ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "ریختی اور انشا" شائع ہوا ہے۔ موصوف نے اپنے مضمون میں ریختی کا مولد لکھنؤ اور موجد سعادت یار خاں رنگین کو قرار دیا ہے۔ مضمون کے آخر میں اُنھوں نے انشا کی ہمہ دانی اور قابلیت کا اعتراف کرتے ہوئے اس امر پر تعجب ظاہر کیا ہے کہ اُن کے بعض اشعار مختلف اوزان میں اور ایسے اشعار کو بھی پیش کیا ہے۔ فاضل ڈاکٹر کے ان دونوں بیانوں سے مجھے اختلاف ہے۔

جہاں تک اُن کا یہ خیال ہے کہ ریختی کا مولد لکھنؤ ہے اس کے بارے میں مدیر نیادور نے اپنے فٹ نوٹ میں یہ ضرور لکھ دیا ہے کہ "یہ کہنا کہ لکھنؤ نے ریختی کو جنم دیا ایک ایسا دعویٰ ہے جو محتاجِ ثبوت ہے۔" میں مدیر نیادور مذکور کے فٹ نوٹ کی عبارت میں اتنا اضافہ اور ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کہنا کہ لکھنؤ نے ریختی کو جنم دیا نہ صرف محتاجِ ثبوت ہے بلکہ لکھنؤ پر ایک اتہام ہے۔ ادبیات کی تاریخیں شاہد ہیں کہ لکھنؤ بزمِ سخن کی تشکیل مہاجر اساتذہ دلی کے ہاتھوں ہوئی۔ اور یہی مہاجر نامورانِ فن اپنے فکری جواہر پاروں کے ہمراہ متعدد مخرب اخلاق اصنافِ سخن، مثلاً ریختی، زٹل، امرد پرستی، عریاں نگاری، فحش گوئی، معاملہ بندی، ادا بندی وغیرہ بھی اپنے ساتھ لائے جو بیکر شعر و ادب کے لیے متعدی بیماریوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ مذکورہ اصنافِ سخن میں ایک صنف بھی ایسی نہیں جو لکھنؤ کے ماحول کی آفریدہ قرار دی جا سکے۔

رہا "ریختی" کی ایجاد کا مسئلہ تو یہ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ریختی کا اصل موجد کون ہے۔ ڈاکٹر زور کا دعویٰ ہے کہ صنف ریختی کا موجد ہاشمی بیجاپوری ہے، جس کا عہد شاعری ۱۰۹۹ھ مطابق ۱۶۸۸ء ہے۔ ادھر سعادت یار خاں رنگین کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ صنفِ ریختی کے موجد ہیں۔ اب ہاشمی بیجاپوری کے مندرجۂ ذیل اشعار دیکھیے:—

پنچے پکڑیں آ ہیں گے چھوڑ دیکھو ہانک ماروں گی
خدا کی سوں میں نپٹ ہوں بڑی بوکر پکاروں گی

اُجڑ گئے، کیا ظلم کرتا، پڑوسی کوئی دیکھیں گے
سنجے تک چھوڑ دے بارے جو پردہ جا اُتاروں گی

ڈاکٹر گیان چند کہتے ہیں کہ اُردو کی ابتدائی شاعری، ہندی کی مقلد ہے اور "دکنی شاعری میں ایسے نمونوں کی کمی نہیں جن میں عورت مرد کے لیے اظہارِ شوق کرتی ہے۔" اس لیے "صرف عورت کی زبانی اظہارِ عشق کو ریختی نہیں کہہ سکتے۔" ورنہ امیر خسرو کی پہلی غزل بھی ریختی قرار پائے گی۔ ڈاکٹر گیان چند کا یہ فرمانا بجا ہے لیکن ہاشمی بیجاپوری کے مندرجۂ بالا اشعار کے متعلق اُن کا یہ کہنا کہ یہ اشعار "ریختی کے تمام تقاضوں کو پورا نہیں کرتے" صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اشعار کی فضا ریختی کے جملہ تقاضوں کو یقیناً پورا کرتی ہے۔ ان میں عریانیت بھی ہے اور نسوانی زبان بھی استعمال کی گئی ہے۔ ایسی صورت میں ہاشمی کو ریختی گو ماننا ہی پڑے گا اور اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ریختی نواب آصف الدولہ سے سو برس پہلے یعنی اس وقت جنم پا چکی تھی جب لکھنؤ میں شعر و سخن کا چرچا بھی نہیں شروع ہوا تھا اور اس کا جنم بھی لکھنؤ سے ہزاروں میل دور ہوا تھا۔

اب آئیے رنگین کی طرف۔ ڈاکٹر صابر علی خاں نے اپنی تصنیف سعادت یار خاں رنگین میں رنگین کے بارے میں لکھا ہے کہ "رنگین اپنے اوائل شباب ہی سے اپنی جنسی کمزوری یوں کلبے دھڑک استعمال معیوب نہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عیاش فحش شخص سمجھے جاتے رہے ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۶ء میں بمقام سرہند پیدا ہوئے۔ ۱۲۵۱ھ مطابق ۱۸۳۵ء وفات پائی۔ باعتبار سن ہجری اکیاسی سال عمر پائی۔ چودہ سال کی عمر سے شعر و سخن کی ابتدا کی، ۱۲۰۲ھ میں پہلا دیوان ریختہ مرتب ہوا۔ ۱۲۰۳ھ میں لکھنؤ پہنچے اور شاہزادہ سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔"

رنگین نے ۱۲۱۲ھ میں نواب آصف الدولہ کے انتقال کے بعد لکھنؤ چھوڑ دیا لیکن ان کے قیام لکھنؤ کے آٹھ برسوں میں کوئی شہادت اس امر کی نہیں ملتی

کہ انھوں نے صنفِ ریختی کی ابتدا لکھنؤ سے کی ہو۔ ہاں ڈاکٹر صابر علی خاں کی کتاب سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ رنگین نے لکھنؤ آنے سے بہت پہلے ریختی میں شاعری شروع کر دی تھی۔ چنانچہ رنگین کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ "...... اوائل عمر میں خانگیوں کی صحبت نے ریختی کی جانب متوجہ کیا، اور دلی کی بیگماتی زبان میں ریختی گوئی کا دور شروع ہوا۔" ان عبارتوں سے صریحی طور سے ثابت ہو جاتا ہے کہ رنگین کا دیوانِ ریختہ اُن کی آمد لکھنؤ سے دو برس پہلے یعنی ۱۲۰۰ھ ہجری ہی میں مرتب ہو چکا تھا۔ چوں کہ چودہ سال کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے اور عیاش منش بھی تھے، کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۴۴ برس کی عمر میں (یعنی لکھنؤ پہنچنے سے پہلے) ریختی میں بھی ان کا کافی ذخیرہ جمع ہو چکا ہو۔ بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ بہ قول ڈاکٹر صابر علی خاں، رنگین نے اپنی اوائل عمر ہی سے خانگیوں کی صحبت کے نتیجے میں دلی کی بیگماتی زبان میں ریختی شروع کر دی تھی۔ اس کے علاوہ ایک امر اور قابلِ غور ہے وہ یہ کہ بہ قول ڈاکٹر گیان چند لکھنؤ ریختی کا مولد ہوتا اور لکھنؤ میں ریختی پروان چڑھی ہوتی تو لکھنؤ اور بہت سے ریختی گو پیدا کرتا۔ جب تک ریختی گویان کی صنف میں لکھنوی شعرا سے لے دے کے صرف ایک جان صاحب ریختی و شاعری کی حیثیت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہلِ لکھنؤ کے نزدیک صنفِ ریختی نہ تو پسندیدہ اصناف میں شمار ہوئی اور نہ قابلِ تقلید سمجھی گئی۔ بلکہ اس کی نامقبولیت کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ اڈیٹر یادگار کے بہ قول (دنت نوٹ۔ نیا دور بابت سنہ ۶۲ء) لکھنوی شعرا میں جان صاحب کے علاوہ کوئی دوسرا ریختی گو شاعر نظر نہیں آتا۔ ان حالات کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ریختی لکھنؤ ہی میں پروان چڑھی۔

ڈاکٹر گیان چند صاحب کے زیر بحث مضمون کا دوسرا اہم پہلو انشا کے عروضی تجربات کا تجزیہ ہے۔ ڈاکٹر موصوف اس سلسلے میں رقم طراز ہیں کہ "انشا اپنے عروضی تجربات میں ہر جگہ کامیاب رہے لیکن ایک دو مقامات پر وزن میں کچھ سقم رہ گیا مثلاً"

یہ کیا تجھے بے خواہی نہ خواہی مجھ سے بکنا واہی تباہی

یہ پوری غزل فعلن فعولن فعلن فعولن کے وزن پر ہے لیکن شعر مذکور کا رکن ثانی سہواً فعلن رہ گیا ہے۔"

ڈاکٹر گیان چند نے زیر بحث شعر کے تعیّن اوزان و بحر میں تسامح برتا ہے اصل میں زیر بحث شعر کی تقطیع مندرجہ ذیل طریقے سے کرنا چاہیے۔

یہ کیا تجھے بے خواہی نہ خواہی مجھ سے بکنا واہی تباہی

یکُ، تجھ بے، خاہ، نخواہی مج سے، بکنا، واہ، تباہی

فعل، فعولن، فعلُ، فعولن فعلن، فعلن، فعلُ، فعولن

مذکورہ بالا تقطیع کے ارکان کی بحر کا نام، بحرِ متقارب مثمن اثرم سالم الآخر ہے۔ اور اثرم کے ساتھ ارکان اثلم کا استعمال عروضی اعتبار سے بلا تکلف جائز ہے۔

میر تقی میر نے بحرِ متقارب مثمن اثرم میں اس شدت کے ساتھ مختلف الوزن مصاریع کا اختلاط و ارتباط جائز قرار دیا ہے جو بعض اوقات موجبِ حیرت ہے۔ مثال کے طور پر یہاں چند اشعار میر کی مثنوی جوشِ عشق کے حاضر کرتا ہوں ڈاکٹر صاحب مصاریع کے مختلف الوزن استعمال ملاحظہ فرمائیں۔ میر کی اس تقلید میں جملہ مستند شعرا نے بھی یہ راہ اختیار کی اور اس کی بھی بے شمار مثالیں حاضر کی جا سکتی ہیں، مگر میں اس مختصر مضمون میں چند مثالیں حاضر کرنے پر اکتفا کروں گا۔

میر تقی میر نے بحرِ متقارب اثرم سالم الآخر کے ساتھ بحرِ متقارب کے متعلقہ زحافات کے مختلف انداز استعمال سے ۳۶ مختلف الوزن شکلیں حاصل کیں اور یہ سب ایک دوسرے وزن کے ساتھ بے دھڑک استعمال ہوئی ہیں۔ مگر بحرِ متقارب میں یہ تصرف صرف بحرِ متقارب مثمن اثرم سالم الآخر کے ساتھ ہی روا رکھا ہے۔

اشعارِ مثنوی جوشِ عشق

چشمِ رہ سارا چمن اُس کا نقشِ قدم تھا یاسمن اس کا

فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن فعل فعولن

صبر نے چاہی دل سے رخصت تاب نے ڈھونڈی اک دم فرصت

فعل فعولن فعلن فعلن فعل فعولن فعلن فعلن

خواب و خورش کا نام نہ آیا ایک گھڑی آرام نہ آیا

فعلُ فعولن فعل فعولن فعلُ فعولن فعل فعولن

گل آشفتہ اُس کے رو کا سنبل اک زنجیری مو کا

فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن

بستہ کرشمہ جانِ تغافل شایاں اس کے شانِ تغافل

فعل فعولن فعل فعولن فعلن فعلن فعل فعولن

سر پر اس کے ناز ہمیشہ جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ

فعلن فعلن فعل فعولن — فعلن فعلن فعل فعولن

تھا دیکھا اِک رہ پڑنے میں — برقِ خرمن مہ پردے میں

فعلن فعلن فعلن فعلن — فعلن فعلُ فعولن فعلن

اب ظفر کے شعر ملاحظہ ہوں :۔

گزرے جو ہم پر کیا کہویں — پوچھ نہ دل پر کیا کہویں

فعل فعولن فعلن فعِ — فعل فعولن فعلن فعِ

جھوٹی وہ تو بتاتے ہیں — باتیں ظفر پر کیا کہویں

فعلن فعل فعولن فعِ — فعل فعولن فعلن فعِ

بحرِ متقارب اثرم سالم الآخر کے ساتھ اس قبیل کے سیکڑوں دوسرے اشعار مستندین فن کے پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں مختلف الوزن مصاریع کے اختلاط و ارتباط کی شدت و بہتات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انشا کا زیرِ بحث شعر :۔

یہ کیا تجھے ہے خواہی نخواہی — مجھ سے بکسنا واہی تباہی

فعل فعولن فعل فعولن — فعلن فعلن فعل فعولن

میر کے اس شعر کا ہم وزن ہو جو بحرِ متقارب مثمن اثرم کے ساتھ اثلم کا تصرف ظاہر کرتا ہو۔

چشم کرشمہ جانِ تغافل — شایاں اس کے شان تغافل

فعل فعولن فعل فعولن — فعلن فعلن فعل فعولن

ایسی صورت میں انشا کے اس شعر کو بحرِ متقارب مثمن اثلم سالم الآخر کا وزن فعلن فعولن فعلن فعولن قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔

ڈاکٹر گیان چند نے انشا کے مندرجہ ذیل مطلعے کو بھی معیوب قرار دیا ہے :۔

نظر آتی ہیں اس میں پڑھنے کے گُن — جیسے کھیل میں بھی لگی ہو یہ دُھن

فعولن فعولن فعولن فَعَلْ — فعولن فعولن فعولن فَعَلْ

اور لکھا ہے کہ یہ پوری غزل فعولن فعولن فعولن فعولن کے وزن میں ہے مگر اس کے مطلعے کے دونوں مصرعوں میں آخری رکن فعل رہ گیا جو جائز نہیں انشا جیسے عالم سے اس کی توقع نہ تھی ممکن ہے کہ سہو کاتب ہو؟

ارکان فعولن فعولن فعولن فعولن بحرِ متقارب مثمن سالم کے اصل ارکان ہیں۔ عروضی کلیے کے اعتبار سے اس بحر کے عروض و ضرب یعنی مصرعہ اولیٰ و ثانی کے رکن آخر میں رکن سالم فعولن یا رکن مقصور فعول یا رکن محذوف فَعَلْ ہر طرح استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے استعمال کو ناجائز قرار دینا فن عروض کے ضابطوں سے بے خبری ظاہر کرنے کے برابر ہے۔ میں چند ماہرین فن کے ایسے اشعار حاضر کرتا ہوں جن میں انشا کے شعر کے وزن کا آہنگ موجود ہے۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جن میں مطلعے میں سالم ارکان کے ساتھ عروض و ضرب (دونوں مصرعوں کے رکن آخر) میں مقصور و محذوف شکلیں فعول یا فَعَلْ کا استعمال ہوا ہے۔

یہ حُسن و جوانی اور اُس پہ یہ غم — ستم ہے، ستم ہے، ستم ہے ستم (میر حسن)

فعولن فعولن فعولن فعل — فعولن فعولن فعولن فعل

کوئی ناامیدانہ کرتے نگاہ — سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے (میر)

فعولن فعولن فعولن فعول — فعولن فعولن فعولن فَعَلْ

پلا ساقیا مجھ کو جام شراب — وہ پانی کہ جس میں ہو سرتی کی آب (شاہ رؤف احمد ثاقب)

فعولن فعولن فعولن فعول — فعولن فعولن فعولن فعول

ڈاکٹر گیان چند ملاحظہ فرمائیں کہ بحرِ متقارب مثمن سالم کے مطلعوں میں رکن سالم فعولن کے بجائے فَعَلْ اور فعول محذوف و مقصور کا تصرف جید اساتذۂ فن کے یہاں موجود ہے اور یقیناً عروضی ضابطوں سے مختلف نہیں ہے۔ اس لحاظ سے انشا کے دونوں اشعار فنی اغلاط سے پاک ہیں۔

شعور بریلوی

چین کسی وقت بھی ہمالیہ سے ہو کر ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہمیں اپنی فوجی طاقت بڑھانے کی فکر ہے۔ ہمیں اپنی مرضی کے بالکل خلاف سرمایہ اکٹھا کرنا، اپنے بجٹ کو بڑھا اور اپنے وسائل کو ان مقاصد میں لگانا پڑ رہا ہے۔ ——— رادھا کرشنن (صدر جمہوریۂ ہند)

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

شہری دفاع کی تربیت ـــــ قیدیوں کی حب الوطنی ـــــ نوجوانوں کی تفریح کے لیے فن کاروں کی ٹولیاں ـــــ چھوٹی صنعتوں کے واحدوں کی دو بالائی کوششیں ـــــ مکئی کی پیداوار کے سلسلے میں ایک کامیاب تجربہ ـــــ سیلابوں کی روک تھام کے انتظامات ـــــ کھاندساری کے واحدوں کے لیے لائسنس ـــــ ضلع جالون میں واٹر ورکس ـــــ چھوٹی صنعتوں اور آبپاشی کے لیے بجلی ـــــ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے قرضے ـــــ چھوٹی صنعتوں کے لیے خام مال ـــــ متفرقات

لکھنؤ کے شہری دفاع سے متعلق تربیتی مرکز میں ریاست کے مختلف اضلاع سے آئے ہوئے سرکاری افسروں کو شہری دفاع کے فن اور اس کے طریق کار کی تربیت دی جا رہی ہے۔ اس مرکز میں ایک مربوط تربیتی پروگرام کے تحت ان افسران کو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ وہ دشمن کے حملوں سے ہونے والے نقصانات کو کس طرح کم کریں۔ جانی اور مالی تحفظ کے کیا اقدامات کریں اور مختلف شعبوں میں پیداوار کو کس طرح جاری رکھیں۔ زیر تربیت افسر اپنے ضلعوں اور اپنے شہروں میں واپس جا کر شہری دفاع سے متعلق اقدامات اور مختلف شہری دفاع کے کاموں کی تنظیم کریں گے۔ اس کے علاوہ شہری دفاع کے عملہ کو تربیت دیں گے اور ان کے کاموں کی نگرانی بھی کریں گے۔

مذکورہ تربیتی مرکز دسمبر ۱۹۶۲ء میں کھولا گیا تھا جو افیسرس ٹریننگ اسکول کی عمارت میں لکھنؤ۔ سیتاپور روڈ پر واقع ہے اب تک اس مرکز سے ۲۰۰ افسروں کو یکے بعد دیگرے پانچ جتھوں میں کامیابی کے ساتھ تربیت دی جا چکی ہے۔

ضلع مجسٹریٹ تربیت پانے والے افسروں کو ضلع کی سطح پر منتخب کرتے ہیں۔ انتخاب میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ افسران تندرست و قیمت پھرتیلے ہوں تاکہ وہ امدادی اور آگ بجھانے کے خطرناک کاموں کو تن دہی سے انجام دے سکیں۔

اس تربیتی مرکز میں آرام دہ اور زائد گنجائش کے کمرے ہیں جن میں زیر تربیت افسروں کو تصاویر، نقشوں، خاکوں اور ماڈل کی مدد سے سمجھا کر لیکچر دیے جاتے ہیں۔ ان کو مختلف اقسام کے بم، حفاظتی اقدامات، حادثات، فلاحی کاموں اور ہوائی حملہ سے آگاہی دینے کا طریقہ، بنیادی امداد، ابتدائی طبی امداد اور شہری دفاع سے متعلق معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ درجوں میں تعلیم کے دوران تبادلۂ خیال بھی ہوتا رہتا ہے۔

شہری دفاع کے مسائل کو واضح طور پر سمجھانے کے لیے فلم شو بھی منعقد کرائے جاتے ہیں۔ زیر تربیت افسران آگ بجھانے، آتش زدہ مکانات سے بچ کر نکلنے، ملبہ کی صفائی اور دوسرے امدادی کاموں کا عملی تجربہ بھی کرتے ہیں۔ وہ اسٹوپ پمپ، آگ بجھانے سے متعلق پمپ اور دوسرے آلات کا استعمال بھی سیکھتے ہیں۔ مزید برآں زیر تربیت افسروں کو شہری دفاع کے اہم مقامات مثلاً فائر بریگیڈ اور پولیس وائرلیس ہیڈ کوارٹرس لے جا کر وہاں کے طریقہ کار سے روشناس کرایا جاتا ہے۔

اس مرکز کے انسٹرکشنل اسٹاف میں پرنسپل، وائس پرنسپل، چیف فائر افیسر اور فائر اسسٹنٹ افیسر شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بنیادی امداد اور ابتدائی طبی امداد کے بارے میں ہدایات دینے کے سلسلے پارٹ ٹائم انسٹرکٹرس ہیں۔ شہری دفاع اور دوسرے محکموں کے حکام کو اہم موضوعات پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔

زیر تربیت افسروں کو سنڈیکیٹ میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ عملی کاموں کے بارے میں اجتماعی طور پر تبادلۂ خیال کر سکیں۔ ہر سنڈیکیٹ

ایک لیڈر منتخب کر لیتا ہے جو سنڈیکیٹ کے ممبروں کا ترجمان ہوتا ہے اور میس کمیٹی کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ لیڈر اپنے سنڈیکیٹ کے نظم و ضبط اور فلاح و بہبود کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

تربیت کے مکمل ہو جانے کے بعد افسروں کا شہروں کے دفاع کے فرائض کی انجام دہی اور شہری دفاع سے متعلق عملہ کو تربیت دینے کی اہلیت کا امتحان لیا جاتا ہے۔

آگرہ سنٹرل جیل کے مکینوں نے کمبلوں کی پیداوار میں دگنا اضافہ کرکے اپنی حب الوطنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ کمبل ملک کی شمالی سرحدوں کی حفاظت کرنے والے جوانوں کو بھیجے جا رہے ہیں۔

مذکورہ جیل میں ہنگامی حالات کے اعلان کے قبل ۴۰ کمبل روزانہ تیار کیے جاتے تھے اور اب یہ تعداد بڑھ کر ۹۰ ہو گئی ہے۔

سن ۶۲-۱۹۶۱ء کے دوران جیل میں تخمیناً ۱۵۰۰۰ کمبل تیار کیے گئے اور سن ۶۳-۱۹۶۲ء میں یہ تعداد ۲۶۰۰۰ ہو گئی۔ اس سال تیار کیے گئے کمبلوں کی مجموعی تعداد میں سے ۸۸۲۰ کمبل ہنگامی حالات کے اعلان کے بعد کی سہ ماہی میں تیار کیے گئے۔ مکینوں کی کارکردگی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اور وہ ۵۰۰۰۰ سالانہ کمبل تیار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

جیل کا ہر مکین جو کمبل کی تیاری کے کام پر مامور ہے ایک کلو کے مقررہ کوٹہ کے بجائے دو کلو صاف کیے ہوئے اون کی کتائی کر رہا ہے وہ آج کل ۹۰ سے ۱۲۰ فٹ منٹ اون کی کتائی بھی کر رہا ہے جبکہ اس کا مقررہ کوٹہ ۶۰ فٹ ہے۔

آگرہ جیل میں تیار کیے جانے والے کمبل سات فٹ لمبے اور چار فٹ چوڑے ہوتے ہیں اور ایک کمبل کی قیمت ۱۶/۷۶ روپیہ ہے مذکورہ جیل کے افسران کا ارادہ ہے کہ آیندہ ساڑھے سات فٹ لمبے اور ساڑھے چار فٹ چوڑے کمبل تیار کیے جائیں۔

ملک میں ہنگامی حالات کے دوران اناؤ جیل کے قیدیوں نے بھی متعلقہ کاموں کو پوری تن دہی سے انجام دیا۔ انھوں نے محکمۂ جنگلات آبکاری۔ روڈویز۔ ڈاک اور پی۔ اے۔ سی۔ کے جوانوں کے لیے وردیاں جیبت کوٹ۔ کٹ بیگس۔ بڑے کوٹ۔ کھانے پینے کی چیزیں رکھنے کے تھیلے اور دیگر اشیاء تیار کرکے نمایاں کارگذاری پیش کی۔

حالانکہ بہت سے قیدی ان پیشوں سے پوری طرح واقف نہ تھے لیکن میلانِ طبع نے ان کو بہت جلد اس قابل بنا دیا کہ وہ ہنگامی حالات کے دوران کافی سامان تیار کرکے بڑے آرڈرس کی تعمیل کر سکیں۔ آج کل ۳۸۵۵ بجلی اور ۱۱۲ پاؤں سے چلنے والی سلائی کی مشینوں پر علی الصباح سے شام کو دیر تک کام کر رہے ہیں۔ دس کٹرس اور ان کے اتنے ہی معاون کپڑوں کو مختلف نمونہ کے مطابق کاٹنے کے لیے مامور ہیں جو قینچی کو ہاتھ میں لے کر تیزی کے ساتھ کپڑوں کو پھیلاتے اور لپیٹتے بھی ہیں۔

اناؤ ڈسٹرکٹ جیل کی ٹیلرنگ فیکٹری کا انتظام براہ راست سب قیدی کرتے ہیں۔ بٹن کے لیے سوراخ بنانے اور بٹن لگانے کے ابتدائی کام نئے قیدیوں سے کرائے جاتے ہیں۔ ان کاموں کے انجام دینے قمیص جیبت کوٹ جیکیٹس۔ بڑے کوٹ۔ ٹریفک پولیس کے کوٹ تپلون اور اسپتال کی وردیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ ابتدائی مدارج میں انھیں کٹر کے معاون کی حیثیت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد انھیں قیدیوں کے لباس کو ٹانکنے اور سلائی کے کام پر مامور کیا جاتا ہے بالآخر انھیں فوجیوں کے لیے وردیاں جیبت کوٹ اور پولیس کی وردیاں تیار کرنے کا کام سپرد کیا جاتا ہے۔

قیدیوں کو مقررہ اوقات سے زائد کام کرنے پر انعامات بھی دیے جاتے ہیں۔ کچھ قیدی ۷ روپیہ فی ماہ تک کما لیتے ہیں لیکن اس کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ وہاں رہ کر ایسی تربیت حاصل کر رہے ہیں جو رہائی کے بعد ایماندارانہ زندگی گذارنے میں حد درجہ معاون ثابت ہو گی۔

اناؤ جیل کو سن ۶۱-۱۹۶۲ء کے دوران ۳۴/۱۸۵ روپیہ منافع ہوا اور اندازہ لگایا جاتا ہے کہ گذشتہ مالیاتی سال کے دوران منافع میں اضافہ بھی ہوا ہے۔

اترپردیش شہری کونسل سرحدی علاقوں میں جوانوں کی تفریحِ طبع کے لیے فنکاروں کی ٹولیاں بھیجنے کا انتظام کر رہی ہے۔

یہ کام مرکزی شہری کونسل کے ایماء پر شروع کیا گیا ہے جس کو سرِ دست کم از کم تین اچھی ٹولیوں کی ضرورت ہے۔

کونسل فن کاروں کے ریل سے سفر کے اول درجہ کے اخراجات برداشت کرے گی۔ فوج کے افسران فن کاروں کے مفت قیام وطعام کا انتظام کریں گے۔

کونسل ہر فن کار کو پروگرام کی مدت میں دس روپیہ یومیہ بھتہ اور سفر کے دوران ۳ روپیہ دے گی۔ دورہ کی مدت ۱۵ دن سے ایک ماہ تک ہوگی۔

تفریحی پروگراموں میں کٹھ تپلی کا ناچ۔ جادو کا تماشہ، قوالیاں، ہلکے گانے، لوک گیت اور لوک ناچ شامل ہیں۔

جو فن کار اس میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ اترپردیش شہری کونسل (۱۵۔ رائل ہوٹل۔ لکھنؤ) سے تفصیلی معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔

اترپردیش کے چھوٹے پیمانے کے صنعتی واحدوں نے گذشتہ ۶ ماہ کے دوران تقریبًا ۳۰ء۱ کروڑ روپیہ کا دفاعی ضرورتوں کا سامان تیار کیا۔

سنہ ۶۳-۱۹۶۲ء کے درمیان مسلح فوجوں کو ۰۲ء۳ کروڑ روپیہ کی مالیت کا دفاعی ضرورتوں کا سامان فراہم کیا گیا جبکہ سنہ ۶۲-۶۱ کے دوران ۴۳ء۱ کروڑ روپیہ کا سامان فراہم کیا گیا تھا۔ ریاست میں پھلوں کو کام میں لانے والے اور پروسیسنگ واحدوں نے ۵۵،۲۱۴۳ روپیہ کی مالیت کے پھل اچار کاریاں اور پھلوں کے ڈبے بھی بھیجے۔

جوتا سازی کے کارخانوں نے ۶۰ء۱۰ لاکھ روپیہ کے فوجی بوٹ اور دیہی علاقوں کے پیداواری مراکز نے ۲۳ء۳ لاکھ روپیہ کے دس ہزار کمبل فراہم کیے۔

چھوٹے پیمانے کے صنعتی واحدوں نے ۳۱ء۱۱ لاکھ روپیہ کی مالیت کے ۹۳۰۰۰ گولی بارود رکھنے کے صندوق تیار کیے۔ اس کے علاوہ ۱۵۹۹۸۷ روپیہ کی مالیت کے طبی آلات۔ کیمیاوی اشیاء اور دوائیں بھی فراہم کی گئیں۔

دفاعی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ۲۰ء۴ لاکھ روپیہ کی مالیت کے ۱۸۵۰۰۰ تالے۔ ۶۰ء۳ لاکھ روپیہ کے ۱۰،۲۰ لاکھ خیمہ میں ٹھونکے جانے والی کھونٹیاں۔ ۱۸ء۱ لاکھ روپیہ کے ۳۵،۰۰۰ کپڑوں پر استری کرنے والے لوہے ۷۶ء۲ لاکھ روپیہ کے ۱۲۸،۳۰ تسلے اور ۹۲۲۵۲ روپیہ کی ۱۵۲۳۴۰۰ میٹرس نواڑ فراہم کی گئی۔

ریاستی پلاننگ۔ ریسرچ اینڈ ایکشن انسٹی ٹیوٹ نے دوغلی نسل کی مکئی کی فصلوں سے متعلق ایک کامیاب تجربہ کیا ہے جس سے میدان زراعت میں خوش آیند انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئیں گی۔ اس تجربہ کے بعد مکئی، جو خریف کی فصلوں میں شمار کی جاتی ہے اب بارہ ماسی فصلوں میں شامل ہو جائے گی۔

اس کا امکان ہے کہ اسی کھیت میں بجائے ایک فصل کے تین فصلیں ہوا کریں گی۔ اترپردیش کے تمام علاقوں میں جولائی اور ستمبر کے درمیان سال میں ایک بار جونپوری مکئی کی فصل تیار کی جاتی ہے۔ لیکن اب اکتوبر اور جون کے درمیان دوغلی نسل کی مکئی کی دو فصلیں تیار کی جایا کریں گی۔ ان تین فصلوں کے لیے موزوں کھاد اور آب پاشی کا بندوبست بھی کیا جائے گا جس سے ۱۲۵ من فی ایکڑ سے زائد پیداوار کی امید ہے۔

موجودہ انسٹی ٹیوٹ کو امریکہ کے موسم گرما اور ہندوستان کے موسم سرما کے درجۂ حرارت میں مماثلت ہونے کی وجہ سے کچھ اشارات ملے اور اس طرح یہ توقع ہوئی کہ دوغلی نسل کی مکئی کی فصل یہاں موسم سرما میں تیار کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ تجربہ کے طور پر اکتوبر اور اس کے بعد کے مہینوں میں فروری تک اس کی بوائی کی گئی جس سے ریاست میں مکئی کی پیداوار ۱۵۔۲۰ من کے بجائے ۹۰ من فی ایکڑ ہوگئی۔

ریاستی حکومت نے موسم باراں کے دوران سیلابوں کی روک تھام کے پیش نظر پوری ریاست کے ضلع مجسٹریٹوں کو آگاہ کر دیا ہے۔

ان سے کہا گیا ہے کہ وہ بارش شروع ہونے سے قبل امدادی سامان کا بندوبست کرلیں تاکہ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے امدادی کاموں میں ذرا بھی کمی واقع نہ ہونے پائے۔

آغاز کار کے لیے سرکار نے ۷۵،۰۰۰ روپیہ کمشنروں کو دیا ہے تاکہ وہ اسے زائد بارش اور سیلاب سے متاثرہ ضلعوں کے غربا اور بے گھر اشخاص کو تقسیم کرسکیں۔ کرایہ پر کشتیاں۔ خیمے اور گیس بتیاں حاصل کرنے اور دیگر متفرق اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مزید ۶۵،۰۰۰ روپیہ منظور کیے گئے ہیں۔ کمشنروں کو جو رقم دی گئی ہے اس میں سے وہ ضلع کے افسروں کو پیشگی رقم بھی دے سکتے ہیں

امدادی کاموں کے لیے دارانسی۔ الہ آباد۔ گورکھپور۔ لکھنؤ اور فیض آباد
ڈویژنوں کو ۔۔۔۔۔۱ روپیہ فی ڈویژن مخصوص کر دیے گئے ہیں۔ متفرق اخراجات
کو پورا کرنے اور دیگر امدادی کاموں کے لیے اتنی ہی رقم دی گئی ہے متفرق
کاموں کے لیے جھانسی۔ کمایوں۔ اترا کھنڈ۔ میرٹھ۔ آگرہ اور روہیلکھنڈ
ڈویژن کو ۔۔۔ ۲۵ روپیہ فی ڈویژن مخصوص کیے گئے ہیں۔ متاثرہ اشخاص
کو امداد دینے کے لیے میرٹھ۔ آگرہ اور روہیلکھنڈ ڈویژن کو ۔۔۔۔ ۵ روپے
فی ڈویژن اور جھانسی۔ کمایوں اور اترا کھنڈ ڈویژن کو ۔۔۔ ۲۵ روپے
فی ڈویژن منظور کیے گئے ہیں۔

سرکار نے اس پر زور دیا ہے کہ سیلابوں کی روک تھام کرنے کے لیے ایسے اقدامات کیے جانا چاہئیں کہ لوگوں میں چوکنا رہنے، اجتماعی ذمہ داری اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اس طرف بھی خاص طور پر توجہ دلائی گئی ہے کہ سیلاب کی امدادی اسکیم کی کافی پبلسٹی کی جائے تاکہ لوگ اس سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔

گڑ۔ راب اور کھانڈساری تیار کرنے والے واحدوں کے مالکوں سے آئندہ سال کے لیے جو یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء سے شروع ہوگا نئے لائسنس حاصل کرنے کے لیے درخواستیں طلب کی جاتی ہیں۔

ریاست میں اس قسم کے واحدوں کو چلانے کے لیے سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء میں جو لائسنس جاری کیے گئے تھے ان کی میعاد ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء کو ختم ہو جائے گی۔

شوگر کمشنر اتر پردیش لکھنؤ نے ان لوگوں کو جو سنہ ۱۹۶۳-۶۴ء کے دوران اپنے واحدے چلانا چاہتے ہیں یہ صلاح دی ہے کہ وہ لائسنس کی تجدید کے لیے مقررہ فارموں پر متعلقہ شوگر انسپکٹر اور کھانڈساری افسر کے توسط سے جلد از جلد درخواستیں دیں۔ درخواستوں کے ساتھ ٹریژری چالان کی صورت میں لائسنس کی مقررہ فیس بھیجنا ضروری ہے۔ درخواستوں کے فارم اور ٹریژری چالان کھانڈساری انسپکٹر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

شکر کی پیداوار میں کمی کو دور کرنے اور پیداوار میں زیادہ اضافہ کرنے کے پیش نظر شوگر فیکٹریوں کے ریزرو علاقوں میں نئے لائسنس منظور نہیں کیے جائیں گے۔ چنانچہ ان لوگوں کو جو اس میں دلچسپی رکھتے ہیں یہ صلاح دی جاتی ہے کہ وہ پاور کرشر لگانے میں اپنا سرمایہ نہ لگائیں۔

وزیر لوکل سلف گورنمنٹ شری دیتی نرائن شرما نے ۱۵ مئی کو کرنج ضلع جالون میں اتر پردیش کے نناویں واٹر ورکس کی رسم افتتاح ادا کی۔

یہ واٹر ورکس جو بندیلکھنڈ کی سب سے بڑی غلہ منڈی کی پانی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے ۵،۲۱ لاکھ روپیہ کی تخمینی لاگت سے تعمیر کیا گیا ہے اور اس میں ۲۶۰۰۰ ہزار اشخاص کو پانی کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے۔

اب تک ریاست کی ۶۰ فی صد شہری آبادی ان واٹر ورکس سے مستفید ہو سکی ہے اور ان کی تعمیر پر ۱۲،۸۰ کروڑ روپیہ کی لاگت آئی ہے۔ بقیہ شہری آبادی کے لیے ۲۵۰ نئے واٹر ورکس کی مزید ضرورت ہے۔ تیسرے منصوبہ میں ۸ لاکھ آبادی کو واٹر ورکس سے پانی فراہم کرنے کے لیے مزید ۵۰ واٹر ورکس تعمیر کیے جائیں گے جن پر ۱،۲۷ لاکھ روپیہ صرف ہوگا۔

اتر پردیش میں سنہ ۱۹۴۷ء تک صرف ۲۷ واٹر ورکس تھے اس کے بعد ۷۲ نئے واٹر ورکس تعمیر کیے گئے۔

اس موقع پر لوکل سلف گورنمنٹ کے چیف انجینئر شری۔ اے بیگ رائے بھی موجود تھے جنھوں نے کہا کہ نئے واٹر ورکس سے فراہم کیے جانے والے پانی کی قیمت دس گیلن کے لیے صرف چار نئے پیسے مقرر کی گئی ہے جو ملک بھر میں سب سے کم ہے۔

ریاستی حکومت نے حال ہی میں چھوٹے پیمانہ کے صنعتی واحدوں نجی ٹیوب ویل اور پمپنگ سیٹ کے لیے بجلی کے کنکشن آسانی سے منظور کیے جانے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔

ریاست کے چھبیس ضلع مجسٹریٹوں کو اپنے اپنے علاقوں کے ہر صنعتی واحدے کے لیے ۲۵ ہارس پاور بجلی دینے کے اختیارات دیدیئے گئے ہیں۔

یہ منظور شدہ بجلی نئے صنعتی واحدے قائم کرنے اور پرانے واحدوں کی توسیع کے کام میں لائی جا سکتی ہے۔ ان چھبیس ضلعوں کے نام

جہاں یہ سہولتیں فراہم کی گئی ہیں۔ یہ ہیں — میرٹھ۔ بلند شہر۔ مظفر نگر۔ علی گڑھ۔ مراد آباد۔ دہرہ دون۔ سہارنپور۔ متھرا۔ مین پوری۔ ایٹہ۔ بجنور۔ بدایوں۔ رام پور۔ شاہ جہاں پور۔ پیلی بھیت۔ فرخ آباد۔ اٹاوہ۔ الموڑہ۔ نینی تال۔ ہردوئی۔ لکھیم پور کھیری۔ سیتاپور۔ الہ آباد۔ وارانسی۔ آگرہ اور بریلی۔

دیہی علاقے جہاں پہلے منصوبہ کے دوران بجلی کی فراہمی کی جا چکی ہے اشخاص اپنے انفرادی صنعتی واحدوں کے لیے ۱۵ ہارس پاور تک بجلی استعمال کر سکیں گے لیکن ان کے کنکشن کی منظوری ایگزیکیٹو انجینیرس دیں گے۔

ضلع مجسٹریٹوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نجی ٹیوب ویل یا پمپنگ سٹ چلانے کے لیے دس ہارس پاور تک بجلی دے سکتے ہیں لیکن کنکشن حاصل کرنے والے کے پاس دس ایکڑ مزروعہ آراضی ہوتی چاہیے جو ریاستی آب پاشی کی نہروں اور ٹیوب ویل سے آب پاشی کیے جانے والے علاقہ میں نہ ہو۔ جن اشخاص کو کنکشن دیے جائیں گے وہ رات میں صنعتی مقاصد کے لیے بھی بجلی استعمال کر سکتے ہیں لیکن مارچ ۱۹۶۴ء تک یہ دس بجے رات سے دوسرے دن چھ بجے شام تک بجلی استعمال کی جا سکتی ہے۔

اترپردیش میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کو مالیاتی سال ۔۔ داں کے دوران ۔۔ ۶۷ لاکھ روپیہ کے قرضے دیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ مختلف دستکاریوں اور پیشوں کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو مالی امداد دینے اور منظم اداروں کو آلات اور ساز و سامان کی خریداری کے لیے ۲ لاکھ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

اس مقصد کے لیے تیسرے منصوبہ میں ۲۹۸ لاکھ روپیہ فراہم کیا گیا تھا جس میں سے ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران ۸۔۷ لاکھ روپیہ بطور امداد اور ۶۰۰۰ روپیہ بطور قرضہ تقسیم کیا گیا تھا۔

ایسی اسکیموں کے لیے قرضوں کی منظوری ضلع مجسٹریٹ ڈسٹرکٹ انڈسٹریز کمیٹی سے تبادلۂ خیال کے بعد دے گا جس کے لیے ۱۰۰۰ روپیہ سے زیادہ کی ضرورت نہ ہوگی۔ ایسی اسکیموں کے قرضوں کی منظوری پر اسیٹ لونس اینڈ گرانٹس کمیٹی غور کرے گی جن کے لیے ۔۔۔۔ روپیہ سے زیادہ کی ضرورت ہوگی۔ یہ کمیٹی ۱۵۰۰۰ روپیہ تک کے قرضے منظور کرتی ہے۔ آسان شرائط پر قرضے دینے کی اسکیم کے تحت اترپردیش مالیاتی کارپوریشن ۱۵ ہزار روپیہ سے زیادہ سے لے کر ایک لاکھ روپیہ تک کے قرضے منظور کرتی ہے۔

۲۵۰۰۰ روپیہ تک کے قرضوں پر ۳ فی صدی۔ ۲۵۰۰۰ سے زیادہ سے ۵۰۰۰۰ روپیہ تک کے قرضوں پر ۴ فی صدی اور ۵۰ ہزار سے زیادہ سے ایک لاکھ روپیہ تک ۵ فی صدی سالانہ کی شرح سے سود وصول کیا جائے گا۔

۱۵ ہزار روپیہ تک کے قرضے سات سال میں ششماہی قسطوں اور ۱۵ ہزار روپیہ سے زیادہ کے قرضے ۱۰ سالانہ مساوی قسطوں میں واجب الادا ہوں گے۔ قرضہ لینے کی تاریخ کے دو سال بعد ادائیگی شروع ہوگی۔

ریاست کی چھوٹی پیمانہ کی صنعتوں کے خام مال کی کمی کو پورا کرنے کے لیے تیسرے پنج سالہ منصوبہ کے پہلے دو برسوں میں ۴۲ء۱۰۱ لاکھ روپیہ کی قیمت کا ۱۰۱۰۰ ٹن لوہا، گھیل کر پیوست نہ ہونے والے دھات پولی اسٹرین اور اسٹینلیس اسٹیل فراہم کیا گیا۔

یہ خام مال اترپردیش اسمال انڈسٹریز کارپوریشن کی جانب سے کانپور۔ آگرہ۔ میرٹھ۔ نینی۔ الہ آباد اور وارانسی میں قائم کردہ گوداموں سے فروخت کیے گئے۔

گذشتہ دو برسوں میں ان گوداموں سے ۷ء۴۵ لاکھ روپیہ کی قیمت کی ۷ء۶۱۹ ٹن قلعی کی ہوئی لوہے کی چادریں اور تار تقسیم کیا گیا جس میں گذشتہ مالیاتی سال کے دوران ۷۳۰۰۴۴۴ روپیہ کی قیمت کی ۵ء۲۷ ٹن قلعی کی ہوئی لوہے کی چادریں شامل ہیں۔

گذشتہ دو برسوں میں مجموعی طور پر ۲۵۷۵ ٹن گھیل کر پیوست نہ ہونے والے دھاتیں اور پولی اسٹرین میں سے جس کی قیمت ۲ء۵۵ لاکھ روپیہ ہے ۔۔۔ ۷۵ [illegible] قیمت ۲۲۹۲ ٹن جستہ [illegible] ۲۹۵۵ [illegible] قیمت ۔ ۱۰۶ ٹن تانبا ۳۷۔۱۲۱ روپیہ کی قیمت کا ۹۲ ٹن المونیم [illegible] روپیہ کی قیمت کا ۔۔ ٹن سیسہ اور ۲۳۹۰ روپیہ

کی قیمت کا ۲۱۲ ، ٹن یوپی اسٹیل میں ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران فروخت کیا گیا۔

متفرقات

آٹوموبائل کی ایڈوانس ٹریننگ ۔ ریاستی حکومت نے تکنیکی ہنر کو تربیت دینے کے ایک اسکیم وضع کی ہے جس کے تحت اترپردیش روڈویز کے ۵۴ ملازمین کو آٹوموبائل انجینیرنگ کی اعلیٰ ٹریننگ دی جاچکی ہے۔ان میں سے ۳۰ کو مغربی جرمنی اور بقیہ کو برطانیہ میں ٹریننگ دی گئی ہے۔

حکومت نے گریجویٹوں ۔ ڈپلوما ہولڈروں اور مستریوں کو تربیت دینے کے لیے روڈویز سنٹرل ورکشاپ ۔ کانپور میں انتظامات مکمل کرلیے ہیں۔ زیر تربیت اشخاص کو تربیت مکمل کرلینے کے بعد ورکشاپوں میں جگہیں دی جاتی ہیں۔

چین کا محنت کش طبقہ

(بسلسلہ صفحہ ۳۹)

پسند گلہ اس مسئلے کا حل اس وقت تک نہیں ہو سکے گا جب تک کہ مناسب حالات پیدا نہ ہوں۔

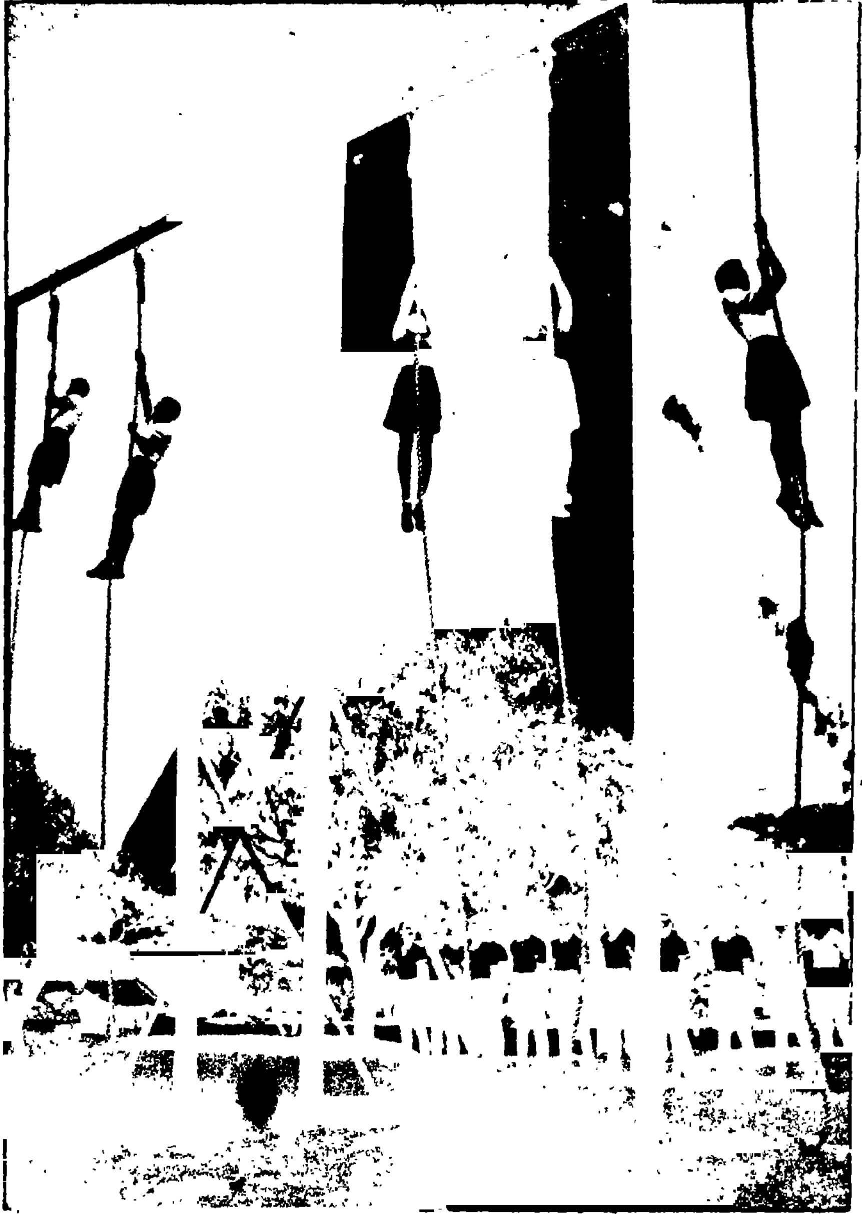
مزید بتایا گیا ہے کہ اگر خاوند اور بیوی دونوں مختلف مقامات پر نوکری کرتے ہیں اور اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک گھر جانے کی چھٹی لے چکا ہے تو دوسرا اس رعایت کا مستحق نہیں رہتا۔ بصورت دیگر کام اور پیداوار پر برا اثر پڑے گا۔ یہ سوال کہ خاوند یا بیوی دونوں میں سے کس کو گھر جانے کی چھٹی دی جانی چاہئے متعلقہ مزدوروں اور ان کے یونٹوں کے انتظامیہ کے درمیان سمجھوتے سے طے کیا جاتا ہے۔

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۵ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ " نیادور " کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں

(۱) مقام اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری جے ۔ ڈبلو ۔ ایچ ۔ ہندستانی ۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری ۔ اترپردیش، الٰہ آباد
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	شری امیہ بھوشن ملک ۔ ہندستانی ۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش، لکھنؤ
(۵) ایڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری صباح الدین عمر ۔ ہندستانی ۔ ایڈیٹر "نیادور" محکمۂ اطلاعات ۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں	نیادور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کی پونجی کا ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں امیہ بھوشن ملک اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

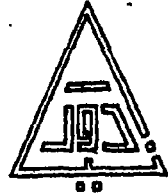
(دستخط) امیہ بھوشن ملک (پبلشر)



فوجی جوان رسّی کے ذریعے اوپر چڑھنے کی مشق کر رہے ہیں

18(b)





جلد ۱۸ | نمبر ۶

بھادوں ۱۸۸۵
ستمبر ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے
فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر
صباح الدین عمر

پبلشر
اُمیش بھوشن ملک
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
جے۔ ڈبلو۔ مارچ
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اُترپردیش

عنوانات

اپنی بات

شمالی سرحد پر چینی سرگرمیوں کے بارے میں جو اطلاعیں موصول ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ چین اپنی مفسدانہ سرگرمیوں سے باز نہیں آ رہا ہے۔ ان اطلاعات کے مطابق تبت میں چینی فوجوں کے اجتماع میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور ہماری سرحد پر اس وقت جتنی چینی فوج ہے وہ اس فوج سے کہیں زیادہ ہے جو گزشتہ سال اکتوبر میں چینی حملے کے وقت پائی جاتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ یہ فوج اکتوبر ۱۹۶۲ء کے مقابلے میں آج ہماری سرحد سے قریب رکھی گئی ہے۔ سرحد ہی کے قریب گودام، ہوائی اڈے وغیرہ بنائے جا رہے ہیں اور جگہ جگہ توپیں نصب کی جا رہی ہیں۔ پچھلے چند مہینوں سے فوجوں کی نقل و حرکت میں سہولت پیدا کرنے اور سلسلہ مواصلات کو بہتر بنانے کے لیے چینی سپاہی نئی سڑکیں بھی بنا رہے ہیں اور زیر زمین ٹیلی فون بھی لگائے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ساری تیاریاں کسی امن پسندانہ اقدام کا پتہ نہیں دیتیں بلکہ ان سے نیت کا فتور ہی ظاہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت نے ہنگامی حالات (ایمرجنسی) ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا اور ہمارے وزیر اعظم برابر یہ کہتے رہے کہ سرحد پر اگرچہ خاموشی اور تعطل ہے لیکن ہمیں اپنی تیاریوں سے غافل نہ رہنا چاہیے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں اپنے حملے کے بعد سے اس وقت تک چین کا جو رویہ رہا ہے اسے خاموشی اور سکوت پر کسی طرح محمول نہ کرنا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ اپنے حملے کے کچھ ہی دنوں بعد چین نے اپنی فوجیں ہٹالی تھیں لیکن حالات و واقعات نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اس واپسی کا یہ مطلب نہ تھا کہ چین کو اپنے اس بے وجہ حملے پر کوئی تاسف ہے یا وہ اظہار ندامت کے طور پر پیچھے پلٹ رہا ہے۔ یہ بھی چین کی ایک چال تھی۔ اس نے حملہ کرکے دیکھ لیا کہ ہندوستان کوئی نوالہ نہیں ہے۔ ابتدائی معمولی کامیابیوں کی بات دوسری ہے: یہ چین سمجھنے لگا تھا وہی صورت پیدا ہونے لگی تھی جب اسے یہ کہنا پڑتا کہ جنگ آسان نہ ہو ولے افتاد مشکلہا۔ بہرحال اس وقت سے اب تک چین نے ایک قدم بھی ایسا نہیں اٹھایا جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا کہ یہ اس کی صلح پسندی پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں تک کہ جب بعض ناوابستہ ممالک نے کولمبو کانفرنس میں چین اور ہندوستان کے مسئلے کو طے کرنے کے سلسلے میں کچھ تجویزیں پیش کیں تو چین نے ان تجویزوں کو قبول کرنے سے انکار ہی نہیں کر دیا بلکہ ان تجویزوں کے برخلاف غیر فوجی منطقے میں ۲۶ سول چوکیاں قائم کر دیں۔ کولمبو کانفرنس کی ایک تجویز یہ تھی کہ مغربی سیکٹر میں دونوں ملکوں کی سول چوکیاں قائم کی جائیں مگر چین نے یہ بھی نہ مانا اور صرف اپنی چوکیاں قائم کیں۔ خود چینیوں نے اعلان کیا تھا کہ مشرقی سیکٹر کے غیر فوجی علاقے میں ان کی ۱۶ سول چوکیاں رہیں گی مگر انھوں نے اس علاقے میں ۵۲ فوجی اور سول چوکیاں قائم کر دیں۔ اس کے علاوہ مشرقی سرحد پر ان کی گشت اور دیکھ بھال بھی برابر جاری ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے چین کے برعکس کولمبو کانفرنس کی تجویزوں پر وہ سختی سے عملدرآمد کر رہا ہے۔ ہندوستان کو امید تھی کہ چین کم سے کم اپنے یکطرفہ اعلانات پر تو عمل کرے گا لیکن چین کے قول و فعل کا یہ عالم ہے کہ وہ ان اعلانات پر بھی عمل نہیں کر رہا ہے۔ ہندوستان کو چین ہی کی نامہربانیوں سے سابقہ نہیں پڑ رہا ہے بلکہ پاکستان کا رویہ بھی بڑا افسوسناک ثابت ہو رہا ہے۔

ہندوستان کی پالیسی یہ رہی ہے کہ دونوں ملک ایک دوسرے کے دوست رہیں۔ چنانچہ ہندوستان نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین جو بھی اختلافات پائے جاتے ہیں وہ باہمی گفت و شنید سے طے کر لیے جائیں تاکہ دونوں ملک ایک دوسرے کے اچھے پڑوسی کی طرح رہ سکیں اور دونوں ترقی کر سکیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر چند مہینے ہوئے ہندوستان کے ایک وفد نے سردار سورن سنگھ وزیر ریلوے کی زیر سرکردگی پاکستان کے ایک وفد سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ سلسلہ وقفے وقفے سے پانچ مہینے تک جاری رہا مگر پاکستان ایک تو سوائے کشمیر کے کسی اور اختلافی مسئلے پر بات چیت کرنے پر راضی ہی نہیں ہوا، دوسرے اس نے ہر گفتگو میں ایسی شرطیں پیش کر دیں جو ہندوستان کے لیے کسی طرح قابل قبول ہی نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان نے شروع سے وہ طرز عمل اختیار کیا جو ناپسندیدہ ہی نہیں ایک حد تک اشتعال انگیز بھی تھا۔ مثلاً راول پنڈی میں گفتگو کا میابی سے شروع ہونے سے ایک دن پہلے پاکستان کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ چین اور پاکستان میں سنکیانگ اور کشمیر کی سرحد کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے اصولاً ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس اعلان کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کی گفتگو جاری رہی مگر ابھی اختتام پر پاکستان کی طرف سے ایک مرتبہ پھر یہ اعلان ہوا کہ پاکستان اور چین سے کشمیر کی سرحد پر سمجھوتہ ہو گیا ہے جس کی رو سے چین کو کشمیر کی تقریباً ۲ ہزار مربع میل زمین مل گئی ہے۔ یہ غور کرنے کی بات ہے کہ زمین ہندوستان کی ہے لیکن وہ پیش کی جا رہی ہے پاکستان کی طرف سے چین کو! بہرحال ہندوستان نے پھر بھی پاکستان سے گفت و شنید کے دروازے بند نہیں کیے لیکن پاکستان ایک طرف انتہائی ناقابل قبول دعوے کرتا رہا اور شرطیں پیش کرتا رہا اور دوسری طرف مغربی ممالک میں بڑی شدت سے ہندوستان دشمن پروپیگنڈا کرتا رہا۔ کشمیر قانونی اور اخلاقی ہر حیثیت سے ہندوستان کا ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پاکستان کا کشمیر پر کوئی دعویٰ نہ ہونا چاہیے۔ مگر اب بھی وہ اس سے دست کش ہونے کے لیے تیار نہیں ہے بلکہ کشمیر کے ایک حصے پر قابض بھی ہے۔ ہندوستان اس گفتگو کے دوران محض مصالحت کی خاطر پاکستان کو کچھ رعایتیں دینے پر بھی رضامند ہو گیا تھا اور یہ پیش کش بھی کی تھی کہ دونوں ملکوں میں یہ معاہدہ ہو جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے پر کسی صورت میں حملہ نہیں کریں گے مگر پاکستان اس پر بھی راضی نہ ہوا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان اس وقت ہندوستان کے ساتھ کسی طرح مصالحت پر آمادہ نہیں ہے۔ یہ ہمارے ملک کو اس کا دکھ ہے لیکن پاکستان کے نامصالحانہ رویے کے بعد وہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ پھر بھی ہندوستان پاکستان کا خیر خواہ ہے، بدخواہ نہیں، اور پاکستان جب بھی صدق دلی سے اس کی طرف دست مصالحت بڑھائے گا، ہندوستان کی طرف سے کوئی کوتاہی نہ پائے گا۔ لیکن جب تک اس کا یہ رویہ ہے اور جب تک چین راہ راست پر نہیں آتا ہندوستان کو ہوشیار رہنا ہی ہے۔

ایڈیٹر

ظہورِ آدم

(ایک طویل مثنوی "آب و سراب" کا ایک باب)

جمیل مظہری

تم میں جو ہیں قدرتیں نہانی — اب ان کی سنو ذرا کہانی

وحدت سے جو کی خود اپنی تعمیم — ہونے لگی نعمتوں کی تقسیم

غنچے کو شگفتگی ملی جب — شبنم کو فتادگی ملی جب

جب شب نے ردائے نور پائی — تاروں کو غنودگی سی آئی

پائے جو فلک نے گوشوارے — بخشے گئے کہکشاں کو تارے

جوہر کو عرض، عرض کو جوہر — گوہر کو صدف، صدف کو گوہر

ابرو کو نمی، نمی کو ابرو — جادو کو نظر، نظر کو جادو

کوثر کو عطا ہوئی روانی — طوبیٰ کو ملا لباس دھانی

چلمن سرِ عرش کی ہلی جب — جبریل کو معرفت ملی جب

سجدہ کیا اُن کی آگہی نے — اُس وقت جمالِ ایزدی نے

پانی میں بھگو کے آگ کی روح — مٹی میں سمو کے آگ کی روح

اِک پیکرِ معتدل بنایا — تم چونک اُٹھے جو دل بنایا

چونکا کے الوہیت عطا کی — رحمانی کی ہر صفت عطا کی

ہو پختگی تاکہ ہر صفت میں — رکھے گئے دارِ تربیت میں

مقصود یہ تھا بفضلِ باری — آجائے تمہیں خود اختیاری

ظلمت سے نہ نور سے ڈرو تم — اپنی مرضی سے کچھ کرو تم

پیدا ہو شعور میں ارادہ
خود شوق بنائے اپنا جادہ

یہ بات نہ تھی خدا کو منظور — مختار کا جانشیں ہو مجبور

مجبوری جماد کی صفت ہے — مجبوری دلیلِ قدسیت ہے

مجبوری ہے فرض کی وہ زنجیر — وابستہ ہے جس سے بزمِ تقدیر

جس کے حلقوں میں عاجزانہ — جکڑا ہے یہ سارا کارخانہ

اس پر جو بنایا جائے حاکم — قدرت اُس کے لیے تھی لازم

ہوتی رہی تربیت تمہاری — منظور تھی منزلت تمہاری

جنت ہوا مدرسہ تمہارا — دیتا تھا سبق خدا تمہارا

پوری ہوئی جب کہ یہ پڑھائی — منزل تب امتحاں کی آئی

سکھلا کے تمیزِ خیر و شر کی — شاخوں کو دکھا کے اک شجر کی

فرمان ہوا کہ تم ہو دانا — دیکھو آدم ادھر نہ جانا

ہے اس کے ثمر میں تلخ کامی — چھونا انھیں عقل کی ہے خامی

بات اتنی تھی جو کہی خدا نے — تخئیل کو مل گئے فسانے

ابلیس کی من گھڑی کہانی — ہے مسلکِ جبر کی زبانی

ابلیس تو شوق تھا تمہارا — معذوری نہ کر سکا گوارا

دل پر یہ ممانعت تھی بھاری — بے چین ہوئی خودی تمہاری

بے ساختہ بڑھ کے ہاتھ ڈالا — تخلیق کا حوصلہ نکالا

پہلا جو کیا گناہ تم نے — کھینچی اک سرد آہ تم نے

لیکن تقدیر مسکرائی — اس کی زنجیر مسکرائی

طاقت کا سرور مسکرایا — خالق کا غرور مسکرایا

پورے اُترے جو امتحاں میں — اک غل ہوا بزمِ لامکاں میں

آتش کو ہوا نے تہنیت دی — مٹی کو خدا نے تہنیت دی

جب بجھ چکی معطّنِ مشیّت — بخشا تمھیں منصبِ حکومت

انعامِ گناہ بے گناہی — رکھا گیا سر پہ تاجِ شاہی

سمجھا کے رموزِ راہ بینی — پہنا کے قبائے جانشینی

بھیجا گیا تم کو اس جہاں میں
آنے لگا رنگ داستاں میں

تم مدرسۂ جناں سے نکلے — ناوک کی طرح کماں سے نکلے

چھائی در و بام پر اُداسی — جنت کے نظام پر اداسی

تھا بس کہ گراں غمِ جدائی — تاروں کی بھی آنکھ ڈبڈبائی

رنگ اُڑ گیا رخ سے آسماں کے — مرجھا گئے پھول کہکشاں کے

باجاہ و جلالِ شہریاری — شہزادۂ خلد کی سواری

اِس محشرِ آب و گل میں پہنچی — آہٹ سی زمیں کے دل میں پہنچی

سینے سے نمو کی موج پھوٹی — خوابیدہ فضا کی نیند ٹوٹی

فرش اپنا بچھایا روشنی نے — سجدہ کیا جھک کے تیرگی نے

بہنے لگا آب تھا جو گدلا — مٹی نے بھی اپنا بھیس بدلا

ذرات میں رنگ کو ابھارا — پھولوں کا حسین روپ دھارا

شاخوں پہ طیور چہچہائے
پتھر میں صنم بھی گنگنائے

سلیم پانی پتی
کی
شاعری میں وطنیت

شجاعت علی سندیلوی

اُردو شاعری میں ' وطنی نغمے ' اپنی پوری رعنائی و توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں وطن سے بے پناہ محبت ہے ' غلامی و محکومی سے نجات پانے کی تمنا ہے ' آزادی کے لیے مرنے کی تڑپ ہے اور وطن کو رشکِ جناں بنانے کی خواہش ہے۔ اُردو میں یہ جذبات و رجحانات ہندستان کی دوسری تمام زبانوں کے مقابلے میں غالباً سب سے زیادہ ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ انقلابات و حوادث کا سب سے زیادہ شکار رہی۔ اس کے بہو توں نے مادرِ وطن کی آزادی و حفاظت کے لیے بیش از بیش قربانیاں پیش کیں۔ یہ ضرور ہے کہ وطنیت کے یہ جذبات ' عصری رجحانات کے بموجب ' بدلتے رہے ' لیکن رہے ہمیشہ۔ اُردو شاعروں نے گل و بلبل ' قفس و آشیانہ کے پردے میں آزادی و محکومی پر اپنے خیالات ظاہر کیے :

بحثِ صیاد و اسیر ' افسانہ ہو یا واقعہ
قصۂ آزادیِ ہندوستاں سے کم نہیں (اقبال سہیل)

انھوں نے ہاتھ قلم کیے جانے کے باوجود ' حکایاتِ خوں چکاں ' لکھیں :

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے (غالب)

یہ تو ۱۸۵۷ء کے بعد کی داستان ہے لیکن اس سے بہت پہلے جب سراج الدولہ ' میر جعفر کی غداری کی وجہ سے انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بن گیا تھا ' اس وقت راجہ شتاب رائے نے کتنے دل سوز مگر بامعنی انداز سے یہ شعر کہا تھا :

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری ؟

اسی طرح مصحفی نے تو صاف صاف کہہ دیا :

ہندستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی
ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

یہ چند مثالیں صرف اس لیے پیش کر دی گئیں کہ اُردو شاعری کے متعلق ظاہر ہو جائے کہ اس کے فن کاروں نے مادرِ وطن کی تباہی و غلامی پر کس جرأت و بے باکی کے ساتھ کبھی اشاروں اور کنایوں میں اور کبھی صاف صاف اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان جذبات نے ۱۸۵۷ء کے بعد اور زیادہ شدت اختیار کر لی۔ دستورِ زباں بندی اور بات کرنے پر زبان کاٹے جانے کے باوجود ' شعرا نے ' نغماتِ وطن ' گائے ' وطن کی عظمت و محبت کا سکہ ہر دل پر بٹھایا ' وطن کی خدمت کرنے کے جذبات بیدار کیے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق وطنیت کا احساس دلایا۔ غالب و مومن ' ذوق و ظفر ' آزاد و حالی ' داغ و امیر وغیرہ کے کلام کا بیش تر حصہ ' وطنیت ' سے بھرا ہوا ہے۔ حالی میر کارواں تھے ' لیکن حالی کے بعد ' ان کی پیروی کرنے والے بہت سے شاعر و ادیب پیدا ہو گئے۔ اُنھیں میں ایک وحیدالدین سلیم پانی پتی بھی تھے۔ سلیم پانی پتی انقلاب ۱۸۵۷ء کے بیس برس کے بعد پانی پت میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی سے عروسِ سخن کے گیسو سنوارنے لگے۔ پہلے مفتوں تخلص رکھا۔ مولانا حالی سے ملاقات کے بعد مفتوں سے سلیم ہو گئے۔ سرسید سے ۱۸۹۳ء میں ملاقات ہوئی اور سلیم کی قابلیت کے جوہر نمایاں ہونے لگے۔ جلد ہی وہ ادبی دُنیا میں مشہور و ممتاز ہو گئے۔

شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صحافی بھی تھے۔ متعدد اخبارات و رسائل کے مدیر رہے ' مسائلِ حاضرہ پر ان کے مضامین ' ان کی ژرف نگاہی کے گواہ ہیں۔ حبِ وطن ' غلامی سے تنفر ' بے خوفی و حق گوئی ان کا مسلک تھا۔ اسی بیباکی و آزادہ روی کی بدولت ان پر حکومتِ برطانیہ کا عتاب متعدد بار نازل ہوا۔ مسلم گزٹ لکھنؤ کی ایڈیٹری کے زمانہ میں " اگر میں کان پور کا کلکٹر ہوتا " لکھا۔ یہ مضمون اتنا پر جوش اور شعلہ ساماں تھا کہ انھیں ۱۲ گھنٹے کے اندر اندر شہر چھوڑ دینے کا حکم ملا۔ زمیندار لاہور کے بھی ایڈیٹر رہے اور اس دور میں بھی حکومت کی سخت گیری کا انھیں سامنا کرنا پڑا یعنی اخبار سے ضمانت طلب کر لی گئی۔ آخر عمر میں مولانا عثمانیہ یونیورسٹی چلے گئے۔

سات ماہ کی تکلیف دہ علالت کے بعد ۲۹ جولائی ۱۹۲۸ء کو مولانا کا انتقال ہو گیا اور ملیح آباد کی حریت نواز خاک نے، مادرِ وطن کے اس جری اور بے باک فرزند کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

وحید الدین سلیم جس ماحول میں پروان چڑھے تھے اور جن بزرگوں کی صحبت سے انھوں نے استفادہ کیا تھا، ان سب کا تقاضا یہی تھا کہ وہ علم و ادب کا مہرِ درخشاں بن کر مادرِ وطن کی جہالت و غلامی کی تاریکی کو دور کریں۔ سلیم نے شعر و ادب کے ذریعے سے اس مقصد کو پورا کیا۔ ان کی شاعری مردہ دلوں میں روح ڈالنے والی اور مادرِ وطن پر قربان ہو جانے کے جذبات پیدا کرنے والی ہے۔ ان کے یہاں قنوطیت و یاسیت، فرار اور پست ہمتی کا نام نہیں۔ وہ وطن کے سپوتوں کو جری، باہمت، مشکل پسند سچا خادمِ وطن بنانا چاہتے ہیں ؎

کیا نے گا خاکِ مردہ و افسردہ بن کے تو — طوفان بن، کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح — بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب
وہ خاک ہو کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر — وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب
وہ چشمہ بن کہ جس سے ہوں سرسبز کھیتیاں — رہرو کو تو فریب نہ دے صورتِ سراب

سلیم کو یقین کامل تھا کہ بزدل اور پست ہمت وطن کی خدمت نہیں کر سکتے۔ وطن کی خدمت وہی کر سکتا ہے جو اولوالعزم، ایمان دار، باحوصلہ وسیع النظر اور سچا محبِ وطن ہو ؎

پاؤں جم جم کے رہِ حبِ وطن میں رکھو — سکہ تم تم کے تم اپنا دلِ عالم پہ جماؤ
جوش کی ہیں جو امنگیں انھیں ہمیز کرو — عیش کی ہیں جو ترنگیں انھیں سینوں میں دباؤ
بدلیاں غم کی ہوں چھائی تو سراسیمہ نہ ہو — بجلیاں زر کی چمکتی ہوں تو جھل بل میں نہ آؤ
نقش خیبوں کے جو دل پر ہیں مٹا دو ان کو — محفلِ گردشِ ایام میں رنگ اپنا جماؤ

وطن کی تباہی و بربادی پر سلیم کڑھتے تھے۔ وہ اس کو فارغ البال اور خوش حال بنانے کی دھن میں لگے رہتے۔ اس کے افلاس و غلامی کے اسباب پر غور کرتے اور انھیں دور کرنے کی تدبیر بتاتے۔ وہ ہندوستان کی عظمتِ ماضی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسے دنیا کا سب سے عظیم ملک سمجھتے تھے۔ اس کی صنعت و حرفت، تجارت و فلاحت پر وہ فخر کرتے تھے۔ اس کے علم و فضل و کمال کے گن گاتے تھے۔ ساری دنیا نے ہندوستان سے علم و ہنر کی روشنی حاصل کی تھی، ساری دنیا کو اس نے اپنی اخلاقی و روحانی شمع سے منور کیا تھا، اس کا حرفت ریزہ بھی درِ نایاب سے کم نہیں تھا، اس کی زمین سونا اگلتی تھی اور آسمان اس پر جن برساتا تھا، دنیا کے ممالک اس کی تقلید کرنے پر فخر کرتے تھے۔ مگر پھر اس پر نکبت و جہالت کی گھٹا چھا گئی تھی، یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات سلیم نے متعدد نظموں میں ظاہر کیے ہیں۔ "وطن سے خطاب" میں کہتے ہیں ؎

تجھے اے وطن! تو ذرا بتا کہ کہاں ہیں وہ تری صنعتیں
جو ہر ایک ملک سے لاتی تھیں ترے پاس کھینچ کے دولتیں
تجھے مفلسی نہ پسند تھی، تری راہ سعی نہ بند تھی
تری ہمت ایسی بلند تھی کہ نثار اس پہ تھیں ہمتیں
تری کوششوں سے لگی تھی لَو اسی لَو سے پھیلی ہی تھی ضو
ہوئے سست ملک بھی گرمِ رو، تری دیکھ دیکھ کے محنتیں
گیا جب بدل وہ ترا چلن، نہ رہا وہ علم ترا نہ فن
گئیں تجھ سے چھن وہ اب اے وطن، جو خدا نے دی تھیں فضیلتیں
نہ رہا وہ علم کا آسماں، نہ رہا صنعتوں کا رہا نشاں
نہ رہی وہ دولتِ شائگاں، ہوئیں سب وہ خواب و سعادتیں

لیکن سلیم مایوس نہیں ہوئے۔ وہ دعوتِ عمل دے کر ہندوستان کو رشکِ جناں بنانے کے لیے برابر کوشاں رہے ؎

اگر اب بھی گرمِ عناں ہو تو، نہ سرِ دری پہ رواں ہو تو
تو پھر افتخارِ جہاں ہے تو تجھے پھر ملیں وہی عزتیں
اگر اب بھی تیرا بڑھے قدم تجھے سرِ علم کا ہو علم
وہی جاہ پھر ہو، وہی حشم، وہی دولتیں، وہی ثروتیں

اور یہ آرزو ایک سچے محبِ وطن ہی کی ہو سکتی ہے۔

یہی آرزو ہے اے وطن کہ شگفتہ پھر ہو ترا چمن — ترا بخت پھر سے ضیا فگن ہو، ترے وہ عہد کی رونقیں

سلیم انفرادی طور سے وطن کی خدمت کرنے کے علاوہ اجتماعی حیثیت سے اس کی خدمت پر سب کو اکساتے ہیں اور شخصی زندگی پر قومی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ سلیم کی زندگی ہی میں ہندوستان کی سیاسی تحریک نے ایک نیا موڑ اختیار کر لیا تھا۔ عدم تعاون، تحریکِ خلافت اور بعض دوسری تحریکوں نے عوام کا اندازِ فکر بدل دیا تھا۔ اگرچہ ان تحریکوں میں ہندوستان کے سپوتوں کو قید و بند کی مصیبتیں برداشت کرنا پڑ رہی تھیں مگر وہ ان تکلیفوں پر خوش

تھے۔ اردو کو اس سلسلے میں یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے بعض مشہور شعرا تحریک آزادی کے نغمہ خواں ہی نہیں بلکہ اس کے سپہ سالاروں میں تھے اور چکی کی مشقت کے ساتھ "مشق سخن" بھی کر رہے تھے۔ وحیدالدین سلیم نے بھی ذوق عمل پیدا کرکے 'جذبۂ آزادی' کو بیدار کیا اور آزادی کے لئے انھوں نے زنداں ہی کو نہیں بلکہ دار و رسن کو بھی قبول کرنے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا ؎

اگر آزادیٔ ہندستاں پنہاں ہے جھیلوں میں　　تو ہے مشتاق ہر ہندی در و دیوار زنداں کا
کبھی رکنے سے رکتا ہے کہیں یہ جذب آزادی　　دبانے سے بھڑک اٹھتا ہے شعلہ آہ سوزاں کا
قتیل خنجر بیداد کی کرلی زباں بندی　　مگر ہے بولنے والا ابھی کوئی چشم گریاں کا
شہیدانِ وطن کا خون آخر رنگ لائے گا　　خدائی کے برابر ہے بہانا خونِ انساں کا

برطانوی حکومت اقتدار کے نشے میں پوری بربریت اور طاقت کے ساتھ تحریک آزادی کو ختم کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ مگر وحیدالدین سلیم کو یقین تھا کہ باطل پرست اپنی طاغوتی قوتوں کے باوجود شکست کھائیں گے۔ اپنی ایک نظم 'جذبۂ ایمان' میں صاف صاف کہتے ہیں ؎

قیامت خیز جذبہ ہے بلندی کا جو سینوں میں　　تو کیسی کھلبلی برپا ہو ان جاہل پرستوں میں
تڑپنے میں ہے مظلوموں کے پنہاں ہم یقیں جانو　　وہی طاقت نظر آتی ہے جو زور جفا کے دستوں میں
حوادث باد و باراں کی طرح آکر گزر جائیں　　پہاڑوں کی توانائی بھری ہے جن کے پربتوں میں
شکستیں کھائی ہیں مشرق نے مغرب سے بہت لیکن　　چھپا بیداریٔ مشرق کا تھا راز ان شکستوں میں
قریب آیا ہے پھر غائب ہوتے نشان مغرب کا　　کہ اک طوفان محشر ہو بپا غفلت کے مستوں میں
نہیں ممکن کہ یہ آندھی تھمے اور تھم کے رہ جائے
در و بام جہاں پر گرد سی اک جم کے رہ جائے

ایک دوسری نظم "امید کی کرن" میں تخم تمنا کا نمو پاکے گلستان ہونے پر یقین دلا رہے ہیں۔

خاتمہ تیرا اب اے ظلمت ہجراں ہوگا　　صبح امید کا پھر جلوہ نمایاں ہوگا
خاک میں تخم تمنا جو دبایا تھا کبھی　　اب وہی تخم نمو پاکے گلستاں ہوگا
زیر خاکستر پروانہ جو پنہاں تھا شرر　　پھر بھڑک کر وہی اب شمع شبستاں ہوگا
خون جس پنجۂ مژگاں سے ٹپکتا تھا کبھی　　خوشنمائی سے وہ اب پنجۂ مرجاں ہوگا
رہ چکا زرد جمال رخ کنعاں جس میں　　گلشن مصر وہی گوشۂ زنداں ہوگا
پہلے اٹھتے تھے جہنم کے شرارے جس جا　　اب وہیں جلوہ نما گلشن رضواں ہوگا

ظلمت فصل خزاں چھائی تھی جس کی پر　　اب وہ پھولوں کی تجلی سے چراغاں ہوگا
یاس کی نیند سے اٹھے گا جو آنکھیں ملتا　　صبح امید کے جلوے سے وہ حیراں ہوگا
جلوۂ شاہد مقصود جو تھا زیر نقاب　　روبروئے چشم تماشا کے وہ عریاں ہوگا
یہ سماں دیکھ کے ہر غم زدہ مانند سلیم
وجد میں آکے مسرت سے غزل خواں ہوگا

سلیم کی حقیقت بیں نگاہ، ہر حال میں عروس فتح و ظفر کا نظارہ کرتی ہے۔ ہندستان کے شاندار مستقبل پر ان کا ایمان و عقیدہ ہے۔ ان کے نزدیک خاک وطن کا ہر ذرہ، رفعت و درخشنی میں اتنا زیادہ ہوگا کہ آفتاب اس کی بلندی و تابناکی کے آگے سر بسجود ہو جائے گا ؎

ناکامیوں کا پردہ الٹتا ہوں جب کبھی　　روئے عروس فتح و ظفر دیکھتا ہوں میں
بخشی ہیں میرے ذرے کو تونے وہ رفعتیں　　سجدہ میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں

عوام کی سربلندی مزدور اور کسان کی بلند بختی، اور محنت کی عظمت پر ان کا ایمان ہے ؎

مزدور کو یہ ایک مبصر نے دی صدا　　محنت کے سنگریزوں میں زر دیکھتا ہوں میں
یہ خاک مفلسی میں جو ذرے چمکتے ہیں　　پوشیدہ ان میں شمس و قمر دیکھتا ہوں میں
محنت بدلنے والی ہے راحت سے بے گماں　　خون جگر بہ رنگ دگر دیکھتا ہوں میں

ایک اور نظم "آئندہ کا خواب" میں کس وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں ؎

جن کو ارباب حشم نے ابھی ٹھکرایا تھا　　محتشم اب وہی دہقاں نظر آتے ہیں مجھے
جن سادات کی کرتے تھے ثنا اسلاف　　اس کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں مجھے
حب انساں کی ضیا جن کے دلوں میں ہے بھری　　چہرے اس قوم کے تاباں نظر آتے ہیں مجھے

لیکن یہ تابانی، بغیر حرکت کے نہیں ہو سکتی۔ وہی قوم زندہ رہ سکتی ہے جو راز زندگی سے واقف ہے اور جس کے نونہال سخت کوش و خطر پسند اور بلند ہمت مستقل مزاج ہوتے ہیں۔ "جادۂ ترقی" میں نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

مثل پروانہ تم اک پل میں نہ جلنا سیکھو　　تا سحر شمع کی مانند پگھلنا سیکھو
دل کو کرنا ہے اگر سوز محبت میں کباب　　کروٹیں آگ کے بستر پہ بدلنا سیکھو
زندگی نام ہے حرکت کا تم افسردہ نہ ہو　　نبض کے خون کی مانند اچھلنا سیکھو
عزم جو دل میں ہو، پورا اسے تم کرکے رہو　　طفل سرکش بنو اور ضد سے مچلنا سیکھو
چشمۂ آب ہو تم سوتے ہو کیوں زیر زمیں　　سنگ خارا کے شگافوں سے ابلنا سیکھو

نہ ڈرو صدمۂ طوفان سے مانند نہنگ — درطۂ بحر کی آغوش میں پلنا سیکھو
آئے گر رنج و مصیبت کی نہ کچھ خوف کرو — موم کی طرح ہر اک سانچے میں ڈھلنا سیکھو
ہے کٹھن منزلِ تسلیم تو پروا کیا ہے — سر کے بل دھار پہ تلوار کی چلنا سیکھو
کلفت دہر سے کیوں ناک چڑھاتے ہو ابھی — اس مئے تلخ کے دو گھونٹ نگلنا سیکھو

ہوکے پامالِ حوادث نہ ترقی سے رکو
دُوب کی طرح سے دب دب کے نکلنا سیکھو

سلیم رجائیت پر ایمان رکھتے ہیں۔ قنوطیت اور فرار، ان کے نزدیک کفر ہے۔ پست ہمتی، غفلت، بے عملی، جمود، یہ تمام باتیں انسان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی، مردوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان کے پاس اگر گوش شنوا اور چشم بصیرت ہے تو کائنات کے ذرے ذرے سے وہ عبرت و بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔ اسی لئے سلیم غفلت و جمود کے طلسم کو توڑنا چاہتے ہیں وہ مادر وطن کے نونہالوں کو ہی نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

طوفانِ حوادث سے لڑ سینہ سپر ہو کر — آتی ہیں یہ آوازیں پیہم لب دریا سے

ان کے نزدیک "منشاء راہ عمل" یہ ہے کہ

در حق پر جھکا سر، دل میں اطمینان پیدا کر — حوادث سے نہ جو بسپا ہو، وہ ایمان پیدا کر
مہیا کر وہ آنکھیں جن سے دیکھے جلوۂ صانع — سنے فطرت کے نغمے جن سے تو کان پیدا کر
تری ہستی کے ذرے گر بکھر جائیں تو کیا پروا — لڑی خورشید سے آنکھیں یہ وہ آن پیدا کر
فلک کی گردشوں کی زد سے جائے گا نکل باہر — جنونِ عشق سے سر میں ذرا دوران پیدا کر

اور جب انسان کا لائحہ عمل یہ ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کو بحر بیکراں پاتا ہے اس کو ہر چیز زندہ و متحرک نظر آتی ہے ؂

ذرے ذرے میں رواں روحِ رواں پاتا ہوں میں — زندگی کو ایک بحر بیکراں پاتا ہوں میں
زندہ ہستی کی خبر دیتی ہے رفتار نفس — بوئے گل کو زندگی کا ترجماں پاتا ہوں میں
چار سو راہِ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر — زندگی کو کاروانِ بے کاراں پاتا ہوں میں
الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں — زندگی کے انقلابات میں نہاں پاتا ہوں میں

دنیا کی تلخیاں انسان کے لئے "حیات شیریں" ہوتی ہیں۔ بڑے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں وہ انسان جو آلام و مصائب کا شکار ہوتے ہوئے بھی مسکراتے رہتے ہیں۔ درحقیقت، مصائب و مشکلات انسان کے جوہر کو نکھارتے ہیں۔ اور اس کی زندگی کو شہرت دوام عطا کرتے ہیں۔

ایسی حیات شیریں کب کو نہیں میسر — دنیا کی تلخیوں کے گھونٹ ایک دم نگل جا
لیکن یہ مرتبہ بغیر ہمت و استقلال کے حاصل نہیں ہو سکتا۔
زندگی کی ہو ترے دم سے جہاں میں ہلچل — کہتے ہیں تجھ کو جہاں کی رگ جاں اے ہمت

صاحب ہمت انسان، اپنی قوت بازو پر بھروسا کرتا ہے، وہ اپنی گاڑی کو خود ہانکتا ہے۔ اس کے نزدیک احسان اٹھا کر جنت میں جانا بھی دوزخ سے کم نہیں ہے سعدی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور سلیم کی خوددار طبیعت بھی نہیں چاہتی کہ وہ بار احسان اٹھائیں بلکہ وہ تو احسان مند ہونے کو موت سمجھتے ہیں۔

زندگی چاہے تو پھر خضر کا احسان اٹھا
آبرو چاہے تو سے چشمہ حیواں سے نگاڑ

کامیابی انھیں کے قدم چومتی ہے جو اپنے اوپر بھروسا کرتے ہیں، دوسرے سے کسی قسم کی کوئی مدد کے طالب نہیں ہوتے۔ عزت نفس اور خودداری اور خود اعتمادی کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتے۔

راہ طلب میں آپ ہو اپنے دستگیر — ہاتھ اپنا خضر کو بھی پکڑنے نہ دو کبھی
عزت کی آب و تاب میں آنے نہ پائے فرق — اس چاند کو خسوف میں پڑنے نہ دو کبھی
دیتے رہو زمانے کی ہر چال کا جواب — نقشے کو زندگی کے بگڑنے نہ دو کبھی
راہِ طلب میں اپنے تئیں اے ہم روو — ہمت کے قافلے سے بچھڑنے نہ دو کبھی
کشتی لڑو زمانے کی ناکامیوں سے تم — غیرت کے ولولوں کو پچھڑنے نہ دو کبھی
دامن میں اٹھو سفر کی جو مطلوب ہے ظفر — دامن سے گرد راہ کو جھڑنے نہ دو کبھی

سلیم کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی قسم کے اعلیٰ جذبات سے بھرا ہوا ہے جس میں انسانیت اور وطنیت کا پہلو نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کے سرسری مطالعے سے ہی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کے نزدیک وطن کی فارغ البالی اور ترقی کا انحصار ابنائے وطن کے افکار و کردار پر ہے اور جب تک ابنائے وطن کا ہر فرد بلندی فکر اور پختگی کردار کا حامل نہیں ہوتا اس وقت تک وہ وطنیت کے صالح اور جاندار تصور سے بے بہرہ رہتا ہے اور وہ وطن کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا۔

غزل

حبیب احمد صدیقی

کچھ نہ کچھ جینے کا حاصل بھی تو ہو
دل اگر ہو، دشمنِ دل بھی تو ہو

رقصِ بسمل کے تماشائی بہت
چارہ سازِ زخمِ بسمل بھی تو ہو

ہم کو مرنا بھی کوئی مشکل نہیں
تم مسیحائی پہ مائل بھی تو ہو

اب بھی ہیں جاں باز پروانے بہت
کوئی لیکن شمعِ محفل بھی تو ہو

کب تلک آغوشِ طوفاں میں جئیں
ہاں کبھی آغوشِ ساحل بھی تو ہو

ہم کو بھی جینے کا ارماں ہے مگر
زندگی جینے کے قابل بھی تو ہو

بے رُخی تم کو نہیں زیبا کہ تم
محرمِ بے تابیِ دل بھی تو ہو

جور کا شکوہ نہیں لیکن کبھی
جور میں کچھ لطف شامل بھی تو ہو

عمر کی صرفِ وفا ہم نے تو کیا
کوئی کافر اس کا قائل بھی تو ہو

شکوۂ دامن کشی ہے ناروا
اب وہ ساقی اب وہ محفل بھی تو ہو

ہے تگ و تازِ مسلسل زندگی
راہ رو کی کوئی منزل بھی تو ہو

نعمتوں سے پُر ہے دامانِ حیات
کوئی طالب کوئی سائل بھی تو ہو

غالب

اور

فنِ تاریخ گوئی

مختار ٹونکی

تاریخ گوئی اور مادّہ نویسی بھی ایک فن ہے اور بڑا نازک فن۔ چناں چہ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شاعر جو بہت پُرگو ہو، ایک ہی نشست میں سیکڑوں اشعار کہہ سکتا ہو اور اپنی جولانیٔ تخیل سے فی البدیہہ غزل یا نظم موزوں کر لینے پر قدرت رکھتا ہو، اُسے تاریخ گوئی اور سن برآمد کر لینے پر بھی بخوبی ملکہ حاصل ہو۔ یہ بات مشاہدہ میں آئی ہے کہ بہت سے اچھے شاعروں کے سامنے جب تاریخ کہنے کا موقع آیا ہے تو اُن سے ایک مصرع تیار کرنا بھی دشوار ہو گیا ہے۔ اس کے برخلاف بہت سے بیگانۂ شعر قسم کے اشخاص اکثر اوقات منٹوں میں تاریخ نکال لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ فن طبعی مناسبت اور ذاتی رجحان پر محمول ہوتا ہے۔

مرزا غالب کے شاعرانہ کمالات سے کون انحراف کر سکتا ہے۔ وہ حقیقت میں "شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے اور شاعری ان کے لیے۔" اُن کا معجز نما کلام اردو شعر و سخن کا حرفِ آخر ہے۔ لیکن وہ تاریخ گوئی اور مادّہ نکالنے میں کامل عبور اور اچھی دستگاہ حاصل نہ کر سکے، باوجودیکہ اُن کے ہم عصر حکیم مومن خاں مومن اس فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے اور تاریخیں چٹکی بجاتے نکال لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح کی تاریخیں اور معمّے جات مومن کے کلام میں پائے جاتے ہیں، غالب کا دیوان اُن سے خالی ہے۔ چنانچہ معمّہ تو غالب نے موخر الذکر نے ایک بھی نہیں لکھا البتہ دو چار تاریخیں ضرور کہی ہیں مگر وہ بھی دورِ شباب یا جوانی کے زمانے کی تحریر کی ہوئی ہیں اور اُن میں کبھی تعمیہ و تخرجہ پایا جاتا ہے۔

غالب نے زیادہ تاریخیں کیوں نہیں کہیں، اس کی کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہی کہ اُنھیں تاریخ گوئی سے طبعی بُعد تھا اور اُن کا میلانِ طبع اس طرف تھا ہی نہیں۔ چنانچہ میر جان جاگوب کو اُنھوں نے خود اس طرح لکھا تھا:

"سوگند کہ ہیچ گاہ دل بہ فنِ تاریخ و معما نہادہ ام و صنعت الفاظ را بر معنی نہ گزیدہ۔"[1]

دوسرے مرزا صاحب اِن شاعرانہ گورکھ دھندوں اور داؤ پیچ کو مرتبۂ شاعری سے کمتر خیال کرتے تھے اور اُنھیں اس بات کے ماننے میں بھی تامل تھا کہ سنِ ولادت یا تاریخِ وفات کہہ دینے سے "ادائے حقِ محبت" ہو جاتا ہے۔ اُن کے ایک قریبی دوست منشی نبی بخش نے سنہ ۱۸۶۰ء میں وفات پائی تو مرزا کے عزیز شاگرد ہرگوپال تفتہ نے قطعۂ تاریخ رحلت کی فرمائش کا اظہار کچھ ان لفظوں میں کیا کہ مرحوم کا ہم پر یہ حق ہے۔ اس پر غالب نے تفتہ کو جواباً اس طرح تحریر کیا:

"فنِ شاعری کو دونِ مرتبۂ شاعری جانتا ہوں اور تمہاری طرح یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخِ وفات لکھنے سے ادائے حقِ محبت ہو جاتا ہے۔"[2]

---

[1] پنج آہنگ صفحہ ۱۶۲ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۱۴

میاں داد خاں سیاح کو مکتوب لکھتے ہوئے انھوں نے تیسری وجہ خود بیان کر دی ہے :

" میں فنِ تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سنی ہوگی۔ فارسی دیوان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ مادّہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم کچھ کہیں کیا کہتا ہوں؟ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھ کو جوڑ لگانا نہیں آتا۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادّہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈھ لا دیتے، موزوں میں کرتا۔[1] "

ان اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرزا غالب کو تاریخ گوئی قطعاً پسند نہیں تھی۔ وہ ان الجھنوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اور بہ مجبوری اُنھوں نے جو تاریخی قطعات کہے ہیں، ان میں اشعار تو اُن کے موزوں کیے ہوئے ہیں لیکن مادہ ہائے تاریخ بیشتر دوسروں کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس کا ثبوت اُن کے دوسرے خطوط کے تجزیہ سے بھی ملتا ہے۔ نواب علاء الدین احمد خاں بہادر علائی کو اپنے دیوانے بھائی کے مادۂ تاریخ وفات سے متعلق اپنی پریشانی کا اظہار ان لفظوں میں کیا :

" میاں اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادّہ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں۔ لوگوں کے مادّے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادّہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے بھائی کی رحلت کا مادّہ "دریغ دیوانہ" نکالا۔ اس میں سے آہ کے عدد گھٹائے۔ تمام دوپہر اسی فکر میں رہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مادّہ ڈھونڈھا۔ تمھارے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اس پر بڑھاؤں۔ بارے ایک قطعہ درست ہو گیا تمھاری زبان سے، یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر زائد و موضح مدعا۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ قطعہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ ہاں اغلاق تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو۔[2] "

نواب علائی کے یہاں جب فرزند تولد ہوا تو انھوں نے تاریخی نام اور قطعۂ تاریخ ولادت کی زور دار فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اپنی معذوری ظاہر کرتے ہوئے جو جواب تحریر کیا ہے اور جس طرح اپنی برات کے لیے بہانے تراشے ہیں، اُن سے بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ ان چیزوں سے بہت گھبراتے تھے اور ان جھمیلوں سے دور رہنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں :

" مولانا نسیمی! کیوں خفا ہوتے ہو؟ ہمیشہ سے اسلاف اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر میں خلیفۂ اول ہوں تو تم خلیفۂ ثانی ہو۔ اس کو عمر میں تم پر تقدم زمانی ہے۔ جانشین دونوں، مگر ایک اول اور ایک ثانی ہے..... شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے، طریق صید افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے۔ حسنِ طبع خدا داد رکھتے ہو۔ ولادت فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو؟ اسم تاریخی کیوں نہ نکالو کہ مجھ پیر غم زدہ دل مردہ کو تکلیف دو۔ علاء الدین خاں تیری جان کی قسم! میں نے پہلے لڑکے کا اسم تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہونچا۔ نہ صاحب! دہائی خدا کی، میں نہ تاریخ کہوں گا، نہ نام تاریخی ڈھونڈھوں گا۔[3] "

فنِ تاریخ سے اپنی ناواقفیت کا اعتراف منشی شیو نارائن سے ایک خط میں اس طرح کیا ہے :

" رات بھر میں نے فکر شعر میں خونِ جگر کھایا، اکیس شعر کا قصیدہ کہہ کر تمھارا حکم بجا لایا۔ میرے دوست خصوصاً میرزا تفتہ جانتے ہیں کہ میں فنِ تاریخ کو نہیں جانتا۔ اس قصیدے میں ایک روش خاص سے اظہار ۱۸۵۸ء کا کر دیا ہے۔ خدا کرے تمھارے پسند آ دے۔[4] "

پھر بھی غالب کی کہی ہوئی جو تاریخیں ہمیں دستیاب ہیں وہ خالی

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۰۴ [2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۳۳ منقول از [illegible]

[3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۴۱ [4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۴۹

اندول جیسی نہیں ہیں۔ یہی مادہ ہائے تاریخ اُن کے مزاج کو سمجھنے میں بھی مدد بہم پہونچاتے ہیں اور قطعۂ تاریخ سے متعلق شخص کا اُن سے تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ اُن کی اُردو فارسی تاریخیں معدودے چند ہیں جن میں سے کچھ کا بیان درج ذیل ہے۔

میرن صاحب نے ۱۲۷۳ھ میں دنیائے فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی تو مرزا صاحب نے نواب انوار الدولہ کو تحریر کیا:

"آپ کو معلوم ہوگا کہ میرن صاحب نے انتقال کیا۔ یہ چھوٹے بھائی تھے مجتہد العصر لکھنؤ کے۔ نام ان کا سید حسین اور خطاب سید العلماء تمش تخلص میر حسین ابن علی۔ میں نے اُن کی رحلت کی ایک تاریخ پائی۔ اس میں پانچ بڑھتے تھے یعنی ۱۲۷۸ ہوتے تھے۔ تخرجہ نئی روش کا میرے خیال میں آیا۔ میں تو جانتا ہوں اچھا ہے۔ دیکھوں آپ پسند فرماتے ہیں یا نہیں۔ قطعہ

حسین بن علی آبروئے علم و عمل — کہ سید العلماء نقش تمائش بودی

نماندہ ماندی اگر زندہ پنج سال دگر — "غم حسین علی" سال ماتمش بودی"[1]

۱۲۷۸ - ۵ = ۱۲۷۳ھ

تذکرہ سراپا سخن ۱۲۷۰ھ میں شائع ہوئی تو غالب نے قطعۂ تاریخ بالکل نئے اور انوکھے ڈھنگ سے لکھا۔ اگرچہ اس میں مادہ تاریخ بہت آسان طریقہ پر نکالا گیا ہے مگر اُن کے ذوق بذلہ سنجی نے ایک نیا لطف اور حسن پیدا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اس کتاب طرب نصاب نے جب — آب و تاب انطباع کی پائی

فکر تاریخ سال میں مجھ کو — ایک صورت نئی نظر آئی

ہفتہ[؟] پہلے سات سات کے دو — دیئے ناگاہ مجھ کو دکھلائی

اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا — باہزاراں ہزار زیبائی

سال ہجری تو ہو گیا معلوم — ہے شمول عبارت آرائی

مگر اب ذوق بذلہ سنجی کو — ہے جداگانہ کار فرمائی

سات اور سات ہوتے ہیں چودہ — بہ امید سعادت افزائی

غرض اس سے ہیں چار دہ معصوم — جن سے ہے چشم و جاں کو زیبائی

اور بارہ امام ہیں۔ بارہ[12] — جن سے ایماں کو ہے توانائی

اُن کو غالب یہ سال اچھا ہے

جو اُنھی کے ہیں تولائی"[2]

ایک مکتوب میں نواب 'فردوس مکاں' کو اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"...... ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلۂ مغفورہ کی تعزیت میں روانہ کر چکا ہوں۔ اب ایک قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا نقیہ ہے لیکن کتنا خوب اور بے تکلف ہے۔

جناب عالیہ از بخشش حق — بہ فردوس بریں چوں کرد آرام

سخن پرداز غالب سال رحلت — "خلود خلد" گفت از روئے الہام

۱۲۷۵ھ

جب نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر 'خلد آشیاں' ۱۸۶۶ء میں کونسل کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے بحکم گورنمنٹ کلکتہ تشریف لے گئے تو غالب نے قطعۂ تاریخ نت نئے طرز پر نظم کیا ملاحظہ کیجئے:

"چو نواب از بہر اجلاس کونسل — بہ کلکتہ از رامپور آورد رخ

عدد را بگیرد کشش زود دی را — بجو سال اجلاس از "بخت فرخ"

چہ گویند، کز کشتن دی چہ خواہی — بگو حذف اعداد دی اینت پاسخ"

اینت لغت پارسی ہے مرادف 'ہی و زہی' اور 'قتل' کا مشار الیہ لفظ "دی" ہے جس کے ۱۶ عدد ہیں اور "دی" کا مشار الیہ "عدد" ہے۔ "بخت فرخ" کے ۱۸۸۲۔ جب اس میں سے ۱۶ کم کئے تو ۱۸۶۶ رہے۔"[3]

میرزا جعفر کی شادی کے موقع پر قطعہ ہائے تاریخ اس طرح نظم کیے:

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ

ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب — نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی "محظوظ"

۱۸۵۴ء

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزم طرب میں رقص ناہید

کہا غالب سے تاریخ اس کی کیا ہے؟ — تو بولا "انشراح جشن جمشید"

۱۲۷۰ھ

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۱

[2] غالب نامہ [3] مکاتیب غالب صفحہ ۱۳ [4] مکاتیب غالب صفحہ ۶۳

یہ دو دوسری تاریخیں بھی دیکھئے :

سلیم زماں کہ وہ ہے نورِ چشمِ واصل خاں | حکیمِ حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام
تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے | کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام
اسے فضائل علم و ہنر کی افزائش | ہوئی ہے مبدءِ عالم سے استعدادِ تمام
کہ بحثِ علم میں اطفال ابجدی اُس کے | ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام
عجیب نسخۂ نادر لکھا ہے ایک اُس نے | کہ جس میں حکمت و طب کے مسئلے ہیں تمام
نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع | نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہر کام
کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے | کمالِ فکر میں رکھا خرد نے بے آرام
کہا یہ جلد کہ "تو اس میں سوچتا کیا ہے!" | لکھا ہے "نسخۂ تحفہ" یہی ہے سالِ تمام[1]

۱۲۷۹ھ

پروردہ فرزند احمد کو ملا | رحمتِ باری کا جو گنجینہ ہے
سالِ تاریخ ولادت یوں لکھا | "راحتِ جاں ہے سرورِ سینہ ہے"[2]

۱۲ ۸۴ ھ

مادۂ تاریخ سے متعلق مرزا غالب کا ایک لطیفہ بھی بہت مشہور ہے۔ میرزا نے حضرت صاحبِ عالم مارہروی سے اُن کا سنِ ولادت دریافت کیا تو موصوف نے جواب میں لکھا کہ میرا سالِ پیدائش لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے جس کے اعداد ۱۲۱۱ ہیں۔ میرزا کی ولادت ۱۲۱۲ھ میں واقع ہوئی تھی۔ چنانچہ میرزا کی شوخی عود کر آئی اور انھوں نے یہ پُرمذاق شعر لکھ بھیجا:

ہاتفِ غیب سن کے یہ چیخا | اُن کی تاریخ میرا تاریخا[3]

۱؎ یادگارِ نالہ قطعہ ۲۰ ۲؎ منقول از صحیفۂ عرشی ۳؎ نکاتِ غالب صفحہ ۱۰

کہا جاتا ہے کہ مومن خاں مومن نے "دست و بازو بشکست" کہہ کر خود اپنی تاریخِ وفات از روئے نجوم نکال لی تھی۔ غالب نے بھی کئی بار اپنے مرنے کی تاریخ کہی مگر ہر دفعہ غلط ثابت ہوئی۔ ۱۲۷۷ھ میں انھوں نے ایک قطعہ تاریخِ وفات لکھا تو ان کے ایک شاگرد منشی جواہر سنگھ جوہر نے اُن سے ازراہِ تفنن کہا: "حضرت انشاء اللہ یہ مادہ بھی غلط ثابت ہوگا۔" مرزا بولے: "دیکھو صاحب! تم ایسی فالِ بد منہ سے نہ نکالو، اگر یہ مادہ ٹھیک نہ نکلا تو میں سر پھوڑ کر مر جاؤں گا۔" مرزا کی وفات اس قطعہ کے برخلاف آٹھ سال بعد ہوئی۔ فرماتے ہیں:

کیستم من کہ جاوداں باشم | چوں نظیری نماند و طالب مرد
در بگویند در کدامیں سال | مرد غالب بگو کہ "غالب مرد"

لیکن اس کے بارے میں وہ خود لکھ چکے تھے کہ "یہ مادۂ تاریخ از روئے نجوم نہیں بلکہ از روئے کشف ہے۔"[1]

آل محمد مارہروی نے دیوانِ تاریخ صفحہ ۱۶۴ پر ایک قطعۂ تاریخ بعنوان "تاریخِ کر شدن مرزا اسد اللہ خاں المتخلص بہ غالب والمشہور بہ مرزا نوشہ دہلوی" لکھا ہے!

کان بہرے میرزا نوشہ کے آہ | بیٹھے بیٹھے یک بیک کیونکر ہوئے
دوستو تاریخ اس کی غیب سے | یوں سنی میں نے کہ "غالب کر ہوئے"[2]

لیکن عرشی نے اسے درست نہیں مانا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مرزا غالب اس سے پیشتر ہی اپنی قوتِ سماعت کھو چکے تھے۔

۱؎ غالب کے لطیفے صفحہ ۷۷۔ عود ہندی صفحہ ۱۴۰ ۲؎ منقول از مکاتیبِ غالب۔



"ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ملک کی حفاظت ہماری سب سے پہلی ذمے داری ہے۔"
—— جواہر لعل نہرو

للکار

تاج قریشی

بھارت کھیتی کے رکھوالو، اُٹھو! چینی دل کو بھگاؤ
دیکھو تو، تر ہے بھارت دھرتی، پاپی پگ یاں آنے نہ پائیں
دیکھو، پیلے بادل اُٹھ کر، چھاتے ہیں آکاش پہ اس کے
آندھی بن کر روند و اِن کو، بجلی بن کر ٹوٹو اِن پر
بھارت کے اے ویر سپوتو! لاج تمھارے ہاتھ ہے پیارو
گھٹنیوں اُس نے چلنا سکھایا، گود میں اپنی پالا پوسا
ایک اِک پوت ہے اس کا "ٹیپو" اور ہر استری "جھانسی کی رانی"
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، سب ہیں اس کی آنکھ کے تارے
اُتر، دکھن، پورب، پچھم، اِس کے پجاری کونے کونے
جس کے اتنے پریم پجاری، اُس کے دوارے دھول کہاں ہو
ننھے، بالک، کرِپل، گبھرو، بوڑھے، بھگتی، دھنی، بھکاری
کشٹ گھڑی جب آئے اس پر، اپنے لہو کی بھینٹ چڑھاؤ
بھارت جے للکارو ایسا، جس سے ہوں سب پیتے، پانی
دیش کے کارن آگ میں کود و، پربت کو بھی توڑ کے رکھ دو
جیسے ترنگا جھنڈا اپنا، ویسے تینوں نبسنا او نچے
دیش دھرم کا پالن کر کے، اپنے من کی آنکھیں کھولو!

کھیت کی باڑھ تک آیا ہے یہ، اِس پر آگ کا مینہ برساؤ
سادھو سنتوں کا ہے ٹھکانا، دیکھو ٹھگ یاں آنے نہ پائیں
اپنا بس پھیلائیں گے یہ، کھاج سے پھوڑوں سا، برسوں کے
رات کا کالک پوتھ نہ دیں یہ، کندن سے چمکیلے دن پر
اپنی ماتا کے چرنوں پر تن من دھن سب اپنا وارو
آج تمھارے بل بوتے کا اِس کو ہے بھرپور بھروسا
بستی بستی، جنگل جنگل، دیوتا ان کی سب نے مانی
مچلی ہوئی جمنا کی لہریں، بپھرے ہوئے ساگر کے دھارے
جانتے ہیں یہ اپنی بھلائی، اس پر اپنا سب کچھ کھونے
تُلتی رہے پھولوں میں سدا جو، اُس کے آنگن شول کہاں ہو
جاگ پڑے ہیں دیش کے کارن، سب نے اب تلوار اُٹھا لی
اِس کو سکھی رکھنے کے کارن، جتنے بھی ہوں بوجھ اُٹھاؤ
آج سنا دو جگت والوں کو بھولی ہوئی ایک ایک کہانی
جو بھی پودے سامنے آئیں، ان کو سر سے جھوڑ کے رکھ دو
باپو، سبھاش اور پنڈت نہرو، بھارت دیش کے ناؤ کھویتے
سب کی پرکھشا کا یہ سمے ہے، بھارت ماتا کی جے بولو!

بھارت کھیتی کے رکھوالو، اُٹھو! چینی دل کو بھگاؤ
کھیت کی باڑھ تک آیا ہے یہ، اِس پر آگ کا مینہ برساؤ

منشی نوبت رائے نظرؔ

دیریندر پرشاد سکسینہ

منشی نوبت رائے نظرؔ لکھنوی لکھنؤ کے مردم خیز محلہ نوازگنج میں ستمبر ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے تھے لیکن ہمارے ادبی مورخوں نے آپ کی سن ولادت سب ہی تذکروں میں ۱۸۶۶ء تحریر کی ہے جو بالکل غلط ہے۔ نظرؔ لکھنوی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں فرماتے ہیں:۔ "پیدائش ستمبر ۱۸۶۴ء بمقام لکھنؤ محلہ نوازگنج۔" آپ کے والد منشی اُلفت رائے اردو اور فارسی کے جید عالم تھے اور اُن کا تعلق ایک معزز سکسینہ کائستھ خاندان سے تھا جن کے بزرگ دہلی اور لکھنؤ کے شاہی درباروں میں ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔ بچپن سے ہی نوبت رائے میں غیر معمولی ذہانت کے آثار اُن کے چہرے سے نمایاں تھے۔ اُردو فارسی اور انگریزی تعلیم سے فراغت حاصل کر کے ہمہ تن اردو ادب کی خدمت میں منہمک ہو گئے۔ نظرؔ مرحوم اپنی تعلیم کے سلسلے میں اپنے خود نوشت حالات میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"صغر سنی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے پر راقم کی تعلیم و تربیت جد مرحوم کے ظلِ عاطفت میں ہوئی۔ قدیم دستور کے مطابق راقم کی تعلیم بھی فارسی سے شروع کی گئی۔ بارہ اور تیرہ سال کی عمر تک فارسی کی درسیات، ادبیات، عروض و قافیہ، معانی و بیان اور علم انشا کی کتابیں پڑھائی گئیں۔ مولوی حسن علی خاں صاحب لکھنوی، مولوی فضل علی صاحب کاکوروی مرحومین اول سے آخر تک معلم رہے۔ خوشنویسی کی اصلاح مولوی عبدالرزاق صاحب مرحوم دیتے تھے۔ سیاق اور علم مجلس کی تعلیم منشی رنگ لال صاحب متخلص بہ چمن سے دلائی گئی۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم شروع ہوئی اور آٹھویں جماعت تک پہونچنے پر مارچ ۱۸۸۰ء میں جد مرحوم کا انتقال ہو گیا جس سے تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔"

نظرؔ ۱۸ سال کی عمر میں آغا مظہرؔ لکھنوی کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہو گئے اور انھیں سے اکتساب فن بھی کیا اور اکتساب کمال بھی۔ محمد سخاوت مرزا نے بغیر کسی تحقیق کے آپ کو منیشؔ تھانوی کا شاگرد لکھ دیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ منشی نوبت رائے نظرؔ نے رسالہ زمانہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں اپنے ابتدائی شوق کا حال اور نیز یہ کہ ۱۸۸۲ء میں آپ کو آغا مظہرؔ سے تلمذ کیونکر حاصل ہوا نہایت دلچسپ طریقے سے قلمبند کیا ہے۔ نظرؔ مرحوم اپنے تلمذ کے سلسلے میں خود نوشت حالات میں یوں رقمطراز ہیں:۔

"۱۸۸۲ء میں پہلے پہل نواب امیر بہادر عرف منجھلے آغا صاحب مرحوم کے مشاعرے میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ مشاعرے سے چند گھنٹے پہلے غزل کہی اور حضرت مظہرؔ مرحوم کو بہ نظر اصلاح دکھائی۔ اس وقت سے سلسلہ اصلاح سخن جاری ہوا اور کئی سال تک جاری رہا۔ فاضل استاد نے شاعری کے عیب و صواب بہت جلد ذہن نشین کر دیے اور اپنے کلام پر آپ اصلاح کرنے کی ہدایت کی۔ اپنے نومشق تلامذہ کے کلام پر بھی راقم ہی سے

اصلاح دلاتے تھے۔ اس طرح مشق سخن کی بہت جلد تکمیل ہو گئی۔"

سب سے پہلا علمی کام جس کو نظر مرحوم نے شائقین علم و ادب کے سامنے پیش کیا اور جس پر لکھنؤ کی سرزمین کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے، خدنگ نظر نامی ماہوار رسالہ کا اجرا تھا۔ خدنگ نظر کا سب سے پہلا شمارہ ماہ ستمبر سنہ ۱۸۹۶ء میں نواب میر محبوب علی خاں نظام الملک آصف جاہ کی سالگرہ کے موقع پر شائع ہوا تھا۔ اس خاص شمارہ کی ایک کاپی میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ خدنگ نظر کے مطبع کا نام بھی نظام کے نام پر آصفی پریس تھا۔ یہ مطبع نوازگنج میں نظر مرحوم کے دولت کدہ پر واقع تھا۔ رشید حسن خاں، اقبال ورما سحر ہتگامی، رفیق مارہروی، رئیس مینائی، عشرت لکھنوی، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ وغیرہ نے خدنگ نظر کے طبع ہونے کی تاریخ سنہ ۱۸۹۷ء لکھی ہے جو غلط ہے۔ منشی نوبت رائے نظر اپنے خود نوشت حالات میں خدنگ نظر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"سنہ ۱۸۹۶ء سے راقم کی ادبی زندگی کا دور شروع ہوا جو اب تک کم و بیش جاری ہے۔ اس سال کے اواخر میں راقم نے لکھنؤ سے خدنگ نظر جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔ یہ اردو کا بہترین رسالہ تصور کیا جاتا تھا۔ نفاست اور ادبی خصوصیات کے لیے خاص شہرت رکھتا تھا۔ بہر نوع سخت مالی مشکلات اور خانگی معاملات کی وجہ سے سنہ ۱۹۰۴ء میں خدنگ نظر کی اشاعت موقوف ہو گئی لیکن اس کی شہرت اب تک قائم ہے۔"

خدنگ نظر کے سرورق پر پہلے یہ شعر ہوتا تھا۔ ؎

مانوس ہیں اگر نگہ فتنہ گر سے آپ
بہلائیے دل کو سیر خدنگ نظر سے آپ

کچھ عرصہ بعد یہ شعر لکھا جانے لگا۔ ؎

نکلا ہے بن سنور کے خدنگ نظر نہ ہو   یاں دل دھڑک رہا ہو کسی کی نظر نہ ہو

رسالہ خدنگ نظر کی عمر کے بارے میں سب ہی تذکرہ نگاروں نے یہ غلطی کی ہے کہ یہ رسالہ ۲ سال بعد مالی مشکلات کے باعث بند کر دیا گیا۔ نظر اپنے خود نوشت حالات میں یوں رقم طراز ہیں:-

"راقم نے خدنگ نظر جاری کیا جو آٹھ سال تک شائع ہوتا رہا۔"

بہرحال رسالہ خدنگ نظر کے ذریعہ نظر مرحوم نے اردو ادب کی آٹھ سال تک بڑی گرانقدر ادبی اور قومی خدمات انجام دیں۔ لکھنؤ اسکول کے ممتاز اساتذۂ سخن صفی، محشر، عزیز، ثاقب، آغا مظفر لکھنوی، چکبست، پنڈت بشن نرائن در، آبرو وغیرہ نے اس گلدستہ کے لیے معرکۃ الآرا طرحوں میں غزلیں لکھ کر خدنگ نظر کو سارے ہندوستان میں مشہور و مقبول کر دیا۔ حق تو یہ ہے کہ نظر مرحوم نے لکھنؤ اسکول کی پوری پوری نمائندگی کی اور وہاں کی شاعری میں (جو بہت لوگوں کی نظر میں کھٹکتی تھی) ایک نیا رنگ پیدا کر دیا جس کی نمائندگی غزل میں عزیز، نظر اور یگانہ کا کلام کرتا ہے۔ نادر کاکوروی کی مشہور نظمیں بھی خدنگ نظر میں شائع ہوئیں۔ عبدالحلیم شرر بھی جب تک خدنگ نظر نکلتا رہا اس کے لیے مضامین لکھتے رہے۔ خدنگ نظر میں جب حصۂ نثر کا اضافہ کیا گیا تو اس کے حصۂ نثر کی ادارت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو سپرد کی گئی۔ خدنگ نظر میں مولانا کا ایک مقالہ انگیں ریزہ کی تاریخ پر شائع ہوا تھا۔ جب یہ مقالہ مولانا شبلی کی نظر سے گذرا تو انھوں نے اس کی بڑی تعریف کی۔

خدنگ نظر کے بند ہو جانے کے بعد نظر مرحوم سنہ ۱۹۰۵ء میں رسالہ زمانہ کانپور کے سب اڈیٹر مقرر ہو گئے اور رسالہ زمانہ ایک خاص آب و تاب اور ادبی خصوصیات کے ساتھ ان کی سب اڈیٹری میں نکلتا رہا۔ پانچ برس بعد یعنی سنہ ۱۹۱۰ء میں آپ انڈین پریس الہ آباد چلے گئے اور وہاں سے ادیب کا اجرا کیا۔ رسالہ ادیب الہ آباد کے سلسلے میں نظر مرحوم پر مقالہ لکھتے ہوئے سحر ہتگامی زمانہ جنوری سنہ ۲۲ء میں رقمطراز ہیں:-

"جنوری سنہ ۱۹۱۰ء میں انڈین پریس الہ آباد سے اردو کا مشہور رسالہ ادیب بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلا۔ نظر مرحوم اس کے اولیں اڈیٹر تھے۔ ادیب کی یاد سے دل میں اب تک کسی قدر بے چینی ضرور ہو جاتی ہے۔ اس کو اردو زبان کی بد نصیبی ہی کہنا چاہیے کہ ایسا اچھا اور ہونہار پرچہ ساڑھے تین سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا۔ اور اس سے نظر صاحب کا تعلق تو صرف ڈیڑھ سال کے

قریب ہا۔ انھوں نے جس غیر معمولی قابلیت کے ساتھ رسالہ کو ایڈٹ کیا تھا اُس کی شہادت ادیب کے اوراق کہنہ سے آج بھی مل سکتی ہے۔"

ڈیڑھ سال کے بعد انڈین پریس الہ آباد سے مستعفی ہو کر لکھنؤ چلے آئے اور پھر کانپور آکر رسالہ زمانہ کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ اس مرتبہ اخبار آزاد کی ترتیب اور نگرانی بھی منشی دیانرائن نگم نے آپ کے سپرد کر دی تھی۔ مگر ۱۹۱۴ء میں منشی دیانرائن نگم سے ناراض ہو کر پھر اپنے وطن لکھنؤ چلے آئے اور لکھنؤ کے سب سے قدیم اور مشہور اخبار اودھ اخبار کی ادارت آپ کو مل گئی۔ اس اخبار میں آپ نے اس قدر دماغ سوزی سے کام کیا کہ آپ کی صحت خراب ہو گئی اور آخر کار اُس سے تعلق منقطع کرنا پڑا۔ اس کے بعد پنڈت برج ناتھ شرما کے اخبار خادم ھند سے وابستہ ہو گئے۔ آخر ۱۹۲۲ء میں آپ کو ایک ایسے روح فرسا صدمہ سے سابقہ ہوا جس نے آپ کی دنیاوی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ ان کی حاصل زندگی ایک لڑکی تھی۔ وہ داغ مفارقت دے گئی۔ اُس کے ایک لڑکا تھا۔ نظر مرحوم اُس سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ماں سے پہلے لڑکا مر چکا تھا۔ نظر نے اس سانحہ پر ایک نوحہ لکھا تھا جس کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے۔ اپنی حالت کا بالکل سچا نقشہ کھینچا ہے:۔

کھو کہ اس اجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ
نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبل جاں دل کے پار ہوتی ہے
نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

ابھی یہ صدمہ دل سے دور نہیں ہوا تھا کہ والدہ کا سایہ سر سے جاتا رہا۔ شدتِ غم میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

اشک خونیں بارہا ٹپکے تھے آنکھوں سے مگر اس قدر سرخ دیکھی خون تمنا میں کبھی
ہو گیا آغوشِ مادر بھی جدا آج اے نظر اب ملے گی ایسی راحت پھر دنیا میں کبھی

آپ کے بھائی کے داماد منشی تاما پرشاد آپ کے قریب رہتے تھے۔ نظر مرحوم اُن کے چار سالہ بچے کو اپنا کھویا ہوا نواسہ خیال کرنے لگے بڑے لاڈ پیار سے اُس کو کھلاتے پلاتے اور پاس سلاتے تھے لیکن دفعتاً ایک روز چھت سے گر کر اُس بچہ کا چار دن بعد انتقال ہو گیا تو نظر مرحوم نے ایک ہفتہ تک کھانا نہیں کھایا۔ غرض ان کو ساری زندگی اسی طرح کے روح فرسا سانحات پیش آتے رہے جس کی وجہ سے جتنے دن جئے آزردہ جئے۔ آخر یہ کہتے ہوئے ۱۱ر اپریل ۱۹۲۳ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ؎

اے انقلاب عالم تو بھی گواہ رہنا کاٹی ہے عمر ہم نے پہلو بدل بدل کر

حضرت کاظم حسین محشر لکھنوی نے کیا خوب مادۂ تاریخ نکالا ہے۔ ؎

کلک محشر نے لکھا سالِ وفات
شاعر کامل نظر سے چھپ گیا
(۱۹۲۳ء)

ہمارے ادبی مورخوں اور تذکرہ نویسوں کا خیال ہے کہ نظر نے شامِ جوانی کے علاوہ کوئی اور معنوی یادگار نہیں چھوڑی۔ لیکن ذیل کی تفصیل سے اندازہ ہو گا کہ انھوں نے کئی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں سے کچھ تو شائع ہو چکی ہیں اور بعض کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔

(۱) انوار نظر۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے نظر کی غزلیات کا ایک مجموعہ اُن کے وارثوں سے خریدا تھا اور اس مجموعہ غزلیات کا نام اکیڈمی کی طرف سے انوارِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس مجموعہ کی ترتیب کا کام منشی دیانرائن نگم اڈیٹر زمانہ کے سپرد ہوا تھا لیکن وہ اس کام کو اپنی زندگی میں پورا نہیں کر سکے اور نگم صاحب کو سفر آخرت پیش آ گیا۔ اس طرح کلام نظر نگم صاحب کی الماریوں میں بند رہ گیا۔ حضرت جگر بریلوی نے جنھوں نے نظر کی یاد میں یادگار نظر نامی کتاب لکھی ہے منشی دیانرائن نگم کو کئی بار اشاعت کلام نظر کے متعلق لکھا لیکن ہر مرتبہ نگم صاحب نے بڑے لطیف انداز سے اس کی اشاعت کی معذرت کی۔ ضرورت ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی یہ مجموعہ نگم صاحب کے وارثوں سے حاصل کر کے شائع کر دے۔

(۲) دیر و حرم۔ نظر کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ دیر و حرم تھا جو بابو مگھو موہن دیال ڈپٹی کلکٹر کے پاس تھا۔ ڈپٹی صاحب نے اس مجموعہ کو بغرض اشاعت مرحوم کے داماد سے لیا تھا لیکن انوارِ نظر کی طرح یہ مجموعہ بھی ڈپٹی صاحب کی الماریوں میں بند رہ گیا۔

(۳) شامِ جوانی ۔ یہ رینالڈس کے ایک مشہور ناول کا ترجمہ ہے جس میں اتھیل اور لیڈی لینگو پورٹ کی مکمل داستانِ عشق و محبت درج ہے۔ نظر نے اس کا ترجمہ شامِ جوانی کے نام سے دو حصوں میں کیا تھا۔ یہ کتاب نول کشور پریس لکھنؤ سے کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے۔ ترجمہ اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

(۴) "نظر کے تنقیدی مضامین" حضرت نظر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس کو انھوں نے خود مرتب کیا تھا۔ اس میں آخری شاہِ اودھ، میر انیس، اکبر مرحوم کے خطوط، سرور جہان آبادی، مصوران لکھنؤ، رجب علی بیگ سرور، گلزارِ نسیم، مثنوی حزن اختر وغیرہ پر مضامین ہیں۔ یہ مجموعہ خدا نے چاہا تو جلد منظرِ عام پر آئے گا۔

(۵) عروج و زوال یا حسین رانی ۔ اس کتاب میں پرتھوی راج اور شہاب الدین غوری کی معرکہ آرائیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کے کئی اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) ستے بگڑے ۔ یہ ایک دلچسپ مزاحیہ ناول ہے۔ اس ناول کے پانچ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

منشی نوبت رائے نظر کا شمار ہندوستان کے صفِ اول کے اساتذۂ سخن میں ہے۔ آپ غزل اور نظم دونوں میں یکساں قدرت رکھتے تھے۔ خاص کر فنِ غزل گوئی میں وہ درجۂ کمال حاصل تھا کہ ان کے دور میں ان کا لکھنؤ میں شاید ہی کوئی ہمسر قرار دیا جا سکے۔ نظر نے غزلوں میں پرانے لکھنوی رنگ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا بلکہ وہ پہلے لکھنوی شاعر ہیں جنھوں نے پرانی ڈگر سے انحراف کیا۔ حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگان میں نظر مرحوم کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:۔

"حضرت نظر فطری شاعر تھے۔ ان کا مستقل رنگ جذبات نگاری ہے۔ اُن کا کلام کیفیاتِ قلب کا آئینہ ہے۔ بلند خیالی کا دفتر ہے۔ اُن کے اشعار میں بے انتہا سوز و گداز ہے۔ اس کی وجہ تھی "آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد" جو صدمے ان کی جان پر گذر رہے، معمولی نہ تھے۔ اول تو یوں ہی ان کی زندگی آزردگی کی زندگی تھی اُس پر روح فرسا سانحات کا پیش آنا۔ غم و اندوہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئے۔ یہ ان کی سلامتی ذوق تھی کہ اپنی آہ میں انھوں نے واہ کی شان نہیں پیدا ہونے دی۔ یہ ان کا شاعرانہ اعجاز تھا کہ قلب کی المناک کیفیتوں کو ایسی پاکیزہ اور دل کش زبان میں ادا کیا کہ دل تڑپ اٹھتا ہے۔"

اب نظر کے چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی   اب یہ دنیا نہیں بدلنے کی

دلِ سوزاں کو شمع کیا کہیے   اس کو حسرت کہاں ہے جلنے کی

دل تھا تو ہو رہا تھا احساسِ زندگی بھی   زندہ ہوں اب کہ مردہ یہ بھی خبر نہیں ہے

یاسِ ناکامی سے جس قلب مضطر ہو گیا   اب ترا ملنا نہ ملنا سب برابر ہو گیا

یاس سے ویرانی حسرت کبھی ایسی نہ تھی   دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی

تباہی دل کی دیکھی ہے جو ہم نے اپنی آنکھوں سے
ہر اب کیسی ہی بستی ہم اسے ویرانہ کہتے ہیں

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں   سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

قفس سے چھٹ کے ہوا باغ باغ دل کیا   بہار دے گیا اُجڑا ہوا نشیمن بھی

ٹپکا لہو کا قطرۂ آخر بھی آنکھ سے
اے غم ہزار شکر کہ اب دل نہیں رہا

ہوئی ہے کیا جانے کیا بُرائی قفس سے پاتے نہیں رہائی
گلوں کی بو تک نہ اُڑ کے آئی ادھر کی شاید ہوا نہیں ہے

اتنی ہی رہ گئی ہے اب کائنات دل کی   دیکھو گے جب تم آ کر کچھ اضطراب ہوگا

نہ چھیڑ اے ہمنشیں ناکامیٔ حسرت کا افسانہ   کہ اب تو بات کرنے سے بھی دل میں درد ہوتا ہے

اب کچھ بلند بینی کے نمونے بھی ملاحظہ ہوں:۔

گردشِ دہر بھی اک گردشِ پیمانہ ہے   ذرے ذرے میں ترا جلوۂ مستانہ ہے

حالتِ محفلِ عشرت ہی تو ہم سب اس میں   ایک خضر کے برابر پروانہ ہے

جہاں میں چار دن رہ کر فنا ہوئے دنیا   گلوں سے بھی سبق لیتا ہوا اپنی محبت کا

نہ ملتا مدعائے دل درم ملتا جو منعم سے
مگر اک داغ بن کر وہ کفِ سائل میں رہ جاتا

نہ ہوئی جلوہ گہ ناز کی وسعت معلوم   گو میں ہر ذرے کو اک دیدۂ حیراں سمجھا

یہ اک قطرۂ خوں حاصل ارض و سما ہوتا
بنا ہے دل جو سینے میں نہ ہوتا دل تو کیا ہوتا

زبانِ شمع نے رسوا کیا سوزِ محبت کو — مناسب تھا کہ خاموشی میں یہ مطلب ادا ہوتا

فنا ہونے میں سوزِ شمع کی منت کشی کیسی — جلے جو آگ میں اپنی اُسے پروانہ کہتے ہیں

معاذ اللہ تیرا حسن تیری بزمِ عشرت میں — یہ وہ محفل ہے جس میں شمع کو پروانہ کہتے ہیں

بند آنکھوں سے نظر آتی ہے ہر شے دہر کی — عالمِ رویا میں فرقِ خواب بیداری نہیں

پردہ اٹھا دے اک دن تو لئے حجابِ ہستی — پاتا ہوں اس کو دل میں دیکھا مگر نہیں ہے

وہ دل ہے بزمِ عالم میں نظر اک سازِ شکستہ — نہ چھیڑے تار ہستی پر جو نغمہ اُس کی قدرت کا

جلوۂ بے ثبات ہوں رونقِ کائنات ہوں — پھول میں رنگ بن کے میں جوش ہوں میں بہار کا

خزاں انجام ہو سب کی بہار چند روزہ کا — بہت روتا ہوں صورت دیکھ کر گلہائے خنداں کی

نظر مرحوم کی نظمیں بھی ایک مخصوص طرز رکھتی ہیں۔ نظموں میں پختگی شگفتگی اور بلا کی روانی ہے۔ نظموں میں جو تشبیہیں آپ نے استعمال کی ہیں وہ بڑی عام فہم ہیں۔ نظر کی متعدد نظموں سے اُن کا سیاسی شعور اور ان کا جذبۂ حبِّ وطن بھی ظاہر ہوتا ہے۔ "مظالم جنوبی افریقہ" کے عنوان سے نظر نے ایک مسدس لکھا تھا۔ اِس کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔ ؎

برادرانِ وطن کا پیامِ غم سن لو — حکایتِ ستم و قصّۂ الم سن لو

سُنے نہ ہوں جو زمانہ میں وہ ستم سن لو — غریب قوم کا احوالِ بیش و کم سن لو

جہاں سے رخصت بیمار ہے خدا حافظ

جنازہ قوم کا تیار ہے خدا حافظ

یہ تیرے نام کا ہے پاس ان کو اے بھارت — کہ جان جائے نہ جائے مگر تری عزت

ہے تیری عظمتِ دیرینہ کی انھیں غیرت — وطن سے دور ہیں لیکن ہے ان میں وہ ہمت

مٹیں گے آن پہ بگڑی بنا کے اٹھیں گے

مٹانے والوں کو اپنے مٹا کے اٹھیں گے

نظر مرحوم نے اپنے نواسہ کی وفات پر ایک نوحہ لکھا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی پتہ چلتا ہے کہ یہ اُن کے دُکھ بھرے دل سے خود بخود نکل پڑے ہیں۔ دو بند ملاحظہ ہوں۔ ؎

ہوا تمام امیدوں کا خاتمہ تم پر — کسی سے اب توقع نہ ہے کسی پہ نظر

جہاں میں اپنا ہوا انجام کیا نہیں ہے خبر — مرے پہ دیکھئے ملتا ہے اب کفن کیونکر

کہاں گئے مری بگڑی سنوارنے والے

پکار لو مجھے لالہ پکارنے والے

ٹھہر ٹھہر کو اس اجڑے مکاں کا تھا یہ چراغ — بہار پر تھا اسی نونہال سے یہ باغ

نہ ہوگا اب مجھے حاصل کبھی جہاں میں فراغ — تمام عمر دلِ ناتواں ہے اور یہ داغ

فغانِ بلبلِ جاں دل کے پار ہوتی ہے

نظر کے باغ سے رخصت بہار ہوتی ہے

فصلِ بہار کے عنوان سے نظر نے ایک نظم لکھی تھی جس میں بہار کے مناظر کی بڑی حسین تصویر کھینچی گئی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔ ؎

کہاں ہیں جو دلکشِ لطفِ ابتدائے بہار — وہ آئے ابر کے ٹکڑے چلی ہوائے بہار

وہ جھوم جھوم کے چاروں طرف گھٹا چھائی — ہوا نے کھول دی وہ زلفِ مشک سائے بہار

وہ شورِ رعد سے سارا جہان گونج اٹھا — ہوئی وہ دھوم سو پھر آج ابتدائے بہار

کڑک رہی ہے وہ بجلی گرج رہا ہے وہ ابر — بجا رہی ہے وہ سازِ طرب ہوائے بہار

پیامِ موسمِ گل لے کے ابر آیا ہے — ترانہ سنج ہیں مرغانِ خوشنوائے بہار

چمک رہی ہے یہ ابرِ سیاہ میں بجلی — چڑھا ہوا ہے کسوٹی پہ یا طلائے بہار

چمن میں ابر کے چھینٹے کریں مسیحائی — خزاں کی فصل کے کشتوں کو پھر جلائے بہار

نظر مرحوم شاعر اور نثر نگار ہونے کے علاوہ اردو میں اپنے طرز کے بہترین تنقید نگار بھی تھے۔ اُن کی تنقیدوں میں ہیر پھیر نہیں ملتی بلکہ بے لاگ تنقید ہوتی ہے۔ ان تنقیدوں میں انھوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے۔ اُن کی نثر نہایت شگفتہ، رواں اور دلکش ہوتی تھی۔ سلیس فقرات اور عام فہم محاورات کا استعمال اُس میں جان ڈال دیتا تھا۔ خدنگ نظر، زمانہ، ادیب، شمس بنگالہ، تنویر المشرق، اور اودھ اخبار میں آپ کی نثر کے اعلیٰ نمونے مختلف موضوعات پر ملتے ہیں۔ نظر نے واجد علی شاہ پر بھی ایک تحقیقی مقالہ لکھا تھا جو ۱۰۰ صفحات سے زیادہ پر پھیلا ہوا ہے۔ لکھنؤ کے سلسلے میں اُن کے مضامین اگر اکٹھے کیے جائیں تو پانسو صفحات کی ایک کتاب شائع ہو سکتی ہے۔ یہ کام اردو والوں کا ہے لیکن ایسے کاموں کی طرف ہماری نظر ہی نہیں جاتی۔

نظر کی انشا پردازی کے متعلق منشی دیا نرائن نگم مرحوم رسالہ زمانہ کے جوبلی نمبر میں لکھتے ہیں:۔

"گو انگریزی میں اسکول کا معمولی کورس بھی ختم نہ کیا تھا لیکن دقیق سے دقیق مضامین کا بخوبی ترجمہ کر لیتے تھے۔ آپ کی پہلی تنقید

"نقاد لکھنوی" کے نام سے جون ۱۹۰۵ء کے زمانہ میں مثنوی گلزار نسیم کے متعلق شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ کی اکثر عالمانہ تنقیدیں شائع ہوتی رہیں۔ منیر شکوہ آبادی، داغ دہلوی، رجب علی سرور پر آپ کے مضامین اپنا جواب نہیں رکھتے۔ زمانہ میں ایک سلسلۂ مضامین اردو رسالوں کے حصۂ نظم کی تنقید کا بھی شروع کیا گیا تھا۔ یہ نظر صاحب ہی کا لکھا ہوتا تھا۔ وفات کے ماہ سوا ماہ قبل "خطوط اکبر" پر آپ نے ایک آزادانہ عالمانہ تنقید زمانہ میں لکھی تھی۔"

حضرت جگر بریلوی یاد رفتگان میں فرماتے ہیں :۔

"صحت مذاق اور دقت نظر کے اعتبار سے بھی آپ کی تنقیدیں قابل تقلید نمونہ ہیں۔ آپ کس پایہ کے انشا پرداز تھے اس کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ کے ناول اور تمام وہ مضامین جو اس وقت کے معیاری رسالوں کا زیور تھے، جمع کر کے ادبی دنیا میں پیش کیے جائیں۔ یہ فرض اردو والوں کا تھا۔ سو نہ آپ کے مضامین نثر باقی ہیں نہ تصنیفات نظم۔"

آخر میں نظر مرحوم کے دو غیر مطبوعہ خطوط ملاحظہ فرمایئے۔ پہلا خط حامد علی خاں بیرسٹر مرحوم کے نام ہے جو نظر مرحوم کے جگری دوست تھے اور دوسرا خط منشی دیا نرائن نگم کے نام ہے جن کے رسالہ زمانہ کی شہرت میں نظر مرحوم کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ان خطوط کی اصل میرے پاس محفوظ ہے۔

(۱)

کانپور مورخہ ۷ر اپریل ۱۹۱۳ء

جناب مکرمی۔ تسلیم۔ نوازش نامہ مع کلام پہونچا ممنون منت فرمایا۔ غزل اور تاریخ دونوں لاجواب ہیں۔ تاریخ میں آپ کا کمال مجھے آج ہی معلوم ہوا۔ یادگار تاریخ ہے۔ غزل میں بعض بعض شعر تو ایسے ہیں جن سے بہتر اس طرح میں ہونا محال ہیں :۔

اے ہمت غم لاکھ صعوبت کٹے راہ — چہرے سے مگر ہو نہ عیاں گرد سفر کی
اک چیز ہے سنتے ہیں اے کاش کبھی تم — بجلیس کی صدا درد بھری پچھلے پہر کی

طرح اس قابل نہ تھی لیکن آپ کی فکر رسا نے موتی چن لیے۔ ۱۰؍ اکتوبر کے مشاعرہ میں بہت ہی پامال طرح ہے۔ ہر طبقہ کے شاعر اس میں طبع آزمائی کر چکے ہیں اس لیے میری طبیعت رجوع نہیں ہوتی۔ البتہ مشاعرہ میں آؤں گا اور آپ حضرات کو سنوں گا۔ ممکن ہوا تو دو چار شعر کہتا لاؤں گا۔ لیکن چونکہ یہاں امیر و داغ کے دواوین نہیں ہیں اس لیے توارد کا امکان ہے۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ طبیعت نہیں اچھی ہے۔ اس مختصر فقرہ کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ آپ نے مفصل نہ لکھا کہ معمولی اضمحلال ہے یا خاص شکایت۔ مجھے اس کے معلوم کرنے کا انتظار ہے۔ منشی دیا نرائن نگم اڈیٹر زمانہ آپ کے خاص طور پر مشکور ہیں۔

خادم

نوبت رائے نظر

(۲)

دفتر اودھ اخبار لکھنؤ

بتاریخ ۴؍ فروری ۱۹۱۹ء

مخدومی و معظمی۔ تسلیم۔ آپ کے نوازش نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ دہلی سے واپس آ گئے۔ سال نو آپ کو بھی مبارک و مسعود ہو۔ مرزا رجب علی بیگ کے مضمون کو میں نے اس لیے مکمل کرنے کی کوشش نہیں کی کہ ابھی مسٹر حامد علی خاں مرحوم کا مضمون آپ کے پاس موجود ہے۔ جیسے ہی وہ شائع ہو جائے گا میں سرور کا مضمون بھیج دوں گا۔ خاطر شریف مطمئن رہے۔ ادھر سال تمام کے حسابات متعلق اودھ اخبار تیار ہو رہے ہیں اور بعض جدید انتظامات درپیش ہیں۔ اس لیے فرصت بھی عنقا ہے۔ غالباً اس ماہ کے وسط میں آپ سے مل سکوں گا اور سرور کا مضمون بھی دے دوں گا۔ بہت عرصہ سے نیاز نہیں حاصل ہوا ہے اس لیے قلق خاطر ہے۔ پولیٹیکل دنیا میں اس وقت عجیب ہیجان ہے۔ ایشور ہمارے ملک اور قوم کو نیک ہدایت کرے۔ خیریت مزاج سے مطلع فرماتے رہیں۔

آپ کا نیازمند

نوبت رائے نظر

سپرنٹنڈنٹ اودھ اخبار۔ لکھنؤ

غزل

افقر موہانی

مرتبے انسانیت کے جن پہ نازاں ہو گئے
عالمِ ہستی میں کچھ ایسے بھی انساں ہو گئے

اُن پہ اسرارِ حقیقت جب نمایاں ہو گئے
دیکھنے والے ترے جلووں میں پنہاں ہو گئے

دیکھتا کیا اُس کو کوئی، کب یہ تھی تابِ نظر
حُسن کے جلوے حجابِ روئے جاناں ہو گئے

سرخیِ خونِ وفا کے ہیں مناظر سیکڑوں
کچھ شفق میں، کچھ بہاروں میں نمایاں ہو گئے

یہ ہوائے دہر کے جھونکوں سے بجھ سکتے نہیں
داغ ہائے دل چراغِ زیرِ داماں ہو گئے

مقتلِ اہلِ وفا کی اُف وہ خوں افشانیاں
کیا خبر کتنے شہیدِ نازِ جاناں ہو گئے

کثرتِ انوار نے خود لے لیا آغوش میں
اپنے ہی جلووں میں بالآخر وہ پنہاں ہو گئے

اس سے تو اچھا تھا بخیہ گر نہ کرتا تو رفو
اک گریباں کے ہزاروں اب گریباں ہو گئے

آستانِ یار، افقر آستانِ یار ہے
ہم یہاں آ کر مقیمِ باغِ رضواں ہو گئے

غزل

وفا ملک پوری

اُسے زخمِ دل کی ہے آرزو، اُسے چارہ گر کی تلاش ہے
جو جگر کے پار نہ ہو سکے، مجھے اُس نظر کی تلاش ہے

میں حریصِ ناوکِ نیم کش، مجھے اک جگر کی تلاش ہے
وہ مری پسند کا مرحلہ، یہ تری نظر کی تلاش ہے

میں حرم میں جا کے کروں گا کیا کہ مری جبینِ نیاز کو
ترے نقشِ پا کی تلاش ہے، تری رہ گزر کی تلاش ہے

میں دیارِ حُسن میں جاؤں گا، مگر اک نظر نہ گنواؤں گا
میں فریبِ جلوہ نہ کھاؤں گا، مجھے جلوہ گر کی تلاش ہے

مرے دل کو کعبہ بنا دیا، مگر اک گھڑی نہ ٹھہر سکے
جسے اپنے گھر کی خبر نہیں، اُسی بے خبر کی تلاش ہے

میں چمن کا خیرِ طلب تو ہوں مگر اُن سے مجھ کو غرض نہیں
کہ جنھیں بہار کی بخششوں سے فقط ثمر کی تلاش ہے

یہ چراغِ بزمِ خمار ہیں، یہ جبینِ شب کا سنگھار ہیں
مجھے کیوں ستاروں کی چاہ ہو کہ مجھے سحر کی تلاش ہے

وہی جس کے فیضِ نظر سے ہے تری چشم و لب میں یہ فتنگی
مرے شوقِ فتنہ پرست کو اُسی فتنہ گر کی تلاش ہے

مرے من کی جوت جگا جو دے، مرے دل کو شمع بنا جو دے
مجھے اس جہاں میں وفا اُسی غمِ معتبر کی تلاش ہے

لیسا

بی۔ ال۔ چکر

اُتر پردیش میں ٹنک پور سے رشی کیش جاتے ہوئے پہاڑوں کی سایہ دار ڈھلوانوں پر چیڑ کے اونچے اونچے اور خوش نما درخت ایک خوش نما منظر ہی نہیں پیش کرتے بلکہ اُن سے ایک بڑی کار آمد شے حاصل کی جاتی ہے جسے "لیسا" کہتے ہیں۔ بریلی کا مشہور سرکاری کارخانہ (ٹرپنٹائن اینڈ روزن کمپنی) یہ لیسا خرید لیتا ہے اور اُس سے تارپین تیار کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل مضمون میں لیسا کی صنعتی افادیت اور اس کارخانے کی کارکردگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سڑک کے راستہ سے ٹنک پور سے رشی کیش جانے کے لئے تقریباً ۱۸۵ میل کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ یہ سفر ایک فرحت بخش تجربہ ہوتا ہے جس کی یاد ہمیشہ دل میں تازہ رہتی ہے۔ حد نظر تک گھنے جنگل، سال کے درختوں کے نیچے روشنی اور سایہ کی آنکھ مچولی، کتھے کے درخت جو دامن صحرا پر حسین نقش و نگار معلوم ہوتے ہیں اور سایہ دار کاجو کے درخت جن سے ہلالی وڈھا حاصل ہوتی ہے، فطرت کے ازلی حسن اور رنگینی کے مظہر ہوتے ہیں۔ یہ مناظر دل کو نئی تر و تازگی بخشتے ہیں اور گھنے جنگلوں کے پردے میں چھپے ہوئے اسرار کو بے نقاب کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس راستہ میں ٹنک پور۔ کاٹھ گودام رام نگر۔ کوٹ دوارا اور رشی کیش کے مقامات پر لیسا کی سپلائی کے ڈپو قائم ہیں جہاں محکمہ جنگلات کمایوں، الموڑا اور گڑھوال کی پہاڑیوں سے لایا ہوا لیسا جمع کرتا ہے۔ اور یہ لیسا چیڑ کے درختوں سے نکالا جاتا ہے۔



چیڑ کا جنگل

چیڑ ایک ہندوستانی درخت ہے جو تین ہزار سے چھ ہزار فیٹ تک کی بلندی پر اُگتا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں چیڑ محض اونچی پہاڑیوں ہی پر نہیں بلکہ نیچی پہاڑیوں، میدانوں اور سمندر کے ساحلوں پر بھی اُگتے ہیں لیکن یہ ہمارے یہاں کے چیڑ سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس وقت لیسا زیادہ تر امریکہ، فرانس، پرتگال، اسپین اور یونان میں پیدا ہوتا ہے۔

اتر پردیش میں چیڑ کے درخت اونچی پہاڑیوں پر اُگتے ہیں جہاں درجہ حرارت بہت کم ہوتا ہے اور ہوا میں کافی خنکی رہتی ہے۔ گہرے نیلے آسمان کے پس منظر میں پہاڑیوں کی سایہ دار ڈھلوانوں پر چیڑ کے سربلند درخت انتہائی دلفریب منظر پیش کرتے ہیں لیکن اس مضمون میں چیڑ کے درختوں کے حسین منظر کی عکاسی مقصود نہیں بلکہ ہم لیسا کی تجارتی اور صنعتی افادیت پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں جو ان درختوں سے نکالا جاتا ہے۔

درختوں سے نکالنے کے بعد لیسا مختلف ڈپو میں جمع کیا جاتا ہے، اور پھر اسے بریلی بھیج دیا جاتا ہے جہاں انڈین ٹرپنٹائن روزن کمپنی واقع


کارخانے کا ایک منظر


کارخانے کی عمارت

یہ فیکٹری تقریباً ۳ لاکھ من لیسا خریدتی ہے اور بقیہ لیسا امداد باہمی انجمنوں کو سپلائی کیا جاتا ہے نیز کھلے بازاروں میں فروخت ہوتا ہے۔ لیکن لیسا کی پیداوار کا بڑا حصہ یہ فیکٹری خرید لیتی ہے۔ لیسا کا موجودہ نرخ تقریباً ۴۲ روپیہ من ہے۔ اس طرح فیکٹری ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ کی مالیت کا لیسا خریدتی ہے۔

کیمیاوی عمل کے بعد لیسا ایک سیال شے میں تبدیل ہو جاتا ہے جسے تارپین کہتے ہیں۔ تارپین زیادہ تر کاغذ، پینٹ اور وارنش بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔

تارپین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں جن میں زرد شفاف تارپین اعلیٰ کوالٹی کی سمجھی جاتی ہے۔ تارپین کی زیادہ تر کھپت کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے بازاروں میں ہوتی ہے۔ نیز جنوبی ہندوستان میں بنگلور، حیدرآباد اور ارناکولم تک بھیجی جاتی ہے۔ تارپین مختلف اشیا بنانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ اب اسے کافور بنانے میں بھی استعمال کیا جائے گا۔ حال ہی میں ٹرپنٹائین فیکٹری کے قریب ایک کافور کا کارخانہ کھولا گیا ہے۔ ٹرپنٹائین فیکٹری سے پائپ لائنوں کے ذریعہ اس کارخانہ کو براہ راست تارپین سپلائی کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے پائپ لائنیں بچھائی جا چکی ہیں۔ ایک ممتاز امریکی کیمسٹ کی زیر نگرانی ایک ریسرچ یونٹ بھی قائم کی گئی ہے اور کافور بنانے کے بعد باقی بچے ہوئے اجزا کو کام میں لانے کے بارے میں تجربات کئے جا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں نئے اقسام کا لیسا تیار کرنے کے تجربات بھی کئے جا رہے ہیں جن سے ایک طرف تو لیسا کی کھپت میں کمی ہوگی اور دوسری طرف اشیا کی کوالٹی بھی بہتر ہو جائے گی۔ مزید براں ربر امیلسی فائر تیار کرنا بھی سودمند ثابت ہوگا۔ اس وقت یہ ربر کچھ ضروری اشیا بنانے میں استعمال ہوتا ہے اور باہر سے منگایا جاتا ہے۔ اگر کلٹربک گنج میں اسے تیار کیا جا سکے تو اس سے غیر ملکی مبادلہ زر کی بچت ہوگی۔

جنگلات کی پیداوار پر مبنی یہ صنعت اترپردیش کی پرانی صنعتوں میں سے ہے۔ ملک بھر میں جتنا لیسا پیدا ہوتا ہے اس کا ۵۵ فیصدی اترپردیش میں نکالا جاتا ہے۔ اترپردیش کے علاوہ یہ محض تین دوسرے مقامات یعنی کشمیر، ہماچل پردیش اور ہوشیار پور (پنجاب) میں نکالا جاتا ہے۔ لیکن ان سب میں کلٹربک گنج کا کارخانہ بہت بڑا ہے جہاں ۷۰۰ سے زیادہ افراد کام میں لگے ہوئے ہیں۔

یہ کارخانہ دوسرے کارخانوں سے مختلف ہے۔ یہ ایک سرکاری کارخانہ ہے لیکن اس کا انتظامی ڈھانچہ پبلک سیکٹر کے دوسرے کارخانوں سے جداگانہ ہے۔ اس کے انتظام کے لئے سات ڈائرکٹروں کا ایک بورڈ ہے جن میں پانچ سرکاری اور دو غیرسرکاری ہیں۔ کمپنی کو وہ مراعات حاصل نہیں جو دوسرے کارخانوں کو حاصل ہیں۔ اسے کسی دوسری جوائنٹ اسٹاک کمپنی کی طرح انکم ٹیکس و سیلس ٹیکس وغیرہ ادا کرنا ہوتا ہے۔ مزید برآں کسی دوسری تنظیم یا ادارے کی طرح جس میں حکومت کا روپیہ

رکھا ہو اس کے حسابات کی بھی سرکاری جانچ ہوتی ہے۔

حکومت نے اس کارخانہ کے ۱۵ ر ۷ لاکھ روپیہ کی مالیت کے حصے خریدے ہیں۔ یہ کارخانہ سنہ ۱۹۱۹ء میں قائم ہوا تھا لیکن حکومت نے اس کا انتظام رسمی طور پر اپنے ہاتھ میں اکتوبر سنہ ۱۹۵۰ء میں لیا۔ اس وقت سے کارخانہ کے منافع میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔ اس کارخانہ کو سنہ ۱۹۴۷ء میں ۹۸ ر ۱ لاکھ روپیہ اور مارچ سنہ ۱۹۶۲ء کو ختم ہونے والے سال میں انکم ٹیکس ادا کرنے کے بعد ۸۱ ر ۱۶ لاکھ روپیہ کا خالص منافع ہوا۔ گزشتہ دو تین برسوں سے کارخانہ کے مزدوروں کو ۱۵ فیصدی منافع کے علاوہ چار مہینوں کی تنخواہ بطور بونس تقسیم کی جاتی ہے۔ یہ صورت حال حد درجہ اطمینان بخش ہے۔ یہی نہیں اس کارخانہ کے پاس کافی محفوظ سرمایہ بھی ہے۔

کمپنی کے محفوظ سرمایہ سے ایک دوسرا پلانٹ بھی لگایا گیا ہے۔ اس کے لئے حکومت سے کوئی مالی امداد یا قرض نہیں لیا گیا۔ دوسرا پلانٹ لگانے کا سوال کچھ عرصہ پہلے اٹھایا گیا تھا اور اب یہ پلانٹ لگ گیا ہے اور چالو بھی ہو گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے لئے بوائلر وغیرہ ہندوستانی کارخانہ داروں سے خریدے گئے ہیں لیکن کشید کرنے کا پلانٹ وغیرہ کمپنی کے انجینیروں نے خود تیار کیا ہے۔ اس قسم کے انتظام میں ہمیں غیر ملکی درآمد کا محتاج نہیں رہنا پڑتا۔ جب ہمارے انجینیر کوئی پلانٹ خود تیار کر سکتے ہیں تو وہ ضرورت پڑنے پر اس کے پرزے بھی بنا سکتے ہیں۔

نئے پلانٹ کے لئے مزید خام مال کی سپلائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ محکمہ جنگلات جو لیسا تیار کرتا ہے وہ اس کمپنی کی ضروریات کے لئے کافی نہیں ہوتا اس لئے خام مال کی سپلائی بڑھانے کے لئے محکمہ جنگلات نے موجودہ منصوبہ کی مدت میں اقدامات کئے ہیں اور جنگلوں

کارخانے میں کچا مال پیپوں میں رکھا ہے



تارپین جیوب میں بھرا جا رہا ہے

سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں لیسا نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ محکمہ جنگلات جتنی بھی مقدار میں لیسا اور سپلائی کرے گا اس کی کھپت کمپنی میں بہ آسانی ہو سکے گی۔ اس سے محکمہ کو معقول آمدنی ہو گی۔ لیسا کی قیمت میں بہت زیادہ اضافہ کیا گیا ہے۔ محکمہ جنگلات کے ساتھ ۲۰ سال کے معاہدہ کے ختم ہونے پر اس کی قیمت دگنی سے زیادہ ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں کمپنی سے ضلع پریشدوں کو فی من ۵۰ نئے پیسے ادا کرنے



کچا مال متھنے کے لیے بھٹی میں ڈالا جا رہا ہے

کے لئے بھی کہا گیا ہے۔ اس طرح موجودہ سپلائی کی بنیاد پر ضلع پریشدوں کو تقریباً ۱۵۰۰۰ روپیہ کی مالیت کی باقاعدہ سالانہ آمدنی ہو گی۔ کمپنی، بڑھی ہوئی قیمتوں اور دوسری مشکلات کے باوجود برابر آگے بڑھ رہی ہے اور اپنی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کے پیش نظر وہ پورے اعتماد کے ساتھ درخشاں تر مستقبل کی راہ پر گامزن ہے۔



پنج سالہ منصوبوں پر سوال و جواب

نیا دور کے جو ناظرین پنج سالہ منصوبوں کے سلسلے میں اپنی معلومات کے لیے کوئی سوال کرنا چاہیں وہ مختصر لفظوں میں اور واضح طریقے سے اپنے سوال ہمیں لکھ کر بھیج دیں۔ ان سوالوں کے جوابات نیا دور میں شایع ہوا کریں گے۔

——— ایڈیٹر

ایک دوشیزہ کرن

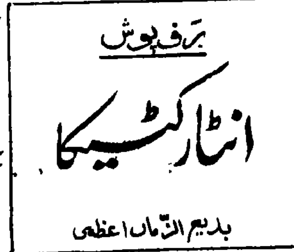
دانش نیازی

ایک ایسا بھی تو عالم کبھی گزرا ہوگا
وقت کے پاؤں کی زنجیر ٹوٹی ہوگی
صبح یوں شام کی آہٹ سے نہ روٹھی ہوگی
سازِ خود مطرب و مضراب کو ترسا ہوگا
آسماں مہرِ جہاں تاب کو ترسا ہوگا
اور اک گہری خموشی کی ردا میں سمٹی
بے کراں گھور اندھیرے کے گراں بوجھ تلے
کتنی بے چین رہی ہوگی یہ جلووں کی زمیں
نکہت و نور کے آغوش، یہ نغموں کی زمیں
دشت بھی ہوں گے، سمندر بھی، یہ پربت بھی مگر
خوف سے سانس بھی لیتے ہوئے ڈرتے ہوں گے
نہ لپکتے، نہ گرجتے، نہ ابھرتے ہوں گے
جانے پھر کون سے آفاق میں جاگی ہوگی
ایک دوشیزہ کرن، ایک روپہلی سی پھوار
جس کی اک جلوہ گری کے یہ کرشمے ہیں تمام
بن گیا تارِ رگِ سنگ چٹکتی کونپل
چھا گئے عرصۂ ہستی پہ سنہرے بادل
کھل گئے جھیل کی آغوش میں گلنار کنول
بج اٹھے حلقۂ آفاق میں وہ سازِ نفس

کھل گیا سینۂ احساس میں سنگیت کا رس
کس کو معلوم یہ کب سے ہے یونہی محوِ خرام
اس کے قدموں کی ہر اک چاپ جہانِ آہنگ
اس کا آہنگ گراں تابہ گراں ہے اب تک

اس نے دیکھا ہے ابوالہول کے خوابوں کا مآل
اس نے دیکھی ہے سلگتے ہوئے صحراؤں کی لو
سرد شعلوں سے جھلستے ہوئے پھولوں کے دیار
کہیں محتاجِ رفو گوشۂ دامانِ بہار
کہیں شبنم کی تلاش سے لرزتے کہسار
اس نے دیکھا کہیں نمرود کو پابندِ خلیل
جب بھی ٹپکا ہے رگِ زیست سے کچھ تازہ لہو
پردۂ شب میں سنی اس نے نوائے جبریل
اس کو پرہول اندھیروں نے نگلنا چاہا
چند تاریک جزیروں نے نگلنا چاہا
دام پھیلائے عزازیلِ ہوس نے کتنے
ایک دوشیزہ کرن، ایک روپہلی سی پھوار
آج تک صیدِ شبستانِ ہزیمت نہ ہوئی
اور دنیا کبھی محرومِ صداقت نہ ہوئی

انسانی مہم جوئی کی تاریخ ایسے باہمت اور جاں باز انسانوں کی اولوالعزمیوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہے جنھوں نے بڑے سخت مصائب جھیل کر اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر خشکی اور تری دونوں اعتبار سے دنیا کے نامعلوم علاقوں کو دریافت کیا ہے اور بنی نوع انسان کے لیے ان خطّوں کو جو ہزاروں برس سے راز سربستہ چلے آ رہے تھے آشکارا کر دیا ہے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بعض خطّے ابھی تک ایسے ہیں جن کے متعلق ہمیں پوری واقفیت نہیں ہے۔ انھیں خطّوں میں انٹارکٹیکا کا یخ بستہ براعظم ہے جو قطب جنوبی میں واقع ہے اور جس کے بیشتر حصوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگرچہ کئی بہادر سیاح مثلاً امنڈسین، اسکاٹ، ولکنس اور امیر البحر رچرڈ ای برڈ، قطب جنوبی تک پہنچ چکے ہیں اور متعدد ملک مثلاً امریکہ، روس، برطانیہ، چلی، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جرمنی، فرانس، ناروے اس براعظم کے کچھ ساحلی علاقوں کو اپنی ملکیت بھی قرار دیتے ہیں، لیکن یہ براعظم اب بھی ہمارے لیے ایک راز سا بنا ہوا ہے اور اس کے بیشتر حصوں تک کوئی سیاح نہیں پہنچ پایا ہے۔ اس پُراسرار براعظم کے بارے میں ابھی تک جو معلوم ہو سکا ہے اس مضمون میں اسے مختصر طور سے بیان کیا جارہا ہے۔



یہ تو جغرافیہ کا ہر معمولی طالب علم جانتا ہوگا کہ دنیا میں دو قطب ہیں۔ ایک قطب شمالی کہلاتا ہے اور دوسرا قطب جنوبی۔ اگر مریخ سیارہ سے ایک دوربین کے ذریعہ کرۂ ارض کا جائزہ لیا جائے تو دونوں قطبی خطّوں میں کوئی خاص فرق نظر نہ آئے گا۔ یہ دونوں خطّے گول دھبے نظر آئیں گے۔ اگر کوئی فرق محسوس ہوگا تو صرف اتنا کہ جنوبی سرے کا گول دائرہ کسی قدر بڑا معلوم ہوگا۔ شمالی دائرہ جسے ہم آرکٹک کہتے ہیں ایک یخ بستہ گہرا سمندر ہے جو چاروں طرف خشکی سے گھرا ہوا ہے اور جنوبی دائرہ یخ بستہ انٹارکٹیکا ہے جو چاروں طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ ایک بہت وسیع خطۂ ارض ہے جس کا رقبہ پچاس لاکھ مربع میل ہے یا یوں سمجھیے کہ انٹارکٹیکا ہندوستان سے تقریباً تین گنا بڑا ہے۔

برف پوش سرزمین

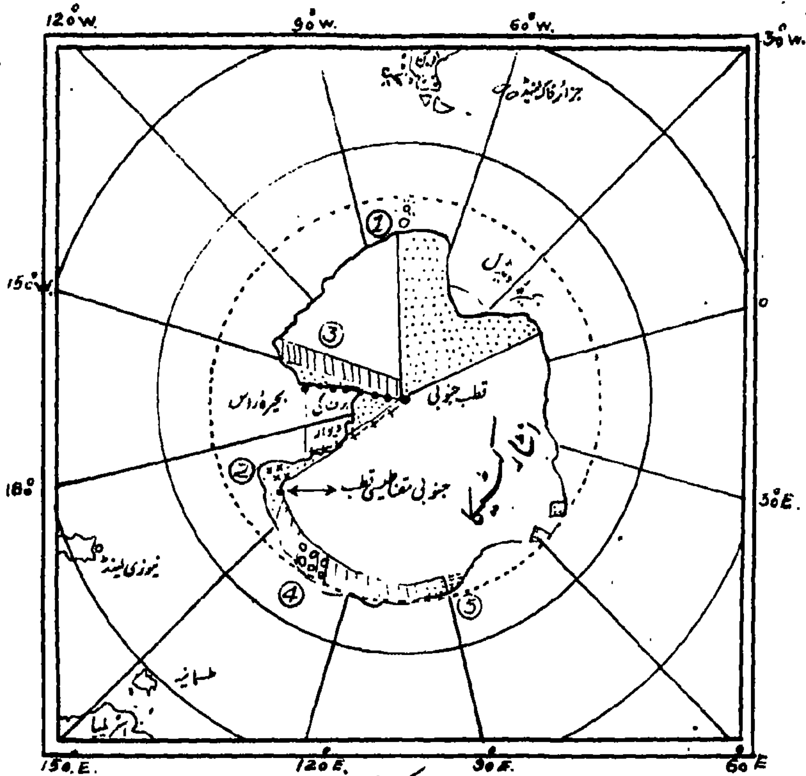
یہ پورا براعظم جو ایک سنسان سطح مرتفع ہے نامعلوم گہرائی تک یخ بستہ ہے۔ برف کے وہ تودے جو ہزاروں سال سے جمع ہوتے رہے ہیں اپنے بوجھ کے سبب گلیشیرز کی شکل میں پھسل پھسل کر سمندر میں آتے رہتے ہیں۔ سمندر میں جمع کردہ برف کی دیوار کی طرح دکھائی پڑتے ہیں جن کی بلندی ۲۰ فٹ سے ۱۸۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں جب کوئی برف کی دیوار ٹوٹتی ہے تو بڑے بڑے آئس برگس کو جنم دیتی ہے جو سمندر میں تیرتے ہوئے چلتے ہیں۔

ان کی جسامت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان ٹکڑوں کی لمبائی تیس تیس میل تک کی دیکھی گئی ہے۔ گلیشیرز اور آئس برگ کی موجودگی اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب شمالی کرہ کے شمالی حصے یخ بستہ تھے، جسے ہم یخ کا زمانہ کہتے ہیں اور جس کو ختم ہوئے ۲۵ ہزار برس سے زائد کی مدت گزر چکی ہے۔

اگر آپ دستی صفحہ پر دیئے ہوئے نقشے کا گہرا مطالعہ کریں تو یہ دیکھیں گے کہ براعظم انٹارکٹیکا تو بہ ذات خود دائرہ منجمد جنوبی کے اندر ہی ہے مگر جاڑے کے ایام میں یعنی اپریل سے اگست تک گلیشیرز اور برف کی دیواریں اس کے رقبے کو کافی بڑھا دیتی ہیں اور اس وقت یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ ساحل کہاں ہے اور سمندر کہاں۔

انٹارکٹیکا کی دریافت

مشہور انگریز کپتان کک وہ پہلا شخص تھا جو اپنا جہاز لے کر دائرہ جنوبی کے قریب سے گذرا۔ یوں تو اس نے جنوبی سمندروں کو اپنی سمندری سیاحت میں کئی بار عبور کیا مگر خشکی کا کوئی نشان نہ پاکر اس نے ۱۷۷۵ء میں اس وسیع کے اس فرضی براعظم کے وجود ہی کو غلط بتایا جس پر سولھویں صدی کے



براعظم انٹارکٹیکا

① Alexander I Land
② South Victoria Land
③ Byrd Land
④ Adelie Land
⑤ Kaiser Wilhelm Land

اسکاٹ کا راستہ +-+-+
امنڈسین کا راستہ ▬ ▬ ▬

دریافت اور دعویٰ:—
برطانیہ
ریاست ہائے متحدہ امریکہ
فرانس
ناروے
روس
جرمنی

جغرافیہ دانوں کا ایمان تھا۔ کُک کا یہ نظریہ دیر پا ثابت نہ ہو سکا۔ روس کے شہنشاہ نے ۱۸۱۹ء میں فیبین فان بیلنگ شاسن (FABION VON BELLING SHAUSEN) کو انٹارکٹکا کی مہم پر روانہ کیا اس نے پورے براعظم کا طواف کرکے ایک خطے کو اپنے شہنشاہ کے نام سے منسوب کیا اور اس کا نام (ALEXANDER I LAND) رکھا۔ اس کے بعد سیل اور وھیل کے شکاری شکار کی تلاش میں اِدھر آئے اور انھوں نے انٹارکٹک سمندروں کے نقشے تیار کیے۔ ان میں سب سے زیادہ کامیاب انگریز کپتان جیمس ویڈل جان بسکو اور جان بالینی ہیں۔ ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۳ء کے درمیان مختلف ممالک کے کپتان انٹارکٹکا کی مہم پر روانہ ہوئے۔ ان میں سے انگریز کپتان جیمس کلارک راس (JAMES CLARK ROSS) کا نام خاص طور سے قابل ذکر

ہے یعنی کہ اس نے بحیرۂ راس (ROSS SEA) ساؤتھ وکٹوریہ لینڈ (SOUTH VICTORIA LAND) گریٹ راس بیریر (GREAT ROSS BARRIER) اور نہیں بڑے پہاڑوں کے وجود کی چشم دید شہادت دی۔ پہلا سیاح جس نے پہلی بار سرزمین انٹارکٹیکا پر قدم رکھا، ناروے کا بورشگریونک (BORCHGREVINK) تھا جس نے ۱۸۹۹ء کے موسم سرما میں راس اڈارے (CAPE ADARE) سے گذرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۰۲ء میں ایک جرمن پارٹی نے کپتان ڈری گالسکی (DRYGALSKI) کی سرکردگی میں قیصر ولہم دوم لینڈ (KAISER WILHELM II LAND) دریافت کیا۔

قطب جنوبی کی دریافت

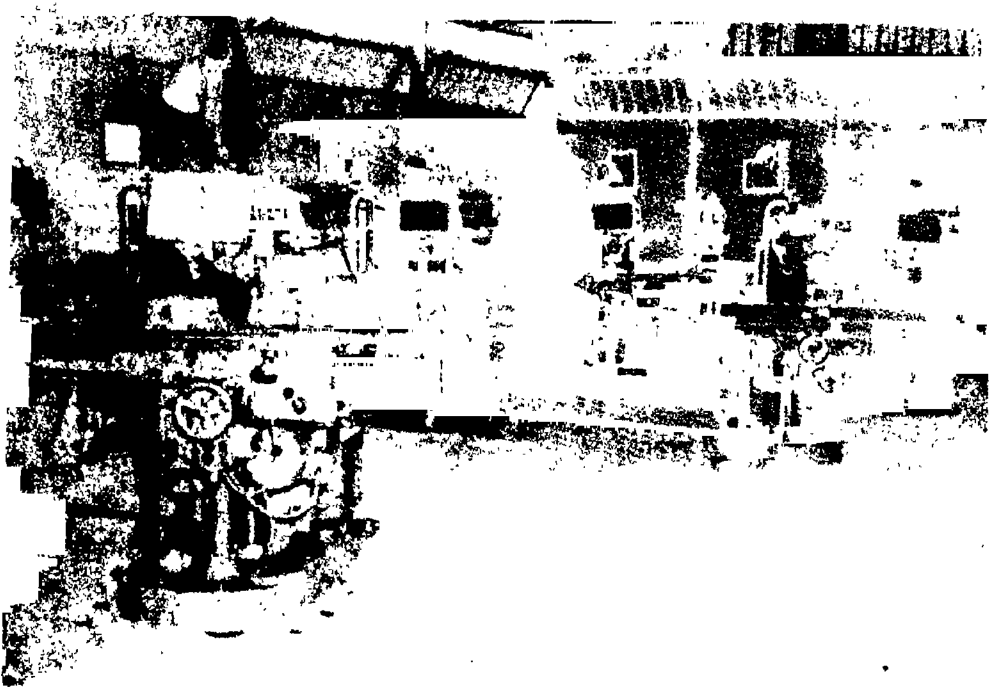
کپتان رابرٹ۔ ایف اسکاٹ (CAPTAIN ROBERT F. SCOTT) پہلا انگریز سیاح تھا جس نے ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک بحیرۂ راس کے راستے قطب جنوبی تک پہنچنے کی پہلی ناکام کوشش کی پھر بھی دو سال کی سیاحت کے بعد وہ مفید معلومات لے کر واپس ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں دوسرا برطانوی بیڑا جس کا سردار مشہور لفٹننٹ شیکلٹن (SIR ERNEST SHACKLETON) تھا قطب جنوبی کی جستجو میں اس براعظم پر لنگر انداز ہوا۔ اس بہادر سیاح نے اس مہم کو سر کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی مگر اس مہم میں اسے اور اس کے ساتھیوں کو اس قدر مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ آگے بڑھنے کے لیے معطل تھا : تھے۔ چناں چہ کپتان مذکور کو اپنے ساتھیوں کے اصرار پر جنوری ۱۹۰۹ء میں مجبوراً اس مقام سے واپس ہونا پڑا جہاں سے قطب جنوبی صرف [illegible] رہ گیا تھا۔ دوسرا نام [illegible] اس سلسلے میں آتا ہے وہ سر ڈگلس ماسن [illegible] (DOUGLAS MAWSON) کا ہے جو قطب جنوبی پر تو نہیں مگر مقناطیسی قطب (SOUTH MAGNETIC POLE) پر ضرور پہنچ گیا اور جس نے آسٹریلی مہم کے سلسلے میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۴ء تک اڈیلی لینڈ (ADELIE LAND) میں قابل قدر کام انجام دیے۔

اسی دوران ناروے کا ایک کپتان روآلڈ امنڈسن (ROALD AMUNDSEN) قطب شمالی کی مہم پر روانہ ہونے والا تھا کہ اسے خبر ملی کہ شمالی قطب کی دریافت کا سہرا امریکہ کے سیاح رابرٹ پیری کے سر رہا۔ اس خبر کے ملتے ہی اس نے اپنے جہاز کے بادبانوں کا رُخ بدل دیا اور قطب جنوبی کو دریافت کرنے کے خیال سے تیزی سے جنوب کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس کے قبل برطانوی بحری بیڑے کے کپتان اسکاٹ کی قطب جنوبی کی دوسری مہم کی شاندار تیاری اور روانگی کی خبر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ امنڈسین کا مقابلہ کے لیے میدان میں کود پڑنا دنیا والوں کے لیے بڑی دل چسپی کا باعث ہوا۔ اخباروں کے صفحات اپنے اپنے ہیرو کی تعریف سے پُر نظر آنے لگے۔

کپتان امنڈسین فرام نامی جہاز پر جنوبی امریکہ کے مشرقی ساحل کی جانب سے براعظم انٹارکٹیکا پر ۱۴ر جنوری ۱۹۱۱ء کو بحیرۂ راس کی برفیلی دیوار پر لنگر انداز ہوا۔ ٹھیک اسی وقت کپتان اسکاٹ کی جماعت جزیرۂ راس کی کیپ ایونس (CAPE EVANS) پر خیمہ زن تھی۔ تقریباً آٹھ ماہ تک یعنی موسم سرما کے ختم ہونے تک دونوں نامور سیاح قطبی سفر کی تیاریوں میں مشغول رہے مگر ان میں سے کسی کو ایک دوسرے کی خبر نہ تھی۔ موسم بہار کے شروع ہوتے ہی امنڈسین ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو اپنے چار ساتھیوں باون کتوں اور چند برف پر پھسلنے والی گاڑیوں کو ساتھ لے کر ہمیشہ یاد رہنے والی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اس کی جماعت نے بلند پہاڑی سلسلوں کے یخ بستہ دشوار گذار راستوں کی تکالیف کا خندہ پیشانی سے سامنا کیا۔ اس مہم میں اس کے متعدد کتے کام آئے۔ بالآخر وہ مبارک ساعت آ ہی گئی جس کا دنیا والے بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے تھے یعنی ۱۴ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو امنڈسین قطب جنوبی پر پہنچ گیا۔ وہاں اس نے ایک خیمہ نصب کیا اور اپنے ملک کے جھنڈے کے ساتھ ساتھ اپنا جہازی پھریرا بھی لہرا دیا۔ قطب کے گرد و نواح کے پلیٹو کو اس نے اپنے بادشاہ کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام [illegible] (KING HAAKON VII LAND) رکھا۔ [illegible] اس کے خیمے کے اندر [illegible] بطور یادگار [illegible] ساڑھے تین مہینے میں واپس گیا۔

کیپٹن اسکاٹ کی پارٹی

اس کے برخلاف کپتان اسکاٹ کی پارٹی اپنے رسدی مرکز سے ۲ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو قطب کی جانب روانہ ہوئی۔ اس کے چار ساتھی ڈاکٹر ولسن (DR. WILSON) لفٹننٹ بوورس (BOWERS) کپتان اوٹس (OATES) اور کپتان ایونس (EVANS) اس کے ہمراہ تھے۔ یہ جماعت بھی دشوار گذار راستوں کو پار کرتی ہوئی ۱۸ر جنوری ۱۹۱۲ء کو قطب جنوبی پہنچی۔ ان کی ساری خوشی غم و یاس میں بدل گئی جب انھوں نے وہاں اپنے حریف امنڈسین کی فتح کا پرچم



کارخانے بھی جنگی مورچے ہوتے ہیں۔ اُتر پردیش میں صنعتوں کو اِسی روشنی میں ترقی دی جا رہی ہے

(اوپر) ہردوار کے ہیوی الیکٹریکل کمپنی کا اندرونی منظر (نیچے) نیاری (ضلع پتھوراگڑھ) میں بہاطی ادن اسکیم کے ماتحت چلنے والے تربیتی و پیداواری مرکز کا ایک منظر





ایشیا کا سب سے بڑا ذخیرۂ آب



خالص پور ضلع اعظم گڑھ میں ایک پمپنگ سٹ

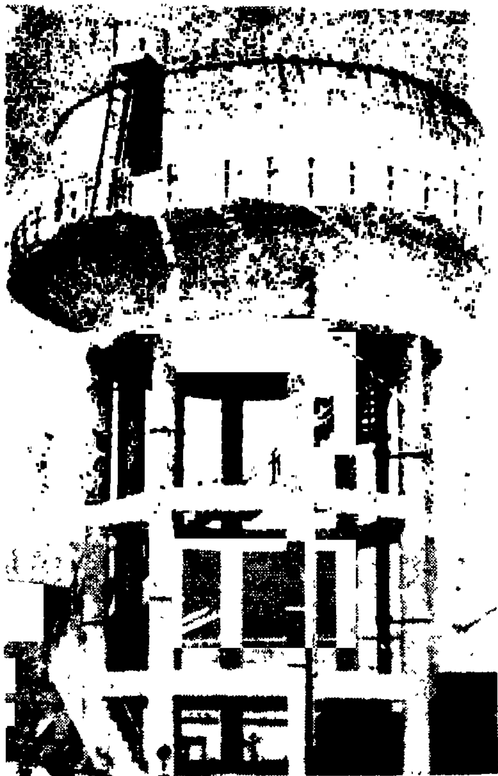
اتر پردیش

منیاری (پھوڑا گڑھ) ڈیولپمنٹ

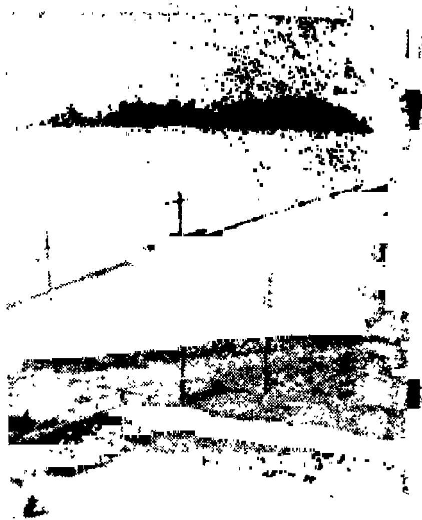


لکھنؤ میں سول ڈیفنس ٹریننگ





ضلع آگرہ کے ایک گاؤں میں واٹر ورکس



—— ریہاند بجلی منصوبہ

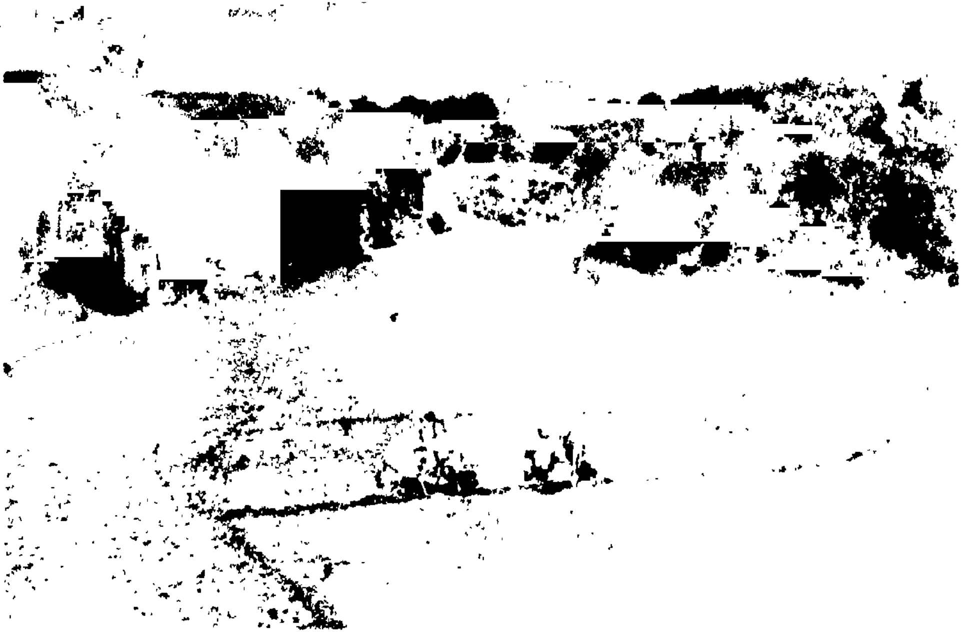
راہِ ترقی پر

گاؤں والوں کا تعمیر کیا ہوا زینہ



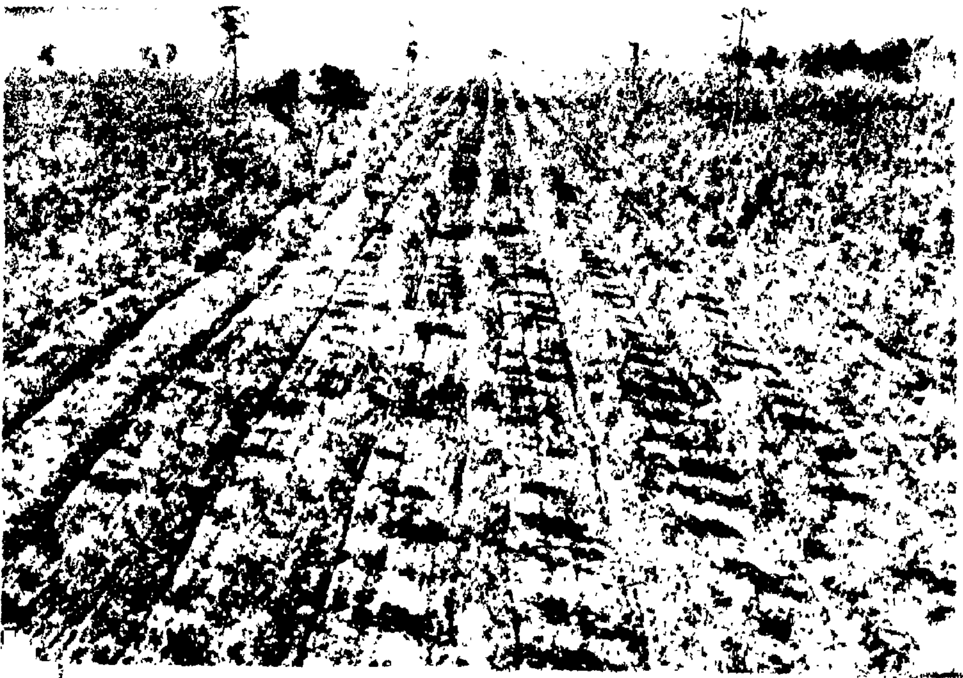
وارانسی میں این، سی، سی افسروں کی ٹریننگ





کھیت بھی محاذِ جنگ ہوتے ہیں اور اُتر پردیش میں اس مورچے کو ہر طرح سے مضبوط بنایا جا رہا ہے

(اوپر) مانک پور بلاک (ضلع باندہ) میں بن کی بازیابی   (نیچے) ہلدوانی۔ فارسٹ ڈویژن کے لالا چوڑ میں ۱۲۵۲ ایکڑ میں یوکلپٹس کے درخت لگائے گئے ہیں۔



لہراتا ہوا دیکھا اور خیمے کے اندر اسکاٹ کے نام امنڈسین کا ایک خط بھی پایا۔ انھوں نے کچھ دیر تک قطبی مرکز کے گرد و نواح کا جائزہ لیا پھر ایک مناسب جگہ پر خیمہ نصب کرکے یونین جیک (برطانوی پرچم) لہرا دیا۔

کپتان اسکاٹ اور اس کی پارٹی کا نوسویل کا واپسی کا سفر بہت ہی دردناک ہے۔ دشوار گذار راستوں اور ناخوش گوار موسمی حالات کی وجہ سے اس جماعت کا ایک فرد بھی واپس نہ آسکا۔ کپتان ایونس ایک برفیلی دیوار سے پھسل کر گر پڑا اور ہلاک ہو گیا۔ کپتان اوٹس کے پیروں کی انگلیاں سردی سے کٹ کر گر گئیں اور جب اس کی جسمانی قوت نے آگے بڑھنے سے جواب دے دیا تو اس نے اپنے آپ کو ۱۶ مارچ ۱۹۱۲ء کو اس خیال سے طوفان کی نذر کر دیا کہ اسکاٹ کو اپنی جان بچانے میں کچھ آسانی پیدا ہو سکے۔ ان المناک حادثوں کا اثر کپتان اسکاٹ پر اور برا پڑا۔ اس کی کمزوری اور لاغری روز بہ روز بڑھتی گئی۔ برف ریز تیز و تند طوفان نے اسکاٹ کو اپنے جہازی مرکز سے صرف گیارہ میل کی دوری پر خیمہ زن ہونے پر مجبور کر دیا۔ ہفتوں کی فاقہ کشی اور بڑھتی ہوئی نقاہت سے اسکاٹ بھی اپنے باقی ساتھیوں سمیت اسی جگہ ۲۹ مارچ ۱۹۱۲ء کو ابدی نیند سو گیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اسکاٹ نے اپنا روزنامچہ لکھا تھا جسے وہ دنیا والوں کے لیے چھوڑ گیا۔

آٹھ ماہ تک جب اسکاٹ اور اس کی پارٹی کی کوئی اطلاع مرکزی خیمہ کو نہ ملی تو لوگوں کو بے حد تشویش ہوئی۔ چناں چہ ایک جماعت اس کی تلاش میں روانہ ہوئی جس نے ۱۲ نومبر ۱۹۱۲ء کو اسکاٹ کے خیمہ تک پہنچ کر اسکاٹ کی اور اس کے ساتھیوں کی لاش برآمد کی۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اسکاٹ کی ڈائری بھی ملی۔ آخری تاریخ میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:۔

"۲۹ مارچ ۱۹۱۲ء ۔۔۔۔ ۲۱ تاریخ سے موسم برابر طوفانی ہے۔ ۲۰ تاریخ کو صرف دو دن کی رسد بچ رہی تھی۔ روزانہ ہم لوگ اپنے مرکزی خیمہ کی طرف جو یہاں سے صرف گیارہ میل دوری پر رہ گیا ہے روانہ ہونے کا ارادہ کرتے ہیں مگر طوفان کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔ ہم لوگ بہت کمزور ہو چکے ہیں۔ پیر سوج چکے ہیں۔ انگلیاں کٹ کر گر چکی ہیں۔ آگ اور کوئلہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ ہم لوگوں کا آخری وقت قریب آن پہنچا ہے مگر پھر بھی ہم ہراساں نہیں ہیں۔ چار دن سے خیمے کے اندر طوفان کی سختی کی وجہ سے بیٹھے ہیں۔ اب روانہ اور بغیر آگ کے بسر ہو رہی ہے۔۔۔۔۔" اس کے بعد ڈائری کے اوراق سادے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۹ مارچ ۱۹۱۲ء کے بعد اسکاٹ اور اس کے ساتھی زندہ نہیں رہے۔

کپتان اسکاٹ اگرچہ زندہ نہیں ہے مگر اس کی توقیر لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ اس کے ملک نے اپنے بہادر کپتان کی یاد قائم رکھنے کے لیے براعظم انٹارکٹیکا کی ٹھوس برفانی سطح پر ایک بہت بڑا مقبرہ تعمیر کر دیا ہے۔

حیوانات اور نباتات

اس براعظم کی آب و ہوا چوں کہ ہمیشہ سرد ترین رہتی ہے اور دنیا کے دیگر براعظموں سے یہ بالکل الگ تھلگ ہے اس لیے یہاں پر نہ تو شمالی قطبی خطے کے خشکی والے حیوانات ہی ملتے ہیں اور نہ وہاں کی نباتات ہی۔ ہاں اکائی اور کچھ گھاس گرمی کے موسم میں کہیں کہیں نظر آ جاتی ہیں۔ خشکی کا کوئی جانور نہیں پایا جاتا البتہ سرد سمندروں میں سیل۔ وھیل اور والرس کی قسم کے سمندری ہاتھی پائے جاتے ہیں۔ سمندری پرندوں پین گوئن (PENGUINS) اور شکرے (GULLS) کی افراط ہے۔ سمندری ہاتھی نہ صرف والرس سے بڑا ہوتا ہے بلکہ ہمارے یہاں کے ہاتھی سے بھی۔ ایسے سمندری ہاتھی شکار کیے جا چکے ہیں جن کی لمبائی ۲۰ فٹ اور جن کے جسم کا گھیرا ۱۲ فٹ تھا۔ ان کے سونڈ نہیں ہوتی۔ لیکن ان کے نتھنے پانی سے ایک فٹ اوپر نکلے رہتے ہیں۔ ان کے بڑے منہ میں لمبے لمبے اور پیلے پیلے دانت ہوتے ہیں۔ جب یہ بپھرتے ہیں تو خوفناک طریقہ پر چنگھاڑتے ہیں۔ ان کا گوشت کالا اور چربیلا ہوتا ہے۔ ان کی زبان کھانے میں لذیذ ہوتی ہے۔

پین گوئن ایک دل چسپ چڑیا ہے۔ یہ پرواز نہیں کر سکتی مگر پیرنے میں کمال رکھتی ہے۔ اس کے پیر اس قدر پیچھے ہوتے ہیں کہ جب یہ خشکی پر ہوتی ہے تو بالکل سیدھی کھڑی ہوئی معلوم پڑتی ہے۔ اس کے بازو چھوٹے چھوٹے اور سخت ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ پانی میں پیرتی ہے اور کسی برفیلی دیوار پر چڑھنے میں ان کا سہارا لیتی ہے۔ یہی اس کے مدافعت کے حربے بھی ہیں۔ اس کی ڈبکی لگانے اور پیرنے کی قوت غضب کی ہوتی ہے۔ سر جیمس راس نے ایک بار ان کے ایک جوڑے کو خشکی سے تقریباً ایک ہزار میل کے فاصلہ پر پیرتے دیکھا تھا۔ ایک ایسی چڑیا جو اڑ نہ سکتی ہو اتنی لمبی مسافت محض پیر کر طے کرے بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ پین گوئن قد میں ڈھائی تین فٹ ہوتی ہیں اور ان کا وزن نوے پونڈ تک ہوتا ہے۔ یہ بالعموم سمندری میں رہتی

ہیں صرف انڈے بچے دینے کے لیے خشکی پر آجاتی ہیں۔ یہ جولائی میں انڈے دیتی ہیں مگر انڈوں کو پیٹ کے پاس اپنے پروں سے ڈھک کر محفوظ رکھتی ہیں اگر برف پر چھوڑ دیں تو انڈے جم کر ٹھوس ہو جائیں اور بچے نہ پیدا ہو سکیں۔ یہ اپنے گھونسلے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور روڑوں کے بناتی ہیں جن کا حاصل کرنا امر محال ہوتا ہے اس لیے یہ اکثر دوسروں کے جمع کیے ہوئے ذخیرہ میں سے چوری بھی کر لیتی ہیں۔ اگر یہ چوری کرتے ہوئے پکڑ لی جائیں تو ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ جھگڑے کی صورت میں وہی سماں پیدا ہو جاتا ہے جو دو بوڑھی عورتوں کے جھگڑے میں ہوتا ہے۔ پھر یکے بعد دیگرے سب مداخلت کرتی ہیں اور اپنی چونچوں اور اپنے بازوؤں سے ایک دوسرے پر حملہ کرتی ہیں۔ غرض پورے جھنڈ میں شور قیامت برپا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی بھی ان کا سامنا ہمارے بہادر سیاحوں سے ہوا ہے انھوں نے ان سیاحوں کی ٹولیوں کو بھی اپنا ہی جیسا اگر ذرا بڑا پرند سمجھ کر ان کا خیر مقدم بھی ایک خاص انداز میں کیا ہے۔ وہ اس طرح کہ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر پہلے اپنے سر کو بندگی میں جھکایا اور پھر عجیب و غریب آواز نکال کر گویا اس نے ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد ایک دوسری نے آگے بڑھ کر اسی انداز میں استقبال کیا۔ پین گوئن کے بڑے خطرناک دو دشمن ہوتے ہیں۔ خشکی پر تو شکرے ہوتے ہیں جو ان کے انڈوں اور بچوں کی تلاش میں منڈلایا کرتے ہیں اور سمندروں میں سیل مچھلیاں گھات لگائے بیٹھی رہتی ہیں۔

ماضی، حال اور مستقبل

قطب جنوبی کی مہم اگرچہ کئی بار سر کی جا چکی ہے مگر اب بھی بر اعظم انٹارکٹیکا کے وسیع علاقے ایسے ہیں جہاں انسانی قدم نہیں پہنچ سکا ہے۔ اس بر اعظم کے تفصیلی حالات معلوم کرنے اور صحیح نقشہ تیار کرنے کے سلسلے میں اب ہوائی جہازوں کی مدد لی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کمانڈر رچرڈ۔ ای برڈ اور آسٹریلیا کے کپتان سر ہیوبرٹ ولکنس کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ولکنس نے ۱۹۲۸ء میں سب سے پہلے قطب جنوبی پر پرواز کی اور کمانڈر رچرڈ۔ ای برڈ نے ۱۹۲۹ء میں پہلی بار ۱۹۳۳ء میں دوسری بار ۱۹۳۹ء میں تیسری بار اور ۱۹۴۷ء میں چوتھی بار پرواز کر کے اس بر اعظم کے حالات سے دنیا کو روشناس کرنے میں قابل قدر کام کیا ہے۔ ان کی تحقیقات نے اس امر کا ثبوت دے دیا ہے کہ یہ بر اعظم کسی وقت نسبتاً گرم آب و ہوا رکھتا تھا کیوں کہ برف کے اندر دبے ہوئے کوئلے کے خزانے اور صنوبر کی پتیاں اور رتنے (FOSSILS) جا بجا پائے گئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اگلے زمانے کے درخت وغیرہ کے آثار ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ اس حقیقت کی بھی غمازی کرتے ہیں کہ یہ بر اعظم ماضی بعید میں یخ بستہ نہ رہا ہوگا۔ مگر آج حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ گرمی کے موسم میں بھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے ۰۷ درجہ یا اس سے اور زیادہ نیچے رہتا ہے۔ ہوا شاذ و نادر ساکت رہتی ہے ورنہ اس کی تیزی منطقہ حارہ کے طوفان (HURRICANES) سے کم نہیں رہتی۔ کبھی کبھی تو ہوا کی رفتار ۱۲۰ میل فی گھنٹہ ہو جاتی ہے جس سے ہوا میں ایک برقی رو دوڑ جاتی ہے۔ اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب حرارت کی بنی ہوئی چیزوں کے چھونے سے جھٹکا لگتا ہے یا انسانوں کے ناخن کے سرے تاریکی میں روشنی دینے لگتے ہیں۔

اس بر اعظم کی ساخت میں بڑا اہم آتش فشاں پہاڑوں کا ہے۔ آج بھی وہاں بہت سے مردہ، خوابیدہ اور زندہ آتش فشاں پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ کوہ ایری بس (MT. EREBUS) ہے جس کی بلندی تیرہ ہزار دو سو فٹ ہے آج بھی شعلے اور گیس نکلتی رہتی ہے۔ اس کے دہانہ کی گہرائی نو سو فٹ اور اس کا قطر نصف میل ہے۔ اس کی چوٹی پر بھی درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے پچاس درجہ کم تک نوٹ کیا گیا ہے۔

اس پُراسرار بر اعظم کی تحقیقات کے لیے موجودہ دور کے میکانکی آلات ہی معاون و مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ راس بیریر (ROSS BARRIER) پر برڈ کے ہوائی اڈے پر بنا ہوا ریڈیو اسٹیشن اس سلسلے کا پہلا قدم ہے جس کی مدد سے اس یخ بستہ بر اعظم کا رشتہ مہذب دنیا سے قائم کیا جا سکے گا۔ مگر جب تک بر اعظم انٹارکٹیکا کی سرد ترین آب و ہوا باقی رہے گی، اس کے پہاڑ، پلیٹو اور میدان یخ بستہ رہیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ہیبت ناک طوفان آتے رہیں گے اس وقت تک انسانی بود و باش کے امکانات کم ہی رہیں گے۔ ہاں مستقبل بعید میں اس کے امکانات ہیں کہ آب و ہوا کی سختی کم ہو جائے اور پھر یہاں کی وہی حالت ہو جائے جو قرن اولیٰ میں تھی۔ اور جب تک یہ صورت نہیں پیدا ہوتی قطب جنوب کا یہ برف پوش بر اعظم سنسان اور بیابان ہی رہے گا۔

چین کج سرشت

مناق سہارے انور

یلغار کر کے چین نے ہندوستان پر
لے لی ہے خود بلائے عظیم اپنی جان پر

وہ اک طرف تو قحطِ مسلسل سے تنگ ہے
اور اک طرف زیاں زدۂ خبطِ جنگ ہے

سرہنگ اُسی کی فوج کے مارے گئے بہت
مُردے عدم کو پاؤں پسارے گئے بہت

پھر بھی مآلِ شر نظر آتا نہیں اُسے
ظاہر ہے جو ضرر، نظر آتا نہیں اُسے

آئے کدھر سے عقل اُتر کر دماغ میں
کوڑا بھرا ہوا ہے سراسر دماغ میں

لایا اگر وہ لشکرِ جرّار اور بھی
ہو جائے گا تباہ سیہ کار اور بھی

دُنیا سمجھ رہی تھی جسے یارِ چین کا
وہ روس بھی نہیں ہے مددگار چین کا

ہر چند بد قماش اکیلا ہے آج کل
لیکن وہی ہے آج بھی جو تھا مزاج کل

کس سمت چل رہی ہے ہوا جانتا نہیں
جو فائدے کی بات ہے وہ مانتا نہیں

کیوں راستی سے بیر نہ ہو کج سرشت کو
کج لگ گیا تھا قطِ قلم سرنوشت کو

مری آواز پہنچا دو

چندر پرتاپ سنگھ نظر

دھواں اُٹھا، ہمالہ کی چٹانوں سے، دھواں اُٹھا
کفن سر سے لپیٹے ملک کا ہر نوجواں، اُٹھا!

مزا آجائے روزِ حشر کا ان شر پسندوں کو
سبق ایسا سکھا دو، چین کے بے حس درندوں کو

جوانو! جبر و استبداد کا سر ہی کچل ڈالو
تقاضے سے نظامِ زندگی یکسر بدل ڈالو

یہ وقتِ امتحاں ہے امتحاں، ہندوستاں والو!
سوالِ گلستاں ہے گلستاں، ہندوستاں والو!

اُٹھو! تم میں ہزاروں تلوا و بابا ابھی تک ہیں
بڑھو! تم میں ہزاروں رانا و سانگا ابھی تک ہیں

جو تم سے مادرِ ہندوستاں مانگے، اُسے وہ دو
ہمالہ کی چٹانیں دشمنوں کے خون سے دھو دو!

بزُعمِ عزمِ مستحکم اُڑا دو دھجیاں اس کی
اُٹھی ہے نیفا و لداخ کی جانب نظر جس کی

تم اپنی گن مشینوں میں کڑکتی بجلیاں بھر لو
جو دشمن کو اُڑا لے جائیں ایسی آندھیاں بھر لو

مزا جب ہے کہ دشمن کا سرِ مغرور جھک جائے
وہ ہنگامہ بپا کر دو کہ نبضِ وقت رُک جائے

زمینِ پاک! کس کا حوصلہ تیری طرف دیکھیں
وہ آنکھیں پھوڑ دوں جو برملا تیری طرف دیکھیں

فانی کی قنوطیت

سعادت نظیر

جب آرزوئیں پیاپے پامال اور ساعی متواتر ناکام ہو جاتی ہیں یا توقع سے کم کامیابی ہوتی ہے تو دل و دماغ پر ایک ایسا احساس چھا جاتا ہے جس سے بعض طبیعتیں اپنے متعلق محرومی کا مستقل فیصلہ کر کے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جاتی ہیں اور زندگی کو مصیبتوں، بلاؤں اور حادثوں کا ایک لامتناہی سلسلہ خیال کرتی ہیں۔ فانی کے الفاظ میں ان کے نزدیک ؎

زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

ایسے لوگوں کی نظر میں قیدِ ہستی گویا جبریت کا ایک پہلو ہے اور کائنات ایک ایسا عرصۂ کارزار ہے جہاں شکست و ناکامی ہی سے زیادہ تر دوچار ہونا پڑتا ہے اور محرومی و حرماں نصیبی گلے کا ہار ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آرزومندوں کے جذبات مجروح اور احساسات خوں گشتہ ہو جاتے ہیں۔ جذبات اور احساسات کی اسی اثر پذیری ہی کو "قنوطیت" کہتے ہیں، اگرچہ ایسی حالت میں "رجائیت" بالکل فنا نہیں ہوتی بلکہ غیر شعوری طور پر قنوطیت ہی کے روپ میں انسان اپنی زندگی گذارتا رہتا ہے۔ کسی ناامید کو موت کے سہارے تسکین ملنا، در پردہ رجائیت ہی کا ایک پرتو ہے مگر اس رجائیت پر چوں کہ قنوطیت غالب رہتی ہے اس لیے اس کو رجائیت کا نام نہیں دیا جاتا۔ یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امید کی ہائے وہ دل کے بہلانے پہ دھوکا سا آبادی کا

بہر حال، رجائیت ہو کہ قنوطیت، ہر کیفیت انسان ہی کے ساتھ پیدا ہوتی ہے اور انسان ہی کے ساتھ مرتی ہے۔ لیکن مشاہدات و تجربات کی دنیا میں دونوں پہلو بہ پہلو شاذ و نادر نظر آتی ہیں۔ انسانی مزاج پر رجائیت سے کہیں زیادہ قنوطیت حاوی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اس میں ایک یاس انگیز انفرادیت سی آ جاتی ہے۔ ایسی طبیعت کے انسان کو موت کے سوا کوئی منظر نہیں آتا۔ ؎

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

شاعروں کے طبقے میں جو افراد اس انفرادیت کے حامل [illegible] پائے جاتے ہیں ان میں شوکت علی خاں فانی کو بڑا امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ ایک مرگِ مسلسل کی مانند ہے۔ اُن کی شکست خوردہ انفرادیت میں ایک مستقل تمنائے اجل ہے کہ جھلکتی نظر آتی ہے اور ان کی اپنی زندگی جو لگاتار ناکامیوں کا شکار رہی، موت محسوس ہوتی ہے اور موت زندگی۔ ؎

مجھے عزیز ہے فرمانِ موت کی تعمیل
کہ موت کی یہ تمنا ہے زندگی کی دلیل

فانی نے قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے میں ۱۸۷۹ء میں آنکھ کھولی۔ جوانی کی وادی میں قدم رکھا تو "مر جانے کا زمانہ" آیا۔ ایک نظر کے بدلے میں جس دل ربا کو جان سی شے بھی سستے داموں دینے تیار ہو گئے، وہ عذرِ جفا بھی نہ بن پڑنے پر روٹھ گیا اور اس کی بے رُخی مزاج کے سبب کائناتِ دل کی نبضیں ڈوبنے لگیں۔ ؎

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

فانی نے ورثے میں جو کچھ پایا، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی اپنی بے راہ روی اور بے پروائی کے ہاتھوں لٹ گیا۔ حالات سے مجبور ہو کر خلافِ طبیعت پیشۂ وکالت کو ذریعۂ معاش بنایا مگر کشاکشِ حیات کچھ ایسی کہ انھیں بدایوں چھوڑنا اور شہر بشہر کی خاک چھاننا پڑی۔ تئیس سال کے لگ بھگ لکھنؤ، اور آگرے وغیرہ میں وکالت کی مگر ؎

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

آب و دانہ کی کشش تھی یا خاکِ گور کی کہ ۱۹۳۲ء میں حیدر آباد کی راہ لی اور یہاں سر رشتۂ تعلیمات سے منسلک ہو گئے۔ حیدر آباد کی روایتی دلچسپیوں اور قدر دانیوں نے ہمیشہ اربابِ کمال کو اپنی آغوشِ راحت میں جگہ دی اور ایسی جگہ دی کہ ان میں سے اکثر یہیں کے ہو رہے اور بالآخر یہیں پیوندِ خاک بھی ہو گئے، چناں چہ فانی کو بھی یہاں کے ماحول نے ایسا موہ لیا کہ انھوں نے یہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ لیکن افتادِ طبیعت، نازک مزاجی اور اسراف کے علاوہ بعض ذہنی صدموں نے ان کو سراپا غم بنا دیا

اور ان کی ہر بات غم آگیں اور یاس انگیز ہو گئی۔ ؎

جینے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی؟ کس طرح اٹھتی؟ — ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

آخر ۲۶ / اگست ۱۹۴۲ء کو فانی اپنی عمر کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

فانی نے اس دنیائے آب و گل میں ویرانے بھی دیکھے اور آبادیاں بھی مگر ان کی دنیائے دل کچھ ایسی اجڑی کہ پھر نہ بسی۔ انھوں نے دل کی اس بستی کے ذرّے ذرّے کو جلوہ گاہِ درد و الم کی صورت میں دیکھا اور ہر نفس کو آہِ بے تاثیر کا جنازہ اور عمرِ گزشتہ کی ایک میت پایا۔ خوشیوں اور مسرتوں سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا بلکہ محرومیِ نشاط ان کا مقدر تھا اور اسی محرومی کے شدید احساس نے ان کو اول اول مجسمِ کرب و اضطراب اور آخر ایک پیکرِ یاس بنا دیا۔ ؎

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا — ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا
منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی — تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
نامرادی حد سے گزری، حال فانی کچھ نہ پوچھ — ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا
عشق کا بھی کیا تصرف ہو کہ دل اب دل نہیں — آئینہ ہے غم کی بنتی جاتی تصویر کا

غم اور رقتِ طبیعت ایک فطری سنجیدگی کے طالب ہیں اور یہ سنجیدگی طبیعتوں کے اختلاف کے لحاظ سے مختلف معیار رکھتی ہے جب فانی کی طرح کوئی شخص غم اور عشق کو جدا نہ سمجھے شکستِ تدبیر ہی کو تقدیر خیال کرے تو یہی سنجیدگی اپنی حدود سے متجاوز ہو کر کراہیت پیدا کر دیتی ہے۔ فانی کے کلام میں موت و میت اور گور و کفن وغیرہ کی تکرار بعض اوقات تنفر کا باعث ضرور بن جاتی ہے مگر فانی کے کلام میں ہر جگہ اسی قسم کے الفاظ نہیں ملتے بلکہ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو تراکیبِ الفاظ، پیرایۂ بیان و اسلوبِ ادا کے اعتبار سے یہ کلام روانی و سلاست اور جذباتِ غم و یاس کے موثر اظہار کا بہترین مرقع دکھائی دیتا ہے۔ ؎

ابھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی — رکھنا قدم، تصورِ جاناں! سنبھال کے
اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ! — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم! خدا بھی ہے
صبح تک، فانی! ہر آوازِ شکستِ دل کے ساتھ — کیا قیامت تھا وہ تیرا جانبِ در دیکھنا!
تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق — جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی
خوشہ چینوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی — موسمِ گل آ گیا، زنداں میں بیٹھے کیا کریں؟

ظرفِ ویرانہ بقدرِ ہمتِ وحشت نہیں — لاؤ، ہر ذرہ میں پیدا وسعتِ صحرا کریں

فانی کی شاعرانہ انفرادیت اور شاعروں کی انفرادیت سے مختلف ہے اور ایک ایسی حیثیت رکھتی ہے جس میں مومن کا طنز تو ہے لیکن شوخی نہیں غالب کا بلیغ انداز بھی اکثر و بیشتر اشعار میں جھلکتا ہے مگر یاس کے روپ میں۔ نظیری کی شیوہ بیانی بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے لیکن غم کے ان ہی پردوں میں سمٹ لپیٹے۔ فانی کے مطالعے کے دوران میں بہت سی جگہوں پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کے معمولی سے معمولی غم کو بھی اپنی غم آفریں طبیعت سے مجبور ہو کر بڑے سے بڑا غم محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت طنز و شوخی اور شرارت سے فطرتاً گریزاں تھی۔ ان کی زندگی کے بعض واقعات سے یہ علم ہوتا ہے کہ فانی میں میر کی سی نازک مزاجی پائی جاتی تھی لیکن ایسے موقعوں پر وہ میر کے انداز سے ہٹ کر گریز و فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ نہ کہیں زمین ہی سے الجھتے ہیں اور نہ آسمان ہی سے جھگڑتے ہیں۔ بس وہ ہوتے ہیں اور یاس و حرماں کا ہجوم۔ وہ ایسے مریضِ غم ہیں جس کا غم ہی بجائے خود مداوا ہے اور یہ سب کچھ غمِ روزگار سے زیادہ غمِ دوست ہی کا فیضان معلوم ہوتا ہے۔ وہ اپنا پتہ بھی ہر مسافر سے پوچھتے ہیں تو یوں پوچھتے ہیں کہ میں خانہ برباد ہوں یا خانہ بدوش ہوں؟ ان کا اعتمادِ غم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اپنی ذات کو شیرازۂ دفترِ غم سمجھتے ہیں اور اپنی موت کو دفترِ غم کے شیرازے کا بکھر جانا تصور کرتے ہیں۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ ایک ایسا دل رکھتے ہیں کہ وہ ٹوٹ کر بھی شوقِ یاس آمیز کا طلسم بن جاتا ہے۔ آہ و زاری کو سکونِ دل کا سبب سمجھا جاتا ہے مگر فانی اس کو بھی اپنے دل کی بربادی تصور کر کے آزردہ ہوتے ہیں۔ ؎

اس خانہ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ! — با دلِ ہجر آہ بھی دل سے نکل گئی

فانی ایک پیامبرِ غم ہیں، وہ اپنے مذہبِ غم کی تبلیغ کرتے ہیں مگر ایک انوکھے انداز سے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اپنے آپ کو بے دلی کا ایک ایسا پیام کہہ کر پیش کرتے ہیں جس کا مدعا نہ خیر و شر ہے نہ صلح و جنگ ؎

میں ہوں عالم کو بے دلی کا پیام — خیر و شر مدعا نہ صلح نہ جنگ

فانی کے تیز احساس کا عکس ان کی شاعری کے صوری محاسن پر بھی پڑا۔ ان کا الم انگیز طریقِ اظہار واقعیت کی حدود کو نہیں توڑتا۔ بات سے بات یا مضمون سے مضمون پیدا کرنے میں بھی وہ اپنی انفرادیت کو

ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل اشعار دیکھیے! ان میں مختلف شاعروں نے "وفا" کا مضمون باندھا ہے۔

یا وفا خود نہ بود در عالم ۔۔۔ یا مگر کس دریں زمانہ نہ کرد (سعدی)

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ۔۔۔ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا (غالب)

اڑ گئی یوں وفا زمانے سے ۔۔۔ کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں (داغ)

اسی پامال مضمون کو اپنے مخصوص طرز میں فانی نے یوں ادا کیا ہے۔

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانے کا ذکر کیا؟ ۔۔۔ اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

بنیادی خیال تو وہی سعدی، غالب اور داغ کا ہے مگر "زمانے" اور "دوست کی شکایت" کے اضافے نے بات کہیں سے کہیں پہنچا دی۔ اسی طرح بعض معمولی اور پیش پا افتادہ باتوں کو بھی فانی نے ایک نیا رنگ دے دیا ہے۔ مثلاً کثرتِ مصروفیت کے اظہار کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "مرنے کی بھی فرصت نہیں"۔ اسی چیز کو انھوں نے یوں کہا ہے۔

ہر لمحۂ حیات رہا وقفِ کارِ شوق ۔۔۔ مرنے کی عمر بھر مجھے فرصت نہیں رہی

فانی عالم ہستی میں صحرائے بے آب و گیاہ کے ایک ایسے تشنہ لب مسافر کی طرح گامزن ہوتے ہیں جو دور سے چمکتی ہوئی ریت کی طرف پانی کے دھوکے میں دوڑ پڑے لیکن انجام کار اسے مایوسی کا سامنا ہو۔ فانی کو اپنی زندگی میں ایسے کئی تجربات ہوئے۔ انھیں امید کا کوئی ستارہ چمکتا دکھائی دیتا ہے مگر پل بھر چمک کر ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے حالات میں ساری دنیا انھیں سراب معلوم ہوتی ہے اور جب حقیقت کا کہیں پتہ نہیں چلتا تو کرشمۂ حیات کو محض فریبِ خیال تصور کرتے ہیں اور دنیائے آب و گل کے مشاہدات کو تجلیات وہم۔

تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل ۔۔۔ کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

فانی کے یہاں دانستہ یا نادانستہ کہیں کہیں "قنوطیت" کی جھلک بھی آگئی ہے مگر ان کے لہجے میں کوئی بھی فرق آنے نہیں پایا۔

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ۔۔۔ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں (غالب)

فانی امیدِ مرگ نے بھی دے دیا جواب ۔۔۔ جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی (فانی)

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ۔۔۔ سائل بنے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے (غالب)

جلوۂ یار کا بھکاری ہوں ۔۔۔ شش جہت کاسۂ گدائی ہے (فانی)

اسدؔ نے اپنی گدائی پر دل لگی کا پردہ ڈال کر عیب کو ایک ہنر بنالیا تھا اور اسی لیے سوال کرتے تھے تو صرف "اہلِ کرم" سے مگر فانی بھکاری بن میں بھی اپنی آن بان کھوتے ہیں نہ انفرادیت کو ہاتھ سے جانے دیتے ہیں بلکہ جلوۂ یار کی بھیک کے لیے شش جہت کو کاسۂ گدائی بنا کر اس ہنر کو معراجِ کمال پر پہنچا دیتے ہیں۔

لیکن فانی کی نگاہیں کائنات کے نظاروں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں اور وہ کسی کے "جلوۂ طاقت ربا" سے محروم رہتے ہیں۔ یہ محرومی ان پر اتنا اثر کرتی ہے کہ ان میں حیات گریزی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور حیات گریزی و فنا پسندی تصوف کی منفی قدریں ہیں۔ چناں چہ فانی کے یہاں تصوف کی جھلکیاں رجائیت ساماں نہیں، قنوطیت آثار ہیں۔ البتہ وہ تصوف کے بعض مشکل سے مشکل مسائل کو بھی سیدھے سادے ایسے عام فہم اسلوب میں پیش کرتے ہیں کہ پڑھ کر عوام و خواص دونوں کو برابر تشفی ہو جائے۔

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا ۔۔۔ نارسائی سی نارسائی ہے

کوئی منزل ایسی نہیں جس کی خاک انھوں نے چھانی نہ ہو لیکن ہزار تلاش کے باوجود بھی وہ کوئے دوست تک نہیں پہنچ پاتے۔ اسی نارسائی کا رنج، یاس و حرماں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ان کے مزاج میں ایسا رچ بس جاتا ہے کہ راستے کے دل کش مناظر سے وقتی طور پر متاثر ہو کر کبھی کبھی وہ نشاطِ آرزو کا راگ الاپتے بھی ہیں تو تان نوحۂ یاس ہی پر جا کر ٹوٹتی ہے۔

سازِ خیالِ یار سے چھیڑ چلی ہی کیوں نہ جائے ۔۔۔ نغمۂ آرزو سنا، نوحۂ یاس بھی سہی

فانی تمام عمر پابندِ وضعِ غم رہے، یہاں تک کہ اگر کبھی دل نے سلسلہ جنبانیٔ نشاط کی خواہش بھی کی تو "پاسِ وضعِ غم" کو بے غیرت ہو جانے کا طعنہ دیا۔

دل اور ہو لے سلسلہ جنبانیٔ نشاط! ۔۔۔ کیوں پاسِ وضعِ غم! تجھے غیرت نہیں رہی؟

آخر درد ان کی زندگی کا ایسا جز بن گیا کہ پھر محبوب کی کوشش کے باوجود انھیں تسکین نہ ہو سکی۔

آج تسکینِ دردِ دل فانی
وہ بھی چاہا کیے مگر نہ ہوئی

غرض فانی کے کلام میں ایک دو نہیں سیکڑوں مقام ایسے آتے ہیں جن میں قنوطیت کی گھٹی گھٹی فضا نظر آتی ہے جہاں نہ آرزوؤں کا تموج ہے اور نہ امیدوں کا ارتعاش بلکہ اس پر ایسی رات کا سکوت طاری ہے جس کی کوئی سحر نہیں۔

افسانہ

بے عنوان

بدرالنسا

حمیدہ بوا کو میں صرف چند سال سے جانتی ہوں۔ ابتدا میں تو مجھے ان سے شدید نفرت تھی کیونکہ وہ اپنی میلی کچیلی ساری پہنے، پیروں میں آدھی کھڑاؤں اور روکھے بالوں کے ساتھ سیدھے باورچی خانہ میں تشریف لاتیں اور بڑی بے تکلفی سے دیگچیوں کے ڈھکنے اُلٹ پلٹ کر دیکھتیں کہ کیا پک رہا ہے۔ مگر کس کی مجال تھی جو ان کی اس گستاخی پر کچھ کہہ سکتا، اس لیے کہ وہ سارے زمانہ کا کچا چٹھا جانتی تھیں۔ میں بھی خاموشی کے ساتھ ان کی ساری حرکتیں دیکھتی اور چپ رہ جاتی۔ اس نفرت کے باوجود میری زیادہ تر کوشش ہوا کرتی تھی کہ حمیدہ بوا کبھی ناراض ہو کر میرے گھر سے نہ جائیں۔ لیکن مہینے کی آخری تاریخوں میں، جو شریفوں کے آزمائش کا دور ہوتا ہے، اُنھیں میرے گھر سے گویا ناامید ہی لوٹنا پڑتا تھا۔ ایسے وقت میں اُن کا موڈ اکثر "آف" ہو جاتا تھا اور پھر تو وہ عظیم آبادیوں کی شان میں نثر میں فی البدیہہ ہجو شروع کر دیتیں۔ کہنے لگتیں: "پٹنہ والوں کا ستیاناس ہو۔ ان پر بم کے گولے گریں۔ طوفان آئے۔ ہیضے کی وبا پھیلے۔ یہاں والوں کے دل میں ذرا درد نہیں، رحم نہیں۔ مٹ جائیں سب اللہ کرے۔"

ہم لوگوں کو ان کی اس تقریر پر بے اختیار ہنسی آ جاتی اور صرف انھیں چھیڑنے کو کہتے: "اگر پٹنہ میں یہ سب تماشا ہوا تو حمیدہ بوا کیسے بچیں گی؟" مگر وہ سُنی کی ان سُنی کر کے اُٹھ جاتیں۔

رفتہ رفتہ وہ ہمارے گھر سے اور بے تکلف ہونے لگیں اور مجھے بھی ان کی باتوں میں تھوڑا تھوڑا سا لطف آنے لگا، اس لیے کہ وہ سارے پٹنہ کے "اسکینڈل" آ کر سناتیں۔ ان کی کہانیاں بے سر پیر کی ہوتیں، پھر بھی مجھے مزہ آتا۔ وہ کہنے لگتیں: "ہائے کا برا زمانہ آ گیا ہے۔ آج کل کی لڑکی سب کیسی بے شرم ہووے ہے۔ دیدہ کا پانی گر گیا ہے، مگر ان کا قصور؟ سب غلطی مائے باپ کی ہے۔ ہم لوگ کے وقت میں ایسی ایسی جوان دھوتال لڑکین کو کوئی کنوارا بیٹھا تا تھا؟"

"تو اور کیا پیدا ہوتے ہی شادی کر دیتا تھا" میں بھڑکاتی۔

"نہیں جی، دیکھو نے رحیم میاں نے اپنی کیسی ناک کٹائی ہے۔ ان کی بیٹی روز رات کو کھڑکی کے رستے چپکے چپکے جانے کہاں جا ہے۔ اور وہ غفور صاحب کی بیوی! ان پر اللہ کی مار پڑے۔ نہ شرم نہ حیا۔ میاں تو گھر میں رہے ہیں اور بیوی ان کے دوستوں کے ساتھ گھومے جا ہیں اور خوب ہا ہا ٹھیٹھی کرے ہیں، توبہ توبہ!" یہ چٹپٹی داریاں تھیں حمیدہ بوا کی جنھیں سنا سنا کر وہ ہم لوگوں کے قریب آتی جا رہی تھیں۔ مگر کچھ عرصہ سے اُنھوں نے اچانک آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی۔ طبیعت الگ گھبرانے لگی تھی، کیونکہ اپنے شہر کی "مزیدار" خبریں سُنانے والا کوئی نہ تھا۔ اتفاق سے ایک دن صبح ہی صبح حمیدہ بوا ایک چھوٹی سی گٹھری بغل میں دبائے، بڑی افسردہ اور تھکی تھکی سی آتی نظر آئیں۔ ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ان کی ایک ہی بہن تھیں۔ وہ بھی مسلسل بیماری کے بعد انھیں داغ دے گئیں۔ ہم لوگوں نے تعزیت کے رسمی اور گھسے پٹے سے جملے ادا کر دیئے اور اپنے خیال میں حمیدہ بوا کی تسکین کا سامان کر دیا۔ اس دن سے حمیدہ بوا میرے گھر میں رہنے لگیں اور

(بقیہ ص ۳۷ پر)

جشن

نصیر پرواز

حیات جاگ اٹھی سن کے شورشِ ہنگام — نئی ادا سے کھلا دلہنوں کا رنگِ حنا
بجھیں وفاؤں کی موجیں دیارِ طوفاں میں — نظر نے چوم لی بڑھ کر کشتوں کی ردا
محبتوں نے قسم کھائی حسرتِ دل کی — نزاکتوں نے اٹھا دی ہر ایک رسمِ حیا
نہ درد ہجر کے قصے نہ وصل کے نغمے — امنڈ رہی تھی سروں پر مصیبتوں کی گھٹا

حسیں لبوں پہ رجز گیت بکھرتے نغمے — جوان سینوں میں آہنگِ کارواں جاگا
قدم ملائے چلے حسن و عشق کے پیکر — زمیں کا سینہ جو دھڑکا تو آسماں جاگا
ردائے یار بنی کارزار کا پرچم — نگاہِ شوق میں احساس کا جہاں جاگا
ہزار دل تھے مگر ایک دل کی دھڑکن تھی — ہر ایک بزم سے اک جوشِ بے کراں جاگا

ہر ایک دل نے صدا دی کہ دار کو چومیں — ہر ایک جسم اٹھا خونِ دل کا جام لیے
ہر ایک راکھی نے بھیجا محبتوں کا غرور — ہر ایک مانگ بھی جراتوں کا نام لیے
ہر ایک ماں نے سجایا جواں سپوتوں کو — دلوں میں غصہ نگاہوں میں انتقام لیے
ہر ایک حرف بنا بزمِ زیست کی قندیل — ہر ایک لفظ بڑھا فرض کا پیام لیے

گزر گئی وہ گھڑی پھر بھی وسوسوں کی طرح — شبِ حیات کے گیسو بکھر بھی سکتے ہیں
جو ایک بار نگاہیں ملا کے بیٹھ گئے — درِ حیات پہ آکر ٹھہر بھی سکتے ہیں
جنھیں سلیقۂ اندازِ خوش روی ہی نہیں — وہ پست راہوں سے اک دن گزر بھی سکتے ہیں
وہ پاؤں جو کہ مقدس زمیں کی سمت بڑھے — پھر ایک بار یہی جرم کر بھی سکتے ہیں

لبوں کے دیپ جلیں، عارضوں کی شمعیں جلیں — شبِ الم ہے وفا جاگے، زندگی جاگے
یوں ہی دمکتا رہے شعلے مانگ کا سیندور — جنوں بھی سو نہ سکے، رسمِ دلبری جاگے
چراغِ عزم نہ بجھے غم کی تیز آندھی میں — مہ و نجوم سے ذرّوں کی روشنی جاگے
رقص بھی ہوگا مگر شبستاں میں — تمام رات جلیں داغ، تیرگی جاگے

حیات موت کو جب بھی گلے لگاتی ہے
جمالِ صبح زمانے کو بخش جاتی ہے

(بہ سلسلہ صفحہ ۳۵)

اس طرح جیسے گھر کے سب افراد رہتے ہیں۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ ان کا حق تو اس گھر پہ اوروں کی طرح ضرور رہا لیکن فرض کا اگر نام بھی آتا تو خفا ہو جاتیں۔ مگر ہم لوگ تو اب ان کو ناول اور میگزین کی طرح دلچسپ چیز سمجھ کر رکھنے کو بخوشی تیار رہتے!

جب حمیدہ بوا میرے گھر میں رہنے لگیں تو ایک خاص بات جو میں نے ان کی غور کی وہ یہ تھی کہ آس پاس میں جہاں کہیں بھی شادی ہوتی وہ یوں تیار ہو کر جاتیں جیسے دولھن وہی ہیں۔ لیکن جب دولھن کو حجلۂ عروسی میں جاتے دیکھتیں تو یوں الٹے پاؤں شادی کے گھر سے بھاگتیں جیسے ان کا سب کچھ چھن گیا ہو، سب کچھ لٹ گیا ہو۔ پھر تو ہفتوں نہ تو حمیدہ بوا کو کھانا اچھا لگتا، نہ وہ کپڑے بدلتیں اور نہ ہم لوگوں کو مزید اور کہانیاں سناتیں۔ اس کی وجہ میں نے ان سے جب بھی پوچھی وہ ٹال گئیں۔

گرمیوں کی ایک رات تھی۔ بڑی اُمس تھی اور مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں اُٹھ کر چھت پر ٹہلنے لگی۔ سامنے حمیدہ بوا کی کوٹھری نظر آرہی تھی میں اس طرف بڑھنے لگی۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پلنگ پر اخبار دیکھنے میں منہمک ہیں۔ مجھے ہنسی آگئی اور میں نے زور سے کہا! "حمیدہ بوا! تم نے اخبار پڑھنا کب سے شروع کر دیا؟" اتنا سننا تھا کہ حمیدہ بوا گھبرا گئیں اور اخبار جھٹ پیٹھ کے نیچے دبا لیا۔ اس وقت تک میں ان کے بستر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ میں نے بڑے خلوص سے ان سے پوچھا: "بتا بھی دو کیا دیکھ رہی تھیں؟" بیچاری کی حالت قابل دید تھی۔ وہ نظریں نیچی کئے ہوئے مسکرا رہی تھیں، مگر میں اُن کی جان کھانے لگی۔ آخر کار تنگ آکر مگر ہنستے ہوئے انھوں نے کہا: "ان کا فوٹو دیکھتے تھے۔"

"ان کا فوٹو؟ یعنی تمہارے "وہ" زندہ ہیں؟" اس انکشاف پر میری آنکھیں پھٹ گئیں۔ "تو حمیدہ بوا سہاگن ہیں! پھر بیوہ کا روپ اُنھوں نے کیوں دھار لیا ہے؟ وہ کون ظالم ہے جو ان کی خبر تک نہیں لیتا؟" میرے ذہن میں سوالوں کا ایک ہجوم تیار ہو گیا اور پھر تو میں حمیدہ بوا کی کہانی انھیں کی زبان سے سننے کو مچل گئی مگر میں جتنا اصرار کرتی وہ اسی قدر افسردہ ہوتی جاتیں۔ ان کی ساری مسکراہٹ، بیچارگی اور بے بسی میں بدل گئی۔ میں ان کے بستر پر ان کے بہت قریب بیٹھ گئی جیسے میں ان کی ہم عمر اور ان کی سہیلی ہوں۔ مجھے اتنا قریب پا کر اُنھوں نے مجھے لپٹا لیا اور ان کا سارا دکھ اور درد ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا۔

"آج تک میرے بارے میں کوئی کچھ نہ جانے ہے، مگر تم کو ہم سب بتا دیں گے۔ سب کچھ۔" یہ کہہ کر وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگیں جیسے وہ اپنے ماضی کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ تھوڑی دیر سکوت کے بعد انھوں نے یوں شروع کیا۔

"اللہ جانے ہے، ہم بھی شریف گھرانے میں پیدا ہوئے ہماری دو بہنیں تھیں۔ گھر میں دولت بہت تھی، مگر چونکہ میرے باپ ہم کو ایک سال کا ہی چھوڑ کر مرے تھے اس لئے دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کی شادی ایک ساتھ کر دی گئی۔ قسمت بُری تھی۔ اماں حج کو اسی سال گئیں اور وہیں ختم ہو گئیں۔"

"تو پھر تم اپنے سسرال میں بس گئی ہوگی۔" میں نے پوچھا!

"ہاں گئے تو ضرور تھے مگر بسنا اپنی قسمت میں کہاں تھا؟"

"تمہارے میاں کیا کرتے تھے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"بتا تو رہے ہیں۔ اجی وہ تو بہت اچھے تھے۔ ہماری شادی کے وقت وہ ولایت سے انجینیر ہو کر آئے تھے۔ کا جانو گی کہ ہم کتنا خوش ہوئے تھے کہ ماں نے اتنا اچھا گھر دیکھ کر بیاہ کیا ہے۔ دنیا جہان کی بیٹیوں کی طرح ہم بھی روتے سسکتے، اپنی سسرال گئے، مگر اللہ قسم اُن کو دیکھ کر ہم سب کچھ بھول گئے اور اتنے خوش ہوئے کہ جانا کہ غم کا منہ بھی نہ دیکھیں گے، مگر..." ایک ٹھنڈی سانس لیکر وہ رُک گئیں۔

"پھر کیا ہوا؟ تم چپ نہ ہوا کرو۔" میں نے گویا حکم دیا۔

"تب یہ ہوا کہ ایک دم سے ان کی نوکری جمشید پور میں ہو گئی اور وہ جانے لگے۔ جب ہم کہا کہ ہم کو بھی لیتے چلئے تو بولے کہ "وہاں جا کے سب انتظام کر لیں تو تم کو بُلا لیں گے۔" میرے واسطے ان کا اتنا کہہ دینا بڑی بات تھی۔ ان کو چلا دیا اور آج تک سوچے ہیں کہ

ضرور آئیں گے"

"تمہیں یقین ہے بوا کہ وہ آجائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نا کاہے؟ جانو ہم خواب میں برابر دیکھے ہیں کہ وہ آگئے ہیں اور وہی سوٹ پہنے ہوئے دیکھے ہیں جس کو پہن کر وہ گئے تھے ذرا تو نہ بدلے ہیں۔ جیسے کے تیسے ہیں، اور ہم بھی اپنے آپ کو وہی بارہ برس کا دیکھے ہیں اور ویسے ہی کپڑے پہنے جیسے ان کو جاتے وقت پہنے تھے۔"

پھر وہ کسی خیال سے اچانک گھبرا گئیں اور بڑے اضطراب کے لہجہ میں مجھ سے پوچھا: "میری صورت بہت خراب ہے۔ ہم بہت بُرے لگے ہیں بی بی؟" میں ان کے اس سوال سے گھبرا سی گئی۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگیں:

"ہائے میری کیا صورت تھی اور کیا ہو گئی۔ میرا رنگ گورا تھا۔ اور میرے بال (انھوں نے اپنا چھوٹا سا جوڑہ کھول دیا) کس قدر لمبے اور گھنے تھے۔ ایسے لمبے تھے کہ انھیں دھونا اور سلجھانا بھی ہم کو جنجال لگتا تھا۔ مگر اب میرے بس کا دھرا ہے۔ اسی لئے تو جب ہم سڑک پر نکلے ہیں تو پورا منہ چادر میں چھپا لے ہیں، خالی میری آنکھ کھلی رہے ہے۔"

میری نگاہیں ان کی آنکھوں پر جم گئیں جو کافی کشادہ تھیں اور جن میں کسی کے انتظار کا اضطراب پوشیدہ تھا۔

"او میرے پہچان لیں گے نے؟ یا اسی صورت سے ان کو بھی نفرت ہو جاگی؟"

میرا دل ان کے غم پہ آنسو بہانے لگا کیسی کیسی تمنائیں اور ساتھ ساتھ وسوسے ان کے دل میں جنم لے رہے تھے۔ پھر میں یوں ہی پوچھ بیٹھی:

"تم کتنے دن اپنے شوہر کے ساتھ رہیں؟"

"دس دن۔"

صرف دس دن! اس طویل زندگی میں حمیدہ بوا کو یہ مختصر وقت مسکرانے کو ملا تھا۔ میں نے ایک بے تکی سی بات کہہ دی:

جب وہ کافی عرصہ تک لوٹے نہیں، اور نہ تمہاری خبر ہی لی، تو تم نے دوسری شادی کیوں نہ کر لی؟"

حمیدہ بوا نے جھٹ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اللہ نہ کرے، خدا نہ کرے کہ ہم یہ دن دیکھیں۔ ہم کو یقین ہے کہ او ضرور آویں گے۔ نا تو کا میری اتنا دعا برباد ہو گی۔ نہ بی بی اللہ اتنا ظلم نہ کر سکے ہے۔"

میں سوچنے لگی، یہ ظلم نہیں تو اور کیا نوازش ہے؟ بارہ سال کی عمر سے پچپن سال کی عمر تک تنہا و تشنہ زندگی بخشنا احسان ہے؟ میرا جی چاہا حمیدہ بوا سے کہہ دوں کہ خواہ مخواہ کی امید نہ رکھو۔ تمہارے میاں کبھی نہیں آئیں گے۔ ایسے ظالم سے آس باندھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟ مگر پھر میں نے سوچا کہ زندگی میں اور دھرا ہی کیا ہے۔ اگر فریب کے پردے بھی ہٹ جائیں تو شاید جینا بھی محال ہو جائے۔ اگر انسان کا تخیل اور مستقبل سے وابستہ خوش آئند تصورات کا طلسم بھی ٹوٹ جائے تو انسان کا دم گھٹنے لگے۔ یہ قسمت اور خدا کا تصور ہی تو ہے جو ساری تلخیوں کے باوجود جینے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ پھر حقیقتوں سے پردے ہٹا کر حمیدہ بوا کی رہی سہی خوشی چھین لینا کہاں کا انصاف تھا؟

"کا سوچ ہو بی بی؟" حمیدہ بوا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں، تمہارے انھیں کے متعلق سوچ رہی تھی۔"

"کہ وہ کیسے ہیں؟ اجی بی بی وہ تو ایسے ہیں کہ نہ ہم ویسا مرد کہیں دیکھا ہے نہ دیکھیں گے۔ بہت اچھے ہیں۔ آویں گے تو دیکھیو نے کہ ہم جھوٹ بولتے تھے کہ سچ کہا تھا۔"

"اچھا تو دکھاؤ مجھے وہ تصویر جو تم ابھی دیکھ رہی تھیں۔"

حمیدہ بوا پھر شرما کر بڑے انداز سے مسکرا دیں۔ اس وقت اُن کی مسکراہٹ سے مجھے بڑی اذیت پہنچی۔ کتنی بھولی ہیں حمیدہ بوا میں نے سوچا۔ رات کافی گذر چکی تھی مگر میری آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ اب تو گرمی کا احساس بھی نہیں تھا۔ پھر حمیدہ بوا نے بغیر اصرار کے یہ کہتے ہوئے اخبار میری طرف بڑھا دیا کہ جاوید (میرا چھوٹا بھائی) بے چارے نے، اللہ اس کو لاکھوں برس کی زندگی دے، بتایا ہے کہ اُن کی فوٹو چھپی ہے۔ یہ اخبار ہم کوئی کو نہ دیں گے۔" مگر جاوید کیسے جانتا ہے کہ تمہارے شوہر زندہ ہیں۔

"انھیں سے میں نے ایک بار خط لکھنے کو کہا تھا" بس ادھی پڑن سے جانے ہیں۔"

ابھی تک تو میں باتوں میں لگی تھی۔ اب ذرا غور سے جو تصویر دیکھی تو میرے منھ سے بے اختیار نکل گیا: "جاوید تو ایک نمبر کا شریر ہے اور جھوٹا بھی۔ یہ تصویر تو انور بھائی کی ہے۔ کل وہ امریکہ جانے والے ہیں۔ اسی سلسلے میں تصویر چھپی ہے۔

"کیا کہا" ؟ یہ تصویر ان کی نا ہے۔ ایسا ہو نہ سکے ہے تم جھوٹ مت بولو بی بی!" یہ کہہ کر انھوں نے زور سے قہقہہ مارا اور پھر زور زور سے کہنے لگیں: "یا اللہ کیسا اندھیر ہے کہ ایرے غیرے تو انھیں پہچان لیں اور ہم ہی نہ پہچانیں!" یہ کہہ کر انھوں نے تصویر اپنے سامنے رکھ لی اور اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: تمہیں بولو دونا کہ تم میرے کون ہو۔ یا اللہ میری محبت دیکھو کہ ہم تم کو اتنی مدت کے بعد بھی پہچان لیا۔ تم آؤ گے تو میرے بھی اتنی ہی جلدی پہچان لو گے نے!"

شاید اب پو پھوٹ رہی تھی، مگر فضا پر ابھی تک دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ حمیدہ بوا تصویر پر جھکی ہوئی بار بار اُسے ہونٹوں سے لگا رہی تھیں۔



ساتھ چلو

اختر نظامی

میں مجاہد ہوں، سپاہی ہوں مرے ساتھ چلو
منزلِ فتح کا راہی ہوں مرے ساتھ چلو

آؤ اک ساتھ اُٹھیں، آؤ کہ اک ساتھ بڑھیں
یوں بڑھیں گے تو نہ ٹھہرے گا مقابل میں کوئی
آزمائش کا ہے یہ وقت چلو جاں بازو
حوصلہ دل کا نہ رہ جائے کہیں دل میں کوئی

غیر کے سایۂ دامن میں نہیں گنگ و جمن
سر کٹا دیں گے مگر یہ نہ گوارا ہوگا
جذبۂ جہد و عمل ہے تو ہمیں غم کیا ہے
پرچمِ فتح ہمارا ہے، ہمارا ہوگا

چین نے ہند کی تہذیب کو للکارا ہے
عزتِ قوم ہے خطرے میں وہ وقت آیا ہے

آؤ ہم ایک ہیں، اور ایک ہے ہم سب کا وطن
پھر سنواریں گے ہم اک بار لہو سے یہ چمن

لیکن آزادی پہ حرف آئے، یہ ناممکن ہے
گلشنِ ہند کو سینچیں گے لہو سے اپنے
اک نیا عزم لیے آگے بڑھیں گے ہم سب
اپنی آنکھوں میں ہیں اب جیت کے سُندر سپنے

آؤ ٹیپو کے عزائم کی قسم کھا کے اُٹھو
فیصلہ آج کا ہے فیصلۂ مستقبل
آج یہ راہ جو دشوار نظر آتی ہے
کل اِسی راہ کے ہر ذرّے میں ہوگی منزل

ضربِ دشمن پہ جو اب ہوگی وہ کاری ہوگی
آخری جیت یقیں ہے کہ ہماری ہوگی

جستجو جس کی ہے وہ راہ گزر دور نہیں
ان اندھیروں سے نہ گھبراؤ سحر دور نہیں

میں کہ طوفان ہوں، اک برق ہوں، اک شعلہ ہوں
میں کہ اک عزم ہوں، اک جوش ہوں، اک جذبہ ہوں

میں کہ دشمن کی تباہی ہوں مرے ساتھ چلو
منزلِ فتح کا راہی ہوں مرے ساتھ چلو

ہمہ چو من دیگرے نیست

ال، ار، ناشر

صدیوں سے چینیوں کا یہ عقیدہ رہا ہے کہ "چین ہی دنیا ہے اور دنیا کا ہر وہ خطہ جو چین سے باہر ہے وہ یا تو گنوار ہے یا چین سے کم تر۔" دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ چین نے جو رویہ اختیار کیا اُس میں شروع سے اب تک اسی احساس برتری کو دخل رہا ہے۔ موجودہ دَور میں یہ احساس اور زیادہ ہو گیا ہے۔ غالباً اسی احساس برتری نے چین کو ہمیشہ توسیع پسند بنائے رکھا۔ چین کے نزدیک دنیا کے دوسرے ملک اور وہاں کے رہنے والے وحشی ہیں۔ اسی لیے اُس کا یہ نظریہ رہا ہے کہ اطراف واکناف کے "وحشیوں کو مغلوب کر کے چینی بنا دینا چاہیے اور ایک بار مہذب بنا دینے کے بعد انہیں دوبارہ وحشی بننے کی اجازت نہ دینا چاہیے۔" لہٰذا جو علاقہ چین نے ایک بار فتح کر لیا ہو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا حصہ رہے گا اور اگر کبھی یہ چین کے ہاتھ سے نکل بھی جائے تو اسے جلد از جلد دوبارہ پا لینے کا موقعہ نکال لینا چاہیے۔"

ماضی کے اس تصور پر چین کا موجودہ انداز نظر استوار ہوا ہے اور دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات پر یہی نظریہ کارفرمائی کر رہا ہے۔ جنگجویانہ وطن پرستی کے ان تصورات کو لے کر موجودہ چینی حکومت اپنے آپ کو جنوب مشرقی ایشیا میں اپنے سابقہ ثقافتی وسیاسی اقتدار کا حقدار سمجھتی ہے۔ وہ نہ صرف اپنے تصور کی عظمت رفتہ کو زندہ کرنا چاہتی ہے بلکہ یہ بھی چاہتی ہے کہ چین کی سابقہ وسعت کو پھر حاصل کیا جائے۔ یہی نہیں موجودہ حکومت چین، اس سے بھی آگے بڑھ کر ساری دنیا پر محیط ہو جانا چاہتی ہے تاکہ ماؤ کے کہنے کے مطابق "تاریخ کے پہیے کو تیزی اور تندہی کے ساتھ چلایا جائے۔"

قدیم شہنشاہیت کی تجدید۔

اگر ماضی پر نظر ڈالیں تو ہمیں چین کی توسیع پسندانہ اسکیم کا صحیح اندازہ ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک بڑا طویل اور مسلسل عمل ہے۔ ایک زمانہ میں اُن علاقوں کے علاوہ جو براہِ راست چین کے زیر اقتدار تھے کچھ اور باج گزار ریاستیں بھی اُس کے دائرہ اثر میں تھیں مثلاً شمال میں کوریا، برما، ہند چین کے کچھ حصے اور انڈونیشیا۔ چینیوں نے نیپال اور تھائی لینڈ پر بھی مبہم سے دعوے کیے۔ موجودہ چینی حکومت وہ سارے علاقے پھر حاصل کرنا چاہتی ہے جو پہلے کبھی چین کے زیر اقتدار تھے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ "جب کوئی علاقہ ایک بار چین کا حصہ بن جاتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لیے چین کا ہو جاتا ہے۔" اور چینی علاقے کے کسی حصے کی علیحدگی زیادہ سے زیادہ "عارضی غیر درست اور غیر منصفانہ" تصور کی جا سکتی ہے۔ چین کا یہ ہمیشہ خیال رہا کہ اہل مغرب "بدترین وحشی" ہیں۔ یہ نظریہ اب بھی قائم ہے۔

چینی حکمت عملی کے بنیادی مقاصد

موجودہ چین کی خارجہ حکمت عملی کے خاص مقاصد میں پہلا مقصد یہ کہ اپنی سیاسی وثقافتی اہمیت بڑھائی جائے تاکہ چین دنیا میں

بالعموم اور ایشیائی عوام میں بالخصوص لیڈر کا مرتبہ پا سکے۔ اسی وجہ سے بعض اوقات وہ خود ہی ایشیائی ملکوں کا ترجمان بن جاتا ہے۔ چین کی حکمت عملی کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک زبردست فوج کی مدد اور صنعتی ترقی کے بل پر چین ایک عالمی طاقت بن جائے۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ اس کی جنگجویانہ کمیونزم مضبوط اور مقبول ہو جائے۔ حکومت چین غیر جانبداری کے نظریہ کو بھی نہیں تسلیم کرتی۔ ماؤ نے ۱۹۴۹ میں کہا تھا "غیر جانبداری محض ایک سراب اور ایک دھوکہ ہے۔"

ان مقاصد کی تکمیل کے لیے اور ماضی کی چینی شہنشاہیت کے کھوئے ہوئے حصوں کو پھر دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے حکومت چین نے مانچوریا، تبت اور سنکیانگ میں جو ایک عرصہ تک اس کے تابع رہ چکے تھے، اپنا اقتدار دوبارہ جمالیا، کوریا اور ویٹ نام کی باجگزار ریاستوں پر اپنا دائرہ اثر پھیلایا اور مشرقی دنیا میں اپنی برتر قوت کا سکہ جمانے کی کوششیں کیں۔

روایاتی چینی حکمت عملی کی پیروی کرتے ہوئے زیادہ دور ملکوں یعنی ملایا، تھائی لینڈ، لاؤس اور کمبوڈیا سے موجودہ چینی حکومت کے تعلقات آج مختلف ہیں۔ چین کے نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے کہ یہ ممالک کسی مخالف طاقت کے زیر اثر نہ آجائیں۔ شاید چین کا یہ اندازہ ہے کہ اگر وہ ویسے ہی رہیں جیسا کہ اس وقت ہیں تو وہ دوسرے ذرائع کی مدد سے مثلاً معاشی اثرات کے سبب چین کے سیاسی اثر کے تابع ہو جائیں گے۔

اعتماد کی کمی

آزاد بھارت کے اس اثنا میں ظہور سے ایشیائی سیاست میں ایک نیا عنصر رونما ہوا ہے۔ کچھ برسوں تک چین کی نئی حکومت نے پنج شیل کے پانچ اصولوں پر مبنی بقائے باہم کی پالیسی پر کاربند ہونے کا دم بھرا لیکن دوسرے ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھنے سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت چین دوسروں کے ساتھ اسی وقت سمجھوتے کرتی ہے جبکہ یہ ناگزیر ہوں یا چین کے حق میں مفید ہوں۔ لیکن بین حکومتی تعلقات کے روایاتی طریقوں مثلاً طے شدہ معاہدوں وغیرہ کی شرائط کو چینی حکومت اپنے لیے لازمی نہیں سمجھتی۔ چین کے حدود سے دور رہنے والوں کے سماجی اقتصادی و سیاسی رویوں کو بدلنے کے لیے وہ ہر ممکن طریقوں کا استعمال جائز سمجھتی ہے۔

تبت پر چین کے تسلط کے بعد بھارت کے ساتھ اس کی سرحدوں کا معاملہ سامنے آیا۔ چین نے روایاتی و قانونی بین الاقوامی سرحد کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ گزشتہ سال ماہ اکتوبر میں چین کے بے وجہ جارحانہ اقدام کے ساتھ ہی پُرامن باہمی بقا کا وہ عہد بھی ختم ہو گیا جو اس نے ہندوستان سے کیا تھا۔

چینی جارحیت کی بیرونی چوکیاں

حکومت چین نے ہمیشہ سمندر پار بسے ہوئے چینیوں سے اپنے نسلی و ثقافتی رشتے کا اعلان کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں کی معاشی زندگی میں ان چینیوں نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ کبھی کبھار ان ملکوں میں ایسے چینیوں کو غیر ملکی بھی قرار دیا گیا ہے لیکن حکومت چین نے ہمیشہ اپنے آپ کو باہر بسی ہوئی چینی اقلیتوں کا محافظ و نگہبان تصور کیا۔ ایک چینی ترجمان نے تو ایک مرتبہ صاف صاف کہہ دیا کہ "بیرونی ملکوں میں اپنے ہم وطنوں کی کوئی تذلیل یا ان کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی کو ہم ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔" اب جہاں تک دوسرے ملکوں میں بسے ہوئے ان چینیوں کا تعلق ہے انہوں نے اس ملک کو جہاں وہ بس گئے اپنا وطن نہیں سمجھا بلکہ چین کے آلۂ کار ہمیشہ بنے رہے اور جب کبھی موقع ملا انھوں نے چینی جارحیت کی بیرونی چوکیوں کا کام کیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے چین کے تعلقات دونوں ملکوں کے درمیان بحرالکاہل جیسے وسیع و عریض سمندر کی موجودگی کی جغرافیائی حقیقت کے احساس کا نتیجہ ہیں۔ اگرچہ شمال میں روس بھی ایک عظیم طاقت ہے لیکن عملی طور پر ریاست ہائے متحدہ ہی مغربی بحرالکاہل پر اپنا اثر قائم کیے ہوئے ہے۔ چین دونوں سے بگاڑ مول نہیں لے سکتا تھا اس لیے وہ روس کی طرف جھک گیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو اپنا دشمن سمجھنے لگا اور اس لیے بھی کہ تائی وان میں چیانگ کائی شیک کو امریکہ کی تائید و حمایت حاصل ہے۔

دائرہ اثر کی توسیع

یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ روس اور چین میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن

یہ زیادہ تر نظریاتی بنیادوں پر ہے، اگرچہ چینیوں نے اکثر وسیع علاقائی جھگڑوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اختلاف کی ایک اور وجہ چین کی یہ خواہش ہے کہ افریقہ و ایشیا کی نوآزاد و نوخیز قومی ریاستیں روس کے بجائے چین کے دائرہ اثر میں رہیں۔

دنیا کے دوسرے ملکوں سے چین کے تعلقات ماؤ کے اُس "لچک دار" نظریے کے مطابق ہیں جو اس نے ۱۹۴۱ء میں پیش کیا تھا۔ "حملہ کرنا ہو تو مدافعت کرو، پیش قدمی کرنا ہے تو پیچھے ہٹو، گھیرا ڈالنے والی سپاہ پر حملہ کرنا ہو تو بازو سے حملہ کرو اور سیدھے نکل جانا ہو تو دائیں بائیں مڑتے گزر دو۔ یہ ساری باتیں کسی بھی واقعے یا تبدیلی کے عمل کے ناگزیر پہلو ہیں۔" لہذا اس کے معاہدوں کے قطعی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کی ہر چال کے پیچھے ایک پوشیدہ مطلب ہوتا ہے۔ یعنی جب بھی وہ پیچھے ہٹا ہو، تو اس لیے کہ اُسے آگے بڑھنا ہے۔

پیکنگ کی دغابازی سے امن کو خطرہ

اگرچہ چین میں اس وقت ایک نیا نظام حکومت قائم ہے لیکن چین ہے ایک بہت قدیم ملک جس کے بیرونی تعلقات کی طویل روایات ہیں۔ ماضی میں دوسرے ملکوں سے اُس کے دو طرح کے تعلقات ہوا کرتے تھے۔ جو اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے تھے انھیں خوش کیا جاتا تھا۔ جو کمزور ہوتے تھے یا مزاحمت کرتے تھے انھیں کچل دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ چین کا اور کوئی طریق کار نہ تھا۔ اپنی پوری طویل تاریخ میں چین نے کوئی دوست یا اتحادی نہیں بنایا کیونکہ وہ اپنے آپ کو ہر ملک سے بالاتر سمجھتا تھا اور دوستی تو ان میں ہوتی ہے جو ایک دوسرے کو اپنے برابر سمجھیں!

علیحدگی اور برتری کا یہ رجحان عالمی امن کے لیے خطرناک ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ وہاں ماؤ جیسا شخص برسر اقتدار ہو جس کی حکمت عملی کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اس نے خود اپنی پالیسی یوں بیان کی ہے۔ "دشمن آگے بڑھتا ہے ہم پیچھے ہٹتے ہیں۔ دشمن خندق کھودتا ہے ہم اُسے ہراساں کرتے ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے تو ہم اس پر حملہ کر دیتے ہیں اور جب اس کے پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں تو اس کا پیچھا کرتے ہیں۔



"ہمیں (چین کی) جارحانہ سرگرمیوں پر توجہ کرنا ہے، ہمیں صورت حال کی حقیقتوں کا سامنا کرنا ہے اور اپنی علاقائی سالمیت کو اگر پھر کوئی خطرہ پیدا ہو جائے تو اسے دُور کرنے کے لیے سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے اپنی دفاعی تیاریوں کو تیز تر کرنا ہے۔"

———— جواہر لعل نہرو

محمد عالمگیر خاں کیف

یونس حسنی

محمد عالمگیر خاں کیف سنہ ۱۲۶۹ھ مطابق سنہ ۱۸۶۰ء بمقام ٹونک پیدا ہوئے۔ والد کا نام جہانگیر خاں تھا۔ بچپن ہی میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بارہ سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ مروجہ ابتدائی تعلیم استاد آبرو سے حاصل کی۔ استاد آبرو ٹونک کے ایک ذی علم اور ہمہ داں بزرگ تھے۔ پہلوانی، خوش نویسی اور عالمانہ تبحر کے علاوہ بڑا اچھا شعری ذوق پایا تھا۔ پیر پنجہ شکن اور نادر رقم کے خطابات حاصل کیے تھے۔ شاعر تھے۔ ان کے مسلم الثبوت استاد ہونے کے لیے صرف یہی بات کافی ہے کہ وہ ٹونک میں "استاد" آبرو کے نام سے مشہور تھے۔ ہوسکتا ہے کہ کیف کے ذوقِ شعری کو پروان چڑھانے میں استاد آبرو کی ابتدائی تربیت کو بھی دخل رہا ہو۔ ویسے خود استاد آبرو نے بھی کیف کے جوہرِ شاعرانہ کی داد دی ہے۔ نوادرِ محمد آباد میں کیف کے بیان میں لکھتے ہیں :—

"انھوں (کیف) نے اگرچہ مُولف سے کچھ برائے نام پڑھا ہے مگر شعر گوئی میں اس قدر رنگ بڑھا ہوا ہے کہ ان کی طبیعتِ خداداد شعرا کے نزدیک قابلِ تحسین و داد ہے۔" (ص۱۴۲)

کیف کے ذوقِ شعری کو ہوا دینے والا دوسرا عنصر وہ ماحول تھا جس میں ان کی شاعری نے پر پرواز نکالے تھے۔ ان کی شاعری کی ابتدا کا زمانہ نواب ابراہیم علی خاں کی حکمرانی کے عروج کا دور تھا۔ نواب ابراہیم علی خاں سنہ ۱۸۶۷ء میں مسند آرائے ریاست ہوئے۔ اُس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ کیف صاحب کی عمر اس وقت سات سال کی رہی ہوگی۔ ابراہیم علی خاں کو بساطِ شعر و ادب بچھی بچھائی ملی تھی۔ ان کے پیش رو ان کے لیے گراں قدر ادبی تاریخ چھوڑ گئے تھے۔ بڑے بڑے اساتذۂ فن ریاست کے متوسلین میں رہے تھے۔ خود نواب ابراہیم علی خاں بڑے اچھے اور صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ ان کا غیر مطبوعہ دیوان ان کے صاحبزادے (ٹونک کے موجودہ نواب اسمٰعیل علی خاں صاحب، تاج) کے پاس موجود ہے۔ اسی شعری ذوق کا نتیجہ تھا کہ نواب ابراہیم علی خاں کا دربار بھی شعر و ادب کی محفلوں سے سجا رہا۔ گردشِ روزگار کے ستائے ہوئے استادانِ فن جب دہلی اور لکھنؤ کو خیرباد کہہ کر چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں پناہ گزیں ہوئے تو ریاست ٹونک نے بھی بہ قدرِ ظرف ان کی امداد کے لیے اپنے ہاتھ بڑھا دیے۔ یہی وجہ ہے کہ ٹونک میں لکھنؤ اور دہلی دونوں اسکولوں کے اساتذہ موجود تھے اور ٹونک کا رنگِ شاعرانہ دونوں مکاتبِ فکر کے حسین امتزاج سے عبارت ہے۔ اس دور میں بیرونی اساتذہ اور ان کے شاگردوں کے علاوہ ٹونک میں قابلِ قدر مقامی ہستیاں بھی موجود تھیں۔ ان لوگوں میں مندرجہ ذیل اصحاب خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ سید سعید احمد سعد، اصغر علی آبرو، امیر حسن خاں تنہا، جگن ناتھ پرشاد شاد، لالہ امراؤ لال تپش، سید عبدالرزاق حسنی کلامی، عالمگیر خاں کیف، محمد عمر خاں جام، صاحبزادہ احسان اللہ خاں احسان، بھائی جان عاشق وغیرہ۔ اس اجتماع کا نتیجہ یہ تھا کہ شعر و سخن کا مذاق عام ہوگیا تھا۔ جگہ جگہ مشاعرے ہوتے تھے۔ لکھنؤ اور دہلی کی چوٹیں چلتی تھیں اور ایک شاعر دوسرے سے

بازی لے جانے کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ مشاعروں میں شاگردوں کی فوج کے ساتھ اساتذہ تشریف لاتے اور جانب دارانہ داد، اعتراضات اور طلب سند کے مناظر مصحفی اور انشا کے لکھنؤ کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔

کیف صاحب کی پرورش اسی شاعرانہ ماحول میں ہوئی تھی اور وہ لکھنؤ اسکول سے متعلق تھے۔ نواب اسد لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ نواب صاحب نے عرصہ تک آپ کے کلام پر اصلاح کی۔ اور بالآخر اپنے ہونہار شاگرد کی شاعرانہ صلاحیتوں کی داد اس طرح دی کہ ۲ر جنوری ۱۹۱۵ء کو انھیں "امام الشعرا" کے لقب سے نوازا۔ جس سند کے ذریعے سے یہ خطاب انھیں دیا گیا تھا وہ مندرجۂ ذیل ہے:

"سعادت نشان جادو بیان میاں حافظ محمد عالمگیر خاں المتخلص بہ کیف زاد اللہ عمرہٗ۔

"بعد دعائے ترقی درجات کے معلوم ہو کہ تمھاری دونوں غزلیں بے عیب و بے مثال ہیں۔ اتفاق سے اس وقت ریاض اور بھائی سید وحید حسن وحید شاگرد امیر مرحوم و مغفور بھی موجود ہیں۔ تمھاری غزلوں کا داغ مرحوم و مغفور کی غزلوں سے مقابلہ کر کے دیکھا گیا لیکن تمھاری غزلوں کا لفظ تو کیا حرف بھی نہ اٹھ سکا۔ ماشاء اللہ "جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے" توبہ توبہ یہ لوگ کس کو ماننے والے ہیں۔ لیکن انصاف نے مجبور کر دیا۔ بعد مشورہ یہی لقب مناسب سمجھا گیا لہٰذا آج ہم تم کو "امام الشعرا" کے لقب سے ملقب کر کے مبارکباد دیتے ہیں اور بھائی سید وحید حسن اور ریاض دونوں تائید کرتے ہیں۔ ۲ر جنوری ۱۹۱۵ء

راقم فدوی معذار نواب سلیمان خاں اسد لکھنوی"

غزل جس پر نواب صاحب نے کیف کو "امام الشعرا" کا لقب عطا کیا تھا اس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ یہ غزل داغ کی مشہور زمین میں کہی گئی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

مطلب کی چھیڑ ان سے یہاں ہے سخن سخن میں	سچ یہ کہ داغ پرفن یکتا ہے اپنے فن میں
ہے لطف دشت گردی میرے سخن سخن میں	کانٹے ہیں کچھ زباں میں چھالے ہیں کچھ بدن میں
اس داغ دار دل میں جو غم ہے شادماں ہے	پھولے پھلے ہوئے ہیں کانٹے مرے چمن میں
میں مرغ مضطرب ہوں وہ سوختہ مقدر	آتی ہے آگ لینے بجلی مرے چمن میں
صحرا نوردیوں نے چھلنی بنا دیا ہے	پیوستہ ہو گئے ہیں کانٹے مرے بدن میں

ریاست کوٹہ کے ایک عظیم الشان جلسہ میں کیف صاحب کے ایک حریف ہم عصر فتنہ عباسی نے ۳ر اگست ۱۹۲۰ء کو کیف کے کمال فن کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدے کے عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیف، امیر مینائی کے بھی شاگرد رہے ہیں۔ قصیدے کا عنوان یہ ہے۔

"قصیدہ در شان سعادت نشان فضیلت مآب، بلبل بوستان فصاحت، طوطی شکرستان بلاغت، دوست صادق، محب واثق، رشک سودا و میر، فخر امیر و اسیر، امام الشعرا، صاحب قلم والسیف جناب حافظ محمد عالمگیر خاں صاحب المتخلص بہ کیف، شاگرد نا بار جہاں لا والا دو شاگرد رشید و باعث افتخار جناب اسد و امیر فخر روزگار و مشہور ہر دیار و اعصار زاد عنایتہ"۔

اس عنوان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیف، اسد لکھنوی کی طرح امیر مینائی کے بھی شاگرد تھے۔ لیکن نواب اسد لکھنوی کے ۱۹۱۵ء کے جس خط کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں، انھوں نے امیر کا ذکر مرحوم کی حیثیت سے کیا ہے۔ اس سے یہ گمان حقیقت میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ کیف نے پہلے امیر مینائی سے اصلاح لی اور ان کے وفات پا جانے یا نواب اسد لکھنوی سے قرب ہو جانے کی وجہ سے ان سے رجوع کیا۔ نواب اسد صاحب ایک عرصے تک ٹونک میں مقیم رہے۔ نواب محمد علی خاں کے عہد حکومت (۱۸۶۴ء تا ۱۸۶۷ء) میں وہ ٹونک تشریف لائے اور ملازمت حاصل کر کے واپس چلے گئے۔ چند سال بعد صاحبزادہ عبید اللہ خاں کی دعوت پر پھر ٹونک تشریف لائے اور صاحبزادہ موصوف اور بہت سے دوسرے افراد اس زمانے میں ان کے شاگرد ہوئے۔ پولیٹکل ایجنٹ مسٹر نیو کے زمانہ ایجنسی میں تخفیف میں آ گئے۔ لیکن جنوری ۱۸۹۴ء میں نواب ابراہیم علی خاں کے مشیر سخن مقرر ہوئے[1] اور پھر اگست ۱۸۹۶ء میں بہ عہدہ وکالت ایجنسی بھوپال سیہور میں مامور ہوئے[2]۔

بہرحال کیف پر امیر مینائی کا اثر نہیں معلوم ہوتا جب کہ اسد لکھنوی کے اثرات واضح اور نمایاں ہیں۔ اس سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ انھیں امیر مینائی سے بہت تھوڑے عرصہ تک تلمذ حاصل رہا۔ یہ اسد لکھنوی کی ہی صحبت کا نتیجہ تھا کہ کیف پر لکھنویت غالب رہی۔

---

[1]، [2] تاریخ محمد آباد از اصغر علی آبرو ص۱۲۱

ان کے ہم راہ انھیں مشاعروں میں لکھنؤ جانے اور وہاں قیام کرنے کا موقع ملا۔ لکھنؤ کے دوران قیام میں ان کی زبان بڑی حد تک منجھ گئی اور بالآخر وہ ایک مسلّم الثبوت استاد اور زبان داں تسلیم کئے جانے لگے۔ اپنی زبان دانی کے اس سرچشمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رہا ہوں کیفؔ فرنگی محل کے محلوں میں یونہی تو آئی ہے اردو کی بول چال مجھے

اسی کے ساتھ وہ اپنی زباں دانی پر بھی بار بار فخر کرتے ہیں ؎

اے کیفؔ لکھنؤ کی زباں مستند ہے آج شہرے خدائی بھر میں ہماری زباں کے ہیں
چست بندش، نئے مضمون، زبان ٹکسالی کون سا لطف بیاں کیفؔ کے دیوان میں ہے
آج یوں ملک سخن پر ہے حکومت کیفؔ کی جس طرح دلّی پہ کل قبضہ تھا عالمگیر کا

زباں دانی اور قدرت کلام کا یہی احساس تھا جس نے ان سے اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہلوائیں۔ چنانچہ ان کے غیر مطبوعہ دیوان کا تین چوتھائی حصہ مستند شعرائے دلّی کی زمینوں میں طبع آزمائی پر مشتمل ہے۔ سب سے زیادہ غزلیں انھوں نے داغؔ کی غزلوں پر کہی ہیں۔ دلّی اور لکھنؤ کی چشمک کا یہ بھی ایک انداز تھا۔ لیکن انھوں نے داغؔ کی استادی کو ہمیشہ تسلیم کیا ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

اس طرز اس روش کا جادو بیاں شاعر یا کیفؔ ٹونک میں ہے یا داغؔ تھا دکن میں

اس شعر میں داغؔ کی استادی کا اعتراف بھی ہے اور اپنی عظمت کا احساس بھی۔ پہلی نظر میں یہ شعر بالکل ایک شاعرانہ تعلّی نظر آتا ہے لیکن جب داغؔ اور کیفؔ کے ہم زمین اشعار کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ کیفؔ نے اپنے آپ کو داغؔ کی صف میں کھڑا کر کے اپنی حدود سے تجاوز نہیں کیا ہے۔ ذیل میں دونوں کے کچھ ہم قافیہ اشعار پیش کیے جا رہے ہیں۔

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں (داغؔ)
مانوس نگہ حسن سے کھٹکے فغاں کے ہیں پھولوں میں تل رہے ہیں یہ تنکے کہاں کے ہیں (کیفؔ)
کھلتے نہیں ہیں راز جو سوز نہاں کے ہیں کیا پھوٹنے کے واسطے چھالے زباں کے ہیں (داغؔ)
لکنت سے اور حسن تمھارے بیاں کے ہیں گویا سخن کے پاؤں میں چھالے زباں کے ہیں (کیفؔ)
غصہ بھی آنکھ میں رہا پیار کی طرح اب کیا ہے دیکھنے کو تمھاری نگاہ میں (کیفؔ)
اب میری آنکھ تمھیں کیوں کر دکھائی دے دشمن سما گیا ہے تمھاری نگاہ میں (داغؔ)

داغؔ کے ہاں جلوہ گاہ کا قافیہ نہیں ہے کیفؔ نے اس میں بڑا استادانہ شعر نکالا ہے ؎

لب بند، گم حواس، تحیر نگاہ میں تصویر بن گیا ہوں تری جلوہ گاہ میں (کیفؔ)

کچھ اور شعر ملاحظہ کیجیے ؎

نہ بصارت، نہ اشارت، نہ خجالت، نہ حیا تجھ میں تو دیکھنے کو دیدۂ تر کچھ بھی نہیں (داغؔ)
یہی رونا ہے کہ رونے میں اثر کچھ بھی نہیں دیکھنے کے ہیں فقط دیدۂ تر کچھ بھی نہیں (کیفؔ)
رات بھی رات کا مہماں ہے مریض ہجراں صبح تم آئے تو کیا آئے سحر کچھ بھی نہیں (داغؔ)
ولولے جوش جوانی کے کہاں پیری میں رات کی رات کا میلہ ہے سحر کچھ بھی نہیں (کیفؔ)
باغ میں گل کھلے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں انگلیاں سرو اٹھاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں (داغؔ)
آنے والے کو تو آنے کی خبر تک بھی نہیں کہنے والے کہے جاتے ہیں کہ وہ آتے ہیں (کیفؔ)
دل و جاں پاس سے جاتے ہیں چلے جاتے ہیں صبر و ہوش و خرد آتے ہیں کہ وہ آتے ہیں (داغؔ)
کوئی آیا ہوا دھوکے شب وعدہ لیکن ڈھنگ ایسے نظر آتے ہیں کہ وہ آتے ہیں (کیفؔ)
بزم اغیار کا نظارہ ہے اثر آنکھوں پر مہرباں آپ کی خفت مرے سر آنکھوں پر (داغؔ)
ہجر میں ان کا خیال آئے کہ رونا آئے کوئی مہماں ہو آئے مرے سر آنکھوں پر (کیفؔ)
مے خانے کے قریب تھی مسجد بھلے کو داغؔ ہر ایک پوچھتا ہے کہ حضرت ادھر کہاں (داغؔ)
گھر ہے یہ مجھ غریب کا دشمن کا گھر کہاں جاتے تھے کس طرف نکل آئے ادھر کہاں (داغؔ)
پھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے (کیفؔ)
ہوئی دیر اتنی کہاں آتے آتے کہاں رہ گئے تھے یہاں آتے آتے (داغؔ)

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کیفؔ لکھنؤ اسکول سے متعلق تھے وہاں کی تراش خراش، الفاظ کی نزاکت، انداز بیان کے رکھ رکھاؤ وغیرہ کا وہ خیال رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں معاملہ بندی بھی ملتی ہے لیکن اس معاملہ بندی میں ابتذال کم اور ایک لطیف چھیڑ چھاڑ زیادہ پائی جاتی ہے۔ چند اشعار پیش ہیں ؎

تم سامنے آ کر بھی سمجھنا کہ ہے پردہ ہم دیکھ کے کہہ دیں گے کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا
محفل میں تم یاؤں مرے کیوں نہ بھول جائیں وہ اٹھ گئے ہیں پاؤں مرا کیوں دبا کے ہاتھ
سکتے میں دیکھ کر مجھے درباں سے یوں کہا در پر کھڑا ہے کون یہ دیوار کی طرح
وعدۂ وصل پہ یوں بھی تو وہ کہہ دیتے ہیں بھول جانا مری عادت ہے ذرا یاد رہے

اوائل ۱۹۱۰ء میں جب معاشی پریشانیوں نے اُن کی زندگی اجیرن کر دی تو کیفؔ مجبور ہو گئے اور یہ کہہ کر کہ

ٹونک سے اب کہیں چل دے کیفؔ بے چلے کام چل نہیں سکتا

ٹونک سے چل پڑے۔ لیکن ان کو زیادہ دور نہیں جانا پڑا۔ ان کے وطن

ٹونک کے قریب ہی جھالا وار پاٹن کی چھوٹی سی ریاست تھی جس کے حکمراں اس وقت مہاراجہ بھوانی سنگھ تھے۔ یہ بڑے قدر شناس اور علم دوست حکمراں تھے۔ انھوں نے کیف کو ہاتھوں ہاتھ لیا، انھیں درباری شاعر کا اعزاز عطا کیا اور ان کی عزت و احترام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ کیف آزاد منش انسان تھے۔ مہاراجہ بھی مزاج داں اور مردم شناس آدمی تھے۔ انھوں نے کیف پر کوئی پابندی عائد نہیں کی یہاں تک کہ حاضری دربار کے لئے بھی کوئی قید نہیں تھی۔ جب جی چاہتا حاضر ہوتے ورنہ گھر پڑے رہتے۔ ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ عرصۂ دراز تک حاضر دربار نہ ہو سکے حالانکہ قیام پاٹن ہی میں رہا۔ پھر جب آئے تو مہاراجہ نے صرف یہ کہا: "کیا کیف بھگون جھالا واڑ ہی میں ہیں؟" (کیف کو مہاراجہ تمام عمر کیف بھگون کہہ کر مخاطب کرتے رہے) اس جملے میں اشتیاق، محبت اور شکوے کا لطیف امتزاج ہے۔ مگر درباروں میں سازشیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں۔ کسی درباری نے کیف سے کہہ دیا کہ اس جملے کا مقصد شکوہ شکایت نہیں بلکہ طنز تھا اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو جھالا واڑ چھوڑ دینا چاہیے۔ کیف صاحب کی طبع آزاد نے اس کے بعد پاٹن میں رہنا گوارا نہ کیا اور چند ہی روز بعد ایک قطعہ کہا اور اسے سر دربار مہاراجہ کے سامنے پڑھا تاکہ جانے کی اجازت مل جائے۔ پورا قطعہ نقل کرنے کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے اس لئے چند آخری اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

محض آزادی غرض ہے اور یہی ارمان بس — رہ چکا ہے کیف جھالا واڑ میں بارہ برس
رنگ آزادی تو ہے بچپن ہی سے میرا شعار — دل اگر میرا تجھے چھوڑے تو ہیں تقصیر وار
اب تو رت جا مجھ کو نہ کچھ زر چاہیے — اب تو پینے کے لئے خواجہ کا لنگر چاہیے
پی کے لنگر یوں کہے گا پھر یہ کیف خوش گو — یا خدا راجہ بھوانی سنگھ پر بھی رحم ہو

اس قطعہ میں مہاراجہ نے کیف کے تاثرات پڑھ لئے۔ آبدیدہ ہو کر بولے "کیا کیف بھگون زندگی ہی میں مجھے چھوڑ جائیں گے؟" اس جملے پر کیف کو اپنی غلط فہمی کا احساس ہوا۔ فوراً بولے: "نہیں مہاراج ایسا کبھی نہیں ہوگا" اور ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کیف نے مہاراجہ بھوانی سنگھ کی زندگی میں جھالا واڑ کبھی نہیں چھوڑا۔ انھیں بہتر مواقع ملے، دکن سے کئی بار بلاوا آیا۔ لیکن ان کی وضع شعاری اور فطری استغنا نے گوارا نہیں کیا کہ وہ پاٹن چھوڑ کر دکن کا رُخ کریں۔ وہ کہہ اٹھے ؎

عزت افزائی کی خاطر کیف کیوں جاتا دکن — قدرداں راجہ بھوانی سنگھ جب پاٹن میں ہے

کیف صاحب بڑے زود گو تھے۔ حکیم اجمل خاں صاحب سے خصوصی مراسم تھے۔ دہلی جاتے تو وہیں قیام کرتے۔ حکیم صاحب نے داغ کی مشہور زمین

بھرے راہ سے وہ یہاں آتے آتے — اجل مر رہی تو کہاں آتے آتے

میں شعر کہنے کی فرمائش کی۔ کیف نے چند منٹ میں غزل کہہ دی۔ یہ غزل کیف کی بہترین اور کامیاب ترین غزلوں میں سے ہے۔ اس کے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں ؎

لگی دیر اتنی کہاں آتے آتے — کہاں رہ گئے تھے یہاں آتے آتے
نہیں روز آتے تھے اپنی خوشی سے — نہیں رک گئے مہرباں آتے آتے
ابھی چال ان کی نہیں آئی تجھ کو — یہ آئے گی اے آسماں آتے آتے
بلاتے جو تم اپنی محفل میں ہم کو — تو ہم کیا نہ آتے وہاں آتے آتے
نہیں سہل اے کیف دشوار ہے یہ — کہ آتا ہے حسن بیاں آتے آتے

کیف مشاعروں میں شرکت کے لیے دوسرے شہر جاتے رہتے۔ بمبئی کے ایک مشاعرے میں انھوں نے ایک غزل پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں ؎

کشش الفت کی تربت پر انھیں بعد فنا لائی — یہ جب لاتی تو کیا ہوتا کہ یہ لائی تو کیا لائی
نہ دم بھر چین لغزشوں سے نہ مٹا سر اٹھانے کی — زمیں اک فرش کا نشتر کا فلک اک قہر بالائی
اگر بدلے تو دنیا بھر کی اس سے زندگی بدلے — کہ مرنے کے لئے جس کو تیرے در پر قضا لائی
ملے ہیں خاک میں ارماں ہمارے دل میں آ آکر — یہاں کی جس کی مٹی تھی وہیں اس کی قضا لائی
ہم اپنی شعر گوئی کا تماشہ کل دکھا دیں گے — اگر اے کیف نسیم ادھر طبع رسا لائی

اس غزل نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ عطیہ فیضی کی بھاوج زہرہ بیگم جو ریاست جنجیرہ کی حکمراں تھیں اس مشاعرے میں موجود تھیں۔ (جنجیرہ بمبئی کے قریب ایک جزیرے پر آباد ہے۔) مشاعرے کے بعد وہ بمبئی میں کیف کی قیام گاہ پر پہنچیں۔ انھیں اپنے گھر لے آئیں۔ دو تین دن بعد ہی انھیں تین سو روپیہ ماہانہ وظیفے کے وعدہ پر اپنے ساتھ جنجیرہ لے گئیں۔ لیکن کیف کا وہاں بالکل جی نہیں لگا اور وہ تین دن بعد ہی بغیر اطلاع دیئے وہاں سے جھالا واڑ بھاگ آئے۔

کئی سال بعد زہرہ بیگم جھالاواڑ آئیں۔ مہاراجہ نے ان کی تفریحِ طبع کے لئے مجلسِ غنا منعقد کی۔ جھالاواڑ کی مشہور مغنیہ ننی بائی نے بیخود دہلوی کی یہ غزل پڑھنا شروع کی۔

یار بدخو، آسماں دشمن، زمانہ برخلاف　　یہ مصیبت سہ سکے جانِ حزیں اتنی نہیں
دل کو کچھ رنج کا ہے کچھ تم آ گئے ہنسنے سے باز　　تجھ کو بھی زیبا ستم گر اب نہیں اتنی نہیں

بیگم صاحبہ یہ غزل سن کر بہت لطف اندوز ہوئیں۔ مہاراجہ نے ان کی دلجوئی کے لئے چاہا کہ اسی زمین میں ایک غزل اور ہو جائے۔ کیف صاحب کو ایک طرف بلوا کر ان سے پوچھا "کیف جگنو! غزل کیسی ہے؟" کیف نے کہا "خوب ہے"۔ مہاراجہ نے فرمایا "پھر؟" کیف سمجھ گئے۔ عرض کیا "مہاراج ابھی بس غزل ختم ہونے پر اسے ایک بار اور پڑھوا دیجیے"۔ غرض ننی بائی نے جب تک دوسری بار غزل ختم کی کیف نے غزل کہہ دی اور تضمین بھی کر دی۔ کئی بندوں پر مشتمل یہ تضمین بڑی کامیاب رہی۔ چند بند ملاحظہ ہوں ؎

نازِ ستوں، ادا بیباک آنکھوں میں خمار　　وہ بناوٹ کی حجابِ ادا، یہ طلب بے اختیار
اس طلب پر جان صدقے اس ادا پر دل نثار　　مانگنے بھی جاتے ہیں ساغر پہ ساغر بار بار
اور یہ بھی کہتے جاتے ہیں نہیں اتنی نہیں

منفعل آنکھیں چھپائے بھی چھپ سکتی نہیں　　ہم نے شرمانے کی باتیں جان لیں پہچان لیں
کھائیے دھوکا نہیں یہ ہو گیا ہم کو یقیں　　لیجئے ہم غیر سے یہ اس سے پہلے ملتی نہیں
ورنہ شرمیلی نگاہیں شرمگیں اتنی نہیں

اور جب وہ مقطع پر آئے ؎

یاالٰہی اس سے دونا چوگنا ہو اس کا راج　　اتنی چھوٹی سی ریاست پہ یہ شاہانہ مزاج
ہو اسی راجہ کے دم سے قدردانی کا رواج　　قدرداں راجہ بھوانی سنگھ ہو جتنا کہ آج

کیف قدر شعرگوئی اب کہیں اتنی نہیں

تو زہرہ بیگم چونک پڑیں اور پوچھا "کون ہے کیف، کہاں ہے؟"۔ مہاراجہ نے کیف کو بلا بھیجا جب وہ سامنے آئے تو بولیں "اچھا یہ ہیں جگنو سے کیف!" اور پھر سارا قصہ مہاراجہ کو خود ہی سُنا دیا۔

• کیف کی انہیں شاعرانہ اداؤں کا کرشمہ تھا کہ جب تک مہاراجہ بھوانی سنگھ زندہ رہے کیف جھالاواڑ ہی سے وابستہ رہے۔ مہاراجہ کی وفات کے بعد ٹونک چلے آئے مگر ٹونک آنے کے بعد ہی سخت بیمار ہوئے۔ فالج کا حملہ ہوا۔ ۱۹۴۷ء میں جب مہاراجہ بھوانی سنگھ کے صاحبزادے مہاراجہ راجیندر سنگھ کرکٹ ٹورنامنٹ دیکھنے ٹونک آئے تو کیف کے گھر گئے اور انہیں علاج کی غرض سے جھالاواڑ لے گئے۔ وہیں ۱۶ مئی ۱۹۴۸ء کو کیف نے اپنے قدرداں کا حق اس طرح ادا کیا کہ جھالاواڑ کی زمین کو آسمان سے زیادہ مقدس و محترم خیال کرتے ہوئے اپنے آپ کو اسی کے سپرد کر دیا۔

کیف کو غزل کے علاوہ دوسرے اصنافِ سخن پر بھی قدرت کاملہ حاصل تھی مگر نعت نگاری ان کا خاص میدان تھا۔ ان کے نعتیہ کلام کا مجموعہ وسیلہ شفاعت کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ نعت کے علاوہ قصیدہ، رباعی اور قطعہ وغیرہ اصناف پر بھی وہ حاوی تھے۔ ایک مقام پر کہا ہے ؎

کرم ہے اس کے اصنافِ سخن پر کیف قادر ہے
نہ یہ کام ایسے ویسے کا نہ یہ منھ ہر غزل خواں کا

فنِ عروض کے بھی بڑے ماہر تھے۔ اس کے علاوہ اپنے زمانے کے مروجہ فنون پر بھی انھیں مہارت حاصل تھی۔ صاحبِ سیف تھے اور لکڑی کے ہاتھ خوب جانتے تھے۔ ایک شعر میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے۔



"میں تمام لوگوں کو یہ پھر بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہماری آزادی کو ابھی تک خطرہ درپیش ہے۔ ہر ہندوستانی کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ اپنی آزادی کی حفاظت کرے۔"

——— جواہر لعل نہرو

فن کار

عزیز وارثی

میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف
میری فطرت بھی حسین میرا تخیئل بھی شریف
خوبیاں ہیں یہ مری روزِ ازل سے لیکن
میری تخلیق ہے سموم فضاؤں کی حریف
میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف

چاک دل چاک گریبان پہ احسان کیا
اپنے سر اپنے رفیقوں کا ہر الزام لیا
مجھ سے اُلفت کے عوض جس نے بھی نفرت کی ہے
اُس ستم کیش کو پھر دہر میں جینے نہ دیا
میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف

اپنے گلشن سے ازل ہی سے عقیدت ہے مجھے
غنچہ و گل سے محبت تھی محبت ہے مجھے
ماؤسی تنگ کی دھرتی ہو کہ چاؤ کا نظام
کل بھی نفرت تھی مجھے آج بھی نفرت ہے مجھے
میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف

میں نے اُس وقت بھی نغموں ہی سے للکارا تھا
جب مرے دیش پہ قبضہ تھا ستمگاروں کا
میرے گیتوں کی دھڑکنے سے دہل جاتا تھا
دل ستمگاروں کا اُس دَور کے غدّاروں کا
میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف

دشمنِ ہند کو یہ آج بتانا ہے مجھے
پاک دھرتی پہ ہوں ناپاک قدم ناممکن
تو وہ انساں ہے کہ جس کا کوئی مشرب ہی نہیں
تجھ کو اپنائیں مرے دیر و حرم ناممکن
میں ہوں فنکار مرا فن ہے بہر طور لطیف

خون دو

(رکت دان تحریک سے متاثر ہوکر)

جرار چھولسی

ظلمتِ فتنۂ دوراں کے مٹانے کے لیے
خون دو خون چراغوں میں جلانے کے لیے

خون دو خون ترقیِ وطن کی خاطر
خون دو رنگ زمانہ پہ جمانے کے لیے

خون دو خون کہ بیدار ہو انساں کا شعور
خون دو جذبۂ احساس بڑھانے کے لیے

خون دو آبروئے گنگ و جمن کی خاطر
خون دو اک نئی تقدیر بنانے کے لیے

خون دو خون تمھیں خونِ شہیداں کی قسم
خون دو انجمن عشق سجانے کے لیے

لالہ و گل کی جوانی پہ نکھار آنے دو
خون دو شوخیِ گلزار بڑھانے کے لیے

ایک ہونے دو امیروں کا غریبوں کا لہو
خون دو شہر مساوات بسانے کے لیے

مٹنے پائیں نہ اجنتا و ایلورا کے نقوش
خون دو عظمتِ فن کار بچانے کے لیے

داغ کچھ دامن تاریخ پہ آتے ہیں نظر
خون درکار ہے داغوں کو چھپانے کے لیے

وزیر اعظم نے ریہاند بجلی گھر کا افتتاح کیا اور ریہاند اور ماتا ٹیلہ پروجیکٹوں سے پیدا ہونے والی بجلی کی تقسیم کے بارے میں اترپردیش اور مدھیہ پردیش کی حکومتوں کے درمیان معاہدہ کی تکمیل ہوئی۔ ہردوا گنج توسیعی پروجیکٹ مرحلہ اول کے تحت ۳۰۔۳۰ ایم۔ ڈبلیو کی بجلی پیدا کرنے کی یونٹوں میں کام شروع کیا گیا۔

ہنگامی حالت کے پیش نظر مالگزاری پر زائد ٹیکس عائد کرنے سے متعلق ریاستی قانون ۱۹۶۲ء پاس کیا گیا جس کے تحت حکومت کو کسی کھاتہ دار پر واجب الادا مالگزاری کا ۲۵ فی صدی بطور زائد ٹیکس عائد کرنے کا اختیار دیا گیا۔ علاوہ ازیں یو۔پی دریہہت جوت کر ادھنیم بھی منظور کیا گیا۔ اس کے تحت حکومت کو ۳۶۰۰ روپیہ سے زیادہ مالیت کی ۳۰ ایکڑ سے زیادہ تمام جوتوں پر ٹیکس لگانے کا اختیار دیا گیا۔

زیر نظر سال میں ۱۲ سالہ نیشنل ڈیفنس سرٹیفکٹوں میں ۱۳۸۵۳۶۰۰۰ روپیہ ۱۰ سالہ ڈیفنس سرٹیفکٹوں میں ۷۱۹۶۰۰۰ روپیہ اور بلا سود والے انعامی بانڈوں نیز پریمیم بانڈوں میں ۳۸۵۷۰۰۰ روپیہ لگایا گیا۔ قومی دفاعی فنڈ میں ۱۶۷۴۰۱ گرام سونا کے علاوہ ۶ کروڑ روپیہ سے زیادہ کے رضاکارانہ عطیے موصول ہوئے۔

زیر نظر مدت میں ۱۴ شہری علاقوں میں خاتمۂ زمینداری ایکٹ نافذ کیا گیا اور جوتوں کی انتہائی حد کے تعین سے متعلق ریاستی قانون کے تحت ۲۸۵۵۹ ایکڑ فاضل زمین کے مالکانہ حقوق حکومت کو منتقل ہو گئے۔ علاوہ ازیں علی گڑھ کے سنٹرل ڈیری فارم کی نو تنظیم کی گئی۔ فوجیوں کو انڈے سپلائی کرنے کے لیے ایک اسکیم شروع کی گئی۔ پولٹری کی ترقی کے لیے لکھنؤ میں ایک مرکز کھولا گیا اور مصنوعی تولید کے ۵۰ مرکز قائم کیے گئے۔

اترپردیش میں ۷۰۰۰ مواضعات کی سطح بلند کرنے نیز ۱۰۶ شہروں اور ۲۲۴۵۶ لاکھ ایکڑ کے رقبہ کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے محفوظ کرنے کے لیے ۷۶ کروڑ روپیہ کی لاگت کا ایک ماسٹر پلان بنایا گیا۔ زیر نظر مدت میں چار ہزار خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے قیام کا نشانہ پار کر لیا گیا۔

ضلع مجسٹریٹوں کو یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ خاندانوں کو شمار کرنے اور کثیر مقصدی شناختی کارڈوں کی تیاری اور تقسیم کا کام شروع کر دیں تاکہ ضرورت پڑنے پر اناج اور دیگر اشیاء کی تقسیم پر کنٹرول عائد کیا جا سکے۔ یو۔پی شوگر ڈیلرس لائسنسنگ آرڈر ۱۹۶۲ء کے تحت شکر کی فروخت یا فروخت کے لیے شکر کا ذخیرہ جمع کرنے کے لیے لائسنس لینا ضروری قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں مٹی کے تیل کے تھوک اور ریٹیل بیوپاریوں کے لیے بھی لائسنس لینا ضروری کر دیا گیا۔

اترپردیش میں (ناؤ اور اتراکھنڈ ڈویژن کے ضلعوں کو چھوڑ کر) بقیہ تمام ضلعوں میں ۲۰ جون ۱۹۶۳ء سے ضلع پریشدیں قائم کی گئیں۔

حکومت نے کھنشی کا تالاب کے تربیتی اور پیداواری مرکز کو اپنے انتظام میں لے لیا۔ چمولی، اترکاشی، پتھوراگڑھ، ٹہری گڑھوال اور پوڑی گڑھوال کے لیے ایک علیحدہ پولیس رینج قائم کیا گیا۔ اور کچھ زمروں کے پولیس عملہ کی تنخواہوں پر نظر ثانی کی گئی۔

زیر نظر مدت میں اتراکھنڈ اور کمایوں ڈویژنوں کو چھوڑ کر اترپردیش بھر میں انتظامیہ کو عدلیہ سے علیحدہ کرنے کی اسکیم زیر عمل رہی۔ علاوہ ازیں ۳۶ ایکٹ منظور اور پانچ آرڈیننس نافذ کیے گئے۔

زیر نظر سال میں مزید راستوں پر سرکاری بسیں چلانے کی اسکیم بنائی گئی جن کی مجموعی لمبائی ۲۰۰ میل ہے۔ کانپور میں سٹی بس سروس شروع کی گئی اور آگرہ اور دہلی کے درمیان ائیر کنڈیشنڈ آرام دہ بس سروس جاری کی گئی۔ وزیر اعظم نے بنارسی باغ لکھنؤ میں ریاستی عجائب گھر (میوزیم) کی نو تعمیر عمارت کا افتتاح کیا۔ حکومت نے یکم اپریل ۱۹۶۳ء سے وگیان مندروں کو اپنے انتظام میں لے لیا۔ وگیان مندروں کے قیام کا مقصد عوام میں سائنس کی اہمیت کا احساس پیدا کرنا ہے۔

اترپردیش کے ۱۷ ضلعوں میں دو کروڑ ۷۰ لاکھ کی آبادی کو چیچک سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا گیا۔ پراونشل ویکسین انسٹی ٹیوٹ نے ہیضہ کی ویکسین پیدا کرنے کی صلاحیت ۲۰ لاکھ ڈوز سے بڑھا کر ۵۰ لاکھ ڈوز کر دی۔ فیض آباد اور دہرہ دون میں بلڈ بینک قائم کیے گئے اور خاندانی منصوبہ بندی کے لیے ۲۰۰ دیہی، ۱۵ شہری

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۵ پر)

مراسلات و توضیحات

انشا کے دو اشعار کا عروضی تجزیہ

نیا دور مئی ۱۹۶۳ء میں میرا ایک مضمون "ریختی اور انشا" شائع ہوا تھا۔ جولائی ۱۹۶۳ء کے نیا دور میں شعور بلوی صاحب نے ایک مراسلے میں اس کے چند بیانات سے اختلاف کیا ہے۔ مراسلے کے جزوِ اوّل کے بارے میں سردست میں کچھ نہیں کہنا چاہتا سوا اس کے کہ جان صاحب کے علاوہ لکھنؤ میں دوسرے ریختی گو شعرا بھی ہوئے ہیں چنانچہ امجد علی خاں عصمت اور مہراتن ریختی میں جان صاحب کے خلاف معرکہ آرا رہتے تھے۔ میر احمد علی نسبت بھی غالباً لکھنؤ کے باشندے تھے۔ اس کے برعکس مرزا فرحت اللہ بیگ نے نازنین کے لیے لکھا ہے کہ "دہلی میں بس یہی ایک ریختہ گو ہیں۔"
(دلی کا ایک یادگار مشاعرہ)

میں نے اپنے ایک مضمون میں انشا کے دو اشعار کا عروضی سقم ظاہر کیا تھا ان پر تبصرہ کرتے ہوئے شعور صاحب لکھتے ہیں: "ایسے استعمال کو ناجائز قرار دینا فنِ عروض کے ضابطوں سے بے خبری ظاہر کرنے کے برابر ہے۔" دیکھا جائے کہ فنِ عروض کے ضابطوں سے بے خبری کون ظاہر کرتا ہے۔

شعور صاحب نے اعتراض کرنے سے قبل میری تحریر پر غور نہیں کیا۔ میں نے انشا کے جن اشعار کو خارج از بحر ٹھہرایا تھا وہ فرد نہیں غزل کے شعر ہیں۔ اُنھیں پوری غزل کے وزن کا ساتھ دینا ہے۔ محض ایک شعر یا ایک مصرع کو کسی بحر میں موزوں ثابت کرنا بے سود ہے۔ میں نے دونوں اشعار کے بارے میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ ان کی پوری غزل فلاں وزن میں ہے۔ شعور صاحب میرے اس بیان کو نظر انداز کر گئے۔ اگر وہ اس سے متفق نہ تھے تو 'رنگین انشا' نکال کر پوری غزل پر ایک نظر تو ڈال لیتے۔ میں ان کے ملاحظہ کے لئے پوری غزل نقل کرتا ہوں۔

پہلا شعر جس غزل کا مطلع ہے وہ یہ ہے۔

یہ کیا تجھے ہے خواہی نہ خواہی — مجھ سے بکنا واہی تباہی
اگیا دَدَا کی تب تو بنے ایک — ساری کی ساری جب ہووے لاہی
طوفان تم نے مجھ پر جو باندھا — کوئی بھی دے گا اس کی گواہی
میری بدی میں جو کوئی ہووے — اس سے سمجھ لے تو ہی الٰہی
دشمن جو میری تھی اک جنی وہ — از غیب آئی اس پر تباہی
ہم نے نباہی تم سے تو پیارے — لیکن نہ تم نے مطلق نباہی
انشا نے بھی اب تلوار باندھی — کیا خوب اے واہ ایسا سپاہی

اہلِ نظر ملاحظہ کریں کہ کیا یہ غزل بالخصوص خط کشیدہ مصرعے کسی طرح کھینچ تان کر بھی بحرِ متقارب اثرم (فعْلُ فعولن فعْلُ فعولن) میں تقطیع کیے جا سکتے ہیں۔ شعور صاحب نے ایک غیر متعلق وزن کی شرح میں نجم الغنی کی بحر الفصاحت سے کالم کے کالم نقل کر دئیے۔ جب یہ مسلم ہے کہ اس غزل کا وزن متقارب مثمن اثلم یعنی فعْلُن فعولن فعْلُن فعولن ہے تو مطلع کے دوسرے مصرع کا رکنِ ثانی صریحاً وزن سے خارج ہے۔

دوسری غزل یہ ہے۔

نظر آویں ہیں اسمیں پڑھنے کے گُن — جسے کھیل میں بھی لگی ہو یہ دُھن
الف دو زبر اً دو زیر اِ دو پیش اُ — سو نامِ خدا بگما ہے اری سُن
سنی تھی کسی سے جو بحرِ تقارب — اسے کر لیا گھنگھروؤں کا تھنن
کہ تو لے ہے اپنے سبق پر یہ کہہ کر — فعولن فعولن فعولن فعولن
کرم آم ایسے یہ تینوں کہ انشا — تصدق ہوان پر طنبورے کی تُن تُن

شعور صاحب لکھتے ہیں "عروضی کلیے کے اعتبار سے اس بحر کے عروض و ضرب یعنی مصرعۂ اولیٰ و ثانی کے رکنِ آخر میں رکنِ سالم فعولن یا رکنِ مقصور فعول یا رکنِ محذوف فعَلْ ہر طرح استعمال ہوتے ہیں۔ ایسے استعمال کو ناجائز قرار دینا فنِ عروض کے ضابطوں سے بے خبری ظاہر کرنے کے برابر ہے۔" شعور صاحب کا ماخذ بحر الفصاحت (مطبوعہ ۱۹۵۷ء ص ۲۲۰) ہے جس میں لکھا ہے کہ "اجتماع قصر و حذف کا ایک شعر میں درست ہے" لیکن اس میں یا کسی اور کتاب میں یہ نہیں دیکھنے میں آیا کہ عروض و ضرب میں رکنِ سالم فعولن کے ساتھ بھی قصر یا حذف (فعول یا فعَلْ) کا اجتماع ہو سکتا ہے۔ شعور صاحب نے جتنی مثالیں دی ہیں ان کا رکنِ آخر فعول یا فعَلْ ہے فعولن کہیں نہیں۔ ان سے انشا کی لغزش کی تائید نہیں ہوتی۔ میرا کہنا ہے کہ متقارب مثمن سالم (فعولن فعولن فعولن فعولن) کے ساتھ متقارب مثمن مقصور یا محذوف (فعولن فعولن فعولن فعول یا فعَلْ) نہیں آ سکتا۔

انشا کی پوری غزل متقارب مثمن سالم میں ہے لیکن مطلع متقارب مثمن محذوف میں ہے جو بے اصولی ہے۔ کیا شعور صاحب رکن آخر میں فعولن اور فعل کے اجتماع کی کوئی مثال پیش کریں گے ؟ ——— گیان چند

آ. بچین

(۱) میرے مضمون "آبچین" مطبوعہ نیا دور (اگست ۶۳ء) میں جس جگہ بھی میر سعادت علی خاں یا سعادت علی خاں ہو، اُسے میر سعادت علی سمجھا جائے۔

(۲) صحاح الفرس مولفہ محمد بن ہندو شاہ نخجوانی (ماۃ ہشتم ہجریہ) نظر سے گزری۔ اس میں آبچیں کی بحث نہیں۔

(۳) علی اکبر دہ خدا ایران حاضر کے مسلم الثبوت محققین میں تھے۔ ان کی فرہنگ جو ناتمام رہ گئی تھی ان کی وفات کے بعد مکمل کی جا رہی ہے۔ اس میں برہان قاطع کی عبارت متعلق آبچیں بدون تنقید نقل ہوئی ہے اور فردوسی و اسدی کے اشعار بطور سند پیش کئے گئے ہیں۔ فردوسی کے شعر مندرجۂ فرہنگ جہانگیری کے ساتھ کے ۲ اور شعر درج ہوئے ہیں کہ محل استعمال اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے اسے عربی میں قطیفہ وغیرہ کہتے ہیں' اور اس کا استعمال " آب خشک کن" کی جگہ کہ روشنائی اس سے خشک کی جاتی ہے' بے تناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ——— قاضی عبدالودود

مغلوں کے باغات

"مغلوں کے باغات" مطبوعہ نیا دور (اگست ۶۳ء) میں مریم کے چمن اور انگوری باغ کا جہاں ذکر آیا ہے وہاں گز کی جگہ فٹ پڑھا جائے۔ یعنی انگوری باغ کا صحن ۱۷۰ × ۲۳۵ فٹ تھا۔ مریم کے چمن کا رقبہ ۹۲ ⅔ فٹ لمبا اور ۶۲ ½ فٹ چوڑا تھا۔

خسرو باغ کے پھاٹک کا کتبہ یہ ہے۔

"باہتمام مرید اخلاص آقا رضا این بنائے عالی صورت اتمام ۱۰۲۴ یافت۔" ——— سید صباح الدین عبدالرحمٰن

شہیدوں کا گیت

میرے گیت (مطبوعہ نیا دور جولائی ۶۳ء) کے دو مصرعوں میں کتابت کی غلطی ہے۔ وہ مصرعے یوں ہونے چاہئیں۔

چم چم چم چم برچھم لہرائے
گھنن گھنن رن باجے
گھنن گھنن ہر بوند لہو کی چھکے اور تن ساجے ——— شہاب جعفری



اتر پردیش میں آزادی کا سولھواں سال

(بسلسلہ صفحہ ۵۲)

اور ۱۰ گشتی مرکز کھولے گئے۔

چھوراگڑھ، دوگڈ، کھرالا اور راتر کاشی میں میونسپل بورڈ بنائے گئے اور جوگ۔ گھرما۔ رینوکوٹ اور ردوسا میں نوٹی فائیڈ ایریا کیٹیاں قائم کی گئیں۔ اتر پردیش کے کاوال شہروں اور رتھورا گڑھ، غازی آباد، گڈھ مکتیشر، فیروز آباد، رودپور، کچھا، بازپور، چھوراگڑھ کے شہروں نیز جوالاپور، ہردوار، رشی کیش کے منطقہ میں تعمیراتی کاموں کو ضابطہ کے تحت لانے سے متعلق ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اتر پردیش میں زیر نظر سال میں ۱۲ واٹر ورکس چالو کیے گئے اور محکمہ شہری اور دیہی منصوبہ بندی میں دیہی علاقوں میں تعمیر مکان سے متعلق ایک یونٹ قائم کی گئی۔

یتیموں اور لاوارث بچوں کے لیے اور بعد کی دیکھ بھال کے مرکزوں کے بچوں کے لیے بالترتیب متھرا اور میرٹھ میں ایک ایک ہوم قائم کیا گیا۔ نابالغ اور نوجوان مجرموں کی اصلاح کے لیے لکھنؤ میں ایک اسکول کھولا گیا۔ ریاست میں موجودہ آٹھ مرکزوں کے علاوہ دو مزید گرام سیوک تربیتی مرکز قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ ہریجنوں اور مندرجہ فہرست قبائل کو مزید سہولتیں دی گئیں۔

اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

یونیورسٹی پروفیسروں کی فوجی تربیت — جوانوں کی آسائش کے لیے قیدیوں کی جاں فشانی — متفرقات

اتر پردیش اور مدھیہ پردیش کی مختلف یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کے ۲۳۰ سے زیادہ لکچرر اور پروفیسر بنارس ہندو یونی ورسٹی میں ،، ،، روزانہ این۔ سی۔ سی آفیسرز پری کمیشن ٹریننگ کیمپ میں بھرپور فوجی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

تربیت پانے والوں کے دھوپ سے تمتماتے ہوئے چہرے ان کی پسینہ سے شرابور وردیوں میدان میں جھلسا دینے والی دھوپ میں ان کی مستعدی اور ڈیوٹی کے بعد ان کی مسکراہٹ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان میں اپنے ملک کی خدمت کا شدید جذبہ موجود ہے اور ان کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہے اور وہ زندگی کی بڑی سے بڑی سختی کا مقابلہ کرنے کی جرات رکھتے ہیں۔

تمام تربیت حاصل کرنے والے رضاکار ہیں جن کی عمر ۲۱ سے ۲۶ سال تک ہے۔ مختلف یونیورسٹیوں کے زیر صدارت مخصوص بورڈ کی تشکیل کی گئی تھی جنہوں نے تربیت کے لیے ان کا انتخاب کیا ہے تاکہ تمام ملک میں این۔ سی۔ سی (رائفل) کی اسکیم کی توسیع کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی انسٹرکشن سے متعلق عمل کی کمی کو پورا کیا جا سکے۔ کیمپ اتر پردیش کے نظامت کیڈٹ کور کے زیر نگرانی ۲۶ اپریل سے شروع کیا گیا ہے جس میں ۲۲۹ افراد کو ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ ٹریننگ پانے والوں میں ۸۰ مدھیہ پردیش اور بقیہ اتر پردیش کے ہیں۔ ٹریننگ حاصل کرنے والوں کو جسمانی تربیت ڈرل۔ ہتھیار چلانے۔ سگنلنگ۔ نقشہ پڑھنے۔ فرسٹ ایڈ۔ حفظان صحت۔ صفائی۔ فیلڈ کرافٹ۔ لانگ رینج رائفل شوٹنگ۔ تنظیمی اور انتظامی فرائض سے متعلق سبق دیے جاتے ہیں اور وہ تمام دن مشغول رہتے ہیں۔ ہر ٹریننگ پانے والے کے لیے کھیلوں میں حصہ لینا ضروری ہے۔

دستہ پلٹن یا جتھے کی کمان ٹریننگ کا ایک لازمی جزو ہے۔ کیڈٹ کی آخری گریڈنگ میں اس کی کارگزاری۔ عام برتاؤ اور کسی دستہ۔ پلٹن یا جتھے کی کمان کرتے ہوئے اس کی انتظامی صلاحیت پر خاص طور سے غور کیا جائے گا۔

کیڈٹوں کی صحت پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور کیمپ میں بہت سی طبی سہولتیں دستیاب ہیں تربیت پانے والوں کی تفریح طبع کے لیے سینما اور ثقافتی پروگراموں کا بھی انتظام ہے۔ اتوار کو چھٹی منائی جاتی ہے۔

ٹریننگ کے خاتمہ پر جس کیڈٹ کی کارگزاری مجموعی طور پر سب سے اچھی ہوگی اس کو ایک ٹرافی انعام میں دی جائے گی۔ ٹرافی کے علاوہ ڈائرکٹر جنرل اس کیڈٹ کو ایک بید بھی پیش کریں گے۔

ملک کی شمالی سرحدوں پر برف اور تیز و تند طوفانوں کا بہادری سے سامنا کرنے والے جوانوں اور میدانی علاقوں میں فوجی یا شہری دفاع کی تربیت حاصل کرنے والوں کو سورج کی تپش یا موسلا دھار بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے فتح گڑھ سنٹرل جیل کے قیدی جی توڑ محنت کر رہے ہیں۔ ان کی پُرخلوص اور ان تھک کوششوں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مختلف سائز اور ڈیزائن کے خیمے پہلے کے مقابلہ میں دگنی تعداد میں تیار ہو رہے ہیں۔

یہ قیدی ہر قسم کے خیمے تیار کر رہے ہیں جن میں چار اشخاص کے لیے ۴۰ پاؤنڈ کے ہلکے میدانی خیمے۔ آٹھ اشخاص کے لیے ۸۰ پاؤنڈ وزن کے خیمے۔ ۲۰ اشخاص کے لیے ای۔ بی۔ آئی خیمہ۔ آرام دہ اور خوبصورت سوئس کاٹج اور رنگین اور دھاری دار باغ کے خیمے شامل ہیں۔

جیل میں روزانہ آٹھ دس خیمے تیار کیے جا رہے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ سال رواں میں آٹھ لاکھ روپے کی مالیت کے خیمے

مختلف مقامات پر جوانوں کو بھیجنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔

اس کام میں تقریباً ۲۵۰ قیدی لگے ہوئے ہیں۔ خیمہ کے اندر کے کپڑے کی چھپائی بھی جیل ہی میں ہوتی ہے۔ یہ کپڑا فرخ آباد سے نہیں خریدا جاتا جہاں کے چھپے ہوئے کپڑے مشہور ہیں۔ خیمہ کی دیدہ زیبی اور خوش نمائی قیدیوں کی پرخلوص محنت کی مظہر ہے۔ ان خیموں میں رنگوں کا امتزاج حد درجہ دل فریب ہے اور ہمالیہ کی بلندیوں پر تند و تیز طوفانوں میں بھی یہ خیمے بہت زیادہ پائیدار ثابت ہوئے ہیں۔

یہ قیدی ملک کی خدمت کے ساتھ اپنی مدد بھی کر رہے ہیں کیونکہ وہ پہلے کے مقابلہ میں زیادہ ہنرمند کاریگر بن رہے ہیں اور رہائی کے بعد یہ بات ان کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں بدرجہ معاون ثابت ہوگی۔

متفرقات

سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اسکیم۔ حکومت اترپردیش نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے درجوں میں سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے اور اسے بہتر بنانے کے لیے ایک اسکیم بنائی ہے۔

سائنس کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے علاوہ اس اسکیم کا مقصد ریاست میں سائنس کے ٹیچروں کی کمی کو دور کرنا بھی ہے۔ اس اسکیم کے تحت غیر تربیت یافتہ بی۔ ایس۔سی ٹیچروں کے لیے ملازمت کرتے ہوئے ٹریننگ کا بندوبست کیا جائے گا۔ سائنس ٹیچروں کے ٹریننگ پروگرام کی توسیع کی جائے گی اور ریفریشر کورس شروع کیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں سرکاری اور تسلیم شدہ ہائر سکنڈری اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کو سائنس کے ساز و سامان کی فراہمی کی جائے گی۔

اس اسکیم کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں میں فزکس، کیمسٹری، زوالوجی اور بوٹنی میں ایم۔ایس۔سی درجوں میں مزید ۵۰ فی صدی داخلوں کی تجویز ہے۔

فراموش کردہ یادگاروں کی حفاظت۔ آثار قدیمہ کی ریاستی مشاورتی کمیٹی نے ان یادگاروں میں سے جن کی حفاظت کا فیصلہ کیا ہے جو تاریخی اہمیت کی حامل ہیں لکھنؤ میں بیگم کوٹھی، وارانسی میں ہنگاتا رکا پرانا مندر، جون پور میں اور گومتی پر پتھر کا پل، الٰہ آباد میں شرنگی رشی کا مندر، اور بھارت کنڈ، کانپور میں بالمیکی آشرم، علی گڑھ کا قلعہ، مرزاپور میں شیو کا پرانا مندر اور دیوریا میں وشنو کا مجسمہ۔

کمیٹی نے ایسے تاریخی مقامات کا پتہ لگانے اور ان کی کھدائی کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے جو حکومت ہند نے اپنی نگرانی میں نہیں لیے ہیں۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ سروے کا کام ریاست کی یونیورسٹیوں کے سپرد کر دیا جائے اور اس مقصد کے پیش نظر ان کو ہر ضلع کے لیے ۱۰۰۰ روپیہ منظور کیا جائے۔

کمیٹی نے متھرا میوزیم کے نوادرات اور نمائش کی چیزوں کی فہرست تیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔

ہریجنوں کے لیے پوسٹ میٹرک وظیفے۔ ڈائرکٹر محکمہ اور سماجی فلاح اترپردیش کے جاری کیے گئے ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ پوسٹ میٹرک وظیفوں کے لیے درخواست دینے والے کو چاہیے کہ وہ اپنی درخواست کے ساتھ اپنا پاسپورٹ سائز کا ایک فوٹو بھی بھیجے جس پر اس افسر کے دستخط ثبت ہوں جس کے توسط سے درخواست بھیجی جا رہی ہے۔

مندرجہ فہرست اقوام اور سابق جرائم پیشہ خانہ بدوش اور نیم خانہ بدوش قبائل کے امیدواروں کو جو ملازم ہیں فارم "بی" میں اپنی آمدنی کا ڈیکلریشن بھیجنا چاہیے۔ فارم "بی" اور درخواست کے فارم ضلع ہریجن اور سماجی فلاح افسروں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

زیر تربیت ٹیچروں کے لیے وظیفے۔ ریاستی حکومت ۱۹۶۳-۶۴ء کے دوران ٹریننگ اسکولوں میں تربیت حاصل کرنے والے ٹیچروں کو ۲۰ روپیہ ماہانہ کے ۱۶۵۰ وظیفے دے گی۔ اس مقصد کے لیے ۲۴۲۰۰۰ روپے کی رقم منظور کی گئی ہے۔

وظیفوں کی مجموعی تعداد میں سے ۱۵۰۰ وظیفے ۱۰ ٹریننگ اسکولوں کے مرد ٹیچروں اور ۱۵۰ وظیفے ایک ٹریننگ اسکول کی خواتین ٹیچروں کے لیے ہیں۔ بعض وظیفوں کی مدت ۱۲ مہینے بعض کی ۸ اور بعض کی ۲ ماہ ہے۔

REGD. No. A-319

آزادی خطرے میں ہے۔ اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے —— جواہر لال نہرو

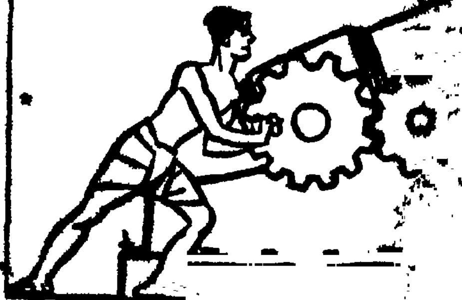
بچت کرنا ملک کی خدمت کرنا ہے

نیشنل ڈیفنس سرٹیفکیٹ خریدیئے



[illegible]

آزادی کی [illegible] کے لیے روپیہ لگایئے



آزادی خطرے میں ہے [illegible] طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے — جواہر لال نہرو

ترقی سے طاقت

[illegible] قوم کی پشت پناہ ہوتی ہے

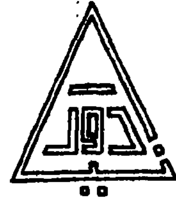
[illegible]

طاقت سے تحفظ



نیا دور

اکتوبر ۱۹۶۳ء



جلد ۱۸ | نمبر

آشون ۱۸۸۵

اکتوبر ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ رو

فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

امیہ بھوشن ملک

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

جے۔ ڈبلو۔ ہارج

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو، پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوان

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں حکومت اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو۔

اپنی باتیں

اکتوبر کی دوسری تاریخ تھی اور ۱۸۶۹ سن عیسوی جب کاٹھیاواڑ کے ایک علاقے، پوربندر میں اس عظیم ہستی کا جنم ہوا جو آگے چل کر دنیا میں مہاتما گاندھی کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ نادر دست شخصیت پہلے جنوبی افریقہ میں، پھر تقریباً ۳۰ برس تک ہندوستان کے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اقتصادی آسمان پر مہر درخشاں کی طرح چمکتی رہی اور موجودہ دور میں بھی اس کی کرنیں نہ صرف ہمارے ملک کو بلکہ اکناف عالم کو اپنی ضیا پاشیوں سے منور کر رہی ہیں۔ آج دنیا کا سیاسی مطلع گرد آلود ہے۔ شکوک و شبہات کے بادل ہر طرف چھائے ہوئے ہیں۔ شوق نبرد آزمائی اور اظہار قوت و جبروت کے جذبات مہلک ترین حربوں کی ایجاد کا باعث بن رہے ہیں۔ اور یہ ہتھیار تیار کرنے والے ممالک یہ نہیں سوچتے کہ ان ہلاکت آفرینیوں کا کیا ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ یہ تیاریاں اپنے اور مہذب دنیا کے تحفظ اور بقا کے نام پر کی جا رہی ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ ان تیاریوں کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یہی ان کی غلط فہمی ہے۔ گاندھی جی کی تعلیمات کا اگر مطالعہ کیا جائے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جائے تو دنیا اس کشمکش سے نجات پا سکتی ہے جس سے اس وقت وہ دوچار ہے۔ گاندھی جی کی اس بارے میں جو تعلیم ہے وہ ایسی نہیں جس پر عمل کرنا دشوار ہو یا اس کی پالیسی پر چلنے والا اپنی کوئی کمی محسوس کرے۔ انھوں نے ایک سیدھی سادی سی بات کہہ دی ہے لیکن ہے وہ ایسی گر کی بات جو ہزاروں باتوں پر بھاری ہے۔ گاندھی جی سب سے پہلے تو یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ دنیا میں مستقل طور سے قیام امن ممکن نہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ "مستقل امن پر یقین نہ رکھنا انسانی فطرت کی قدسیت سے انکار کر دینا ہے۔" رہی یہ بات کہ ابھی تک تو مستقل امن کی کوئی صورت نظر نہیں آئی، یا جو صورتیں اور طریقے اختیار کیے گئے وہ ناکام ہو گئے، اس کا جواب گاندھی جی نے یہ دیا ہے کہ "ابھی تک جو طریقے اختیار کیے گئے وہ اس لیے ناکام ثابت ہوئے کہ جو لوگ اس سلسلے میں کوشش کرتے رہے ان میں دلی خلوص نہیں پایا جاتا تھا..... اگر انسانیت کے سلسلہ پر بعد تخفیف آلات تباہی پر اختیار ہے اُن کے استعمال کا ارادہ یکسر ترک کر دیں (اس کے نتائج و عواقب کا پورا علم رکھتے ہوئے) تو مستقل امن حاصل ہو سکتا ہے۔" اس وقت دنیا کے دونوں مخالف گروہوں میں اضافہ اسلحہ کے سلسلے میں جو مقابلہ ہو رہا ہے گاندھی جی اس کے بھی سخت مخالف تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اس بارے میں لکھا کہ "ایک چیز یقینی ہے۔ اگر اسلحہ سازی کا مجنونانہ مقابلہ جاری رہا، تو ایسا قتل عام یقینی ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہ ملے گی۔ اگر (اس معرکے میں) کوئی فتح یاب بھی ہوا تو یہ فتح بھی اس قوم کے لیے جو فتح یاب ہوگی ایک زندہ موت ثابت ہوگی۔ اس تباہی سے بچنے کی اور کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ عدم تشدد کے طریقے کو مع اس کے سارے شاندار امکانات کے جرأت مندانہ اور غیر مشروط طور سے قبول کر لیا جائے۔" ظاہر ہیں اور حقیقت سے ناواقف لوگوں کو ہر مسئلے، بالخصوص مستقل امن اور تخفیف اسلحہ ایسے مسائل کے لیے بھی اہنسا یا عدم تشدد کا نسخہ عجیب سا معلوم ہوتا ہوگا۔ لیکن یہ استعجاب حقیقتہً نتیجہ ہے اہنسا یا عدم تشدد کے اصل مفہوم سے ناواقف ہونے کا۔ اہنسا یا عدم تشدد کے معنی بہت سے لوگ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ تم پر جتنا ظلم ہو رہا ہو، حق و صداقت کا جتنا خون کیا جا رہا ہو، تمھارے حقوق اور تمھاری آزادی تم سے سلب کی جا رہی ہو، تمھارا مال و متاع غصب کیا جا رہا ہو، تمھارے ناموس پر حرف آ رہا ہو لیکن تم خاموشی سے یہ سب برداشت کرتے رہو اور زبان پر شکایت کا ایک لفظ بھی نہ آنے دو۔ مگر اہنسا یا عدم تشدد کا یہ مفہوم غلط ہے۔ گاندھی جی کی اہنسا انھیں کے بقول "انسانیت کے پاس سب سے بڑا حربہ ہے۔ وہ انسانی ذہانت کی یہ دولت ایجاد شدہ مہلک ترین حربے سے بھی زیادہ طاقتور ہے۔" اہنسا، دوسروں سے نفرت کرنے کو باز رکھتی ہے کیونکہ نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ اہنسا دوسروں کو تکلیف پہنچانے سے روکتی ہے۔ اہنسا دوسروں سے محبت کرنے کا سبق دیتی ہے کیونکہ محبت، نفرت کو ختم کر دیتی ہے۔ مگر اہنسا یہ نہیں سکھاتی کہ تمھاری آزادی، عزت و ناموس اور وطن کو خطرہ ہو اور تم اس خطرے سے منھ پھیر لو، یا حق و باطل کی جنگ میں تم حق اور انصاف کا ساتھ نہ دو۔ اہنسا، بزدلی نہیں سکھاتی بلکہ بزدلی سے نفرت کرتی ہے۔ گاندھی جی نے ایک جگہ لکھا ہے: "میری اہنسا یہ نہیں سکھاتی کہ خطرے سے بھاگ جاؤ اور عزیزوں کو غیر محفوظ چھوڑ دو۔ اگر تشدد اور بزدلانہ فرار میں انتخاب کرنے کا سوال پیدا ہو جائے تو میں بزدلی پر تشدد کو ترجیح دوں گا۔" اگر کوئی شخص گاندھی جی کی اہنسا کا صحیح مفہوم نہ سمجھتا تھا تو انھیں تکلیف ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ان کے پاس ایک گاؤں کے کچھ لوگ آئے اور ان سے کہا کہ پولیس کے لوگ گاؤں کے مکانات لوٹ رہے تھے اور گاؤں کی عورتوں کی بے عزتی کر رہے تھے مگر ہم لوگ وہاں سے بھاگ آئے کیونکہ آپ (گاندھی جی) نے اہنسا پر کاربند رہنے کی تلقین کی تھی۔ یہ سنتے ہی گاندھی جی نے بقول اپنے "شرم سے سر جھکا لیا"، کیونکہ انھیں یہ توقع تھی کہ لوگ اپنی جانیں دے دیں گے مگر خطرے سے نہ بھاگیں گے۔ گاندھی جی کے نزدیک اپنی جان بچانے کی خاطر اَملاک، عزت اور مذہب کو کسی غلط کار کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا "نامردانہ، غیر فطری اور ذلیل" فعل تھا۔ گاندھی جی جب جنوبی افریقہ میں تھے تو ایک مرتبہ ۱۹۰۸ء میں ان پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا۔ گاندھی جی کے بڑے لڑکے نے اس کے بعد ایک بار گاندھی جی سے پوچھا کہ اگر میں اس حملے کے وقت موقع پر موجود ہوتا تو آپ کو قتل ہو جانے دیتا اور میں وہاں سے بھاگ جاتا یا آپ کی حفاظت کے لیے طاقت کا استعمال کرتا؟ گاندھی جی نے اس کے جواب میں کہا کہ اس موقع پر تمھارا فرض یہ تھا کہ میرے بچانے کے لیے تم تشدد (ہنسا) بھی برتتے۔ دراصل گاندھی جی کی نگاہیں بڑی دور رس تھیں۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ آزاد ہندوستان کی آزادی کو کبھی خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے انھوں نے یہ نصیحت کی تھی: "میں یہ چاہوں گا کہ اپنی عزت و ناموس بچانے کے لیے ہندوستان جنگ پر آمادہ ہو جائے بجائے اس کے کہ وہ بزدلانہ طریقے سے اپنی بے عزتی گوارا کرے یا اس کی بے عزتی ہوتی رہے اور وہ خاموشی سے یہ سب دیکھتا رہے۔" پچھلے سال اسی اکتوبر کی ۲۲ تاریخ کو ہمارے شمالی ہمسایہ، چین، نے ہمارے ملک پر بے وجہ حملہ کر کے اس کی آزادی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ خطرہ ہندوستان کو آج بھی درپیش ہے۔ گاندھی جی کی تعلیم اس موقع پر ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دے رہی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم گاندھی جی کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں، مادر وطن کی عزت و ناموس پر کسی طرح حرف نہ آنے دیں اور دشمن کو یہ دکھا دیں کہ گو ہم امن پسند ضرور ہیں لیکن جب باطل سے مقابلہ کرنے کا وقت آ جائے گا اور وطن کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی تو ہم پھر نہ جان دینے سے ڈریں گے اور نہ ظالم کی جان لینے سے!

—— ایڈیٹر

غزل

آنند نرائن مُلّا

وہ نبض کی رفتار کہ چھٹتے ہیں پسینے   لگتے نہیں دُنیا ترے جینے کے قرینے

نظروں میں ہمیں ہم تھے، کبھی بزم میں جب تھے   اُٹھ آئے تو بھولے سے بھی پوچھا نہ کسی نے

بن جاتے ہیں، تقدیر بدلتی ہے جہاں رُخ   چڑھتے ہوئے زینے ہی اُترتے ہوئے زینے

اُس بزم میں کیا جائیں اُڑاتے ہوں جہاں گت   آنکھوں میں بسائے ہوئے ساون کے مہینے

وہ شوق کی بستی، نہ وہ میلے، نہ چراغاں   اب دیدۂ و دل ہیں کہ ہیں یادوں کے دفینے

میرے بھی قدم تھے سوئے عشرت کدۂ ہوش   وہ تو کہو روکا مجھے آشفتہ سری نے

اب غم کی صدا پر کوئی دیتا نہیں آواز   کل خوش تھا تو آ آ کے پکارا تھا سبھی نے

اب نجم فلک بن کے دکھاتے ہیں سبھی آنکھ   ذرّے وہی کل جن کو اچھالا تھا ہمیں[1] نے

برساتے ہوئے آنکھوں سے مے ملتے ہیں اکثر   در پردہ خصومت سے سُلگتے ہوئے سینے

بے کس پہ ستم توڑنے والوں میں نہ ڈھونڈو   جراُت وہ، جو خنجر کفِ سفّاک سے چھینے

آغوش میں ساحل کی جو گزری وہ نہ پوچھو   طوفاں کو صدا دینے لگے پھر سے سفینے

مے خانے میں یوں وعظ کناں مُلّا تھا کل رات   شعلہ بہ پیالے و انگارے بہ مینے

---

[1] میرے ذوق کو یہ قافیہ ناگوار نہیں ۔ آنند نرائن مُلّا

گاندھی جی کا طریق عمل

عبدالمجید سہالوی

گاندھی جی ایک ہی وقت میں کئی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انھوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے تجربات کیے۔ سیاسیات کے میدان میں انھوں نے برطانیہ ایسی طاقت ور حکومت سے ٹکر لی اور بالآخر کامیاب بھی ہوئے۔ لیکن وہ سیاست کا شعبہ ہو یا تعلیم کا، ہریجنوں کی اصلاح ہو یا دیہاتوں کی ترقی کا سوال، ان کے طریق کار کی یہ خصوصیت رہی کہ انھوں نے حق، صداقت، ایمانداری، عدم تشدد اور روحانیت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے جنوبی افریقہ میں ہندستانیوں کے حقوق کے لیے جد وجہد شروع کی تو یہ اصول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہے۔ ہندستان آنے کے بعد جنگ آزادی کے سپہ سالار اعظم کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں لیکن انھوں نے اس جنگ میں بھی اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا۔ جنگ آزادی کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے دیہات کی ترقی، تعلیم کی اشاعت، سماج کی اصلاح اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے مسائل کے حل کے لیے نہ صرف اپنے نظریات اور خیالات پیش کیے بلکہ عملی طور سے بھی حصہ لیا۔ مگر کسی منزل پر بھی انھوں نے اپنے اصول توڑے نہیں بلکہ انھوں نے جو قدم بھی اٹھایا اس میں ان کے مسلک یعنی روحانیت، صداقت، نیک نیتی، عدم تشدد یا اہنسا کا پرتو پایا گیا۔ اور یہی گاندھی جی کی وہ خصوصیت ہے جس نے انھیں دنیا کے دوسرے سیاست دانوں میں ممتاز کر دیا ہے۔ آیئے، اب دیکھیں کہ گاندھی جی کی یہ روحانیت پسندی، عدم تشدد، ستیہ گرہ وغیرہ واقعی ہیں کیا۔

مذہبیت

گاندھی جی روحانیت کے قائل تھے اور اس لحاظ سے ایک مذہبی آدمی تھے مگر ان کی مذہبیت اُس مفہوم سے مختلف تھی جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ گاندھی جی اکثر کہا کرتے تھے کہ ایک ستیہ گرہی کا خدا پر عقیدہ ہونا چاہیے لیکن یہ خدا صرف انھیں کا یا ان کے ہم مذہبوں کا ہی کا خدا نہ تھا بلکہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، یہودی ہر فرقہ کا تھا اور ہر شخص کے دل میں موجود تھا۔

بعض موقعوں پر گاندھی جی نے خدا کو اخلاقی قانون سے تعبیر کیا اور یہ کہا کہ سچائی ہی خدا ہے۔ جب وہ مذہب کا نام لیتے تھے تو اس کا مطلب اخلاق ہی ہوتا تھا۔ ہر وہ شخص جو اخلاقی اصولوں کی پابندی کرتا ہے ان کے نزدیک مذہبی اور روحانی آدمی تھا۔ چاہے وہ خدا پر عقیدہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ گاندھی جی کی مذہبیت کسی خاص قسم کی عبادت یا رسم و رسوم تک محدود نہ تھی۔ ان کی عبادت کسی مادی نفع کے لیے نہیں ہوتی تھی بلکہ صرف روحانی پاکیزگی اور ایک ایسی ناقابل بیان طاقت کی خوش نودی کے لیے ہوتی تھی جسے نہ تو عقل سے پہچانا جا سکتا ہے اور نہ منطق سے ثابت کیا جا سکتا ہے البتہ، وہ صرف محبت اور سچائی کا مظہر ہے۔

گاندھی جی کے نزدیک مذہب کا مفہوم اتنا وسیع تھا کہ اس کے

امن میں دنیا کے انفرادی، اجتماعی، سماجی، سیاسی اور معاشی تمام مسائل آجاتے تھے۔ انھوں نے بعض دوسرے مذہبی اور روحانی بزرگوں کی طرح دنیا کی کشمکش اور الجھنوں سے الگ رہ کر پہاڑوں اور جنگلوں میں نجات اور روحانی پاکیزگی کے لیے مراقبہ نہیں کیا بلکہ کشمکش اور الجھنوں کی اسی دنیا میں تمام آدمیوں کے دوش بدوش کام کر کے اس ماحول کو بدلنے کی کوشش کی جس سے الجھن، کشمکش، نفرت، رقابت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور انسانوں کو سچائی اور محبت کے راستے سے دور کر دیتے ہیں۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ایک مرتبہ ۱۹۴۲ء میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تقریر کا حوالہ دیا جس میں انھوں نے گاندھی جی کو مہاتما کے نام سے یاد کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ غیر معمولی روحانی طاقت کے حامل ہیں اس لیے وہ جس طرح اپنا پروگرام عمل درآمد کر سکتے ہیں وہ عام آدمیوں کے بس کی بات نہیں۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ میں اسی مٹی کا بنا ہوا ایک انسان ہوں جس مٹی سے عام لوگ بنتے ہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میں گزشتہ بیس سال سے عام لوگوں کے ساتھ مل جل کر کیسے کام کرتا رہتا۔ مجھ میں اور کسی دوسرے آدمی میں کوئی فرق نہیں ہے اور جو میں کر سکتا ہوں ضروری تربیت کے بعد وہ بھی کر سکتا ہے۔ گویا گاندھی جی اس کے قائل نہیں تھے کہ اپنی اصلاح کر دو دنیا کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی، بلکہ ان کا کہنا تھا کہ اگر تم اپنی اصلاح کرنا چاہتے ہو تو یہ تم اپنے ماحول کی اصلاح کے ساتھ ساتھ کر سکتے ہو، اس سے الگ اور بے تعلق رہ کر نہیں۔ انسان پیداوار ہے اپنے ماحول کی، اگر تم اس کی اصلاح کے خواہشمند ہو تو تمھیں اس ماحول کا جس میں وہ زندگی بسر کر رہا ہے پورا جائزہ لے کر مرض کے بنیادی سبب کا علاج تلاش کرنا ہوگا۔ انفرادی طور پر ایک دو آدمیوں کی اصلاح اور روحانی پاکیزگی سے عام انسانوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی اور وہ اخلاقی قدروں کو نہیں پہچان سکتے۔ اس لیے ان کے اندر مذہبی تبدیلی اور روحانی بیداری پیدا کرنے کیلئے ان کے گرد و پیش کے حالات کو بدلنا ہوگا۔

گاندھی جی کے نزدیک بھی روحانیت کسی فرد کی ذاتی پاکیزگی ہی کا نام نہیں بلکہ ان کے نزدیک اس پاکیزگی کا اظہار ہر فرد کے ہر شعبۂ زندگی میں، خواہ وہ سماجی ہو معاشی ہو یا سیاسی سب میں، ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کے مذہب کا مفہوم اتنا وسیع تھا کہ اس میں زندگی کے تمام شعبے آجاتے ہیں اور خود گاندھی جی کسی شعبۂ زندگی میں بنیادی اخلاقی قدروں سے الگ ہٹ کر کام نہیں کر سکتے تھے۔

ایک مرتبہ مغربی ممالک کے کچھ لوگ گاندھی جی کے ساتھ مہاتما کے لقب کو لگے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھے کہ وہ کوئی بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں جنھوں نے یہ روحانی طاقت، ریاضت اور وظائف کے ذریعہ حاصل کی ہے۔ چنانچہ وہ ان سے روحانیت کا درس حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس گئے۔ ان کا خیال تھا کہ گاندھی جی انھیں کوئی منتر یا وظیفہ بتائیں گے یا جنگل اور پہاڑ پر جا کر ریاضت اور مراقبہ کی ہدایت کریں گے تاکہ انھیں نجات اور روحانی پاکیزگی حاصل ہو سکے۔ لیکن گاندھی جی کی روحانی پاکیزگی، وظیفے، مراقبہ اور منتر کی مرہون منت نہ تھی بلکہ وہ نتیجہ تھی ان کے اس خلوص اور ان کی ان قربانیوں اور کوششوں کا جو انھوں نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے سماجی، معاشی اور سیاسی ہر شعبۂ زندگی میں کی تھیں۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ سیاست داں سیاسی زندگی میں اخلاقی اور روحانی قدروں کی پابندی ضروری نہیں خیال کرتے اور قومی اور بین اقوامی سیاست میں ڈپلومیسی یعنی سیاسی چال بازی کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن گاندھی جی نے سیاسی زندگی میں بھی اخلاقی اور روحانی قدروں پر سختی سے عمل کیا اور کوئی ایسی بات نہ کی اور نہ کہی جو بنیادی اخلاقی اصولوں کے منافی ہو۔ جنگ آزادی کے زمانہ میں وہ جب کوئی اقدام حکومت کے خلاف کرنے کا پروگرام بناتے یا قانون کی خلاف ورزی کا ارادہ کرتے تو اس کی اطلاع پہلے ہی سے حکومت کے ذمہ دار افسروں کو کر دیتے۔

گاندھی جی جب جنوبی افریقہ گئے اور وہاں کے بسنے والے ہندستانیوں کی حالتِ زار دیکھی تو انھوں نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا یہ ان کی پہلی ستیہ گرہ تھی۔ وہ بیرسٹری پاس کرنے کے بعد جنوبی افریقہ ایک ہندستانی سوداگر کے مقدمے کی پیروی کے سلسلہ میں گئے تھے اور اس کے بعد وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ چونکہ وکالت میں بھی انھوں نے سچائی کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اس لئے بہت جلد وہاں کے ہندستانی باشندوں میں مقبول ہو گئے۔ بہرحال جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کو ستیہ گرہ میں اچھی خاصی کامیابی ہوئی جس سے ان کا عقیدہ ستیہ گرہ پر پختہ ہو گیا اور انھوں نے محسوس کر لیا کہ ناسازگار سے ناسازگار حالات میں بھی حق کی آواز بلند کرنے کے لئے ستیہ گرہ کے طریقہ کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جنوبی افریقہ کے کامیاب تجربے کے بعد جب گاندھی جی ہندستان کے سیاسی میدان میں آئے تو انھوں نے یہاں بھی ستیہ گرہ کے طریقہ کو برطانوی اقتدار سے ہندستان کو نجات دلانے کے لئے اختیار کرنے کی کوشش شروع کی۔ شروع میں لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی اور اس طریقہ کار کے ذریعہ کامیابی پر شبہات کا بھی اظہار کیا لیکن جلد ہی انھیں اور دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی کا یہ طریقِ کار کتنا موثر ہے۔

اب یہ دیکھئے کہ یہ ستیہ گرہ ہے کیا؟ ستیہ گرہ کا مطلب زیادتی اور ناانصافی کا عدم تشدد کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ عدم تشدد اور تشدد کے ذریعہ مقابلہ کرنے میں فرق یہ ہے کہ تشدد کے ساتھ مقابلہ کرنے میں زیادتی کرنے والے کے جسم کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور اس طرح جسمانی طاقت کے ذریعہ اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ زیادتی نہ کرے۔ اس طریقہ میں زیادتی کرنے والے کے خلاف دل میں نفرت اور غصہ کا جذبہ بھی شامل ہوتا ہے جس کی انتقامی نوعیت ہو جاتی ہے بخلاف اس کے ستیہ گرہ یا عدم تشدد کے ذریعہ برائی کا مقابلہ برائی کرنے والے کے ساتھ نفرت کے بجائے ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ کیا جاتا ہے اور اپنے اوپر تکلیف برداشت کر کے اس کے ضمیر میں چٹکی لی جاتی ہے تاکہ وہ بیدار ہو کر اپنی زیادتی اور ناانصافی پر شرمندہ ہو اور اسے ترک کر دے۔

ستیہ گرہ کرنے والے فرد یا فرقے کے لئے گاندھی جی کے نزدیک ضروری ہے کہ وہ جس زیادتی یا ناانصافی کے خلاف ستیہ گرہ کر رہا ہے وہ خود اس سے پاک ہو۔ فرض کیجئے کہ کوئی فرقہ چھوت چھات کے خلاف ستیہ گرہ کر رہا ہے اور وہ خود اپنے فرقہ میں کسی سطح پر چھوت چھات برتتا ہے تو اس کے لئے مناسب نہیں کہ وہ چھوت چھات کے خلاف ستیہ گرہ کرے اس لئے کہ یہ ستیہ گرہ مضحکہ خیز ہوگی۔ اس سے نہ تو دوسرے لوگوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہوگی اور نہ چھوت چھات برتنے والوں کی روح یا ضمیر پر چوٹ پڑے گی کیونکہ ستیہ گرہ کے کرنے میں اصلی طاقت اخلاقی طاقت ہے اور یہ اخلاقی طاقت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب خود ستیہ گرہ کرنے والے کا کردار اخلاقی معیار پر پورا اترتا ہو اور اس کا دامن اس زیادتی اور ناانصافی سے پاک ہو جس کے خلاف وہ ستیہ گرہ کر رہا ہو۔

اہنسا

ہندستان کا برطانیہ ایسی طاقت سے نہتے ہوتے ہوئے بھی مقابلہ کرنا اور بغیر کسی بڑے خون خرابے کے آزادی کا حاصل کرنا دنیا کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ تھا اور بالکل انوکھا تجربہ۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کے لئے اہنسا کا تصور نئی چیز نہیں تھا۔ اس سے پہلے مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ اور سقراط نے بھی حق کی آواز بلند کرنے کے لئے انفرادی طور پر اس پر عمل کیا تھا اور اعلیٰ اصولوں کی خاطر خوشی خوشی زہر کا پیالہ پی لیا تھا۔ لیکن اہنسا کو وسیع پیمانے پر سیاسی حربہ کے طور پر کبھی استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ مگر گاندھی جی نے اہنسا کو جنگ آزادی کے لئے استعمال کر کے دنیا کے تمام دبے ہوئے عوام کے ہاتھوں میں زیادتی اور ظلم کرنے والوں کے خلاف وہ تیز تلوار دیدی جو ضرب لگائے بغیر ظلم و استبداد کی زنجیر کاٹ دیتی ہے۔

گاندھی جی اہنسا کو صرف برگزیدہ ہستیوں کی میراث نہیں خیال کرتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ یہ خدا کی دی ہوئی وہ طاقت ہے جسے عوام کو بھی استعمال کرنا چاہئے۔ اہنسا کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے گاندھی جی نے ہریجن (مارچ ۱۹۴۰ء) میں لکھا تھا کہ "اہنسا اور سچائی صرف افراد ہی تک نہیں محدود رہنا چاہئے بلکہ اس پر

گروہوں، فرقوں اور قوموں کو بھی عمل کرنا چاہئے۔ یہ میری تمنا اور میرا خواب ہے۔"

گاندھی جی کی اہنسا عدم مدافعت کے مرادف نہ تھی۔ وہ ناانصافی اور زیادتی کرنے والے کے معاملہ کو خدا پر نہیں چھوڑ دیتے تھے بلکہ اس سے خود نپٹنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس کی مخالفت میں آواز بلند کرتے تھے اور بہادری سے مقابلہ کرتے تھے چاہے اس میں اپنی جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانا پڑتی ہو۔ گاندھی جی کی شاندار موت اس کا بیّن ثبوت ہے کہ اہنسا پر عمل کرنا کوئی کھیل نہیں اور اس کے لئے جس ہمّت اور جراُت کی ضرورت ہے وہ ہر ایک میں نہیں پائی جاتی۔ گاندھی جی نے مسکراتے ہوئے جان دیدی لیکن حق بات کہنے سے باز نہ آئے۔ کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس امتحان میں پورے اتر سکتے ہوں؟

دراصل گاندھی جی کی اہنسا ایک طاقتور بہادر کی اہنسا تھی۔ وہ کمزوری اور مجبوری کا نتیجہ نہ تھی اور نہ وہ بزدلی کے لئے بہانہ بنائی جاسکتی تھی۔ اِسی لئے گاندھی جی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ اگر کسی عورت کی عزت پر حملہ کیا جا رہا ہو تو بزدلی سے اس بے عزتی کو برداشت کرنے سے بہتر ہے کہ حملہ آور کے خلاف تشدد استعمال کیا جائے اور ایک معصوم عورت کی عزّت کو بچا یا جائے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گاندھی جی کی اہنسا بزدلی کسی صورت سے نہیں بلکہ وہ ظلم اور بے انصافی کے خلاف ایک موثر حربہ ہے۔ جہاں تک تشدد کا تعلق ہے گاندھی جی سمجھتے تھے کہ جس طرح آگ سے آگ نہیں بجھائی جا سکتی اسی طرح تشدد کو تشدد کے ذریعہ نہیں ختم کیا جا سکتا۔ اُن کے نزدیک تشدد سے فریقِ مخالف کو دبایا جاسکتا ہے لیکن اس کے دل کی آگ نہیں بجھائی جا سکتی جس کے آگے چل کر زیادہ شدّت کے ساتھ بھڑکنے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے۔

نیک ذرائع

گاندھی جی کا ہر مقصد اعلیٰ اور پاکیزہ تو ہوتا ہی تھا لیکن اُس مقصد کے حصول کے لئے بھی وہ اعلیٰ اور پاکیزہ ذرائع کا استعمال ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر کوئی پاک مقصد ناپاک ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے اس مقصد کو نقصان پہنچے گا اور اس کے پیچھے جو اخلاقی طاقت ہے وہ ختم ہوجائے گی، نیز دوسرے لوگوں کی ہمدردی باقی نہ رہے گی۔

گاندھی جی اپنے وطن کے لیے برطانوی حکومت سے جنگ فروٗ کرتے رہے تھے مگر اُن کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں تنگ نظری اور خود غرضی کا شائبہ تک نہ تھا۔ اسی لئے جنگ آزادی کے دوران، گاندھی جی نے برطانیہ کے باشندوں کے خلاف نہ تو کبھی کوئی بات کہی اور نہ ان کی طرف سے اپنے دل میں کوئی کدورت رکھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک دنیا کی سیاست کو ملکی اور قومی خود غرضی سے بلند کرکے انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کی سطح پر نہیں لایا جائے گا اس وقت تک عالمی امن کا خواب، خواب پریشاں ہی رہے گا اور اس کی تعبیر کبھی نظر نہ آئے گی۔ دراصل وہ دنیا کے تمام انسانوں کو ایک خاندان کا فرد سمجھتے تھے۔ وہ ہر ملک کو آزاد اور خوشحال دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی تمنا تھی کہ دنیا کے ممالک امن اور بھائی چارے کی فضا میں ایک خاندان کے افراد کی طرح خوشی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ وہ ایک ملک پر کسی دوسرے ملک کے قبضہ کو اہنسا اور سچائی کے اصولوں کے خلاف سمجھتے تھے۔

آج جب کہ دنیا کے بہت سے ممالک دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں اور اس کا خطرہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں کب جنگ چھڑ جائے، ضرورت ہے کہ مہاتما گاندھی کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اُن کے طریقۂ کار پر نگاہ ڈالی جائے کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس سے دنیا میں مساوات اور اخوت کا جذبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے، ظلم اور بے انصافی دور ہو سکتی ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کا دوست بن کر زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کرسکتا ہے۔



کئی سال کی بات ہے کچھ پرانے رسائل کی ورق گردانی کے سلسلہ میں رسالہ ادیب معلی (علی گڑھ) جلد اول شمارہ ۳ کے صفحہ ۴۶ پر محمد علی میاں خیال شاہجہاں پوری کی ایک غزل نظر سے گزری۔ غزل اپنی جزالت ترکیب، سلاست بیان اور لطافت جذبات کے لحاظ سے کافی دلکش

محمد علی میاں خیال

عبدالاحد خاں خلیل

معلوم ہوئی۔ اس غزل کے تین شعر درج ذیل ہیں۔

مقدر میں عشق بتاں لے کے آئے ۔۔۔ ازل سے غم جاوداں لے کے آئے
سلام اب تو جاتے ہیں لے کعبہ والو ۔۔۔ یہاں مجھ کو وہم و گماں لے کے آئے
کہاں میں خیالؔ اور کہاں کوئے قاتل ۔۔۔ بڑے اک مرے مہرباں لے کے آئے

اسی وقت سے خیالؔ کے مزید کلام اور ان کے حالات زندگی کی جستجو رہی۔ کچھ عرصہ ہوا اتفاق سے شاہجہان پور میں حضرت خیالؔ کے صاحبزادے سید محمد نبی میاں صاحب سے دیوان خیال کا ایک قلمی نسخہ دستیاب ہوا اور خود ان سے نیز ان کے قریبی اعزا اور احباب سے کچھ ان کے خاندانی حالات، سوانح حیات اور ادبی رجحانات کا بھی پتہ چلا۔ اس خیال سے کہ اپنے وقت کے یہ ادبی جواہر پارے ذہنوں سے بالکل محو نہ ہو جائیں، خیالؔ کے حالات اور ان کے کلام کا نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جس سے ان کی پُرگوئی، نازک خیالی اور قادرالکلامی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

محمد علی میاں حکیم مولوی سید اکبر علی صاحب کے خلف اصغر تھے۔ ان کی پیدائش سنہ ۱۸۵۶ء میں تحصیل باندہ میں ہوئی جہاں ان کے والد تحصیلدار تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے بعد وہ شاہجہان پور واپس آگئے اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر وہیں مقیم ہو گئے۔ خیالؔ کی ابتدائی تعلیم و تربیت حسب معمول محلہ کے مکتبوں اور خاندان کے بزرگوں کی نگرانی میں ہوئی۔ قدرت نے ان کو غیر معمولی حافظہ اور ذہن عطا کیا تھا۔ گھر ہی پر انھوں نے فارسی علم و ادب اور عربی زبان میں مہارت حاصل کی۔ اس کے بعد تحصیل علم کے شوق میں بدایوں اور رامپور کا چکر لگایا۔ رام پور میں انھوں نے شمس العلما مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی سے خاص طور پر علوم عقلیہ کا اکتساب کیا اور شعر و سخن سے دلچسپی کے سلسلے میں امیر مینائی سے رابطہ عقیدت قائم کیا۔ پھر شاہجہان پور واپس آگئے اور پیشہ نہیں بلکہ شغلہ اور تجدید علم کے خیال سے انھوں نے گھر پر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

ہوتا یہ تھا کہ صبح و شام دونوں وقت طلبا اور شائقین علم و ادب ان کو گھیر لیا کرتے تھے اور درس و تدریس، بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ جن لوگوں نے محمد علی میاں کو درس دیتے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہ کبھی کتاب سامنے رکھ کر نہیں پڑھاتے تھے۔ طالب علم نے کتاب سے عبارت پڑھی اور انھوں نے تشریح و توضیح شروع کر دی۔ علاوہ ازیں دوران تقریر میں چشم و ابرو کے اشارے اور دست و بازو کے حرکات و سکنات سے مطالب و معانی کو مجسم اور مصور بنا کر ذہن نشین کر دیتے تھے۔ درس کے دوران میں وہ بالعموم ٹہلتے رہتے تھے اور منطق کے مسائل تو اس انداز میں بیان کرتے تھے کہ مشکل سے مشکل مسئلہ دلچسپ اور پرلطف بن کر دلوں میں نقش کالحجر ہو جاتا تھا۔ تصوف کے مسائل پر بات چیت کرنے اور الجھنوں کو سلجھانے کے لیے اچھے اچھے صوفی اور عمر رسیدہ اہل شہر اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ ضمیر حسن خاں صاحب دلؔ اور حسین احمد میاں بیباکؔ جیسے مشہور و معروف شعرا نے محمد علی میاں خیالؔ سے کسب فیض کیا اور علم و ادب سے دلچسپیوں اور شعر و سخن سے انہماک کو مزاج و طبیعت بنا لیا۔

شخصیت کا جہاں تک سوال ہے لوگ بیان کرتے ہیں کہ محمد علی

میاں کا قد میانہ اور رنگ گندمی تھا۔ سر اور داڑھی مونچھ کی اصلاح مشین سے کراتے تھے۔ داڑھی رکھنے کا انداز یہ تھا کہ گالوں سے کچھ نیچے تک داڑھی باقاعدہ محفوظ رہتی تھی۔ اس کے بعد ٹھوڑی کے پاس اور نیچے استرے سے صاف کردی جاتی تھی۔ بڑھاپے میں مہندی کا خضاب لگایا کرتے تھے۔ لباس میں زیادہ تر قمیص، ڈھیلے پائنچے کا پاجامہ اور لکھنوی انداز کی دوپلی ٹوپی استعمال کرتے تھے کبھی کبھی شیروانی بھی زیب تن کرلیتے تھے۔ طبیعت اور مزاج میں نفاست پسندی بدرجۂ اتم موجود تھی۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے اور رکھ رکھاؤ میں لکھنویت کے بے حد قائل تھے۔ صبیح الدین میاں حسنا تاریخ شاہجہانپور میں ان کے لباس و انداز کلام کے متعلق لکھتے ہیں کہ "جو آپ کو دیکھتا سمجھتا شاہجہاں پور کے لکھنؤ کا ساکن بتلاتا" (تاریخ شاہجہاں پور صفحہ ۲۶۷)

خوش خطی سے خاص دلچسپی تھی چنانچہ ان کا خط پختہ اور پاکیزہ تھا۔ فرصت کے اوقات میں آپ اکثر وصلیاں اور سونے کا غذیا دفتی پر قطعات، متفرق اشعار یا عبارت نثر خط نسخ یا نستعلیق میں لکھنے کی مشق کیا کرتے تھے۔

خیالؔ نہایت سادہ مزاج، خوش باش، مرنجاں مرنج، زندہ غریب، بے نیاز، بے تکلف، صوفی منش اور اللہ والے انسان تھے۔ انتظام خانہ داری سے انھوں نے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رکھا۔ اپنے آبائی مکان میں ان کے لیے ایک کوٹھری مخصوص تھی۔ گھر کے انتظامات اور آبائی جائداد کی دیکھ بھال ان کے بڑے بھائی کرتے تھے۔ جب تک بڑے بھائی زندہ رہے خیالؔ نے بے فکری اور سکون قلب کی زندگی گزاری۔ ان کے انتقال کے بعد مجبوراً بس واجبی طور پر اس ذمہ داری کو سنبھالا، ورنہ عام طور پر یہ سب کام خاندان کے دوسرے افراد و اقربا ہی کے ذمہ رہا۔

بزرگان دین سے عقیدت اور سید الشہدا کے احترام کا یہ حال تھا کہ عشرۂ محرم میں دس روز مسلسل فرش پر سوتے تھے۔ جمعہ کی نماز مسجد میں ادا کرتے تھے، بقیہ پنج وقتہ نماز گھر پر ہوا کرتی تھی۔ پاک باطنی کا یہ عالم تھا کہ جھوٹ سے سخت نفرت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک مقدمہ میں بطور گواہ لکھنؤ کی ایک عدالت میں طلب کیے گئے۔ جب حاکم کے روبرو پہنچے تو حسب ضابطہ حلف اٹھانے کو کہا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ میرا وضو نہیں ہے اس وجہ سے حلف نہیں لے سکتا۔ وضو کا انتظام کیا گیا اور آپ نے وضو کرکے حلف اٹھایا اور بیان دیا۔ اس انداز سے بیان دینے کا اثر حاکم عدالت کے دل پر ایسا ہوا کہ اس نے ان ہی کے بیان پر اعتبار کرکے مقدمہ کا فیصلہ کردیا۔ اولیائے کرام اور بزرگان دین سے خیالؔ کو جو عقیدت تھی انھوں نے اپنے اشعار میں جابجا ظاہر کیا ہے۔

محمد علی میاں اور ان کے بڑے بھائی کی آمدنی آبائی جائداد سے تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار تھی۔ دیہات میں سیر ہوتی تھی اور گھر کے خرچ کے لیے کافی غلہ مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے بھائی کھنڈسار کا کام بھی کرتے تھے جس سے مزید آمدنی ہو جاتی تھی۔ سب اہل خاندان ایک ہی سلسلہ مکانات میں ملے جلے رہتے تھے اور اخراجات یکجائی ہوتے تھے۔ بڑے بھائی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ محمد علی میاں بڑے بھائی کا بیحد احترام کرتے تھے اور کبھی کسی معاملہ میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے۔ جب کبھی ان کو اپنے ذاتی اخراجات کے لئے کچھ روپیہ کی ضرورت ہوتی تو اپنے صاحبزادے محمد نبی میاں سے کہتے کہ چچا سے دس روپیہ لا دو۔ اس سے زیادہ ان کا ذاتی خرچ تھا بھی نہیں۔ دنیا اور متاع دنیا سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فقر و بے نیازی میں زندگی گزارنا ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔

فقرا اور غربا کی امداد کا یہ عالم تھا کہ اپنی محدود ذاتی آمدنی کے باوجود کسی سائل کو رد کرنا خلاف انسانیت سمجھتے تھے۔ اور جو کچھ پاس ہوتا یا اپنی والدہ یا ہمشیرہ سے مل جاتا چپکے سے لاکر سائل کو دے دیتے اور اس سے کہہ دیتے کہ کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔ اس سلسلہ میں اگر کبھی ان کا کوئی بزرگ ان کو کچھ نصیحت یا ہدایت کرتا تو آپ مسکرا کر ٹال دیتے یا جود و سخا کو خاندانی وقار کا مسئلہ بنا کر ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔ سائل کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرکے رخصت کرتے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ عید کا روز تھا اور جاڑوں کا موسم، ایک سائل نے آکر سوال کیا کہ سردی کی وجہ سے بہت تکلیف ہے اور کچھ اوڑھنے کو اس کے پاس نہیں ہے۔ آپ زنانہ مکان میں گئے اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ جھولے کی کھونٹی پر ایک نئی رضائی تہ کی ہوئی رکھی تھی۔ آپ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے لوگوں کی نظریں بچا کر چپکے سے

اٹھا لائے اور سائل کو دے کر فرمائش کی کہ جلدی سے بھاگ جا اور کسی سے ذکر نہ کرنا۔ مغرب کے قریب گھر میں رضائی کی تلاش ہوئی اور کہیں نہ ملی۔ اتنے میں آپ گھر میں تشریف لائے۔ صورت حال دیکھ کر دریافت کیا کہ کیا تلاش کیا جا رہا ہے۔ بہن نے، جن کے لیے وہ رضائی بنوائی گئی تھی، وجہ پریشانی بیان کی۔ آپ نے فرمایا کہ "مت تلاش کرو۔ ہم نے وہ رضائی ایک ایسے شخص کو دے دی ہے جس کے عوض میں تمھیں ستر رضائیاں ملیں گی۔"

پاک باطنی کے سلسلے میں اکثر کہا کرتے تھے کہ انسان کا دل مثل آئینہ کے صاف ہونا چاہیے کہ جو کچھ اس کے سامنے آئے وہ آئینہ میں آ جائے۔ کسی کو برا کہنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ عیب پوشی و خطا بخشی میں ان کو خاص لطف آتا تھا۔ ان کے بارے میں ایک چشم دید واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد جب کہ ان کا جاری کردہ شکر سازی کا تجارتی کاروبار ابھی جاری تھا، ایک روز بعد مغرب محمد علی میاں اپنے زنانہ مکان سے مردانہ مکان میں گئے، دیکھا کہ کھنڈسار میں کام کرنے والا ایک ملازم چوری کی نیت سے ایک گھڑے میں شیرہ بھر رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی آپ الٹے پاؤں زنانہ مکان میں واپس چلے گئے۔ اس طرح فوراً ہی واپس اندر چلا آنا خلاف معمول تھا اس لیے ان کی والدہ نے دریافت کیا کہ کیوں لوٹ آئے۔ آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور دیر تک خاموش ٹہلتے رہے۔ بہت اصرار پر آپ نے صرف اتنا کہا کہ "میں نے دیکھا کیوں"۔ جب کافی وقت گزر گیا اور گھر والے برابر دریافت حال کرتے رہے تو آپ نے کھنڈسار میں کام کرنے والے اس نوکر کی نامعقول حرکت کا کچھ حال مختصراً بیان کیا۔ لوگوں نے ارادہ کیا کہ باہر جا کر اس نوکر کو اس حرکت سے روک دیں۔ لیکن محمد علی میاں نے ان کو باز پرس سے منع کیا اور کسی طرح باہر نہ جانے دیا۔ اس ردوکد میں اتنا وقت گزر گیا کہ وہ ملازم شیرہ کا گھڑا اپنے مکان پر پہنچا آیا۔ جب کسی کے آواز دینے پر کچھ دیر بعد محمد علی میاں دوبارہ باہر گئے تو ملازم کو بیٹھا ہوا پایا۔ آپ نے اس پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ اس کی چوری کا کسی کو علم ہو گیا ہے اور حسب معمول اس سے بات چیت کرتے اور کام لیتے رہے۔

شعر و سخن سے دلچسپی کے سلسلہ میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ محمد علی میاں کے بچپن میں شاہجہانپور میں ادبی محفلوں اور شاعرانہ صحبتوں کا چرچا عام تھا، اور ہر پڑھا لکھا اور صاف ستھرا مذاق رکھنے والا اس قسم کی نشستوں میں شرکت کا متمنی رہا کرتا تھا۔ حافظ نثار احمد خاں عرف حافظ بدھن صاحب ثاقب۔ محمد طاہر عرف موتی میاں صاحب طاہر نیز دیگر اہل علم و فضل کی بدولت محلہ محلہ ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ قدرتی طور پر محمد علی میاں کو بھی ان صحبتوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پہلی غزل جو نو عمری میں کہی تھی اسے بغرض اصلاح حضرت ثاقب کو جو نابینا تھے اور فارسی کے مشہور عالم ہونے کے علاوہ مقامی شعرا میں خاص امتیاز رکھتے تھے، سنائی۔

محمد علی میاں کے تخلص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ابتداً انھوں نے اپنا تخلص قیس رکھا تھا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب انھوں نے حضرت شفق سے جو تنیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے، اصلاح لینا شروع کی تو اپنا تخلص عروج کر لیا۔ اس زمانے کی ایک غزل کا مقطع ہے:-

مجھ سے اختر نے بعد مرگ کیا پایا عروج خاک ہو کر سرمۂ چشم حسیناں ہو گیا

(تاریخ شاہجہاں پور ص۱۴۵)

یہ غزل دیوان خیالؔ میں نہیں ملتی۔ غالباً ضایع ہو گئی یا ابتدائی کلام تصور کر کے اسے دیوان میں شامل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ اس کے بعد جب امیر مینائی سے عقیدت و تلمذ کا سلسلہ قائم ہوا تو محمد علی میاں نے اپنا تخلص خیالؔ رکھا جو آخر عمر تک قائم رہا۔

شعرائے شاہجہان پور میں جن حضرات نے امیر مینائی سے استفادہ کیا ان میں خیالؔ کا خاص مرتبہ تھا۔ ویسے تو ضمیر حسن خاں دلؔ، سید تصدق حسین قرارؔ، سید مختار احمد مختارؔ وغیرہ سب امیر مینائی کے شاگردوں میں تھے، لیکن اس زمانے میں محمد علی میاں خیالؔ پر امیر مینائی کی خاص نگاہ التفات تھی۔ کہتے ہیں کہ امیر مینائی نے اپنے مقامی شاگردوں کو لکھ دیا تھا کہ وہ اپنی غزلیں برائے اصلاح خیالؔ کو دکھا لیا کریں۔ معلوم ہوا ہے کہ خیالؔ کے انتقال کے بعد جب ان کا کلام مرتب کیا جا رہا تھا تو ایک رقعہ مختار احمد صاحب مختارؔ کا دستیاب ہوا جس کی پشت پر خیالؔ کی ایک غزل ان ہی کے قلم سے لکھی ہوئی ملی جو غالباً اسی مشاعرے کے لیے لکھی گئی تھی جس کے متعلق مختارؔ نے اپنی غزل بہ نظر اصلاح محمد علی میاں کو بھیجی تھی۔

خیالؔ کی غزل کا مطلع تھا:۔

آنکھیں ملا کو بیچ کے عدو کی نگاہ سے   چھپ چھپ کے دل میں آ گئی محبت کی راہ سے

اس غزل کے بقیہ اشعار قلمی دیوان خیال میں موجود ہیں۔ مختار کے رقعہ کی عبارت حسب ذیل ہے جس سے خیالؔ کی اصلاحی صلاحیتوں اور استادانہ وقار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے:۔

"مخدوم والاجاہ۔ مدفیوضہٗ۔ سلام نیاز کے بعد ملتمس ہوں پرسوں معلوم ہوا کہ اتوار کو بعد مغرب مشاعرہ ہوگا۔ وقت بہت کم ہے مگر لڑکے سید جو شعر موزوں کیے ہیں وہ یہ ہیں جو ارسال خدمت ہیں۔ بعد اصلاح جن کو زیادہ اچھا سمجھیے ان پر صاد بنا دیجیے اور جن کو معمولی سمجھیے ان کو ویسے ہی چھوڑ دیجیے۔ اور جو بالکل ردی ہوں ان کو کاٹ دیجیے۔ غزل عصر کے وقت مرحمت فرمایئے تو شفقت قدیمانہ سے بعید نہ ہوگا۔ والسلام

فرمانبردار مختار عفا اللہ عنہ۔"

خیالؔ نے کبھی اپنا کلام احتیاط سے نہیں رکھا۔ چناں چہ ان کے بہت سے اشعار جو اہل شہر کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں مرتبہ دیوان میں نہیں ملتے۔ جو کچھ مل سکا وہ ان کے صاحبزادے سید محمد نبی میاں نے دیوان کی صورت میں یکجا کر لیا۔ سید محمد نبی میاں کو اعتراف ہے کہ ان کے والد محترم کا بہت کچھ کلام ضایع ہو گیا اور وہ باوجود امکانی کوشش کے سب کلام فراہم نہ کر سکے۔ خیالؔ کا طریقہ یہ تھا کہ اپنی مخصوص کوٹھری کے ایک طاق میں ایک رجسٹر رکھے رہتے تھے اور اس پر کبھی کبھی کچھ لکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ کلام کاغذ کے پرزوں پر لکھا ہوا اس رجسٹر میں چسپاں تھا۔ کچھ کاغذ کے ٹکڑے پنسل سے لکھے ہوئے تلے اوپر ویسے ہی اس کے اندر رکھے تھے۔ یہ پرزے بالعموم وہ تھے جن پر مشاعروں میں یا کسی بے تکلف صحبت میں پڑھنے کے لیے غزل لکھ لی گئی تھی اور واپس آ کر وہ پرزے اس رجسٹر میں رکھ دیے گئے تھے۔ خیالؔ کا معمول تھا کہ جب اس قسم کی ادبی نشستوں میں بلائے جاتے یا پکڑ کر لے جائے جاتے تو ایک کاغذ کے ٹکڑے پر پنسل سے غزل لکھ کر نیفے میں رکھ لیتے اور لوگوں کے اصرار پر سنا دیتے۔ پھر گھر آ کر اگر یاد رہ جاتا اور وہ کاغذ کا ٹکڑا محفوظ بھی رہتا تو اس کو رجسٹر میں رکھ دیتے اور بے فکر ہو جاتے۔ کبھی غالباً اس کا موقع نہ آتا کہ اس غزل پر نظرثانی کریں یا باقاعدہ کسی بیاض میں لکھ لینے کی کوشش کریں۔

جن لوگوں نے خیالؔ کو مشاعروں میں یا نجی صحبتوں میں غزل پڑھتے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ محمد علی میاں کا انداز غزل سرائی نہایت سادہ لیکن مؤثر، والہانہ اور دل کش ہوتا تھا۔ کلام سناتے وقت چشم و ابرو کے اشارے قابل دید ہوتے تھے معمولی شعر پر بھی ان کے دل نواز طرز ادا سے لوگ لوٹ لوٹ جاتے تھے۔ صرف شاہجہانپور ہی نہیں بلکہ گرد و نواح کے اضلاع کے مشاعروں میں بھی خیالؔ مدعو کیے جاتے تھے اور کبھی کبھی شرکت بھی کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخر ایام میں مقامی مشاعروں میں محمد علی میاں کی شرکت مشاعرہ کی کامیابی کی ضامن سمجھی جانے لگی تھی اور انتقال سے آٹھ دس سال پہلے تو کوئی مشاعرہ ان کی شرکت کے بغیر بے لطف سمجھا جاتا تھا۔

خیالؔ کی رحلت کا واقعہ بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے خاص ادبی اور رومانی اہمیت رکھتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ۶؍ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۶ء) بروز پنجشنبہ خیالؔ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے گئے جو مکان کے قریب ہی محلہ انجمن چوپال میں منعقد ہوا تھا جب دوسرے شعرا کلام سنا چکے تو ان کی باری آئی۔ انھوں نے مطلع پڑھا:۔

جو چاہتے ہیں بت وہی کرتا ہے خدا بھی   معلوم ہوا فیصلۂ روز جزا بھی

پوری غزل دل نواز تھی۔ ہر طرف سے داد ملی۔ اس کے بعد آیندہ مشاعرے کے لیے مصرع طرح کی جستجو شروع ہوئی۔ متعدد اہل ذوق نے مختلف مصرعے پیش کیے۔ خیال نے اپنے مخصوص انداز میں حسب ذیل مصرع تجویز کیا:۔

ان کھڑکیوں سے جھانک رہی ہے قضا مجھے

جس وقت خیال یہ مصرع تجویز کر رہے تھے تو کہا جاتا ہے کہ اپنے چشم و ابرو اور ہاتھ اور انگلیوں سے اپنی آنکھوں اور خیالی معشوق کی انکھڑیوں کی طرف اشارے کرتے جاتے تھے اور عجب مستانہ انداز میں موت کے فرشتے کا خیر مقدم کر رہے تھے جو "لایستاخرون ساعتہ ولا یستقدمون" کے حکم کے مطابق وقت معینہ کا منتظر تھا۔ اگلے مشاعرہ کے لیے مصرع طرح منظور ہونے کے بعد خیالؔ کے استاد تائبؔ نے اپنی غزل شروع کی جس کا دوسرا مطلع تھا:۔

وہ ذبح ہوئی آ کے جسے عشق ہوا تھا بھی   قاتل ہے چلا کھینچے ہوئے تیغ ادا بھی

حاضرین نے داد دینی شروع کی۔ خیالؔ نے بھی حسب معمول استاد کی غزل کا مطلع اٹھایا اور کلام کی داد دی۔ اسی دوران میں یکایک اُف اُف

کرکے ایک طرف کو جھکے۔ اگالدان ہاتھ میں تھا رکھ دیا اور ایک طرف کو گر گئے۔ لوگوں نے خیال کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے اور خیال کی کوئی پرانی ادا ہے۔ لیکن قریب بیٹھے ہوئے لوگوں نے جو دیکھا تو طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا اور خیالی کھڑکیوں سے جو قضا جھانک رہی تھی وہ اپنا کام کر چکی تھی۔ محفل مشاعرہ مجلس ماتم بن گئی اور ہر طرف آشفتہ حالی اور عبرت نگاہی چھا گئی۔ گھر سے خوش خوش اپنے پیروں پر مشاعرہ میں آئے تھے اب جنازے کے کندھوں پر واپس گئے۔ اس غیر متوقع حادثہ کا اثر اعزا و احباب بالخصوص ان کی ضعیف ماں کے دل پر بہت ہوا اور وہ عرصہ تک اپنے ہوش و حواس بجا نہ لا سکیں۔ خیال کی تجہیز و تکفین، ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ (۱۹۰۶ء) بروز دوشنبہ ہوئی اور آبائی قبرستان واقع محمد نگر کلاں میں اپنے والد کے پائنتی سپرد خاک کیے گئے۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے خیال کے قلمی دیوان کی تفصیل مختصراً ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ یہ دیوان ۸½ × ۱۲½ انچ سائز کے ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر خوش خط جلی قلم میں کہیں پندرہ اور کہیں بیس اشعار لکھے گئے ہیں۔ بالعموم سطر اٹھارہ سطری ہے لیکن حاشیہ پر اور کبھی کبھی بین السطور کچھ اضافے کیے گئے ہیں۔ غزلوں کی تعداد اور ترتیب حسب ذیل ہے:-

ردیف الف۔ ۴۵ غزلیں ب۔ ایک غزل، ت۔ ۲ غزلیں۔ ث ج۔ ح۔ خ۔ د ایک ایک غزل (۵ غزلیں) ر۔ ۱۰ غزلیں، ز، س، ایک ایک غزل (۲ غزلیں) ک۔ ۲ غزلیں، ن۔ ۴ غزلیں و۔ ۱۰ غزلیں، ہ ۴ غزلیں اور ی ۱۰۵ غزلیں۔ کل غزلوں کی تعداد ۲۴۳ ہے۔ جن میں کچھ مختصر ہیں اور کچھ کافی طویل۔ کبھی ایک ہی قافیہ و ردیف میں دو دو غزلیں بھی ملتی ہیں۔ دیوان کے ۱۸۱ صفحات میں غزلیات اور بقیہ ۲۵ صفحات میں متفرقات اور خمسہ جات درج کیے گئے ہیں۔

خمسہ جات کے سلسلے میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ہمارے قدیم شعرا کا بالعموم یہ اصول تھا کہ اساتذہ کے کلام پر پورا عبور حاصل کر لینے اور ان کے مختلف انداز فکر کو پوری طرح سمجھ لینے کے بعد ان کی مقبول و مشہور غزلوں کی تضمین کو فکر سخن کا ایک ضروری جز تصور کرتے تھے۔ اس دلچسپ ادبی مشغلہ کی بدولت ہمارے شعر و ادب کو ارتقائی منازل طے کرنے میں مدد ملتی تھی اور قوت بیان میں توانائی پیدا ہوتی تھی۔ مشق سخن بڑھتی تھی اور لطف بیان کے ساتھ مضمون کی پوری توضیح ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی تضمین کے بہانے مفہوم کے نئے پہلو بھی ابھار لیے جاتے تھے اور اصل خیال کی توسیع اور تشریح کے ذہنی جولانیاں دکھانے کا موقع ملتا تھا۔ ابہام دور ہو جاتا تھا اور ایجاز کی توضیح کے علاوہ کلام کے لطیف و نازک پہلو روشن تر ہو جاتے تھے۔ خمسہ نگاری کے سلسلہ میں خیال کی بیشتر توجہ مومن کی غزلوں پر رہی۔ اس کے بعد غالب، اسیر لکھنوی اور خواجہ حافظ پر۔ دیوان خیال میں ۱۳ خمسے ہیں جن میں چھ خمسے مومن کی غزلوں پر ہیں اور پانچ غالب کی غزلوں پر۔ خیال نے جس جس انتخاب سے اس سلسلہ میں کام لیا ہے وہ ان کے ذوق ادب اور رجحان طبع کا آئینہ دار ہے بالخصوص مومن کی غزلوں کا انتخاب ان کے ذوق جمال، ذوق عرفان اور معنی آفرینی کا شاہد ہے۔ دو ایک نمونے ملاحظہ ہوں:-

اے خیال اس عشق میں قید مذہب ننگ ہے   بت پرستی میں نہیں ہٹتا ہے ایمان زینہار
ایسے رند لاابالی کا بھلا کیا اعتبار   ہو گئے نام بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

غالب کی غزل پر خمسے کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

تذکرہ کس بوالہوس کا آج اس محفل میں ہے   گفتگو کیسی ابھی سے یہ حق و باطل میں ہے
وائے ناکامی کہ میری جان کس مشکل میں ہے   سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

اپنی آنکھوں کی طرح فقرہ ہر اک جادو بھرا   ہے بہ رنگ حسن صورت شوخ حسن مدعا
تلخی دشنام میں بھی چاشنی جاں فزا   دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اسیر لکھنوی کی ایک مشہور غزل پر خیال کی تضمین ملاحظہ ہو:-

طریق عشق میں مجھ سے کسی کا دل نہ دکھا   میں رو دیا جو کبھی کوئی آبلہ ٹوٹا
عجیب بعد فنا بے کسی نے کام کیا   چراغ خوب ہوا میری قبر پر نہ جلا
"ادھر ادھر کے پتنگے غریب جل جاتے"

خیال ہم بھی کبھی بند غم سے تھے آزاد   پھنسے ہیں دام محبت میں ہو کے اب برباد

کڑی نگاہ کا عادی نہیں دلِ ناشاد　　اسیر آنکھ دکھاتا اگر ہمیں صیاد

قفس تو کیا قفسِ جسم سے نکل جاتے

قدیم غزل کے محرکات میں قافیہ پیمائی اور مشاعرہ آرائی بڑی گونا گوں اثر انگیزی خاطر خواہ اہمیت رکھتی تھی۔ ذاتی تاثرات واحساسات کو حسبِ پسند اپنے معاصرین واحباب کے سامنے بے تکلف پیش کرنا اور تعیش خصائل و حوادث کو سادگی و معصومیت کے ساتھ نرم ونازک لب ولہجہ میں بیان کردینا مناظرِ قدرت و مقامی محاورات کو نظم کرکے زبان وبیان کو تنقیق دینے کی کوشش کرنا، حسن پرستی و معاملہ بندی، رعایتِ لفظی و مرصع سازی، خوش گپی و ظرافت، طنز وطعن، آدابِ عشق ومحبت، ہجر ووصال، رندی وسرمستی وغیرہ مضامین پر طبع آزمائی کرنا اس عہد کی شاعری کی خصوصیات تھیں۔ خیالؔ نے بھی انھیں موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ انھوں نے قدیم اساتذہ کے کلام کا مطالعہ بہ نظرِ غائر کیا تھا اور خود قدامت پسندی و روایت پرستی کے قائل تھے۔ اس لیے جدید معیارِ نقد ونظر پر ان کے کلام کی قدر وقیمت متعین کرنا بے معنی اور بے محل ہوگا۔

وہ آزاد منش اور آزاد مشرب انسان تھے اور ان کی شاعری ان کی زندگی اور طبعی بے نیازی کی پوری طرح آئینہ دار ہے۔ کہیں کہیں ان کے کلام میں تعقیدِ لفظی و بے ربطی، غیر سنجیدہ شوخ نگاری و آشفتہ گفتاری اور بعید و سبک معانی بھی ملتی ہے اور ادائے مفہوم میں کچھ ناقص فقرے یا نامکمل جملے بھی نظر آتے ہیں۔

لکھنؤ کے دبستانِ شاعری سے ان کی والہانہ عقیدت کے نمونے ملاحظہ ہوں۔ وہ اپنی کہنہ مشقی اور پختہ کاری کی بدولت اکثر آورد کو آمد میں اور رعایتِ لفظی کو صناعی اور مرصع کاری میں تبدیل کردیتے ہیں۔

نہیں کوئی خار تمنا نہیں　　جیسے آؤ تم دل میں کھٹکا نہیں

فرقت کے داغ کھائے ہیں دل پر ہزار ہا　　سکے بٹھا دیے ہیں محبت کی راہ میں

دلی کے دبستانِ شاعری سے دلچسپی کے سلسلے میں مومنؔ کے عشقِ پردہ نشین کی آوازِ بازگشت اور حسنِ مطلق کی کرشمہ سازیوں کے نمونے ان کے دیوان میں اکثر ملتے ہیں۔

دل بھی کمبخت بتِ پردہ نشیں پر آیا　　کوئی غمخوار جو پوچھے تو بتا بھی نہ سکا

یاد اس پردہ نشیں کی تھی شبِ فرقت میں　　چھپ چھپ کے جس کا تصور بھی سحر کے ہوتے

حجاب وہ ہے کہ آواز بھی سنے نہ کوئی　　وہاں کلیم بھی باتیں بنا نہیں سکتے

ردیف وقافیہ کا ایسا پہلو دار صرف کہ معنی اور مفہوم کا ہر پہلو چمک اٹھے اس زمانے میں ایک بہت بڑی ادبی خدمت، اور عامۃ الناس کے جذبات کی ترجمانی اور مقامی محاورات کا استعمال، سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی شاعرانہ فکر وفن کا ایک امتیازی نشان سمجھا جاتا تھا۔ خیالؔ کے یہاں لطفِ کلام وحسنِ بیان کے یہ پہلو ملاحظہ ہوں:

رہے پاس جو اک بھی خوبانِ گرانجانی　　نہ ہوا ایسا کہ میں فخر سے بانکا ہل چلا

دنبیدہ نگہ سے وہ ادھر دیکھ رہے ہیں　　کس ناز سے ہم قلب وجگر دیکھ رہے ہیں

رندی وسرمستی، درویشی وقلندری "کچھ فی الحقیقت" اور "کچھ بہانے شعر گفتن" ان کے کلام میں جا بجا پائی جاتی ہے اور خمریات کے تذکرے اکثر ملتے ہیں۔ دخترِ رز سے رسم وراہ ان کے تغزل میں بیشتر عارفانہ جذبہ کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ بادہ خواری سے کہیں وہ آبِ انگور مراد لیتے ہیں اور کہیں ذوقِ عرفان۔ طبعی رجحان کے علاوہ ان کو عارفانہ ماحول ایسا ملا تھا کہ جس نے مسائل ومنازلِ تصوف کو ان کا جزوِ حیات بنا دیا تھا۔ جامِ شریعت وسندانِ عشق سے کھیلنا ان کی زندگی کا مشغلہ تھا۔

دل میں بھری ہوئی ہے مئے عشق جانفزا　　ہر دم بغل میں رہتی ہے بوتل شراب کی

جو بھر کے پیشِ نظر ساغرِ بلور آیا　　سرور بن کے وہیں پتلیوں میں نور آیا

خیالؔ ایسے موسم میں ادھر سے توبہ　　یہ کفرانِ نعمت مسلمان ہو کر

کوئی مجھ سا پاک مشرب ہو تو ہو　　صافی مے جامۂ احرام ہے

عہدِ جوانی کی نظر فریبی اور رعنائی نیز عاشقانہ کردار کی ناعاقبت اندیشی اور بے نیازی کی تشریح ملاحظہ ہو:

سب دیکھتے ہیں جس کو وہ ہے عالم شباب　　کچھ دیکھتی نہیں وہ نظر ہے شباب کی

خوب رویوں سے جو الفت ہوگئی　　کچھ برا سننے کی عادت ہوگئی

حسنِ تخییل ولطفِ دیدار کے کرشمے اور ناکردہ گناہوں کا اعتراف وعذر خواہی کے حوالے ملاحظہ ہوں:

جلوہ گر دل میں وہ صورت ہے خیالؔ　　کوئی نظروں میں سماتا ہی نہیں

ستم ہے حشر میں وہ کہہ کر مجھ سے کہتے ہیں　　ادھر تو دیکھنا کس کی شکایت کرنے والی ہے

مقدر یہ دشمن کے ہے رشک کیا کیا　　برا چاہتے ہیں بھلا ہو رہا ہے

ندرتِ فکر و زورِ بیان، لطفِ مشاہدہ و چستی بندش کا کارنامہ غزل کے ایک شعر میں ملاحظہ ہو:

دشنام سنا دیتا ہے ہر بات پہ وہ بت — اڑتے ہوئے تیور شرر دیکھ رہے ہیں

انیسویں صدی کے ربع آخر کے ادبی رجحانات اور حضرت خیال کے کلام کی مجموعی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے عہد کے بہت بڑے شاعر نہیں لیکن ایک بہت اچھے اور قابل قدر شاعر ضرور ہیں۔ انھوں نے اپنی اور اپنے عہد کی ترجمانی بہت خوبصورتی کے ساتھ کی ہے اور اپنے کلام میں لکھنویت اور دہلویت کا ایک حسین امتزاج پیش کر کے اپنے کلام کو آفاقی قدروں کا حامل بنا لیا تھا۔ ذیل میں خیال کے کلام سے سلاست و روانی رمز و کنایہ، مقامی محاورات روزمرہ، رعایت لفظی، تشبیہ و استعارہ، سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی، ذوقِ تصوف، لطفِ بیان و حسن محاورہ، ندرت فکر و جدت خیال، معاملات عشق و آدابِ محبت، شوخی و ظرافت، خمریات، زاہد پر پھبتیوں اور تغزل کے چند نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔

مری زندگی اک بلا ہو گئی — وہ روٹھے اجل بھی خفا ہو گئی

عیاں شوخی ہے چشم سرمگیں سے — شرارت ٹپکی پڑتی ہے جبیں سے

خوب ہے دیکھ لیا حشر کے ہنگامہ کو — آپ ہی دیدۂ بد دور نظر آتے ہیں

لے چلا ہے طرف کوچۂ قاتل مجھ کو — یہی آفت کا بنا یعنی مرا دل مجھ کو

ترکِ الفت کی بہت خوب کہی اے ناصح — ہاتھ لا اماں گیا میں ترے سمجھانے کو

بت بنائے گئے مختار دل و جاں کے خیال — ہائے کیا ہمیں مجبور خدا نے رکھا

یوں دم نظارہ اس کا عکس رخ ہو جلوہ گر — رکھ دیا ہو جیسے آئینہ کے اندر آئینہ

ہے عیاں اس کے خطِ رخسار سے — دائرے میں کفر کے اسلام ہے

واعظا! عشق کے الجھتی ہے طبیعت میری — کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہی تقریر کے پیچ

یہ نالہ کشی یہ ناتوانی — کیا سر پہ اٹھا لیا ہے گھر رات

نہ یہ زمیں نہ فلک تھا عجیب عالم تھا — خیال لے کے گئی بے خودی جہاں مجھ کو

موحد ہوں سمجھتا ہوں کہ اک بھی گھر اسی کا ہے — وہ کعبہ میں جب کوئی نظر آتا دا آنکھ

جفا کرنا محبت آزمانا — خدا کو بھی ہے اے بت منہ دکھانا

یارب مجھے بہشت نہ دے پر فدا سی دے — دوزخ کو ڈال دے شب غم کے عذاب میں

اپنا اپنا یہ مقدر ہے شکایت کس کی — رو دو میں آپ ہنسیں خیر تماشا دیکھیں

کس سے کہیں کہ کچھ دل پہ ہمیں اعتماد ہے — رسوا کیے ہوئے تو اسی رازداں کے ہیں

بتوں کے نام سے اے شیخ کون جلتا ہے — معاف کیجئے دوزخ میں ہیں جناب کہیں

مے کدہ پر برستی آئی گھٹا — مے کشوں پر خدا کی رحمت ہے

کرم کا در رہے پیر مغاں کا بول بالا ہے — کہ اب رندوں سے زاہد ہم پیالہ ہم نوالہ ہے

دستِ ساقی سے ادھر جام کا لینا تھا خیال — کہ بھلا پر ادھر اٹھتے ہی بادل آئے

ہائے یہ شوخی تم بھی کہیں دیکھا نہ تھا — میں تو مرتا ہوں جینے کی ملاقاتیں

کہتے ہیں مجھ سے حشر میں وہ کیا کہو گے تم — اب کیا کہیں بتاؤ دل داد خواہ سے

ہر اک بت کو ہے بے نیازی کا دعویٰ — خداوند عالم یہ کیا ہو رہا ہے

آزاد ہوئے پھر بھی نہ آزاد رہیں گے — ہم ہو کے اسیر غم صیاد رہیں گے

باتوں سے ہے تیری رشک عیاں ظاہر — ناصح بھی کسی کا یار ہوگا

کعبہ میں جب کوئی نہ ملا ہم کو اے خیال — مجبور ہو کے جانب کوئے بتاں چلے

ہر وقت دل میں رہتا ہے کیسی کہ دھیلے — تیری طرح خیال ترا بے وفا نہیں

آج رندوں نے بھی واعظ کو سرافراز کیا — آ گئی صافی مے کے لیے بیتا پسند

کرتے بیدار ابھی صبح قیامت ہم کو — دن چڑھے تک ہے پڑے سونے کی عادت ہم کو

ان کی نگاہ نے، مری حسرت نے بزم میں — تصویر کھینچ دی ہے سوال و جواب کی

خطا معاف ہو لے محتسب کہ تیری طرح
سیاہ قلب نہیں ہوں سیاہ کاروں میں



اپنے وطن کی خاطر

خورشید احمد جامی

وہ اک سحر جس کو ہم نے تم نے
عزیز رکھا، عزیز جانا
سکھا دیا جس کی تابشوں نے
لہو کی فصلوں کو مسکرانا

نگارِ آزادیِ وطن پر
جہاں گلوں کا نکھار آیا
حسین آنکھوں سے پیار جھانکے
تو وقت کا اعتبار آیا

جبیں کی چاندی، نظر کا سونا
نئی اُمنگیں، نئے ترانے
بنامِ عہدِ وفا ملے ہیں
وصالِ محبوب کے خزانے

جہاں دکھائے ہیں دل بری نے
زمردیں خواب کے جزیرے
جہاں تراشے ہیں زندگی نے
شعورِ فکر و نظر کے ہیرے

جسے بڑی مشکلوں سے پایا
اُسے بچانے کا حوصلہ ہے
اجل کی بے نور وادیوں تک
قدم بڑھانے کا حوصلہ ہے

جوان و بیدار ہمتوں پر
کسی کا جادو نہ چل سکے گا!
جہادِ عزم و یقیں کا سورج
نہ ڈھل سکا ہے، نہ ڈھل سکے گا



(نیا دور کے اگست نمبر کے سرورق سے متاثر ہو کر)

شاد عارفی

اے راجا اِندر[1] کے پنچھی — اے بھارت کے "من ہر پنچھی"[2]
رونق پرجنگل ہے تجھ سے — جنگل میں منگل ہے تجھ سے
میٹھی لَے میں بولے جا تو — کانوں میں رس گھولے جا تو
ناچے جا دُم کھولے کھولے — دُم کا بوجھ بدن پر تولے

مت ڈر میں صیاد نہیں ہوں
شاعر ہوں، اُفتاد نہیں ہوں

کتنا سُندر تاج ہے تیرا — سُندر بن تک[3] راج ہے تیرا
سج دھج پوری[4] ہے ساری تیری — صورت پیاری پیاری تیری
ساون نے جب جوڑا کھولا — بجلی چمکی اور تو بولا
گت سُن کر "پی ہو پی ہو" کی — سنگت میں کوئل بھی کُوکی
جب پُروا سنکی، "جھڑ لاگے" — دادر[5] اور پپیہے جاگے
برکھا کی شوبھا ہے تجھ سے — باغوں میں چرچا ہے تجھ سے
تیری چال بڑی "مت والی"[6] — بدلی دھیمی بہنے والی
چڑھتی جائے جوانی تیری — دُنیا ہو دیوانی تیری
بے فکری سے ناچے جا تو — مجھ کو خاطر میں مت لا تو

جاتا ہے جنگھاڑ سنا جا
بستی کے، سوتوں[7] کو جگا جا

---

[1] اِندر اُردو میں سحر کے   [2] قومی پرندہ   [3] چُنری
[4] مینڈک   [5] قافیہ درست ہے   [6] محبِّ وطن سے بے خبر لوگ

زندگی کا راز ـــــ توانائی

اطہر پرویز

توانائی ہماری زندگی کا راز ہے۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے توانائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہم چلتے پھرتے ہیں، دوڑتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں، پڑھتے لکھتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں غرض جو بھی کام کرتے ہیں، اس کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ سونے کے لیے بھی توانائی ضروری ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بیمار کو نیند کم آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے جسم میں بیماری کے سبب سے توانائی کم ہو جاتی ہے۔ اگر ہمارے جسم میں توانائی نہ ہو تو ہم زندہ نہ رہ سکیں۔

ہمارا جسم بھی ایک طرح کا انجن ہے۔ جس طرح انجن کو چلانے کے لیے کوئلے کے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے جسم کے انجن کو چلانے کے لیے غذا کے ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ہم دو وقت کھانا نہ کھائیں تو ہمیں کمزوری محسوس ہوگی۔

جب کوئلہ جلتا ہے تو اس میں توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہمارے جسم میں جب غذا پہنچتی ہے تو توانائی پیدا ہوتی ہے۔

یہ توانائی نہ صرف ہمارے لیے ضروری ہے بلکہ ہر جاندار اس کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ یہ جاندار چاہے جانور ہوں یا پودے، دونوں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے اپنے جسم میں غذا کے ذریعے توانائی پہنچاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ پودوں اور جانوروں کی غذائیں مختلف ہوتی ہیں۔

جانور تین قسم کی غذا استعمال کرتے ہیں۔ شکر، تیل اور پروٹین۔ انسان اپنی غذا جانوروں اور پودوں سے حاصل کرتا ہے۔ وہ جانور جو پودوں کے سہارے زندہ رہتے ہیں اُن کی غذا وہ پودے ہیں جو زمین میں اُگتے ہیں۔ پودے بھی جاندار ہوتے ہیں، اس لیے انھیں بھی توانائی حاصل کرنے کے لیے غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ یہ غذا سورج سے حاصل کرتے ہیں اور زمین سے بھی۔ اُن کی یہ غذا زمین میں امونیم سلفیٹ، امونیم نائٹریٹ اور پانی کی شکل میں ہوتی ہے۔

پودے ان تمام چیزوں کی مدد سے اپنی غذا خود بناتے ہیں۔ لیکن انسان اپنی غذا خود تیار نہیں کرتا، وہ اسے پودوں سے حاصل کرتا ہے۔

پودے سورج کی روشنی سے بھی توانائی حاصل کرتے ہیں۔ روشنی خود ایک قسم کی توانائی ہے۔ جب یہ پودوں پر پڑتی ہے تو پودے اس کو اپنے اندر جذب کر لیتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پودوں کے اندر ایک طرح کا ایک ہرے رنگ کا مادّہ ہوتا ہے جسے "کلوروفل" کہتے ہیں۔ پودے اسی کلوروفل کی مدد سے اس روشنی کو توانائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف پودے ہی روشنی کو توانائی میں تبدیل کرتے ہیں۔ جانور بھی پودوں کی طرح سورج سے توانائی حاصل کرتے ہیں۔ سورج کی دھوپ سے ہمارے جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے لیکن سرد ملکوں میں جہاں سورج کبھی کبھا نکلتا ہے، لوگ مصنوعی طریقوں سے گرمی حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لوگ جانوروں کی کھالوں کے کپڑے پہنتے ہیں، آگ تاپتے ہیں اور کھانے میں گرم چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ جب انسان پہلے پہل تہذیبی زندگی میں داخل ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ آگ سے توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے انسان نے اپنا کھانا پکانا شروع کیا۔ اب اس کا کھانا زیادہ مزیدار بھی ہونے لگا۔ آگ سے یہی ایک فائدہ نہیں ہوا۔ پہلے جب وہ مٹی کے برتن بناتا تو وہ ٹوٹ جاتے تھے۔ اب برتن ٹوٹتے نہیں تھے کیونکہ وہ انھیں آگ سے تپا کر مضبوط بناتا تھا اور یہی نہیں، بعد میں وہ آگ سے دھاتوں کو پگھلا کر ان کے برتن بنانے لگا۔

آدمی عام طور پر خود کام کرنے سے بچنا چاہتا ہے۔ اس کا جی چاہتا ہے کہ اُسے کوئی ترکیب معلوم ہو جائے کہ وہ مقررہ وقت میں کم کام کر کے زیادہ فائدے حاصل کرے۔ اسی لیے اسے فکر ہوئی کہ کسی ایسی ترکیب کا پتہ لگانا چاہیئے کہ وہ اپنی طاقت کو بچائے رکھے اور کہیں اور سے توانائی حاصل کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے گھوڑے پر سواری شروع کردی اور وہ اپنے پاؤں پر چلے بغیر کہیں سے کہیں پہنچنے لگا۔ گویا یہ جانور کی توانائی کا استعمال تھا۔ پھر آدمی کو معلوم ہوا کہ یہ توانائی محض جانوروں ہی میں نہیں ہوتی، بے جان چیزوں میں بھی ہوتی ہے مثلاً ہوا میں۔ وہ کشتی اور ڈونگے میں بیٹھ کر دریا پار کرنے لگا لیکن کشتی کی پتوار اسے خود ہی چلانی پڑتی۔ اس لیے اُس نے تاڑ کے پتّوں کے بادبان بنائے اور انھیں کشتی پر لگا دیا۔ بادبان میں ہوا بھر جاتی اور اُس کی کشتی چلنے لگتی۔ یہ بادبان ہوا کی توانائی سے کام کرتے تھے اور اسی وقت کشتی کو کھینچتے جب ہوا کے رُخ پر ہوں۔ لیکن اس کے باوجود آدمی نے کسی حد تک اپنی محنت بچالی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ توانائی آئی کہاں سے؟ بات یہ ہے کہ ہماری دنیا کا سارا کاروبار سورج کی بدولت چلتا ہے۔ مثلاً ہم کوئلے یا لکڑی سے اپنا کھانا پکاتے ہیں۔ یہ لکڑی اور کوئلہ کہاں سے آتا ہے؟ جب پُرانے درخت کاٹ ڈالے جاتے ہیں تو ان کا ایندھن بنایا جاتا ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو درخت بھی نہ اُگیں۔ کچھ جانور پودے کھاتے ہیں۔ بعض جانور ایسے جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں جن کی غذا سبزی ہے۔ ہم چاہے گوشت کھاتے ہوں یا سبزی، اپنا کھانا پکانے کے لیے کوئلہ جلاتے ہیں یا لکڑی۔ ان سب کے لیے سورج کی مدد ضروری ہے۔

اس طرح سورج کی بدولت ہوا بھی چلتی ہے۔ یہ گرم ہوا ٹھنڈی ہوا کے مقابلے میں ہلکی ہوتی ہے۔ اسی لیے گرم ہوا اوپر اُٹھتی ہے اور ٹھنڈی ہوا نیچے جاتی ہے اور اس طرح ہوا میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ ہوا میں توانائی ہوتی ہے کیونکہ یہ حرکت کرتی ہے اور ہوا کی یہ حرکت سورج کی بدولت ہوتی ہے۔

قدیم انسان کو پانی کی طاقت کا اندازہ پہلے ہی ہو چکا تھا کیونکہ پُرانے زمانے میں لوگ دریاؤں کے ذریعہ بڑے بڑے شہتیروں کو بہاکر لے جاتے تھے۔ گویا جو کام بعد میں ریلوے انجن سے لیا گیا وہ پانی کے ذریعہ پہلے ہی لیا جا چکا تھا۔ لیکن سچ پوچھیے تو پانی کی توانائی بعد میں دریافت ہوئی۔ آٹا پیسنے کے لیے نہر یا دریا کے کنارے چکیاں لگائی جاتی تھیں، جنھیں لوگ "پن چکی" کہتے تھے۔ پانی کی اس طاقت کو استعمال کرنے کے لیے ہمیں پانی کو اونچائی سے گرانا پڑتا ہے۔ پانی جتنی اونچائی سے گرے گا اتنا ہی زیادہ توانائی ہوگی۔

جب انسان آج کے مقابلے میں سادہ زندگی گزارتا تھا تو وہ محض ہوا اور پانی کے ذریعہ توانائی حاصل کرتا تھا لیکن جیسے جیسے اس کی ضرورتیں بڑھنے لگیں اس کو توانائی کے دوسرے ذریعوں کی تلاش ہوئی کیونکہ اسے زیادہ مقدار میں مختلف چیزیں درکار تھیں۔ دنیا کی آبادی بڑھنے کی وجہ سے توانائی کی ضرورت بھی بڑھتی جارہی ہے۔

آج کل یہ توانائی کوئلے اور تیل کے ذریعہ حاصل کی جارہی ہے۔ کوئلے کے ذریعہ سے بھاپ بنتی ہے اور بھاپ کے ذریعہ انجن چلتے ہیں۔ آج ہماری صنعتوں میں کوئلے کی بڑی اہمیت ہے۔ ہمارے کارخانوں اور ریل کے انجنوں کو بھی کوئلے کی ضرورت پڑتی ہے۔

جس طرح ہم کوئلے سے توانائی حاصل کرتے ہیں اسی طرح ہم تیل کے ذریعہ بھی توانائی حاصل کرتے ہیں۔ تیل کے ذریعہ توانائی حاصل کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایک زمانے سے انسان تیل کے چراغ جلاتا آرہا ہے۔ یہ تیل بیجوں کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا یا جانوروں کی چربی سے نکالا جاتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا لوگوں نے سوچا کہ یہ تیل ناکافی ہوگا۔ پھر زمین سے مٹی کا تیل نکالا گیا۔ اس کے علاوہ پٹرول بھی زمین سے نکالا گیا۔ اب یہ سوال پھر پیدا ہے کہ زمین کے اندر یہ کوئلے اور تیل کا خزانہ کہاں سے آیا؟

آج سے لاکھوں کروڑوں سال پہلے پیڑوں کے بڑے بڑے جنگلات زمین کے نیچے دب گئے اور بعد میں جب کانیں کھودی گئیں تو لکڑی کا یہ دبا ہوا خزانہ کوئلے کی شکل میں نکلنے لگا۔ ہم اس کوئلے کو جلا کر توانائی حاصل کرتے ہیں۔

تیل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ جانوروں سے تیار ہوا۔

وہ جانور جو اب سے لاکھوں برس پہلے زمین میں دب گئے تھے، زمین کی گرمی اور دباؤ نے ان کا تیل نکال دیا۔ اب ہم تیل کو کانوں سے نکالتے اور اس کے ذریعہ توانائی حاصل کرتے ہیں۔

ہماری آج کی دنیا لاکھوں برس پہلے کی چیزوں سے توانائی حاصل کر رہی ہے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ توانائی کا سب سے بڑا خزانہ سورج ہے۔ سورج ہی سے ہم توانائی حاصل کرتے ہیں۔ گویا سورج دن بھر توانائی کا راشن گرمی اور روشنی کی شکل میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔ سورج کی کچھ توانائی پودے محفوظ کر لیتے ہیں۔ اس کی کچھ گرمی فضا میں جذب ہو جاتی ہے اور جب سورج چھپ جاتا ہے تو فضا کی اس گرمی سے ہم اپنے آپ کو گرم رکھتے ہیں۔

جرمنی کے ایک سائنس داں نے ایک ایسا ریڈیو بنایا ہے جو سورج کی گرمی سے کام کرتا ہے۔ اس میں بجلی کے تار یا بیٹری کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ریڈیو کا پچھلا حصہ کھول کر اس کو دھوپ میں رکھنا پڑتا ہے۔ اس میں سورج کی گرمی اکٹھا کرنے والی مشین ہوتی ہے جو سگار کے بکس کے برابر ہے۔

ہمارے ملک میں ایندھن کی بڑی کمی ہے۔ دوسرے ملکوں میں ایندھن کے لیے گیس اور بجلی کا استعمال عام ہے۔ ہندوستان گرم ملک ہے، اس لیے صرف کھانا پکانے کے لیے ہی ایندھن کی ضرورت پڑتی ہے لیکن اس کام کے لیے بھی ہمارا ایندھن پورا نہیں پڑتا۔ چنانچہ ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ گوبر کے اوپلوں سے کھانا پکاتے ہیں۔ یہ گوبر ہماری کھاد کے کام میں آنا چاہیے۔ اگر یہ کھاد میں استعمال ہو تو ہماری زراعتی پیداوار بڑھے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں لوگ نادانی میں اس کھاد کو جلا دیتے ہیں اور اس سے ایندھن کا کام لیتے ہیں۔

ایندھن کے لیے ہمارے یہاں لکڑی بھی استعمال ہوتی ہے نتیجہ ایندھن کے لیے بڑے بڑے بن کاٹ ڈالے جاتے ہیں۔ جب بن کٹ جاتے ہیں تو ان کے کٹنے سے ریگستان بڑھنے لگتے ہیں کیونکہ بن، موسموں کو قابو میں رکھتے ہیں۔

دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں میں لوگ کوئلے اور تیل کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ زمین کے اپنے خزانے سے کوئلہ اور تیل برابر نکالا جا رہا ہے اور زمین کی معدنی دولت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے مگر کوئلہ اور تیل کا برابر نکلتے رہنا ضروری ہے۔ آج ساری دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ صنعتی ترقی ہو رہی ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ کوئلے اور تیل کا خرچ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ڈیڑھ سو سال کے اندر زمین کا کوئلے اور تیل کا خزانہ خالی ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس دانوں کو کسی ایسی توانائی کی تلاش تھی جو اس کی جگہ لے لے ورنہ ایک دن ایسا آئے گا جب ہمارے کارخانے ایک دم سے چلتے چلتے رک جائیں گے۔

اب آیئے توانائی کی کچھ شکلوں کے بارے میں غور کریں۔ ان میں حرارت، روشنی، اور بجلی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حرارت توانائی کی ایک قسم ہے۔ جسم کے اندر حرارت (H E A T) پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم کھانا کھاتے ہیں تو ہماری غذا سے توانائی پیدا ہوتی ہے۔ یہی توانائی ہمارے جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ ہم سورج سے بھی حرارت حاصل کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب ایندھن جلایا جاتا ہے تو ہوا میں حرارت سرایت کر جاتی ہے۔

حرارت کو طبعی توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ بجلی کا پنکھا چلایا جا سکتا ہے۔ بھاپ کے انجن میں یہ گرمی پانی کو گرم کر دیتی ہے۔ بھاپ کی وجہ سے حرکت بھی پیدا ہوتی ہے۔ بھاپ کو بجلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسے روشنی میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی چیز کو خوب گرم کیا جائے تو اس میں روشنی اور چمک پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح گیس لیمپ جلتا ہے۔

حرارت زندگی کا سرچشمہ ہے۔ ہمیں زندہ رہنے کے لیے ہر لمحہ حرارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر حرارت کی مقدار ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو انسان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ اس لیے حرارت خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ حرارت خطرناک ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے۔ جسم چھو کر ہم اس کی حرارت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ آپ آگ کے پاس جایئے آپ کو اس

حرارت دور ہی سے محسوس ہوگی اور آپ خود اندازہ لگا سکیں گے کہ آپ اس حرارت کو کس حد تک برداشت کر سکتے ہیں۔ سائنس دانوں نے ایسے آلے تیار کیے ہیں جن کی مدد سے وہ کسی چیز کا درجۂ حرارت معلوم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک آلہ تھرمامیٹر ہے جس سے جسم کی حرارت معلوم ہو جاتی ہے۔

توانائی کی ایک اور شکل روشنی ہے۔ ہم سورج کے ذریعہ روشنی حاصل کرتے ہیں اور رات کے وقت چاند بھی ہماری دنیا کو روشن کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ چاند کی یہ روشنی اس کی اپنی نہیں ہوتی۔

سورج کے علاوہ ہم دوسرے طریقوں سے بھی روشنی حاصل کرتے ہیں۔ جب کوئلہ یا تیل جلایا جاتا ہے تو اس سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور کچھ روشنی نکلتی ہے۔ روشنی کو بجلی کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔ اسے حرارت میں بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے اور پھر طبعی توانائی کی شکل دی جا سکتی ہے۔

پودے سورج سے روشنی حاصل کر کے اس کو طبعی توانائی میں منتقل کرتے ہیں۔ روشنی زندگی کے لیے ضروری ہے۔

جو چیز حرکت کرتی ہے وہ اپنے ساتھ توانائی لے کر چلتی ہے۔ وہ چیز چاہے چلتی ہوئی ہوا ہو یا بہتا ہوا پانی۔ توانائی حرکت کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ متحرک توانائی کو بجلی کی شکل میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ بجلی کو حرارت کی شکل دی جا سکتی ہے۔ اسے روشنی میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔

توانائی ہماری زندگی کے لیے ضروری ہے۔ اگر غذا میں توانائی نہ ہو تو ہم زندہ نہ رہ سکیں۔ اسی کے ساتھ، مقدار سے زیادہ توانائی انسان برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کے زور سے مکا مارا جائے تو اس کے چوٹ لگے گی۔ ہاتھ کی رفتار جتنی زیادہ تیز ہوگی، اتنی ہی زیادہ چوٹ لگے گی۔ اسی لیے بندوق کی گولی سے اتنی چوٹ لگتی ہے کہ جس کے لگ جاتی ہے اس کا بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔

توانائی کی ایک شکل بجلی ہے۔ برسات کے زمانے میں آسمان پر بجلی چمکتی نظر آتی ہے۔ یہ بجلی فطرت کی اپنی ہے لیکن انسان نے اپنا کام چلانے کے لیے خود بجلی بنائی ہے۔ بجلی کا یہ استعمال پچاس سال سے ہو رہا ہے اور ہمیں بجلی کی وجہ سے بڑی سہولت حاصل ہے۔

بجلی کی توانائی کو تار کے ذریعہ دور دور تک لے جایا جا سکتا ہے۔ بجلی کو بڑی آسانی کے ساتھ طبعی توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بجلی کے ذریعہ انجن کو چلایا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ روشنی کی جا سکتی ہے۔ پنکھے چلائے جا سکتے ہیں۔ کمروں کو ٹھنڈا اور گرم رکھنے کے لیے بجلی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس کی مدد سے کارخانوں کی مشینیں چلائی جا سکتی ہیں۔

آج کل دنیا کے تمام ملک بجلی کی توانائی سے کام چلا رہے ہیں اور سب سے زیادہ بجلی کی توانائی امریکہ میں پیدا کی جاتی ہے۔ وہاں ۱۲ کروڑ کلوواٹ بجلی بنتی ہے۔ ہمارے ملک میں بھی زیادہ بجلی پیدا کرنے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ امید ہے کہ تیسرے منصوبے کے آخر تک ہمارے ملک میں ایک کروڑ ۲۶ لاکھ، ۹۰ ہزار کلوواٹ بجلی بننے لگے گی۔

لیکن اب انسان برابر ترقی کر رہا ہے اور توانائی کے دوسرے ذریعوں کی تلاش میں مصروف ہے۔ ان میں ایٹم موثر ترین ذریعہ ہے۔ اس کے ٹکڑے کرنے کے بعد تو توانائی کا اتنا زبردست ذخیرہ دریافت ہوا ہے کہ اس سے بڑے بڑے کام لیے جا سکتے ہیں مگر بدنصیبی یہ ہے کہ وہ ایٹم جو دنیا کو بہت کچھ دے سکتا ہے، انسانیت کی ترقی اور خوش حالی میں مدد کر سکتا ہے، اس سے دنیا کی تباہی اور بربادی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ پچھلی بڑی لڑائی میں ایٹم بم جاپان کے دو شہروں پر گرائے گئے جس سے ہزاروں لاکھوں آدمی مر گئے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم ایٹم سے نفرت کرنے لگیں اور اس کی نعمتوں کو ٹھکرا دیں۔ آگ ہی کو لیجیے اس سے گھر جل سکتے ہیں اور اسی سے ہم اپنا کھانا بھی پکاتے ہیں لیکن ہم آگ کو اس لیے نہیں چھوڑتے کہ اس سے گھر جل سکتے ہیں۔

ایٹمی توانائی کو ہم صنعتی ترقی، زراعتی پیداوار، صحت اور علاج وغیرہ کے کاموں میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اپنی زراعت کو بہت زیادہ ترقی دے سکتے ہیں۔ مثلاً اچھی کھاد تیار کی جا سکتی ہے۔ سبزیوں اور ترکاریوں کو

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۹ پر)

غزل

جگر بریلوی

شکستہ خاطر و محروم و دل فگار ملے
گدائے در ترے پھر بھی امیدوار ملے

نہ جانے کتنی بہاروں کو راہ میں چھوڑا
کہ اب ملے ہمیں، اب آستانِ یار ملے

جنھوں نے شمعیں جلائیں رہ محبت میں
وہ خستہ حال و زبوں زار و دل فگار ملے

ہزاروں سال جیے جائے کوئی مر مر کے
ذرا کہیں سے جو ایماے انتظار ملے

گئے تھے ڈھونڈنے دل کو رہِ محبت میں
ہمیں ملے تو کچھ اُڑتے ہوئے شرار ملے

ہے جس کی دُردِ شباب و شراب کی مستی
کبھی ہمیں بھی وہ بادۂ نگاہِ یار ملے

تمام عمر اسی سعی و اُمید میں گزری
کسی روش سے کبھی تو مزاجِ یار ملے

زیادہ ہم سے بھی نکلے وہ سینہ ریش و فگار
نصیب سے جو کبھی ہم کو غم گسار ملے

نثارِ عشق جگر ایک اور کیجے عمر
کہیں سے نقد ملے یا کہیں اُدھار ملے

غزل

نشتر سندیلوی

دل میں طوفانِ غم آزردگیِ دل سے اُٹھا
عشقِ ناکامِ نظر، حسن کی محفل سے اُٹھا

قعرِ دریا سے نکل آئی تھی بچ کر کشتی
اُف! وہ طوفانِ بلاخیز، کہ ساحل سے اُٹھا

انقلابِ اثرِ آہ، مبارک اے قیس!
دیکھ، وہ دیکھ! دھواں پردۂ محمل سے اُٹھا

جلوے ہی جلوے ہیں، کر قطع نظر دُنیا سے
بند کی آنکھ جہاں، پردہ درِ دل سے اُٹھا

کس مسافر کے قدم تا سرِ منزل آئے
غلغلہ تہنیتِ شوق کا منزل سے اُٹھا

دَبک اُٹھی ہے دبی آگ کی اک چنگاری
آئی کیا یاد تری، شعلہ بھی دل سے اُٹھا

کانپ اُٹھی روح کہ پھر ہجر کی گھڑیاں آئیں
دل دھڑکنے لگا جس دم کوئی محفل سے اُٹھا

رونقِ بزمِ محبت ہے ترا سوختہ جاں
رہنے دے جلتی ہوئی شمع نہ محفل سے اُٹھا

غفلتیں دُور ہوئیں کھُل گئیں آنکھیں نشتر
نقش اُجاگر ہوئے پردہ جو درِ دل سے اُٹھا



رام لعل

رات کی خاموشی میں بجلی کے جنریٹر کی آواز میلوں تک پہنچ رہی تھی۔ اس کے ساتھ پانی کھینچنے والے ہائیڈرالک پمپ کی آواز بھی شامل ہوگئی تھی۔ چند فرلانگ کے فاصلے پر اپنے ٹینٹ کے باہر ایک چارپائی پر لیٹے ہوئے اسسٹنٹ برج انجینئر پرمانک کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ کتنی دیر سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ کبھی اِس پہلو کبھی اُس پہلو۔ لیکن نیند تھی کہ اُس سے کوسوں دور۔ جیسے کسی جیالے عاشق سے اُس کی محبوبہ بچھڑ جائے۔

لیکن اس کی محبوبہ تو اس کی اپنی بیوی تھی۔ جہاں وہ لیٹا ہوا تھا وہاں سے دس میل دور لکھنؤ کے ایک خوبصورت سرکاری بنگلے میں رہتی تھی۔ پرمانک اس کی وجہ سے متفکر نہیں تھا۔ آج ہی دن میں اس سے مل کر آیا تھا۔ دن میں ایک بار ضرور اس سے مل آتا تھا۔ جب بھی موقعہ پاتا۔ دوپہر میں یا شام کے وقت۔ موٹر سائیکل پر وہاں پہنچتے دیر ہی کتنی لگتی تھی!

اُس کی بے چینی کا کارن دوسرا تھا۔ دوسرے دن صبح نو بجے نئے پل اور نئے ٹریک کا اُدگھاٹن (افتتاح) ہونے والا تھا۔ وہاں سے پہلی بار پسنجر گاڑی گزرے گی۔ چھ مہینے کے بعد پرانے ٹریک کے سامنے ایک نیا ٹریک تیار کرلیا گیا تھا۔ پُرانے ٹریک سے پانچ فٹ اونچا۔

وہ تکیے پر سے سر اُٹھا کر جنریٹر کی روشنی کی طرف دیکھنے لگا۔ تیز روشنی میں سیندوری رنگ کے پل کے گارڈر اور ستون چمک رہے تھے۔ وہیں پانی کی ایک تیز دھار بھی ایک خاصے بڑے پمپ میں سے نکل نکل کر ایک کھیت میں گر رہی تھی۔ یہ پمپ پچھلے تین مہینوں سے لگاتار پانی اُگل رہا تھا۔ آس پاس کے سارے کھیت سیراب ہوچکے تھے۔ لیکن وہاں کبھی کچھ اُگتا نہیں تھا۔ وہاں ہر سال سیلاب کا پانی آجاتا تھا۔ زمینیں اسی طرح پڑی رہتی تھیں۔

پرمانک کے ذہن میں کئی طرح کے خیالات پیدا ہورہے تھے۔ پھر ایک دوسرے میں خلط ملط بھی ہوجاتے تھے۔ اپنی چھ مہینوں کی جی توڑ محنت کے بعد اب آزمائش کی ایک اور منزل آگئی تھی۔ اس نے اور اسکے ساتھی لائن بچھانے والے انجینئروں نے جون سے پہلے پہلے ٹریک اور پل تیار کردینے کا پلان بنایا تھا۔ پل بن چکا تھا۔ ٹریک بھی تیار تھا۔ اُس دن جون کی گیارہ تاریخ تھی۔ دوسرے دن صبح ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ اور دوسرے اعلیٰ افسران اس پل پر سے گاڑی میں بیٹھ کر جانے والے تھے۔ اُس کا دل کل کے اس معائنے کے تصور سے دھڑک رہا تھا۔

آج دن میں جب وہ اپنے بائیس ڈی بنگلے میں سے نکل رہا تھا تو پورنیما نے اُسے اچانک پیچھے سے پکارا تھا۔ اُسے کمرے کے اندر لے گئی تھی۔ وہ حیران تھا، پورنیما کہنا کیا چاہتی ہے۔ پردے کے پیچھے پہنچا تو اُس نے پورنیما کے ہاتھ میں سیندور کی ایک ڈبیہ دیکھی جس میں وہ اپنی ایک انگلی رکھے کھڑی تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ذرا فاصلے پر چپ چاپ کھڑا رہا۔

"شونو"

"کی بیتیر!" (کیا بات ہے؟)

"اِکھانے تو ایشو!" (یہاں تو آؤ)

وہ اس کے اصرار پر اُس کے قریب چلا گیا۔ دراصل وہ جلدی میں تھا۔ صرف کھانا کھانے کے لئے ہی تھوڑا سا وقت نکال کر پہنچا تھا۔

پورنیما نے سیندور سے بھری ہوئی انگلی اُس کے ماتھے پر ٹکا دی تھی اور مسکرا بھی دی تھی ــــــ وہی گہری مسکراہٹ جسے دیکھ کر وہ لوٹ پوٹ ہوجایا کرتا تھا۔

"دُیا شبھو۔ بُجھلے؟ کل شاکالے آمی تُمر کاچھے تھک بونا۔ آر آمی جودی تھاک تُم کنتو آمرآتما تُمر ساتھے تھاک بے۔ بِشاش کرو۔"

(یہ شگن ہے، سمجھے؟ کل صبح میں آپ کے ساتھ نہیں ہوں گی۔ لیکن میری آتما آپ کے ساتھ ہوگی۔ وشواش کرو۔)

وہ کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا اور اُس نے شرماکر سر جھکا لیا تھا۔ پرمانک نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے بھی لگا لیا تھا۔ پورنیما نے اُس کی چوڑی چھاتی پر سر رکھ کر اور اُس کی بش شرٹ کے بٹن کو گھماتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سپھل آنندی اسے کی دیوے؟"

(سپھل ہونے کی خوشی میں مجھے کیا دیجئے گا؟)

"جا تمی چاہبے ۔" (جو تمہیں چاہئے) یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر چلا آیا تھا۔ اُسے بہت جلدی تھی نا! وہ اُسے پیار بھری نظروں سے تکتی رہی تھی۔ لیکن اُس نے ابھی موٹر سائیکل اسٹارٹ بھی نہیں کی تھی کہ وہ اچانک ایک خیال آجانے پر اُس کے پاس واپس چلا گیا تھا۔

"بولو' تمی کی چاؤ؟" (بولو، تمھیں کیا چاہئے)

"چاؤ چاؤ کچھو نائیں ۔" پورنیما کی آنکھوں میں شوخی اور مسکاہٹ دونوں بھر گئیں ۔

"نانا بولو ۔ ساڑی گہنا' کونوں اُپہار ؟ ایک بار ٹھکیے بولنا"۔ پرمانک جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ جب پورنیما نے یہ دیکھا تو وہ مسکرا کر بول اُٹھی:" پورو دیش گھُر مو ۔ اُتر تھیکے دکھن ۔ پور بو تھیکے پچھم ۔"

(سارے دیش کی یاترا۔ اُتر سے دکھن تک اور پورب سے پچھم تک۔)

"بس !! " یہ سُن کر پرمانک کو جیسے اُس کی مورکھتا پر ہنسی آگئی۔ بولا۔

"پروجیکٹ پورو ہوئے ۔ دُو ماشے لمبا چھٹی نیبو ۔ ریلیر فری پاس نیبو۔ تاکھن تو مینئیں فسٹ کلاس گھور بو ۔ جیکھانے جیکھانے تمی جیتے چاؤ ۔"

(پروجیکٹ مکمل ہوتے ہی دو مہینے کی لمبی چھٹی لے لوں گا۔ ریلوے کا فری پاس لوں گا۔ پھر تمہیں فرسٹ کلاس میں' جہاں جہاں چاہو گی لئے پھروں گا۔)

وہ اُسے وشواس دلا کر اور مسکرا کر وہاں سے چلا آیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ جنریٹر اور ہائیڈرولک پمپ کی آواز بھول کر پورنیا کی ہنسی کے تصور میں کھویا ہوا بیٹھا رہا۔ اس کی معصومیت کے تصور میں ــــــ اُتر تھیکے دکھن ۔ پور بو تھیکے پچھم !! پورو دیش گھُر مو !! پورو دیش گھُر مو !!

اس کی آواز اب بھی پرمانک کے کانوں میں گونج رہی تھی ۔ اور وہ اپنے آپ مسکرا رہا تھا ۔

کچھ دیر بعد اس نے رات کے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے شمال اور مغرب کی طرف دیکھا' مشرق سے جنوب کی طرف بھی۔ تو اُس کے سامنے جیسے کلکتہ' دارجلنگ' منی پور' بمبئی' تنجور' کونارک' کیرالا اور کشمیر تک آکھڑے ہوئے ۔ اودے پور اور جے پور بھی دکھائی دیئے ۔ اس کے لئے کہیں بھی پہنچنا مشکل نہیں تھا ۔

پھر اُس کے سامنے دھرتی کے سینے پر اُبھرے ہوئے بیشمار خیمے آگئے ۔ ذرا ذرا فاصلے پر کئی انجینیر چارپائیوں پر پڑے سو رہے تھے ۔ قطار در قطار ۔ وہ سب کئی مہینوں کے بعد آج آرام کی نیند سوئے تھے ۔ زمین سے بیس پچیس فٹ اونچی پٹری ان ہی لوگوں نے بنائی تھی۔ ارد گرد کی ساری دھرتی کھود ڈالی تھی ۔ مٹی ڈھو ڈھو کر اتنا اونچا باندھ بنا ڈالا تھا کہ اب سیلاب کا پانی اُس کے اوپر تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہر سال سیلاب ریلوے کی پٹری کے اوپر چلا جاتا تھا۔ گاڑیاں بھی بند ہو جاتی تھیں۔ لوگوں کا اور ضروری سامان کا آنا جانا بند ہو جاتا تھا۔ اب لاکھوں ٹن مٹی اور پتھروں کی مدد سے ایک مضبوط پشتہ تیار ہو چکا تھا۔ اس سال سیلاب کا پانی آئے گا تو اس پشتے کے ساتھ ٹکرا کر منہ کی کھائے گا۔ پُرانے پُل کے دس ستون تھے۔ ان کے درمیان سے پانی کو گزرنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ ستون بھی کمزور ہو گئے تھے۔ اب دس کی بجائے صرف چھ ستون تعمیر کئے گئے تھے۔ اب بپھرا ہوا اور تیزی سے منزلیں مارتا ہوا پانی زیادہ مقدار میں نکل سکتا تھا۔

اچانک پرمانک کو اندھیرے کی گہرائی زیادہ ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے روشنی بجھ گئی ہو۔ لیکن روشنی تو ہو رہی تھی۔ اُس نے اِدھر اُدھر غور سے دیکھا۔ یکا یک بادلوں کی گڑگڑاہٹ سُنائی دی۔ اس نے چونک کر سر اُٹھایا۔ حدِ نظر تک بادل ہی بادل چھا گئے تھے۔ دور پورب

میں بجلی بھی چمک رہی تھی ۔ وہ چارپائی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا ۔
کچھ اور لوگ بھی جاگ پڑے۔ ان کی ملی جلی آوازیں سنائی دینے لگیں۔
بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ ہی پرمانک کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ اس نے ایک خطرے کا احساس کیا۔

مون سون شروع ہونے میں ابھی آٹھ روز باقی تھے۔ موسم کے پنڈتوں نے پیش گوئی کی تھی کہ اس بار بارش ایک ہفتہ دیر سے شروع ہوگی۔ اگر بارش وقت سے پہلے شروع ہو گئی تو ہو سکتا ہے چار میل لمبی پٹری کسی نہ کسی جگہ پر بیٹھ جائے۔

وہ نائٹ ڈریس ہی میں چپل پہنے ہوئے پل کی طرف چل پڑا ۔ دو ایک بار تو بجلی اس کے عین اوپر چمک گئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

پل کے نیچے ورکس مستری کی نگرانی میں چاروں آدمی ہائیڈرالک پمپ پر کام کر رہے تھے۔ جب نئے ستونوں کی بنیادیں کھودی جا رہی تھیں تو ایک جگہ اچانک پانی کا سوتا پھوٹ پڑا تھا۔ سوتے کے پھوٹتے ہی سارا پروجیکٹ ناکام ہوتا نظر آنے لگا تھا۔ ستونوں کے نیچے اینٹوں اور سیمنٹ سے بنی آٹھ فٹ موٹی چادر بنا دی گئی تھی۔ لیکن پھر بھی اس ایک ستون کے نیچے سے پانی پھوٹ رہا تھا۔ پمپ پانی کو نکالنے کے لئے دن رات مصروف رہتا تھا۔ جس قدر پانی نکالا جاتا اسی قدر پھر بھر جاتا۔ لگتا تھا دھرتی کے سینے میں کوئی گھاؤ لگا ہوا ہے۔ جو بھرنے ہی میں نہیں آتا۔ یا پھر وہ سوتا سمندر کی ایک آنکھ ہے۔ سمندر اسی آنکھ کی مدد سے دھرتی پر کام کرنے والوں کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ اسے دھرتی والوں کا محنت کرنا پسند نہیں آیا۔

پرمانک نے اس آنکھ کو بند کرنے کے لئے اپنی ساری قابلیت صرف کر دی تھی۔ پانی کھینچنے کے ساتھ ساتھ اس سوراخ میں ہزاروں من پتھر اور سیمنٹ بھی جھونک دیا تھا۔ پانی کی مقدار کم ہو رہی تھی۔ پانی میں گھلا ہوا سیمنٹ باہر آ جاتا تھا۔ ابھی پانی کو کھینچنے کے لئے چند ہفتے اور درکار تھے۔ لیکن اس کے باوجود گاڑی پل پر سے گذر سکتی تھی۔ پرمانک کا یہی خیال تھا۔ اسی لئے اس نے پل کو گاڑی کے لئے استعمال کرنے کی اجازت دے دی تھی۔

ورکس مستری نے اسے سلام کیا۔ پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"حضور بارش ہو گئی تو سارا پانی پلٹ کر ادھر ہی آ جائے گا!"

پرمانک بھی یہی خطرہ محسوس کر کے وہاں گیا تھا۔ وہ کتنی دیر تک بادلوں کو گھورتا رہا۔ بادلوں کے اندر بے اندازہ پانی تھا۔ یہ بادل کئی مہینوں سے تپی ہوئی پیاسی دھرتی کو سیراب بھی کر سکتے تھے اور اس چھوٹے سے پل کو ہلا دینے کی شکتی بھی رکھتے تھے۔ ایک عجیب سے خوف سے پرمانک کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ کئی مہینوں کی جدوجہد کے بعد وہ سمندر کی آنکھ کو بند کر دینے میں قریب قریب کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب سمندر کے بیٹے سر پر گرجنے لگے تھے۔ وہ صرف چند روز کی مہلت چاہتا تھا۔ کسی طرح ایک ہفتے کے لئے یہ بادل اپنا غصہ بھول کر لوٹ جائیں تو وہ سمندر کی آنکھ کو ہمیشہ کے لئے بند کر سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ بادلوں کا بڑے سے بڑا چیلنج منظور کرنے کے لئے تیار تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر ایک ستون کو چھوا۔ اسے دھیرے دھیرے اس طرح تھپکا جیسے کوئی اپنے بچے کی پیٹھ تھپتھپاتا ہے۔ اسے حوصلہ دیتا ہے۔ پھر اس نے ستونوں کے اوپر رکھے ہوئے سرخ گارڈروں کو دیکھا۔ کل ان پر سے پہلی لوکل ٹرین گزرے گی۔ دھیمے دھیمے سروں میں دل کی دھڑکنوں کا گیت گاتی ہوئی! ——

پھر وہ وہاں سے ہٹ کر سوتے کے کنارے جا کھڑا ہوا۔

دس فٹ کے گھیرے میں ستون کے پاس پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی پہلے کی طرح صاف نہیں تھا۔ اب کافی گدلا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر وہ ٹریک کی طرف گیا۔ بیس فٹ اونچی پٹری کی طرف۔ آہستہ آہستہ جما جما کر قدم رکھتا ہوا۔ اوپر پہنچا تو وہاں اسے نرمل سنگھ نظر آیا۔ وہ بھی انجینئر تھا۔ اس نے لائن بچھائی تھی۔ کچھ اور بنیان پہنے ہی ادھر چلا آیا تھا۔ وہ مٹی کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا رہا تھا۔ پرمانک کو دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بولا۔

"یہ مٹی گھنٹے بھر کا چھینٹا تو سہ جائے گی۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

پرمانک نے جھک کر مٹی کو چھوا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔
"اور بھی اگر لیبر کو پتھر ڈھونے میں لگا دیا جائے تو ہو سکے

صبح تک اس جھاڑ کا سامنا کر سکتا ہے۔!"

اُسی وقت اُن کے سر پر بہت زور سے بادل گرجے۔ دونوں نے سہم کر اوپر دیکھا۔ نرمل سنگھ نے اُس کے ساتھ اتفاق کیا دونوں سنبھل سنبھل کر نیچے اُتر گئے۔ سوتے ہوئے مزدوروں کو جگا کر خطرے کا احساس کرایا گیا۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر سارے مزدور کدالیں اور پھاوڑے اور ٹوکریاں لے کر پہنچ گئے۔ گڑگڑاتے بادلوں اور چمکتی ہوئی بجلی کے نیچے وہ سیمنٹ ملے پتھر اُٹھا اُٹھا کر سوتے کے اندر پھینکنے لگے۔ صبح ہونے میں ابھی چار گھنٹے باقی تھے۔ وہ اوور ٹائم ملنے کے لالچ میں کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ اُس پل کو بچانے کے لئے کام کر رہے تھے جو ان کی کئی مہینوں کی محنت سے تیار ہوا تھا۔ اُس وقت وہ اپنے افسران کے خلاف وہ سب شکایتیں بھی بھول گئے جو کبھی کبھی ان کے دل میں پیدا ہو جاتی تھیں۔ وقت پر چھٹی نہ ملنے کی بے وجہ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اُس وقت وہ ایک خاندان کے افراد کی طرح جٹے ہوئے تھے جو سیلاب کے خطرے کے پیش نظر گرتی ہوئی دیوار کو تھام کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

اچانک بڑے زور کی ہوا چل پڑی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ ریت اور مٹی بھی اُکھڑ اُکھڑ کر اُڑنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تیز ہوا سخت آندھی میں تبدیل ہو گئی۔ سخت آندھی میں کام کرنے والوں کے لئے اپنا توازن تک برقرار رکھنا مشکل ہو گیا۔ سر پر رکھی ہوئی ٹوکریاں اُڑ کر گر جاتی تھیں۔ لیکن اُنھوں نے ہمت نہ ہاری۔ سوتے کو بھرنے میں مصروف رہے۔

اچانک روشنی ہونے لگی۔ دور پورب میں پو پھٹی تھی۔ آندھی ہار کر خاموش ہو گئی تھی۔ اب بہت آہستہ آہستہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بادل ایک بوند تک برسائے بغیر لوٹ گئے تھے کسی اور سمت چلے گئے تھے۔ لیکن وہاں جس قدر خیمے نصب تھے سب اُڑ گئے تھے۔ درختوں پر جا اُلجھے تھے۔ وہاں جس کا جتنا بھی سامان تھا سب اُڑ چکا تھا۔ کھانے پینے اور پہننے کے کپڑوں تک۔ لیکن کسی کے چہرے پر مایوسی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ حیران تھے۔ مسکرا بھی رہے تھے۔

پرمانک اور نرمل سنگھ رات کپڑے رات کے لباس میں اُن کے پاس کھڑے رہے تھے۔ ان کا سامان بھی اُڑ چکا تھا۔

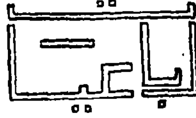
لکھنؤ سے پہلی لوکل ٹرین کے آنے کا وقت چھ بجے مقرر تھا۔ چھ بجنے کو ہوئے تو سب کے دل دھڑکنے لگے۔ وہ سب پل کے پاس زمین پر کھڑے ہو کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ چار میل لمبے ٹریک کے ساتھ کئی جگہ خلاصی اور گینگ میں بکھرے ہوئے کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں کدالیں اور پھاوڑے اُٹھائے۔ نرمل سنگھ اپنی ٹرالی پر بیٹھ کر پوری لائن کا چکر لگا آیا تھا۔ اُسے نیکر اور بنیان میں دیکھ کر مزدور ہنس رہے تھے۔ وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ان کے سلام کا جواب دیتا پھرا تھا۔

پرمانک نے فیلڈ فون کے ذریعے دلکشا جنکشن کے کیبن میں گاڑی بھیجنے کی ہدایت کر دی۔ نرمل سنگھ پل کے اوپر ذرا فاصلے پر لگے ہوئے عارضی سگنل کے پاس کھڑا تھا۔ دور سے گاڑی کی آواز سنتے ہی سب نے جیسے سانس روک لی۔ گاڑی ایک مست ناز حسینہ کی طرح زیر لب گنگناتی ہوئی پہنچی۔ پل کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ نرمل سنگھ نے سگنل گرا دیا تو پھر چل پڑی۔ ہلکی سی سیٹی بجا کر۔ چھک چھک! چھک چھک!!

جب انجن پل کے اوپر پہنچ گیا تو پرمانک کا دل اُچھل کر اُس کے کسے ہوئے جبڑوں کے بیچ میں آ گیا۔ اس پر سے آزمائش کے لئے مال گاڑی کو کئی بار گزارا جا چکا تھا لیکن یہ پہلی پسنجر گاڑی تھی۔ اس میں اس کے افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ اس لئے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

ایک ایک کر کے چار ڈبے نکل گئے۔ پھر اس کے سامنے افسران کی بوگی آئی۔ ہر ڈبے کے دروازے پر ایک افسر موجود تھا۔ مزدور اُنھیں دیکھ کر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر سلام کر رہے تھے۔ وہ اپنے انداز میں ہو ہو کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ افسران مسکرا رہے تھے۔ ہاتھ لہرا رہے تھے۔ اپنی خوشنودی ظاہر کر رہے تھے۔ پرمانک اور

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۷ پر)



اختر رضوانی

(۱)

گرداب میں ساحل کی زمیں ملتی ہے
ہر وادیِ مشکل کی زمیں ملتی ہے
کام آتی ہے آفت میں شکستہ پائی
ہمت ہو تو منزل کی زمیں ملتی ہے

(۲)

ہنگامۂ پیکار کی باتیں ہوں گی
تاریخ کے ادوار کی باتیں ہوں گی
ہم صاف کہے دیتے ہیں تجھ سے، سن لے
تلوار سے تلوار کی باتیں ہوں گی

(۳)

گلزار و مے و جام سے کیا بہلیں گے
حسنِ گل و اصنام سے کیا بہلیں گے
وہ قوم و وطن سے ہے محبت جن کو
وہ بادۂ گلفام سے کیا بہلیں گے

(۴)

یہ برق شرربار سے کب ڈرتے ہیں
اعدائے ہوس کار سے کب ڈرتے ہیں
ہر حال میں دیکھا ہے انھیں سینہ سپر
جانباز کسی وار سے کب ڈرتے ہیں

(۵)

دونوں کا اگر دیکھیے آزار ہے ایک
دونوں کے لیے ایک سزاوار ہے ایک
دو ناگ ہیں، دو سانپ ہیں، چاؤ، ماؤ
دونوں کا چلن ایک ہے، کردار ہے ایک

(۶)

یہ وقت کا منشا ہے کہ سب مل کے رہیں
ممکن نہیں پھر زخم ہرے دل کے رہیں
جمہور و مساوات کے اس گلشن میں
لازم ہے کہ پھولوں کی طرح کھل کے رہیں

مخمور سعیدی

(۱)

نازک سی ہتھیلیوں پہ چہرے کو لیے
وا، قصرِ تصور کے دریچوں کو کیے
بیٹھی ہے اک اپسرا سرِ شام اداس
آنکھوں میں جلائے ہوئے یادوں کے دیے

(۲)

چہرے، کہ شفق کے نور پرور ہالے
زلفیں، کہ سیاہ بادلوں کے گالے
ہم خاک نشینوں کی طرف کیا دیکھیں
جو چاند ستاروں کے ہیں رہنے والے

(۳)

ہلکا کبھی رنگ عارضوں کا گہرا
جوں گہہ شرمِ نوعروسی، چہرا
چہرے پہ پڑا ہوا ہے رنگیں گھونگٹ
گھونگٹ کی بلائیں لے رہا ہے سہرا

(۴)

پھولوں سے لدی ڈال، لچکتا ہوا جسم
خوشبو کی سبک موج، لہکتا ہوا جسم
ویرانۂ دل انھیں سے گلشن گلشن
یہ روپ، یہ رنگت، یہ مہکتا ہوا جسم

(۵)

ہر سمت بہشتوں کی فضا چھائی ہے
ہر شے کتنی لطیف ہو جاتی ہے
ہنگامِ سحر، چمن کی جانب ہوتی
کس کوچۂ رنگیں سے صبا آتی ہے

(۶)

تجھ بن اپنے میں لوٹ آؤں کیوں کر
کھویا ہوں، سراغ اپنا پاؤں کیوں کر
دل ڈھونڈھ رہا ہے ترا قربِ پیہم
جا کر، تجھے تجھ سے مانگ لاؤں کیوں کر

مرزا رجب علی بیگ سرور

دربار بنارس میں

تاج الدین اشعر

مرزا رجب علی بیگ سرورؔ مرزا اصغر علی لکھنوی کے بیٹے تھے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ زبان ریختہ میں آغا نوازش حسین خاں نوازش کے شاگرد تھے۔ نظم میں کمتر اور نثر میں اکثر گلکاری کی ہے اسی لیے بہت سے لوگ ان کی شاعرانہ حیثیت سے واقف نہیں ہیں۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ ان کی تمام تر عظمت و مرتبت ان کی نثاری اور انشاپرداز کی مرہون منت ہے۔ وہ ایک باکمال ادیب اور مایۂ ناز انشاپرداز تھے۔ قدرت نے انھیں بے نظیر تحریری و تصنیفی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جس صنفِ تحریر کے امام تھے آج تبدیلی ذوق کے باعث ہم اس کی حقیقی قدر و قیمت کو محسوس نہ کر سکیں لیکن یہ تحریریں جس عہد کی پیداوار ہیں جب ان کے پس منظر میں ان کا مطالعہ کیا جائے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ شاہکار اردو زبان پر ایک احسان اور ایک کبھی نہ مٹنے والا نقش ہے۔ ان کی تالیفات کے ذریعہ تاریخ کے ایک اہم عہد کی تہذیب و معاشرت اور تمدنی مذاق و رجحان کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فسانۂ عجائب کی بدولت ایک وقت میں پورے ہندوستان میں مرزا صاحب کا طوطی بولتا تھا۔ ان کی یہ پہلی تخلیق تھی جو منظرِ عام پر آئی اور جس نے ملک سے خراج تحسین وصول کیا۔ اس وقت اودھ کے تخت حکومت پر بادشاہ غازی الدین حیدر رونق افروز تھے۔ لیکن جیسا کہ فسانۂ عجائب کے دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے اس کتاب کی تالیف لکھنؤ کے بجائے کانپور میں ہوئی۔ مرزا صاحب کسی معاملے میں عتاب شاہی کا شکار ہو کر گنگا پار اتار دیے گئے تھے۔ جب نواب غازی الدین حیدر کا انتقال ہو گیا اور نواب نصیر الدین حیدر سریر آرائے سلطنت ہوئے تو مرزا صاحب کو لکھنؤ واپس آنے کی اجازت ملی اور وہ مذکورہ کتاب کا مسودہ لے کر لکھنؤ لوٹے۔ لکھنؤ ہی میں یہ کتاب پہلی بار زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں ان دونوں بادشاہوں کی مدح مرقوم ہے۔

لکھنؤ آنے کے بعد بھی مرزا صاحب فلک کج رفتار کی گردش اور ارباب زمانہ کی ناقدری و بے التفاتی کا شکار رہے۔ اسی سال ان کی غم گسار بیوی کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس سانحہ نے مرزا کے دل میں کبھی نہ مندمل ہونے والا زخم ڈال دیا۔ مختصر یہ کہ یہ جوہر گرانمایہ جس قدر و اعزاز کا مستحق تھا وہ اسے مدتوں حاصل نہ ہو سکا۔ انھوں نے لکھنؤ کے اکثر بادشاہوں کی خدمت میں فسانۂ عجائب کو پیش کیا لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کسی نے نہ سنی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ واپس آنے کے بعد دو ۲ سال تک اسی کس مپرسی کی حالت میں مبتلا رہے۔ آخر کار جان عالم واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے۔ مرزا صاحب نے اس موقع پر ایک عمدہ قطعۂ تاریخ کہا جو خوش قسمتی سے قطب الدولہ مفتاح الملک محمد قطب علی خاں مستقیم جنگ کی وساطت سے دربار میں پیش ہو گیا۔ قطعہ یہ ہے: ۔

بہار جوش پہ ہے اور نئی ہے کیفیت   سرور سب کو ہے کہتے ہیں مشتی و رند

جو زیبِ تخت ہوا شہ کے شاہِ نیک اختر　　ہوا ہے سالِ جلوس اس سے بے چراغ بند

(۱۲۶۳ھ)

واجد علی شاہ کا تخلص چوں کہ اختر تھا اس لیے اس لفظ نے خاص لطف پیدا کیا اور بادشاہ نے اس قطعہ کو بہت پسند کیا اور مرزا سرور کو ملازمین خاص کے زمرہ میں داخل کرکے پچاس روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کی۔ درحقیقت مرزا صاحب کی زندگی کا تابناک اور خوش گوار دور یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے وہ دربدر پھرتے رہے تھے اور کہیں فارغ البالی کی صورت میسر نہ آتی تھی غالباً یہی وجہ تھی کہ فسانہ عجائب کی تصنیف کے بعد بائیس تئیس برس کی طویل مدت میں ان کی کوئی دوسری تصنیف معرضِ وجود میں نہیں آئی۔ آخر کار ۱۲۶۱ھ میں بادشاہ کی فرمائش پر مرزا صاحب نے کتاب شمشیر خانی کا ترجمہ کیا اور اس کا نام سرور سلطانی رکھا۔ یہ شاہنامۂ فردوسی کا خلاصہ ہے۔ مرزا صاحب نے اس کتاب میں وقائع نگاری کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور زبان و بیان کا وہی معیار و اسلوب برقرار رکھا ہے جو فسانہ عجائب کی خصوصیت ہے۔

ان دونوں کتابوں کی وجہ سے مرزا صاحب کی انشا پردازی کے طرزِ خاص کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور انھیں کئی جگہوں سے بڑی قدر دانی کے ساتھ بلایا گیا۔ سب سے پہلے الور کے مہاراجہ نے اپنے مصاحب منشی یوسف علی خاں کے ذریعہ مرزا صاحب کو الور آنے کی دعوت دی۔ چوں کہ یہ گفتگو محض زبانی تھی مرزا صاحب کو اس پر پورا اطمینان نہ ہوا اور وہ مہاراجہ الور کے شقہ کے منتظر رہے اس کے کچھ ہی عرصہ بعد ۱۲۶۷ھ میں والیۂ بھوپال نواب سکندر بیگم صاحبہ نے مرزا صاحب سے ایک واقعہ کو قصے کی صورت میں تحریر کرنے کی فرمائش بھیجی۔ یہ واقعہ سارس کے ایک جوڑے سے متعلق تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ اس زمانے میں وہاں پیش آیا تھا۔ ایک شکاری نے نر سارس کو اپنی بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ مادہ کو اس کا اتنا غم ہوا کہ اس نے لکڑیاں جمع کرکے اپنے کو اس میں زندہ جلا دیا۔ یہ نہیں معلوم کہ مرزا صاحب والیۂ بھوپال کی اس فرمائش کی تکمیل کے لیے بنفس نفیس بھوپال گئے تھے یا نہیں لیکن انھوں نے شگوفۂ محبت کے نام سے اس واقعہ پر ایک کتاب لکھی۔ بادشاہ واجد علی شاہ کے عہد حکومت کے آخری زمانے میں مرزا صاحب نے امجد علی صاحب رئیس سندیلہ ملیح آباد کی فرمائش پر ایک اور قصہ شگوفۂ محبت لکھا جس کے آخر میں واجد علی شاہ کی معزولی اور ان کے کلکتہ روانہ ہونے کا حسرتناک واقعہ بھی درج کیا ہے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں مرزا صاحب ایک بار پھر اپنی معاش کی جانب سے سخت فکر اور تردد میں مبتلا ہو گئے جس کا سلسلہ کئی برس تک چلتا رہا۔

لکھنؤ میں مولوی محمد یعقوب انصاری فرنگی محلی مرزا صاحب کے پرانے دوستوں میں تھے۔ لکھنؤ میں ان کا مطبع شاہی زمانے سے قائم تھا۔ مرزا صاحب کی کتابیں اسی پریس سے چھپی تھیں۔ مرزا صاحب نے ان کی وساطت سے انگریز منتظم شہر مسٹر کارنگی کے سررشتہ دار سید قربان علی تک رسائی حاصل کی اور وہ ان کی سرپرستی کرنے لگے۔ ان کے علاوہ منشی شیو نرائن سے جو کبریٹ میں تھے مرزا صاحب نے ملاقات کی۔ انھوں نے بھی مرزا صاحب کے حالِ زار سے متاثر ہو کر ان کی ہمدردی اور امداد کی۔ مرزا صاحب نے اپنی تحریروں میں کہیں کہیں ان دونوں حضرات کی نیک دلی، فیاضی اور سیر چشمی کی بہت تعریف کی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانے کو مرزا صاحب کا دو دن بھی اطمینان و فراغت سے بسر کرنا گوارا نہ تھا۔ چناں چہ اب یہ افتاد آپڑی کہ مسٹر کارنگی انگلستان روانہ ہوئے اور اس کے نتیجے میں سید قربان علی بھی اپنے وطن مالوف چلے گئے اسی دوران ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہوا جس نے پورے ملک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ مرزا صاحب اہل و عیال کی کثرت اور اپنی بے کاری کی وجہ سے پھر انتہائی مصیبت و عسرت میں مبتلا ہو گئے۔ اسے مرزا صاحب کی خوش قسمتی کہیے کہ مسٹر کارنگی دوبارہ وارد لکھنؤ ہوئے اور میر قربان علی صاحب پھر ان کی سررشتہ داری کے منصب پر فائز ہوئے۔ اب پھر وہی میرزا صاحب تھے اور وہی علمی و ادبی مشغلے اور شاعرانہ انجمن آرائیاں۔ لیکن اس صحبت میں نے بھی مرزا صاحب کے ساتھ کچھ زیادہ وفا نہ کی۔ ڈیڑھ سال بعد سید قربان علی صاحب

گوشہ نشین ہو گئے اور وہ اس بزم نشاط کو درہم برہم کر کے مستقل طور پر اپنے وطن چلے گئے۔

خوبی قسمت سے اس مرتبہ مرزا صاحب کو زیادہ سختی نہیں جھیلنی پڑی۔ اب ان کی کشتی حیات ایک ایسے ساحل مراد پر لگی جس کے دامن میں پہنچنے کے بعد وہ آلام و حوادث کے طوفان سے یکسر محفوظ ہو گئی۔ یہ ساحلِ مراد تھا مہاراجہ ایشری پرشاد نرائن سنگھ کا غفراں منزل والی ریاست بنارس[1] کا دربار فیض آثار جہاں بلا امتیاز مذہب و ملت ہر صاحب کمال اور فن کار کی اس کے شایانِ شان قدر و عزت کی جاتی تھی اور داد و دہش سے مالا مال کر دیا جاتا تھا۔ مہاراجہ صاحب موصوف نے اپنا خاص شقہ بھیج کر مرزا صاحب کو طلب کیا اور ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۷۵ھ کو وہ لکھنؤ سے بنارس روانہ ہو گئے۔ مہاراجہ نے مرزا کی بے انتہا قدر دانی کی۔ ان کی زندگی کے آخری آٹھ نو سال یہیں بسر ہوئے اور یہیں ان کی دو معرکہ آرا اور مہتم بالشان تصانیف گلزار سرور اور شبستان سرور وجود میں آئیں۔ اول الذکر تصنیف فارسی کتاب حدائق العشاق کا ترجمہ ہے۔ اس میں عشق اور روح کی معرکہ آرائی دکھائی گئی ہے اور تزکیہ نفس اور ابدی نجات کے مسئلے کو عجیب دلآویز پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ترجمے کے لیے اس کتاب کا انتخاب خود مہاراجہ نے کیا تھا اور انھیں کی فرمائش پر مرزا صاحب نے اپنے خاص اسلوب یعنی نثر مرصع میں اس کا ترجمہ کیا اور حق یہ ہے کہ ترجمے میں انھوں نے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو صرف کر دیا ہے۔ عوام کی پسندیدگی و مقبولیت کسی چیز کی بلند معیاری کے لیے کوئی سند نہیں ہوتی۔ گلزار سرور کا ادبی پایہ کتنا بلند ہے اس کا اندازہ اس دیباچے سے بہ خوبی کیا جا سکتا ہے جو مرزا اسد اللہ خاں غالب نے خاص طور پر اس کتاب کے لیے لکھا تھا۔ وہ دیباچہ من و عن ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

"سبحان اللہ، خدا کی کیا نظر فریب صنعتیں ہیں۔ تعالیٰ اللہ کیا حیرت آور قدرتیں ہیں۔ یہ جو حدائق العشاق کا فارسی زبان سے عبارت اردو میں نگارش پاتا ہے، ارم کا زمین دنیا سے اٹھ کر بہارستان قدس کے ایک باغ میں جاتا ہے۔ وہاں حضرت رضوان ارم کے گلبند و آبیاز ہوئے، یہاں مرزا رجب علی بیگ صاحب سرور حدائق العشاق کے صحیفہ نگار ہوئے۔ اس مقام پر ہیچمیرز جو موسوم بہ اسد اللہ خاں اور مخاطب بہ نجم الدولہ اور متخلص بہ غالب ہے، خدائے جہاں آفریں سے توفیق کا اور خلق سے انصاف کا طالب ہے۔ ہاں اے صاحبانِ فہم و ادراک سرور سحر بیان کا اردو کی نثر میں کیا پایہ ہے اور اس بزرگوار کا کلام معنی شناس کے واسطے کیا گراں بہا سرمایہ ہے ؎

رزم کی داستان اگر سنئے ہے زباں ایک تیغ جوہردار
بزم کا التزام اگر کیجے ہے قلم ایک ابر گوہر بار

مجھ کو دعویٰ تھا کہ اعجاز بیان و شوخی تقریر میں افسانۂ عجائب بے نظیر ہے جس نے میرے دعوے کو اور فسانۂ عجائب کی یکتائی کو مٹایا وہ یہ تحریر ہے۔

"کیا ہوا اگر ایک نقش دوسرے کا ثانی ہے۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں نقاش لاثانی ہے۔ ہاں، نقاش بے معنی صورتیں بنا کر پیغمبری کا دعویٰ کرے، کیا عقل کی کمی ہے۔ یہ بندۂ خدا معنی کی تصویر کھینچ دعویٰ خدائی نہ کرے، کس حوصلہ کا آدمی ہے۔ سچ تو یوں ہے کہ جناب مہاراجہ صاحب والا مناقب عالی شان ایشری پرشاد نرائن سنگھ بہادر جس باغ کی آرائش کے کارفرما ہوں اور پھر اس پر طرہ یہ کہ مرزا سرور چمن آرا ہوں، وہ باغ کیا ہوگا؟ بہشت نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ کوئی نہ کہے کہ درویش گوشہ نشین فضول و بک سر کیوں ہے؟ بے دیکھے بھالے حضور کا ثنا گستر کیوں ہے۔ صاحبو! حاتم سے ہم نے کیا دولت پائی ہے کہ اس کی سخاوت کی ثنا کرتے ہیں۔ رستم سے کہاں شکست کھائی ہے کہ اس کی شجاعت کا ذکر کیا کرتے ہیں۔ مع ہذا جناب

---

[1] قدیم زمانے سے یہ تاریخی ریاست، ریاست بنارس کے نام سے مشہور ہے حالانکہ بنارس شہر اور ضلع اس میں شامل نہ تھا۔ بنارس کے تین علاقوں پر یہ ریاست مشتمل تھی رام نگر، چکیا اور بھدوہی۔ ریاست کی راجدھانی رام نگر تھی، وہیں گنگا کے کنارے مستحکم قلعہ اور حکومت سے متعلق دیگر عمارات اور محکمہ جات تھے۔ البتہ بنارس شہر اور مضافات میں بہت بڑے بڑے قطعہ ہائے زمین والی ریاست کی جاگیر میں تھے اور اب تک موجود ہیں۔



موہن داس کرم چند گاندھی

جنھیں دنیا آج مہاتما گاندھی کے نام سے جانتی ہے



حیات نو
کی
پُراسرار
رہ گزاروں
پر



دیدہ

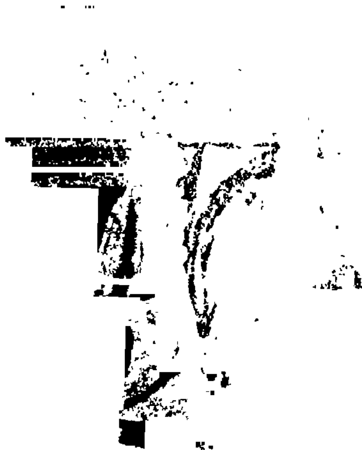
گاندھی جی کی عظمت کا راز یہ
بلکہ ان کی نمایاں خصوصیت یہ ہے
تھے۔ وہ اعلیٰ سیاست داں بھی تھے
اور مفکر بھی۔ معلم اخلاق بھی تھے اور بہ
پائے کے صحافی بھی۔ وہ فرقہ وارانہ
سب سے بڑے ہم درد بھی۔ ان کا عزم د
گاندھی جینتی مناتے ہیں لیکن اس
پر چلنے کا عہد کریں اور ان کی دکھائی





ترے
خیال و عمل
کے
چراغ
روشن ہیں







آزادی کے قائد تھے
ت اور خوبیوں کے حامل
زدست مصلح بھی تھے
علیم بھی تھے اور اعلیٰ
تھے اور ہر یجنوں کے
ہر سال ۲ر اکتوبر کو
کہ ہم ان کے نقش قدم
النے کی کوشش کریں۔



مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو

مہاراجہ صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان بابو پرسدھ نارائن[1] کا مورد عنایت رہا ہوں۔ جن دنوں وہ دلی میں تشریف لائے ہیں۔ اکثر اوقات شریک صحبت رہا ہوں۔ جب ناشناسائی اور بیگانگی درمیاں نہ ہو تو ان کا نیاز مند کیوں اتنا ثنا خواں نہ ہو۔ نہیں نہیں میرا کیا منہ ہے ثنا خوانی کا۔ میں تو عاشق ہوں ان کی شاعر پروری کا اور سخندانی کا۔ حضور نے قدر دانی کی۔ سرور نے گہر افشانی کی۔ حضور کا اقبال سرور کا کمال۔ حضور کی عالی ہمتی سرور کی خوش قسمتی۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نقش صفحۂ روزگار پر یادگار رہے گا۔ مصنف کا شہرہ رنگیں بیانی میں، مہاراج عالی جاہ کا نام فیض رسانی میں تا روز شمار رہے گا۔"

مرزا غالب نے یہ دیباچہ اسی اسلوب خاص میں لکھا ہے جو ان کی اپنی ایجاد ہے۔ وہی سادگی و پرکاری۔ وہی بے تکلفی و بے ساختگی۔ ثقیل تراکیب و استعارات سے احتراز کرنے کے باوجود عبارت میں لطف و لذت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ غالباً انھوں نے مرزا سرور کی طبیعت اور مذاق کی رعایت کرتے ہوئے مرصع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔

دوسرا نمبر شبستانِ سرور کا ہے جو الف لیلے کا ترجمہ ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا مرزا صاحب نے منشی شیو نرائن (افسر کریٹ) کی فرمائش پر لکھنؤ ہی میں کر دی تھی لیکن اس وقت پریشانی طبع کے باعث چند اجزا سے زیادہ نہ لکھ سکے تھے۔ جب مہاراجہ بنارس کی سرپرستی میں آئے اور سکون و اطمینان حاصل ہوا تو اس تصنیف کی تکمیل کا بھی خیال آیا۔ اس طرح یہ ترجمہ تقریباً چار سال میں مکمل ہوا۔ دوسری تالیفات کی طرح سرور نے اس کتاب میں بھی اپنی باغ و بہار طبیعت سے خوب خوب گلفشانیاں کی ہیں اور حسنِ بیان اور لطافتِ زبان کے جوہر دکھائے ہیں۔

مہاراجہ بنارس کی خصوصی فرمائش پر مرزا صاحب نے تیسری چیز جو لکھی وہ "نثر نثرۂ نثار" نامی ایک تہنیت نامہ ہے۔ یہ اس موقع پر لکھی گئی جب شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی شادی کی تقریب انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں دھوم دھام سے منائی جا رہی تھی۔ اس میں ملکہ وکٹوریہ کی شان میں ایک قصیدہ بھی شامل ہے۔

آخری عمر میں کہ مرزا صاحب تقریباً اسّی سال کے ہو چکے تھے اور آنکھوں کی روشنی بھی جواب دے چکی تھی، انھوں نے ایک ایسے زبردست کام کا عزم کیا جو جوانوں کے حوصلے سے بھی باہر کی بات تھی۔ یعنی مہاراجہ کی فرمائش پر وہ بوستانِ خیال کے ضخیم سلسلے کا ترجمہ کرنے والے تھے لیکن افسوس کہ ان کا یہ ارادہ عمل میں نہ آسکا۔

ایک بار مہاراجہ پٹیالہ والیٔ بنارس کے مہمان ہوئے۔ وہ مرزا صاحب کے علمی و ادبی کارناموں اور فضل و کمال کا شہرہ سن چکے تھے۔ انھوں نے مرزا صاحب کو ملاقات کے لیے بلوایا اور از راہ تلطف سونے کے کڑے کی ایک جوڑی انھیں دی۔

مہاراجہ بنارس کے دربار میں اودگھر خواص نامی ایک شخص تھے جو اگرچہ قوم کے حجام اور معمولی پڑھے لکھے تھے لیکن اپنی خدمت و وفاداری کے باعث مہاراجہ کے نہایت معتمد علیہ اور مقرب بن گئے تھے۔ ان کا خاندان مہاراجہ بلونت سنگھ کے زمانے سے ریاست سے متوسل تھا۔ جس زمانے میں مرزا سرور مہاراجہ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، مہاراجہ نے اودگھر خواص کو دیوانِ ریاست کے منصب پر فائز کر دیا تھا۔ مہاراجہ کو اودگھر خواص پر اتنا اعتماد و اطمینان تھا کہ اگر کوئی کام ان کے مزاج کے خلاف ہوتا اور وہ اس پر اظہارِ ناگواری کرتے اور کوئی کہہ دیتا کہ یہ کام اودگھر خواص کے ایما سے ہوا ہے تو خاموش ہو جاتے اور سمجھتے کہ اس میں کوئی خاص مصلحت یا سرکار کی خیر خواہی

---

[1] بابو پرسدھ نارائن سنگھ کاشی نریش راجہ اودیت نارائن سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ راجہ اودیت نرائن لاولد تھے اس لیے انھوں نے بابو پرسدھ نارائن سنگھ کے خلف الرشید ایشری پرشاد نارائن سنگھ کو متبنّیٰ کر کے ولیعہد بنایا تھا۔ بابو پرسدھ نارائن سنگھ عربی فارسی اور انگریزی میں بڑی قابلیت رکھتے تھے۔ علم و فن کے قدر داں اور صاحبانِ علم و فن کے مربی و سرپرست تھے۔ علما و فضلا کو تلاش کر کے دوسرے شہروں سے لانا، ان سے کتابیں لکھوانا، تراجم کرانا اور کتابوں کو چھپوانا ان کا پسندیدہ شغل تھا۔ اس میں وہ بے اندازہ دولت صرف کرتے تھے۔

ضرور پوشیدہ ہوگی۔

مرزا رجب علی بیگ کو بھی قیام بنارس کے دوران اکثر اد گھر خواص سے سابقہ پڑا اور بعض معاملات میں باہم چشمک بھی رہی اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ریاست میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص مہاراجہ کی ملازمت میں داخل ہوتا تو جب تک مہاراجہ اس کی فرد پر دستخط نہ کرتے وہ مستقل ملازم نہ سمجھا جاتا۔ جب مرزا صاحب ملازم ریاست ہوئے تو کچھ عرصہ بعد مہاراجہ نے ان کی فرد پر دستخط کر دیا لیکن اد گھر خواص نے جو دیوان ریاست تھے اپنا دستخط اس پر نہ کیا اور ایک عرصہ تک اسے معرضِ تعویق میں ڈالے رکھا جس سے مرزا صاحب کی تنخواہ متعلقہ سررشتہ سے برآمد نہ ہو سکی۔ مرزا صاحب تو زمانے کی کج خلقیوں سے پہلے ہی جلے بھنے رہتے تھے، ایک دن مہاراجہ نے ان سے برسبیل تذکرہ دریافت کیا کہ خواص نے آپ کی فرد پر دستخط کیا یا نہیں۔ مرزا صاحب نے از راہ خوش طبعی برجستہ فرمایا۔ حضور! وہ خط تو بنا نہیں سکتے دستخط کیا بنائیں گے؟ مہاراجہ اس مطائبہ سے بہت لطف اندوز ہوئے۔

اسی طرح ایک بار مہاراجہ از راہ دریا دلی مرزا صاحب کو کوئی بڑی رقم دینا چاہتے تھے۔ اد گھر خواص کو یہ بات شاق گذر رہی تھی۔ انھوں نے اس مرتبہ بھی حکم کی تعمیل میں تغافل سے کام لے کر کچھ دنوں تک ٹال مٹول کی۔ اس پر ایک دن مرزا صاحب نے عین دربار میں فی البدیہہ یہ چار مصرعے موزوں کرکے مہاراجہ کو سنائے:

عجیب رنگ یہ لایا ہے چرخ مینائی — کہ جس کے دیکھنے سے زندگی ہوئی ہو دبال
وہ آج کرتے ہیں اصلاح راج کی ہوکل — کنارے بیٹھ کے دریا کے مونڈتے تھے بال

مہاراجہ اس وقت یہ مصرعے سن کر خاموش رہ گئے۔ جب اد گھر خواص تک بات پہنچی اور انھوں نے مہاراجہ سے اس کی شکایت کی تو مہاراجہ نے ان کو سمجھا دیا کہ مرزا صاحب کو رقم ملنے میں جو تعویق ہوئی ہے اس کے سے دل تنگ ہو کر انھوں نے ایسا کیا ہے۔ آخر خواص کو تعمیلِ حکم کرتے ہی بنی۔

آخر عمر میں مرزا صاحب آنکھوں کے علاج کی غرض سے کلکتے گئے اور وہاں کے سب سے مشہور ماہرِ چشم کا علاج شروع کیا۔ لیکن مرض کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گیا۔ آخر کئی مہینے کلکتے میں رہ کر واپس آئے۔ کلکتہ کے قیام کے دوران ایک مرتبہ انھیں مٹیا برج میں نظر بند بادشاہ واجد علی شاہ سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔ کلکتہ سے واپسی میں کچھ عرصہ تک زنگی محل لکھنؤ میں وہ مولوی محمد یعقوب کے یہاں مقیم رہے۔ وہیں ایک کحال سے آنکھیں بنوائیں اور پھر بنارس چلے آئے۔ ان کے بڑے صاحبزادے کانپور میں رہتے تھے۔ لکھنؤ کا مکان خالی پڑا ہوا تھا اکثر جاتے اور خالی مکان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور بیتے ہوئے زمانے کی یادیں لیکر واپس آتے یہ یادیں ان کے دل و دماغ میں ایک خاص تاثر اور ہیجان پیدا کر دیتی تھیں۔ آخر ایک دن داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی یہ شمع بھی خاموش ہوگئی۔ رام نگر (راجدھانی ریاست) میں ۱۲۸۶ھ میں انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اور قصبہ کے مشرق میں پنج بٹی کے مقام پر واقع گورستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ قبر پر غالباً کوئی امتیازی علامت موجود نہیں۔ بدایوں کے منشی دیبی پرشاد سحر نے مرزا صاحب کے انتقال پر یہ رباعی کہی:۔

مُرد چوں شاعرِ بے مثل سرور — در جہاں شور و شغب کرد ظہور
ہست جاری بہ زبانِ ہر کس — ہائے آمد الم و رفت سرور

۱۲۸۶ھ



تجدیدِ پیمانِ وفا

متین سارش

مُبارک ہو، وطن کے عشق میں مدہوش ہو جانا
جوانانِ وطن کا یہ سراپا جوش ہو جانا
وفورِ شوق میں سر کا دبالِ دوش ہو جانا
فضائے فکر و فن کا حشر در آغوش ہو جانا

جوانانِ وطن اُٹھو! نشاطِ جاوداں لے کر
شہیدانِ وطن کے خوں کی رنگیں داستاں لے کر
یقین و عزم کی ہمت فزا جولانیاں لے کر
زمیں کیا چیز ہے، اُٹھو غرورِ آسماں لے کر

قدم راہِ وفا میں اُٹھ کے ہرگز رک نہیں سکتا
ہمارا سر کسی ظالم کے آگے جھک نہیں سکتا!

ہمارے واسطے فطرت کی ہر شانِ کرم ہو گی
دلِ تاریخ میں اک داستانِ نو رقم ہو گی

سحر پر ظلمتوں کی یورش بے سکم کیا ہو گا؟
نیا ہر ہر قدم پہ روشنی کا سلسلا ہو گا
ہر اک اقدام اپنا اب تو محشر آزما ہو گا
حق و انصاف کا دُنیا میں پھر سے فیصلا ہو گا

وُلولے آرزو کچھ اور آتش ریز ہو جائے
شہادت کی ہوا کچھ اور شرر آمیز ہو جائے
مذاقِ حُریت کچھ اور جنوں انگیز ہو جائے
جہادِ زندگی کچھ اور قیامت خیز ہو جائے

ہماری دادِ جاں بازی بقائے اَمنِ عالم ہے
ہماری فکر سے روشن چراغ ذہنِ عالم ہے

ہمارے جوشِ خودداری کا ہر منزل میں جلوا ہے
ہمارے عزم و ہمت کا زمانے میں اُجالا ہے

غمِ انساں کو ہم نے حُسن کے سانچے میں ڈھالا ہے
شعاعِ فکر کے ہر عکس کو تاباں بنایا ہے
رُخِ دانش کو ہر رنگین جلوہ ہم نے بخشا ہے
ہمارے خون سے ہر رنگ آزادی کا چمکا ہے

عروسِ حریت کی لالہ کاری دیکھ لی ہم نے
نگارِ زندگی کی حشر سامانی بھی دیکھیں گے
چمن پر بجلیوں کی شعلہ باری دیکھ لی ہم نے
بہارِ عیش کی گلشن میں ارزانی بھی دیکھیں گے

ہر اک نقشِ کفِ ظلمت نے ہم سے روشنی پائی
شعور و آگہی نے اک نئی شمعِ خودی پائی

وطن سے آج ہم تجدیدِ پیمانِ وفا کر لیں
متاعِ جان و دل دیں نذرِ سامانِ بقا کر لیں

اکتوبر ۱۹۶۳ء

ادب اور ادیب

موجودہ چین میں

ن۔ سی

فن اور ادب پر ۱۹۴۲ء میں ینان میں ہونے والا مباحثہ چینی کمیونسٹوں کی ثقافتی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موقع پر ماؤ نے جو دو تقریریں کیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ چین کی ادبی دنیا اس وقت سے کس ڈگر پر چلتی آئی ہے، گو کہیں کہیں اِدھر اُدھر بھی ہوئی ہے۔

اس مباحثے کے آخر میں بولتے ہوئے ماؤ نے ۲ مئی ۱۹۴۳ء کو واضح کیا کہ ادب کی تشکیل میں "پارٹی کے مفاد کا واضح جذبہ" لازماً کارفرما ہونا چاہیے اور اسے عوام، خاص کر مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کی ضرورت کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ "سارا کلچر، فن اور ادب مخصوص طبقوں سے تعلق رکھتا ہے اور واضح سیاسی خطوط پر چلتا ہے۔" گویا ادب کا وجود ابتدائی طور پر جی بہلانے یا تفریحِ طبع کے لیے نہیں بلکہ سیاسیات کے لیے ہے۔

قبل ازیں ۲ مئی کو اس موضوع کو چھیڑتے ہوئے ماؤ نے کہا تھا کہ جولائی ۱۹۳۷ء میں چین اور جاپان میں جنگ چھڑ جانے کی وجہ سے بہت سے "انقلابی فن کار اور ادیب" ینان اور دوسرے کمیونسٹ علاقوں میں آ گئے ہیں۔ ماؤ نے بتایا کہ اس اجتماع کا مقصد فن و ادب کو سارے انقلابی ڈھانچے میں اس طرح بٹھانا ہے کہ وہ اسی کا ایک پرزہ معلوم ہو تاکہ لوگوں کو متحد کرنے، انھیں تعلیم دینے اور دشمن پر وار کرنے اور اسے مٹا ڈالنے میں ان سے ایک زبردست ہتھیار کا کام لیا جا سکے۔

ماؤ نے ۱۹۳۹ء میں اپنی پالیسی کا خاکہ پیش کیا تھا اور "نئی جمہوریت" کا وہ طریقہ بیان کیا تھا جسے وہ چین میں پروان چڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ کلچر "قومی، سائنسی اور عوامی" ہونا چاہیے۔ "قومی" کے معنی یہ ہیں کہ اُسے سامراجی جبر و استبداد سے ٹکر لینا اور چینی قوم کے وقار اور آزادی کو برقرار رکھنا چاہیے۔ "سائنسی" کا مطلب یہ کہ اُسے تمام جاگیردارانہ اور توہم پرستانہ خیالات کی مخالفت اور "اصول اور عمل کی وحدت" کی حمایت کرنی چاہیے۔ اور "عوامی" سے مراد یہ ہے کہ اس سے مشقت کرنے والے مزدوروں اور کسانوں کو، جو قوم کی آبادی کا ۹۰ فی صدی ہیں فیض پہنچے اور رفتہ رفتہ یہ ان کا کلچر بن جائے۔

ینان کے مباحثے میں ماؤ کی تشویش ادب کے بارے میں نہیں تھی۔ اس کا "انقلاب" تو یہ کہتا تھا کہ ادبی اور فنی کام افراد یا چھوٹے چھوٹے گروہوں کے ہاتھوں سے لے کر پارٹی کو سونپ دیے جائیں۔ جیسا کہ ٹی، اے چا نے کہا ہے، "ماؤ کا خیال تھا کہ جب تک ادبی اور فنی کام چھوٹے گروہوں کے ہاتھ میں رہیں گے، وہ کمیونسٹ کاز سے کتنی ہی ہمدردی جتاتے ہوں، تب تک اُن کے پاس شک کرنے، تضادات کی قلعی کھولنے، انصاف کے بارے میں استفسار کرنے، آزادانہ سوچنے کی ہمت افزائی کرنے، راحت کے انفرادی حقوق کے جتانے، مطلب یہ کہ پارٹی کی طاقت کو کمزور کرنے کا اختیار رہے گا۔"

ینان کے مباحثے میں چند اختلاف رائے رکھنے والے بھی تھے لیکن ماؤ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا یعنی فن، سیاسیات کے تابع ہو گیا۔ اپنے آپ کو "عوام" میں سے ایک سمجھنے کی سعی نے فن کار کو اپنی اندرونی ضرورتوں سے

خواہ وہ اخلاقی ضرورتیں ہی کیوں نہ ہوں، خواہ جمالیاتی، پہلوتہی کرنے پر مجبور کر دیا۔ مباحثے میں کیے جانے والے فیصلوں کی رُو سے ادیبوں پر لازم ہو گیا کہ وہ تعلیم نو کے پروگرام میں حصہ لیں، بورژوا رجحانات کا اقبال کریں اور اپنے گزشتہ کام کو رد کر دیں۔ اس پروگرام پر تسلیم خم نہ کرنے والوں کے لیے دوسری صورت یہ تھی کہ وہ "ناپید" ہو جائیں۔

نئی تعلیم دینے کی ضرورت انھیں کمیونوں، اجتماعی کھیتوں اور کارخانوں میں سے گئی تاکہ وہ عوام کو واضح طور پر سمجھ سکیں اور ان سے گھل مل جائیں۔ بورژوا رجحانات کا اقرار کرنا ان تمام ادیبوں کے لیے لازمی ہو گیا جن کا زندگی کے بارے میں اندازِ نظر پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے ہم آہنگ نہ تھا۔ اپنے آپ پر نکتہ چینی کے ساتھ دوسروں پر نکتہ چینی کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس طرح بااُصول ادیبوں کے لیے جینا دوبھر ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے زیادہ وقت تھیوری کے مطالعے اور متعدد مخصوص مسائل اور دھندوں کے ذریعے جائزہ و اصلاح پر صرف کرنا شروع کر دیا۔

جب کمیونسٹ ۱۹۴۹ء سے، ملکِ چین پر پوری طرح غالب آ گئے تو انھوں نے ادیبوں کو اور بھی سختی سے جکڑ دیا۔ ہارورڈ ایل، بورمین کے کہنے کے مطابق "۱۹۴۹ء کے بعد کے زمانے میں سارا زور" عوامی ادب" کی تخلیق پر رہا۔ اس کے ساتھ ہی تمام ادیبوں کو چاہے وہ کمیونسٹ ہوں یا غیر کمیونسٹ، کڑے معیاروں کا پابند بنانے کا ایک نیا ڈھنگ رائج کیا گیا۔ پہلے مفروضہ یہ تھا کہ سیاست کا ادب پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ پھر یہ دستور ہو گیا کہ سیاست" ادب کی جان ہے۔"

تخلیقی ادب پر ماؤ اور پارٹی کے قیود کی داستان اب بھی جاری ہے۔ کچھ ڈھیل صرف اُس مختصر سے وقفے کے دوران میں دی گئی تھی جب ۱۹۵۶ء کے وسط میں" سو پھولوں کو کھلنے اور سو مکاتیبِ خیال کو ساتھ ساتھ چلنے دیجیے" کا نعرہ لگایا گیا تھا۔

لیکن اس تحریک نے جلد ہی ادیبوں کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا؛ کیوں کہ دوسرے ہی سال پارٹی میں درستی کی ایک نئی مہم چلا دی گئی اور دائیں بازو کے عناصر کے خلاف ملک گیر پیمانے پر صف آرائی شروع ہو گئی۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد دائیں بازو کے عناصر کو ختم ہی کرنا تھا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کی ماؤ اور پارٹی کو اُمید تھی۔ ادیبوں کو یہ جھوٹا احساس دلا کر کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑے گا اُن پر خود اعتمادی کا منتر پھونکا گیا اور اُن میں کھُل کر بات کہنے کی جرأت پیدا ہو گئی۔ اس زمانے کا ادبی دُنیا کو متاثر کرنے والا سب سے زیادہ ڈرامائی قصہ نامور اور اسٹالن پرائز حاصل کرنے والی چینی مصنفہ ٹنگ لنگ کا ہے جس نے کمیونسٹ صفوں کے اندر پارٹی کے خلاف سازش کی قیادت کرنے میں اپنی" خطائیں" تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چناں چہ اس "کانٹے" کو پارٹی اور نظم و نسق کے تمام عہدوں سے نکال دیا گیا اور چاکری پر مجبور کر دیا گیا۔

چینی چاؤ ینگ اور متعدد دیگر ادیبوں اور ایڈیٹروں کو غیر معین عرصے کے لیے کارخانوں اور اجتماعی کھیتوں میں مشقت پر لگا دیا گیا۔ نقاد با جن پر چینی اخبارات میں مسلسل چوٹیں کی گئیں لیکن اُسے کوئی سخت سزا نہ دی گئی۔ بعد میں اس نے پارٹی کے نقطۂ نگاہ کو تسلیم کر لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی وہ قدر و منزلت ہوئی جو شاذ و نادر ہی کسی غیر کمیونسٹ ادیب کو نصیب ہوئی ہو۔ قدرتی طور پر آج وہ حلقہ ہائے ادب و فن کی کل چین فیڈریشن کے پریزیڈیم کا رکن، ادیبوں کی یونین کا نائب صدر اور دو چینی اخباروں کا مدیرِ اعلیٰ ہے۔

مختلف شکلوں میں ادیبوں پر توڑی جانے والی سختیوں کی وجہ سے ادبی تخلیقات کا معیار اتنا گر گیا اور اُن کی تعداد اتنی گھٹ گئی کہ ۱۹۵۹ء میں ادیبوں کی یونین نے نظموں، مضمونوں اور کہانیوں کے کوٹے مخصوص کر دیے جو یکم اکتوبر ۱۹۵۹ء یعنی کمیونسٹ راج کی دسویں سالگرہ تک مکمل کیے جانا تھے۔ یہی وہ وقت تھا جب شوقیہ لکھنے والوں کو جی کھول کر داد دی گئی۔ مقصد بظاہر یہ تھا کہ اگر پیشہ ور ادیب لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو سکھائے پڑھائے شوقیہ لکھنے والے خلا کو پُر کریں گے۔ کوٹا تو پورا ہو گیا لیکن اس کثرت سے تخلیق کیے جانے والے ادب میں کوئی ذہانت یا ادبی خوبی ڈھونڈھنا مشکل ہے۔

شاید ماؤ اور اس کی پارٹی کو اس نازک صورتِ حال کا احساس ہے جبھی تو مسٹر چو این لائی نے ایک بار پھر سو پھولوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھا۔ چناں چہ ۱۸ اپریل ۱۹۵۹ء کو نیشنل پیپلز کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۲ پر)

نامی سیتاپوری

نادم سیتاپوری

مالوے کے شعری شعور اور ادبی ذوق کو سنوارنے میں اودھ کے جن ارباب کمال نے نمایاں حصہ لیا ان میں ملک الشعرا الٰہی بخش نازش[1] خیرآبادی، نیاز احمد نامی سیتاپوری، حکیم عابد علی[2] کوثر خیرآبادی، حافظ محمد حسین[3] بسمل خیرآبادی، اعتبار الملک[4] مضطر خیرآبادی اور حکیم عبدالرزاق[5] عریق خیرآبادی کا نام رہتی دنیا تک رہے گا۔ نازش، کوثر، بسمل، اور مضطر تو دربار ٹونک کی جمی جمائی بزم سے وابستہ تھے، عریق نے اندور کے ادبی ماحول میں جان ڈالی۔ لیکن نامی جب بھوپال پہنچے تو یہاں کی صورت بالکل مختلف تھی۔ یہاں غالب کے چار[6] شاگرد: ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعت شروانی، نواب یار محمد خاں شوکت افتخار الشعرا، خان محمد خاں شہنیر اور حکیم معشوق علی خاں جوہر شاہ جہاں پوری پہلے سے رونقِ بزم تھے۔ والاجاہ نواب صدیق حسن خاں کا زمانہ تھا۔ اس دور کا بھوپال لٹی ہوئی دلی اور اجڑے ہوئے لکھنؤ کی "خزاں رسیدہ" بہاروں کا مرقع نظر آتا تھا۔

نامی کے بھوپال پہنچنے کے بعد یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں جیسے ایک انقلاب آ گیا۔ ان کی خاموش ادب خیزیوں نے ایک نئے ماحول کو جنم دیا۔ سراج میرخاں سحر جیسے باکمال پیدا ہوئے اور پھر ان کی معنوی نسل سے عبدالکریم خاں کی کھوئی اور ان کے شاگرد۔

نامی کا ذکر عام طور سے تذکروں میں نہیں ملتا۔ ایک آدھ جگہ جہاں ان کا مختصر ذکر کیا گیا ہے وہ اغلاط سے پر ہے مثلاً حافظ سید ممتاز علی نے تذکرہ آثار الشعراء میں انھیں "خیرآبادی" لکھا ہے۔

"نامی تخلص، سید نیاز احمد صاحب بن سید وزیر علی "خیرآبادی" شاگرد مولوی مصطفےٰ حسین راسخ وغیرہ۔ ملازم ڈیوڑھی سلطان دولھا صاحب بہادر شوہر ولی عہد ریاست بھوپال، اردو لکھتے ہیں[7]۔"

---

[1] علامہ فضل حق خیرآبادی کے چچازاد بھائی اور منظفر علی خان اسیر کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد ٹونک پہنچے نواب وزیر الدولہ نے عزت افزائی فرمائی ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کی اور ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ ۱۲۹۵ھ میں وفات پائی۔ (تاریخ ٹونک مطبوعہ مطبع ستارہ ہند آگرہ ۱۳۱۱ھ۔ صفحہ ۴۲)۔ [2] امیر مینائی کے شاگرد اور فرمانروا ٹونک کے طبیب خاص تھے۔ [3] ابتدائے مشق سخن غالب سے کی۔ ان کی وفات کے بعد کچھ دنوں امیر مینائی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل رہے۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ [4] یہ بھی فرماں روائے ٹونک کے استاد تھے۔ بسمل اور امیر مینائی دونوں سے تلمذ تھا۔ ۱۹۲۷ء میں انتقال ہوا۔ [5] ریاض خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ ۲۵-۲۶ سال کی عمر میں اندور پہنچے اور تمام عمر وہیں گذار دی۔ ۷۰ سال کی عمر میں ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو اندور ہی میں وفات پائی۔ مالوے میں ان کے بہت سے شاگرد ہیں صاحب دیوان تھے لیکن ابھی تک دیوان چھپا نہیں۔ ان کے کلام کا بڑا ذخیرہ ان کے شاگرد حکیم شاداں اندوری کے پاس محفوظ ہے۔ [6] جناب مالک رام نے ان چاروں کے تحقیقی حالات تذکرۂ تلامذۂ غالب میں درج فرمائے ہیں۔ [7] تذکرہ آثار الشعراء مطبوعہ مطبع شاہ جہانی بھوپال۔ ص ۲۱۶

اس غلطی کو عبدالجلیل آثل سندیلوی نے بیاضِ سحر میں بھی دہرایا ہے جسے ڈاکٹر سرراس مسعود نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا تھا۔ بیاضِ سحر میں نامی کے شاگرد رشید سراج میر خاں سحر کے منتشر کلام کو یک جا کرکے شایع کیا گیا ہے۔ آثل سندیلوی نے سحر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"دستور قدیم کے مطابق کسی استاد کا شاگرد ہونا لازمی تھا اور سحر صاحب اس ارادے کو اپنے دل میں راسخ کرچکے تھے مگر طبیعت کے مناسب کوئی استاد نظر نہیں آتا تھا۔ اتفاق سے منشی نیاز احمد نامی خیرآبادی بہ عہدۂ تحصیل داری مامور ہوکر بھوپال آگئے۔ یہ تلق، امیر، برق، اور بحر کی صحبتوں میں برسوں شرکت کرچکے تھے۔ انیس و دبیر کے تیور دیکھے ہوئے تھے تحت اللفظ میں انھیں حضرات کا رنگ اڑایا تھا جس مشاعرے میں شریک ہوتے تھے کچھ زورِ کلام کچھ انداز غزل خوانی سے اکثر شعرا پر غالب رہتے تھے عرصے کے غور و فکر کے بعد سراج میر خاں سحر ان کے شاگرد ہوگئے۔ نامی صاحب نے جب ان کا کلام سنا تو کہا۔ "میاں تم شاعری نہیں جادو کرتے ہو۔ اب سراج کے بجائے سحر اپنا تخلص کرو۔ چناں چہ یہی تخلص آخر تک قائم رہا۔"[۸]

قطع نظر اس سے کہ نامی کا اصل وطن "سیتاپور" تھا خیرآباد نہیں مائل سندیلوی کی یہ اطلاع بھی صحیح نہیں ہے کہ نامی ریاست بھوپال میں تحصیل دار کے عہدے پر فائز ہوکر گئے تھے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ نامی نے ریاست بھوپال کی تحصیل داری سے پنشن پائی۔

نامی سیتاپور کے مشہور جعفری نیشاپوری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ علم و فضل کے اعتبار سے یہ خاندان کسی زمانے میں ہندوستان کا ممتاز خاندان شمار ہوتا تھا۔ ان کے جد اعلیٰ ظہیر الدین کبرامی (مصنف ... واسطہ پیری) بابری عہد کے ان برگزیدہ افراد میں تھے جن کے ماننے والے قندھار اور غزنی تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے بعد مخدوم سید عبدالملک کبرامی، مخدوم عالم الملک اور مخدوم سید عادل الملک اپنے عہد کے وہ صاحب طریقت بزرگ گذرے ہیں جن کے اذکار و تذکار سے تاریخ کے اوراق خالی نہیں ہیں۔ صاحب شجرات طیبات نے نامی کے حالات ان الفاظ میں تحریر فرمائے ہیں۔

"مولوی سید نیاز احمد نامی بن سید وزیر علی بن سید غلام امام کی تاریخ ولادت چوتھی شعبان سنہ ۱۲۰۱ھ روز یکشنبہ ہے۔ یہ ریاست بھوپال میں بہ عہدۂ تحصیل داری ملازم ہیں۔ ان کی دو شادیاں ہوئیں زوجہ اولیٰ مساۃ ذکن دختر مولوی سید کرامت علی نیشاپوری سیتاپوری۔ دوسری شادی انھوں نے ریاست بھوپال میں بہ موجودگی زوجہ اولیٰ نواب یار محمد خاں (شوکت) رئیس بھوپال کی سالی سے کرلی۔ یہ نواب سلطان جہاں بیگم والیہ بھوپال کی عزیزہ ہیں۔..... وفات مولوی سید نیاز احمد ۱۶ شعبان سنہ ۱۳۲۹ھ کو ہوئی"[۹]

نامی ۱۴ شعبان سنہ ۱۲۰۱ھ کو سیتاپور میں پیدا ہوئے۔ ان کے نانا مولوی اکرام علی (علامہ سیتاپوری) فورٹ ولیم کالج کے ان ارباب کمال میں تھے جنھوں نے میر امن دہلوی، میر شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری وغیرہ کے دوش بدوش زبان اردو کی گراں بہا خدمات انجام دی تھیں۔ سارے گھر میں علمی اور ادبی چرچوں کے سوا کوئی دوسرا ذکر نہ تھا نامی نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی۔ مروجہ علوم کی تکمیل گھر پر کی اور فن شعر میں منشی مصطفےٰ حسین راسخ بلہوری کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ راسخ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ فارسی میں ان کا تخلص شائح تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے انھیں بھی خیرآبادی لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ تذکرہ گلدستۂ سخن میں راسخ کے متعلق صرف اتنا ملتا ہے۔

"راسخ تخلص۔ منشی مصطفےٰ حسین صاحب رئیس بلہور وارد حال خیرآباد (ضلع سیتاپور)، صاحب تالیف و تصانیف کثیرہ ہیں۔ ان کو مہارت مرثیہ گوئی میں مثل مرزا دبیر و میر انیس صاحب مرحوم کے حاصل ہے۔ نثر فارسی میں بے مثل۔ نظم فارسی و قصیدہ گوئی میں کامل۔ ہمہ دان

---

[۸] بیاضِ سحر مطبوعہ گورنمنٹ پریس بھوپال۔ ص۲ [۹] شجرات طیبات۔ مطبوعہ امیر المطابع سیتاپور ص۵۵۔ [۱۰] بیان کیا جاتا ہے کہ نظم کے علاوہ راسخ اردو اور فارسی کے نثار و ادیب بھی تھے اور صاحب تصنیف بھی۔ میری نظر سے ابھی تک راسخ کی کوئی تصنیف نہیں گذری۔ قاضی سید الیاس حسین سیتاپوری کے پاس راسخ کا قلمی دیوان تھا جسے قاضی صاحب نے خود ترتیب دیا تھا۔

مجمع فضائل و محامد بیکراں ہیں[۱۱]۔"

نامی کو آسودہ حالی اور فارغ البالی ورثہ میں ملی تھی۔ خاندانی زمین داری اچھی خاصی تھی لیکن انھیں اس ماحول سے شاید کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور بھوپال آگئے۔ وہاں ان کے کچھ اعزا پہلے سے موجود تھے۔ نواب یار محمد خاں شوکت کی سرکار میں "کامدار" کے عہدے پر فائز ہوئے یہ عہدہ اس زمانے میں مالوے کے جاگیرداروں کے یہاں اسی حیثیت کا عہدہ تھا جیسے بڑی ریاستوں میں "مدار المہام" (منیجر) کا عہدہ۔

یہ نواب یار محمد خاں شوکت غالب کے وہی شاگرد ہیں جن کے والد نواب فوجدار محمد خاں کی فرمائش پر غالب نے اپنے دیوان کی نقل بھجوائی تھی جسے آج ہم "نسخہ حمیدیہ" کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ بی بی رشیدہ بھوپالی تحریر فرماتی ہیں:

"نواب فوجدار محمد خاں بھوپال کی پہلی فرماں روا خاتون نواب گوہر بیگم (قدسیہ بیگم) کے حقیقی بھتیجے تھے اور ان کے والد نواب غوث محمد خاں سردار دوست محمد خاں (بانیٔ ریاست بھوپال) کے حقیقی پوتے۔ نواب فوجدار محمد خاں بھوپال کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے کو غیر سیاسی بنا کر علم و ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی کافی عمر ادبی مشاغل میں بسر ہوئی اور مرتے وقت اتنا بڑا کتب خانہ چھوڑا جس کی مثال مالوہ کیا، اس زمانے میں دور دور نہیں ملتی تھی۔ وہ غالب کے گہرے دوست ہی نہیں تھے بلکہ انھیں مرزا سے ایک قسم کا والہانہ عشق تھا...... دیوان غالب کا "نسخہ حمیدیہ" جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ترتیب دیا تھا اور ان کے مرنے کے بعد گورنمنٹ بھوپال نے شائع کیا تھا انھیں نواب فوجدار محمد خاں کے ان تعلقاتِ خصوصی کی یادگار تھا جو ان سے اور غالب سے تھے[۱۲]۔"

باپ کی طرح نواب یار محمد خاں شوکت کو بھی شعر و ادب سے دیوانہ وار محبت تھی۔ ان کے یہاں کے شاعرے بھوپال کی ادبی تاریخ کے وہ زریں ابواب ہیں جنھیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ادبی چہل پہل تو اس سرکار میں ہمیشہ رہی لیکن نامی کے پہنچنے کے بعد "بزم شوکت" پر گویا ایک نئی بہار آگئی۔ نواب یار محمد خاں شوکت کے بعد والاجاہ نواب صدیق حسن خاں نے "تاج محل" میں شاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں خود فرماں روائے بھوپال نواب شاہجہاں بیگم بہ نفس نفیس شرکت فرماتی تھیں ان کی نشست شہ نشیں کے اوپر تھی اور پردہ کا خاص اہتمام رہتا تھا۔ اسی زمانے میں نواب عالمگیر محمد خاں[۱۳] جاگیردار کے یہاں بھی شاعرے ہونے لگے جو اپنی روایتی آن بان کے لحاظ سے بھوپال کے تاریخی شاعرے کہے جاتے ہیں۔

شوکت اور نامی کے تعلقات میں باوجود "رشتۂ ملازمت" کے ایک خاص قسم کی جاذبیت اور ہم آہنگی تھی۔ یہاں تک کہ یہی تعلقات آگے بڑھ کر قرابت داری میں تبدیل ہو گئے اور شوکت کی سالی کا نکاح نامی کے ساتھ ہو گیا۔ لیکن یہ رشتہ ہو جانے کے بعد نامی نے شوکت کی سرکار سے ترک تعلق کر لیا اور ریاست بھوپال میں بہ عہدۂ تحصیل داری ملازمت کر لی جہاں آخر وقت تک رہے اور یہیں سے پنشن پائی۔

نامی کی ابتدائی زندگی کا کچھ حصہ سیتاپور اور لکھنؤ میں گزرا جہاں بڑے بڑے تاریخی شاعروں میں شریک ہوئے۔ لکھنؤ میں نواب سلیمان قدر بہادر کے یہاں اکثر شاعرے ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ناسخ کے ایک مصرعے "طلوع صبح محشر چاک ہے اپنے گریباں کا" کی طرح پر ایک شاعرہ ہوا۔ حکیم محمد شریف طالب سیتاپوری جو نامی کے رشتہ میں بھائی ہوتے تھے اور مرزا غالب کے شاگرد تھے نواب سلیمان قدر بہادر کی سرکار میں ملازم تھے۔

اس شاعرہ میں انھیں طالب کے ایک مطلع نے نقش ثانی ہونے کے باوجود ایسی دھوم مچا دی تھی کہ برسوں اہل لکھنؤ اس مطلع کو گنگناتے رہے۔ طالب کا مطلع تھا ؎

یہی ہو زور گر دستِ جنونِ فتنہ ساماں کا   نگہباں ہے خدا ہی صبح محشر کے گریباں کا

---

[۱۱] گلدستۂ سخن مطبوعہ مطبع نول کشور لکھنؤ[؟]۔ [۱۲] ماہنامہ نیادور لکھنؤ جمہوریت نمبر ۱۹۵۰ء۔ [۱۳] شمشیر جنگ نواب جہانگیر محمد خاں کے پوتے تھے تو دو تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے شبستان عالمگیری کے نام سے ایک تذکرہ لکھا ہے جو ۱۳۰۰ھ میں مطبع مفید عام آگرہ سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔ یہ تذکرہ دراصل ان شاعروں کی ایک دلچسپ روداد ہے جو نواب صاحب کیا کرتے تھے۔ ان کا انتقال تخمیناً ۱۹۵۵ء میں بہ مقام بھوپال ہوا۔ بوقت انتقال ان کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔

ان مشاعروں میں ناآمی بھی پابندی کے ساتھ شریک ہو کر غزل پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ اس زمین میں ان کی غزل نے بھی کافی شہرت پائی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:-

یہی درماں ہو تسکین کے لیے ہر دردِ پنہاں کا	دہانِ زخم سے قاتل ملا دے منہ نمکداں کا
دبا کر خاک کر ڈالا فلک نے اس قدر ہم کو	ہوا پر اڑ نہیں سکتا غبار اپنے بیاباں کا
اندھیرے سے لحد کے اس لیے ڈرتا نہیں ہے دل	کہ عالم اس نے دیکھا ہے شبِ تاریک ہجراں کا
مرا پیراہنِ محشر میں ہو گا خلعتِ پُر خوں	شہیدِ عشق ہوں ناآمی مگر شاہِ شہیداں کا

جہاں تک فن کا تعلق ہے ناآمی اپنے معاصرین میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے چنانچہ مولوی احمد حسن زیدی بھوپالی (سابق سپرنٹنڈنٹ مال ریاست بھوپال) اپنے استاد مفتی افضل باری سفتوک کی زبانی ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں۔

"سراج میر خاں سحر ناآمی کے سب سے زیادہ چہیتے اور نامور شاگرد تھے۔ ناآمی نے انھیں تھوڑے ہی دنوں میں تکمیل فن کی سند دیدی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اب تمھیں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں۔ اتفاقاً اس کے بعد ہی حیدرآباد دکن جاتے ہوئے امیر مینائی بھوپال ٹھہرے۔ سحر ان سے ملنے گئے اور تبرکاً اپنی ایک غزل اصلاح کے لیے پیش کی۔ امیر خود ناآمی کے ملاقاتیوں میں تھے اور ان کی فنی صلاحیتوں سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے غزل سُن کر فرمایا اول تو تم خود پختہ گو استاد ہو دوسرے ناآمی جیسے استاد کے شاگرد جن کا شمار اساتذہ میں ہے۔ اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن سحر نے اصرار کیا کہ حضور تبرکاً کچھ اصلاح ضرور فرما دیں چنانچہ امیر نے سحر کے اس شعر میں

وہ بہکے تھے یہ باتیں منہ سے کیا پھولوں کی جھڑتی ہیں	زباں پر بات کیا آئی بہارِ صد چمن آئی

"صد چمن" کا قافیہ بدل کر "بہارِ یاسمن" کی خوشبو بھر دی! سحر نے خوش ہو کر کئی سلام کیے!"

شاید اسی واقعہ کو بنیاد بنا کر شاہ ممتاز علی آہ نے امیر مینائی[۱] مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۳۲ء میں سراج میر خاں سحر کا نام امیر مینائی کے شاگردوں میں شامل کر دیا حالانکہ وہ ناآمی ہی کے شاگرد تھے۔ اس واقعہ کے علاوہ سحر کی زندگی میں کوئی دوسرا ایسا ذکر نہیں ملتا کہ انھوں نے امیر مینائی کو اپنا کلام دکھایا ہو۔

ناآمی کے تعلقات اپنے معاصرین سے ہمیشہ خوش گوار رہے۔ ان تعلقات کو استوار رکھنے کے لیے وہ اپنے معاصرین سے اکثر ملتے بھی رہتے تھے۔ چنانچہ جب بنارس پہنچے تو مشہور شاعر اور ادیب مرزا محمد حسن فائز سے ملنے کے لیے ان کے مکان پر گئے۔ قاضی الیاس حسین سیتاپوری نے اپنے قلمی روزنامچے میں اس ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

"۱۰ شوال ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء، بنارس..... یہاں کے مشہور شاعر مرزا محمد حسن صاحب فائز سے ملنے کو ہم لوگ خود ان کے مکان پر گئے..... ماموں سید نیاز احمد صاحب (ناآمی) نے ان کی زبان سے ان کے اشعار سننے کی ان سے خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے تقریباً دو گھنٹے اپنا اردو فارسی کا کلام سنایا جس میں غزلیں بھی تھیں اور رباعیاں بھی مخمس بھی تھا اور مسدس بھی..... رخصت کے وقت انھوں نے ماموں صاحب (ناآمی) کو اپنا اردو دیوان تاجِ سخن دو یادگار کے طور پر پیش کیا۔ ماموں صاحب (ناآمی) ان کے اخلاق اور شاعری اور اس علمی تحفہ سے بہت خوش ہوئے۔"

ناآمی اپنے زمانے میں ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا خلق، مرنج و مرنجان روش اور صلح کل پالیسی تھی۔ تمام زندگی ان سے اور ان کے معاصرین سے کبھی معاصرانہ نوک جھونک یا ادبی شاعرانہ چشمک نہیں رہی۔ اس دور کا بھوپال ارباب فن سے بھرپور ایک ہنگامہ خیز محفل تھی جہاں آئے دن ادبی ہنگامے ہوا کرتے تھے۔ مولوی امجد علی اشہری نے داغ کے شاگرد امراؤ علی عیش کو استاد کے مقابلے پر کھڑا کر دیا۔ سعادت مند شاگرد کی طرف سے استاد پر اعتراضات کی بوچھار کی گئی اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ عیش تو یہ کہہ کر چپ ہو گئے کہ

شاگرد ہو کے داغ کا میں داغ سے لڑا	اے عیش زور یہ مری طبعِ رواں میں ہے

مگر بھوپال کی ادبی فضا بہت دنوں تک گرد آلود رہی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ داغ کبھی گھڑی بھر کے لیے بھوپال نہیں گئے۔ ناآمی ان ہنگاموں سے ہمیشہ علیحدہ رہے وہ عام طور سے نہ تو مشاعروں میں شریک ہوتے تھے نہ شاگردوں کی تعداد بڑھانے کے قائل تھے۔ زندگی بھر میں انھوں نے پانچ افراد سے زیادہ کو اپنے

---

[۱] امیر مینائی صفحہ ۴۴۶ پر امیر کے شاگردوں کی جو فہرست شاہ ممتاز علی آہ نے دی ہے اس میں سحر کا اکیسواں نمبر ہے۔

حلقۂ تلامذہ میں شامل نہیں کیا۔ انگلیوں پر گننے والے ان شاگردوں میں سراج میر خاں سحرؔ، سید ناظم علی ناظمؔ بھوپالی، وکیلؔ سیتاپوری، قاسم علی خاں بیدلؔ بھوپالی اور نظیر محمد خاں وفاؔ بھوپالی کے نام نظر آتے ہیں۔ ممکن ہو دو ایک بزرگوں کو اور بھی یہ فخر حاصل ہوا ہو۔ لیکن ان نامعلوم تلامذہ میں سوائے عبدالکریم ذکیؔ لکھنوی کے کسی اور کا پتہ نہیں چلتا۔ ذکیؔ کے متعلق اتنا معلوم ہوا ہے کہ جب سراج میر خاں سحرؔ (ذکیؔ کے استاد) بھوپال سے باہر جانے لگتے تو ذکیؔ کو ہدایت کر گئے تھے کہ تم "استاد" (نامیؔ) کو اپنا کلام دکھایا کرنا۔ میں نے استاد سے تمہارے بارے میں کہہ دیا ہے[۱۱]

بھوپال میں نامیؔ کے معاصرین میں اس وقت غالبؔ کے چار شاگرد؛ ابو الفضل مرزا محمد عباس رفعتؔ شروانی، نواب یار محمد خاں شوکتؔ، معشوق علی خاں جوہرؔ اور خان محمد خاں شہیرؔ کے علاوہ والاجاہ نواب صدیق حسن خاں، مولوی امجد علی اشہریؔ، حکیم عبدالکریم ترنمؔ گورکھپوری (ایڈیٹر مشرق گورکھپور)، مرزا عاشق حسین بزمؔ اکبرآبادی، حافظ غلام احمد فرخیؔ، منشی جمیل احمد سہسوانی، حکیم سید محمد شہیرؔ، امداد علی طیش، انورؔ بھوپالی اور نواب عالمگیر محمد خاں جیسی نامور ہستیاں موجود تھیں۔ خود نامیؔ کا زیادہ تر قیام بھوپال سے باہر رہتا تھا مگر مستقل طور پر ان کا ایک مکان بھوپال میں بھی تھا جہاں برابر آنا جانا رہتا تھا۔ ریاست کی ملازمت کے باوجود نامیؔ کی زندگی بناوٹ، تصنع اور خوشامد سے پاک صاف رہی۔ والیٔ ملک کی خوشامد اور امراء کی قصیدہ خوانی سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان کی تمام زندگی میں صرف چند ایسی مثالیں ملتی ہیں جب انھوں نے "انعام واکرام" سے بے نیاز ہو کر اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں بھی کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا کہ ان کا یہ مظاہرۂ فن صلۂ زر کی تمنا یا کسی بڑے عہدے کے حصول کے لیے تھا۔

نامیؔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ نظم کی طرح نثر پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کی نثری تصانیف میں صرف دو تین کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو غیر مطبوعہ تذکرہ شعرائے بھوپال جس کا باوجود تلاش کے نہ تو مسودہ دستیاب ہو سکا اور نہ اس کی کوئی نقل۔ دوسری ایک مطبوعہ کتاب تحقیق طاعون ہے جو ۱۹۰۲ء میں نامیؔ نے کرنل حمید اللہ خاں (مرحوم ہز ہائینس بھوپال کے چھوٹے بھائی) کی فرمائش پر لکھی تھی۔ چار جزو کی یہ کتاب صرف ایک بار "قومی پریس لکھنؤ" میں چھپی تھی۔ اب کمیاب ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس محفوظ ہے۔ تحقیق طاعون کی وجہ تصنیف دراصل ایک خاص ایجی ٹیشن تھا جو ۱۹۰۲ء میں "طاعونی ٹیکے" کے خلاف بھوپال میں کیا گیا تھا۔ پلیگ کا ٹیکہ اس زمانے میں نیا نیا دریافت ہوا تھا۔ کچھ حضرات نے اسے "خلاف شرع" قرار دے کر عوام میں ایجی ٹیشن کرا دیا۔ یہ کتاب اسی ایجی ٹیشن کو ختم کرنے کے لیے نامیؔ سے لکھوائی گئی تھی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ تحقیق طاعون میں نہ محض اس ایجی ٹیشن کے مذہبی اور طبی پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے بلکہ مرض طاعون کی ایک مکمل تاریخ بھی پیش کی گئی ہے جس سے نامیؔ کے گہرے تاریخی مطالعے کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب کے خاتمہ پر ان کے شاگردوں کے قطعات تاریخ بھی شامل کیے گئے ہیں جن میں ان کے شاگرد رشید سراج میر خاں سحرؔ کا بھی ایک قطعہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ تحقیق طاعون کی تقریظ میں نامیؔ کے صاحبزادے سید وکیل احمد وکیلؔ سیتاپوری نے دو کتابوں کی اور نشاندہی کی ہے لیکن وکیلؔ سیتاپوری کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ۔ ان میں سے ایک کتاب ہے امثالِ بھوپال جس کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ ان کہاوتوں کا مجموعہ ہے جو بھوپال اور اطراف بھوپال میں رائج تھیں۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گذری لیکن سننے میں یہی آیا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک خاص انفرادیت رکھتی تھی کیوں کہ ان کہاوتوں میں مضافات بھوپال کے وہ ضرب الامثال بھی شامل ہیں جو گونڈوں اور پٹھانوں کے میل جول سے رواج پا گئی تھیں۔ اسی تقریظ میں ایک کتاب قمر سلطانی کا بھی ذکر آیا ہے۔ لیکن یہ کتاب بھی کہیں نہیں ملی اسی لیے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ نامیؔ کی مطبوعہ تصانیف میں ۵۴ بند کا ایک مسدس "قبلہ نما"

---

[۱۱] یہ واقعہ مجھ سے سید محمد یوسف قیصرؔ بھوپالی نے بیان فرمایا جن کے والد سید ناظم علی ناظمؔ نامیؔ کے شاگرد تھے اور خود قیصرؔ صاحب بھی نامیؔ کے دیکھنے والوں میں ہیں۔ قیصرؔ صاحب کا بیان ہے کہ واقعہ خود مجھ سے عبدالکریم ذکیؔ لکھنوی نے بیان کیا تھا۔ [۱۲] اس تذکرہ کا ذکر قاضی الیاس حسین سیتاپوری نے اپنے ایک مضمون "مصنفین سیتاپور کی تصانیف" میں کیا ہے جو سہ ماہی مصنف علی گڑھ بابتہ اکتوبر ۱۹۴۶ء و جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا ہے۔ یہ نام اسی طرح چھپا ہے جسے بجنسہ نقل کر دیا ہے۔

میرے کتب خانے میں موجود ہے جو [illegible] میں مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا تھا۔ یہ مسدس ایک "استقبالیہ" ہے جو نواب سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال کے سفرِ حج سے واپسی پر ناسخی نے پیش کیا تھا۔ نواب عالم گیر محمد خاں مرحوم فرماتے تھے کہ ناسخی نے جب یہ مسدس بیگم صاحبہ کو پڑھ کر سنایا تھا میں وہاں موجود تھا۔ ناسخی نے یہ مسدس نہایت موثر انداز میں صحیح اللفظ سنایا تھا جسے بیگم صاحبہ نے بہت پسند کیا تھا۔

ناسخی کی تخلیقات کا جو ذخیرہ مجھے فراہم ہو سکا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔ افسوس کہ چند متفرق اشعار کے سوا مجھے ان کی ایک بھی مکمل غزل دستیاب نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں انھوں نے جو غزلیں کہی تھیں یا تو انھیں خود تلف کر دیا یا پھر وہ محفوظ نہ رہ سکیں۔

۱۔ میلادِ منظوم (مسدس باسٹھ بند۔ (غیر مطبوعہ) اس کا پہلا مصرع ہے:

آج نظارۂ انوارِ خدا ہے منظور

۲۔ مرثیہ ۸۶ بند (درحالِ حضرت حُر۔ غیر مطبوعہ)۔ اس کا پہلا مصرع ہے:

واہ کیا حُر دلاور نے مقدر پایا

۳۔ مرثیہ ۹۰ بند۔ (غیر مطبوعہ) اس کا پہلا مصرع ہے

یارب خطابِ مہرِ طبیعت بلند کر

۴۔ مثنوی "حملۂ حیدری" (فارسی) ۱۹۷ شعر۔ (غیر مطبوعہ)۔ یہ مثنوی نواب مراد دولہا (شوہرِ اول نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال) کے اس "شکار" کے سلسلے میں کہی گئی جب "حیدری" کے جنگل میں ایک "نار" (شیر ببر) نے نواب پر حملہ کر دیا تھا مگر نواب نے اپنے ہوش و حواس پر قابو رکھتے ہوئے اس زخمی شیر کا کام تمام کر دیا تھا۔

۵۔ ترکیب بند اردو۔ بارہ بند (غیر مطبوعہ)۔

ان کے علاوہ کچھ نامکمل مرثیوں کے متفرق بند، چند رباعیاں اور کچھ اردو فارسی کے متفرق اشعار اور بھی ہیں جن میں ناسخی اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ نظر آتے ہیں



زندگی کا راز — توانائی

(بسلسلہ صفحہ ۱۹)

سڑنے گلنے سے بچایا جا سکتا ہے۔ کھیتی دشمن کیڑوں کو مارا جا سکتا ہے جو ہر سال لاکھوں من غلہ خراب کرتے ہیں۔ اس سے نئی نئی دوائیں بن سکتی ہیں جو آدمیوں کو ناسور اور سرطان جیسی مہلک بیماریوں سے محفوظ کر سکتی ہیں۔

سائنس دانوں نے اس کی مدد سے ایک ایسی گھڑی بنائی ہے جو بہت صحیح وقت دے سکتی ہے۔ اگر یہ تین سو سال تک چلتی رہے تو اس میں صرف ۵ سکنڈ کا فرق پڑے گا۔ اس کے علاوہ ہم ریگستانوں کو سبزہ زار میں بدل سکتے ہیں۔

اگر ایٹم کی توانائی کو جنگ کے لیے استعمال کیا گیا تو ہماری یہ خوبصورت دنیا آن کی آن میں ویران ہو جائے گی اور یہ انسانیت کی خودکشی ہوگی۔ یہ بھلائی کے کاموں میں ایٹم کی توانائی ان گنت کام کر سکتی ہے تو ہم پھر کیوں نہ یہ کوشش کریں کہ اسے جنگ کے بجائے امن کے کاموں میں استعمال کیا جائے۔

تصحیح نیا دور کے ستمبر [illegible] کے شمارے میں ایک مضمون "سلیم پانی پتی کی شاعری میں وطنیت" کے عنوان شایع ہوا تھا۔ فہرست میں صاحب مضمون کا نام شفاعت علی صدیقی اور مضمون کے ساتھ شجاعت علی سندیلوی شایع ہو گیا ہے۔ یہ مضمون شجاعت علی صاحب صدیقی کا ہے۔
اسی طرح "رکھ سرِ شت جبین" (نظم) منوہر سہائے صاحب انور کی ہے۔ پرچہ میں منور سہائے انور شایع ہو گیا ہے۔

غزل

تجمل حسین بیمار

میں وہ نہیں جو آ سکوں دامِ زمانہ ساز میں
دیکھتا ہوں وہی، جو ہے آئینۂ مجاز میں

کچھ بھی رہا نہ امتیاز، غزنوی و ایاز میں
فطرتِ دل بدل گئی ہے کسی نیاز میں

پہلے پہل جو دیکھ کر اس کو نکل گئی تھی آہ
حاصلِ زندگی بنی، عالمِ سوز و ساز میں

دل ہے حقیقت آشنا، ذوقِ نظر بھی ہے بلند
سجدے پہ سجدہ کیوں کروں، بت کدۂ مجاز میں

خلوتیانِ راز کو، قیدِ مقام و وقت کیا
دل میں جب آیا، آگئے، تیرے حریمِ ناز میں

حق تو یہ ہے، ادا ہوا، پھر بھی نہ حقِ بندگی
زندگیاں گزر گئیں سجدۂ بے نیاز میں

جائزہ لے ضمیر کا، عشق کی خامیوں کو ڈھونڈھ
نالہ ہے بے اثر ترا، سوز نہیں ہے ساز میں

تیری خوشی کہ دے نہ دے مجھ کو سکونِ زندگی
میرا ہے کام کاٹ دوں، عمر ترے نیاز میں

آشون ۱۸۸۵

غزل

ندرت کانپوری

طوافِ کعبۂ کوئے بتاں بھی کر لیا میں نے
جہاں سجدہ نہ کرنا تھا، وہاں بھی کر لیا میں نے

مجھے تو خاک ہونا تھا بہت پہلے محبت میں
کچھ اپنا وقت شاید رائگاں بھی کر لیا میں نے

ستم ایجاد، تو نے تو ستم کی انتہا کر دی
مگر اپنے دہن کو بے زباں بھی کر لیا میں نے

وہ شاید اب مرے ذوقِ وفا کی داد دیں مجھ کو
نشانِ زندگی کو بے نشاں بھی کر لیا میں نے

نہ جانے کیوں جبیں سے شورشِ سجدہ نہیں جاتی
حرم کو فرض تیرا آستاں بھی کر لیا میں نے

مسرت بھی تصور کر لیا اکثر ترے غم کو
دلِ ناشادماں کو شادماں بھی کر لیا میں نے

یوں ہی برہم تھے وہ اور ان سے دل کی بات بھی کہہ دی
انھیں اپنی طرف سے بدگماں بھی کر لیا میں نے

زمانہ سنگ دل ہو، کیا سنے گا داستاں میری
اگر آنکھوں سے اشکوں کو رواں بھی کر لیا میں نے

حیاتِ عشق کا افسانہ بے حد تلخ تھا ندرت
مگر سن بھی لیا اس نے بیاں بھی کر لیا میں نے

اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء

نیشِ عقرب

شہنشاہ حسین

مجھ سے اور مہدی علی خاں سے سنہ ۲۷ء میں پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت میں گورکھپور میں تعینات تھا۔ وہ بھٹوا کے ایک چھوٹے موٹے زمیندار تھے۔ تنہا رہتے تھے۔ بیوی مر چکی تھیں۔ کوئی بچہ نہ تھا۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ پابند صوم و صلوٰۃ اور مخیر و مہمان نواز۔ اگر کوئی عیب تھا تو یہ کہ بہت باتونی تھے۔ ان کا ہر ذکر بہت طول کھینچتا۔ مخاطب کو سوائے کبھی کبھی ہوں، ہاں کر دینے کے جملہ تک پورا کرنے کی مہلت نہ ملتی! چونکہ میں فطرتاً خاموش ہوں مجھے ان کی یک طرفہ گفتگو سے کچھ زیادہ زحمت نہ ہوتی۔ اور پھر ان کی بکواس ہوتی بھی تھی بڑی دل چسپ۔ عموماً تو شکار کے قصے سناتے جس کا مجھے خود بھی شوق تھا۔ بھوت پریت، چڑیلوں اور جنوں کے قصے ہوتے۔ یا پھر جنگ کے زمانے کے قصے عراق کے اور مصر کے اور نہ معلوم کہاں کہاں کے۔

اُس وقت وہ تھے پچاس کے اوپر۔ سوائے اللہ اللہ کرنے کے ان کو کسی چیز سے کچھ زیادہ سروکار بھی نہ تھا، بجز کبھی کبھی شکار کھیلنے اور جھاڑ پھونک کرنے کے۔ دس دس پندرہ پندرہ میل سے لوگ بچھو کا زہر "جھڑوانے" ان کے پاس آتے اور وہ خندہ پیشانی سے بغیر کسی معاوضہ کے یہ کام انجام دیتے۔ رات ہو یا دن، کسی وقت بھی کوئی آ جائے، وہ اس خدمت کے لیے تیار رہتے۔

میرا دورہ بھٹوا قریب ہر ماہ ہوتا۔ وہی چار ملاقاتوں میں بے تکلفی بڑھی اور پھر تو میری مجال نہ تھی کہ میں کہیں اور مقیم ہوتا۔ ایک دن جو میں پہنچا تو بولے:

"آدھ گھنٹہ پہلے آ گئے ہوتے تو تم دیکھتے کہ میں جو پڑھتا ہوں اس میں کتنا اثر ہے۔ اس برسات کا یہ پہلا کیس آج آیا تھا۔ وہ عورت کئی گھنٹوں سے درد میں تڑپ رہی تھی۔ ایک چیخ زمین کی تھی۔ ایک آسمان کی۔ بڑا ہی موذی بچھو تھا۔ خیر، دو ہی منٹ میں سکون ہو گیا۔"

قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں، بول اُٹھے: "ران کے نیچے کاٹا تھا۔ پوری ٹانگ پھوڑے کی طرح ٹپک رہی تھی۔ شاید ہی بچتا۔ ایسی حالت ہو گئی تھی کہ تن بدن کا ہوش نہ تھا۔"

"تو یہ کہیے ابھی ران سہلانے سے فرصت پائی ہے۔"

ہنسے اور کہا: "خوب یاد دلایا۔ پرسوں منگل کو میرے ساتھ چلنا۔ رمپروا کا کلوا کلوار تنا بھگت ہو گیا ہے۔ اب تو خوب مزے کرتا ہے۔ ہر منگل کو میلا سا لگنے لگا ہے۔ دور دور سے عورتیں آتی ہیں۔ خوب جھومتی ہیں۔ وہ ان کے سر سے بھوت اُتارتا ہے۔"

"ادھر کچھ شکار وکار بھی ہو گا؟"

ان کے ذہن نے میرے سیدھے سے سوال کو میرے پہلے مزاحیہ جملے سے خواہ مخواہ جوڑ دیا: "چڑیا مضبوط ہو تو شکار ہی شکار ہے۔"

بہرحال، منگل کو ہم دونوں گھوڑوں پر سوار ہو کر دوپہر کے بعد رمپروا پہنچے۔ واقعی ایک چھوٹا سا میلا لگا تھا۔ گاؤں کے باہر میدان میں

ایک جھونپڑی کے سامنے کچھ زمین لپی ہوئی تھی۔ اس پر دس پندرہ عورتیں بیٹھی تھیں جن کے چہروں سے وحشت برس رہی تھی۔ سب ہی جوان تھیں۔ بعض کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور بعض آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں۔ ان کے چاروں طرف مجمع لگا تھا۔ اسی مجمع کے پیچھے ہم لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

ایک جوان عورت جھونپڑی کے سامنے 'چبوترے پر' کلوا کے پاس بیٹھی زور زور سے جھوم رہی تھی۔ کچھ ناریل پڑے تھے۔ تھوڑے سے سکوروں میں کچھ سیندور تھا اور نہ معلوم کیا کیا۔ لوبان سلگ رہا تھا۔ کلوا نے جھک کر اس عورت سے کچھ کہا۔ اُس عورت کے سر کی جنبش بڑھی اور بڑھتی گئی۔ سر سے ساری کا آنچل کھسک گیا اور سر کی جنبش اتنی تیز ہوئی کہ سر کے بال ہر حرکت کے ساتھ شدت سے آگے پیچھے آنے جانے لگے۔ اتنی دیر تک اور اس تیزی سے سر ہلانا کسی مضبوط مرد کے بھی بس کا روگ نہ تھا۔ نہ معلوم کون قوت تھی جو اس کے سر اور دھڑ کو مشین کی طرح چلا رہی تھی۔ مگر آخر کہاں تک؟ کلوا نے پھر جھک کر اس سے کچھ کہا اور وہ عورت چیخ مار کر چت گری اور بے ہوش ہو گئی۔ اب کلوا نے کچھ منتر پڑھے اور کچھ دانے اس پر پھینکے۔ اس کے بعد اُس نے عورت کے گھر والوں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھے، عورت کی ساری درست کی اور اس کو اُٹھا لے گئے۔

خاں صاحب چپ تھے۔ اتنی دیر تک ان کا چپ رہنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ مڑ کر جو دیکھا تو ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ کچھ دعائیں پڑھ رہے ہوں گے۔ جب ان کے ہونٹ رکے تو میں نے کہا:

"دیکھئے خاں صاحب۔ جنون کے عالم میں انسان میں کتنی قوت آجاتی ہے۔ اب اس عورت کو ....."

"جی ہاں۔ سائنس داں صاحب۔ آپ اس کو سوائے جنون کے اور کیا کہیں گے۔ یہ دیکھئے۔ یہ دوسری عورت جو جا کر جھومنے لگی ہے وہ بھی پاگل ہے۔ مگر اس کا پاگل پن ذرا کچھ مختلف ہے۔ آگے پیچھے کے بجائے وہ بیٹھی ہوئی سر کو ایک دائرے کی شکل میں گھما رہی ہے۔ دیکھئے۔ اُس نے بھی تیزی پکڑی۔"

"خاں صاحب۔ اگر آپ کو کلوا کے علم پر اتنا اعتقاد ہے تو اس کے شاگرد ہو جائیے۔ ایک ہنر اور....."

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ عقل کرتا ہے۔ دیکھنا کسی دن کیسا چت ہو۔ خدا نہ کرے میرا دھیان اُدھر جائے۔ مجھنا چیز سے جو کچھ ہو سکتا ہے خلق خدا کی تھوڑی بہت خدمت کرتا رہتا ہوں۔ نہ گھر کا رہوں گا نہ گھاٹ کا۔ چلو۔ اب واپس چلیں۔"

ہم لوگ جب واپس آئے تو دیکھا کہ خاں صاحب کے دو "مریض" اُن کے منتظر ہیں۔ ایک بڑھیا اور ایک کمسن لڑکا۔ دونوں بہت بے چین تھے۔ لڑکا تو خیر بہت زور زور سے رو ہی رہا تھا، بڑھیا کی بھی درد سے بُری حالت تھی۔ خاں صاحب گھوڑے سے اُترتے ہی مریضوں کی طرف رجوع ہو گئے۔ منھ ہاتھ تک نہ دھویا۔ واقعی چند ہی منٹ میں دونوں کو سکون ہو گیا اور وہ خوش خوش واپس چلے گئے۔

میں نے اس روز پہلی مرتبہ خاں صاحب کو جھاڑ پھونک کرتے دیکھا تھا۔ اور پھر تو بیسوں مرتبہ دیکھا۔ ہر دفعہ ان کا طرز عمل ایک سا ہوتا۔ مثلاً اگر کسی کے پیر کے انگوٹھے میں بچھو نے ڈنک مارا ہے تو وہ پوچھتے کہ کہاں تک تکلیف ہے۔ جہاں تک درد کی تکلیف ہوتی اس مقام سے کچھ اوپر سے ہاتھ پھیرنا شروع کرتے۔ کچھ پڑھتے جاتے۔ جوں جوں ان کا ہاتھ نیچے آتا درد گھٹنا شروع ہوتا اور پھر وہاں پہنچ کر جہاں ڈنک لگا تھا کچھ دیر ہاتھ رکھتے۔ اکثر "مریض" تو بالکل چنگے ہو جاتے اور بعض اگر یہ کہتے کہ معزدب جگہ میں کچھ خلش باقی ہے تو وہ "لال دوا" (پوٹیشیم پرمینگنیٹ) لگا دیتے۔ ہر مریض سے ہدایت کرتے کہ "اگر ہو سکے کچھ خیرات کر دینا۔"

میں گورکھپور میں تقریباً چار سال رہا۔ جب میرے تبادلے کا حکم آیا تو میں ایک اتوار کو خاں صاحب سے "خدا حافظ" کہنے گیا۔ وہ شکار پر جا رہے تھے۔ مجھے بھی پکڑ لے گئے۔ میرے تبادلے کا حال سن کر بے حد متاسف ہوئے۔ بڑی دیر تک چپ رہے۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ اُنھیں بھی مجھ سے کتنا اُنس تھا۔ ہم لوگ خاموشی سے جنگل میں چلے جا رہے تھے۔ انھوں نے کہا۔ "یہ بندوق لینا۔ میں ابھی آیا۔"

خاں صاحب اپنی ۱۵ سے ماڈل کی بریچز کے بٹن کھولتے ہوئے نالے کی طرف گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں پانی میں دھماکا ہوا۔ میں لپکا تو دیکھا خاں صاحب ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔ ان کا پیر پھسل گیا تھا۔

بندوقیں پھینک کر، کوٹ اُتارتا ہوا، میں فوراً پانی میں کود پڑا۔ کون ایسا
چوڑا نالا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں کنارے پہنچے۔ خاں صاحب
نے شکریہ ادا کرتے کرتے واقعی میرے کان کھا لیے۔ بات ٹالتا۔ دوسرا
ذکر چھیڑتا۔ مگر گھوم پھر کر وہ پھر اسی مضمون پر آجاتے کہ "بھئی اگر آج
تم میرے ساتھ نہ ہوتے ....." اور پھر وہی شکریہ کا چرخہ چلنے لگتا۔ کوئی
انگریز تو تھے نہیں کہ "تھینک یو" کہہ کر میری "ڈونٹ منشن پلیز" پر
قصہ ختم ہو جاتا۔

آخر ہم لوگ بیٹھے کپڑے سکھانے لگے۔ اب شکار کیا ہوتا۔ ہاں،
شکریہ کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے اُن کا دھیان دوسری طرف لے جانے
کے لیے پوچھا: "خاں صاحب۔ آپ نے یہ بچھو کا زہر جھاڑنا کس سے
سیکھا تھا۔"

کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر جو انھوں نے جواب دیا تو وہ اتنا طویل
اور وہ قصہ اتنا دل چسپ تھا کہ گھنٹوں میں ختم ہوا۔ ہم لوگ کپڑے
سکھا کر سہ پہر کو واپس آ گئے اور یہ قصہ جاری تھا۔ یوں تو کیا سوں آپ
بیتی کہانیاں سنا چکے تھے مگر اس روز کا اُن کا یہ قصہ تفصیل سے لکھنے کے
لائق ہے۔ اُن کی چٹخارے دار قصہ گوئی کا انداز کہاں سے لاؤں۔ پھر بھی
کوشش کرتا ہوں کہ انھیں کی زبان میں اُن کا یہ تجربہ اور بچھوؤں پر قابو
پانے کا قصہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے لکھ دوں۔

(۲)

"یہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پہلی جنگ عظیم میں میں کہاں کہاں گھوما۔
جنگ کو تین سال ہو چکے تھے۔ میری تعیناتی شمالی افریقہ کے ایک صحرا میں
ہو گئی۔ اتفاق سے ایک دن میرے بائیں ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قریب
کے ایک قصبے کے اسپتال میں میرا داخلہ ہو گیا۔ یہ اسپتال ایک بہت
شریف یورپین ڈاکٹر کے چارج میں تھا جن کو مشرقی چیزوں اور لوگوں سے
بڑی دل چسپی تھی۔ بڑا ہر دل عزیز تھا۔ مجھ سے بھی اچھی خاصی ملاقات
بڑھ گئی۔ میں اس کو اکثر ہندوستان کے قصے سنایا کرتا تھا، بالخصوص ایسے
قصے جن میں اس کو کچھ زیادہ دل چسپی تھی۔ یعنی بھوت پریت، جادو گروں
اور جھاڑ پھونک کے۔

"ایک دن اس کے ایک حبشی مریض نے مجھے بتایا کہ اس قصبے
سے قریب ہی ایک گاؤں ہے جہاں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کی کراماتیں مشہور
ہیں۔ وہ لوگ تو اکثر صحرا نوردی ہی کیا کرتے ہیں مگر ایک قبیلے کی ایک
حبشن حمیدہ آج کل وہاں موجود ہے جو بچھوؤں سے اس طرح کھیلتی ہے
جیسے بعض بچے کھلونوں سے۔ وہ مریض اتفاق سے میرا ہم نام تھا اور
ہم مذہب۔ ہم دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔ پھر بھی قدرے تامل کے بعد
مجھے اپنے گاؤں کی اس حبشن کے کمالات دکھانے پر راضی ہوا۔

"دو تین دن میں اس کو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ چلتے وقت اس نے
وعدہ کیا کہ اگر وہ حبشن راضی ہوئی تو وہ مجھے بلوا لے گا۔ میں نے ڈاکٹر سے
اس حبشن کا تذکرہ کیا۔ ڈاکٹر تو ایسی چیزیں دیکھنے کا متمنی رہتا ہی تھا خود
بھی چلنے پر راضی ہو گیا۔

"تیسرے ہی دن مہدی (وہی حبشی) کا لڑکا ہم لوگوں کو لینے آیا۔ اُسی
دن ہم لوگ کرائے کے خچروں پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ سورج غروب ہونے
سے پہلے ہی مہدی کے گاؤں پہنچ گئے۔ چند پیچیدہ گلیاں طے کر کے تاڑ
کے جھنڈ کے نیچے ایک شکستہ جھونپڑی ملی جو دھوئیں سے لپی ہوئی تھی۔ اس
جھونپڑی میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ ایک جلتی ہوئی انگیٹھی سے جھونپڑی کا
اندرونی حصہ کچھ روشن تھا۔ جھونپڑی کے اندر کی چیزیں اور جو لوگ وہاں
بیٹھے ہوئے تھے بہ مشکل دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ کھسر پھسر کی آوازیں
آرہی تھیں۔ چٹائیوں پر ننگے پیروں کی دھیمی آوازیں بھی سنائی پڑیں۔
اتنے میں کسی نے ایک طاق میں چراغ جلایا تو ہم لوگوں نے دیکھا کہ اس
جھونپڑی میں صرف دو بڑھیا حبشنیں ہیں۔ ہم لوگوں کو سخت تعجب ہوا
کیونکہ کچھ دیر پہلے کی کھسر پھسر سے کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ کئی لوگ
باتیں کر رہے ہیں۔ بہر حال، ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔

"مہدی نے ان دونوں حبشنوں کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے
اُس سے کہا: "کیا تمھارے یہ ہندی بھائی آسام جا کر ایسے کرشمے
نہیں دیکھ سکتے تھے جو اتنی دور سے یہاں آئے ہیں؟"

"ہم لوگ کیا جواب دیتے۔ خاموش رہے۔

"ان دونوں بڑھیوں کے شکن زدہ چہروں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ
کی لہر دوڑی اور انھوں نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ کچھ وقفے کے بعد ہم لوگوں
کو چائے پینے پر مجبور کیا۔ جب تک کہ حمیدہ نمودار ہو، بڑھیاں چائے بنانے

میں مشغول ہو گئیں۔ باہر تیز ہوا کے جھونکے چل رہے تھے اور کچھ دور گانے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

"تھوڑی دیر بعد چائے تیار ہو گئی جس میں کچھ مسالے پڑے ہوئے تھے اور شاید بھنی مونگ پھلی بھی۔ جب ہم لوگ چائے پی چکے تو ایک بڑھیا نے کچھ پڑھ کر دہکتی ہوئی انگیٹھی پر تھوڑے سے سوکھے دانے ڈال دیے۔ یکایک ایک خوشبودار دھواں نکلا اور جھونپڑی میں پھیل گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے جھونپڑی میں ایک طرح کی نیم تاریکی ہو گئی تھی۔ اسی نیم تاریکی میں حمیدہ چپکے سے پرچھائیں کی طرح داخل ہوئی۔ وہ سر سے پیر تک ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی اور اس کی صرف ایک آنکھ چادر سے جھانک رہی تھی۔ اس نے ہم لوگوں کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوئی۔

"ڈاکٹر صاحب۔ خدا آپ پر مہربان رہے۔ کیسے تشریف لائے؟"

"یہ سوال بیکار سا تھا کیونکہ مہدی اس کو ہم لوگوں کی آمد سے مطلع کر چکا تھا۔ مہدی نے ڈاکٹر کی طرف کچھ چپکے سے کہہ دیا۔

"تو آپ بچھوؤں کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں!" اس نے پھر ڈاکٹر ہی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اس کی آواز بہت دھیمی تھی اور قدرے میٹھی ہوئی۔ لہجہ اکثر الفاظ کو غیر مانوس بنا دیتا تھا۔ اور یوں بھی ہماری اور ڈاکٹر کی عزلی کون ایسی زود سعادت تھی!

"کیا آپ لوگ کوئی منتر جانتے ہیں جس سے بچھوؤں پر قابو پا لیا جائے؟"

"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ جس آنکھ سے جھانک رہی تھی اس سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحب۔ آپ تو بڑے قابل آدمی ہیں مگر بچھوؤں کا کوئی منتر نہیں جانتے؟"

"ڈاکٹر چپ رہا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ شاید بچھوؤں کے ڈنک کی کوئی دوا بھی نہیں جانتے۔ اسی لیے شاید آپ کو میرا ہنر دیکھنے کا اشتیاق ہے۔"

"ڈاکٹر نے سر ہلا دیا۔

"حمیدہ نے ایک ادا سے سر کو جنبش دی۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے جیسے کچھ کھو سی گئی۔ گانے کی آوازیں دور سے ابھی تک آ رہی تھیں۔ یکایک حمیدہ چونک سی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اپنا چہرہ کھول دیا اور ہاتھ پیچھے ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سو گئی ہے۔ مگر اس کے کاندھے دور کے گانے کی لے پر برابر ہل رہے تھے۔ انگیٹھی سے خوشبودار دھواں برابر نکل رہا تھا۔ دفعتاً حمیدہ نے اپنے تئیں جھنجھوڑا اور اپنے سر، سینے اور کولھوں کی ہلکی سی جنبش سے اپنی چادر گرا دی۔ اب وہ پلتھی مارے بالکل سیدھی بیٹھی تھی۔ اس کے بدن پر ایک بغیر آستین کا لمبا، ڈھیلا ڈھالا کرتا تھا اور بس۔ زیور ایک بھی نہ تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ ہونٹ موٹے اور کچھ ادھ سے لگ رہے تھے مگر ناک زیادہ چپٹی نہ تھی۔ ماتھا بیضا اور آنکھیں شنگرفی تھیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے گھونگھرالے بال اس کے سر سے چپکے ہوئے تھے۔

"یکایک اس نے ایک چٹائی کی ٹوکری اٹھائی اور اس کا رنگین ڈھکنا کھولا۔ ٹوکری میں ایک بہت بڑا بچھو اپنی دم کو نیزے کی طرح سیدھا کیے غصے سے ہلا رہا تھا!

"حمیدہ نے بچھو کو گھورنا شروع کیا۔ اس کی آنکھیں اور ہونٹ نیم کشادہ تھے۔ دو انگلیوں سے بچھو کو اٹھا کر اس نے اپنے کندھے پر رکھ لیا۔ بچھو لڑکھڑاتا ہوا اچھلا اور کرتے کے گلے سے ٹکرا کر اس کی ہنسلی کے پاس سے سینے کے اندر جا گرا۔ حمیدہ نے سینہ تان کر اپنا سر پیچھے کھینچ لیا۔ بچھو رینگ کر اس کی گردن پر چڑھتا چلا جبڑے پر رینگ کر، اس کے گال پر آ گیا۔ اس نے ایک آنکھ بند کر لی۔ بچھو اس کی آنکھ پر سے گزرتا ہوا ماتھے پر آیا اور اس کے گھنے بالوں میں گھس گیا۔ حمیدہ نے بچھو کو ہاتھ پر لے لیا اور اس کو سہلانے لگی۔ پھر کچھ بڑبڑا کر بچھو سے کہا اور اس کی پیٹھ کو سہلاتے سہلاتے اس کو اپنے منہ میں رکھ لیا۔ بچھو کی صرف دم باہر تھی اور حمیدہ کی ٹھوڑی اور نتھنوں پر برابر نیش زنی کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد تھوک میں لتھڑا ہوا بچھو حمیدہ کی ہتھیلی پر گھبرایا ہوا ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ مسکرا کر اس نے اس کو اپنی بغل میں دبا لیا۔ پھر اس نے اپنے کرتے کا بند کندھے پر سے دفعتاً کھول دیا اور کندھوں کی ایک ہی جنبش سے کرتا اس طرح گرا کہ وہ زانو تک برہنہ ہو گئی

اور بچھو کو اُس نے اپنی دونوں بھری بھری رانوں کے درمیان دبا لیا۔

"تھوڑی دیر بعد حمیدہ نے سر پیچھے کر کے ایک قہقہہ لگایا۔ اس کے ہونٹ کھلے اور آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ اسی حالت میں اُس نے ایک دوسرے زردی مائل بچھو کو پٹاری سے نکالا اور اُس سے کھیلنا شروع کر دیا۔ یہ بچھو پہلے بچھو سے کچھ چھوٹا ضرور تھا مگر بظاہر زیادہ زہریلا معلوم ہوتا تھا۔ حمیدہ نے اُس کو انگلی سے چھیڑ کر اُس پر ایک پھونک ماری۔ جب وہ بچھو غصے سے دُم پٹخنے لگا تو حمیدہ نے زبان سے اُسے چھیڑنا شروع کیا۔ بچھو زبان پر برابر ڈنک مار رہا تھا مگر حمیدہ کو کوئی تکلیف نہ تھی!

"اب دونوں بچھو حمیدہ کے ہاتھ پر تھے۔ اُس نے دونوں کو گھورنا شروع کیا۔ دونوں مقابل میں مسلح سپاہیوں کی طرح اپنی دُم کا ہتھیار درست کیے پینترے کاٹنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف رفتہ رفتہ بڑھے اور ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ دونوں پنجوں اور دُموں سے ایک دوسرے پر حملہ کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بچھوؤں کی مہلک کشمکش حمیدہ میں سرایت کر رہی ہے۔ وہ اس طرح کانپ رہی تھی جیسے لرزہ اور بخار میں مبتلا ہو۔ اس کے ہونٹ اُس کے چمکتے ہوئے دانتوں پر کھنچ گئے تھے مگر اُس کی نگاہیں دونوں بچھوؤں پر برابر جمی ہوئی تھیں۔

"یکایک اُس کے منہ سے اس قسم کی ایک چیخ نکلی جس طرح کہ اس کے قبیلے کی عورتیں جنگ کے دوران چیخ کر اپنے مردوں کو مشتعل کرتی ہیں۔ اس آواز پر دونوں کیڑے اور بھی جوش میں ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو نوچ رہے تھے اور ان کی دُمیں ہوا میں اسی طرح نیش زنی کر رہی تھیں جس طرح کہ حمیدہ کی آنکھ، ناک، ہونٹ اور زبان پر تھوڑی دیر پہلے کی تھی۔ رفتہ رفتہ دونوں بچھو ساکت ہو گئے۔ دونوں میں ایک دوسرے کا زہر سرایت کر چکا تھا۔ یکے بعد دیگرے دونوں نے پھریری سی لی۔ اب اُن کی گرفت ڈھیلی ہو گئی تھی اور ٹانگیں بھی پھیل گئی تھیں مگر دُمیں ایک دوسرے کے جسم میں پیوست تھیں۔

آخر دونوں کیڑے چٹائی پر لڑھک کر گر پڑے۔ دونوں مردہ تھے۔

"حمیدہ کی رگیں ایک دم سے ڈھیلی پڑ گئیں۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے اپنے گھٹنے پکڑ لیے۔ اس کے منہ سے پھین نکل رہا تھا اور جسم سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

"جھونپڑی میں خوشبودار دھواں اب بھی بھرا ہوا تھا۔ دونوں بڑھیاں ایک کونے میں بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ دھوئیں میں ان کے چہرے غیر انسانی معلوم ہو رہے تھے۔ مہدی کا چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا۔

"حمیدہ اب مُردے کی طرح سفید ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل ساکت تھی۔ البتہ کبھی کبھی وہ ایک پھریری لیتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جان ہے۔ ڈاکٹر نے جلدی سے اس کے قلب کا معائنہ کیا اور گردن ہلا کر اطمینان ظاہر کیا۔ میں نے بھی اس کو چھوا۔ اس کا جسم بالکل سرد تھا۔ بڑھیاں بیٹھی رہیں مگر اُن کے ہونٹ برابر چل رہے تھے۔

"واقعی یہ لڑکی کچھ رموز سے واقف ہے۔" مہدی بولا۔ میں اور یورپ کا ایک تعلیم یافتہ ڈاکٹر کس نتیجے پر پہنچا، اب بھی نہیں کہا جا سکتا۔

"ہم لوگ بڑھیوں کے اشارے پر جھونپڑی سے نکل آئے۔ اندھیرا گھپ تھا۔ بستی سنسان۔ ہوا رک چکی تھی۔ خاموشی مکمل تھی۔

"رات گاؤں میں قیام کیا۔ دوسرے دن ڈاکٹر تو سویرے ہی اسپتال چل دیا مگر میں رُک گیا۔ اس بے چارے نے میرے اصرار پر مجھے دو دن رکنے کی اجازت دے دی تھی۔ مجھے فکر تھی کہ کسی طرح حمیدہ سے بچھوؤں پر قابو پانا سیکھ لوں۔

"صبح میں مہدی کے ہمراہ اس کی جھونپڑی میں پہنچا۔ رات کی حمیدہ اور صبح کی حمیدہ میں بڑا فرق تھا۔ اس وقت وہ چادر لپیٹے، صرف ایک آنکھ نکالے دور آ کر بیٹھ گئی۔ مہدی نے اس وقت میری بڑی مدد کی اور کہا کہ میں ہندوستان سے یہ ہنر سیکھنے آیا ہوں۔ حمیدہ نے کچھ بتانے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ کام مجھے کبھی بھی نہ آئے گا۔

"حمیدہ پر یا اس کے کسی خاندان کے فرد پر مہدی کے کچھ احسانات تھے۔ اس لیے وہ میری برابر سفارش کرتا رہا۔ آخر حمیدہ اس پر راضی ہو گئی کہ وہ مجھے اپنے چچا سے ملا دے گی جو اس کے استاد بھی تھے اور جنہوں نے اُسے اپنی لڑکی کی طرح پالا بھی تھا۔ حمیدہ کے تو نہ باپ تھے نہ ماں۔

"تھوڑی دیر بعد مہدی اور میں، حمیدہ کے ہمراہ اُس کے چچا کے خیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر تمھیں اب نیند آ رہی ہوگی۔ دن بھر کے تھکے ہو، میری حماقت سے بھیگے بھی ہو۔ لہذا قصہ کوتاہ کر کے میں اتنا بتا دوں کہ

حمیدہ کے چچا سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بڑے نیک آدمی تھے مگر جب میرے آنے کا سبب حمیدی نے بتایا تو چپ ہو گئے۔ ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"حمیدہ کو ابھی کیا آتا ہے۔ لیکن آپ کو تو اتنا بھی نہیں بتایا جا سکتا۔ یہ علم صرف قبیلے ہی کے افراد کے لیے مخصوص ہے اور سینہ بہ سینہ صدیوں سے ہمارے خاندان میں چلا آتا ہے۔ مگر جب تم اتنی دور سے میرے پاس آئے ہو تو خالی ہاتھ کیسے واپس کر دوں۔ صبح فجر کی نماز کے بعد کچھ بتا دوں گا۔"

دوسری صبح حسب وعدہ انھوں نے مجھے بلا کر میرے داہنے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور زیر لب کچھ پڑھا۔ پھر ایک عمل بتایا اور چند ہدایات کیں۔

اب اور کہنے کی ضرورت نہیں۔ باقی تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔"

خاں صاحب یہ لمبا قصہ سنا کر خاموش ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ کئی مرتبہ کچھ اور کہنا چاہا مگر ارادہ بدل دیا۔

ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ نماز پڑھی اور سو رہے۔ صبح میں اُن سے رخصت ہوا۔ وہ رنجیدہ سے ہو رہے تھے۔ بغلگیر ہوئے۔ اور اس وقت پھر مجھے خیال ہوا کہ کچھ کہنا چاہتے ہیں مگر ارادہ بدل دیتے ہیں۔

(۳)

زمانہ گذرتا رہا۔ ہم دونوں میں کبھی خط و کتابت نہ ہوئی۔ میں خط لکھنے سے گھبراتا ہوں۔ اور خاں صاحب کو لکھنے پڑھنے سے کیا غرض تھی!

غالباً سنہ ۵۰ء ہو گا کہ ایک دن میرے دفتر میں یکایک خاں صاحب نمودار ہوئے۔ دراصل میں نے ایک نظر میں ان کو پہچانا بھی نہیں۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی اور سینے سے باتیں کر رہی تھی۔ وہی سنہ ۱۵ء والی بریجیز اور وہی پرانا ہنٹنگ کوٹ زیب تن تھا۔ جس نے پہچاننے میں مدد کی۔ ساکت کھڑے مسکرا رہے تھے۔ جب میں ان سے لپٹ گیا تو ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دعا سلام کے بعد ان کی زبان چلی۔ گو بہت ضعیف ہو گئے تھے مگر "طاقتِ گفتار" میں کوئی کمی نہ تھی۔ ایک ہی سانس میں بتا گئے کہ کسی عزیز قریب کی شادی میں لکھنؤ آنا ہوا تھا۔ میرے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا اس لیے دفتر ڈھونڈتے پھرے۔ بڑی پریشانی کے بعد ملاقات ہوئی۔

میں ان کو اپنے گھر پکڑ لایا۔ سامان منگوا لیا اور آن سے رٹنے لگی۔ دوسرے دن ان کو واپس جانا لازمی تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب نماز اور وظیفے سے فارغ ہوئے تو میں نے یوں ہی تذکرہ کیا:

"کہیے خاں صاحب۔ کچھو بازی اب بھی جاری ہے؟"

مسکرائے اور جواب دیا: "وہ تو جب تک دم میں دم ہے کیسے چھٹے گی؟" پھر سوچ کر کہا۔

"وہ دن یاد ہے جب ہم دونوں نے نالے میں ڈبکیاں کھائی تھیں؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

"حمیدہ کا بھی قصہ یاد ہے جو میں نے تم کو سنایا تھا؟ اسی دعا نے میری جان بچائی تھی۔ میں نے کئی مرتبہ ارادہ کیا تھا کہ میں تم کو وہ گر بتا دوں جو مجھے حمیدہ کے چچا نے بتایا تھا اور جس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے میں بہت سے لوگوں کے دکھ میں کمی کر سکا۔ مگر ہر مرتبہ میں نے ارادہ بدل دیا۔ کیونکہ اگر میں تم کو وہ ہنر اس وقت سکھاتا تو اس احسان کا بدلہ ہوتا جو تم نے مجھ پر اس روز کیا تھا۔ ممکن تھا کہ اس بناء پر اس عمل کی تاثیر تم تک نہ پہنچتی بلکہ شاید مجھ میں بھی باقی نہ رہتی۔ پھر کبھی اس زمانہ میں تم بڑے صاحب بہادر ہو رہے تھے۔ نماز گذار تھے نہ روزہ دار ہوتی تھی۔ روزے کو کون کہے۔ میرا تو اب وقت قریب ہے۔ تم میں اب ماشاء اللہ وہ لڑکپن نہیں رہا۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ تم کو وہ طریقہ بتلا دوں اور چند ایسی چیزیں جن پر عمل کرنا ہو گا۔ تم ہی ایک ایسے شخص تھے جس نے مجھ سے اس ہنر کے سیکھنے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ اب کیا کہتے ہو؟"

"خاں صاحب۔ آپ کا بہت بہت شکریہ مگر میں خود کو اہل نہیں سمجھتا۔"

خاں صاحب نے بہت اصرار کیا مگر میں نے ایک نہ سنی۔ دوسرے دن خاں صاحب نے چلتے وقت پھر کہا۔

"بھتیا۔ سوچ لو۔ تم سے کون کہتا ہے کہ تارک الدنیا ہو۔ صرف چند احکامات ہیں جن پر عمل کرنا ہو گا اور وہ کون ایسے مشکل ہیں۔ تم میری زندگی سے واقف ہی ہو۔ میں کہاں کا عابد و زاہد ہوں۔"

میں نے بصد شکریہ کے ساتھ انکار کر دیا۔

چند ماہ بعد مجھے دفتر کے پتے سے ایک غیر مانوس تحریر ملی جس میں یہ اطلاع تھی کہ مہدی علی خاں کا انتقال ہو گیا ہے اور انھوں نے یہ مہر شدہ لفافہ مرتے وقت راقم کو دیا تھا کہ اس پتے پر رجسٹری کر کے بھیج دیا جائے۔

مجھے خاں صاحب کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد رنج ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ اس مہر شدہ لفافے میں ہو نہ ہو وہ تمام احکامات ہوں گے جن کو خاں صاحب نے آخری ملاقات میں بتانا چاہا تھا اور مجھے اس لیے بھیجے کہ اپنے جاننے والوں میں سب سے زیادہ مجھ کو عزیز یا مستحق سمجھتے تھے تاکہ ان کے بعد میں اس نیک کام کو کروں۔ میں نے بہت سوچا مگر واقعی میں نے خود کو اہل نہ سمجھا۔ بہر حال، یہ سوچ کر کہ "پھر دیکھا جائے گا" میں نے لفافے کو گھر لا کر ایک صندوق میں مقفل کر دیا۔

زمانہ اور گزرا۔ میں پنشن یافتہ گروہ میں شامل ہو گیا۔ عموماً اس حصۂ زندگی میں یاد خدا بڑھ ہی جاتی ہے .... میری داڑھی بھی بڑھ گئی۔ تفریحات سے مجھے کوئی سروکار نہ رہا۔ پنشن کے دو سال گزر گئے۔ اس دوران میں اس لفافے کا مجھے خیال تک نہ آیا۔ ایک دن سنا کہ پڑوس میں ایک بچہ کو بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ یکایک مجھے وہ لفافہ یاد آیا۔ میں اُسے لانے کے لیے اُٹھا۔ اُسے کھولنے میں اب بھی مجھے تکلف ہو رہا تھا اور آخر بہت شش و پنج کے بعد اس لفافے کی مہر توڑی۔ لفافہ کھول کر حیران رہ گیا۔

..... اس کے اندر ایک سادہ ورق تھا اور بس!

جب سے تین سال گزر چکے ہیں۔ میں اب تک حیران ہوں کہ آخر یہ معمہ تھا کیا؟ کیا خاں صاحب نے مجھ سے مذاق کیا؟ ہرگز نہیں۔ وہ ایسا مذاق کبھی نہ کرتے جس میں اُن کے عقیدے سے ذرا بھی لگاؤ ہوتا۔ کیا خاں صاحب آخری وقت میں اتنے ضعیف الدماغ ہو گئے تھے کہ احکامات کا پرچہ لفافے میں رکھنے کے بجائے ایک سادہ پرچہ رکھ گئے؟ اگر ایسا ہوا تو اصل پرچہ تو وہ بعد میں دیکھتے۔ یا اگر موت نے اتنی فرصت نہ دی تھی تو وہ پرچہ آخر گیا کہاں؟

کیا میں دراصل اب بھی مستحق نہ تھا کہ ان احکامات کی پیروی کر پاتا اور اسی بنا پر وہ پرچہ میرے نیک اعمال کی فہرست کی طرح سادہ نکلا!

شاید یہی بات تھی۔



سمندر کی آنکھ

(بسلسلہ صفحہ ۲۴)

نرل سنگھ کو رات کے لباس میں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ بوگی نکل گئی تو پرمانک کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو چھلک پڑے۔

آخری دو ڈبے مسافروں کے تھے۔ مسافر بھی باہر جھانک رہے تھے۔ آخری ڈبے میں سے ایک نسوانی بازو لہرایا۔ چوڑیوں سے بھرا ہوا اور ہاتھ میں پھولوں کا ہار لئے۔

"سُنو! سُنو! سوامی یہ ہار لے لو!"

پرمانک نے پورنیما کی آواز پہچان لی۔ حیران ہو کر اوپر دیکھا۔ اُس کا پھینکا ہوا ہار لہراتا، چکر کھاتا ہوا نیچے آ رہا تھا۔ پل کے نیچے وہ خوشی سے اُچھل کر ہار لینے کے لئے لپکا۔ لیکن گڑھے کے اندر گر گیا۔ پانی سے بھرے ہوئے سوتے کے اندر۔ پورنیما نے بیس فٹ اوپر رینگتی ہوئی گاڑی کے ڈبے میں سے چیخ ماری۔ گاڑی رُک گئی۔ پل پر سے گزر جانے کے بعد رُک گئی۔ لوگ گاڑی سے اُتر اُتر کر پانی کے گڑھے کی طرف بھاگے۔ سارے مزدور بھی اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ لیکن پرمانک پانی میں گرنے کے بعد فوراً ہی اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پانی بہت گہرا نہیں تھا۔ بس کمر تک ہی پہنچتا تھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے پتھر بھرے ہوئے تھے۔ سوتا بھرا جا چکا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں پانی میں بھیگا ہوا پھولوں کا ہار تھا۔ اور وہ مسکرا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیڑ میں پورنیما کو تلاش کر رہی تھیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں فارسی اور اردو کے مشہور شعرا

خواجہ منظور الحسن

دکن میں بہمنیوں کے زوال کے بعد ان کی سلطنت پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتوں یعنی بیجاپور، گولکنڈہ، احمدنگر، بیدر اور برار میں بٹ گئی تھی۔ ان میں بیجاپور کی سلطنت کئی لحاظ سے سب سے زیادہ طاقت ور اور ترقی یافتہ تھی۔ بیجاپور نے عادل شاہیوں کے عہد حکومت میں کافی ترقی کی اور دکن میں وہ برسوں تک علوم و فنون کا اہم مرکز بنا رہا۔

عادل شاہی سلطنت کا بانی یوسف عادل خاں، ساوا کا رہنے والا تھا۔ دکن میں اس نے ایک معمولی سی ملازمت اختیار کی لیکن بہت جلد اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر صوبہ داری کے عہدے تک پہنچا اور پھر خود بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ صرف ایک اچھا سپہ سالار ہی نہیں تھا بلکہ اچھا ادبی ذوق بھی رکھتا تھا۔ فارسی کا اچھا شاعر تھا اور ہمیشہ علما و فضلا کی صحبت پسند کرتا تھا۔ اس کا دربار دکنی اور ایرانی علما سے بھرا رہتا تھا۔ یوسف عادل شاہ کا بیٹا اور جانشین اسمٰعیل عادل شاہ اپنے باپ کی طرح علم و فن کا بڑا قدر داں تھا۔ شاعر بھی تھا اور وفائی تخلص کرتا تھا۔ اس کے دربار میں بھی علما و فضلا جمع رہتے تھے۔ خاندانِ عادل شاہی کا تیسرا بادشاہ ملو عادل شاہ نا اہل اور ناکارہ تھا اس لیے چھ ماہ کے قلیل عرصے میں ہی تخت سے علٰحدہ کر دیا گیا۔ البتہ اس کا جانشین ابراہیم عادل شاہ اول ادبی ذوق رکھتا تھا۔ یوسف عادل شاہ اور اسمٰعیل عادل شاہ کی ایرانی تہذیب سے وابستگی کی وجہ سے بیجاپور میں اب تک فارسی ہی کا دور دورہ تھا لیکن ابراہیم اول نے اپنے دربار میں ایرانی زبان و تہذیب کی جگہ دکھنی زبان (اردو) اور تہذیب کو رواج دیا۔ اس کے عہد میں یوں تو بہت سے شعرا اور مصنفین موجود رہے ہوں گے لیکن اب تک صرف ایک ہی شاعر شاہ برہان الدین جانم کا حال معلوم ہوا ہے۔ ابراہیم اول کے جانشین علی عادل شاہ اول بھی علم اور علما کا بڑا قدر داں تھا اور اس کے دربار میں بھی ایران، عراق، عرب اور بہت سے دوسرے ممالک کے علما جمع تھے۔ علی نے بیجاپور میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بھی قائم کیا تھا۔ کتب بینی کا اسے اس قدر شوق تھا کہ جب بھی سفر پر جانا ہوتا وہ اپنے ساتھ منتخب کتابوں کے چار صندوق رکھوا لیا کرتا۔

خاندانِ عادل شاہی کے چھٹے فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی کا دور بیجاپور کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس نے تقریباً نصف صدی تک حکومت کی۔ اس طویل مدت کی وجہ سے حکومت کی بنیادیں اس قدر مضبوط ہو گئیں کہ ہمسایہ حکومتوں کو بیجاپور کے معاملات میں دخل دینے کی کبھی جراءت نہیں ہوئی۔ وہ نہ صرف اپنے علم دوست چچا علی کا جانشین ہی تھا بلکہ بہ حیثیت ایک عالم، ادیب اور شاعر اور ماہر موسیقی ہونے کے اس کو کافی شہرت حاصل تھی۔ اس کا دربار علما و شعرا سے بھرا ہوا تھا اور سوائے دربار اکبری کے

ہندوستان میں اس جیسا شاندار دربار اور کوئی نہ تھا[1]۔ ابراہیم کی ذاتی دل چسپی اور فیاضانہ سرپرستی کی وجہ سے اس کے عہد میں علوم و فنون کی بڑی ترقی ہوئی۔ وہ اردو کا بڑا زبردست سرپرست تھا چناں چہ جب اس نے اپنا دارالسلطنت تبدیل کیا تو خود اس کا نیز محلوں، باغوں اور گلی کوچوں کے اردو نام رکھے۔ گجرات جو علما و شعرا کا زبردست مرکز تھا، جب مغل حملوں کی وجہ سے تاخت و تاراج ہوا تو ابراہیم نے وہاں کے بے سر و ساماں علما اور شعرا کو بڑے بڑے تحفے تحائف دے کر بیجاپور بلوایا اور اس طرح اس کے عہد میں بیجاپور، دکن میں علمی و ادبی سرگرمیوں کا زبردست مرکز بن گیا۔ چناں چہ ابراہیم کے دربار میں شاہ خلیل اللہ اور شاہ نواز خاں ماہر خطاطی و فن تعمیر کے علاوہ ابوالقاسم فرشتہ اور رفیع الدین شیرازی جیسے بلند پایہ مؤرخ، ملا ظہوری اور ملک قمی جیسے فارسی کے مشہور شاعر، آتشی، مقیمی، امین، نوری اور عبدل جیسے شعرائے اردو جمع ہو گئے تھے، جن کی موجودگی نے دربار ابراہیم کو "گلزار ابراہیم" بنا دیا۔

ابراہیم چوں کہ خود ایک زبردست ماہر موسیقی ہونے کے علاوہ خوش گو شاعر بھی تھا اس لیے پہلے اسی کا تذکرہ مناسب ہے۔ اس کے بعد اس کے دربار کے چند مشہور ہستیوں کا مختصر طور سے ذکر کیا جائیگا۔

ابراہیم: ابراہیم عادل شاہ ثانی ابراہیم تخلص کرتا تھا۔ اس نے مثنوی، غزل اور قصیدے سبھی اصناف پر طبع آزمائی کی مگر ان کے بارے میں ہماری معلومات ابھی تشنہ ہیں۔ ہاں، اس کی ایک تصنیف نورس کا پتہ چلا ہے[2]۔ نورس علم موسیقی پر ایک نایاب کتاب ہے جس میں مختلف راگ اور راگنیوں میں گائے جانے والے گیت جمع کیے گئے ہیں۔ اس کے مختلف نسخوں میں کم و بیش گیت ملتے ہیں[3]۔ نورس کے اب تک گیارہ نسخوں کا پتہ چلا ہے ان میں سے سالار جنگ میوزیم میں دو نسخے میں نے دیکھے ہیں۔ ابراہیم اپنی کتاب کا آغاز اس طرح کرتا ہے ؎

نورس سور جگ جوت ان سرو تن   یوست سرستی ماتا ابراہیم پرساد ہی دوانی

(در مقام بھیرو)

نورس پر ملا ظہوری نے دیباچہ لکھا تھا جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے ــــ یہ دیباچہ کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے اور ہندوستان کی کئی یونی ورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہے۔

آتشی: عہد ابراہیمی کا پہلا زبردست شاعر حکیم سید آتشی تھا۔ آتشی ایک اچھا شاعر ہونے کے علاوہ بہت کامیاب طبیب بھی تھا۔ آتشی نے دکنی سے زیادہ فارسی میں طبع آزمائی کی ہے۔ تذکرہ بساتین بیجاپور اور فتوحات عادل شاہی کے مصنفین نے آتشی کی بڑی تعریف کی ہے۔ افسوس ہے کہ کوشش کے بعد بھی اس کا اردو کلام دستیاب نہیں ہوا۔

مقیمی: مرزا محمد مقیم مقیمی نے آتشی کی طرح فارسی اور اردو دونوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ مقیمی استرآباد کا رہنے والا تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد وہ کم عمری میں بیجاپور آیا اور یہیں پرورش پائی۔ کم عمری ہی سے شعر کہنے لگا تھا۔ اپنے زمانے کا مستند شاعر مانا جاتا تھا۔ مقیمی کی دو مثنویاں مشہور ہیں، ایک "چندر بدن و ماہ یار" اور دوسری "سوہار کی کہانی"۔ "چندر بدن و ماہ یار" کو قدیم ادب میں کلاسکی کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ "چندر بدن و ماہ یار" کا قصہ چندرسین کے راجہ کی لڑکی چندر بدن اور ایک نوجوان ماہ یار کے عشق کی داستان ہے جو اپنی زندگی میں مذہب اور رواج کی بندشوں کی وجہ سے ایک نہ ہو سکے لیکن موت نے انھیں ایک کر دیا۔ یہ مثنوی پروفیسر عبدالقادر سروری کی نگرانی میں مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی جانب سے

---

[1] ڈاکٹر محی الدین قادری زور: اردو شہ پارے۔ [2] ابراہیم کو لفظ "نورس" سے خاص لگاؤ تھا۔ اس نے بیجاپور کے قرب میں نورس پور نامی ایک شہر بسایا تھا۔ اس میں قلعۂ نورس اور نورس محل تعمیر کروائے۔ وہ ہر سال "جشن نورس" بھی منایا کرتا تھا۔ درباری شاعر عبدالقادر کو نورسی تخلص عطا کیا تھا اور شاہی مہر پر "نورس" کندہ کروایا تھا۔ [3] ڈاکٹر نذیر احمد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اپنی ایک کتاب میں اس کی پوری تفصیل دی ہے۔

شائع ہو چکی ہے۔ مثنوی کے دو اشعار یہ ہیں ؎

سہیلیاں کہیاں یوں کہ چندر بدنا   تو سب مدن جدا بولی ہو کس کدھن
کہیا یوں وو نازک میٹھے بول سوں   سو بیگی لاوں جا کے اس پھول سوں

مقیمی کی دوسری مثنوی "سوہار کی کہانی" زیادہ شہرت حاصل نہ کرسکی۔ اسپرنگر نے لکھا ہے کہ اس میں دو سو پچاس شعر تھے۔ بہر حال یہ مثنوی اب نایاب ہے۔

امین: عہد ابراہیم ثانی کا تیسرا باکمال شاعر امین تھا۔ چوں کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے متعدد شعرا کا تخلص امین تھا اس لیے بعض دفعہ امین کے تعلق سے مورخین کو بھی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ابراہیم کے عہد کا امین دکنی زبان کی مشہور مثنوی "بہرام و حسن بانو" کا مصنف ہے۔ امین اپنے آپ کو مقیمی کا شاگرد بتلاتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس نے مقیمی کی مثنوی پڑھنے کے بعد ہی یہ مثنوی لکھی ہے۔ اس مثنوی سے امین کے ذاتی حالات کا کچھ پتا نہیں چلتا اس لیے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ بہر حال اس مثنوی کا ماخذ ایران کے مشہور ہیرو بہرام گور کے قصص ہیں۔ اس میں بہرام اور حسن بانو کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس منظوم قصے کی ابتدا امین نے کی تھی لیکن وہ اس کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا۔ محمد عادل شاہ کے عہد کے ایک دوسرے شاعر دولت نے اس کی تکمیل کی۔

نوری: نوری کے بارے میں کوئی بات قطعیت سے نہیں کہی جا سکتی کیوں کہ مورخین اس کے نام اور کارناموں کے بارے میں ابھی تک متفق نہیں ہیں۔ بعضوں نے اس کو اس کے بعد کے نوری (جس کا نام شجاع الدین تھا اور جو گجرات کے ایک سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا) ملا دیا ہے (سر چارلس لائل اور گارساں دتاسی)۔ کو زیر بحث نوری کے متعلق یہ معلوم ہو سکا ہے کہ وہ اعظم پور کے قاضی کا لڑکا تھا۔ اس نے فارسی کے علاوہ دکنی اردو میں بھی غزلیں کہی تھیں جو اس زمانے میں بہت مشہور رہیں۔ رام بابو سکسینہ اور نصیر الدین ہاشمی کا خیال ہے کہ نوری ابراہیم ثانی کے عہد میں بیجاپور آیا اور مرثیہ لکھ کر دکنی میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کی۔

عبدل: ابراہیم ثانی کے عہد میں عبدل بھی اردو کا ایک اچھا شاعر تھا لیکن افسوس ہے کہ کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی اس کے نام کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس کا نام عبد الغنی یا عبد القادر تھا اور تخلص عبدل۔ ایک دن بادشاہ نے اس کو اپنے حضور میں بلوایا اور حکم دیا کہ دکنی زبان میں کوئی کتاب لکھے۔ عبدل نے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں ۱۰۱۲ھ میں یہ مثنوی لکھی۔ اس میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی مدح ہے۔ اس کے بعد اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ تعریف سخاوت بادشاہ، شہر بیجاپور، دربار بادشاہ، نورس بادشاہ، شکار، ہیئت لشکر، تعریف فیلان شاہی، سلحدار یا تعریف اسپاں، تعریف باغ اور تعریف بہار وغیرہ درج ہیں۔ عبدل اگرچہ خود لکھتا ہے کہ اس کو عرب و عجم کی کوئی زبان نہیں آتی لیکن اس کی مثنوی کے سارے عنوانات فارسی میں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے وہ نابلد نہیں تھا۔ ابراہیم نامہ نہ صرف ادبی و لسانی اہمیت رکھتا ہے بلکہ تاریخی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے کیوں کہ ابراہیم ثانی کی سوانح عمری نہ ہونے کے باوجود اس کتاب سے بادشاہ کی زندگی پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ مثنوی کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے:

الٰہی زباں گنج توں کھول منجھ   امولک بھاکر جس کو جیرا
کہوں باسم اول تو اللہ لائے   گلے موکم کھلے جیب پکڑے

اور اختتام اس طرح ہوا ہے:

خدایا تو عبدل بچن پھول کر   بھنور حا زماں جیت سو مقبو

ابراہیم نامہ کا اب تک صرف ایک نسخہ ملا ہے جو کتب خانہ گنج بخش میں موجود ہے۔

ملا ظہوری: ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے فارسی شعرا میں ملا ظہوری کا رتبہ بہت بلند ہے وہ نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتا تھا۔ ابراہیم کے دربار میں اس کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ ملا محمد طاہر نام، نور الدین لقب اور ظہوری تخلص تھا۔ تاریخ بیجاپور کے مولف نے لکھا ہے کہ ظہوری کو فن شاعری میں ملا وحشی یزدی سے تلمذ حاصل ہے۔ ظہوری کی ابتدائی زندگی ...

تنگ دستی اور عسرت میں بسر ہوئی تھی۔ اس کی گذر اوقات کا سارا دارومدار کتابت پر تھا۔ شاید اسی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی سے تنگ آکر اس نے ۹۸۸ھ میں اپنے وطن کو خیرباد کہا اور دکن کا رخ کیا۔ پہلے احمد نگر میں ملک قمی کے پاس رہا اور جب ملک قمی بیجاپور چلا گیا تو چند دنوں کے بعد ظہوری بھی بیجاپور آگیا۔ وہاں کچھ دن حکیم مرزا محمد یوسف کے مکان پر فروکش ہوا۔ پھر حکیم صاحب نے خود اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ ظہوری کو ابراہیم ثانی کے دربار میں باریاب کرایا جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ابراہیم بڑا سخن فہم اور علم دوست تھا۔ وہ ظہوری کی آمد سے بہت خوش ہوا۔ بیجاپور آنے کے بعد ظہوری نے برہان نظام شاہ بحری کے نام پر ساقی نامہ کے علاوہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے نام پر خوان خلیل، گلزار ابراہیم اور کتاب نورس کا دیباچہ لکھا جو بیحد مقبول ہوا۔

ملک قمی: ابراہیم کے عہد کا دوسرا زبردست فارسی شاعر ملک قمی تھا۔ وہ پہلے احمد نگر کے دربار سے متعلق تھا، بعد میں بیجاپور آگیا۔ ملک قمی اور ملا ظہوری میں بڑی گہری دوستی تھی اور دونوں اکثر ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ملک قمی نے ظہوری کی لیاقت دیکھ کر اس سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کر دی تھی۔[1] فیضی ۹۹۹ھ میں دکن میں آیا تھا۔ اس نے دکن کے ان دونوں شاعروں کی بڑی تعریف کی ہے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ظہوری اور قمی نظیری نیشاپوری کو مانتے تھے۔

ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری اور دیگر مصنفین نے ان کے علاوہ ملا باقر، عبدالقادر نوری، عبدالرشید الپنگی اور مولانا حیدر ذہنی وغیرہ کا تعلق ابراہیم ثانی کے دربار سے بتلایا ہے لیکن افسوس ہے کہ کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی تشفی بخش مواد نہیں مل سکا۔ سروری صاحب نے ابراہیم کی ایک بہن خدیجہ سلطان کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ بڑی علم دوست تھی اور اپنے زمانے کے اکثر علما اور شعرا کی سرپرستی کرتی تھی جس کی وجہ سے بیجاپور میں علم و ادب کی ترقی کو ایک زبردست محرک نصیب ہو گیا تھا۔[2] خدیجہ کے بارے میں قطعی طور سے یہ بتلانا مشکل ہے کہ وہ ابراہیم کی بہن تھی بھی یا نہیں اور یہ کہ وہ خود بھی شاعرہ یا ادیبہ تھی یا اس کا شوق صرف سرپرستی کی حد تک محدود تھا۔

اب ابراہیم ثانی کے عہد کے دو زبردست مورخوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے نہ صرف ابراہیم کے نام کو لازوال بنا دیا بلکہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان اور خصوصاً دکن کی تاریخ کو تاریکی میں گھرے رہنے سے بچا لیا۔ یہ مورخ ہیں فرشتہ اور رفیع الدین شیرازی۔

فرشتہ: تاریخ کا مشکل ہی سے کوئی ایسا طالب علم ہو گا جس نے فرشتہ کا نام نہ سنا ہو۔ حکیم محمد قاسم فرشتہ ابن غلام علی ہندوشاہ استرآبادی ۱۵۵۲ء میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں وہ اپنے باپ کے ساتھ دکن آگیا تھا۔ اس کے باپ کو احمد نگر کے دربار میں ملازمت مل گئی تھی لیکن اس کا بہت جلد انتقال ہو گیا۔ فرشتہ کچھ مدت تک احمد نگر میں رہا لیکن جب یہاں کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی تو وہ بیجاپور چلا آیا۔ یہاں دلاور خاں کی مدد سے بہت جلد اس کی ابراہیم کے دربار میں رسائی ہو گئی اور پھر وہ اپنی ساری عمر اسی دربار سے وابستہ رہا۔ فرشتہ کی تاریخ وفات کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ اس نے ۱۶۲۳ء میں وفات پائی ہو گی۔ فرشتہ کی کتاب گلشن ابراہیمی عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کا زبردست ماخذ ہے اور چند خامیوں کے باوجود فرشتہ کے ہم عصروں اور موجودہ دور کے ہر مورخ نے اس سے مدد لی ہے۔ گلشن ابراہیمی پہلی مرتبہ ۱۸۳۲ء میں طبع ہوئی۔ اب تک اس کے کئی انگریزی ترجمے ہو چکے ہیں جنھا

---

[1] عبدالجبار خاں صوفی ملکاپوری: محبوب ذی المنن تذکرۂ شعرائے دکن (جلد دوم)
[2] عبدالقادر سروری: اردو دکنی ادبی تاریخ۔ ۱۹۵۸ء۔ حیدرآباد دکن۔

یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے بھی اس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا جا چکا ہے۔

رفیع الدین شیرازی: رفیع الدین شیرازی ۱۵۴۲ء میں شیراز میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایران سے بہ حیثیت تاجر ۹۶۱ھ میں ہندوستان آیا اور علی عادل شاہ اول کے دربار میں ملازمت اختیار کر لی علی کے عہد میں اس نے خوان سالاری کے فرائض انجام دیے۔ ابراہیم ثانی کے عہد میں اس نے خوب ترقی کی اور ۵۸۰ھ میں وہ بہ حیثیت سفیر نظام شاہی دربار گیا۔ وہاں سے واپس آنے کے بعد ابراہیم نے اسے دار الضرب کا تھا۔ غرض آخر عمر تک وہ اسی طرح کے اعلیٰ عہدوں رفیع شیرازی نے ۱۰۰۷ھ میں اپنی تاریخ تذکرۃ الملوک شروع کی اور ۱۰۲۰ھ میں اسے اختتام کو پہنچایا۔ یہ زیادہ تر سلاطین عادل شاہی کی تاریخ ہے۔ ان کے سلاطین کا تذکرہ صرف برائے نام ہے۔ ابراہیم ثانی کے واقعات اس میں بڑی تفصیل سے ملتے ہیں۔ الملوک ابھی طبع نہیں ہوئی ہے۔



ادب اور ادیب

موجودہ چین میں

(بسلسلہ صفحہ ۴۴)

اُس نے شکایت کی کہ دائیں بازو کے بورژواؤں نے سو پھولوں کی پالیسی کو مسخ کیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت بھی سمجھی گئی کہ "ہمیں یقین ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب سائنس میں مختلف مکاتیب خیال اور نظریات کے درمیان آزادانہ بحث کے ذریعے آرٹ میں مختلف ہیئتوں اور مکتبوں میں کھلے مقابلے کے ذریعے ہمارا سائنسی اور ثقافتی کام ایک خوش حال دور میں داخل ہوگا اور عظیم کامیابی حاصل کرے گا۔"

اس بات کو چار سال گزر گئے ہیں لیکن دنیا نہیں جانتی کہ آرٹ کی مختلف ہیئتوں اور مکتبوں کو "کھلے مقابلے" کی اجازت دی گئی یا نہیں۔ البتہ یہ صاف ظاہر ہے کہ پارٹی کے جبر نے چینی آرٹ کو پارٹی پروپگنڈا بنا ڈالا ہے اور موجودہ چین میں بااصول ادیب ایک جنس نایاب ہو کر رہ گئے ہیں۔ ادیبوں پر بدستور جبر کیا جا رہا ہے جیسا کہ سائنسوں کی چینی اکاڈمی کے صدر کنو موجو کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو این لائی کے ۱۸ اپریل ۵۹ء والے بیان کے دو ہی مہینے بعد ۲۱ جون ۱۹۵۹ء کو اُس نے اعلان کیا "یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم ادیبوں کی کسی قسم کی آزادی کے پردے ایسی سیاسی سرگرمی یا تنظیم کی اجازت نہیں دے سکتے جو کمیونزم کے ہو۔ اس کے خلاف کارروائی کرتے وقت ہم صرف نکتہ چینی سے مطمئن نہ

ظاہر ہے کہ صرف نکتہ چینی سے مطمئن نہ ہونے کا مطلب نظمیت کار رخانوں اور کمیونوں میں جا پہنچنا اور اس سے وابستہ سختیاں ہیں۔

مژدۂ کامرانی

قاصد بریالوی

تاراج اہنسا کا چمن ہونے نہ دیں گے
برباد کبھی اپنا وطن ہونے نہ دیں گے

ہم تیری بلندی کو، ہمالہ تری سوگند!
آماجگہِ زاغ و زغن ہونے نہ دیں گے

اے بحرِ ہوس! تیرے تلاطم کبھی ہم
ناپاک رہِ گنگ و جمن ہونے نہ دیں گے

کشمیر کے گلشن پہ کسی طرح بھی ہم لوگ
اے برق! تجھے شعلہ فگن ہونے نہ دیں گے

پھونکیں گے زن و مرد کے قالب میں نئی روح
کم جذبۂ ایثارِ وطن ہونے نہ (د)یں گے

کانٹوں میں بھی پھولوں کی سما جائے گی نگہت
اک شے کو بھی ہم ننگِ چمن ہونے نہ دیں گے

دھرتی جو یہ ٹیگور کی، گوتم کی ہے، اس کو
ہم کارگہِ دار و رسن ہونے نہ دیں گے

دشمن کے مقابل کبھی میدانِ وغا میں
بھولے سے بھی خم فرقِ وطن ہونے نہ دیں گے

دنیا میں کھری سب سے ہے ٹکسال ہماری
اک سکۂ کاسد کا چلن ہونے نہ دیں گے

اے پرچمِ جمہور! تجھے جان بھی دے کر
ہم اپنے شہیدوں کا کفن ہونے نہ دیں گے

تعمیر نشیمن نہ ہو چاہے ابھی قاصد
گلشن کو کبھی نذرِ زغن ہونے نہ دیں گے

آزمائش ہے

اقبال ماہر

قلم کا امتحاں، تیغ و سناں کی آزمائش ہے
لبِ گفتار و کردارِ جواں کی آزمائش ہے

متاعِ زندگی و نقدِ جاں کی آزمائش ہے
سرِ دار و رسن ہر نوجواں کی آزمائش ہے

جو اہلِ کارواں میں برق رفتاری کرے پیدا
اُس آوازِ رحیلِ کارواں کی آزمائش ہے

حُدی خوان و امیرِ کارواں کے ساتھ اے ہمدم
سفر میں ہر شریکِ کارواں کی آزمائش ہے

یہ نغماتِ طرب کب تک، حکایاتِ جنوں کب تک
رجز خواں مطربِ آتش بیاں کی آزمائش ہے

قدم بڑھنے نہ پائیں اس طرف صیاد و گلچیں کے
گلستاں کی حفاظت، باغباں کی آزمائش ہے

ہمازی جنگ بھی اک معرکہ ہے حق و باطل کا
نہیں اک ملک کی، سارے جہاں کی آزمائش ہے

یہی تیغ زباں ما آہما زبانِ تیغ بن جائے
سُنا ہے شاعرِ عصرِ رواں کی آزمائش ہے

اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

اعلیٰ تکنیکی تعلیم کے لیے وظیفے ـــــ انسانی طاقت سے متعلق علاقائی سروے ـــــ اسکول آف اسپورٹس ـــــ جوانوں کے لیے ایک لاکھ سے زیادہ کمبل ـــــ چھوٹی بچت میں روپیہ لگانے والوں کو انکم ٹیکس میں چھوٹ

ریاستی حکومت نے اتر پردیش کے طلبا کو جو دوسری ریاستوں کے اعلیٰ تکنیکی اداروں میں زیر تعلیم ہیں ۵۰ ـــ ۵۰ روپیہ ماہانہ کے دس اور ۱۲۰۰ ـــ ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ کے آٹھ وظیفے دینے کی منظوری دی ہے۔

یہ وظیفے خصوصی مضامین جیسے الیکٹرونکس ـ ہوائی جہاز انجینیرنگ لیدر ٹیکنالوجی، ٹیکسٹائل کیمسٹری اور ٹیکنالوجی اور ریڈیو فزکس میں پوسٹ گریجوٹ تعلیم کے لئے دیے جائیں گے ـ وظیفہ کی میعاد ایک سال سے لے کر پانچ سال تک ہوگی۔

مختلف اداروں کو الاٹ کئے گئے وظیفوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

۵۰ ـــ ۵۰ روپیہ ماہانہ کے وظیفے ـ سر ـ جے ـ جے کالج آف آرکیٹکچر ـ بمبئی ـ ایک (پانچ سال کے لئے) انڈین اسکول آف ٹکنالوجی مائنز دھنباد ـ ۲ ـ (چار سال کے لئے) انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی ـ کھڑگ پور ـ ۲ ـ (چار سال کے لئے) اور آئی آئی ـ سائنس بنگلور ـ ۳ ـ (تین سال کے لئے)۔

علاوہ ازیں ۵۰ ـــ ۵۰ روپیہ کے دو وظیفے جے ـ کے انسٹی ٹیوٹ آف اپلائڈ فزکس الہ آباد میں زیر تعلیم طلبا کو دئے جائیں گے۔ ان میں سے ایک وظیفہ تین سال اور دوسرا آخری سال کے لئے دیا جائے گا۔

۱۲۰۰ ـــ ۱۲۰۰ روپیہ سالانہ کے وظیفے ـ برلا انجینرنگ کالج ـ پلانی ـ ایک (الیکٹرونکس کے لئے) ایم ـ آئی ـ ٹی ـ مدراس ـ ۲ ـ (ہوائی جہاز انجینیرنگ کے لئے) اے ـ سی ـ کالج آف ٹیکنالوجی مدراس ـ ایک ـ اور کالج آف لیدر ٹیکنالوجی کلکتہ ـ ایک ـ (لیدر ٹیکنالوجی کے لئے) وی ـ جے ـ ٹی ـ آئی ـ بمبئی ـ ایک (ٹیکسٹائل کیمسٹری کے لئے) ڈی ـ سی ـ ٹی ـ بمبئی ـ ایک (ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کے لئے) اور ساہا انسٹی ٹیوٹ آف نیوکلیر فزکس کلکتہ ـ ایک ـ (ریڈیو فزکس) اس سلسلہ میں مزید تفصیلات ڈائرکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشن اتر پردیش کانپور سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

انسانی طاقت کے علاقائی سروے کی اسکیم کے تحت ضلع میرٹھ میں گزشتہ جولائی میں شروع کئے گئے رہبر منصوبہ کی کامیاب تکمیل کے لئے حکومت اتر پردیش اور انسانی طاقت کی ریسرچ سے متعلق ہندوستانی ادارہ کے درمیان اشتراک عمل کے لئے اقدامات پر لکھنؤ میں ایک حالیہ دو روزہ جلسہ میں غور و خوض ہوا ـ یہ جلسہ ریاستی حکومت کے لیبر سکریٹری شری بی ـ بی ـ جوشی کی صدارت میں ہوا تھا۔

علاقائی سروے کی اسکیم کا مقصد انسانی طاقت کی موجودہ صورت حال اور اس کو کام میں لانے نیز ۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۱ء تک اس ضمن میں جو ترقی ہوئی ہے اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد ان مخصوص مسائل پر بھی روشنی ڈالنا ہے جو ۱۹۶۱ء تک سامنے آئے ہیں نیز یہ بھی پتہ لگانا ہے کہ یہ مسائل ہمارے ترقیاتی منصوبوں کے ذریعہ کس حد تک حل کئے جارہے ہیں۔

اس اسکیم کے تحت ضلع میرٹھ میں جو رہبر منصوبہ شروع کیا گیا ہے وہ انسانی طاقت کی ریسرچ سے متعلق ہندوستانی ادارہ، روزگار اور تربیت کے ڈائرکٹریٹ جنرل، مرکزی وزارت تعلیم اور حکومت اتر پردیش کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔

اس رہبر منصوبہ کی ایک جماعت ۔ بیروزگاری ۔ تعلیم ۔ پیدائش اور موت کے اعداد و شمار اور عورتوں اور بچوں کے مسائل کا مطالعہ کرے گی ۔ سروے مکمل ہونے کے بعد یہ جماعت ایک سیمینار میں ان مسائل کے بارے میں مضامین پڑھے گی جو قطعی رپورٹ تیار کرنے کے لئے منعقد کیا جائے گا ۔

یہ رہبر منصوبہ انسانی طاقت کے علاقائی سروے کے پہلے دور کا پہلا مرحلہ ہوگا ۔ پہلے دور کے دوسرے مرحلہ میں ملک کے ۴۰ منتخب ضلعوں میں سروے کی توسیع شامل ہے ۔ پہلے دور کے تیسرے اور آخری مرحلہ میں کل ہند سطح پر سروے مکمل کیا جائے گا اور انسانی طاقت کے علاقائی سروے کے پہلے دور کی کل ہند رپورٹ کو قطعی کیا جائے گا ۔ پہلا دور دو سال میں پورا ہوگا ۔

ادارہ کے ڈائرکٹر شری آر ۔ اے گوپال سوامی، جوائنٹ ڈائرکٹر شری کے ۔ این ۔ بھوٹانی اور ریاستی حکومت کے متعدد اعلیٰ افسروں نے اس جلسہ میں شرکت کی ۔

ہیں ۔ اس ورزش کا مقصد ان کے اندر چستی ۔ مستعدی اور قوت برداشت کو فروغ دینا ہے ۔

شام کو اسکول کے ڈائرکٹر کور دگ وجے سنگھ (بابو) سابق اولمپک ہاکی کیپٹن ان کو دو گھنٹہ تک ہاکی کی عملی اور نظریاتی ٹریننگ دیتے ہیں اور تربیت پانے والے اپنا بقیہ وقت اپنی پڑھائی پر صرف کرتے ہیں ۔

تمام تربیت پانے والوں کو رہنے ۔ کھانے ۔ علاج اور ضروری ساز و سامان کی مفت سہولتیں دی جاتی ہیں ۔ انھیں ٹیوشن فیس بھی نہیں دینا پڑتی ۔ ان کی تفریح طبع کے لئے فاضل اوقات میں انڈور کھیلوں کا بھی بندوبست کیا گیا ہے ۔

ایک ہی مہینہ کی ٹریننگ میں ان کھلاڑیوں نے ہاکی کی مختلف تکنیک جیسے پش شاٹ ۔ ہٹ اور اسکوپ وغیرہ سیکھ لی ہے ۔ امید ہے کہ دو سال کی ٹریننگ کے بعد ان کے کھیل میں پختگی آجائے گی اور وہ مشاق کھلاڑی بن جائیں گے اور اتر پردیش میں ہاکی کی ایک مضبوط ٹیم بن سکے گی ۔

یو ۔ پی اسپورٹس کونسل کے زیر انتظام اسپورٹس اسکول کے قیام سے اتر پردیش میں کھیل کود کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے ۔ یہ اسکول پنجاب اسکول آف اسپورٹس کے طرز پر چلایا جا رہا ہے ۔ اس کا مقصد ریاست کے ہونہار اور ابھرتے ہوئے کھلاڑیوں کو مختلف کھیلوں کی بھرپور جدید اور سائنس ٹریننگ دینا ہے ۔

اسکول کے پہلے دو سالہ سیشن کا آغاز ہاکی کی ٹریننگ سے ۲۲ جولائی کو اسپورٹس اسٹیڈیم میں کیا گیا ۔ اس ٹریننگ میں ۱۴ سے ۱۷ سال کی عمر کے ۱۸ افراد شریک ہیں ۔ ان میں سے چھ نینی تال ۔ بارہ بنکی ۔ علیگڈھ رام پور ۔ مراد آباد ۔ وارانسی اور کانپور کا ایک ایک اور لکھنؤ اور میرٹھ کے دو دو افراد ہیں ۔

یہ کھلاڑی شہر کے مختلف تعلیمی اداروں میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ہی ہاکی کی ٹریننگ بھی پا رہے ہیں ۔ اسپورٹس اسکول میں ان کا روزمرہ پروگرام صبح ساڑھے پانچ بجے شروع ہوتا ہے جبکہ وہ اسٹیڈیم کی گراؤنڈ میں آدھ گھنٹے کی جسمانی ورزش کے لئے جمع ہوتے

فوجیوں کے لئے ۰۰ ۱۲۳۶ کمبل جلد از جلد سپلائی کرنے کے پیش نظر موجودہ مالیاتی سال کے دوران بُنائی کے چار نئے مرکز کوتوالی (بجنور) رائے بریلی ۔ پھولپور (الہ آباد) اور کسیا (دیوریا) میں کھولے گئے ہیں ۔

ان مرکزوں کو اون سپلائی کرنے کے لئے کتائی کے ۲۰ نئے مرکز قائم کئے گئے ہیں جن سے ریاست میں کتائی مرکزوں کی کل تعداد ۶۳ تک پہنچ گئی ہے ۔

کمبل تیار کرنے کے مرکزوں کو بلا تاخیر اور پابندی کے ساتھ اون سپلائی کرنے کے لئے ریاستی کھادی اور دیہی صنعت بورڈ نے گاندھی آشرم کے زیر انتظام ایک مرکزی ایجنسی قائم کی ہے ۔

مرزاپور ۔ غازی پور ۔ مظفر نگر ۔ گورکھپور اور گوپی گنج (وارانسی) کے بنائی مرکزوں نے موجودہ منصوبہ کے پہلے دو برسوں کے دوران ایک لاکھ سے زیادہ کمبل تیار کئے ہیں جن میں ۰۰ ۶۲۵ ۶۳-۱۹۶۲ء میں تیار کئے گئے اور جوانوں کو سپلائی کئے گئے ۔

کمبل تیار کرنے کی اسکیم کے تحت تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک تقریباً ۹۰۰ اشخاص کو کام پر لگایا جائے گا۔

چھوٹی بچت تمسکات میں روپیہ لگانے والوں کو انکم ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

قومی دفاع سرٹیفکیٹوں اور کیومولیٹو ٹائم ڈپازٹ اکاؤنٹس پر دیا جانے والا سالانہ سود۔ ڈیفنس ڈپازٹ سرٹیفکیٹوں اور پوسٹ آفس سیونگس بینک محفوظ اکاؤنٹس پر دیا جانے والا سالانہ سود۔ انیوٹی سرٹیفکیٹوں پر ادا کی جانے والی ماہانہ رقم اور انعامی بانڈوں پر ملنے والا پریمیم اور انعام انکم ٹیکس اور سپر ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

ایسے اشخاص کو جن کی ایک بیوی اور دو بچے ہوں گے اور جو قومی دفاع سرٹیفکیٹوں میں ۵۰۰۰ سے لے کر ۶۰۰۰ روپیہ تک لگائیں گے ان کو کل آمدنی پر ۲۲ر۵ فیصدی سے لے کر ۲۷ر۸ فیصدی سالانہ تک چھوٹ دی جائے گی۔ ڈیفنس ڈپازٹ سرٹیفکیٹوں میں روپیہ لگانے والوں کو ۹۵ر۴ فیصدی اور ۳۱ر۷ فیصدی سالانہ کے درمیان انکم ٹیکس کی ادائیگی سے چھوٹ دی جائے گی۔ پوسٹ آفس سیونگس بینک اکاؤنٹس پر ۳۰ر۴ فیصدی اور ۴۵ر۱۱ فیصدی سالانہ کے درمیان چھوٹ دی جائے گی۔

جس طرح تسلیم شدہ پراویڈنٹ فنڈ میں روپیہ لگانے یا لائف انشورنس پریمیم کی ادائیگی پر چھوٹ ملتی ہے اسی طرح ۱۰ سالہ اور ۱۵ سالہ کیومولیٹو ٹائم ڈپازٹ اکاؤنٹس پر بھی اس شرط کے ساتھ چھوٹ دی جائے گی کہ ان تمام تمسکات میں مجموعی طور پر جو روپیہ لگایا گیا ہے وہ کل آمدنی کے ایک چوتھائی تک یا ۱۰۰۰۰ روپیہ تک (جو بھی کم ہو)۔

پراویڈنٹ فنڈ کے مقابلہ میں کیومولیٹو ٹائم ڈپازٹ اکاؤنٹ پر زیادہ سود ملتا ہے اور یہ بھی انکم ٹیکس سپر ٹیکس اور دولت ٹیکس سے مستثنیٰ ہے۔ علاوہ ازیں انکم ٹیکس میں چھوٹ کی وجہ سے یہ اسکیم آزاد پیشے والوں مثلاً ڈاکٹروں وکیلوں اور تاجروں کے لئے باعث کشش ہے جن کو پراویڈنٹ فنڈ کی سہولتیں حاصل ہیں۔

REGD. No.

آزادی خطرے میں ہے۔ اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے — جواہر لال نہرو

آپ بھی ملک کے محافظ ہیں

محاذ پر ہر ایک جوان کو کیل کانٹے سے لیس کرنے کے لئے ملک کے اندر پچاس سے ایک سو افراد تک کو کام کرنا پڑتا ہے۔ بڑھتی ہوئی دفاعی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے جوانوں کو ساز و سامان اور رسد پہنچتی ہی رہنی چاہیئے — آپ کے کام کی بڑی اہمیت ہے۔ جی جان سے محنت کریں۔ کوششوں میں کمی و کوتاہی نہ آنے دیں۔ قومی اہلیت و کارکردگی کو بڑھائیں۔

آپ کا نظم و ضبط قوم کی قوت ہے



آزادی خطرے میں ہے۔ اپنی پوری طاقت سے اس کی حفاظت کیجئے — جواہر لال نہرو

آپ کی کفایت
قوم کی کفالت

ملک کی آزادی اور سالمیت عوام کی چوکسی اور قربانیوں کی بدولت ہی ممکن ہے۔ فضول خرچی بند کریں۔ قومی وسائل کو سوچ سمجھ کر صرف کریں۔ تبھی آپ ملک کی تیز رفتار ترقی کے لئے زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنے میں معاون ثابت ہو سکیں گے۔

آپ کی بچتوں سے
قوم کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں



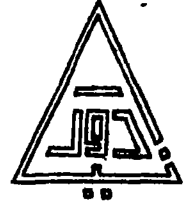
نیا دور

15(9)

اگرہائیز ۱۸۸۵

دسمبر ۱۹۶۳ء

۵۰



جلد ۱۸ | نمبر ۹

اگرہائن ۱۸۸۵

دسمبر ۱۹۶۳ء

چندہ سالانہ : پانچ روپے

فی پرچہ : پچاس نئے پیسے

ایڈیٹر

صباح الدین عمر

پبلشر

آمیہ بھوشن ملک

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

جے۔ ڈبلیو۔ ہارج

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اسٹیشنری۔ یو، پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

اپنی بات

نیا دور کی اس اشاعت کی طباعت شروع ہو گئی تھی کہ دو نہایت اندوہناک خبریں موصول ہوئیں۔ ایک خبر تھی صدر ریاستہائے متحدہ امریکہ جان کینیڈی کے قتل کی اور دوسری خبر تھی ہوائی جہاز کے ایک حادثے سے پانچ سینیئر اور تجربے کار ہندوستانی فوجی افسروں کی موت کی۔ مرنا سب کو ہے لیکن جن حالات میں یہ موتیں ہوئی ہیں وہ نہایت افسوس ناک اور رنج دہ ہیں۔ پریسیڈنٹ کینیڈی، بین الاقوامی اور ملکی معاملات میں بڑے روشن خیال اور وسیع النظر واقع ہوئے تھے۔ ہندوستان کے وہ بڑے دوست تھے اور بین الاقوامی امن کے بہت بڑے حامی تھے۔ ان کی صدارت کے زمانے میں کئی واقعات ایسے پیش آئے کہ جن سے عالم گیر جنگ کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا مگر انھوں نے ان معاملات کو خوش اسلوبی سے سلجھا لیا۔ روس اور امریکہ میں نیوکلیئر ہتھیاروں کے تجربات کی بندش پر سمجھوتہ ان کی امن پسندی کا ایک ثبوت ہے۔ ملکی معاملات میں وہ امریکہ کے سیاہ فام باشندوں کے حقوق اور ان کے ساتھ مساوات برتنے کے بہت بڑے علم بردار تھے اور کئی موقعوں پر انھوں نے مخالفت کے باوجود عملی طور سے ان سیاہ فام باشندوں کا ساتھ دے کر یہ دکھا دیا تھا کہ وہ رنگ اور نسل کے قائل نہیں۔ سیاہ فام باشندوں کے ساتھ رواداری برتنا ان کی زندگی کا ایک مشن ہو گیا تھا اور اسی مشن کی تکمیل کے لیے امریکہ کی ایک ریاست کا دورہ کر رہے تھے کہ ایک قاتل کی گولی کا نشانہ ہو گئے۔ اسی طرح تقریباً ۱۰۰ برس قبل ۱۸۶۵ء میں امریکہ کے ایک دوسرے صدر ابراہم لنکن بھی اسی سیاہ فام دوستی کے باعث ایک قاتل کی گولی کا نشانہ ہوئے تھے۔ آج سو برس کے بعد پریسیڈنٹ کینیڈی کے قتل نے دنیا کو ابراہم لنکن کے قتل کی پھر یاد دلا دی ہے۔ ان دونوں کے علاوہ امریکہ کے دو اور پریسیڈنٹ بھی قاتلانہ حملوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ پریسیڈنٹ جیمس گارفیلڈ پر واشنگٹن میں ۲ جولائی ۱۸۸۱ء کو حملہ کیا گیا اور اسی سال ۱۹ ستمبر کو وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسے۔ اس کے بعد پریسیڈنٹ ولیم میک کنلے پر بفیلو (نیو یارک) میں ۶ ستمبر ۱۹۰۱ء کو حملہ کیا گیا اور اسی سال ۱۴ ستمبر کو ان کی موت واقع ہوئی۔ پریسیڈنٹ فرینکلن روزویلٹ پر بھی ۱۵ فروری ۱۹۳۳ء کو حملہ کیا گیا اور پریسیڈنٹ ہیری ٹرومن پر یکم نومبر ۱۹۵۰ء کو۔ مگر یہ دونوں بچ گئے۔ ایک اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ گزشتہ تقریباً ۱۲۵ برس سے امریکہ کی تاریخ یہ دہرا رہی ہے کہ ہر بیس برس کے بعد صفر نمبر کے سال میں امریکہ کا جو پریسیڈنٹ منتخب ہوا وہ کسی نہ کسی وجہ سے اپنی صدارت کے زمانے ہی میں مر گیا۔ اس فہرست میں حسب ذیل پریسیڈنٹ شامل ہیں۔ ۱. ولیم ہنری ہیریسن (صدر منتخب ۱۸۴۰ء) ۲. ابراہم لنکن (صدر منتخب ۱۸۶۰ء) ۳. جیمس اے گارفیلڈ (صدر منتخب ۱۸۸۰ء) ۴. ولیم میک کنلے (صدر منتخب ۱۹۰۰ء) ۵. وارن جی ہارڈنگ (صدر منتخب ۱۹۲۰ء) ۶. فرینکلن ڈی روزویلٹ (صدر منتخب ۱۹۴۰ء) ۷. جان ایف کینیڈی (صدر منتخب ۱۹۶۰ء)۔ بہرحال یہ اتفاقات جیسے بھی ہوں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ دور میں جب کہ دنیا ایک بڑے نازک دور سے گزر رہی ہے اور ایک عالم گیر جنگ کے خطرات دور نہیں ہوئے ہیں، پریسیڈنٹ کینیڈی کی موت دنیا کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ چھیالیس برس ہی کی عمر تھی انھوں نے دانشمندی، پختہ کاری، امن دوستی اور رواداری کے جو نمونے پیش کیے ان کی وجہ سے دنیا کو ان کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ ہو گئی تھیں اور یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ ان کی روادارانہ پالیسی کی وجہ سے دنیا کے گروہوں میں جو کشیدگی پیدا ہو گئی ہے وہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی اور جنگ کے بادل مطلع عالم سے چھٹ جائیں گے مگر ہائے اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ پریسیڈنٹ کینیڈی دنیا کی سیاسیات میں جو قابل تعریف کردار ادا کر رہے تھے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کے ہر ملک کو ان کے مرنے کا صدمہ ہوا۔ اور تو اور روس میں بھی ان کا غم منایا گیا اور وزیر اعظم روس، مسٹر خروشچیف نے ان کی جوانا مرگی کا ماتم کیا۔ البتہ اس موقع پر اگر کسی ملک نے اپنی شقاوت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے تو وہ چین ہے جس نے پریسیڈنٹ کینیڈی کی موت پر بھی ان کا مضحکہ اڑایا ہے۔

● کشمیر میں پونچھ کے قریب ہوائی جہاز کے حادثے میں جن فوجی افسروں کی جانیں گئیں ان کے نام یہ ہیں: لفٹننٹ جنرل دولت سنگھ، جنرل آفیسر کمانڈنگ ان چیف، ویسٹرن کمانڈ۔ لفٹننٹ جنرل بکرم سنگھ، کور کمانڈر جموں کشمیر۔ ایئر وائس مارشل ای ڈبلیو پنٹو، ایئر آفیسر کمانڈنگ ان چیف ویسٹرن ایئر کمانڈ۔ میجر جنرل این کے ڈی ناناوتی، ڈویژنل کمانڈر جموں۔ بریگیڈیئر ایس آر اوبرائے، بریگیڈیئر کمانڈر۔ لفٹننٹ جنرل دولت سنگھ (۵۲ سال) عنقریب فوجی اسٹاف کے ڈپٹی چیرمین بنائے جانے والے تھے۔ سینڈہرسٹ ملٹری کالج میں تربیت حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں وہ ہندوستانی فوج میں شامل ہوئے۔ مختلف عہدوں پر کام کرنے کے بعد مئی ۱۹۶۱ء میں وہ اپنے موجودہ عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ لفٹننٹ جنرل بکرم سنگھ (۵۲ سال) کو ۱۹۳۲ء میں فوجی کمیشن ملا۔ سرحد میں متعین رہنے کے بعد دوسری جنگ عظیم میں لیبیا، افریقہ، عراق اور ایران میں انھوں نے مختلف خدمات انجام دیے۔ ایئر وائس مارشل پنٹو کو ۱۹۳۳ء میں ہندوستانی فضائی بیڑے میں کمیشن ملا اور ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۳ء تک وہ ایک برطانوی ہوائی اسکواڈرن کے ساتھ انگلستان میں مختلف خدمتیں انجام دیتے رہے۔ بعد کو کشمیر میں تعینات کر دیے گئے۔ اس کے بعد دوسرے عہدوں پر کام کیا اور ۱۹۶۰ء میں موجودہ عہدے پر فائز ہوئے۔ میجر جنرل ناناوتی (۴۹ سال) نے دوسری جنگ عظیم میں ایران، عراق، فلسطین اور اٹلی میں کام کیا۔ مئی ۱۹۶۳ء میں انھیں جموں و کشمیر میں ایک انفنٹری ڈویژن کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ بریگیڈیئر اوبرائے (۴۶ سال) نے دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر کام کیا اور مختلف عہدوں پر تعیناتی کے بعد ستمبر ۱۹۶۱ء میں وہ بریگیڈیئر بنائے گئے۔ اس حادثے میں فلائٹ لفٹننٹ سودھی بھی ہلاک ہو گئے جو ہوائی جہاز کے طیارچی تھے۔ لداخ میں چینی حملے کے دوران نمایاں کارگزاری پر انھیں ایک تمغہ بھی دیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ مادر وطن کے سپوت تھے جنھوں نے مادر وطن ہی کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جانیں دیں اور سارا ہندوستان آج اپنے ان آزمودہ کار فوجی افسروں کی موت پر اشک بار ہے۔

● پہلی دسمبر ۱۹۶۳ء کو ہندوستان کی سولھویں اور سب سے چھوٹی ریاست "ناگالینڈ" کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ وزیر اعظم نہرو نے سب سے پہلے اگست ۱۹۶۰ء میں لوک سبھا کے اندر یہ اعلان کیا تھا کہ حکومت ہند، ہندوستان میں ایک نئی ریاست "ناگالینڈ" کا قیام عمل میں لانے والی ہے۔ لوک سبھا ہی نے اگست ۱۹۶۲ء میں ناگالینڈ ریاست کا بل منظور کیا اور صدر جمہوریہ نے اعلان کیا کہ یکم دسمبر ۱۹۶۳ء کو یہ نئی ریاست وجود میں آ جائے گی۔ ناگالینڈ، ہندوستان کی مشرقی سرحد پر برما سے متصل واقع ہے۔ اس کی آبادی ۳ لاکھ ۷۰ ہزار اور رقبہ ۶۳۶۶ مربع میل ہے۔ ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں اس ریاست کی فی مربع میل آبادی سب سے کم یعنی صرف ۶۲۱۵ فی مربع میل ہے۔ چند سو مربع میل میدانوں کے علاوہ سارا علاقہ پہاڑی ہے اور یہ پہاڑیاں سطح سمندر سے ...۲ فٹ سے ....۱ فٹ تک اونچی ہیں۔ تقریباً ۹۰ فی صدی آبادی کا پیشہ زراعت ہے۔ چاول اور ترکاریاں کافی ہوتی ہیں۔ میدانوں میں گنا اور روئی بھی بوئی جاتی ہے۔ ناگالینڈ میں جنگل بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور یہ ریاست کی بہت بڑی دولت ہیں۔ ناگالینڈ میں تقریباً ۱۶ قبیلے آباد ہیں۔ ہر قبیلے کے رسم و رواج مختلف ہیں مگر بہ حیثیت مجموعی ناگا لوگ بڑے متواضع، محنتی، سادگی پسند اور بہادر ہوتے ہیں۔ ناچ گانے کا بڑا شوق ہے اور آئے دن ایسے تہوار ہوتے رہتے ہیں جن میں سبھی ناگا حصہ لیتے ہیں اور ناچ گا کر اپنی خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ عورتوں کو کافی آزادی حاصل ہے۔ ناگا لوگوں میں اجتماعی طور سے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا بڑا جذبہ پایا جاتا ہے اور جب کوئی کام ہوتا ہے تو بچے، عورتیں، بوڑھے جوان سب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے ناگالینڈ میں ایک نئی زندگی کی لہر پیدا ہو گئی ہے اور امید ہے کہ ایک نئی ریاست کے قیام سے وہاں کی تعمیری سرگرمیوں میں مزید تیز رفتاری پیدا ہو جائے گی۔

—— ایڈیٹر

اور اک دن انساں جیتے گا

آنند نرائن مُلّا

(۱)

کالی اندھیاری راتوں میں اک دیپ جلا اور جل کے بجھا
کچھ دیر کو قصرِ ظلمت پر ۔ اک نور کا پرچم لہرایا
کچھ دیر کو چیر کے بادل کی ۔ ہر تہہ اک تارا مسکایا
کچھ دیر کو اندھی راہوں میں ۔ ننھا جگنو مشعل لایا
کچھ دیر بدی سے لڑنے کو ۔ نیکی کا سپاہی پھر آیا
روشن پرچم آخر تک اُڑا
تارا بجھتے دم تک چمکا
ننھا جگنو گر گر کے اٹھا
نیکی کا سپاہی خوب لڑا
لیکن اس دکھ کی بستی میں
اس اندھیاروں کی نگری میں
آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی
تاریخِ جہاں نے جب اپنا افسانۂ پیشیں دہرایا
پرچم پہ اندھیرے ٹوٹ پڑے
تارے پہ گرے بادل کے پرے
ننھا جگنو کالی راتوں کی مٹھی میں پھر بند ہوا
نیکی کا سپاہی لڑ کے گرا اور مٹی میں پیوند ہوا
پھر معرکۂ خیر و شر میں نیکی ہاری اور شر جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(۲)

ویرانے میں اک پھول کھلا کچھ دیر ہنسا پھر مرجھایا
کچھ دم کو فضائے صحرا پر ۔ رنگ و نکہت برسا ہی گیا
کچھ دیر کو کانٹوں کے بن میں ۔ گلشن کا پیمبر آ ہی گیا
کچھ دم کے لیے اک جامِ حسیں ۔ پھر امرت رس چھلکا ہی گیا
کچھ دم کو دیارِ مرگ و فنا ۔ جینے کا سلیقہ پا ہی گیا
غنچہ آخر دم تک مہکا
امرت کا ہر قطرہ ٹپکا
گلشن کے پیمبر نے اپنی ہر سانس سے جیون رس گھولا
جنت نے پھر دوزخ کی طرف اپنا اک رنگیں پٹ کھولا
لیکن اس بنجر ریتی پر
اس خار و خس کی دھرتی پر
آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی
تاریخِ جہاں نے جب اپنا افسانۂ پیشیں دہرایا
گل کی جانب ہر خار لیے اک خنجرِ خوں آشام آیا
صحرا کے شیاطیں میں گھر کر گلشن کا پیمبر کام آیا
سنگ و آہن کی ضربوں سے امرت کا ساغر چور ہوا
ریگ اپنے بگولے لے کے اٹھی اور ہر جلوہ مستور ہوا
پھر دشت و چمن کے معرکے میں گلشن ہارا صحرا جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(۳)

اک انساں زیست کی راہوں میں الفت کی مشعل لے کے بڑھا
خنجر سی نگاہیں سنگ سے دل ۔ کچھ دم کے لیے پھر نرم ہوئے
شبنم نے بھڑکتے شعلوں پر ۔ کچھ دم کے لیے پھاہے رکھے
نفرت کی چٹانیں کچھ سرکیں ۔ کچھ دم کے لیے سوتے پھوٹے
کڑوے بولوں کی وادی میں ۔ کچھ دم کے لیے نغمے گونجے
شبنم جیتے جی شعلوں پر رکھتی ہی رہی ٹھنڈے پھاہے
گھولا ہی کیے ہر تلخی میں میٹھا رس آخر تک نغمے

ہر قہر و بلا سے لڑنے اک انساں دعائیں لے کے بڑھا
دل میں الفت، اشک آنکھوں میں، ہونٹوں پہ دعائیں لے کے بڑھا
نفرت کی تپتی وادی میں رحمت کی گھٹائیں لے کے بڑھا
لیکن اس جبر کی دھرتی پر
اس خوں سے سینچی مٹی پر

آخر وہ نوبت آ ہی گئی
آخر وہ ساعت آ ہی گئی

تاریخ جہاں نے جب اپنا افسانۂ پیشیں دہرایا
شبنم کی ننھی بوندوں پر ہر سمت سے پھر شعلے لپکے
ذہنوں سے اٹھیں نہ جھنکاریں، دل کے سارے نغمے ڈوبے
حرص اور ہوس کے زنداں میں ابنِ آدم پھر بند ہوا
الفت کو نہ کر پایا سجدہ، طاقت کا عقیدت مند ہوا
حق اور ناحق کے معرکے میں پھر حق ہارا ناحق جیتا
یہ جنگ مگر جاری ہے ابھی

(۴)

اک دیپ جلا، آندھی نے مگر تا دیر اسے جلنے نہ دیا
اک پھول کھلا، صحرا نے مگر تا دیر اسے ہنسنے نہ دیا
اک انساں الفت لے کے بڑھا، دنیا نے مگر بڑھنے نہ دیا
اکثر تو اسے جینے نہ دیا

جب سے یہ دنیا قائم ہے
یہ جنگ برابر جاری ہے
اب تک تو یہی ہوتا آیا، انساں ہارا شیطاں جیتا
لیکن جب تک یہ دنیا ہے
یہ جنگ بھی ہوتی جائے گی، میداں بدلتے جائیں گے
اور اک دن انساں جیتے گا



اردو شاعری کا ایک اہم پہلو

سید اعجاز حسین

انسان اور ادب کے مزاج میں اتنی مماثلت ہے کہ دونوں کو آسانی سے الگ کرنا مشکل ہے۔ ادب دراصل انسانی مذاق کا پرتو ہے بلکہ اسی کا آوردہ و پروردہ ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ انسان سے زیادہ مختلف کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ادب، مذاق زمانہ کو بدل دیتا ہے لیکن عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ سماج ہی ادب کو پست یا بلند ہونے کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اسی مواد سے ادب اپنی محفل آراستہ کرتا ہے، اور توانائی و ناتوانی حاصل کرتا ہے۔ اردو ادب کے ابتدائی دور کا بھی جائزہ لیجیے تو باوجود سیاسی انتشار و خلفشار کے سماج سے اس کی وابستگی اور اپنے عہد کی ترجمانی اس کی امتیازی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

اردو شاعری اپنی طفولیت میں ماحول کے تپتے ہوئے ریگ زار میں ارتقائی منزل طے کرنے پر مجبور تھی۔ حکومتوں اور تہذیبوں کی بدلتی ہوئی زمین پر اسے پھونک پھونک کر قدم دھرنا پڑتا تھا۔ نہ وہ کسی شخصی حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتی تھی، نہ معاشرے سے الگ ہو کر ناصح مشفق کا انداز بیان اختیار کر سکتی تھی۔ نہ توہم پرستی سے وہ لڑ سکتی تھی نہ مذہبی احکام کے غلط تعبیر و تشریح کی ذمہ داری لے سکتی تھی۔ اس کشمکش میں اس کے لیے صرف ایک راستہ رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ معاشرے کی دل جوئی کرتے ہوئے خوبصورت طریقے پر بلندی اخلاق کی نشانیاں عوام کے سامنے پیش کر دے، الفاظ کے پردے میں مظالم کا ذمہ دار بجائے کسی شخص کے آسمان کو ٹھہرائے اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں زندگی کی لہر دوڑانے کی امنگ پیدا کرے۔

بات یہیں نہیں ختم ہوتی۔ بدحالی کے ساتھ نہ سہی اس کے آگے پیچھے خوش حالی بھی پرچھائیں کی طرح لگی رہتی ہے۔ شاعر اس لمحہ کو جس میں تھوڑی دیر کے لیے بھی اسے سکون نصیب ہوتا ہے غنیمت سمجھتا ہے۔ سیر و تفریح کے سامان میں جہاں کہیں دلچسپی کا پہلو نظر آتا ہے اس سے فائدہ اٹھا کر وہ دل کے جذبات قلم بند کر لیتا ہے۔ اس کے اس کلام میں سماجی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ اردو شعرا بھی اس نظریۂ حیات واد سے مستثنیٰ نہ تھے۔ انھوں نے بھی سکون کی غارت گری کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا اسے غنیمت سمجھ کر اپنے کلام کا محور بنایا چناں چہ اس کلام میں معاشرے کی تمدنی زندگی کا اچھا خاصا عکس ملتا ہے۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں یہاں شمالی ہند کے اردو شعرا کے کلام سے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں۔

فائز ایک لحاظ سے شمالی ہند کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں۔ یہ عالمگیری و محمد شاہی دور کے شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ایسے موضوعات جو اس وقت کی سماجی زندگی کی نشان دہی کرتے ہیں، بہت مل جاتے ہیں۔ پنگھٹ، میلہ، نہان وغیرہ ادارے نہ ہوتے ہوئے بھی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے مخصوص ادارے ہیں جہاں زندگی کے مختلف پہلو اور سماج کی متعدد خصوصیات بہ یک وقت سامنے آ جاتی ہیں۔ مثال کے لیے پنگھٹ کی اہمیت و خصوصیت لے لیجیے۔

ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے گرم ملک ہے۔ سرزمین حیات زندگی کے لیے پانی کی بے حد اہمیت ہے۔ اگلے زمانے سے ہی دیہی علاقوں میں پانی مہیا کرنے کا فرض عام طور سے عورتوں کے سپرد تھا۔ کنوئیں سے پانی نکالنا، یا دور جا کر تالاب اور ندی سے گھڑا بھر کر لانا آسان کام نہ تھا۔ بوڑھی عورتیں یہ کام نہ کر سکتی تھیں اس لیے عموماً تندرست اور جوان عورتیں پانی لانے کے لیے گھر سے باہر جاتیں۔ یہ فرض مشقت کے باوجود ایک خوش گوار پہلو کا بھی حامل تھا۔ جوان عورتیں گھر کی گھٹی گھٹی فضا سے نکل کر پنگھٹ پر تھوڑی دیر کے لیے آزاد ماحول میں سانس لینے کا موقع پا جاتیں۔ ہم سن، ہم جنس ساتھیوں کا ایک جگہ جمع ہونا ان کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ مگر اس رنگین اجتماع سے صرف صنف نازک ہی کو دلچسپی نہ تھی۔ آنکھیں سینکنے اور جوانی کی پیاس بجھانے کے لیے مرد بھی گھومتے پھرتے پنگھٹ تک پہنچ جاتے۔ کبھی اشارے کنائے میں، کبھی زبان حال سے اور کبھی بیباکی سے اپنی تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ غرض پنگھٹ ہندوستانی زندگی میں

یا مقام تھا جہاں پیاس بھی بجھائی جاتی اور آگ بھی لگائی جاتی۔ اس عام نگاہ ہر تہذیبی پہلو کا اثر زندگی پر کچھ اس انداز سے پڑا کہ اردو شاعروں نے اس کو اپنی زبان میں محدود یا باعث مسرت سمجھا۔ چناں چہ فائز نے بھی اس موضوع پر ایک خوبصورت نظم کہہ کر اردو کے سماجی عنصر کو تقویت بخشی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

یا جب سیر میں پنگھٹ کا گلزار — کنوئیں کے گرد دیکھی فوج پنہار
روں کیا وصف میں سنگت کے تحریر — کروں کیا ان کی میں خوبی کی تقریر
ہر اک پنہار وال اک اپھراتی — کنوئیں کے گرد پاندر کی سبھاتی
یاں کیوں کر کروں ان کی میں رفتار — کروں تقریر کیا بیچھن کی جھنکار
داں تھے بیٹے پر چندرا جارے — زمیں پر سیر کرتے تھے ستارے
لے آئی تھی جھریا ایک سندر — لے جاتی اک گگریا سیس پر دھر
سبھن کی رنگ رنگ لہنگا و ساری — کنارے ان کے تھی ٹانکی کناری
سبھوں کے رنگ برنگ تھی باکڑی ہاتھ — گگریا تھی سبھی کی سر اوپر ساتھ

اس رومانی فضا نے شاعر کے دل میں ہیجانی کیفیت پیدا کر دی۔ اس کی خاموشی حرکت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک پنہارن پر اس کی نظر انتخاب پڑی۔ اداے دل ربانہ بجلی کی طرح سامنے آئی۔ خارجی مناظر داخلی پہلو کو گرمانے لگے۔ شاعر نے چھیڑنے کے لیے اس کی گگریا چھو لی۔ اس جرأت مندانہ کا جو ردعمل ہوا وہ سننے کے قابل ہے :۔

کھڑا سر پر، کھڑی تھی راہ اوپر — یقیں یوسف کی جا ہے چاہ اوپر
گگریا چھوئی میں اس کی ادا کر — دیا کرنے لگی وہ منہ چھپا کر
تھا کر سینہ، بجلی سی چمک کر — گئی جوں ہرنی آگے سوں ٹھٹک کر
لگی کہنے سکھی سوں منہ پھلا کر — مرُوڑی بھون انکھیاں کو پھرا کر
کہ اب چھوئی .... نے یہ گگریا — لے جاؤں گھر میں کیوں کر آج دیا
جھوں تک اس کنوئیں آئی سو آئی — نہ لیوں پنگھٹ کا ماں پھر نام مائی
.. .. — جو اب پھر آؤں چھمن کی دوہائی

اس نظم میں پنگھٹ کی چہل پہل کے علاوہ اور کئی باتیں ایسی آ گئی ہیں جو ہماری سماجی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کرتی ہیں۔ مثلاً ہنڈا، بول چال برتنوں کے نام پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت عورتیں لہنگا، ساری میں گوٹا اور باکڑی ٹانکتی تھیں۔ جھریا اور گھڑا سر پہ لے کر پانی کے لیے جاتی تھیں اور گھونگھٹ بھی کرتی تھیں۔

اسی قسم کی دوسری نظم "در وصف بھنگری در گاہ قطب شاہ" میں بھی سماجی زندگی کا عکس فائز نے پیش کیا ہے جس سے اس وقت کے ملبوسات، زیورات و تفریحات کا اندازہ ہوتا ہے۔

شاہ مبارک آبرو کی ایک مثنوی سے بھی یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ان کے زمانے میں معقول و وضعدار لوگ کیا لباس استعمال کرتے تھے۔ آبرو کی اس مثنوی کو مرزا فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۳۰ء میں رسالہ (اردو) اورنگ آباد میں "بادہ کہن" کے تحت پیش کیا تھا۔ لباس و آرائش کا جو ذکر اس مثنوی میں آیا ہے وہ بہ ظاہر ایک خوبرو لڑکے کے لیے ہے مگر در اصل یہ ساری وضع قطع وہ ہے جو ان کے زمانے میں شریعت و وضیع لوگوں کی تھی۔ اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ پگڑی باندھتے تھے، مشروع کا پائجامہ پہنتے تھے، کمر میں کٹار لگاتے تھے، آنکھوں میں سرمہ اور دانتوں میں مسی لگاتے تھے، عطر و پان کا رواج عام تھا۔ جا بجا سے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

آنکھوں میں اپنی سجن سُرمہ لگا — کم نما رکھ، مت لگا لے بہت سا
مل مسی دانتوں سنے، رنگیں جما — خوش نما کر لب کے تئیں بیڑا چبا
ڈنڈ پر جامہ تلے تعویذ باندھ — بیچ میں بازو کے کر تعویذ پھاندھ
جب سجا چیرا تو، تو سمجدار سج — جو نہ آوے خوب تو بکدار سج
سج پر ہوا گا ذ بیچ اٹک بلند — اس طرح کی باندھ جو ہووے پسند
گھیر دامن کا ہو تو گز با کہ بس — اس قدر بہتر و پھبتا ہو کہ بس
باندھ پٹکا سات گز کا لمبے کے بل — صاف بندش ہو نہ ہووے چل بچل
عطر لے کر اپنے کپڑوں کو لگا — شان سبتی بیٹھ اور حقہ منگا
اب زمانے میں اجارے ہیں یکھو اور — سیکھ لے ہندوستاں زادوں کا طور

اردو کا یہ مذاق ابتدا ہی سے قائم ہو گیا تھا، حتیٰ کہ دکن میں بھی سماج سے وابستگی کا شعور ہماری شاعری کا محبوب مشغلہ تھا۔ مختلف تہواروں اور جشن کے علاوہ موسم برسات، تقریب ولادت و شادی پر شعرا اپنے فن کا اظہار کرتے۔ اس سلسلے میں قلی قطب شاہ کا کارنامہ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بادشاہ کی لکھی ہوئی ایسی متعدد نظمیں ہیں جن سے اس زمانے کی شادی بیاہ کی تفصیل معلوم ہوتی ہے، مثلاً یہ پتہ چلتا ہے کہ "جلوہ" کے وقت ایک چوکی چاروں طرف سے سجائی

جاتی، دلہن کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائی جاتی، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے جاتے، سات سہاگنیں دلہن کے سر میں تیل لگاتیں، پیشانی پر ٹیکا اور آنکھوں میں سرمہ لگایا جاتا۔ بنا سجا کر دلہن کو چوکی پر بٹھایا جاتا، سر پر سہرا باندھا جاتا، پھر دولہا، دلہن کو شربت پلاتا اور دولہا، دلہن کو اور دلہن دولہا کو اپنے اپنے ہاتھوں سے پان کے بیڑے کھلاتی۔ اس قبیل کی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پرم پیاری جلوہ گاد سارے دسے چند، سور، سوں ہریاں سنگار
رچاؤ تخت جلوے کا خوشی سوں کہ چوندھر چوک موتیاں سوں سنوارے
پلا شربت دیو، ہاتاں میں بیڑے منداد ساریاں موتیاں کمن ارے

مذہبی و نیم مذہبی روایات و جشن کے تو بے شمار پہلوؤں پر ابتدائی دور کے شعرا نے اظہار جذبات کی کوشش کی مگر ان واردات قلب سے الگ ہو کر ہندستان کے بعض موسموں کو بھی شاعری میں جگہ دی۔ برسات ہندستان کے لیے جتنا مفید و دل چسپ موسم ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ افادی و جذباتی لحاظ سے پورا سماج اس فصل سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کسی مخصوص دور کی آوردہ نہیں، زراعتی ملک ہونے کے اعتبار سے ہندوستان ہمیشہ برسات سے متاثر ہوتا رہا۔ اس کی کیف آور فضا و جذبات انگیز ہریالی عوام و خواص کو یکساں متوجہ کرتی رہی۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ موسم برشگال کو ہمارے شعرا اپنی فکر کی جولاں گاہ نہ بناتے۔ چناں چہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ نے اپنی جدت پسندی سے برسات کو ایک تہوار بنا دیا۔ اور تہواروں میں تو مذہب کی پرچھائیں بھی کارفرما تھی جس سے کسی ایک فرقے کا مخصوص تعلق ہوتا تھا مگر "مرگ سال" ایک ایسا تہوار تھا جو خالص ہندوستانی اور غیر مذہبی تھا۔ اس جشن میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کسی آدمی کو نہیں ہو سکتی بہ شرطے کہ وہ آدمی ہو۔ محمد قلی قطب شاہ نے جس انداز و اہمیت سے مرگ سال کو جشن عام بنایا اس کی بابت ڈاکٹر زور لکھتے ہیں :۔

"جس روز مرگ لگتا یا برسات کا موسم شروع ہوتا وہ (محمد قلی) بڑی دھوم دھام سے محفل آرائی کرتا۔ شراب کے دور چلتے، مطربان خوش نوا رقص و سرود کے کمال دکھاتے۔ باغوں میں جھولے ڈالے جاتے۔ عشق و شیفتگی کے جذبات برانگیختہ ہونے لگتے۔ سہیلیاں مشک و زعفران وغیرہ مل کر اپنے جسم کو معطر بنا لیتیں۔ بیر بہوٹی کے رنگ کے سرخ کپڑے زیب تن کرتیں۔ پھول اور پان کے طبق تقسیم کیے جاتے۔ تمام محلات شاہی میں زمردی رنگ کی مسندیں بچھا دی جاتیں اور ہر طرف خوشی و خرمی کا اظہار کیا جاتا۔ محمد قلی نے اپنے شاعرانہ کمال کا بہترین اظہار اس موضوع سے متعلق نظموں میں کیا ہے اس نے موسم باراں کی آمد آمد پر چند نفیس نظمیں لکھیں۔"[۵]

"آپ "مرگ سال" کا بیان نثر میں ملاحظہ فرما چکے۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہو چکا کہ محمد قلی قطب شاہ نے موسم باراں کی آمد پر چند نظمیں لکھیں (جن کا یہاں درج کرنا طوالت کا باعث ہوگا)۔ اب آپ بسنت کا بیان اسی شاعر کی نظم میں دیکھیے :

بسنت کا پھول کھلیا ہے سو جیون پاکو ماتی
کر دل کر سہیلیاں سب بسنت کے تیئں مہانی
سکل جہاناں کوں لاگے ہیں جہاں کہ کیس پھولان
سو پھولاں سوں کیے تل تل پیا پر گوہر افشانی
بسنت پھل کا عامل ہو کر آئی انگن میں دھن
سو پھل منگا کے نقشاں نے حیلوں ہے آنی

اسی قسم کی اور بہت سی نظمیں ہمارے اس دعوے کو تقویت بخشتی ہیں کہ شروع سے اردو شاعری کا رجحان ایسے موضوعات کی طرف تھا جو ہندوستان کے عوام، رسم و رواج، موسموں وغیرہ سے وابستہ تھا۔ شاعری اپنی خوراک ماحول سے حاصل کر رہی تھی۔ اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا کر چل رہی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عام لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ شاعری میں ہماری ہی بات کہی جا رہی ہے۔ اس احساس نے اردو ادب کی جڑیں مضبوط کر دیں اور اس کی ہر دل عزیزی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ہر طبقہ میں اس کا اثر قائم ہو گیا۔ آگے چل کر، اردو کی شاعری سے دل چسپی لینے والوں کی فہرست اتنی لمبی ہو گئی کہ اس میں امیر، غریب، تاجر پیشہ، دستکار بغیر کسی مذہبی یا فرقہ وارانہ ذہنیت کے نظر آتے ہیں، کبھی سامعین کی حیثیت سے اور کبھی فن کار کی حیثیت سے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی کو ہو کہ اردو کی سماج پسندی محدود و مخصوص ہے، زندگی سے متعلقات کی تصویر کشی کی گئی ہے خود زندگی کا نقشہ نہیں پیش کیا

---

۵ سلطان محمد قلی قطب شاہ : مرتبہ ڈاکٹر زور صفحہ ۱۷۔۲۱۶

نیا۔ لیکن یہ خیال بھی کم نظری کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلہ میں بھی اردو شاعری نے اپنی قوت و انفرادیت کا وہ ثبوت دیا ہے کہ مطالعہ کے بعد حیرت ہو جاتی ہے کہ وہی شعرا جو امرا کی قصیدہ خوانی کے لیے بدنام تھے ملک اور سماج کو خراب حالت میں دیکھ کر خون کے آنسو بہاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ امرا کی برائی اور معاشرے کی خستہ حالی کا وہ اس شد و مد سے تذکرہ کرتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہی شاعر ہیں جو کبھی دولت و حکومت سے متاثر ہو کر اہل ثروت کو زمانے کی ممتاز ترین شخصیت سمجھتے تھے۔ ملک کی خستہ حالی سے یہ شاعر اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ بادشاہ سے لے کر امرا تک ان کی زبان تیغ سے بچ نہیں سکے۔ چنانچہ فرخ سیر کے زمانے میں ملک پر جو مصیبتیں آئیں ان میں غلہ کی گرانی خاص طور پر تکلیف دہ تھی۔ جعفر زٹلی نے اس تباہی کو مدنظر رکھتے ہوئے کہا۔

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر   بادشاہ دانہ کش فرخ سیر

اورنگ زیب کے بعد اس کی وسیع سلطنت جس طرح تباہ ہوئی اس کو مدنظر رکھ کر کون ہوگا جو معظم شاہ کو اپنے باپ کا صحیح جانشین مانے گا۔ اکبری و عالمگیری فتوحات نے بادشاہان مغلیہ کا جو وقار بلند کیا تھا وہ دفعتاً جانشینوں کی کمزوریوں سے خاک میں مل گیا۔ ایسی صورت میں معظم شاہ کے لیے جعفر کا یہ کہنا کتنا اثر حقیقت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

همه کار ده بار پدر کشنده کرد

وہ حالات کو تاریخی لحاظ سے دیکھ کر آگ ہو جاتا ہے اور بے ساختہ معظم کو کہتا ہے۔

جہاں ہووے ایسا کلچھن کپوت   لگے خلق کے منھ کو کالک بھبوت

تو غلط کیا کہتا ہے۔

یہی نہیں کہ جعفر نے صرف بادشاہوں کو برا بھلا کہہ کر خاموشی اختیار کر لی ہو بلکہ اس کا دل جس بات پر جلتا تھا اس کا بھی تذکرہ وہ بڑے درد و یاس سے کرتا ہے۔ اس کی نظر ان بنیادی حقائق پر تھی جو بادشاہ کو ہر دلعزیز بناتے ہیں۔ مثلاً رعایا کی بہبودی، اخلاقی قدروں کی بلندی، ملک کا عروج بادشاہ کے فرائض کے اہم ارکان ہیں۔ جب ان میں کمزوری آتی ہے تو بادشاہ بادشاہ نہیں رہ جاتا۔ جعفر کے زمانے میں چونکہ یہ سب خرابیاں پائی جاتی تھیں اس لیے وہ بے چین ہو جاتا ہے کہتا ہے۔

نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری
محبت اٹھ گئی ساری عجب یہ دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں نت اٹھ اٹھ چوکیاں جائیں
قرض بنیوں سے لے کھاویں عجب یہ دور آیا ہے

اور شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کرنا مضمون کے لحاظ اور رسالے کی ضخامت کے خیال سے مناسب نہ ہوگا ورنہ یہ بات صاف ہو جاتی کہ صرف جعفر زٹلی ہی نہیں بلکہ اور شعرا بھی معاشرے کی تباہی اور سلطنت کی کمزوری سے متاثر ہو کر اتنا بیباک ہو جاتے ہیں کہ حسب شاہی بھی ان کو جذبات نظم کرنے میں سد راہ نہیں ہوتا لیکن کم از کم ایک اور مثال اس قبیل کی پیش کرنا ضروری ہے تاکہ یہ یقین ہو جائے کہ بادشاہ کو برملا برا کہنے میں جعفر زٹلی تنہا نہیں۔ شاہ عالم بادشاہ کی چیرہ دستی اور بدنظمی سے متاثر ہو کر قائم چاندپوری نے کہا:

کیا یہ شہ کہ ظلم پر اس کی نگاہ ہو   ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے
بخا ایک آپ ساتھ تیری سیاہ ہو   ناموس خلق سایہ میں اس کے تباہ ہے
شیطان کا یہ ظل ہے، نہ ظل الٰہ ہے
سمجھا تو اس قدر بھی اے بے مروت خبیث خو   کس پر ہوا یہ مظلمہ لوٹا کنھوں نے زر
پر نیک و بد یہ آدمی کرتا ہے بارِ نظر   تب خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر
جس کا خطاب شاہ جہاں پناہ ہے

اردو شاعری کی سماج پسندی کسی ایک دور تک محدود نہیں رہی شعرا ملک کے حالات اور معاشرے کی دلچسپی سے ہر زمانے میں خاطر خواہ اثر لیتے رہے اور ضرورت کے لحاظ سے اپنے رجحانات پیش کرتے رہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ صرف اپنے ہی مفاد و ذاتی جذبات سے مغلوب ہو کر سب کچھ کہتے رہے ہوں۔ ان کے پیش نظر عوام کی بہبود اور ملک کی برتری بھی تھی۔ جس زمانے میں جیسی ضرورت ہوتی ویسا ہی وہ اپنے مذاق شاعری کو معاشرے کے مطالبات کے سانچے میں ڈھالتے۔ مواد کے کم زیادہ ہونے کا سوال ایک الگ بات ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر دور میں ہماری شاعری نے اپنے دور کی ترجمانی کی ہے۔ مثال کے لیے سودا و میر کا کلام لے لیجئے۔ یہ فن کار جہاں غزلوں اور قصیدوں کا مرتبہ اردو میں بلند کرتے رہے وہیں زمانے اور عوام کے جذبات کی بھی ترجمانی کرتے رہے جرأت

غزلوں ہی میں نہیں، جا بجا منتشر اشعار میں نہیں بلکہ تسلسل کے ساتھ پوری پوری نظموں میں معاشرے کی بے چینی اور ملک کی بدحالی پر دل کھول کر شعرا نے ظرافتوں کے ساتھ بے باکی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ حاتم، سودا، میر، نظیر، قائم وغیرہ اردو کے ممتاز شعرا نے اپنے زمانے کی کشمکش اور معاشرے کی حالت جس تفصیل و درد سے اپنی نظموں میں قلم بند کی ہے وہ ہمارے اس دعوے کی پوری تائید کرتی ہے کہ اردو شاعری کو سماج کی ابتری کا ہر دور میں زیادہ سے زیادہ خیال رہا ہے۔ یہاں اس کی گنجائش نہیں کہ ان شعرا کی پوری نظمیں پیش کی جائیں۔ صرف اقتباسات اور وہ بھی اختصار کے ساتھ بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں۔

میر اپنے زمانے میں معاشرے کی تباہی اس طرح بیان کرتے ہیں:

مرنے کے مرتبے میں جینا حباب   جو لٹتا سا ملا، سو بے اسباب
تنگ دستی سے سب بحال خراب   جس کے سے پاس تو نہیں طناب
جس کے ہے فرش تو نہیں فراش

زندگانی ہوئی ہے سب پہ وبال   کنجڑے جھینکے ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال   ایک تلوار بیچے ہے اک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

نظیر نے اپنے معاشرے کی جو گت ہوتے دیکھی اس کو ان کی زبان سے سنیے:

نہیں پہ زور جنھوں میں وہ کشتی لڑتے ہیں   جو زور والے ہیں وہ آپ سے بچھڑتے ہیں
جھپٹکے اندھے بٹیروں کے تئیں پکڑتے ہیں   نکالے چھاتیاں کبڑے اکڑتے پھرتے ہیں
غرض میں کیا کہوں دنیا بھی کیا تماشہ ہے

حاتم، ہندوستان کی کایا پلٹ دیکھ کر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو کہتے ہیں:-

کیا بیاں کیجیے بیرنگی اوضاع جہاں   کہ بہ یک چشم زدن ہو گیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں   پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اس وقت   ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے   کہیں ظلموں کے لانے سے نہ آوے طوفاں
سے جو بے کار ہیں ان کا تو خدا حافظ ہے   سے جو ہیں نام کو نوکر انھیں تنخواہ کہاں
کیا زمانے کی ہوا ہو گئی سبحان اللہ   زندگانی ہوئی ہر ایک کی اب دشمن جاں

زن مبیچے سے چھپا کھاتے ہیں مکڑے کے تئیں   غضب آوے جو کوئی جاوے کسی کے مہماں
سے جو تھوڑی کو ترستے تھے وہ اس میں آج   ہو رہے ہیں صاحب مال و محل و فیل نشاں
یہ خدا خوب کہا ہے یہ کسو نے مصرعہ   یعنی نعمت بہ سگاں بخشی و دولت بہ خراں

اپنے دور کی ترجمانی اہم طبقات کی روداد سے اردو شاعری کبھی بیگانہ وار نہیں گزری۔ اس نے گرد و پیش کے حالات سے کبھی چشم پوشی بھی نہیں کی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جہاں ذاتی جذبات سے وہ متاثر ہوئی وہاں سماج کی ابتری پر وہ خون کے آنسو بہاتی رہی۔ مواد کے کم و بیش کا سوال یہاں نہیں۔ ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ اردو زبان اپنے دور کی اہم سرگزشت پر کس طرح زبان کھولتی رہی۔ معاشرے کے مذاق و مزاج کو اپنے سانچے میں ڈھالنا اپنا فرض سمجھتی تھی یا نہیں۔ ادب کے جائزہ لینے پر اس سوال کا جواب اطمینان بخش ملتا ہے۔ وہ اگر سماج کے تہواروں اور موسموں کی کیفیتوں پر جا بجا شعر کے جذبات پیش کرتی رہی تو اس کی ابتری و بدحالی پر بھی چپ نہیں رہی۔ نہ دربار سے مرعوب ہوئی نہ اپنے عہد کے جابر امرا کے خوف سے اس نے زبان بند کی۔ اس کی معاشرے سے دلچسپی روز ازل سے تھی۔ وہ ہر زمانے میں اس کو فرض منصبی سمجھ کر انجام دیتی رہی یہ ضرور ہے کہ یہ کسی دور میں کم رہی کسی میں زیادہ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے معاشرے کے حالات و جذبات کی ترجمانی نہ کی ہو۔

اردو شاعری میں جہاں سمندر کا ٹھہراؤ ہے وہاں اس کی گہرائی میں بے شمار قیمتی اشیا بھی ہیں۔ مگر چونکہ اس کی بالائی سطح پر حسن و عشق کی لہریں رواں ہیں اس لیے ظاہر بیں نظروں کو زیادہ تر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہاں عشقیہ شاعری کے سوا کچھ نہیں، حالاں کہ اس قسم کے کلام کی تہ میں بھی ایسی چیزیں ملتی ہیں جو انمول موتی سے کم نہیں۔ مثال کے لیے سماجی تمدن پر نظر کیجئے۔ ساحل سے نظارہ کرنے والے اگر دریا میں اتر کر جستجو کریں تو علاوہ اور باتوں کے یہ بھی محسوس ہو کہ اردو شاعری کی وسیع دنیا میں اس قسم کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے جس سے ہر عہد کے رسم و رواج، نہان، میلے، ٹھیلے خوشحالی و بدحالی کا پتہ چلتا ہے۔ چونکہ اس پر توجہ نہیں کی گئی لہٰذا اس کی ضخامت و اہمیت کا اندازہ بھی نہیں ہو سکا۔ ورنہ یہ معلوم ہوتا کہ سماجی موضوعات سے متعلق نظموں کا ایسا اچھا ذخیرہ ہے جو ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں کی ادبی خوبیوں کو نظر انداز کرنے پر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس میں معاشرے کی جیتی جاگتی تصویر ہر قدم پر نمایاں ہے۔

ہم لوگ

(مراد ہے شعرائے کرام سے)

عرش ملسیانی

سازِ چنگ و چغانہ ہیں ہم لوگ
زندگی کا ترانہ ہیں ہم لوگ

حسن کی ایک نظم کیف رُبا
عشق کا اک فسانہ ہیں ہم لوگ

ہم کو کیا واسطہ زمانے سے
آپ اپنا زمانہ ہیں، ہم لوگ

وجہ بیداری جہاں ہیں ہم
نعرۂ والہانہ ہیں ہم لوگ

ہم میں موجود نقش رنگا رنگ
ایک تصویر خانہ ہیں ہم لوگ

راہِ منزل سے بے خبر دُنیا
سوئے منزل روانہ ہیں ہم لوگ

زندگی کی حقیقتیں ہم ہیں
زندگی کا فسانہ ہیں ہم لوگ

لحن ہر دور، لحن ہر ساعت
نغمۂ جاودانہ ہیں ہم لوگ

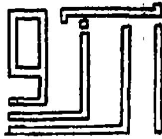
تیر پر تیر ہیں حسینوں کے
ایک ایسا نشانہ ہیں ہم لوگ

شورِ ہُو حق کے ہم نہیں قائل
مے کشی کا ترانہ ہیں ہم لوگ

طائرِ فکر کے شکاری ہم
دام ہم لوگ، دانہ ہیں ہم لوگ

ہم ہیں اے عرش شاعرانِ کرام
نازشِ ہر زمانہ ہیں ہم لوگ

دسمبر ۱۹۶۳ء



سید حرمت الاکرام

فضا میں اک نئی آواز لرزاں چاہتا ہوں
لپکتا لمحہ لمحہ شعلۂ جاں چاہتا ہوں
زمانے سے نیا ہر آن پیماں چاہتا ہوں

دلوں پر کس لیے لہرائیں رنگ و نسل کے سائے
حرم کی چھاؤں میں جلوے شوالے کے نظر آئے
نفاقِ کفر و ایماں! تیرا درماں چاہتا ہوں

فزوں ہوگی کہاں تک ساعتوں کی شعلہ سامانی
مرا عزم مسیحائی ہے محوِ شبنم افشانی
رفیقو! چارۂ آزارِ انساں چاہتا ہوں

وطن کی پاک دھرتی پر نکھار آتا چلا جائے
ترنگا تا بہ گردوں یونہی لہراتا چلا جائے
ہمالہ کی جبیں کچھ اور رخشاں چاہتا ہوں

عروسِ ارتقا کے دل نشیں جلووں کے دیوانے
بناتے جائیں اک اک گام پر سو آئینہ خانے
ہمکتی خاک کو رقصاں غزل خواں چاہتا ہوں

فسردہ لمحوں کو سوزِ طلب، سوزِ تمنا دو
دلوں کو چاہیے اک عزمِ تابندہ، یہ بتلا دو
نئی شمعوں سے روشن بزمِ امکاں چاہتا ہوں

بناؤ اک نیا خاکہ سنوارو گیسوئے فردا
بجاؤ وقت کے ماتھے پہ جھومر اپنے خوابوں کا
وطن کی مانگ میں تاروں کی افشاں چاہتا ہوں

اگر بابینہ ۱۸۸۵

قدیم ہندوستان میں تفریحات

سید سخی حسن

ہر زمانے اور ہر ملک میں کھیل کود، ناچ رنگ، میلوں ٹھیلوں اور دوسری تفریحات سے لوگوں نے ہمیشہ دلچسپی لی ہے اور تفریحات میں دراصل زندگی کا ایک اہم پہلو بھی مضمر ہے۔ تفریحات نہ ہوں تو زندگی بے کیف و بے لطف ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً قدیم یونان میں بڑے بڑے مفکر، عالم، فلسفی، شاعر اور ادیب پیدا ہوئے، لیکن یونانیوں نے اپنی علمی سرگرمیوں کے ساتھ کھیل تماشوں اور تفریحات کو بھی باقی رکھا۔ "اولمپیا" کے عظیم الشان میلے سے جو ہر چوتھے سال منعقد ہوتا، اور جس میں یونان کے گوشہ گوشہ سے لوگ کھیل کود، بھاگ دوڑ، اور جسمانی طاقت کے مقابلوں میں شرکت کے لئے آتے، کون واقف نہیں۔ اسی طرح روم کے "ایمفی تھیٹر" کا نام کس نے نہیں سنا۔ اس تھیٹر میں روم کے عظیم الشان ناٹک اور کھیل کود وغیرہ کے مظاہرے ہوتے تھے۔ غرض قدیم رومیوں اور یونانیوں نے اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے ساتھ زندگی کے تفریحی پہلوؤں کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ہندوستان، جس نے فلسفے اور علوم کے میدان میں یونان اور روم سے پہلے ترقی کی منزلیں طے کیں، زندگی کی رنگینیوں سے بالکل بیگانہ تھا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اپنی علمی، ادبی اور فنی سرگرمیوں، اور روحانیت اور رہبانیت کے باوجود، دنیا کی مسرتوں، دلچسپیوں اور تفریحات سے ناآشنا نہ تھے۔ پروفیسر مجمدار کہتے ہیں: "یہ فرض کرنا غلط ہوگا کہ قدیم ہندوستان میں عام لوگ بنیادی مسرتوں اور لذتوں سے بالکل بیزار و متنفر تھے۔ زندگی میں توازن قائم رکھنے کی ضرورت کو اہل ہند نے ہمیشہ محسوس کیا۔"[1] چنانچہ ہند قدیم کے لٹریچر اور تاریخ کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تفریحات کے موقعے اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے اور ان میں لوگ بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ شرکت کرتے تھے۔ ایسے موقعوں پر عام طور سے میلے لگتے تھے جن میں کٹھ پتلی کے تماشے، کشتی کے مقابلے، شعبدہ بازی اور جادوگری کے مظاہرے، اور دوسرے تفریحی ہنگاموں سے لوگوں کا دل بہلانے کا سامان فراہم کیا جاتا تھا۔

ویدک دور میں رتھوں کی دوڑ، شکار اور جُوا امرا کے خاص تفریحی مشاغل تھے۔ ایک مناجاتی نظم میں دوڑ کے گھوڑوں کا مفصل ذکر موجود ہے۔ امرا ہاتھیوں، جنگلی سوروں، سانڈوں اور ہوا سے باتیں کرنے والے ہرنوں کا شکار سدھائے ہوئے شکاری کتوں کے ذریعہ کرتے تھے۔ شیروں کو جال میں پھانسنے کا بھی رواج تھا۔

عام تیوہاروں اور رواجی تفریحات کے علاوہ لوگ کئی اور موقعوں پر خوشیاں مناتے تھے۔ کامشاستر میں واتسائن[2] نے پانچ اور تیوہاروں کا ذکر کیا ہے۔ پہلے، دیوتاؤں کے اعزاز میں ایک تیوہار منایا جاتا تھا جسے سماج کہتے تھے۔ دوسری ایک تفریحی صحبت ہوتی

---

[1] آر سی مجمدار: "ہسٹری اینڈ کلچر آف دا انڈین پیپل، دا ایج آف دا امپیریل یونٹی۔" باب ۲۱، فصل ۹۔ [2] کوٹلیہ کا ایک اور نام جو کامشاستر کے ساتھ آتا ہے۔

تھی جس کا نام گوشٹی تھا۔ تیسرا ایک سے کشتی کا جلسہ ہوتا تھا جو ا پانک کہلاتا تھا۔ چوتھے یعنی اُتر یانک کو منانے کے لئے لوگ جتھوں کی شکل میں شہر کے باہر نکل جاتے اور کسی خاص باغ یا دوسرے تفریحی مقام پر اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے، جسے آج کل کی اصطلاح میں "پک نِک" کہہ سکتے ہیں۔ پانچواں موقع سَمَت یا کریڈا کا تھا۔ جس میں کثیر تعداد میں لوگ ایک جگہ جمع ہو کر کھاتے پیتے اور دل لگی اور تفریح کے مختلف سامانوں سے لذت کام و دہن حاصل کرتے تھے۔

شاہی تفریح کی خاص مد بڑے قسم کا شکار تھا جس میں راجہ ہاتھی پر سوار ہوتا۔ دوسری مد رتھوں کی دوڑ تھی۔ یونانی مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رتھوں میں دو بیلوں کے بیچ میں ایک گھوڑا جوتا جاتا تھا۔ رتھوں کی دوڑ میں راجہ، امرا اور معمولی لوگ بڑی بڑی بازیاں لگاتے تھے۔ ایک اور تفریح کا ذریعہ تھا مینڈھوں، سانڈوں، گینڈوں اور ہاتھیوں کی لڑائیوں کا تماشہ دیکھنا۔ جب راجہ اِس قسم کے تماشے دیکھنے کے لئے جلوس کی صورت میں نکلتا تو تیر انداز عورتوں کا ایک جتھا جنھیں یادَنا کہتے تھے، باڈی گارڈ کے طور پر ضرور اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہ عورتیں اس کام کے لئے اور دوسری شاہی خدمات انجام دینے کے لئے باہر سے خاص طور پر منگوائی جاتی تھیں۔ یہ عورتیں ہی چترِ شاہی، مورچھل اور پُوَن کُمبھ (طلائی گھڑا) لئے ہوتی تھیں۔ راجہ کی سواری جس راستے سے گزرتی اُس کے دونوں طرف رسیاں باندھ دی جاتی تھیں تاکہ ہجوم راستے میں حائل نہ ہو سکے۔

قدیم ہندوستان کے امرا اور شرفا اپنے انفرادی ذوق کے مطابق تفریح و تفنن کا سامان اپنے گھروں میں بھی رکھتے تھے۔ مثلاً عام طور پر ہر گھر میں مطالعہ کے لئے کتابیں، موسیقی کے مختلف ساز، گھریلو کھیلوں جیسے شطرنج اور چوسر وغیرہ کی بساطیں، مُہرے، پانسے اور مصوری کے لوازم تفریح و دل بستگی کے لیے رکھے جاتے تھے۔ مکانوں کے ساتھ چمن بھی ہوتا تھا جس میں طرح طرح کے خوبصورت پھول، طوطا مینا اور دوسرے پالتو پرندوں کے پنجرے، اور "ڈولا" یا جھولا ہوتا تھا جس میں تمام چھوٹے بڑے جھول کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔

عوام اگرچہ سادہ زندگی گذارتے تھے اور کھانے پینے کے معاملہ میں بہت اعتدال پسند واقع ہوئے تھے، لیکن میلوں ٹھیلوں اور تیوہاروں کے موقعوں پر خوب رنگ رلیاں مناتے تھے۔ اور جب کبھی راجہ یا اُمرا اُنھیں دعوتوں یا تفریحی جلسوں میں مدعو کرتے تو وہ بڑی زرق برق پوشاک پہن کر باہر نکلتے تھے۔ راجہ اُن کیلئے ناٹک، گھونسے بازی، کُشتی اور جانوروں کی لڑائیوں کے تماشے کا انتظام کراتا تھا۔

اِس دَور کے سماجی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آر۔سی۔ مجُمدار لکھتے ہیں: "اس عہد کے مجسّموں سے لوگوں کی زندہ دلی برتی ہے؛ نیز یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زندگی میں اُس وقت ہنگامہ آرائیاں تھیں، جوش و خروش تھا اور تفنن تھا۔ اُس عہد کے ادب سے بھی زندگی کا یہ لطیف پہلو جھلکتا ہے۔ گانے بجانے، ناچ رنگ، اور ناٹک کے علاوہ مسخرے، نقال، شعبدہ باز، نٹ کا تماشہ دکھانے والے، گھومنے پھرنے والے شاعر، گویے، بھاٹ اور نقیب بھی سامانِ تفریح بہم پہنچاتے تھے۔ بہت سے لوگوں کی تفریح کا ذریعہ باغبانی یا رنگ برنگے پھولوں کے ہار بنانا تھا۔ گھریلو یا کھلی ہوا میں کھیلے جانے والے مختلف قسم کے کھیل لوگ کھیلتے تھے۔ گھریلو کھیلوں میں پانسے کے ذریعہ کھیلے جانے والے تمام کھیل، وہ کھیل جس میں جوتے کی شکل کی لکڑی کی کشتی میں ایک محوری سلاخ لگی ہوتی جو گیند کو اوپر ہوا میں پھینک دیتی، جہاں بلّے سے اُسے مارا جاتا تھا، اور قیافہ شناسی وغیرہ شامل تھے۔ کھلی ہوا میں کھیلے جانے والے کھیلوں میں شکار، رتھوں کی دوڑ، تیر اندازی اور گھونسے بازی کے مقابلے، کُشتیاں، سنگ ریزوں سے نشانہ بازی اور بناوٹی ہل سے زمین جوتنے کی نقالی کرنا وغیرہ بہت مقبول تفریحات تھیں۔ عظیم الشان تفریحی جلسے منعقد ہوتے تھے، مثلاً اُتسَو، سماج، اور دھار، جن میں نہ صرف لوگوں کی دِل بستگی اور تفننِ طبع کا سامان فراہم کیا جاتا تھا، بلکہ لذیذ و نفیس کھانوں اور مشروبات و مسکرات سے لوگوں کی تواضع کی جاتی تھی۔ یہ انتظامات اکثر راجہ کی طرف سے کئے جاتے تھے۔"[۳]

---

[۳] آر۔سی۔ مجمدار: "ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پی پل، دا ایج آف دا امپیریل یونٹی" باب ۲۱، فصل ۹۔

اشوک کے زمانے کے بہت سے کتبے غاروں میں سے دریافت ہوئے ہیں جو اُس عہد کے رسم و رواج اور رہن سہن پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ ایک کتبہ میں جو براہمی زبان میں ہے اور رام گڈھ کی پہاڑی کے ایک غار میں سے ملا ہے، تحریر ہے: "موسم بہار کی بھرپور چاندنی میں جب جھولے کا تیوہار (وسنتی) منایا جاتا ہے، اور صحبت نشاط و نغمہ گرم ہوتی ہے تو لوگوں کی گردنیں چنبیلی کے پھولوں کے موٹے موٹے ہاروں سے لدی ہوتی ہیں۔" غالباً اس سے مراد "ہولی" کے تیوہار سے ہے جس میں غار کے اندر ناٹک کھیلے جاتے تھے۔ یہ غار ناٹک کے نمونے کا بنایا گیا ہے، اور ناٹک کا جو طرز تیسری صدی ق۔م۔ میں رائج تھا اُس کے مطابق اس میں تمام انتظامات موجود ہیں۔

رام گڈھ کی پہاڑی کے ایک دوسرے غار میں جو تیسری صدی ق۔م۔ ہی کا ہے، تحریر ہے: "یہ آرام گاہ لڑکیوں کے لئے سُتنُوکا نامی ایک دیوداسی نے بنائی۔" یہ لڑکیاں جن کا ذکر اُس میں کیا گیا ہے ناٹک کرنے والی لڑکیاں تھیں۔ اِس غار میں مصوری کے نمونے بھی ہیں جن میں سے اکثر مسخ ہو چکے ہیں لیکن باقیات الصالحات سے پتہ چلتا ہے کہ اُن میں ہاتھی کے جلوس کی، برہنہ مردوں اور عورتوں کی، پرندوں، جانوروں اور رتھوں کی تصویریں ہیں جنھیں گھوڑے کھینچتے تھے۔ اشوک کے زمانے کے کتبے اور دات سایَن کی کام سُوتر پتہ دیتی ہیں کہ لوگ بڑے زندہ دل تھے اور زندگی کی مسرتوں اور رنگینیوں سے بے گانہ نہ تھے۔ مذہبی رقص، موسیقی اور مسکرات کے استعمال نے ایسی جذباتیت پیدا کر دی جس نے سماج میں رنگینیاں بھر دیں اور زندگی کو زندگی بنا دیا۔

مندرجۂ بالا بیانات سے واضح ہے کہ قدیم ہندوستان میں موسیقی، ناٹک، اور رقص لوگوں کے تفریح و تفنن کا خاص ذریعہ تھے۔ لیکن اہل ہند نے اِن تفریحی مشاغل کو باقاعدہ فن کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ ماہرین فن نے اُن کی فنی تفصیلات اور جزئیات کو باقاعدہ ترتیب دیا اور بعض نے اُن پر کتابیں بھی لکھیں جو دنیا کے فنی ادب میں گراں قدر اضافہ اور فنون لطیفہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

موسیقی کا وجود ہندوستان کے ماضی بعید میں بھی ملتا ہے جب "نارَد"، "بھرت"، "کالی ناتھ"، اور "ہنومان" موسیقی کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اِس کے بعد ہر عہد اور ہر زمانے میں تواتر اور تسلسل کے ساتھ لوگوں کی والہانہ دلچسپی اس فن کیساتھ رہی۔ سمرتیوں میں سرگم (سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی) کا ذکر ملتا ہے۔ سمدرگپت (۳۳۵ء۔ ۳۸۰ء) خود ایک بڑا شاعر اور ماہر موسیقی تھا۔ سمدرگپت ہی کے ایک سکہ میں اُسے ہاتھ میں وینا (بین) لئے کرسی پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا ہے۔ کالجی کے راجہ مہندر پلاوہ (۶۰۰ء) کے ایک کتبے میں راگ راگنیوں کی تقسیم کی گئی ہے۔ اِس میں سات راگ قائم کئے گئے ہیں جو موسیقی میں کلاسکی درجہ رکھتے ہیں۔ مہندر پلاوہ نے موسیقی پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا۔ مہندر پلاوہ اُس عہد کے عظیم اُستاد اور ماہر موسیقی، رُودر اچاریہ کا شاگرد تھا۔

موسیقی کی طرح اہل ہند رقص سے بھی والہانہ شغف رکھتے تھے۔ باقاعدہ فن کی حیثیت سے رقص کی ابتدا بھی پانچویں صدی ق۔م۔ سے پہلے ہو چکی تھی، کیونکہ جس زمانے میں نارَد، بھرت اور ہنومان وغیرہ موسیقی کی تعلیم دیتے تھے، اُسی زمانے میں شلالی اور کرشاشو ناٹیہ (رقص) کی تربیت دیتے تھے۔ اِن دونوں کو رقص کے دو علیحدہ علیحدہ مکتبوں کا بانی مانا جاتا ہے۔ ناچ کے ساتھ ہمیشہ گانا بھی ہوتا تھا جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ پانینی نے ایک نٹ سوتر کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس زمانے میں رقص پر کتابیں موجود تھیں۔ رقص مذہبی بھی ہوتا تھا اور غیر مذہبی بھی، لیکن دونوں قسم کے رقص میں رنگ نرتک (ناچنے والے) مرد ہوں یا عورت، رقص کے وقت خاص قسم کی پوشاک پہنتے تھے۔

رقص کا یہ انداز آگے چل کر ادبی ڈرامے کی بنیاد ثابت ہوا۔ ناٹک اور ڈرامے باقاعدہ لکھے اور کھیلے جانے لگے۔ ڈرامہ لکھنے والوں میں آشوگھوش (پہلی صدی عیسوی)، بھاس،

(دوسری ص۔ ع)، اور کالی داس (چوتھی ص۔ ع) کے بلند پایہ ڈرامہ نگار گذرے ہیں۔ بدھ مذہب کی ایک کتاب اودان سٹک میں، جو دوسری صدی عیسوی کی تخلیق ہے، ایک ڈرامے کا ذکر ہے جو جنوبی ہند کے کلاکاروں نے شوبھاوتی کے راجہ کے سامنے پیش کیا تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں ناٹک کلا پر ایک جامع کتاب ناٹیہ شاستر لکھی گئی جو بھرت کی تصنیف [۴] ہے۔ ناٹک کلا پر یہ کتاب "قاموس" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس میں قدیم ہندوستان کے اسٹیج اور اس کی ٹکنیک کی جزئیات بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

تھیٹر (منڈوا) کس قسم کا ہونا چاہیئے، اُس کی لمبائی چوڑائی کتنی رکھی جائے، سامعین کے بیٹھنے کی جگہ (آڈی ٹوریم) اور اسٹیج کس طرح بنایا جائے، اُن کی لمبائی چوڑائی کتنی ہونی چاہیئے وغیرہ موضوعات پر اُس میں تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بھرت اسٹیجوں کو شیروں، ہاتھیوں، پہاڑوں، غاروں، شہروں اور پھولوں کی تصویروں سے سجانے پر زور دیتا ہے۔ اُس کے مجوزہ نقشے میں نشست کا انتظام سلسلہ وار زینوں میں رکھا گیا ہے جنھیں اینٹوں اور لکڑی سے بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اِس تھیٹر میں ایک ہزار آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ تھیٹر کے مشرقی حصے میں شاہی خاندان کے افراد کے لئے نشست کا انتظام رکھا گیا ہے۔ برہمن، علمار وفضلار کی جگہ جنوب کی جانب ہے اور سرکاری ملازمین وغیرہ کے لئے اسٹیج کے قریب شمال میں۔

ناٹک پر دوسری کتاب ناٹیہ درپن لکھی گئی جس کی تصنیف رام چندر اور گُن چندر نامی دو مصنفوں سے منسوب ہے [۵]۔ اس کا موضوع ایکٹنگ یا کلاکاری ہے۔ اس میں مختلف جذبات، خیالات، اور احساسات کو مختلف اعضائے بدن کی مختلف حرکات سے ظاہر کرنے کے طریقوں سے بحث کی گئی ہے۔ رقص اور موسیقی ڈرامے کے ضروری اجزا رہے جیسے کہ آج تک ہیں، اور اُن میں بھی مُدرون (اشاروں یا حرکات وسکنات) کے ذریعہ جذبات و احساساتِ باطنی کی عکاسی کی جاتی تھی، جسے آج کل کی اصطلاح میں ہم نِرتَ کہتے ہیں۔ اِس کتاب میں نِرتَ کے متعلق بھی ضروری ہدایات موجود ہیں۔ کتاب میں کچھ ممنوعات کا بھی ذکر ہے — مثلاً موت، جنگ، اور آرتیوں کے مناظر کو معیوب قرار دیا گیا ہے۔

سکندریہ کے ایک یونانی جہاز راں کوزماس [۶] (۵۰۰ء) نے قدیم ہندوستان کے راجاؤں کی بہت سی دوسری تفریحات کے علاوہ ہاتھیوں کی کشتی کی تفصیلات بیان کی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں۔ وہ لکھتا ہے: "راجہ کی تفریح کے لئے ہاتھیوں کی لڑائی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ لوگ دونوں ہاتھیوں کے درمیان دو شہتیر سیدھے کھڑے کرتے ہیں جو ہاتھیوں کے سینہ تک پہنچتے ہیں، اور اُن شہتیروں کے بالائی سِروں کو ایک اور لٹھے سے مضبوط باندھ دیتے ہیں۔ بہت سے آدمیوں کو اس کام پر تعینات کیا جاتا ہے کہ وہ ہاتھیوں کو تماشائیوں کے نزدیک نہ آنے دیں، اور دوسری طرف ہاتھیوں کو ایک دوسرے سے مقابلہ پر اکساتے بھی رہیں۔ اِس طرح دونوں ہاتھی اپنی سونڈ سے ایک دوسرے کو ڈھکیلنے اور مات دینے کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تک کہ اُن میں سے ایک دَب کر ہار مان لیتا ہے [۷]۔"

اِس کے بعد، تقریباً ساتویں صدی کے مصوری نمونوں میں جو گوالیار کے قریب باغ نامی گاؤں کے غاروں میں اُنسویں صدی عیسوی تک باقی رہے، ہاتھیوں کے جلوسوں، شہسواروں، اور روزمرہ زندگی کے واقعات کی تصویریں بہت دلچسپ و اہم ہیں۔ اِن تصویروں میں

---

[۴] مختلف مورخین نے دوسری صدی ق۔م۔ سے لے کر تیسری ص۔ ع تک اس کتاب کی تصنیف کے بارے میں مختلف تاریخوں کا تعین کیا ہے لیکن اے۔ ایم۔ ہنڈیل نے کیتھ کی سند پر تیسری ص۔ ع۔ قرار دی ہے (ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل، دا ایج آف دا امپیریل یونٹی۔ باب ۱۹ فصل ۶ ص ۲۷۰)

[۵] اس کی تصنیف کے زمانے کا پتہ نہ لگ سکا۔

[۶] COSMOS INDICOPLEUSTES

[۷] پروفیسر سری نواس آینگر: ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا۔

ناچ رنگ کے مرقعے ہیں، رقص کرتی ہوئی عورتوں کی تصویریں ہیں جو لہراتی ہوئی ساری کے نیچے دھاری دار پاجامے اور لمبی یا منڈی آستینوں کی چولیوں میں ملبوس ہیں۔ دوسری عورتیں پورا لباس پہنے ہیں، یا نیم عریاں حالت میں لکڑی کی چھڑی (ڈانڈ) لئے مردنگ اور تال (مجیرا) بجاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ یہ سب چیزیں ہمارے اس زمانے کے کھیل تماشوں سے کافی مشابہت رکھتی ہیں۔ ایک دوسری تصویر میں جو "ایک ایسے رقص کا مرقع پیش کرتی ہے جس میں مرد بھی حصہ لیتے ہیں، رقص کے ترنم اور تال کو خطوط اور اشکال میں گندھے ہوئے ایک خوبصورت ہار کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔"

آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر یا نویں صدی عیسوی کے اوائل میں جاحظ نامی عالم نے (وفات: ۸۳۸ء) جو بصرہ کا ساکن اور بے شمار کتابوں کا مصنف تھا، اپنے ایک رسالہ میں اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ دنیا کی گوری اور کالی قوموں میں کون افضل ہے۔ اس نے آخر میں اپنا فیصلہ کالی قوموں کے حق میں دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

"...... لیکن ہندوستان کے باشندے، تو ہم نے اُن کو پایا کہ ...... شطرنج کے وہ موجد ہیں، جو ذہانت اور سوچ کا بہترین کھیل ہے...... اُن کی موسیقی بھی دل پسند ہے۔ اُن کے ایک ساز کا نام کنکلہ (اک تارہ) ہے جو کدو پر ایک تار کو تان کر بجاتے ہیں اور جو ستار کے تاروں اور جھانجھ کا کام دیتا ہے۔ اُن کے یہاں ہر قسم کا ناچ بھی ہے۔"[۹]

ابو القاسم عبید اللہ، المعروف بہ ابن خرداذبہ (۸۲۰ء - ۹۱۲ء) جو پارسی تھا اور بعد میں مسلمان ہو گیا تھا، نویں صدی عیسوی کے اواخر میں راشٹر کوٹ کے راجہ بلہار کے زمانے میں ہندوستان آیا۔ یہ موسیقی اور کھیلوں سے بھی شغف رکھتا تھا۔ اُس نے ہندوستان کے سماج کو سات طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے، ساتواں طبقہ لاہود، کا ہے یعنی ناچنے گانے والوں اور شعبدہ بازوں کا، جن کی "عورتیں آرائش اور بناؤ سنگار کی، اور مرد ایسی تفریحات اور کھیلوں کے شوقین ہیں جن میں بڑی مشق اور مہارت کی ضرورت پیش آتی ہے۔"

جاحظ کے بیان سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شطرنج کا موجد جس نے آج بین الاقوامی مقبولیت حاصل کرلی ہے، ہندوستان ہے۔ صاحب بہار عجم نے لکھا ہے: "رشیدی کہتا ہے کہ یہ لفظ (شطرنج) ہندی معرب ہے اور اُس کی اصل 'چترنگ' ہے جو 'چتر' اور 'انگ' سے مرکب ہے۔ 'چتر' کے معنی ہیں چار، اور 'انگ' کے معنی ہیں عضو، جس کا مجازاً اطلاق رکن پر کرتے ہیں یعنی وہ چیز جو چار رکن رکھتی ہے۔ اور ارکان اس بازی کے فیل و اسپ و رخ و پیادہ ہیں۔" لیکن زیادہ قرین عقل بات یہ ہے کہ "چترنگ" سنسکرت لفظ ہے اور "چتر" اور "انگ" سے مرکب ہے۔ "چتر" بمعنی چار، اور "انگ" بمعنی حصہ یا فوجی ڈویژن۔ "چترنگ" کے لغوی معنی "اُس فوج کے ہیں جس میں ہاتھیوں، گھوڑوں، رتھوں، اور پیادوں پر مشتمل چار ڈویژن ہوتی ہیں۔" اس لئے عرف عام میں اُس کھیل کو جس میں ہاتھی، گھوڑے، رتھ (رخ) اور پیادے ہوتے ہیں "چترنگ" کہنے لگے۔ اسی کا عربوں نے 'چ'، 'ت'، اور 'گ' کو 'ش'، 'ط' اور 'ج' سے بدل کر "شطرنج" نام رکھ دیا۔ اور بعد میں اپنے مزاج اور منشا کے مطابق اُس میں ضروری تبدیلیاں کر دیں۔ اُن کا یہ شطرنج بعد ازاں تمام یورپ میں پھیل گیا اور ہندوستان کے "چترنگ" کو دنیا نے بالکل بھلا دیا۔[۱۰]

شطرنج کے متعلق ایک بڑی دلچسپ روایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک ہندو راجہ نے فارس کے بادشاہ نوشیروانِ عادل

---

۹ پروفیسر سری نواس آینگر: ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا۔ ۹ مولانا سلیمان ندوی۔

۱۰ اگر ہماری آج کل کی کوئی فرم اس قدیم شطرنج کے احیا کا بیڑا اُٹھائے تو ہو سکتا ہے ہمارا یہ قدیم "چترنگ" جدید اور مروجہ شطرنج سے زیادہ دلچسپ ثابت ہو، اور اس سے زیادہ مقبولیت حاصل کرلے۔

(۵۳۱ تا ۵۷۹ء) کے پاس شطرنج کی بساط وغیرہ اور پنچ تنتر کا ایک نسخہ بطور تحفہ کے بھیجے۔ شاہِ فارس کو شک گذرا کہ اہل ہند کی ذہنی برتری کا احساس اِن تحفوں کا اصل محرک ہے' اور ہندوستان کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ تمام معاملاتِ دنیا پر انسانی عقل حاوی ہے۔ چنانچہ نوشیرواں کے وزیر بزرجمہر نے اس کا جواب میں ہندوستانی راجہ کے پاس نرد کا ایک کھیل بھیجا جو ایک پانسے کے ذریعہ کھیلا جاتا ہے جس کا دارومدار کلیتاً اتفاق پر ہے۔

لیکن ہندوستان کی قدیم شطرنج (چترنگ) ہمارے آجکل کی شطرنج سے بہت مختلف تھا۔ آج کل شطرنج دو آدمی کھیلتے ہیں۔ قدیم شطرنج کو چار آدمی کھیلتے تھے اور چالیں اگرچہ ایک پانسے کی مدد سے چلی جاتی تھیں لیکن پانسے کے ہوتے ہوئے بھی اُس میں عقل کو کافی دخل تھا۔ اس قدیم شطرنج کی تفصیلات البیرونی نے ہمارے لئے چھوڑی ہیں جن کا ذکر اس مقام پر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"چار آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر دو پانسوں[1] (کعبتین) کی مدد سے شطرنج کھیلتے ہیں۔ بساط پر اُن کے مہروں کی ترتیب اس طرح ہوتی ہے :-

رُخ	پیادہ			شاہ	فیل	اسپ	رُخ
اسپ	پیادہ			پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ
فیل	پیادہ						
شاہ	پیادہ						
						پیادہ	شاہ
						پیادہ	فیل
پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ			پیادہ	اسپ
رُخ	اسپ	فیل	شاہ			پیادہ	رُخ

"چونکہ ہم لوگ اِس شطرنج سے واقف نہیں ہیں اس لئے جو کچھ میں اُس کے بارے میں جانتا ہوں وہ ذیل میں بیان کرتا ہوں :-

"بساط کے چاروں طرف چار آدمی مربع کی شکل میں بیٹھ جاتے ہیں اور بہ یک وقت دو پانسے (کعبتین) باری باری پھینکتے ہیں۔ پانسہ کے "۵" اور "۶" ظاہر کرنے والے پہلو خالی ہوتے ہیں یا پھر شمار نہیں کئے جاتے۔ اِس صورت میں اگر پانسہ "۵" یا "۶" ظاہر کرتا ہے تو کھلاڑی "۵" کی بجائے "۱" اور "۶" کی بجائے "۴" والی چال چلتا ہے۔ اِن دونوں عددوں کی تبدیلی مندرجۂ ذیل طریقہ پر ہوتی ہے' کیونکہ ان ہندی ہندسوں میں تھوڑی بہت صوری مشابہت پائی جاتی ہے :-

۶ ۵

۴ ۳ ۲ ۱

"اِس میں فرزیں کو بھی شاہ مانا جاتا ہے۔ پانسہ پھینکنے سے جو بھی عدد برآمد ہوتا ہے اس کے مطابق اُس کے مقررہ مُہروں کو حرکت میں لایا جاتا ہے۔ اِس طرح سے کہ :-

"اگر '۱' آئے تو یا تو پیادہ چلے گا یا شاہ۔ اِن دونوں مُہروں کی چال بہرحال وہی ہے جو ہمارے شطرنج میں ہوتی ہے۔ شاہ پٹ جاتا ہے' مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی جگہ چھوڑے۔

"'۲' آئے گا تو رُخ چلے گا۔ اُس کی چال ترچھی ہے' جیسے ہمارے فیل کی ہے۔ لیکن اِس شطرنج کا رُخ صرف تین خانے آگے بڑھ سکتا ہے۔

"'۳' آئے گا تو اسپ چلے گا۔ اور اَسپ کی چال وہی ڈھائی گھر کی عام چال ہے۔

"'۴' آنے پر فیل چلتا ہے۔ یہ سیدھا چلتا ہے' جس طرح ہمارے شطرنج میں رُخ چلتا ہے' بشرطیکہ اُس کے راستے میں کوئی اور مُہرا حائل نہ ہو۔ ایسی صورت میں دوسرے پانسے

(بقیہ مضمون ص ۳۵ پر)

[1] پانسہ کعب کی شکل کا ہڈی کا بنا ہوا ہوتا ہے' جس میں ہر پہلو پر ۱ سے لیکر ۶ تک ہندسے پڑے ہوتے ہیں۔ عربی میں اِسے اسی اعتبار سے کعب کہتے ہیں۔

چین کی مذہبی اقلیتیں

خ ۔ ا

دنیا کے پردے پر ایک ایسا ملک ہے جہاں اس کی اقلیتوں کو نہ سماجی آزادی حاصل ہے نہ ثقافتی اور لسانی آزادی، نہ مذہبی آزادی حاصل ہے نہ اظہار خیال و رائے کی آزادی۔ جہاں عبادت کرنا اور خدا کا نام لینا جرم ہے۔ جہاں آج ہر مذہب کا نام و نشان مٹایا جا رہا ہے، جہاں گھوں، مندروں، مسجدوں اور گرجا گھروں کو مسمار کیا جا رہا ہے، جہاں عالموں اور مذہبی پیشواؤں کو جیلوں میں ٹھونس کر کوڑے لگائے جاتے ہیں اور جہاں مذہبی تہوار منانے، مذہبی رسوم ادا کرنے اور اپنے عقیدوں کا اظہار کرنے پر لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے۔

آپ جانتے ہیں یہ کون سا ملک ہے؟ یہ ہے ہمارا پڑوسی ملک ——— چین۔ یہ وہی چین ہے جس کا ہمارے ملک نے ہر موقع پر ساتھ دیا اور جس نے ایک وقت میں ہمارے آپ کے وطن کی دوستی کا دم بھرا تھا لیکن آج وہی ملک ہمارا دشمن بنا ہوا ہے، اور اکتوبر ۶۲ء میں ہم پر حملہ بھی کر چکا ہے۔

چین کے اس حملے اور اس کے جارحانہ اقدام کا راز اس کی توسیع پسندی اور اس کی ہوس ملک گیری اور مذہب دشمنی ہے۔ چینی کمیونسٹوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب عوام کے لیے افیون ہے اور کمیونسٹ سماج میں لوگوں کو اپنے ماحول کا آقا بنانے کے لیے اس "برائی" کا ختم ہونا لازمی ہے۔ چنانچہ اس "برائی" کو ختم کرنے کے لیے چین کی مذہبی اقلیتیں، خاص طور سے مسلمان، جس ظلم و جور اور دہشت و بربریت کا نشانہ بنائے گئے اس کی کہانی بڑی اندوہناک ہے۔

مذہبی صحیفوں سے جوتے بنائے گئے

کمیونسٹوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد سب سے پہلے تبت کے لاما اور بودھ بھکشو چینیوں کے جبر و استبداد کا شکار ہوئے۔ ان کو گھوں اور وہاروں کو چھوڑنے اور مزدوری کرنے پر مجبور کیا گیا۔ یہ مٹھ اور وہار جہاں مذہبی اور روحانی تعلیم دی جاتی تھی چینی حکام کے دفتر، کارخانے اور اسلحے کے گودام بنا دیے گئے۔ قدیم مورتیاں اور مذہبی آثار برباد کر دیے گئے۔ مذہبی صحیفوں کے اوراق سے جوتوں کے تلے بنوائے گئے، مٹھوں کا بیش قیمت سامان بیچ کر مخالفت کرنے والوں کو کچلنے کے لیے ان چینیوں نے بندوقیں اور گولیاں خریدیں۔ بعد میں یہی حال نیفا کے مٹھوں کا بھی ہوا۔

گردواروں کی توہین اور بیخ کنی

سکھوں کی تعداد چین میں کچھ کم نہ تھی۔ خاصی بڑی تعداد میں وہ وہاں آباد تھے اور مختلف ملازمتوں، پیشوں اور روزگار میں لگے ہوئے تھے۔ بہت سے سکھوں نے چینی عورتوں سے شادی کر لی تھی اور اپنے بال بچوں سمیت وہیں بس گئے تھے۔ ان کے بہت سے گردوارے بھی تھے۔

لیکن اب؟ اب چین میں نہ سکھ ملیں گے نہ گردوارے۔ ان کا بھی وہی حشر ہوا جو تبت کے لاماؤں، بھکشوؤں، مٹھوں اور وہاروں کا ہوا۔ چین میں کمیونسٹ حکومت قائم ہونے کے بعد چینی لیڈروں نے سکھوں

کو نہ صرف نوکریوں سے نکال دیا بلکہ انہیں چین چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا بزرگو سکھوں کی توہین کی گئی۔ کہیں کہیں پر تو کمیونسٹ لیڈروں کے اشارے پر سکھوں کے سر کے بال اور داڑھیاں زبردستی مونڈ دی گئیں۔ گردواروں کی بے حرمتی کی گئی۔ ان میں جانور باندھے گئے۔ گرو گرنتھ صاحب کے اوراق پھاڑ کر ہوا میں منتشر کیے گئے۔ اگر کسی سکھ نے اس زبردستی اور حقارت آمیز سلوک کے خلاف آواز اٹھانا چاہی تو اسے گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

عیسائیت اور عیسائیوں کی درگت

چینیوں کی مذہب کشی کا شکار چین میں بسنے والے عیسائی اور اور پادری بھی ہوئے۔ ایک وقت تھا جب چین میں سیکڑوں گرجا گھر اور لاکھوں عیسائی رہتے۔ لیکن آج وہاں نہ عیسائی دکھائی دیتے ہیں نہ ان کے پادری۔ گرجا گھر بھی گرجا گھر نہیں رہے۔ ان میں سرکاری دفتر کھل گئے ہیں۔ سکھوں کی طرح چینی حکمرانوں نے پادریوں اور عیسائیوں کو بھی چین چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پادریوں پر عوام کو ورغلانے اور انہیں دھوکا دینے کا غلط الزام لگایا گیا بعد پھر جیلوں میں بند کر کے ان پر بھیانک ظلم ڈھائے گئے۔ گرجا گھروں میں نصب جھنڈوں، تصویروں اور ان میں رکھے ہوئے حضرت عیسیٰ کے مجسموں کو توڑ پھوڑ کر چوراہوں پر جلایا گیا۔ عیسائیوں کو عبادت کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اس طرح چین میں عیسائی اور عیسائیت تقریباً ختم ہو گئے۔

اسلام کی بے حرمتی اور مسلمانوں کا استیصال

یوں تو چین کی سبھی مذہبی اقلیتیں چینی لیڈروں کے ظلم و جور کا شکار ہوئیں لیکن سب سے زیادہ اور بھیانک مظالم مسلمانوں پر ڈھائے گئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ چین میں سب سے بڑی مذہبی اقلیت مسلمانوں کی تھی۔ اسی لیے چینی لیڈروں اور حکمرانوں نے اپنے لادینی فلسفہ کو رائج کرنے اور کمیونسٹ مقاصد کو فروغ دینے کے لیے غالباً یہ ضروری سمجھا کہ ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے وہاں کے مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے۔ اس مقصد کے پیش نظر انھوں نے چین کے مسلمانوں پر جو بے پناہ مظالم ڈھائے ہیں اس کی داستان بڑی دل دوز ہے۔

آج چین کے کمیونسٹ رہنما چین میں مسلمانوں کی کل آبادی صرف ایک کروڑ بتلاتے ہیں جب کہ کمیونسٹ نظام سے پہلے چینی مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ پانچ کروڑ بتائی گئی۔ اور واقعی مسلمانوں کی تعداد اب چین میں ایک کروڑ ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ باقی چار کروڑ کیا ہوئے اور اتنی بڑی آبادی کا کیا حشر ہوا۔

دراصل چین میں مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے اور اسلام کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کا سلسلہ کمیونسٹ حکومت کے برسر اقتدار آنے کے بعد ہی سے شروع ہو گیا۔ اس سلسلے میں نئی حکومت کا سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ چین کی تمام مسلم آبادی کو مذہبی اقلیت سے نسلی اقلیت بنا دیا گیا۔ اس مقصد کے لیے چینی مسلمانوں کی قلب ماہیت اور تربیت جدید کے جہاں اور بہت سے طریقے اپنائے گئے وہاں پروپیگنڈے کی مسلسل مہموں سے بھی کام لیا گیا۔ ان مہموں میں سزائیں، ذہنی اور جسمانی اذیتیں، مذہبی تعلیم پر پابندی، شہری اور سماجی حقوق سے محرومی جائداد و املاک کو ضبط کر لینا روا رکھا گیا جس سے مسلمانوں پر یہ اچھی طرح واضح ہو گیا کہ چین میں ان کے لیے عرصۂ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ حالات سے مجبور ہو کر اب سے تقریباً تیرہ چودہ برس پہلے سنکیانگ کے مسلم صوبے سے تقریباً ۹۰ ہزار مسلمان اپنے مویشیوں سمیت دشوار گزار اور برفانی پہاڑوں سے ہوتے ہوئے سنکیانگ سے ہجرت کر گئے۔ چینی فوجوں نے ان کا پیچھا کیا۔ راستے میں ہزاروں مسلمان مر گئے مگر سنکیانگ کوئی واپس نہیں گیا اور مرکھپ کر تین ہزار مسلمان ترکی پہنچ پائے۔ حال میں انھیں مظالم سے تنگ آ کر سنکیانگ کے اور مسلمان بھی ہجرت کر رہے ہیں۔ پتہ چلا ہے اور خود پیکنگ نے بھی تسلیم کیا ہے کہ سنکیانگ صوبے کے ....۵ قازق، ایغور اور ازبک مسلمانوں نے بھاگ کر سوویت یونین میں پناہ لی ہے۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ پیکنگ کے کرتا دھرتا دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان غریب مسلمانوں نے اپنے گھربار کو روسی سرحد پار کی تحریص و ترغیب پر خیرباد کہا ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ لوگ اپنے گھربار، وطن، اپنے معبد اور اپنی عزیز ترین چیزوں کو کسی کی تحریص و ترغیب پر چھوڑ کر ہجرت کر جائیں گے۔ حقیقت یہ کہ سنکیانگ کے مسلمان چینی بربریت اور چینیوں کے دل دوز مظالم کے باعث بھاگنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ اسی طرح کی اطلاعیں لاؤس سے ملنے والی چینی سرحد کے میاؤ قبیلے کے بارے میں بھی موصول ہوئی تھیں۔ روسی اخباروں کے مطابق سنکیانگ کے قبائلیوں کو طلوع صبح سے

غروبِ آفتاب تک زنجیروں میں جکڑے ہوئے کام کرنا پڑتا ہے اور ستم بالائے ستم یہ کہ اُنھیں دن بھر میں صرف ایک پیالہ پانی کا سا شوربا کھانے کو ملتا ہے۔ ان قبائلیوں سے کام لینے کے لیے سنکیانگ میں ایک طرح کے نظربندی کے کیمپ بنے دکھائی دیتے ہیں لیکن چینی جو باتیں بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے' ان نظربندی کے کیمپوں کو مزدوروں کے اصلاحی کیمپ بتاتے ہیں۔

ان کیمپوں میں سنکیانگ کے ان قبائلیوں کو کھُردے لکڑی کے تختوں پر سونا پڑتا ہے اور سردی سے بچاؤ کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں افراد کو مرکزی چین جلاوطن کر دیا گیا ہے تاکہ وہ بھاگ کر روس نہ جا سکیں۔

غرض کمیونسٹ چین میں جو مسلمان رہ گئے ہیں اُن پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں اُنھیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی مہم پورے زور و شور سے جاری ہے ان کے ساتھ انتہائی حقارت اور ذلت کا سلوک کیا جا رہا ہے۔ انھیں جلاوطن کیا جا رہا ہے۔ کنسو صوبے کے تمام مسلمانوں کو نامعلوم علاقوں میں منتقل کر دیا گیا ہے مسلمانوں کی تمام مذہبی درس گاہوں اور مسجدوں کو ضبط کر کے اُن پر تالے چڑھا دیے گئے ہیں یا اُنھیں سیاسی مرکزوں اور کمیونسٹوں کے لادینی فلسفے کے پرچار کیلیے گھروں اور تھیٹروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ صوبہ ہونان کی ۳۰۰' پے کنگ کی ۱۳۶' نان کنگ کی ۲۷ مسجدیں بند کی جا چکی ہیں اور اس طرح مسلمان زیارت گاہوں میں روحانی فیض اور سکون حاصل کرنے اور مسجدوں میں عبادت کرنے سے محروم کر دیے گئے ہیں مسلم مبلغوں اور عالموں کو اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ کرنے کے جرم میں ذہنی اور جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کو نماز جمعہ تک کی اجازت نہیں۔ انھیں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ وہ عید اور بقرعید جیسے اہم تہوار نہیں منا سکتے۔ نماز کا وقت ہوتا ہے تو لاوڈ اسپیکر کے ذریعے مذہب کے خلاف نعرے لگائے جاتے ہیں۔ مسلمان بچوں کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کی ممانعت ہے۔ عربی حروف تہجی سیکھنے اور استعمال کرنے پر یہ کہہ کر پابندی لگا دی گئی ہے کہ عربی حروف تہجی وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے منافی ہیں۔

چینی کمیونسٹوں نے اسلام کی بیخ کنی کے لیے اسی پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ جو زمین پشتہا پشت سے اوقاف اور مسجدوں کی ملکیت تھی اشتراکی نظام معیشت کا حصہ بنا دی گئی ہے۔ یہ مسجد کے اماموں کو ان کی معاش سے محروم کرنے کا بالواسطہ طریقہ تھا جو اختیار کیا گیا۔ اسلام کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی اپنایا گیا کہ اسلامی اسکولوں کو چینی اسکولوں میں ضم کر دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان بچے کمیونسٹ عقائد اور اصولوں سے تو واقف ہوتے ہیں لیکن اسلام کے بارے میں ان کی معلومات نفی کے برابر ہو گئی ہیں۔

مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانے کی ترغیب

چین میں اسلامی شعار کی توہین اور مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنا عام سی بات ہو گئی ہے۔ حد یہ ہے کہ مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانے کی ترغیب دی جاتی ہے جو اُن کے لیے شرعاً حرام ہے۔ سنکیانگ کے ایک روزنامے "سنکیانگ ڈیلی" نے اپنی ایک حالیہ اشاعت میں لکھا ہے کہ مسلمان سور کا گوشت جو نہیں کھاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قدامت پرست اور ذہنی طور پر رجعت پسند ہوتے ہیں۔ اس کمیونسٹ اخبار نے مسلمانوں کو سور کا گوشت کھانے کی ترغیب دلاتے ہوئے لکھا ہے کہ سور ہی ایک ایسا جانور ہے جس کا گوشت چین میں بافراط دستیاب ہے اس لیے مسلمانوں کو اس سے پرہیز نہ کرنا چاہیے۔ اس نے قرآن کی آیتوں اور کمیونسٹ نواز نام نہاد مسلم علما کے اقوال نقل کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کا سور کا گوشت نہ کھانا محض ایک رجعت پسندانہ فعل ہے۔ اخبار مذکور نے مسلمانوں پر زور دیا ہے کہ وہ قدامت پرستی اور رجعت پسندی کو ترک کر کے باشعور بنیں' سیاسیات کا مطالعہ کریں اور وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کو سمجھیں۔ اتحاد اور چین کو نسلی طور پر یک رنگ بنانے کے نام پر مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کی شادی غیر مسلموں اور ہنوں (جو چین کے قدیم نسل سے ہیں) کے ساتھ کریں۔

یہ ہے چین کی مذہبی اقلیتوں اور مسلمانوں کے استحصال' ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے' اُنھیں جبراً کمیونسٹ عقائد کو تسلیم کرنے اور پی کنگ کو اپنا کعبہ مان لینے کے لیے اُن پر ہونے والے آئے دن کے بے پناہ مظالم کی مختصر داستان۔



غزل

ذکاء الدین شایاں

عشق میں کیفیتِ سوزِ تمام آنے تک
اہلِ غم اور جئیں، اُن کا پیام آنے تک

بزم میں کہہ گئی ساقی کی اُچٹتی سی نظر
دل کو روشن تو کرو شعلۂ جام آنے تک

اور شائستہ ابھی ہوگا مزاجِ غمِ دل
تیری خاموش نگاہوں کا سلام آنے تک

ابھی کھل جائے گا ظرفِ مے و مستی کا بھرم
رند ٹھہریں تو ذرا شیشہ و جام آنے تک

جرأتِ عشق لبِ شوق پہ نازاں ہو لے
یہ فسانے ہیں فقط آپ کا نام آنے تک

کس قدر عشق نے تشریحِ تمنّا کی ہے
اُن لبوں پر کوئی مبہم سا کلام آنے تک

ابھی اس دل کو بہت ہونا ہے برباد و خراب
تیری جانب سے محبّت کا پیام آنے تک

دسمبر ۱۹۶۳ء

غزل

اوج یعقوبی

شعر، احساس کی تفصیل ہوا کرتے ہیں
جب زباں کھلتی ہے کچھ زخم کھلا کرتے ہیں

جگمگاتے تھے کبھی نورِ بصیرت سے دماغ
اب فقط جسم اُجالوں میں رہا کرتے ہیں

خود گیا وقت سمجھ لیتی ہے دُنیا اُن کو
جو گئے وقت کو آواز دیا کرتے ہیں

پا شکستہ بھی پہنچ جاتے ہیں منزل پہ، مگر
اُن کو کیا کہیے جو دل توڑ لیا کرتے ہیں

وہ چراغ سرِ منزل ہو کہ شمعِ محفل
اپنے مقصد کے لیے دونوں جلا کرتے ہیں

زیست کا ذکر نہیں موت کا دَم گھٹتا ہے
ایسے ماحول میں ہم سانس لیا کرتے ہیں

کم نہ تھی قیدِ حیات، اُس پہ یہ آدابِ حیات
آدمی جیتے ہیں احسان کیا کرتے ہیں

تنگ ہے وسعتِ امکانِ مداوا ورنہ
ہم بھی ہر درد کو محسوس کیا کرتے ہیں

میں اُنھیں دیکھ رہا ہوں کہ نہیں، اس کے لیے
احتیاطاً وہ مجھے دیکھ لیا کرتے ہیں

شعر تو شعر ہیں، ارزانیِ موضوع نہ پوچھ
لوگ زخموں پہ بھی تنقید کیا کرتے ہیں

اوجؔ ہر شب کو سمجھتے ہیں شبِ آخر ہم
انتظارِ سحر اس طرح کیا کرتے ہیں

اگرہائیز ۱۸۸۵

(افسانہ)

شک کی دیواریں

فیاض رفعت

کاندھے پر ایزل لٹکائے ہوئے وہ رمیش ہی تھا جو اپنی پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتا ہوا مستقل مزاجی کے ساتھ پورٹیکو کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ٹیگور کا کوئی گیت 'جس میں سانجھ کی بیلا' کا ذکر تھا' کانپ رہا تھا۔ آج بھی وہ زندگی کی گت پر رقص کرتے ہوئے گیتوں کو والہانہ انداز میں گنگنانا نہیں بھولا تھا اور درد کی لے پر اُبھرتے ہوئے ٹیگور کے گیت سے لذت حاصل کر رہا تھا۔ اُس کی روح آج بھی پھولوں کی بھینی خوشبو کی طرح تازہ تھی۔ اُس نے حزن میں چھپی ہوئی لذتوں سے ہمیشہ کیف حاصل کیا تھا۔ یہی اس کی انفرادیت تھی اور اُس کی یہ انفرادیت ابھی تک مجروح نہیں ہو سکی تھی۔

رمیش کو تیزی سے پورٹیکو کی سیڑھیوں پر چڑھتا دیکھ کر بلدیو کی پیشانی کی رگیں نمایاں ہوتی گئی تھیں۔ اُس نے نفرت سے اپنے ہونٹ سکوڑ لیے تھے۔ مگر ہمیشہ کی طرح اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے وہ خود کو نفرت کا اظہار کرنے میں مجبور محسوس کر رہا تھا۔ اور پھر اُس نے ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر رمیش کو "ہلو" کہا تھا۔ رمیش نے پرجوش مسرت کے ساتھ اُس کی "ہلو" کا جواب دیتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی تھی اور ماحول کے حسن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ڈاک بنگلہ پہاڑیوں کے دامن میں گھرا ہوا تھا اور ڈیفوڈلز کے پھول بسنت کی آمد آمد کا پتہ دے رہے تھے۔ لونگ اور الائچی کے پیڑوں سے ملی جلی خوشبوئیں اُٹھ رہی تھیں۔ اور پھر وہ بلدیو کے جمالیاتی ذوق کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"بلدیو! تم نے بڑی خوبصورت جگہ تلاش کی ہے۔ مجھے مدھو نے لکھا تھا کہ جگہ بڑی پُرفضا ہے۔ اور اب میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں کہ یہاں کچھ روز اچھے گزر سکیں گے۔ اجنبی ماحول کا اجنبی حسن مجھے شاہکار تصویریں دے سکے گا۔"

"ضرور ضرور۔" بلدیو نے اوپری دل سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمھارے آجانے سے مدھو کا بھی دل لگا رہے گا۔" رمیش طنز کی گہرائی کو نہیں ناپ سکا تھا۔ وہ بس ایک اچھا مصور تھا اور اُس کی تصویریں یاس و غم کی ترجمانی کے بجائے رجائی جذبوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ زندگی کے کریہہ چہرے کو بھی اُس نے حسن کی دل آویزی بخشی تھی اور اُسی حسن کی تلاش میں اُس کی روح بھٹک رہی تھی۔ یہی اضطراب اُسے شاہکار دے رہا تھا ورنہ شاید وہ کبھی کا مصوری ترک کر چکا ہوتا۔

بلدیو اس کی آمد پر حیران تھا اور اس انکشاف پر ادھ جلی لکڑی کی طرح سُلگ کر رہ گیا تھا کہ بلدیو، مدھو کی دعوت پر یہاں آیا ہے مگر وہ شعور کے اندھیروں میں بھٹکنے کے باعث اپنی جلن کے اظہار میں ناکام رہا تھا۔ اُس نے خاموشی سے رمیش کو گہری نظروں سے دیکھا۔ بلدیو کو اس طرح گھورتے دیکھ کر رمیش نے سگرٹ کے ادھ جلے ٹکڑے کو پیروں سے مسلتے ہوئے کہا۔

"بلدیو! شاید اس طرح میرے اچانک اور بغیر اطلاع دیے آجانے پر تم اپنی خوشی کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ تلاش کر رہے ہو۔ بہرحال دل کی بات سمجھانے کے لیے لفظوں کا آہنگ ضروری نہیں۔ میں تمھاری مسرت کا احساس کر رہا ہوں۔ اچھا چھوڑ دو۔" اُس نے بلدیو کو شانوں سے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "پہلے مجھے باتھ روم دکھاؤ۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ اور ہاں مدھو نظر نہیں آرہی ہے!"

"اندر چلو۔ مدھو ذرا گھومنے گئی ہے۔ آتی ہی ہوگی۔" بلدیو نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ مگر اُس کے دل میں رمیش کا جملہ تیر کی طرح

چُبھ گیا تھا ۔۔۔ "دل کی بات سمجھانے کے لیے لفظوں کا آہنگ ضروری نہیں۔"

ڈرائنگ روم میں بیٹھا بلدیو سگار کی تلخی میں ڈوبا ہوا ماضی کے لہریے دار آنچل پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اُس کے کانوں میں رمیش کے گیت کی آواز سیسے کی طرح پگھل رہی تھی۔ غسل خانے سے آتی ہوئی گیت کی یہ آواز اور پانی کی رِم جھم سرگم کی طرح اُبل رہی تھی۔

میرے محبوب! پریم کی مالا سچے موتیوں سے گوندھی گئی ہے
یہ موتی سمندر کی تہہ سے نکالے گئے ہیں
وہ بوندیں کتنی قیمتی تھیں ۔۔۔ جنھوں نے
موتیوں کا روپ دھارن کر لیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نذر الاسلام کے بنگلہ گیت کا کچھ ایسا ہی مفہوم تھا۔ بلدیو نے سگار کو توڑ کر ایش ٹرے میں ٹھونس دیا اور نذر الاسلام کے اس گیت کے بارے میں جسے رمیش گنگنا رہا تھا سوچنے لگا اور پھر ماضی زندہ ہو کر اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

اُن دنوں وہ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے بعد فائن آرٹس کے ڈپلوما کلاس کا طالب علم تھا۔ تہذیبی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا سمپوزیم اور مشاعرے منعقد کرانا، اسٹیج ڈرامے پیش کرنا اُس کی زندگی تھے۔ اداکاری میں وہ ماہر تھا۔ جذبات کے خوبصورت اظہار پر اُسے قدرت حاصل تھی۔ اور اُنھیں دنوں اُس کی نظر مدھو پر پڑی تھی۔ اشرافیہ طبقہ کی اسنوب (SNOB) لڑکی جو لڑکوں سے ملنے جُلنے کے باوجود اُن کے وجود کو سوالیہ نشان کبھی نہیں بننے دیتی تھی۔ بلدیو نے اپنے ترکش کے سارے تیر خالی کر دیے۔ اُس نے مدھو کو خود کے ڈائرکٹ کیے ہوئے ڈراموں میں شرکت کی دعوت دی۔ مگر بدلے میں تعریفی اور توصیفی کلمات کے بجائے 'چیپ' 'بوگس' 'نان سنس' 'سینسیشنل (SENSATIONAL)' 'اِرریلیونٹ' (IRRELEVANT) کے الفاظ اپنی سماعت سے ٹکراتے ہوئے نظر آئے۔ مدھو نے اُس کے ایک رومانی ڈرامہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا۔ "مجھے ڈراموں سے بیر نہیں۔ حسن و عشق کے اظہار کو بھی بُرا نہیں سمجھتی، مگر آپ کے ڈرامہ سے مجھے سخت اختلاف ہے۔ سستی جذباتیت، غیر شائستہ رومان، بے ڈھنگی اور غیر تاثراتی اداکاری۔ کچھ بھی نہیں ہے آپ کے ڈرامہ میں۔ کیا آپ کوئی ایسا ڈرامہ اسٹیج نہیں کر سکتے جس میں ہومر کی اوڈیسی کا رنگ جھلکے؟ کیا آپ نے کالی داس کو نہیں پڑھا؟ ۔۔۔ مارلو کے ڈرامے دیکھے ہیں؟ کیا آپ نیفو کے نغموں کی ابدیت سے نہیں واقف؟ کیا آپ برنارڈ شا اور ہنرک ابسن سے استفادہ نہیں کر سکتے؟۔"

اور اُسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ شکست کے احساس نے اُسے بلبلا دیا تھا۔ اس کے برعکس مدھو، رمیش کی تصویروں کی قائل تھی۔ اُسے رمیش کی تصویروں میں رینالڈس اور پکاسو کی روح نظر آتی تھی۔ سنئے تھانوں کا پتہ ملتا تھا۔ اُس نے رمیش کو ایک عظیم مصوّر مان لیا تھا۔ وہ اکثر خالی وقت میں اُس کے ساتھ لائبریری کیفے ٹیریا میں بیٹھی ہوئی اس کی تصویروں پر ہمت افزا تبصرے کرتے ہوئے دیکھی گئی تھی۔

بلدیو کو شکست کا احساس تھا۔ اُس کی انا کو پہلی بار ٹھیس پہنچی تھی۔ ورنہ کم ہی ایسا ہوا تھا کہ اُس نے کسی لڑکی پر نگاہ التفات ڈالی ہو اور وہ اُس کی طرف مائل نہ ہوئی ہو۔ البتہ مدھو پہلی لڑکی تھی جس نے اُس کی شخصیت کے طلسم کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مگر اُس نے زندگی میں کبھی شکست کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اُس نے شیلے کی مشہور نظم "پرومیتھیس" کے مرکزی خیال پر ایک ڈرامہ ترتیب دینے کا فیصلہ کیا۔ پس منظر کی تصویریں بنانے کے لیے رمیش کو دعوت دی۔ اور پھر مجبوراً مدھو اُس ڈرامہ کی ہیروئن بن گئی۔ بلدیو کے اُکسانے پر رمیش نے مدھو کو مجبور کیا تھا اور مدھو نے اُس کے مشورہ کا احترام کرتے ہوئے ڈرامہ کی ہیروئن بننا منظور کر لیا تھا۔ اور ڈرامہ کا ہیرو تھا بلدیو۔ اپنے فن کا ماہر۔ جسے چہرہ کے اُتار چڑھاؤ میں مہارت حاصل تھی۔ جو جذباتی اداکاری کا دیوتا مانا جاتا تھا۔ اور مدھو ایک لڑکی تھی۔ ایک نازک دل کی لڑکی۔ جس کے مٹی کی طرح گیلے دل پر جذباتی مکالموں کے نقش بٹھانے میں بلدیو کامیاب ہو گیا تھا۔ اور آناً فاناً یہ مکالمے حقیقت کا روپ دھار گئے تھے۔

رمیش اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلہ میں کچھ دنوں کے لیے

لندن چلا گیا تھا۔ اس عرصہ میں بلدیو اپنی شخصیت کا جادو جگانے میں کامیاب ہوگیا اور مدھو کے ساتھ اُس کی شادی ہوگئی۔ مگر اس کے باوجود مدھو کے دل میں رمیش کے لیے جگہ تھی۔ وہ ایک عظیم مصور کی حیثیت سے اُس کی پرستش کرتی تھی اور یہ پرستش ہنوز قائم تھی۔ لندن سے واپس آنے پر رمیش سے پہلے جیسی گرم جوشی سے ملی تھی۔ رمیش نے بھی اُسی جوش و خروش کے ساتھ مدھو کو اپنی تصویروں کے فنی لوازمات کے بارے میں بتلایا تھا اور اُس کی شادی کی خبر سُن کر اُس نے بچوں کی طرح چہک کر مبارک باد دی تھی۔ درحقیقت وہ مدھو کو اپنی تصویروں کا مخلص ناقد سمجھتا تھا اور اُس کے جمالیاتی ذوق کا قائل تھا۔ مدھو کے بارے میں اس نے کبھی جنسی نقطۂ نظر سے نہیں سوچا تھا۔ وہ ایک مکمل حسن تھی اور وہ حسن کا خالق، حسن کا پجاری۔ اس پوجا میں تقدس کا پہلو شامل تھا۔ تلذذ اور گندگی نہیں۔

بلدیو اپنی بہت ساری خوبیوں کے باوجود ایک عامیانہ ذہن کے انسان کی طرح غلط فہمیوں کے افسانوں پر یقین رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رمیش اور مدھو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور یہ خیال اس کے لیے اذیت ناک تھا۔ اس تصور کے ساتھ ہی اُسے اپنی شخصیت کے آئینہ خانہ میں بال پڑتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اور انھیں اذیت ناک اور سیہہ کے کانٹوں کی طرح چبھتے ہوئے خیالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ ڈیرہ غازی خاں کے غیر معروف پہاڑی سلسلوں میں چلا آیا تھا —— رمیش کے سایہ سے بھی بہت دور —— مگر اچانک اور غیر متوقع طور پر رمیش یہاں بھی آن ٹپکا تھا۔ اور یہ بات اُس کے لیے اور بھی روح فرسا تھی کہ وہ یہاں مدھو ہی کی دعوت پر آیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی مدھو گھوم کر آ گئی اور رمیش کو دیکھ کر مسرت سے امنڈتی ہوئی گھٹاؤں کی طرح برس پڑی۔ اُس کے لیے خود بڑے چاؤ سے کھانا بنایا۔ ڈائیننگ ٹیبل پر وہ اسے بار بار اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کو کھانے کے لیے مجبور کر رہی تھی اور بلدیو اندر ہی اندر سُلگ رہا تھا۔ مگر اس کا مجرم شعور بولنے سے قاصر تھا اور وہ خود کو پیدائیشی گونگا محسوس کر رہا تھا۔

پھر روزانہ نت نئی تفریحوں کے پروگرام بننے لگے۔ وادی قہقہوں کا مسکن بن گئی۔ جنگلی پھول انگڑائیاں لینے لگے۔ آبشار نغموں کی طرح بکھر گئے۔ الائچی اور لونگ کے درخت اپنی خوشبوئیں بکھیرتے رہے اور رمیش تصویریں بناتا رہا۔ فطرت کے لازوال حسن کو پہاڑیوں کے پس منظر میں ایزل کا قیدی بناتا رہا۔ مدھو اُس کا موڈل بنتی رہی اور فن کے بُرش کی ہر نئی جنبش تخلیق کے کنول کھلاتی رہی۔ بلدیو کے اندھیرے شعور میں اماوس کی راتیں ناچنے لگیں۔ وہ اندر ہی اندر تنور کی طرح سُلگتا رہا۔ اکثر مدھو اور رمیش اُسے اپنے ساتھ تفریح کے لیے مدعو کرتے مگر وہ ٹال جاتا۔ اور پھر ایک روز تنور کی آگ بھڑک اٹھی۔ بلدیو سے یہ تپش برداشت نہ ہو سکی۔ مدھو صبح سے رمیش کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔ شام کی شرمئی رنگت اندھیروں میں بدلتی جا رہی تھی مگر رمیش اور مدھو واپس نہیں لوٹے تھے۔ اور پھر رات نے اپنا آنچل پھیلا دیا۔ آسمان تاریک ہوتا گیا اور مدھو نہیں آئی۔ اور پھر جیسے اُس کی سماعت سے مدھو اور رمیش کے قہقہے ٹکرانے لگے۔ اُسے لگا جیسے تاریک آسمان زمین پر اُتر آیا ہے اور اُس کی تاریکی میں وہ کھو گیا ہے۔ اُس نے ذہنی کرب کی حالت میں الاسٹر اپنے کندھوں پر ڈالا۔ دراز سے پسٹل نکالا اور اُسے لوڈ کر لیا۔ آج وہ اپنے ذہنی انتشار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر ڈالنا چاہتا تھا۔ رمیش اور مدھو کو قتل کر کے وہ اپنی اندھیروں میں لپٹی ہوئی روح کو اس صدیوں کی قید سے آزاد کرا لینا چاہتا تھا۔

وہ اونچی نیچی پہاڑیوں پر ڈگمگاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ ذہنی تشنج کی بنا پر اُسے دماغ کی نلیاں پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور پسٹل پر اُس کی انگلیوں کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک وہ صلیب نما پتھر سے ٹکرایا اور پھر اُسے محسوس ہوا جیسے کوئی عورت بڑی درد بھری آواز میں بین کر رہی ہو۔ اس نے اپنے احساس کو واہمہ پر محمول کیا۔ مگر نہیں۔ یقیناً وہ بھرائی ہوئی آواز کسی عورت ہی کی تھی جو دھیرے دھیرے تیز ہوتی جا رہی تھی۔

"تم قاتل ہو۔ تم قاتل ہو۔ میں تمھیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ تم اُس بچہ کے بھی قاتل ہو جو میری کوکھ میں میرے خون سے پرورش پا رہا تھا اور جو تمھارا ہی ایک وجود تھا۔ شک کی زنجیروں کے قیدی بن کر تم نے مجھے قتل کر ڈالا۔ میں تمھیں معاف نہیں کر سکتی۔ تم قاتل۔ تم قاتل ہو۔"

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۳ پر)

برف اور بارش میں
پیغام رسانی

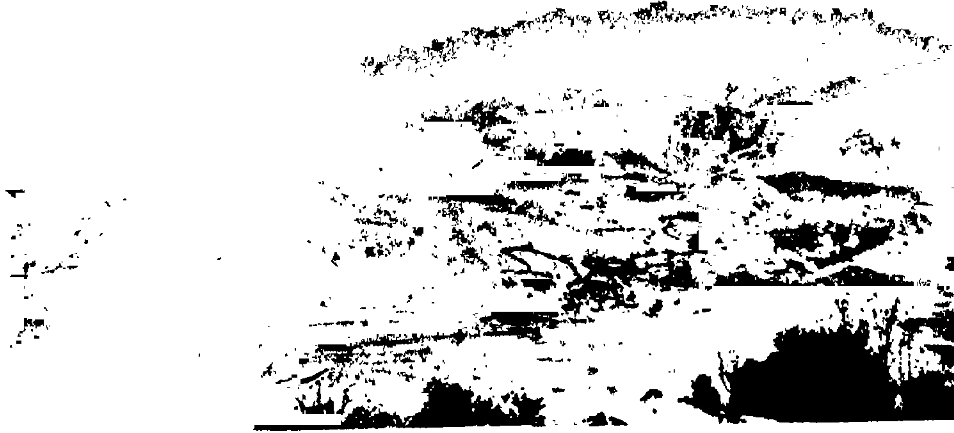
ہماری شمالی سرحد پر اونچے اونچے پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور گہری گھاٹیوں کی وجہ سے سلسلۂ مواصلات قائم رکھنا معمولی بات نہیں ہے کبھی زیادہ برف کا ڈھیر لگ جاتا ہے اور کبھی تیز و تند بارش سلسلۂ مواصلات درہم برہم کر دینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر موسم چاہے جتنا ناسازگار ہو ہماری فوج کی سگنلز کور کے بہادر جوان چوبیس گھنٹے لگاتار کام کرتے رہتے ہیں اور سلسلۂ مواصلات جو فوج کے لیے ناگزیر ہے منقطع نہیں ہونے دیتے۔

برف باری ہو چکی ہے مگر لائن خراب نہیں ہو سکتی

گہری گھاٹیوں کے آر پار تار اور ٹیلیفون کی لائنیں بچھائی جا رہی ہیں

"مشرقی مورچے پر کسی جگہ" چٹانوں کو اڑا کر سڑک بنائی جا رہی ہے





بھوڑا گڑھ سے

اتر پردیش میں ہمالیہ ک

اتر پردیش کا پہاڑی علاقہ جو کوہستان ہمالہ کے دامن میں واقع ہے گرمی اور جاڑے دونوں زمانا
ہو جاتا ہے اور وہاں سے اگر ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کا کوئی نظارہ کرے تو وہ اور بھی حسین نظر آ
جلال کا بھی ایک نمونہ پیش کرتی ہیں اور ایسے بہت سے لوگ ہیں جو برف باری کے مناظر دیکھ

بڑی

بچے برف کی گیند کھیل رہے ہیں





سرد انگ سے

ا۴

ش چوٹیوں کے نظارے

بیا درحسین منظر پیش کرتا ہے۔ جاڑے میں یہ سارا خطہ قریب قریب برف پوش
ـنے کے ساتھ ساتھ برف سے ڈھکی ہوئی یہ سر بہ فلک چوٹیاں فطرت کے جاہ د
ں میں ان علاقوں کی سیر کرتے ہیں۔

نینی تال ایک برفانی منظر گورنر بلیہ اسپتال سے



خاموش پاسباں

شاید یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہے
کہ پچھلے سال ۲۰ اکتوبر کو جب
چین نے ہندستان پر حملہ کیا تو
دوسرے دن رات ختم ہونے سے
پہلے پہلے ہندستانی بحری بیڑے کے
جہاز اپنے ساحلوں اور بندرگاہوں
کی حفاظت کے لیے اپنے لنگر اٹھائے
تیار کھڑے تھے۔ اس دن سے اب
تک بحری جہاز خلیج بنگال سے بحر
عرب تک پھیلے ہوئے ہندستانی ساحل
اور جزیروں کی دن رات نگہبانی کر رہے
ہیں جو عوام کو ان جہازوں کی خبر
کا علم ہو یا نہ ہو لیکن دشمن اس کا
ضرور ہے جو ۱۲ مہینوں سے اس
مسلسل ادائیگی فرض کو برابر
اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں
اور یہ گواہ ہیں
آسماں اور سمندر!

توارد اور سرقہ

وجاہت علی سندیلوی

فن شعر گوئی میں توارد اس حسن اتفاق کو کہتے ہیں جب ایک ہی مضمون کو ایک سے زائد شعرا ایک ہی صورت سے یا بہت معمولی فرق کے ساتھ نظم کر دیں اور مضمون کی عمومیت یا شعرا کی حیثیت یا کسی اور معقول وجہ کی بنا پر یہ احتمال نہ ہو کہ اس کو کسی بھی شاعر نے ارادتاً دوسرے سے اخذ کیا ہو۔ مثلاً

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (غالب)

کہتے ہیں آج ذوقؔ جہاں سے گزر گیا　　کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے (ذوق)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا (غالب)

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں　　کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی (مومن)

علامہ تفتازانی مطول میں رقم طراز ہیں: "اگر کوئی بہ نگاہ تفتیش دیکھے تو شاید ہی کسی شاعر کو توارد مضامین سے محفوظ پائے اس لیے کہ تمام معلومات پر حاوی ہونا خاصۂ علم باری ہے۔ ہے یوں کہ خامۂ معنی نگار اندھیرے میں تیر مارتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ اس کا نشانہ کوئی مرغِ آزاد ہے یا طائرِ پر بستہ۔"

سرقے کے معنی ہیں چوری کے' جس کی بنیاد بدنیتی پر ہوتی ہے۔ شاعری میں اس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شاعر دیدہ و دانستہ کسی دوسرے شاعر کے پہلے کہے ہوئے کسی خاص مضمون کو بالکل اسی صورت سے یا بہت معمولی فرق کے ساتھ یا کچھ رد و بدل کے بعد کہنے کی کوشش کرے اور نفس مضمون میں مجموعی طور سے کوئی اضافہ یا ترقی نہ کر پائے۔ مثلاً خواجہ حافظ کی یہ پوری غزل بجنسہ بغیر کسی تغیر و تبدل کے سلمان ساوجی کے کلام میں درج ہے۔ ؎

زباغ وصل تو یابد ریاض رضواں آب　　نہ تاب ہجر تو دارد شرارہ دوزخ تاب

یا۔

سیل غم ابروے توام پشت دوتا کرد　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد (جامی)

بار غم عشق تو مرا پشت دوتا کرد　　در شہر چو ماہ نوم انگشت نما کرد (حزیں)

یا۔

سرو گفتم کہ بالائے تو ماند لیکن　　نتوانم کہ ازیں شرم ببالا نگرم (خسرو)

سرو گفتم قد ترا وز شرم　　سر ببالا نمی تواند کرد (جامی)

سرقے کے بہت سے اقسام اور مدارج ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کا دار و مدار بیشتر اس شاعر کی نیت اور شعر کی نوعیت پر ہوتا ہے جس پر کہ سرقے کا شبہ کیا جائے یا اتہام لگایا جائے۔ اگر واقعی کوئی شاعر جان بوجھ کر کسی دوسرے شاعر کی دماغی کاوش کو معمولی رد و بدل کے بعد اپنے نام سے منسوب کرتا ہے تو وہ استحصال بالجبر کا مرتکب ہوتا ہے اور قابلِ سرزنش ہے۔ لیکن اگر نادانستہ کسی دوسرے شاعر سے اس کا توارد ہو جاتا ہے یا کسی عامتہ الورود مضمون کو وہ اپنے ڈھب سے باندھتا ہے یا اس میں کوئی نئی بات پیدا کرتا ہے تو یقیناً اس پر کوئی الزام عاید نہیں ہو سکتا۔

سرقے کی نشاندہی کرنے سے پہلے معترض کا یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا سرقہ نہیں ہے اور کون سی صورتیں مستثنیات میں آتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو اشعار میں مفہوم کی ذرا سی مشابہت دیکھ کر بعض نقاد سرقے

کا حکم لگا دیتے ہیں۔ شاعری اور خصوصاً صنفِ غزل میں ایسی شدت پسندی اور حرف گیری ہرگز جائز نہیں ہے بلکہ اس کی قدرتی نشو ونما کے منافی ہے۔ غزل کے موضوعات محدود ہیں اور اگر کہیں یہ بھی پابندی لگا دی جائے کہ دوسرے کی کہی ہوئی بات کا اشارتاً اور کنایتاً بھی اعادہ نہ کیا جائے تو پھر منہ کھولنا مشکل ہو جائے گا۔ چراغ سے چراغ جلایا ہی جاتا ہے اور اسی پر ہمارے سماجی شعور کے تسلسل کا انحصار ہے اور پھر علل اور اسباب کی اس دنیا میں کسی شاعر پر براہ راست آسمان سے وحی اور الہام کب نازل ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول اور روایات اور ان سے متعلق افکار اور اقدار کا قدرتاً پابند ہوتا ہے! اس دنیا میں ایسی بالکل نئی کون سی بات ہے جس کی جڑیں پرانی باتوں میں موجود نہیں ہوتیں۔ نئی باتیں پرانی باتوں سے رشتہ توڑ کر نہیں بلکہ انھیں کی نئی ترتیب اور تدوین اور ان کی جدید پالش اور رنگ آمیزی سے عالم وجود میں آتی ہیں۔ ارتقا' ترقی' اضافہ' تحقیق اور دریافت وغیرہ کے لیے کسی بنیاد یا سلسلے کا ہونا ناگزیر ہے۔

سرقے کا اطلاق عامتہ الورود یعنی ایسے مضامین پر جو ہر شاعر کے لیے پیش پا افتادہ ہوں اور جن کو مسلمات شاعری تسلیم کیا جا چکا ہو، نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہ مضامین کہ معشوق بے وفا ہے، عاشق مظلوم ہے، زمانہ ناقدر ہے، زندگی فانی ہے، ہر چیز میں ذات باری تعالیٰ کا پرتو ہے، وعدۂ وصل ایفا نہیں ہوتا، شب ہجر کاٹے نہیں کٹتی، ناصح یاوہ گو ہے، زاہد منافق ہے، دوست طوطا چشم ہیں، رقیب دشمن ہیں، شراب کی طلب ہے، صحرا نوردی کا شوق ہے، مرنے کی تمنا ہے یا حسن وعشق کی عام چھیڑ چھاڑ اور ان کی جزئیاتی تفصیلات وغیرہ اور ایسے ہی ہزارہا موضوعات حتیٰ کہ ان سے متعلق تشبیہات اور استعارات تک ایسے زبان زد عوام ہو چکے ہیں اور غزل گوئی کے مزاج اور خمیر میں ایسے رچ گئے ہیں کہ ان کے متعلق یہ سراغ لگانے کی کوشش کہ کس شاعر نے کس شاعر سے کیا اخذ کیا ہے نہ صرف مشکل اور ناممکن بلکہ لاحاصل بھی ہے۔ عامتہ الورود مضامین کے متعلق بیشتر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کیا کہا گیا ہے بلکہ محض یہ کہ کس طرح کہا گیا ہے۔ اور مضمون کی جدت پر نہیں بلکہ حسن بیان کی ندرت پر زیادہ نظر رہتی ہے اس قسم کے مضامین پر قریب قریب ہر غزل گو شاعر طبع آزمائی کرتا ہو اور دوسروں کی خوشہ چینی کرنے کا سوال تو دور رہا خود اپنے ہی کلام میں ان کی بار بار تکرار کرتا ہے۔ کوئی بھی عام روداد لیجیے آپ کو اس سے متعلق بیسیوں شعرا کے سیکڑوں اشعار مل جائیں گے۔ مثلاً

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا (میر)
سادگی ہائے تمنا، یعنی — پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا (غالب)
دل سے کس طرح بھلاؤں تجھے اے پردہ نشیں — بیخودی میں تو رہتا ہے ترا دھیان بہت (داغ)
مانوس ہو چلا تھا تسلی سے حالِ دل — پھر تم نے یاد آکے بدستور کر دیا (حسرت)
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا — جب چلی سرد ہوا میں نے تجھے یاد کیا (جوش)
آئی جب ان کی یاد تو آتی چلی گئی — ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی (جگر)

اگر کسی مضمون کو ترقی دے کر یا اس کے اظہار میں کوئی نئی بات پیدا کر کے پیش کیا جائے تو اس کوشش کو بھی سرقہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس کو معیوب کے بجائے مستحسن سمجھنا چاہیے۔ مثلاً

اٹھتی نہیں پلک سے تا ہم تلک بھی آویں — پھرتی ہیں تیری نگاہیں پلکوں کی سائے سائے (میر)
بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے (غالب)
عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے (میر)
قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے (غالب)
تجھ کو دیکھ کے کرتا ہوں یاد اسے غالب — جفا میں جس کی ہے انداز کارفرما کا (غالب)
چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں — کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ([illegible])

سرقہ کا حکم اس صورت میں بھی نہیں لگایا جا سکتا جب بات تو ایک ہی ہو لیکن ایک شاعر اس کے ایک پہلو پر زور دے اور دوسرا شاعر دوسرے پہلو پر جس سے شعر کے مجموعی تاثر میں کافی فرق نمایاں ہو جائے۔ مثلاً

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب — موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا (چکبست)
ورنہ کیا تھا صرف ترتیبِ عناصر کے سوا — خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہو گیا (جگر)
ز مردم یار می‌پرسد کہ حالی کیست؟ طالب است — کہ گرم و محبت رفت و کار آخر میاں جا (حالی)
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ (غالب)
چمن نا محرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے — تحیر گلستاں نرگس چشم کو ملتے ہیں (غالب)
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے — بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا (اقبال)
گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ (غالب)
دکھ دینے کا ایک دینا ہے — دلِ بے مدعا دیا تو نے (داغ)

مندرجہ بالا کے علاوہ اور بھی ایسے اشکال ہو سکتے ہیں جب دو اشعا

میں ظاہری مشابہت تو ہو لیکن دراصل ان کا مقصد اور بنیادی تصور ایک دوسرے سے مختلف ہو۔ مثلاً ؎

گرد فنا شد ند حریفانِ بزم عشق برخاک ریز جرعہ مردآزمائے ما (فیضی)

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد (غالب)

اے گلِ ہوا آمدی از زمیں گو چہ گونہ اند آں روئہا کہ در تہ گرد فنا شدند (خسرو)

پا بر سرِ سبزہ تا بخواری نہ نہی کاں سبزہ زخاک لالہ روئے رستہ است (خیام)

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں (غالب)

خلاصۂ کلام یہ کہ سرقے کا اطلاق کسی دو مضامین کی ظاہری بہت مشابہت کے باوجود ان صورتوں میں نہیں ہوتا جب صرف توارد ہو یا مضامین عامۃ الورود ہوں اور طرزِ ادا مختلف ہو، یا جب کسی مضمون کو ترقی، اضافے یا کسی نئے پہلو سے پیش کیا جائے یا جب دو مضامین کی یکسانیت صرف ظاہری ہو باطنی نہ ہو۔ ورنہ یوں کسی دوسرے کی کسی مخصوص تخلیق کو زبردستی اپنا لینا یا معمولی رد و بدل کے بعد بغیر کسی ترقی کے اپنے نام سے پیش کر دینا یقیناً سرقہ ہے اور اس سے اس کے مرتکب کا نہ صرف عجزِ تخیل بلکہ بدنیتی ظاہر ہوتی ہے اور اس کی نقاب کشائی ایک ادبی خدمت ہے۔

بعض اوقات صرف ظاہری مشابہت سرقے کی غلط فہمی کس طرح پیدا کر دیتی ہے، اس کی وضاحت کے لیے سیلی اور غالب کے دو ایسے متقابل اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں جو نہ صرف سطحی طور سے دیکھنے میں ایک ہی بات کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ جن میں غالب کے بعض نقادوں کے نزدیک ان کا شعر سیلی کے پہلے کہے ہوئے شعر سے بہت پست رہ جاتا ہے۔

بیم از وفا مدار، بدہ وعدۂ کہ من از ذوق وعدۂ تو بفردا نمی رسم (سیلی)

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا (غالب)

اس شعر کے متعلق حضرت آرگس (غالب کے ایک ایسے معترض جنھوں نے اپنا اصلی نام ظاہر نہیں کیا تھا[1]) کا ارشاد ہے: "سیلی نے کہا تھا کہ تو وعدہ کر اور ایفائے وعدہ کا خیال ہی نہ کر۔ ادھر تو نے وعدہ کیا ادھر خوشی سے ہمارا دم نکلا۔ بالکل یہی خیال غالب کے یہاں ہے۔ مگر سیلی کے یہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ"

حضرت شہا نے اس کا جواب یوں دیا ہے: "نیشا پوری وعدے کے ذوق میں مرجانے کا یقین دلا کر محبوب سے پیمان لینا چاہتا ہے غالب صدق و کذبِ وعدہ کا ایک اچھوتا معیار پیش کرتا ہے۔ اختلافِ مضمون مستزاد برآں۔ غالب کا حسنِ بیان شعر کو نیشا پوری کے شعر سے بلند تر کیے ہوئے ہے"

حضرت نخود موہانی کا خیال ہے: "میری رائے میں حضرت آرگس کا خیال صحیح ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں خیال یکساں ہی نہیں بلکہ ایک ہیں۔ حضرت شہا جس کو اچھوتا معیار قرار دیتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بلکہ اس سے کہیں بہتر صورت میں سیلی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مگر یہ مضمون عام ہے اس لیے کہ انتہائی خوشی میں مرجانا مشہورات میں سے ہے جس پر شادی مرگ کی شہرت شاہد عادل ہے۔ پھر وعدۂ وصل یار کی خوشی میں مرجانا کون سی بڑی بات ہے۔ اس لیے اسے ترجمہ کہیے نہ سرقہ۔ یہ توارد کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک سیلی کا شعر نزاکت و بلندیِ خیال کے اعتبار سے مرزا غالب کے شعر سے کہیں بالاتر ہے اس لیے کہ کہاں وعدۂ یار کی خوشی میں مر نہ جانے کی معذرت کرنے کے لیے زندہ رہنا اور کہاں قبل وعدہ وعدۂ وصل کی خوشی میں مرجانے کا یقین ہونا"

میری مودبانہ گزارش ہے کہ غالب کا یہ شعر توارد کی تعریف میں بھی نہیں آتا اور سرقہ تو اسے کسی بھی صورت سے کہا ہی نہیں جا سکتا۔ غالب اور سیلی نے دو مختلف باتیں کہی ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ بعض ارباب ذوق کی نظر میں سیلی کا شعر بہتر ہو اور بعض غالب کے شعر کو ترجیح دیں

سیلی اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ تو مجھ سے وعدۂ وصل کرلے اور اس کے ایفا کرنے کی فکر نہ کر کیوں کہ تیرے وعدے کی خوشی میں میں کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا۔ واقعی سیلی کا شعر اپنی جگہ پر بہت خوب ہے اور اس کا یہ ٹکڑا "از ذوقِ وعدۂ تو بفردا نمی رسم" داد سے مستغنی شاعر کا وعدے کے متعلق حسنِ طلب اچھوتا ہے۔ اس نے ایک ایسی صورت معشوق کے سامنے رکھ دی ہے کہ اب اس کے لئے وعدہ نہ کرنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ شعر کا ایک پر لطف پہلو یہ بھی ہے کہ اب اگر معشوق وعدہ کرنے سے انکار کرتا ہے تو در پردہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے عاشق کی زندگی پیاری ہے جو خود اس کی محبت کا ثبوت ہو جاتا ہے لہذا وعدہ کرلینا

---

[1] جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے مولانا عبد الباری آسی الدنی نے عرصہ ہوا نگار لکھنؤ میں اس نام سے مضمون لکھا تھا۔ ایڈیٹر

اس کے لئے ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔

اس شعر میں شاعر نے بڑی جدت طبع بھی دکھائی ہے لیکن اس کوشش میں وہ بعض امور کے متعلق حدِ اعتدال سے کہیں آگے بڑھ گیا ہے اور اس کا مبالغہ، وہ شاعرانہ ہی سہی، طبع نازک پر گراں گزرتا ہے۔ یہ شعر کسی مشاعرے میں تو بے پناہ داد حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی چلتی پھرتی بات کہی گئی ہے لیکن مخصوص حلقۂ ادب میں یہ تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتا اور اس پر کئی بنیادی اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً شاعر نہ صرف جھوٹا وعدہ کرنے پر معشوق کو اُکسا رہا ہے بلکہ اس کی خاطر مرنے کی بھی ٹھان چکا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے معشوق کے وعدے کی اہمیت کا کبھی احساس نہیں اور وہ صرف اپنے مرجانے کا ایک بہانہ تلاش کر رہا ہے۔ اسے عشق کی منزل نہیں خود فریبی کی منزل کہا جا سکتا ہے۔

غالب ایک بالکل دوسری بات کہتے ہیں۔ ان کے شعر میں لفظ "جان" بہت بلیغ استعمال ہوا ہے اور اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ 'جان' کہہ کر معشوق کو پیار سے مخاطب کیا ہے اور دوسرے 'جان' بمعنی 'سمجھ'۔ حضرت آسی اور حضرت نظم طباطبائی نے پہلا مفہوم سامنے رکھ کر شعر کا مطلب بیان کیا ہے اور بہت سے دیگر شارحین نے دوسرے معنی کو زیادہ دقیع سمجھا ہے اور اس کے ماتحت شعر کی تشریح کی ہے۔

پہلا مطلب یہ ہوگا۔ ہم اپنی مایوسیوں سے تنگ آکر مرنے کی ٹھان چکے تھے لیکن جب تو نے وعدہ کر لیا تو اس کے ایفا ہونے کی امید موہوم کے سہارے ہم جیتے رہے لیکن اے میری جان! تو اسے جھوٹ سمجھتا ہے اور بجائے اسکے کہ ہمارے اس بھروسے کی قدر کرے اور اس کی بنا پر اپنے وعدہ کو ایفا کرنے کی کوشش کرے تو اُلٹا ہمیں طعنہ دیتا ہے "کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا"۔

شعر کا دوسرا مطلب یہ ہوگا جیسا کہ حضرات آرگس، سہا، بیخود موہانی اور بعض دیگر شارحین نے بیان کیا ہے یعنی تیرے وعدۂ وصل کے بعد بھی اگر ہم جیتے رہے تو سمجھ لے کہ تیرے وعدے کو ہم نے سچا سمجھا ہی نہیں تھا کیونکہ اگر سمجھا ہوتا تو کیا ہم مارے خوشی کے مر نہ چکے ہوتے؟

ان مطالب کے پیش نظر غالب اور میلی کے زیر بحث اشعا کوئی خاص مطابقت یا مناسبت نہیں ہے سوائے اس کے کہ دونوں ہی اشعار میں معشوق کے وعدے اور اس کی خوشی میں کا ذکر آیا ہے۔ دونوں کے پس منظر اور مجموعی تاثر میں کافی فرق

اس طرح غالب کے پچیس تیس اشعار پر مختلف ناقدین نے کبھی کھل کر اور کبھی دبے بند سرقے یا دوسرے شعرا کے مضامین عکاسی کا الزام لگایا ہے۔ لیکن درحقیقت اس سلسلے میں کہیں غا کی جانب پانی مرتا ہوا دکھائی نہیں پڑتا۔ حضرت بیخود موہانی نے اپنی کتاب گنجینۂ تحقیق میں اس موضوع پر غالب کے بعض معترضین خصوصاً حضرت آرگس کو بڑا مدلل اور بصیرت افروز جواب دیا۔

سرقے کے متعلق یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اگر جیسا کے مرتکب عموماً وہ شعرا ہوتے ہیں جو فن کار کم اور نقال زیادہ ہو ہیں لیکن اس کا اتہام بیشتر اُن بڑے شعرا پر لگایا جاتا ہے جو لوگ زیادہ قابل توجہ اور لائق اعتنا سمجھتے ہیں۔

اردو ادب میں اب بھی غزل مقبول ترین صنف ادب بھی ہے لیکن پرانی روایتی پابندیوں کے باعث اسکے موضوعات بہت مح ہیں اور ان سے متعلق مروجہ تشبیہات اور استعارات تک میں جدت اور تنوع باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ردیف اور قافیے کی قی نے اس کا میدان اور بھی تنگ کر دیا ہے۔ ان حالات کوئی تعجب نہیں کہ ہمیں توارد اور سرقے کی مثالیں سب سے زیادہ غزل کے اشعار میں ملتی ہیں۔

توارد کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ خاطر رکھنے کی ضرورت کہ اگرچہ اِس کا ایک سے زاید شعرا کے کلام میں پایا جانا محض پر مبنی ہوتا ہے لیکن اس کے پس پردہ یہ نفسیاتی مسئلہ بھی کارفر نظر آتا ہے کہ بڑے لوگوں کے طریقۂ فکر میں بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ یہ اکثر صرف ایک ہی زبان کے شعرا میں نہ بلکہ مختلف زبانوں کے شعرا کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے۔ خا سنسکرت، ہندی اور اردو میں جو گہرا بنیادی تعلق ہے اس

ماتحت ان زبانوں کے کلام میں توارد کی بہتات پر کوئی تعجب نہیں کیا جا سکتا البتہ اُن زبانوں کے خیالات میں توارد جن میں سے ایک کے جاننے والے دوسری زبان سے ناواقف ہوتے ہیں ہمیں اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ خیالات لسانی قیود اور جغرافیائی حدود سے آزاد ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں، میں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

انگریزی میں ایک مقولہ ہے: IGNORANCE IS BLISS

AND IT IS FOLLY TO BE WISE.

غالب نے کہا ہے ؎

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

سرقے کو دو اصناف میں تقسیم کیا گیا ہے۔ سرقہ ظاہر اور سرقۂ غیر ظاہر۔ سرقہ ظاہر کی کچھ مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں۔ مجملاً اس کا اطلاق حسب ذیل صورتوں میں ہوتا ہے:۔

جب ایک شعر دوسرے شعر کی بجنسہ نقل ہو۔ یہ سرقے کی انتہائی معیوب اور مذموم صورت سمجھی جاتی ہے۔

جب ایک شعر اور دوسرے شعر میں صرف الفاظ کی اُلٹ پھیر یا تشبیہ اور استعارے کا ردو بدل یا ردیف اور قافیے کا فرق پایا جائے لیکن نفس مضمون ایک ہی ہو اور کسی طرح سے بھی کسی نئے یا بہتر خیال کا اظہار نہ کیا گیا ہو۔

جب ایک شعر اور دوسرے شعر کے الفاظ اور طرز بیان تو مختلف ہوں لیکن دونوں میں بات ایک ہی کہی گئی ہو۔ غزل کے بہت عام اور روایتی موضوعات اور عاشقانہ اور دو مضامین پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ مثلاً

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر (غالب)

تجھے گھاٹا نہ ہونے دیں گے کاروبارِ الفت میں
ہم اپنے سر ترا اے دوست ہر نقصان لیتے ہیں (فراق)

سرقۂ غیر ظاہر اُس سرقے کو کہتے ہیں جو بظاہر سرقہ نہ معلوم ہو یعنی ظاہر میں تو ایک شعر اور دوسرے شعر میں بہت فرق نظر آئے بلکہ اکثر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوں، لیکن ایک شعر کا بنیادی تصور دوسرے سے مستعار لے کر اس سے متعلق بات کو بدل کر یا پلٹ کر کہہ دیا گیا ہو اور مجموعی طور سے نفس مضمون میں کوئی ترقی یا اضافہ نہ کیا گیا ہو۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کے شعر میں معمولی سی ترمیم و تنسیخ کر دی جائے۔ مثلاً ردیف یا قافیہ بدل دیا جائے۔

اس قسم کے اشعار کی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض مسلم الثبوت شعرا اور اساتذۂ فن کے یہاں بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے اشعار مل جائیں گے۔ مثلاً امیر خسرو کا مشہور شعر ہے۔

ہمہ آہوانِ صحرا سرِ خود نہادہ بر کف
بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

اب میر تقی میر کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہر سو سرِ تسلیم رکھے صید حرم ہیں
وہ صید فگن تیغ بہ کف تا اِدھر آوے

تین اور شعر بھی پیش ہیں۔

چمن میں گُل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا (میر)

برابری کا تری گُل نے جب خیال کیا
صبا نے مار طمانچہ منہ اُس کا لال کیا (حیدری)

دعویٰ کیا تھا گُل نے اُس رخ کے رنگ و بو کا
ماریں صبا نے دھولیں شبنم نے منہ پہ تھوکا (میر سوز)

لیکن سرقۂ غیر ظاہر کا حکم لگانے میں بڑی احتیاط لازم ہے کیونکہ اس کا بیشتر دارومدار کسی شاعر کی نیت اور ادبی حیثیت پر ہوتا ہے الفاظ میں وہ طلسم ہوتا ہے کہ ذرا سی تبدیلی سے بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض وسیع نقادانِ فن اس کو سرقے کی تعریف میں نہیں لاتے ہیں۔

دیس ہی اب دھرم ہے

نذیر بنارسی

وقت کی آندھی بھی ہے، وقت کا طوفان بھی
آگیا ہے وقت اب دھن بھی دیں گے جان بھی
دیس ہی کے مان سے سب کا ہے سمان بھی
سب ہے ماتا کے لیے، دان بھی بلیدان بھی
دیس ہی اب دھرم ہے دیس ہی ایمان بھی

ایک کر دو توڑ کر آج ساری ٹولیاں
آ گئے ہیں راہ زن چھیننے آزادیاں
مر نہیں سکتے کبھی ہم رگڑ کر ایڑیاں
دیس پر مرنے میں ہے زندگی کی شان بھی
دیس ہی اب دھرم ہے دیس ہی ایمان بھی

دشمنوں کے خون سے کھیلنا ہے ہولیاں
پھینک دی ہیں توڑ کر ہم نے جتنی بیڑیاں
سب کو لاؤ سب ہے ہم آج ڈھالیں گولیاں
سیکڑوں کی لے کے جان دیں گے اپنی جان بھی
دیس ہی اب دھرم ہے دیس ہی ایمان بھی

جان جانے دیجیے جائے کیوں پرکھوں کی آن
کیوں نہ گاڑھے وقت میں بڑھے بن جائیں جوان
آج سے یہ سوچ لیں دیس کے سارے کسان
جنگ کا سامان ہے کھیت بھی کھلیان بھی
دیس ہی اب دھرم ہے دیس ہی ایمان بھی

کیا سنعنہ خون میں اپنا کھے سکتے نہیں
بزدلی الزام ہے سر پہ لے سکتے نہیں
جان لاکھوں دیں گے ہم ساکھ دے سکتے نہیں
جیسی ماتا ہے نذیر ویسی ہی سنتان بھی
دیس ہی اب دھرم ہے دیس ہی ایمان بھی

بہادر شاہ ظفر

شمسی مینائی

عشرت دہر سے واقف بھی تھا بیگانہ بھی — تیری شاہی میں تھی اک شانِ فقیرانہ
زہد و پیری میں بھی اک جرأت رندانہ تھی — سامنے ہو کے تدبیر حریفانہ تھی
اپنے ایمان کو غیرت کو بچایا تو نے — ہر تباہی کو کلیجے سے لگایا تو نے
ہر غم دہر کو مہمان کیا ہے تو نے — پوری اک نسل کو قربان کیا ہے تو نے
سارے عالم نے ترے شوق کا عالم دیکھا — عینی "قربانی پیہم" کو مجسم دیکھا
کتنی وسعت ترے جذبے میں ترے خون میں ہے — بزم دلی میں بھی خلوت تری رنگون میں ہے
تیرا انداز چلا ہی سحر و شام کے ساتھ — تیرا ارمان رہا گردش ایام کے ساتھ
تیری بے تابی دل پیکر گل تک پہنچی — تیری آواز بھی جو بوس[1] کے دل تک پہنچی
تو نے دیوانوں کو اک "جذبہ وحدت" بخشا — تیرے مرقد نے نئیں "شوق شہادت" بخشا
یہ حقیقت بھی کھلی، رہ گئی دنیا تکتی! — "آدمی مرتا ہی تحریک نہیں مر سکتی"
تیری تقدیر کو رسوا تو نہیں کر سکتا — بدنصیبی کا میں چرچا تو نہیں کر سکتا
سلطنت رہ نہ گئی اس کا بھروسہ کیا تھا — جو ملا اوروں سے اس چیز کو سمجھا کیا تھا
دین ہی تیرے لہو کی ترا فن قبضے میں — آج بھی سلطنتِ شعر و سخن قبضے میں
جنگ میں ہار کے بھی فن میں ظفر کہیے — شب کے ہاتھوں سے یہ تنظیم سحر کیا کہیے
تجھ کو اندھا تو کیا مٹ نہ سکا زور کلام — اب بھی چونکا تا ہے انساں کو ترا صور کلام
تو ہی "سلطان جنوں" تو ہی "شہ سوز و گداز" — عمر شاہی تو تھی کم، شعر کی ہے عمر دراز
زندگی خون میں اپنے ہی ڈبو کر رکھ دی — زندگی شعر و سخن میں بھی سمو کر رکھ دی
ذوق سے بڑھ کے ترے شعر میں رعنائی ہے — درد سے بڑھ کے ترے درد میں گہرائی ہے
حشر تک یاد رہے گا یہ تعقد ریر تری — صاحب دل کی نگاہوں میں ہے تصویر تری

تیری سطوت پہ نہ شاہی پہ قلم اٹھتا ہے
ایک انساں کی تباہی پہ قلم اٹھتا ہے

---

[1] سلسلہ تاریخ کی عجیب کرشمہ ہی ہے کہ بہادر شاہ کے مرنے کے تقریباً اسی برس کے بعد نیتا جی سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج رنگون ہی میں بنائی یہاں بہادر شاہ کی قبر ہے اور پہلا کام یہ کیا کہ ان کی قبر پر جاکر وطن کو آزاد کرانے کی قسم کھائی۔

موسیقی کی اصناف ثلاثہ

خیال، دھرپد اور ٹھمری

بندیو مرزا

جو موسیقی آج ہماری ملکیت ہے وہ صدیوں کی گود میں پلی ہے۔ وقت اس میں بیڑیاں نہ ڈال سکا۔ نئی راہیں برابر نکلتی رہیں۔ اور اب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ نئی راہیں نکالتے ہوئے موسیقی کے اعلیٰ اصناف کی حفاظت کی جائے

ان اعلیٰ اصناف میں دھرپد، خیال، ٹھمری اور کئی دوسرے اصناف شامل ہیں مگر یہاں صرف انھیں تینوں چیزوں کا مختصر طور سے ذکر کیا جائے گا۔

سب سے پہلے خیال گائیکی کو لیجیے کیونکہ میرے نزدیک یہی ایک صنف ہے جو فن موسیقی کے تقاضوں کو ہر اعتبار سے پورا کر سکتی ہے۔

خیال گائیکی کیا ہے؟ قبل اس کے کہ ہم یہ بتائیں، ہندوستانی موسیقی کے پس منظر پر کچھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ دھرپد اور ٹھمری کا بھی اسی ضمن میں ذکر آجائے گا۔

ہندوستانی موسیقی کی تاریخ کے بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں موسیقی کا وجود سام وید سے بھی پہلے تھا حالانکہ اس زمانہ میں کوئی شاستر نہیں تھا۔ اس موسیقی کی کیا شکلیں تھیں، اس کے بارے میں تو کوئی روشنی نہیں ڈالی جا سکتی، البتہ اس کے مختلف ناموں کا ذکر ضرور کیا جا سکتا ہے مثلاً دھرپد کو بھی پہلے پربندھا گانے کا رواج تھا جو مغلوں کے دور کے شروع کے چند سالوں تک قائم رہا۔ پربندھا کے ساتھ ساتھ بعض دوسری شکلیں بھی، جو وستو اور روپک کے نام سے مشہور تھیں گائی جاتی تھیں۔

پربندھا کے عموماً چھ موضوع ہوتے تھے۔ ناٹیہ شاستر کے مصنف بھرت رشی کے زمانے میں گرام سنگیت کا رواج تھا۔ اس کے بعد موسیقی نے کچھ اور شکلیں اختیار کیں اور تیرھویں صدی تک روپک گانے کا رواج رہا۔ درباری شاعر ہی گویے ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو ہندوستانی موسیقی نے ایک اور موڑ لیا۔ اس دور کے خاص نمائندے امیر خسرو ہیں جن کا نام موسیقی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جاتا ہے۔ امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں نئی راہیں نکال کر اس کو چار چاند لگا دیے۔ ہندوستانی موسیقی اور ایرانی موسیقی میں ایک امتزاج پیدا کیا۔ بہت سے ساز اور راگ ایجاد کیے جن میں پرانے اور نئے دونوں روپ جھلکتے تھے۔ خیال گائیکی کا وجود بھی اسی عظیم ہستی کا رہین منت ہے۔ لیکن اس زمانہ کے حالات اس گائیکی کے لیے سازگار نہیں تھے اس لیے یہ گائیکی اس دور میں زیادہ مقبول نہ ہو سکی۔ خیال گائیکی کی اختراع دھرپد گائیکی پر ایک طرح کا ردعمل تھا۔ اور شروع شروع میں اس پر دھرپد کا بہت بڑا اثر رہا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کا رجحان انسانی جذبات کی ترجمانی کی طرف ہونے لگا کیونکہ اس صنف میں کافی وسعت ہونے کی وجہ سے فن کار کو نہ صرف فنی حیثیت سے اس میں اپنے جوہر دکھانے کے زیادہ مواقع حاصل تھے بلکہ انسانی جذبات کی ترجمانی کرنے میں بھی کوئی دقت نہیں تھی۔ دھرپد کے سخت قیود کی وجہ سے فن کار بہت سی باتوں میں اپنے کو عاجز محسوس کرتا تھا مگر خیال میں فن کار کو اپنی

شخصیت سمو دینے کی کافی گنجائش تھی۔

دھرپد میں اصولوں کی قید ہے۔ دھرپد گاتے وقت فن کار الاپ میں ضرور اپنے آپ کو شامل کر سکتا ہے لیکن اس کے بعد وہ ان قیود کا پابند ہو جاتا ہے۔ خیال میں مُرکی، چھندوں اور تانوں کا استعمال بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ تانیں ہی دراصل اس گائیکی کی زیبائش ہیں جبکہ دھرپد میں ان کی سخت ممانعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موسیقی کا یہ نیا انگ آخر کار رفتہ رفتہ پروان چڑھنے لگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ خیال میں اصولوں اور پابندیوں کو بالکل توڑ دیا گیا۔ پابندیاں اور قیود اس میں بھی ہیں مگر دھرپد کی طرح کی نہیں۔

خیال گائیکی کا دور دراصل بالکل ایسا ہی ہے جیسے انگریزی ادب میں رومانیت (ROMANTICISM) کا دور جس میں ورڈسورتھ، شیلے، کیٹس، بائرن اور کالرج شاعری کی پرانی روش کو توڑ کر نئی راہیں اور نئے موضوعات تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ دھرپد گائیکی نے بھی وقت کی ضرورت کو پورا کیا تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ دھرپد ہندوستانی موسیقی کی اتنی بلند پایہ اور عظیم صنف ہے کہ تان سین ایسے اعلیٰ فن کار کی عظمت کا ایک بڑا راز یہ ہے کہ وہ دھرپد گاتا تھا لیکن ان سب باتوں کے ساتھ یہ امر بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ تان سین کی عظمت اور مقبولیت میں خود دھرپد کا بڑا ہاتھ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تان سین بذات خود بہت بڑا فن کار تھا مگر اس کی شہرت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے خارجی حالات بھی بہت سازگار تھے۔ اس صاحب کمال کی تابانی میں شہنشاہ اکبر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اگر یہ موسیقار کسی اور دور میں پیدا ہوا ہوتا تو ممکن ہے اسے وہ قدر و منزلت حاصل نہ ہوتی جو آج حاصل ہے۔

اکبر کا دور موسیقی کی دو راہوں، ایک لوک گیت دوسرے کلاسیکی موسیقی کا سنگم تھا۔ یہ دونوں بھگتی تحریک میں ایک دوسرے میں شامل ہو کر ایک نیا رنگ پیدا کرتی ہیں۔ اس تحریک کے خاص نمایندے سورداس اور میرا بائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں کوی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ موسیقار بھی تھے۔ لوک گیتوں اور کلاسیکی موسیقی کا خوبصورت ملاپ ان دونوں شاعروں کی رچناؤں میں بڑی خوبی سے

ملتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں مکمل امن ہے۔ کوئی بدامنی نہیں اور نہ کوئی ذہنی انتشار۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دور فنی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ سماجی، سیاسی اور معاشرتی حیثیت سے بھی بام عروج پر ہے۔

جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں بھی فن اور فن کار کے وقار میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کہتے ہیں کہ شاہجہاں نے اپنے درباری گویے کو اشرفیوں سے تولا تھا۔ لیکن فن کو ان ادوار میں کوئی نئی زندگی نہیں ملی۔ اس اعتبار سے محمد شاہ رنگیلے کا دور بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ سدا رنگ (نعمت خاں) جو دربار میں بطور بین کار کے ملازم تھے موسیقی میں ترقی کے اصلی حامل ہیں۔ کچھ لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ خیال گائیکی کے خالق سدا رنگ ہی تھے مگر یہ غلط ہے۔ خیال گائیکی کی تخلیق تو تیرھویں صدی میں امیر خسرو کے ہاتھوں پہلے ہی ہو چکی تھی مزید پندرھویں صدی میں سلطان حسین شرقی والی جونپور نے اس نئے انگ میں ترمیم و تراش کی۔ اس میں دھرپد کا اثر کم کر کے (چپدا) گانے کا (جو شمالی ہندوستان کی عورتوں میں بہت مقبول تھا) انگ بھر دیا (لوک گیت کی یہ قسم آگے چل کر لاونی بھی کہلائی۔) بہرحال اس سے خیال گائیکی کو ایک نئی روح ضرور ملی لیکن خیال کو پایۂ تکمیل کو پہنچانے کا اصلی سہرا سدا رنگ کے سر پر ہی رہے گا۔ کہا جاتا ہے کہ دھرپد گائیکی پورے دو سو برس تک گائی گئی۔ خیال شروع ہوا تو اسے عام مقبولیت یا دھرپد کے برابر مقبولیت نہ حاصل ہو سکی۔ سدا رنگ نے اس گائیکی میں نئے رنگ بھر کر اسے دھرپد گائیکی کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

بہرحال اب خیال کی مقبولیت کا زمانہ آیا اور جیسے جیسے یہ مقبول ہونے لگا ویسے ویسے اس میں نئی نئی راہیں نکلنے لگیں۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے محمد خاں، جو گوالیار دربار میں ملازم تھے، تانوں کا اضافہ کرنے کے موجد تھے۔ اس کی وجہ سے قدیم اور جدید خیال کے ڈھنگ میں نمایاں فرق ہو گیا۔ امیر خسرو کا خیال دھرپد اور قوالی کے بیچ تھا۔ اب اگر دھرپد کا اثر خیال میں رہا تو صرف اس حد تک کہ الاپ، مینڈ اور گمک خیال میں قائم رہی۔

خیال دو حصوں میں گایا جاتا ہے۔ استھائی اور انترا جبکہ دھرپد چار حصوں میں گایا جاتا ہے: استھائی، انترا، آبھوگ

سنچاری۔ (استھائی یعنی پہلا مصرعہ۔ انترا دوسرا' یعنی پہلے سے مختلف۔ آبھوگ یعنی پھیلاؤ 'سنچاری' یعنی اس کا خاتمہ) دُھرپد میں ان چاروں حصوں کا توازن قائم رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بولوں کی اہمیت کو بھی نظر میں رکھنا بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خیال گائیکی میں بولوں کی اہمیت دھیرے دھیرے کم ہونے لگی۔ لیکن بقول رابندر ناتھ ٹیگور "جہاں بول ختم ہوتے ہیں وہیں اصلی موسیقی کا آغاز ہوتا ہے" یعنی موسیقی بولوں کی محتاج نہیں ہے۔ یہ بات کسی قدر صحیح بھی ہے۔ سازوں کی موسیقی اس بات کی شاہد ہے۔

دُھرپد گائیکی کی ترقی اور عظمت کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ اس میں بول برابر قائم رہتے ہیں یہ گائیکی بہت سنجیدہ ہے۔ مردانہ گلے کے لیے خاص طور پر موزوں ہے۔ باوجود اس کے کہ اس میں بلا کی اصول پرستی ہے' اس میں ایک پورے دور کی عظمت ملتی ہے۔ اس کی چال وہی ہے جو ہاتھی کی یعنی وہ خارجی ماحول کی پوری آئینہ دار ہے۔ بقول پنڈت بھاتکھنڈے دھرپد گائیکی کی اختراع پانچ قسم کے لوک گیتوں یعنی شُدھا، جِنا' جبیرا' گوڑی اور سادھارنی سے ہوئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ دُھرپد میں ابتدائی عنصر کا عکس برابر ملتا ہے (اس ضمن میں دھمار کا ذکر بھی ضروری ہے۔ دھمار کی تخلیق دراصل خیال گائیکی پر ایک ردعمل تھا۔ یعنی دھرپد ہی کو دھمار نام کی تال میں تیزی سے گایا جانے لگا۔ اس میں زیادہ منظر کشی ملتی ہے۔ رنگ اور گلال کا ذکر بھی ہوتا ہے۔)

کئی عالموں کا کہنا ہے کہ دھرپد گائیکی کے جنم داتا راجہ مان سنگھ والئ گوالیار ہی تھے۔ لیکن تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ دھرپد گائیکی پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ راجہ مان سنگھ نے اپنی بیوی مرگ نینی اور نائیک بخشو کی مدد سے اسے حالات کے مطابق تراش خراش لیا' اور یہ گائیکی اُس دور کے مزاج پر پوری اتری پھر تان سین کے ہاتھوں وہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی اور تان سین یا دوسرے لفظوں میں دُھرپد کی سرپرستی شہنشاہ اکبر نے کی۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو تان سین کا مزاج دراصل خیال گائیکی کا تھا۔ خارجی حالات کتنے بھی سازگار کیوں نہ ہوں فن کار کے یہاں ایک گھٹن کا احساس ضرور رہتا ہے۔ یہ گھٹن ذہنی ہو' یا جذباتی' اس کا ثبوت ہمیں درباری راگ سے ملتا ہے۔ راگ درباری' نام کا درباری ہے۔ اس میں کیفیت بالکل دوسری ہے۔ یعنی اس راگ میں فن کار کی اپنی شخصیت کی پوری ترجمانی ملتی ہے۔ اس راگ میں سُر گندھار (گا) اَتی (بہت) کومل ہے۔ خود کومل گندھار ہی حزنیہ کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس میں تان سین نے کومل سُر کو اَتی کومل کرکے اس میں اور بھی المیہ کیفیت پیدا کردی۔ اِس پورے راگ کا مزاج دُھرپد گائیکی کے بالکل برعکس ہے۔ دراصل یہ خیال گائیکی کے مزاج پر پورا اترتا ہے۔ اس راگ کی تخلیق سے تان سین کی داخلی کیفیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یعنی یہ کہ اکبر کے دربار میں اتنی عزت ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا شدید احساس ملتا ہے اور یہی وہ احساس ہے جس نے تان سین کو یہ عظمت بخشی۔

دراصل تان سین نے جتنے بھی راگ ایجاد کیے' ان سب میں اس کی اپنی شخصیت کی گھٹن کا احساس برابر ملتا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خیال گائیکی نہ صرف ایک اعلےٰ فنی صنف ہے بلکہ فن کار کا اپنا مزاج بھی ہے جس کی شمولیت فن میں اشد ضروری ہے۔ اور فن میں فن کار کے مزاج کی شمولیت کے امکانات زیادہ تر خیال گائیکی میں ہی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محمد شاہ کے دور میں خیال' گائیکی کو حیاتِ نو ملی۔ انسان کے ذہنی انتشار کی صحیح ترجمانی خیال گائیکی نے کی۔ سدا رنگ اور ادا رنگ نے اس روپ کو اور بھی نکھارا۔ دھرپد گائیکی وقت کے ساتھ ساتھ مفقود ہونے لگی۔ اگرچہ آج بھی دھرپد گانے والے بہت سے گھرانے موجود ہیں لیکن خیال گائیکی کے مقابلہ میں دھرپد کی شہرت ماند پڑ گئی ہے۔ گانے والے ضرور باقی ہیں لیکن سننے والے اور سمجھنے والے نہیں رہے۔

خیال' بلمپت اور درت میں بھی گایا جاتا ہے۔ بلمپت کے معنی ہیں ٹھہرا ہوا۔ (لیکن اتنا ٹھہرا ہوا نہیں جتنا دھرپد) بلکہ اس سے درت یعنی تیز۔ خیال کو بلمپت میں ایک تال میں جو بارہ ماتراؤں کی ہوتی ہے گایا جاتا ہے۔ درت زیادہ تر تین تال میں گائی جاتی ہے جو سولہ

ماتراؤں کی ہوتی ہے۔ آج کل درت کا زیادہ رواج ہے۔ اب بہت کم گوئیے ایسے رہ گئے ہیں جو بلمپت لے میں اسی طرح گاتے ہیں جیسے پہلے رواج تھا۔ مثال کے طور پر مرحوم استاد ولایت حسین خاں کا نام لیا جا سکتا ہے جو آگرہ گھرانے کی گائیکی کے خاص نمائندے تھے اور بہت سے نئے راگوں کے موجد بھی تھے۔ دوسرے امیر خاں ہیں جو کرانہ گھرانے کے ممتاز رکن ہیں۔ خیال گائیکی میں فن کی ہی تکمیل نہیں بلکہ جمالیاتی عنصر بھی موجود ہے، بالکل اسی طرح جیسے غزل گوئی میں۔

آگے چل کر یہی جمالیاتی پہلو اپنی ایک انفرادی شکل اختیار کر لیتا ہے، جسے ہم ٹھمری کے نام سے پکارتے ہیں۔ ٹھمری ٹھمک ٹھمک سے پیدا ہوئی ہے، یعنی ناز سے نرت کرنا۔ واجد علی شاہ کے دور میں ہر فن کی تراش خراش ہوئی۔ انھیں نئی وضع کے مطابق ڈھال لیا گیا اور جمالیاتی پہلو کو فوقیت دی گئی۔ شاعری میں بھی یہی ہوا اور موسیقی میں بھی۔ چنانچہ اس دور میں ٹھمری کو ایک نیا آہنگ ملا اور وہ جذبات عشق و حسن کی ایک حد تک ترجمان بن گئی۔ ٹھمری کا یہ طرز بہت مقبول ہوا ہے اور آج کے دور میں اسی طرز کو پسند کیا جاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے خیال بھی اب ٹھمری سے قریب تر ہو گیا ہے۔ ٹھمری میں نرت کے پورے بھاؤ ملتے ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کتھک ناچ۔

ٹھمری گائیکی جتنی عورت کے سریلے گلے کے لیے موزوں ہے اتنی مرد کے لیے نہیں۔ اس میں بولوں کو مرکیوں اور پھندوں میں نئے نئے انداز سے پرو دیا جاتا ہے اور یہ چیز عورت ہی کے گلے سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ٹھمری گانے والوں کی صف اول میں ہمیں عبدالکریم خاں، معزالدین خاں اور بڑے غلام علی خاں ایسے زبردست ماہر فن نظر آتے ہیں۔ پھر بھی عورت جب ٹھمری گاتی ہے تو اس کا جلوہ ہی دوسرا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں بیگم اختر، رسولن بائی اور نرملا دیوی کے نام ٹھمری گانے والوں کی فہرست میں بڑا ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ٹھمری کو نکھارنے کا سہرا صادق علی خاں، جو دربار اودھ میں درباری گوئیے تھے، کے سر ہے۔ کچھ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کام معزالدین خاں نے کیا۔ انھوں نے اس میں ایک نئے حسن کا اضافہ کر کے اس کو نئی راہ پر ڈالا۔ ٹھمری کا خا

موضوع سنگار رس ہے۔ خیال گائیکی کی طرح اس میں وسعت نہیو
اسی لیے نئے نئے طریقوں سے بول بنانا، اور مرکیاں اور پھندے
انھیں سجانا ٹھمری گائیکی کا خاص انگ ہے۔ کدر پیا، واجد علی س
(اختر پیا) اور فرخ آباد کے للن پیا کی بنائی ہوئی ٹھمریاں بہت مشہو
آج بھی ذوق و شوق سے گائی اور سنی جاتی ہیں۔ دہلی کے کیرت د
گوسائیں عرف کنور شیام چاند پیا اور بیدل بھی نظرانداز نہیں
جا سکتے۔

ٹھمری، دیپ چندی، روپک، جھپ تال اور تین تال میں
جاتی ہے۔ ٹھمری میں تین انگ مانے جاتے ہیں۔ بنارسی انگ
لکھنوی انگ اور پنجابی انگ۔ بنارس والے بولوں کو بہت دھ
دھیرے بدلتے ہیں۔ مرکی اور تانوں کا استعمال کم کرتے ہیں ان
انداز میں ٹھہراؤ زیادہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ والے بھی بول بہت دھی
دھیرے بولتے ہیں لیکن مرکی اور تان کا استعمال خوب کرتے ہیں۔ بر
کو نئے نئے انداز سے سجاتے ہیں۔ تیسرا ہے پنجابی انگ جس میں
سُروں کے بجائے بارہ سُروں کا استعمال عموماً کرتے ہیں اور ٹھ
کو بہت تیزی سے بڑھاتے ہیں۔ اس میں ٹپا انگ (جو خاص پن
کی ایجاد ہے) کی سی تانیں لیتے ہیں۔ بول کم بناتے ہیں۔ جس طرح بن
انگ کجری چیتی اور ایسے ہی دوسرے لوک گیتوں سے متاثر ہے
اسی طرح پنجابی انگ بھی پہاڑی، ماہیا اور اس قسم کے دوسرے ا
گیتوں سے متاثر ہے۔ زیادہ تر ٹھمری آسان راگوں میں گائی جاتی

علم موسیقی کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ ان تمام راگوں
جو پرانے اصول تھے اور سنگیت شاستروں میں اُن کے جو قواعد منض
تھے انھیں برابر توڑا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے ہندوستانی سنگیت
ترقی نہیں بلکہ تنزلی ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال صحیح نہیں ہے
ترقی کرتی جا رہی ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں تبدیلی ہوتی جا رہی ہے۔
ہے کہ موسیقی کا شعبہ بھی نئے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سک
تھا اور اس میں بھی تبدیلیاں ناگزیر تھیں۔ اس لیے موسیقی نے بھی نئی را
اختیار کیں اور اسے تنزلی نہیں بلکہ ترقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔
ان تمام تبدیلیوں کے باوجود آج بھی ٹھمری میں عظمت، وقار میں منظ

خیال میں موسیقار کی اپنی شخصیت کا اظہار اور ٹھمری میں صنفِ نازک کا پورا پورا حسن چھایا ہوا ہے۔ یہ موسیقی کے پورے جسم کے مختلف اعضا ہیں۔

دُھرپد دماغ ہے، دل خیال اور ٹھمری پاؤں جو تھرک تھرک کر ذوقِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ یہ تینوں اصنافِ موسیقی یعنی دھرپد، خیال اور ٹھمری اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان تینوں فن پاروں میں سے خیال ہی ایسی گائکی ہے جو ہر اعتبار سے ہر تقاضے کو پورا کر سکتی ہے تو بالکل صحیح ہوگا۔ نہ تو دھرپد کی طرح اس میں ضرورت سے زیادہ پابندیاں ہیں اور نہ ٹھمری کی طرح ایک مخصوص کیفیت کا ہی اُس میں اظہار رہتا ہے۔ دراصل خیال کا انگ ہر کیفیت کا بڑے حسن سے احاطہ کر لیتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ خیال گائکی میں وہ ترقی نہیں ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ فنِ موسیقی مختلف گھرانوں میں بٹ گیا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف گھرانوں نے اِس فن کی نہ صرف پرورش کی بلکہ اُس کو غیر ملکی بادِ سموم سے محفوظ رکھا، نہیں تو برطانوی حکومت کے دور میں یہ فن بالکل تباہ ہو جاتا۔ لیکن موسیقی پر اُن کے اِس احسان کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے موسیقی کو اپنی ہی ملکیت بنالیا۔ اپنے خاندان کے علاوہ دوسرے کو سکھانا معیوب سمجھا جانے لگا۔ جہاں اُن گھرانوں نے اعلیٰ فن کار پیدا کیے وہاں ایسے لوگ بھی منظرِ عام پر آگئے جن کی آوازیں اس لائق نہیں تھیں کہ موسیقی جیسے اعلیٰ فن کے لیے وہ اپنی تمام عمر صرف کرتے۔ ایسا بھی ہوا کہ دوسرے گھرانوں کے بولوں کے حسن اور ان کی اہمیت کو محسوس نہ کرتے ہوئے فقط تانوں پر ہی اکتفا کیا گیا اور ایسی ایسی ترکیبیں پیدا کی گئیں جس نے کلاسیکی موسیقی کو بے ہنگم بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ کلاسیکی موسیقی سے کم دل چسپی لینے لگے۔ ان کا دھیان ہلکی پھلکی موسیقی کی طرف بٹنے لگا۔ خیال میں بھی گلے کی اس ورزش نے سُروں کی سچائی اور مٹھاس کو بالکل ختم کر دیا۔ گانا بنیادی طور پر آواز کی مٹھاس ہے جس کو سُروں کے باقاعدہ آتار چڑھاؤ سے دکھایا جاتا ہے۔ ایسا گانا جس میں مٹھاس نہ ہو، خالی فن ہو، بہت روکھا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ خیال میں اور بھی اپنا پن پیدا ہونا چاہیے لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ خیال گائکی زمانہ جدید کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے تو یہ کہنا صحیح نہ ہوگا۔

قدیم ہندوستان میں تفریحات

(بسلسلہ صفحہ ۱۷)

میں جو عدد برآمد ہو اُس کی مدد سے فیل کا راستہ صاف کیا جا سکتا ہے۔ فیل کی چھوٹی سے چھوٹی چال ایک خانہ، اور بڑی سے بڑی پندرہ خانے ہے، کیونکہ بعض اوقات پانسے میں دو "۴" یا دو "۶" آسکتے ہیں، یا ایک "۴" اور ایک "۶"۔ بہرحال اِن میں سے ایک عدد برآمد ہونے پر فیل بساط کے اِس سرے سے اُس سرے تک جا سکتا ہے اور دوسرے پانسے کے عدد کے مطابق پھر دوسرے سرے سے اِس سرے تک واپس لوٹ سکتا ہے، بشرطیکہ راستے میں کوئی دوسرا مُہرہ حائل نہ ہو۔ اِن دونوں عددوں کے نتیجے میں فیل اپنی چالوں کے باعث بساط کے دونوں کونے گھیرے رہتا ہے۔

"تمام مُہرے اپنی علیحدہ علیحدہ قیمت رکھتے ہیں؛ اور چونکہ پٹے ہوئے مہرے سب کھلاڑی کے پاس چلے جاتے ہیں اس لئے مہروں کی مقررہ قیمت کے اعتبار سے کھلاڑیوں کو بازی میں جیت کا حصہ ملتا ہے۔ شاہ کی قیمت ۵ ہے، فیل کی ۴، اَسپ کی ۳، رُخ کی ۲، اور پیادہ کی ۱۔ جو کوئی ایک شاہ مارے گا اُسے ۵ ملیں گے، جو دو مارے گا اُسے ۱۰ ملیں گے، جو تین مارے گا اُسے ۱۵، بشرطیکہ اُس کا اپنا شاہ اُس وقت تک نہ پٹا ہو۔ لیکن اگر کھلاڑی کے پاس اپنا شاہ بھی ہو اور وہ تین شاہ اور مار لے تو اُسے ۵۴ ملیں گے۔ قیمت میں یہ اضافہ حساب کے کسی اُصول کے ماتحت نہیں، بلکہ کھلاڑیوں کی باہمی رضامندی پر منحصر ہے[۱۲]۔"

[۱۲] البیرونی: کتاب الہند۔

چند پرند کا نظام زندگی

ڈی۔ ایس۔ براڈ

جانوروں، خاص کر جنگلی جانوروں اور جنگلی پرندوں کے
سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بعض جانور ہماری نظروں میں ب
ہوتے ہیں۔ بعض پرندوں کو ہم مصیبت قرار دیتے ہیں۔ لیکن و
بدصورت ہوں یا ہمارے لیے پریشان کن، اُن کی زندگی کا مط
نہ صرف دلچسپ ہے اور اس مطالعہ سے نہ صرف ہماری معلو
میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ہم میں یہ احساس بھی پیدا ہوسکتا ہے
" اشرف المخلوقات" انسان اور حیوان کی زندگی میں کہاں تک
مماثلت پائی جاتی ہے۔

ابھی تک ہم یہ سمجھتے رہے ہیں کہ انسانوں میں " زر۔ زمین
کے لیے لڑائی ہوا کرتی ہے لیکن جانوروں کے لیے نہ زر کا سوا
ہوتا ہے نہ زمین کا۔ چنانچہ اگر نر پرندے آپس میں لڑتے ہیں ت
جاتا ہے کہ یہ مادہ کے لیے لڑتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اب
پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یہ لڑائی مادہ کے لیے نہیں بلکہ کسی زم
ملکیت کے لیے ہوتی ہے۔

پرندہ اپنی جاگیر کی حد بندی اپنے گیت کے ذریعہ کرت
اگر اس کی جائداد محفوظ ہے تو اسے ایک تمیزدار دلہن حاص
میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ چوپائے تو کی دنیا میں رہتے ہیں
ہے کہ شیر ببر اور شیر اپنے حلقۂ اثر و رسوخ کی حد بندی اپنے
سے کرتے ہیں اور دریائی گھوڑے اپنی لید سے۔ اگر کوئی اجن
سحر زدہ حلقے کے اندر آجائے تو اس کی شامت آجاتی ہے۔

یہ تو بہت سے لوگ جانتے ہوں گے کہ چیونٹیوں، دیمک
شہد کی مکھیوں کی اجتماعی زندگی کتنی باسلیقہ ہوتی ہے۔ کہا جاتا
کہ اگر کسی دن بہار کے زمانہ میں جب دھوپ خوب نکلی ہوئی ہو ا
پھولوں سے لدے ہوئے ہوں، کوئی شہد کی مکھی وہ جگہ دیکھ لے
جہاں سے بہت سا شہد حاصل کیا جاسکتا ہے تو وہ اپنے
پر واپس آکر دوسری مکھیوں کو یہ اطلاع دیتی ہے۔ دوسری مکھ
بے تابانہ اس کے گرد جمع ہو کر مصروفِ رقص ہوجاتی ہیں۔ جب
ہو رہا ہوتا ہے تو خبر لانے والی مکھی اپنے انداز سے یہ ظاہر ک
کہ وہ جگہ جہاں اس نے ہر طرف پھول ہی پھول کھلے دیکھے ہیں کس

اور کتنی دور ہے۔ پتہ معلوم ہوتے ہی چھتے کی مکھیاں شہد اکٹھا کرنے کے لیے چل پڑتی ہیں۔

باسلیقہ اجتماعی زندگی صرف کیڑوں مکوڑوں ہی میں نہیں بلکہ دودھ پلانے والے بڑے جانوروں مثلاً ہاتھیوں، ہرنوں، چیتلوں بندروں اور جڑی بوٹیاں کھانے والے کئی جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ گوشت خور جانور بھی، جیسے شیر ببر اور شیر، جو بڑی محنت سے اپنے بچوں کو شکار کرنا سکھاتے ہیں، باقاعدہ خاندانی زندگی گذارتے ہیں۔ ہاتھیوں میں بچوں سے پیار صرف ماؤں تک محدود نہیں ہے۔ اکثر چچیاں اور موسیاں اپنے بھتیجے بھتیجیوں اور بھانجے بھانجیوں سے شفقت کے ساتھ پیش آتی ہیں اور بڑی احتیاط سے ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ان بچوں کی مائیں اگر اپنے کسی بچے سے اسی کی غلطی کی بنا پر ناراض ہو جاتی ہیں تو وہ ان ماؤں کی ناراضی کی بھی پروا نہیں کرتیں۔

بھیڑیوں کے گروہوں کا مشاہدہ کرنے والوں نے تفصیلاً ذکر کیا ہے کہ ان کی برادری کے اراکین درجہ بدرجہ بزرگوں کے ساتھ کیسی عقیدت اور نیازمندی سے پیش آتے ہیں۔ سر کا خم کر دینا، کان نیچے کر دینا، دُم کا زاویہ بدل دینا، یہ سب نوع انسانی کے کسی شاہی دربار کے پیچیدہ تکلفات کی طرح مسلّمہ آدابِ محفل نظر آتے ہیں۔

پرندوں اور جانوروں میں اپنے قبیلے یا بچوں کی خاطر قربانی کے جذبے کی شاندار مثالیں ملتی ہیں۔ ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ شام کے وقت بندروں کا ایک غول بڑے نظم و ضبط کے ساتھ اپنی آرام گاہ کی طرف جا رہا تھا۔ ان کے آگے آگے دو بڑے بندر تھے جو گویا قافلہ سالاری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ناگاہ ان کی نظر ایک تیندوے پر پڑی جو دبے قدموں ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگر تیندوا اس غول پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ نہ صرف کئی بندروں کو مار ڈالتا بلکہ بہت سے اس بھگدڑ میں اپنی جانیں گنوا بیٹھتے۔ لیکن دونوں بڑے بندر جنھیں محبِ قبیلہ کہنا چاہیے، آہستہ آہستہ پیچھے مڑ کر تیندوے پر، جو اپنی نظریں بڑے جھنڈ پر گاڑے ہوئے تھا، جھپٹ پڑے اور بڑے وحشیانہ طور سے اس کی گردن پر جگہ جگہ



کاٹ کھایا۔ تیندوے نے اپنے دو ہی تھپڑوں میں ان کا کام تمام کر ڈالا لیکن زخموں کی وجہ سے آخرکار خود بھی مر گیا اور بندروں کی برادری بخیر و عافیت اپنی منزل مقصود پر جا پہنچی۔

ایک عظیم فرانسیسی ادیب مچلے نے کہا ہے "پرندے اس زمین پر اس حالت میں بھی رہ سکتے ہیں جب یہاں آدمی بالکل نہ ہوں لیکن پرندوں کے بغیر آدمی یقیناً نہیں رہ سکتے"۔ منرالائق فتح علی اور ڈاکٹر سلیم علی نے بھی اپنی کتاب "ہندوستانی پرندوں کے بارے میں" بتایا ہے کہ ہم خوراک اور بہت سی دیگر چیزوں کے لیے مکمل طور پر حیواناتی اور نباتاتی دنیا پر انحصار رکھتے ہیں۔ لیکن عام لوگوں کو اس کا احساس بہت کم ہے۔ البتہ ذیل کی سطور سے اس امر کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائیگا کہ پرند و چرند انسانی زندگی میں کتنے دخیل ہیں۔

یہ تو ہر کوئی جانتا ہے کہ ٹڈی دَل فصلوں کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ اس تباہی خیز وبا پر قابو پانے کے لیے ایک عالمی ادارہ قائم کیا گیا ہے اس ادارے نے دریافت کیا ہے کہ سفید لق لق اور گلابی مینا ٹڈی دل کے شدید خطرے کا مقابلہ کرنے میں بڑے کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ ٹڈی دل وسط ایشیا میں خوب پیدا ہوتا ہے اور وہاں کے لاکھوں پرندوں اور

سی گندگی دور کر دیتے ہیں۔ اگر کسی غیر آباد علاقے میں کوئی لاوارث نعش پڑی سڑتی ہوتی ہے تو گدھ اُسے بھی ٹھکانے لگا دیتے ہیں اور اس طرح گرد و پیش میں گندگی اور بدبو نہیں پھیلنے دیتے۔ الو، عقاب، مینا اور نیل کنٹھ فصل کو نقصان پہنچانے والے لاتعداد کیڑوں اور چوہوں وغیرہ کو کھا کر کسان کا بڑا بھلا کرتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ پرندے کبھی کبھی گائے بھینسوں کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کیڑوں مکوڑوں کو زیادہ قریب سے تاڑنا چاہتے ہیں۔ اور اگر گائے یا بھینس پر کوئی کیڑا مکوڑا ہوتا ہے تو یا تو اُسے کھا لیتے ہیں یا ان جانوروں کے قریب سے جو کیڑے گزرتے ہیں اُنھیں پکڑ لیتے ہیں۔ بعض پرندے مثلاً بگلے، مویشیوں کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں اور ان کیڑوں مکوڑوں کو جنھیں مویشی ہلا جلا دیتے ہیں جھپٹ اپنی چونچ میں دبوچ لیتے ہیں۔ معمولی چڑیا بھی جسے عام طور پر حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے بہت سے کیڑوں کی وباؤں کو ختم کرتی ہے۔ کہاوت ہے کہ بہترین کرم کش دوا کرم خور پرندہ ہے۔

بعض پرندے اپنی مادہ کو رجھانے کے لئے جو انداز اختیار کرتے ہیں وہ بہت دلچسپ اور پر لطف ہوتا ہے۔ مور کا (جو ہمارا قومی پرندہ ہے) اپنے خوش نما پروں کو پھیلا کر رقص کرنا خاص طور سے نہایت دل فریب منظر ہوتا ہے۔

بعض جانوروں کی سونگھنے کی حس بڑی تیز ہوتی ہے۔ کتے کو اس سلسلہ میں بڑی خصوصیت ہے۔ چنانچہ پولیس بھی مجرموں کی کھوج لگانے کے لیے کتے استعمال کرتی ہے۔ یہ کتے مجرم کے کسی کپڑے کو سونگھ کر یا اس کے پاؤں کے نشانات کو سونگھ کر اکثر پولیس کو مجرم تک پہنچا دیتے ہیں چاہے وہ مجرم کہیں بھی چھپا بیٹھا ہو۔ پرندوں کی نظر بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ مشاہدے سے پتہ چلا ہے کہ ایک ابابیل جو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑی جا رہی ہو سو گز دور مچھر کو دیکھ لیتی ہے۔ ایک عقاب تین سو فٹ کی بلندی سے چوہا کو دیکھ لیتا ہے۔

دوسرے جانوروں اور پرندوں میں بلا کی دوسری صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ چمگادڑ ایک باقاعدہ صوتی نظام رکھتے ہیں۔ وہ ایسی آوازیں نکالتے ہیں جو انسانوں کو سنائی نہیں دیتیں۔ مگر ان آوازوں کی گونج

ان کے بچوں کی خوراک یہی ٹڈیاں ہیں۔

کوے کو سبھی لوگ ناپسند کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ چیلوں کے ساتھ مل کر چھوٹے موٹے مردہ جانوروں اور ہمارے گھروں کے آس پاس کی

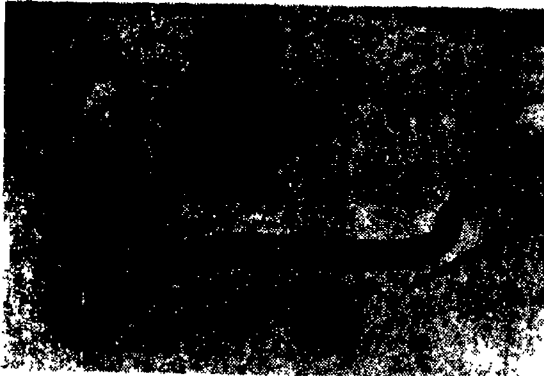


سے کیڑے اُچھلتے ہیں یا ددر چمگادڑوں کو ان کا ٹھکانا معلوم ہوتا ہے
وہ گھپ اندھیرے میں اپنے شکار پر اس طرح جھپٹتے ہیں کہ کیا مجال جو
نشانہ خطا ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دیوار، دن اور دوسری رکاوٹوں
سے یہاں تک کہ کسی تاریک کمرے میں پھیلے ہوئے نازک تاروں کے
بیچ سے صاف بچ کر نکل جاتے ہیں۔ وہ اکثر کافی تیز چلتے ہوئے پنکھے کے
پھلوں کے بیچوں بیچ اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں لیکن زخمی نہیں ہونے
پاتے۔

نقل مکانی کرنے والے پرندوں میں رُخ کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔
بطخیں اور ہنس ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اپنی نسل کشی کی جگہوں
پہ پہنچتے ہیں اور اکثر وہ سال بہ سال اس جگہ آتے ہیں۔

قدیم مشرقی فکر و نظر نے تمام زمینی زندگی کے اتحاد پر ہمیشہ زور
دیا ہے۔ سائنس کی پیش قدمی ہمیں رفتہ رفتہ اس نقطے پر واپس لا رہی ہے۔
ہمارے ملک میں اپنے جانوروں اور چرند پرند کو تباہی سے بچانے کی
مہم کو جاری ہوئے دس سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ خط سرطان
کے جنوب میں واقع براعظم افریقہ کے بعد بھارت، جانوروں اور
پرندوں کی انواع و اقسام کے اعتبار سے، دنیا کے تمام ملکوں سے
زیادہ مالا مال ہے۔ لیکن اگر اِن جانوروں اور چرند پرند کا شکار کھیلنے کی
یہی رفتار رہی تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اور آنے والی نسلیں قدرت
کے ان عجوبوں سے محروم ہو جائیں گی اور وہ دن ہمارے لئے بڑا
افسوس ناک ہوگا جب ہمارے پڑپوتے ہم سے یہ پوچھنے لگ جائیں گے
کہ "جنگلی جانور کیا ہوتا تھا؟"

ہندوستان میں ہر سال جنگلی جانوروں کا ہفتہ اسی غرض سے
منایا جاتا ہے کہ نوجوانوں اور بچوں کے ذہنوں میں خدا کی مخلوق کی مختلف
اشکال کے لیے احترام پیدا کیا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ
جاندار کو ہلاک کر دینے اور مثلاً کھا لینے کی بہ نسبت ان کا مشاہدہ اور
مطالعہ زیادہ دلچسپ ہوتا ہے۔ ہر سال جنگلی جانوروں کی پناہ گاہوں
اور قومی پارکوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر سال بڑھتی ہوئی تعداد
میں لوگ ہمارے چڑیا گھروں، جنگلی جانوروں کی پناہ گاہوں اور
قومی پارکوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ سال بہ سال نوجوانوں میں پرندوں
اور جنگلی جانوروں کی عادتوں کے مشاہدے اور مطالعے کا شوق بڑھتا
جاتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس دلچسپی کا بیج آخرکار ایک قومی ضمیر
کے تنومند شجر کی صورت اختیار کرے گا۔



نذرِ عقیدت

راجیندر نرائن سکسینہ بسمل

اے مادرِ ہندوستاں!

بے شبہ، بے شک، بے گماں — تیری زمیں جنت نشاں
ہر ذرہ تیرا اک قمر — ہر راہ تیری کہکشاں

اے مادرِ ہندوستاں!

ہے شان لاثانی تری — عظمت ہے لاثانی تری
دربان تیرے قصر کی — ہیں پربتوں کی چوٹیاں

اے مادرِ ہندوستاں!

کشمیر کی وہ سرزمیں — وہ رشکِ فردوسِ بریں
اک رخ ہے تیرے حسن کا — جو ہو نہیں سکتا بیاں

اے مادرِ ہندوستاں!

جھرنوں کے نغموں کی صدا — چشموں کے بہنے کی ادا
جنگل کی وہ رومانیت — ہے اور دیشوں میں کہاں

اے مادرِ ہندوستاں!

یہ سب عطیہ جات ہیں — اور ایسے احسانات ہیں
بے حد ہیں جن کی برکتیں — ممکن نہیں جن کا بیاں

اے مادرِ ہندوستاں!

تو نے ہمیں پیدا کیا — یہ تن ہے تیری خاک کا
کھاتے ہیں مٹی کی قسم — تجھ پر نچھاور جسم و جاں

اے مادرِ ہندوستاں!

اگرا ینڑ ۱۸۸۵

راہِ عمل

عظمت عبدالقیوم خاں

پہاڑ کی بلندی نے پکارا
اگر تم کو ہے اپنا دیس پیارا

تو پیمانِ وفا کے گیت گاؤ
لہو کے دیپ راہوں میں جلاؤ
سہارا سخت محنت کو بناؤ
جو کرنا چاہتے ہو کر دکھاؤ

فضاؤں میں ابھی جھنکار سی ہے
وہی حالات ہیں خطرہ وہی ہے
ملا ہے وقت تو یہ قیمتی ہے
شعورِ زندگی ہی زندگی ہے

تمہارا جوش دریا کی روانی
تمہیں سے بزمِ ہستی کی جوانی
تمہارے ساتھ روحِ کامرانی
اندھیروں نے تمہیں سے ہار مانی

حسیں تاج و اجنتا کے فسانے
نئی تاریخ کے دلکش ترانے
یہ تہذیبیں یہ صدیوں کے خزانے
صدا دیتے ہیں کتنے ہی زمانے

تمہارا فرض ہے ان کو بچانا
دیوں کو ہر اک دل میں جگانا
خیال و فکر کے ایواں سجانا
زمیں پر آسمانوں کو جھکانا

نگاہِ غیر اب اٹھنے نہ پائے
اجالوں پر نہ کوئی رات چھائے
کمی عزم و عمل میں رہ نہ جائے
نیا سورج افق پر جگمگائے

پہاڑ کی فصیلوں نے پکارا
اگر تم کو ہے اپنا دیس پیارا

دسمبر ۱۹۶۳ء

(افسانہ)

امباپالی کی راہیں

جنید شرفی

آج سے ہزاروں سال پہلے وہ کاپل سے روانہ ہو کر ہستنا پور کے راستے تکشلا جا رہا تھا۔ زندگی کی عظمت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کیلیے!

ویشالی اس کا گھر تھا، ویشالی کے کھیت میں اس نے اپنے باپ کے ساتھ محنت کی تھی آم، جامن اور کیلے کے باغ لگائے تھے۔

ویشالی اس کے حسین خوابوں کی سرزمین ـــــ جہاں کوئی غلام نہ تھا کوئی راجہ نہ تھا۔ سب اپنے تھے ایک دوسرے کے لیے معصومانہ قرب رکھتے تھے۔

جب وہ چھوٹا تھا تو سون ندی کے کنارے بیٹھ کر اپنے خواب بُنا کرتا اور اسے اپنی اس پُرمسرت آزادی پر بے پناہ خوشی ہوتی ـــــ اس نے ویشالی کے سب سے بڑے پنڈت سے علم حاصل کیا تھا ـــــ اب وہ تکشلا جا رہا تھا۔ جہاں انسان دوسروں کو خوف زدہ نہیں کرتے تھے۔

جب وہ پنچال کی راجدھانی کانیہ کبج پہنچا تو اس نے وہاں کی سندر راجکماری کو دیکھا، جس کے بالوں میں ساون کی گھٹائیں جھک آئی تھیں، جسم صندلی تھا، اعضا اتنے متناسب تھے کہ جیسے خدا نے اپنی ساری توجہ اسی پر صرف کی ہو۔ اس کے ہاتھ گلاب کی ٹہنیوں سے زیادہ نازک تھے راجکماری شاہی باغ کے ایک کونے میں بیٹھی ہنس کے جوڑے کو دیکھ رہی تھی۔

وہ راجکماری کو دیکھ کر ٹھٹک گیا ـــــ امباپالی کے دیس کا تھا، جو کیسر جیسی تھی، جس کے ہاتھ بھی پدم سرس جیسے تھے۔

"تم کون ہو یووک؟"

وہ شاہانہ جلال دیکھ کر گھبرا گیا۔

"میں ویشالی کا ہوں"، اس نے اپنے حواس کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔

اس نے آج تک راجکماری نہیں دیکھی تھی۔ البتہ راجکماریوں کی کہانیاں بہت سنی تھیں۔ ایسی ہی ایک راجکماری اس کے تصور کے گوشے میں تھی۔ اسے اپنے خوابوں کے دروازے کھلتے ہوئے نظر آئے۔

راجکماری ایک لمحہ تک اسے دیکھتی رہی۔ اسے یہ نوجوان عجیب لگا۔ تیکھے تیکھے نقوش کشادہ پیشانی، چوڑا چکلا سینہ۔

راجکماری نے اپنے دل کے شبہ کو دور کرنے کے لیے پوچھا۔ "تم ویشالی کے شہزادے ہو؟"

"نہیں"۔ اس نے مسکراتے ہوئے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

راجکماری حیرت اور تعجب کی نظروں سے دیکھنے لگی۔ "کیا ویشالی میں شہزادے نہیں ہوتے؟"

اسے راجکماری کی باتیں عجیب لگیں۔ یہ کیسی راجکماری ہے؟ یہ کتنا انوکھا سوال ہے؟

"نہیں راجکماری جی۔ وہاں کوئی بھی شہزادہ نہیں ہے تم سب لوگ برابر ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے یگانگت اور گہری محبت رکھتے ہیں۔ وہاں تو کوئی 'شہزادہ' لفظ کے معنی بھی نہیں جانتا۔ ویشالی میں ہماری حکومت ہے حکومت میں ہم سب آپس کے شریک ہیں۔ سب مل کر حکومت بناتے ہیں۔

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتی رہی۔

وہ مسکرایا۔ "میں نے بچپن میں ماتا جی سے شہزادوں اور راجکماریوں کا تذکرہ سنا تھا، جن کے بہت سارے نوکر ہوتے ہیں، بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں، ملک کی حفاظت راجہ کی فوج کو کرنی پڑتی ہے، وہ بہت...."

کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہمارے پڑوسی راج، مگدھ میں ایک راجہ کی حکومت ہے وہ بہت بڑا راجہ ہے! اس میں بد دماغ اور مغرور راجہ کی ساری خصوصیتیں ہیں۔"

"تم راج نرتکی امبا پالی کو جانتے ہو؟"

وہ امبا پالی کے نام پر مسکرایا ـــــ جب وہ انکاچل سے چلا تھا، اس نے راستے میں جہاں جہاں پڑاؤ ڈالا تھا لوگوں نے امبا پالی کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ امبا پالی کے نرت کی شہرت سارے ہندوستان میں ہے۔ وہ دل ہی دل میں ہنسا، سارا ہندوستان پریم اور پیار کا ایک سمندر معلوم ہوا۔

گھاگھرا ندی کے کنارے بہت بڑا آموں کا باغ تھا۔ سارے لڑکے لڑکیاں آموں کے درختوں پر جھولا ڈالے انجانے پریم کے سپنوں کا گیت گا رہے تھے۔ یہ بھولے بھالے ہندوستانی عوام کا گیت تھا، سندر، من بھاون اور انوکھا!

اس کے دل میں نہ جانے کتنے دل کش جذبات کا طوفان مچل رہا تھا۔ اس نے باغ میں پہنچ کر اپنا گھوڑا روک دیا۔ گھاگھرا کی سطح چاندنی کی طرح دھوپ میں چمک رہی تھی۔ مدماتی اور ٹھنڈی ہوا آموں کے پتوں میں سرسراتی ہوئی اس کے جسم کو چھو رہی تھی۔

لڑکے اور لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔ اجنبی سمجھ کر دیکھنے لگے۔ یہ سارے کے سارے اس کی طرح جوان لڑکے لڑکیاں تھے جو اپنے دلوں میں زندگی کی بھرپور دھڑکنیں لیے ہوئے جوان امنگوں کا سندیسہ سنانے کے لیے تیار رہتے تھے۔

"تم کہاں سے آئے ہو اجنبی؟" سبھوں نے پرجوش اور دلوں کو گرمانے والی آواز میں پوچھا۔

سب اپنے چہرے پر محبت اور خلوص کا پرتو لیے ہوئے تھے۔

اس نے اپنی آنکھوں سے ان محبت بھرے چہروں کو چوم لیا۔ ہر ایک کا دل اسے گلے لگانے کو تیار تھا۔ جیسے ان ہی میں سے کوئی کالے کوسوں کا سفر کر کے پہنچا ہو اور وہ بچھڑے ہوئے ساتھی کو پا کر بہت خوش ہوں۔ یہ آدرش ہندوستان کے باشندے تھے۔ انہیں راجاؤں کے باہمی اختلافات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سارا ہندوستان ان کا گھر تھا۔ سب ان کے بھائی تھے

وہ مسکراتا ہوا بولا۔ "میں ویشالی سے آیا ہوں اور ٹیکسلا جا رہا ہوں۔"

سبھوں نے اس اجنبی اور انوکھے جوان کو غور سے دیکھا۔ ان کا دل مسرت سے دھڑکنے لگا۔ وہ اتنے دور دراز کا سفر کرنے والے نوجوان کو تعجب اور حیرت کی ملی جلی نظروں سے دیکھنے لگے۔

"تم ٹیکسلا جاؤ گے؟"

"ہاں۔ جب ملک کو ضرورت ہوتی ہے تو ملک کے نوجوان سمندر کی گہرائی ناپنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ آج میرے ملک کو بھی ایسی ہی ضرورت آ پڑی ہے۔ ہم پر پڑوسی راج حملہ کرنا چاہتا ہے۔ ٹیکسلا والے ہمارے دوست ہیں۔ ہم وہاں فنون جنگ سیکھیں گے۔"

سبھوں کے چہرے پژمردہ ہو گئے۔

"تم امبا پالی کو جانتے ہو؟ کیا وہ اتنی خوبصورت ہے کہ اندر لوک کی پریاں بھی اس کے آگے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں؟"

"ہاں، وہ بہت خوبصورت ہے، لیکن میرے پیارے بھائی بہنو! سندرتا مٹ جانے والی شے ہے۔ امبا پالی نے کلا کے دروازے پر سادھنا کے چراغ جلائے ہیں۔ اس کی نرت کلا آکاش کے سمان ہے۔ اس کا فن، اس کی عظمت اپنی جگہ ہے۔ مگر آج ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ سارے ویشالی پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔"

"تم میرے مہمان ہو۔" ایک لمبی سی چھریرے بدن والی لڑکی اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ "ہم سب تمہاری مصیبتوں میں ساتھ دیں گے۔ تمہارے دیس کے لیے لڑیں گے! اور میں ویشالی کے لیے لڑنے والے جوانوں کی خدمت کروں گی۔" اس کی آواز کپکپا گئی۔

کانیہ کبج کی راجکماری نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

"ہاں۔ اس وقت ہم کچھ اور یاد کرنا نہیں چاہتے۔ سارے ویشالی

پر مصیبتوں کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ پڑوسی راجہ ویشالی کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر ہمارے نوجوان اس کی حفاظت کے لیے تیار ہیں، وہ اس کے محافظ ہیں۔"

راجکماری عقیدت سے اسے دیکھنے لگی۔ "تم تکشلا جاکر کیا کروگے نوجوان؟"

"تکشلا جاکر ہم علم سیکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے بہت سے نوجوان وہاں پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے یہاں کی عورتیں بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑنے کو تیار ہیں۔ وہ اپنے جسم کو زیوروں سے سجانے کے بجائے تلوار سے سجانا چاہتی ہیں۔ انھیں اس سمے امباپالی جیسی نازک بدن ہستیاں پسند نہیں، وہ محنت کرنا چاہتی ہیں تاکہ ان کے ہاتھ فولاد کی طرح سخت ہوں، اور جب مرد میدان جنگ میں لڑ رہے ہوں تو عورتیں اس جنگ میں زخمی ہونے والوں کی مرہم پٹی کرسکیں۔ ہماری عورتوں نے امباپالی کے ہاتھ واپس کر دیے ہیں۔ ویشالی بچھو کی سورماؤں کا دیس ہے جن کی زندگیاں میدان جنگ کے لیے ہیں۔"

راجکماری جذبات کے رو میں بولی۔ "بیشک وہ سب مہان ہیں جو وطن کی حفاظت کے لیے مرتے ہیں۔ جب تم لوٹو تو مجھے اپنے دیس لے چلو تاکہ میں وہاں کے لوگوں کو قریب سے دیکھ سکوں۔"

وہ مسکرایا اور اپنی راہ پر لگ گیا۔

ہزاروں سال بعد سارا ہندوستان ایک ہے، یہاں کوئی اختلاف نہیں۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔ ہم بھی ہندوستان کے بہادر سورماؤں کی اولاد ہیں۔ دغاباز چینیوں نے ہماری غیرت کو للکارا ہے۔ ہماری سرحدوں پر بری نظر ڈالی ہے۔ ہماری عورتیں بھی دیس کے لیے زیور دے رہی ہیں۔ وہ جنگ کے زمانے میں آرائش کو پسند نہیں کرسکتیں۔ زخمیوں کے علاج کے لیے ڈاکٹری اور نرسنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں۔ وہ اس وقت امباپالی کے طریقوں کو اپنانا نہیں چاہتیں ——
جس طرح ویشالی کی عورتوں نے مگدھ راجہ کے حملے کے زمانے میں اپنے سارے فیشن چھوڑ دیے تھے۔ انہیں اس کی نقل پسند نہیں تھی۔

آج ہمیں بھی امباپالی کی آرائش اور اس کے طریقوں کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں مضبوط ہاتھوں کی کام کرنے والے ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ وہ بھی امباپالی جیسے ہاتھ واپس کر دیں گی تاکہ ہم بزدل اور عیار چینیوں کو اپنے دیس سے باہر نکال دیں۔

شک کی دیواریں

(بہ سلسلہ صفحہ ۲۴)

اور پھر بے شمار سسکیاں غمناک فضا میں ڈوبتی چلی گئی تھیں۔ اور بلدیو پاگلوں کی طرح اپنے کانوں پر انگلیاں رکھے بھاگتا چلا گیا تھا اور پھر شاید کسی پتھر سے ٹکرا کر گر پڑا تھا۔ وہ جب ہوش میں آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاک بنگلہ کا چوکیدار اُسے سہارا دیتے ہوئے کہہ رہا ہے۔

"بابو جی! آپ کہاں چلے آئے۔ اس علاقہ میں آنے کی منادی ہے۔"

بلدیو نے دحشت ناک نظروں سے چوکیدار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک عورت کی بھرائی ہوئی آواز سنی تھی۔ کون تھی وہ عورت؟ کون تھی وہ؟"

"بابو جی! ایسی ہی اندھیری راتوں میں اس عورت کی بھٹکتی ہوئی روح کی آوازیں سنی گئی ہیں۔ سیکڑوں برس پہلے یہاں ایک قبیلہ آباد تھا اور قبیلہ کے سردار کی عورت امینہ کو اُس کے شوہر نے شک کی بنا پر قتل کر ڈالا تھا۔ امینہ کی بھٹکتی ہوئی روح آج بھی اس پر کیے گئے اُس ظلم کی فریاد کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ مگر چھوڑیئے بابو جی، آپ کو ان باتوں پر کہاں یقین آئے گا۔"

اور بلدیو اس سے زیادہ نہیں سن سکا تھا۔ وہ پھر بیہوش ہوگیا تھا اور دوبارہ ہوش میں آنے سے قبل وہ ذہنی تشنج کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ "امینہ مجھے معاف کردو۔ امینہ مجھے معاف کردو۔" اور ادھر اُس کے سرہانے بیٹھی ہوئی بلک بلک کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"رمیش انھیں کیا ہوگیا ہے۔ جلدی سے کسی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کرو۔"

اترپردیش شاہ راہ ترقی پر

انعامات کے لیے کتابیں طلب ـــــ مٹی کے سب سے اونچے بند کی تعمیر ـــــ ایک صاف ستھرا تمثیلی گاؤں ـــــ صنعتی اغراض کے لیے بجلی کی سپلائی ـــــ حج کی خبریں ـــــ جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے وظیفے ـــــ تقریباً ۱۴ ہزار افراد کو بڑھاپے کی پنشن ـــــ پراویڈنٹ فنڈ کی اضافہ شدہ شرح ختم ـــــ جلد اُگنے والے درخت لگانے کی اسکیم ـــــ پوڑی (گڑھوال) میں ہائیڈل اسٹیشن کے قیام کی تجویز ـــــ بچوں کا ڈرائنگ کا مقابلہ ـــــ متفرقات

حکومت اترپردیش نے انعامات کے لیے ملک بھر کے مصنفین سے ہندی، سنسکرت اور اردو میں اعلیٰ درجے کی طبع زاد تخلیقات اور ترجمے طلب کیے ہیں۔

ریاستی حکومت کے ہندی لٹریچر فنڈ سے ہر سال ادب، سائنس، فلسفہ، تعلیم، سیاسیات، تاریخ، معاشیات اور بچوں کے ادب سے متعلق کتابوں پر کل ۱۰۰۵۰ روپے کے ۴۷ انعامات دیے جاتے ہیں۔

ہندی کتابوں پر دیے جانے والے مختلف انعامات حسب ذیل ہیں:

پہلا انعام: (ہر انعام کی رقم ۵ ہزار ہے)۔ ہندی ادب پر تلسی اور رویندر انعامات۔ قانون اور فلسفہ قانون پر موتی لال نہرو انعام۔ سائنس پر بیربل ساہنی انعام۔ فلسفے پر ڈاکٹر بھگوان داس انعام۔ تعلیم پر مدن موہن مالویہ انعام اور سیاسیات یا معاشیات پر پنت انعام۔

دوسرا انعام: (ہر انعام کی رقم ڈھائی ہزار روپیہ)۔ افسانوں کے مجموعے یا ناول پر پریم چند انعام۔ رزمیہ شاعری پر نرالا انعام۔ ڈرامے پر پرساد انعام۔ تاریخ پر نریندر دیو انعام۔ سائنس پر ڈاکٹر کے این بھال انعام اور مجموعہ نظم یا جدید شاعری پر بال کرشن شرما 'نوین' انعام۔

ادب کو چھوڑ کر متفرق مضامین یا موضوعات پر مزید ۲۰ انعامات ۵۰۰، ۵۰۰ روپے کے دیے جائیں گے۔

اردو کتابوں پر دیے جانے والے انعامات درج ذیل ہیں:۔

۱۵۰۰ روپے کا غالب انعام۔ ۱۲۰۰ روپے کا اکبر الہ آبادی انعام، اور ۸۰۰ روپے کا رام پرشاد بسمل انعام۔ متفرق کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے پانچ اور انعام دیے جائیں گے۔

سنسکرت میں ۱۵۰۰ روپیہ کا کالی داس انعام۔ ایک ہزار روپیہ کا گنگا ناتھ جھا انعام اور ۵۰۰ روپیہ کا ایک اور انعام دیا جائے گا۔

علاوہ ازیں بچوں کی انسائیکلوپیڈیا پر ۱۵۰۰ روپے کا ایک انعام اور سائنس کی کتابوں نیز بچوں سے متعلق دوسرے متفرق موضوعات پر پانچ پانچ سو روپے کے دو انعام دیے جائیں گے۔

انعامات کے لیے محض ایسی کتابوں پر غور کیا جائے گا جو یکم جنوری ۱۹۶۳ء اور ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء کے درمیان شایع ہوئی ہیں۔ اگر انعام سے متعلق کمیٹی کسی ایسی کتاب کو جو انعام کے لیے نہیں بھیجی گئی ہے اعلیٰ درجے کی سمجھے گی تو اس کتاب پر بھی انعام کے لیے غور کیا جائے گا۔ اگر کسی موضوع پر اعلیٰ درجے کی کوئی کتاب موصول نہیں ہوگی تو اُس موضوع پر انعام نہیں دیا جائے گا

ہر کتاب کے آٹھ نسخے، اُس کی تاریخ اشاعت، مصنف کا نام اور پتہ نیز اس انعام کے نام کی تفصیل کے ساتھ جس کے لیے کتاب بھیجی جائے، سکریٹری پُرسکار وِچار سمیتی، ایجوکیشن "سی" ڈپارٹمنٹ یوپی گورنمنٹ۔ دو دھان بھون، لکھنؤ کے یہاں ۱۵ر فروری ۱۹۶۴ء تک بھیج دینا چاہیے۔

ضلع مرزاپور کے دادری گاؤں میں بیلن ندی پر مٹی کا ایک بند تعمیر کیا جا رہا ہے۔ یہ بند اُترپردیش کے سب سے اونچے مٹی کے بندوں میں سے ایک ہوگا۔

یہ بند ایک میل ۴ فرلانگ لمبا اور ۱۱۲ فٹ اونچا ہوگا۔ اس میں ۶۵۰۰ ملین مکعب فیٹ پانی جمع ہوگا جس سے ۸۹۲۱ ایکڑ کا رقبہ زیرِ آب ہو جائے گا۔

اس بند کا ۵۲۰۹ ملین مکعب فیٹ پانی ٹونس، لیری، گنگا اور کرزتی ندیوں کے دوآبوں میں قابلِ کاشت زمین کی آب پاشی کے لیے فراہم ہو سکے ہوگا۔

ان علاقوں میں ۲۰۳ میل لمبی نالیوں کا جال بچھا دینے کی تجویز ہے۔ ان نالیوں میں ۱۴ میل ۳ فرلانگ لمبی اصل نالیاں اور ۱۸۸ میل ۵ فرلانگ لمبی معاون نالیاں ہونگی۔ اصل نالیوں کی تعمیر کا کام پورا کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں ۶۲ میل اور ۵ فرلانگ لمبی معاون نالیاں بھی بنائی جا چکی ہیں۔

اس بند کی تعمیر میں ۸۵ر۰ کرور مکعب فیٹ مٹی کی کھدائی کا کام کرنا ہوگا جس میں سے ۵۰ر۱ کرور مکعب فیٹ مٹی کی کھدائی ہو چکی ہے۔

اُمید کی جاتی ہے کہ یہ بند سنہ ۶۶ - ۱۹۶۵ء میں بن کر تیار ہو جائے گا۔

یہ بند بیلن نہر سسٹم کا ایک جزو ہوگا جس میں اس وقت سرسی خزانۂ آب سے پانی آتا ہے۔ بیلن نہر کی صلاحیت ۹۳۷ سے بڑھا کر ۱۲۶۹ کیوسیکس کر دی گئی ہے تاکہ یہ نئے خزانۂ آب سے مزید پانی لے سکے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس بند سے مجموعی طور پر ۱۶۱۷۱ ایکڑ رقبہ، جس میں ۱۳۵۸۲۴ ایکڑ قابلِ کاشت رقبہ شامل ہے، مستفید ہو سکے گا۔
اس بند سے سالانہ ۶۳۸۶۷ ایکڑ اراضی کی آب پاشی ہوگی۔
اس بند کی تعمیر پر تخمیناً ۳۲۰۴۸۹۲۱ روپیہ صرف ہوگا۔

ضلع فتح پور کے دیوبائی ترقیاتی بلاک کا موضع مادھوپور آج ایک صاف ستھرا تمثیلی گاؤں بن گیا ہے۔ تقریباً سات سال پہلے شہر کے ایک باشندے شری برہما نرائن شکلا نے دیہی عوام کی خدمت کے پیشِ نظر مادھوپور کو اپنی مستقل جائے سکونت بنا لیا تھا۔ اس وقت گاؤں کی حالت بہت خراب تھی۔ گاؤں میں نہ تو سڑکیں تھیں اور نہ نالیاں اور نہ پینے کے پانی کے لیے کنوؤں کا ہی انتظام تھا۔ گاؤں میں ہر طرف گندگی اور مچھروں کی کثرت تھی۔ شری شکلا نے اپنی اَن تھک محنت و مشقت سے گاؤں کے باشندوں میں سخت محنت کرنے کا جذبہ پیدا کیا۔ شری شکلا کی لگن، دوراندیشی اور دیہی باشندوں کے لیے اُن کی انتہائی ہمدردی کا ہی نتیجہ ہے کہ آج گاؤں کی شکل بالکل بدل گئی ہے۔ اب گاؤں کی تمام سڑکیں پکی ہوگئی ہیں اور نالیوں کا بھی مناسب انتظام ہے۔ ایک اسکول بھی قائم ہو گیا ہے جس میں ۳۰ طلبا ہیں۔ ہر کنبے کے پاس چارہ کاٹنے کی ایک مشین ہے اور ہر کسان سائنسی طریقے سے کھیتی کرتا ہے۔ گاؤں کے کنوؤں کے پانی کو صاف رکھنے کے لیے بھی مناسب انتظام کر دیا گیا ہے۔ ایک سڑک نکالی گئی ہے جو گاؤں کو قریب ترین شاہ راہ سے ملاتی ہے۔

اس تبدیلی سے گاؤں کی معاشی حالت بھی بہتر ہوگئی ہے۔ عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو گیا ہے اور ان کی صحت بھی پہلے سے کہیں اچھی ہوگئی ہے۔ اب وہاں کی گلیوں میں لڑکے آوارہ نہیں گھومتے۔ ان کے کھیلنے کے لیے کھیل کود کا ایک میدان اور پڑھنے کے لیے ایک اسکول ہے۔ دیہی خواتین جو روایتی طور پر عوامی زندگی سے کنارہ کش تھیں اب ترقیاتی کاموں میں جوش و خروش سے حصہ لیتی ہیں۔ ان میں سے تین عورتیں پنچایت کی ممبر ہیں۔

دیہی رضاکار جماعت میں بھی لوگوں کو اس درجہ دلچسپی ہے کہ گاؤں کا ہر تن درست نوجوان شہری دفاع کے پروگرام میں گرم جوشی سے حصہ لیتا ہے۔

حکومت اتر پردیش نے صنعتی اغراض کے لئے بجلی کی سپلائی میں مزید آسانیاں فراہم کی ہیں اور اڈیشنل ڈائرکٹر انڈسٹریز اتر پردیش کانپور کو یہ اختیار دیدیا ہے کہ وہ حکومت کی منظوری حاصل کئے بغیر صنعتی ریاستوں میں صارفین کو صنعتی اغراض کے لئے مجموعی طور پر ۲۳۶۰۰ کیلوواٹ تک کے بجلی کنکشن منظور کر سکتے ہیں۔

مختلف صنعتی ریاستوں میں زیادہ سے زیادہ جتنی بجلی منظور کی جا سکتی ہے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔
بڑی صنعتی ریاستیں۔ علی گڑھ۔ میرٹھ۔ وارانسی اور لکھنؤ۔ ہر ایک کے لئے ۱۵۰۰ کیلوواٹ۔
درمیانی صنعتی ریاستیں۔ مرزاپور۔ بریلی۔ گورکھپور اور دہرہ دون ایک ایک ہزار کیلوواٹ۔ رڑکی ۷۵۰ کیلوواٹ۔
چھوٹی صنعتی ریاستیں۔ خورجہ اور مراد آباد ۵۰۰ - ۵۰۰ کیلوواٹ۔ اناؤ اور فرخ آباد ۲۰۰ - ۲۰۰ کیلوواٹ۔

خیرآباد اور اعظم گڑھ ۱۵۰ - ۱۵۰ کیلوواٹ۔
ہریجن صنعتی ریاستیں۔ فتح پور۔ روشن باغ (رام پور)۔ اندپور (دیوریا)۔ رانوپالی (فیض آباد)۔ کالپی (جالون)۔ سیجرو (مظفرنگر) برہانہ کوسی کلاں (متھرا)۔ رام نگر (وارانسی)۔ ہردوئی۔ بلرام پور (گونڈہ)۔ غازی پور۔ بلیا۔ بدایوں اور رائے بریلی ہر ایک کے لئے ۱۵۰ کیلوواٹ۔ ہلدوانی (نینی تال) ۲۰۰ کیلوواٹ
صنعتی ریاستوں کے محل وقوع۔ فیروز آباد۔ لکھیم پور کھیری۔ رام پور۔ مظفر نگر۔ شاہ جہاں پور۔ بارہ بنکی۔ ہاتھرس۔ فیض آباد اور مین پوری (ہر ایک کے لئے ۷۵۰ کیلوواٹ۔

ٹہریا (مراد آباد)۔ اترولی (علی گڑھ)۔ چوہڑپور (دہرہ دون) سلطان پور۔ گولہ گوکرن ناتھ (کھیری)۔ نگینہ (بجنور)۔ شیام منڈی (بلند شہر)۔ جسونت نگر (اٹاوہ)۔ لالورہ کھیرا (باندہ) سلیم پور (دیوریا)۔ بھرباد (ہمیرپور)۔ اورئی (جالون)۔ بہرائچ۔ بیکاپور (فیض آباد) بھری پیدہ (بریلی)۔ گھوسی (اعظم گڑھ)۔ پھولپور (الہ آباد)۔ اور للت پور (جھانسی) (ہر ایک کے لیے ۱۰۰ کیلواٹ)۔ جون پور (۲۰۰ کیلواٹ)۔

ریاستی حج کمیٹی نے ۱۹۶۴ء میں حج کرنے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مغل لائن لمیٹڈ بمبئی کے یہاں اپنی نشستیں پہلے سے ریزرو کرالیں۔ حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان کو جہاز میں نشستیں دلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی۔
ریاستی حج کمیٹی کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مغل لائن لمیٹڈ بمبئی سے جہازوں کی روانگی کے عارضی پروگرام کا جلد ہی اعلان کرے گی۔ جہازوں کی روانگی کی قطعی تاریخوں کا اعلان کم سے کم پندرہ دن پہلے کر دیا جائے گا۔ کرایہ وغیرہ کی پوری رقم ادا کرنے ہی پر فرسٹ اور ڈیک کلاس میں نشستوں کا ریزرویشن کیا جائے گا۔
نشستوں کے ریزرویشن کے بعد تمام افراد کو جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم سے کم چار دن پہلے اپنے ٹکٹ خرید لینا ہونگے۔

جہازوں کی روانگی کی عارضی تاریخیں۔ آئندہ حج کے زمانہ میں ہندوستانی عازمین حج کے گیارہ جہاز مختلف تاریخوں کو بمبئی سے جدہ کے لئے روانہ ہوں گے۔ جہازوں کی روانگی سے ۱۵ دن پہلے قطعی تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا۔
عارضی پروگرام کے مطابق پہلا جہاز "محمدی" ۱۸ر فروری ۱۹۶۴ء کو روانہ ہوگا۔ اس کے بعد ۲۰ر فروری کو "مظفری" اور ۲۶ر فروری کو "سعودی" روانہ ہوگا۔ چوتھی۔ پانچویں۔ چھٹی۔ ساتویں اور آٹھویں بار محمدی۔ مظفری۔ اسلامی۔ محمدی اور مظفری بالترتیب ۵ - ۷ - ۱۸ - ۲۱ اور ۲۳ر مارچ کو روانہ ہوں گے۔ سعودی ۳ر اپریل کو۔ محمدی ۶ر اپریل کو اور آخری جہاز مظفری ۸ر اپریل کو روانہ ہوگا۔

ریاست کی سماجی اور ہریجن فلاح کی نظامت جسمانی طور پر معذور افراد کو جن کی عمر ۱۶ اور ۳۵ سال کے درمیان ہے اعلیٰ تعلیم کے لئے ۲۰ روپیہ سے ۳۰ روپیہ ماہانہ تک کے وظیفے دیگی۔
یہ وظیفے ایسے افراد کو دئے جائیں گے جو ریاستی حکومت کے تسلیم شدہ یا کسی یونیورسٹی سے ملحق تعلیمی یا تکنیکی ادارہ میں اعلیٰ تعلیم یا پیشہ سے متعلق نصاب شلاً موسیقی۔ انجینیرنگ اور علاج کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔
مذکورہ وظیفوں کے امیدواروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کے شہری ہوں اور عام طور پر اتر پردیش میں رہتے ہوں اور ان کو ریاستی یا مرکزی حکومت سے امداد مل رہی ہو۔

وزیر محنت اور امداد باہمی شری بنارسی داس نے ودھان سبھا کے سوالات کے وقفے میں ایک تحریری جواب میں بتایا کہ ریاست میں بڑھاپے کی پنشن کی اسکیم کے آغاز سے گزشتہ ۳۱ر جولائی تک مجموعی طور پر ۱۳۸۰۸ افراد کو بڑھاپے کی پنشن منظور کی گئی۔ زیر نظر مدت کے دوران بڑھاپے کی پنشن کے لیے مجموعی طور پر ۳۵۹۹۲ درخواستیں موصول ہوئیں۔
ایک دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر محنت نے کہا کہ

یکم اپریل ۱۹۶۳ء اور گزشتہ ۳۱ جولائی کی درمیانی مدت میں سیتاپور اور شاہ جہان پور کے اضلاع میں بڑھاپے کی پنشن کے لیے بالترتیب ۲۰۴ ا اور ۱۴۸ درخواستیں موصول ہوئیں۔ ۹۶ اور ۷۷ منظور کی گئیں اور بقیہ درخواستیں زیر غور ہیں۔

حکومت اتر پردیش نے ریاستی پراویڈنٹ فنڈ قواعد کی وہ دفعہ ختم کر دی ہے جس کے تحت پراویڈنٹ فنڈ کی شرح بڑھا دی گئی تھی۔

اس دفعہ کے تحت سرکاری ملازمین لازمی ڈپازٹ (امپلائز) اسکیم ۱۹۶۳ء سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے حکومت نے اس دفعہ کے تحت ایسے سرکاری ملازمین کے لیے پراویڈنٹ کی شرح یکم اکتوبر ۱۹۶۳ء سے بڑھا کر ان کے مشاہرے کا دس فی صدی کر دی تھی جن کی سالانہ تنخواہ ۱۵۰۰ روپے یا اس سے زیادہ ہے اور جن پر انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔

حکومت ہند نے اب لازمی ڈپازٹ (امپلائز) اسکیم واپس لے لی ہے اس لیے ریاستی حکومت نے بھی ریاستی پراویڈنٹ فنڈ قواعد کی وہ دفعہ ختم کر دی ہے جس کے تحت پراویڈنٹ فنڈ کی شرح بڑھا دی گئی تھی۔

اتر پردیش کے سرکاری جنگلات کے مزید ۶۰۰۰ ایکڑ کے رقبہ میں مالیاتی سال رواں کے دوران جلد اُگنے والے درخت لگائے جائیں گے۔ ریاستی محکمہ جنگلات نے مغربی۔ جنوبی۔ مشرقی اور انتظام آراضی منطقوں کے بالترتیب ۲۵۰۰ - ۲۰۰۰ - ۱۵۰۰ اور ۷۰۰ ایکڑ کے رقبوں میں جلد اُگنے والے درخت لگانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت جلد اُگنے والے جو درخت لگائے جائیں گے ان میں یوکلپٹس۔ شہتوت۔ پولا اور بانس کے درخت شامل ہیں۔

ریاست میں جلد اُگنے والے درختوں کی اسکیم ۶۳-۱۹۶۲ء میں شروع کی گئی تھی جس کے لیے حکومت ہند مالی امداد دے رہی ہے۔ ۶۳-۱۹۶۲ء کے دوران ۲۵۰۰ سے زیادہ ایکڑ کے رقبہ میں جلد اُگنے والے درخت لگائے گئے۔

پوڑی (گڑھوال) سے ۱۴ میل کے فاصلہ پر موضع راکھون کے قریب راندھی ندی کے داہنے کنارہ پر ۶۰۰ کے ڈبلو کے ایک ہائیڈرو الیکٹرک بجلی گھر کے قیام کی تجویز ہے۔ اس بجلی گھر سے پوڑی۔ سری نگر۔ کیرتی نگر اور رودر پریاگ کے قصبوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

اس پروجیکٹ کے تحت پورے۔ بال بہنے والی چھوٹی مقامی ندیوں گنگوار سیوم اور سیتان سیون کے پانی کو کام میں لانے کے لئے بند تعمیر کئے جائیں گے اور بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک ۳ میل لمبی نہر بھی بنائی جائے گی۔ مختلف قصبوں کو بجلی فراہم کرنے کے لئے تقریباً ۶۱۵ میل لمبی ایل۔ ٹی۔ لائینیں اور ۱۱ کے وی کی تقریباً ۲۵ میل لمبی لائینیں بھی معہ ذیلی بجلی گھروں کے تعمیر کی جائیں گی۔

امید ہے کہ یہ پروجیکٹ جس پر تخمیناً ۶۹ء۱۰۱ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی، موجودہ منصوبہ کی مدت میں مکمل ہو جائے گا۔

ریاستی بجلی بورڈ نے اس پروجیکٹ کے سلسلہ میں لائسنس یافتہ یا دیگر افراد سے یکم فروری ۱۹۶۴ء تک عذرداریاں طلب کی ہیں۔

لیگ آف دی جرمن ڈیماکریٹک ری پبلک نے بچوں کی ڈرائنگ کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کیا ہے اور ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں سے پینٹنگس۔ رنگین کھریا کی ڈرائنگس۔ لٹرکٹس یا وڈکٹس۔ سینرکٹس اور پیپر موزئیکس طلب کیے ہیں۔

بچے اپنی مادر وطن کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، چراگاہوں کی پینٹنگس۔ آسمان۔ آفتاب۔ سمندر۔ اپنے گھر۔ کارخانہ۔ احاطہ۔ اسکول ٹیچر۔ باپ اور ماں کی پینٹنگس اور خود اپنی تصویریں بھیج سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سونا۔ چاندی اور جستے کے تمغے اور ۱۰۰۰ قیمتی انعامات دیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں مقابلہ میں حصہ لینے والے ہر امیدوار کو ایک سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں جو ڈرائنگ اور سامان بھیجا جائے گا وہ ایک نمائش میں جمع کیا جائے گا جو مختلف ممالک میں دکھائی جائے گی۔

ہر بچہ تین پینٹنگس بھیج سکتا ہے بشرطیکہ وہ یکم جنوری ۱۹۶۳ء سے قبل مکمل کی گئی ہوں۔ اجتماعی طور پر بھی تصاویر بھیجی جا سکتی ہیں۔ جو پینٹنگ

خیرآباد اور اعظم گڑھ ۱۵۰ - ۱۵۰ کیلوواٹ -
ہریجن صنعتی ریاستیں - فتح پور - روشن باغ (رام پور) - اندو پور (دیوریا) - رانوپالی (فیض آباد) - کالپی (جالون) - سجرو (مظفر نگر) برہانہ کوسی کلاں (متھرا) - رام نگر (وارانسی) - ہردوئی - بلرام پور (گونڈہ) - غازی پور - بلیا - بدایوں اور رائے بریلی ہر ایک کے لئے ۱۵۰ کیلوواٹ - ہلدوانی (نینی تال) ۲۰۰ کیلوواٹ
صنعتی ریاستوں کے محل وقوع - فیروز آباد - لکھیم پور کھیری - رام پور - مظفر نگر - شاہ جہاں پور - بارہ بنکی - ہاتھرس - فیض آباد اور مین پوری (ہر ایک کے لئے ۷۰ کیلوواٹ -
[illegible]یا (مرادآباد) - اترولی (علی گڑھ) - چوہر پور (دہرہ دون) سلطان پور - گولہ گوکرن ناتھ (کھیری) - نگینہ (بجنور) - شیام منڈی (بلند شہر) - جسونت نگر (اٹاوہ) - لالورہ کھیرا (باندہ) سلیم پور (دیوریا) - جھبا (ہمیرپور) - اورئی (جالون) - بہرائچ - بیکاپور (فیض آباد) بھرجی پورہ (بریلی) - گھوسی (اعظم گڑھ) - پھولپور (الہ آباد) - اور للت پور (جھانسی) (ہر ایک کے لیے ۱۰۰ کیلوواٹ) - جون پور (۲۰۰ کیلوواٹ) -

---

ریاستی حج کمیٹی نے ۱۹۶۴ء میں حج کرنے والوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ مغل لائن لمیٹڈ بمبئی کے یہاں اپنی نشستیں پہلے سے ریزرو کرالیں - حکومت ہند نے اعلان کیا ہے کہ وہ ان کو جہاز میں نشستیں دلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتی -
ریاستی حج کمیٹی کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ مغل لائن لمیٹڈ بمبئی سے جہازوں کی روانگی کے عارضی پروگرام کا جلد ہی اعلان کرے گی - جہازوں کی روانگی کی قطعی تاریخوں کا اعلان کم سے کم پندرہ دن پہلے کر دیا جائے گا - کرایہ وغیرہ کی پوری رقم ادا کرنے ہی پر فرسٹ اور ڈیک کلاس میں نشستوں کا ریزرویشن کیا جائے گا -
نشستوں کے ریزرویشن کے بعد تمام افراد کو جہاز کی روانگی کی تاریخ سے کم سے کم چار دن پہلے اپنے ٹکٹ خرید لینا ہونگے -

---

جہازوں کی روانگی کی عارضی تاریخیں - آئندہ حج کے زمانہ میں ہندوستانی عازمین حج کے گیارہ جہاز مختلف تاریخوں کو بمبئی سے جدہ کے لئے روانہ ہوں گے - جہازوں کی روانگی سے ۱۵ دن پہلے قطعی تاریخوں کا اعلان کیا جائے گا -
عارضی پروگرام کے مطابق پہلا جہاز "محمدی" ۱۸ فروری ۱۹۶۴ء کو روانہ ہوگا - اس کے بعد ۲۰ فروری کو "مظفری" اور ۲۶ فروری کو "سعودی" روانہ ہوگا - چوتھی - پانچویں - چھٹی - ساتویں اور آٹھویں بار محمدی - مظفری - اسلامی - محمدی اور مظفری بالترتیب ۵ - ۷ - ۱۸ - ۲۱ اور ۲۳ مارچ کو روانہ ہوں گے - سعودی ۳ اپریل کو - محمدی ۶ اپریل کو اور آخری جہاز مظفری ۸ اپریل کو روانہ ہوگا -

---

ریاست کی سماجی اور ہریجن فلاح کی نظامت جسمانی طور پر معذور افراد کو جن کی عمر ۱۷ اور ۲۵ سال کے درمیان ہے اعلیٰ تعلیم کے لئے ۲۰ روپیہ سے ۳۰ روپیہ ماہانہ تک کے وظیفے دیگی -
یہ وظیفے ایسے افراد کو دئے جائیں گے جو ریاستی حکومت کے تسلیم شدہ یا کسی یونیورسٹی سے ملحق تعلیمی یا ٹکنیکی ادارہ میں اعلیٰ تعلیم یا پیشہ سے متعلق نصاب مثلاً موسیقی - انجینیرنگ اور علاج کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں -
مذکورہ وظیفوں کے امیدواروں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہندوستان کے شہری ہوں اور عام طور پر اتر پردیش میں رہتے ہوں اور ان کو ریاستی یا مرکزی حکومت سے امداد مل رہی ہو -

---

وزیر محنت اور امداد باہمی شری بنارسی داس نے ودھان سبھا کے سوالات کے وقفے میں ایک تحریری جواب میں بتایا کہ ریاست میں بڑھاپے کی پنشن کی اسکیم کے آغاز سے گزشتہ ۳۱ جولائی تک مجموعی طور پر ۱۳۸۰۸ افراد کو بڑھاپے کی پنشن منظور کی گئی - زیر نظر مدت کے دوران بڑھاپے کی پنشن کے لیے مجموعی طور پر ۲۵۹۹۲ درخواستیں موصول ہوئیں -
ایک دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے وزیر محنت نے کہا کہ

یکم اپریل سنہ ۱۹۶۱ء اور گزشتہ ۳۱ جولائی کی درمیانی مدت میں سیتاپور اور شاہجہان پور کے اضلاع میں بڑھاپے کی پنشن کے لیے بالترتیب ۱۰۴ اور ۱۴۰ درخواستیں موصول ہوئیں۔ ۹۶ اور ۷۷ منظور کی گئیں اور بقیہ درخواستیں زیرِ غور ہیں۔

حکومت اُتر پردیش نے ریاستی پراویڈنٹ فنڈ قواعد کی وہ دفعہ ختم کر دی ہے جس کے تحت پراویڈنٹ فنڈ کی شرح بڑھا دی گئی تھی۔

اس دفعہ کے تحت سرکاری ملازمین لازمی ڈپازٹ (امپلائیز) اسکیم سنہ ۱۹۶۲ء سے مستثنیٰ کر دیے گئے تھے حکومت نے اس دفعہ کے تحت ایسے سرکاری ملازمین کے لیے پراویڈنٹ کی شرح یکم اکتوبر سنہ ۱۹۶۳ء سے بڑھا کر ان کے مشاہرے کا دس فی صدی کر دی تھی جن کی سالانہ تنخواہ ۱۵۰۰ روپے یا اس سے زیادہ ہے اور جن پر انکم ٹیکس ایکٹ سنہ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس عائد نہیں ہوتا۔

حکومت ہند نے اب لازمی ڈپازٹ (امپلائز) اسکیم واپس لے لی ہے اس لیے ریاستی حکومت نے بھی ریاستی پراویڈنٹ فنڈ قواعد کی وہ دفعہ ختم کر دی ہے جس کے تحت پراویڈنٹ فنڈ کی شرح بڑھا دی گئی تھی۔

اتر پردیش کے سرکاری جنگلات کے مزید ۶۷۰۰ ایکڑ کے رقبہ میں مالیاتی سال رواں کے دوران جلد اُگنے والے درخت لگائے جائیں گے۔ ریاستی محکمہ جنگلات نے مغربی۔ جنوبی۔ مشرقی اور انتظام آراضی منطقوں کے بالترتیب ۲۵۰۰ — ۲۰۰۰ — ۱۵۰۰ اور ۷۰۰ ایکڑ کے رقبوں میں جلد اُگنے والے درخت لگانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ اس اسکیم کے تحت جلد اُگنے والے جو درخت لگائے جائیں گے ان میں یوکلپٹس۔ شہتوت۔ پولا اور بانس کے درخت شامل ہیں۔

ریاست میں جلد اُگنے والے درختوں کی اسکیم سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء میں شروع کی گئی تھی جس کے لیے حکومت ہند مالی امداد دے رہی ہے۔ سنہ ۱۹۶۲-۶۳ء کے دوران ۲۵۰۰ سے زیادہ ایکڑ کے رقبہ میں جلد اُگنے والے درخت لگائے گئے۔

پوڑی (گڑھوال) سے ۲۴ میل کے فاصلہ پر موضع راکھون کے قریب راندھی ندی کے داہنے کنارہ پر ۲۰۰ کے ڈبلو کے ایک ہائیڈرو الیکٹرک بجلی گھر کے قیام کی تجویز ہے۔ اس بجلی گھر سے پوڑی۔ سری نگر۔ کیرتی نگر اور رودر پریاگ کے قصبوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

اس پروجیکٹ کے تحت پورے سال بہنے والی چھوٹی مقامی ندیوں گگوار سیوم اور سیتان سیون کے پانی کو کام میں لانے کے لئے بند تعمیر کئے جائیں گے اور بجلی پیدا کرنے کے لئے ایک ۳ میل لمبی نہر بھی بنائی جائے گی۔ مختلف قصبوں کو بجلی فراہم کرنے کے لئے تقریباً ۶۵ میل لمبی ایل۔ ٹی۔ لائینیں اور ۱۱ کے وی کی تقریباً ۷۵ میل لمبی لائینیں بھی معہ ذیلی بجلی گھروں کے تعمیر کی جائیں گی۔

امید ہے کہ یہ پروجیکٹ جس پر تخمیناً ۶۹ء۱۸ لاکھ روپیہ کی لاگت آئے گی، موجودہ منصوبہ کی مدت میں مکمل ہو جائے گا۔

ریاستی بجلی بورڈ نے اس پروجیکٹ کے سلسلہ میں لائسنس یافتہ یا دیگر افراد سے یکم فروری سنہ ۱۹۶۴ء تک عذرداریاں طلب کی ہیں۔

لیگ آف دی جرمن ڈیماکریٹک ری پبلک نے بچوں کی ڈرائنگ کا ایک عالمی مقابلہ منعقد کیا ہے اور ۱۵ سال سے کم عمر کے بچوں سے پینٹنگس۔ رنگین کھریا کی ڈرائنگس۔ لنرکٹس یا ووڈکٹس۔ سینر کٹس اور پیپر موزیکس طلب کیے ہیں۔

بچے اپنی مادر وطن کے پہاڑوں، دریاؤں، جنگلوں، چراگاہوں کی پینٹنگس۔ آسمان۔ آفتاب۔ سمندر۔ اپنے گھر۔ کارخانہ۔ احاطہ۔ اسکول۔ ٹیچر۔ باپ اور ماں کی پینٹنگس اور خود اپنی تصویریں بھیج سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سونا۔ چاندی اور جستے کے تمغے اور ۱۰۰۰ قیمتی انعامات دیے جائیں گے۔ علاوہ ازیں مقابلہ میں حصہ لینے والے ہر امیدوار کو ایک سرٹیفکٹ بھی دیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں جو ڈرائنگ اور سامان بھیجا جائے گا وہ ایک نمائش میں جمع کیا جائے گا جو مختلف ممالک میں دکھائی جائے گی۔

ہر بچہ تین پینٹنگس بھیج سکتا ہے بشرطیکہ وہ یکم جنوری سنہ ۱۹۶۳ء سے قبل مکمل کی گئی ہوں۔ اجتماعی طور پر بھی تصاویر بھیجی جا سکتی ہیں۔ جو پینٹنگ

بھیجی جائیں وہ مڑی ہوئی نہ ہوں اور بغیر فریم یا شیشہ کے بھیجی جائیں۔
مقابلہ میں حصہ لینے والوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی تخلیقات
کے عنوان، اپنا پہلا نام اور خاندانی نام، تاریخ پیدائش، صحیح پتہ جس میں
ملک کا نام بھی شامل ہو بھیجیں۔ وہ اپنی جنس بھی لکھیں۔
تخلیقات لیگ آف دی جرمن ڈیماکریٹک ری پبلک فار فرینڈشپ
امنگ دی پیوپلس۔ برلن ڈبلیو ۸ کے پتہ پر بھیجی جائیں۔ چیزیں روانہ
کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۳ء ہے۔

متفرقات

سُناروں کو سہولت: ریاستی حکومت نے سونا کنٹرول قاعدے سے متاثر
ہونے والے سُناروں کو شناختی کارڈوں کے لیے ضلع افسروں کو درخواست دینے
کے سلسلے میں کورٹ فیس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا ہے۔
فیصلہ ریاستی کابینہ کے ایک جلسے میں کیا گیا۔

دفاعی عملے کے بچوں کو مراعات: چینی جارحیت کے نتیجے میں ہلاک
یا معذور ہونے والے فوجیوں کے بچوں سے ٹیوشن اور مہنگائی بھتہ فیس نہیں لی جائے
گی۔ ریاستی کابینہ کے ایک فیصلے کے مطابق یہ سہولت ریاست کے کسی بھی
تسلیم شدہ تعلیمی ادارے میں پرائمری سے لے کر ڈگری کے درجوں تک کے
تمام زیر تعلیم نیز بعد میں داخلہ لینے والے طلبا کو بھی حاصل ہوگی۔

گنڈک نہر پروجیکٹ: گنڈک نہر پروجیکٹ پر تعمیراتی کام اگست
سنہ ۱۹۶۱ء سے شروع کر دیا گیا ہے جو امید ہے کہ سنہ ۱۹۷۰ء تک مکمل
ہو جائے گا۔ نیپال بند پر ابھی تک تعمیر کا کام نیپال میں زمین دست یاب
نہ ہونے کی وجہ سے شروع نہیں کیا گیا ہے۔
ایک ضمنی سوال کا جواب دیتے ہوئے نائب وزیر شری شانتی پرین شرما
نے بتایا کہ توقع ہے کہ آئندہ نومبر تک نیپال میں زمین حاصل ہو جائے گی۔

ریاستی شہری کونسل۔ وزیر اعلیٰ اتر پردیش شریمتی سوچیتا کرپلانی
نے جو ریاستی شہری کونسل کی چیئرمین بھی ہیں، شری نول کشور کو کونسل کا
جنرل سکریٹری نامزد کیا ہے۔ شری نول کشور کو شری کیلاش پرکاش
کی جگہ جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ کونسل کا دفتر رائل ہوٹل بلڈنگ
سے کونسل ہاؤس میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

جنگلات سے گودا۔ ریاستی محکمۂ جنگلات نے یوکلپٹس، بانس، شہتوت
اور پولا وغیرہ کے درخت لگانے کا کام شروع کیا ہے۔ امید ہے کہ ان
درختوں سے ایک لاکھ ٹن گودا حاصل ہو سکے گا جو ریاست کی کاغذ اور
متعلقہ صنعتوں کے کام آئے گا۔
ان درختوں کے لگانے کا اقدام اس اسکیم کا ایک جزو ہے
جس کے تحت تیسرے پنجسالہ منصوبہ کی مدت میں جنگلات کے ۲۷ ہزار
ایکڑ سے زیادہ رقبہ میں جلد اگنے والے درخت لگانے کی تجویز ہے۔
بعد میں مزید ایک لاکھ ایکڑ کے رقبہ میں یہ درخت لگائے جائیں گے۔
ان درختوں سے مستقبل میں تقریباً ڈھائی لاکھ ٹن گودا حاصل
کیا جا سکے گا جس سے کاغذ اور ریاست کی صنعتوں کی ضروریات پوری ہو سکیں گی
ریاست میں پہلی بار گودا تیار کرنے کا یہ اقدام کیا جا رہا ہے۔

لائبریری کے مشیر کے لیے درخواستیں مطلوب: یونیسکو نے رائل کالج
نیروبی کینیا میں لائبریری کے مشیر کے عہدے کے لیے درخواستیں طلب کی ہیں۔
اس عہدے کی تنخواہ دیگر بھتوں کے علاوہ ۸۹۲۰ ڈالر سالانہ ہوگی۔ یہ تقرری
مئی ۱۹۶۴ء سے چھ ماہ کے لیے ہوگی۔
منتخب اُمیدوار کو ٹیکنالوجی آف انجینیرنگ کی لائبریری کا پلان بنانا
اور اس کی تنظیم کرنا (ادارے کی ضروریات کے لیے کتابیں وغیرہ منگانا)
لائبریری کے عملے کو ٹریننگ دینا نیز اُن کی رہنمائی اور نگرانی کرنا ہوگی۔
اُمیدوار کے لیے ضروری ہے کہ سائنس میں ڈگری اور کسی ٹیکنیکل یا
یونیورسٹی لائبریری میں کام کرنے کا تجربہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ضروری
ہے کہ اس کو انگریزی زبان کا علم ہو نیز فرانسیسی یا جرمن زبان میں کام
چلانے بھر کی واقفیت ہو۔
یونیسکو کے نمونے کے فارم پر صاف ٹائپ کی ہوئی درخواستوں کی دو
نقلیں وزارت تعلیم حکومت ہند نئی دہلی کے یہاں ۱۶ر جنوری ۱۹۶۴ء تک
پہنچ جانا چاہیے۔

حج کمیٹی کے چیرمین۔ حکومت اتر پردیش نے شری مظفر حسن وزیر
نقل و حمل کو ریاستی حج کمیٹی اتر پردیش کا چیرمین مقرر کیا ہے۔ کمیٹی
کے سابق چیرمین شری صدیق حسن آئی۔ سی۔ ایس کی وفات کے بعد
شری مظفر حسن کی تقرری کی گئی ہے۔



REGD. No. A-319

جان جائیے

کہ مسئلہ کیا ہے؟
ترقی اور دفاع کا ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔
آپ کھیتوں اور کارخانوں میں پیداوار
جتنی زیادہ بڑھائیں گے،
قوم کے ہاتھ اتنے ہی زیادہ مضبوط ہوں گے۔

مضبوط دفاع کے لئے جی توڑ محنت کریں

DA63/F 17

غور کیجیے

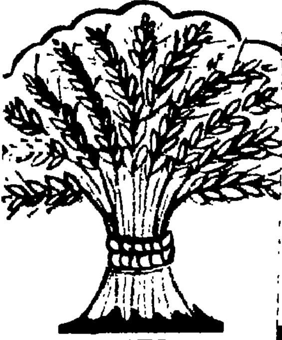
صورتِ حال یہ ہے ——
ہماری آزادی اور ہمارا جمہوری طریقِ زندگی،
دونوں خطرے میں ہیں۔

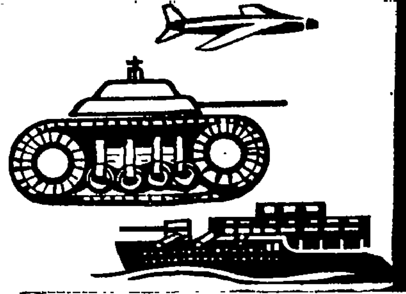
اتحاد بنائے رکھیں، آزادی کی حفاظت کریں

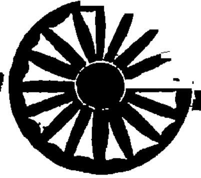
DA63/F 20

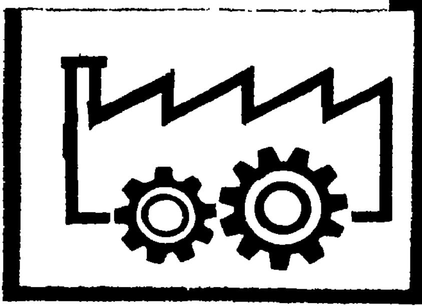
اسپیشل نمبر

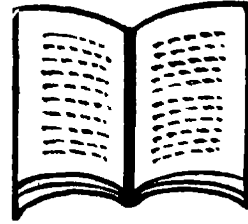
(۱۱)













نیا دور

۲۶ جنوری ۱۹۶۴ء

ماگھ ۱۸۸۵ شک

۵۰
نئے پیسے



اثر لکھنوی

کہہ کے "بھلا ہیں یہ کس کی باتیں" — مجھ کو سنائیں میری باتیں

آہ! وہ بولی میٹھی میٹھی — ہائے! وہ بھولی بھولی باتیں

آگ بگولا پھر ہو جانا — کرتے کرتے پیاری باتیں

پھر وہی چتون تیکھی تیکھی — پھر وہی اکھڑی اکھڑی باتیں

شوخی سمجھوں یا عیاری — آپ اور دل داری کی باتیں

کہتے کچھ ہو کرتے کچھ ہو — دیکھتے جاؤ اپنی باتیں

ایک نہ اک دن آئیں گی منہ پر — جس کی ہوں گی جیسی باتیں

تیرے سوا پھر کس کو سناؤں — جان کے دشمن تیری باتیں

آپ نہ بگڑیں دیوانوں کی — ہوتی ہیں کچھ ایسی ہی باتیں

تیر سا مارا تو نے ہمدم — یاد دلا کر بھولی باتیں

سن لو سن لو پھر نہ سنو گے
بعد اثر کے ایسی باتیں

میرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا

(تقریباً ۱۱۳۰ - ۱۱۹۹ھ)

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

تذکرۂ گلشنِ سُخن کے مؤلف مبتلاؔ نے فارسی گو شعرا کا جو تذکرہ لکھا ہے، اس میں اپنا حال اس طرح شروع کر دیا ہے: "مبتلا تخلص کاتب حروف است"۔ اپنا نام نہیں لکھا ہے لیکن اس تذکرے کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے کتب خانے میں موجود ہے اور جو اس کی تالیف کے صرف چار پانچ سال بعد نقل کیا گیا تھا، اُس کے کاتب نے نسخے کے آخر میں مبتلاؔ کا نام مردان علی خاں لکھا ہے۔ گلشنِ سُخن میں خود مؤلف نے اپنا نام مردان علی خاں بتایا ہے۔ سُخنِ شعرا (۱۲۸۰ھ)، شمعِ انجمن (غالباً ۱۲۹۲ھ) اور نزہتِ سُخن (۱۲۹۰ھ) میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ تذکرۂ شورش (۱۱۹۱ھ) میں اس نام کے شروع میں لفظ 'میرزا' اور گلشنِ بیخار (۱۲۵۰ھ) میں نام کے آخر میں لفظ 'بیگ' بڑھا دیا گیا ہے۔ سراپا سُخن (۱۲۶۹ھ) میں مراد علی خاں ہے، جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔ تذکرۂ عشقی (۱۱۹۷ھ یا بعد) میں مبتلاؔ کو 'مخاطب بہ مردان علی خاں' لکھا ہے، جس کی وضاحت نشترِ عشق (۱۲۳۳-۱۲۲۴ھ) سے ہوتی ہے۔ اس تذکرے میں لکھا ہے کہ مبتلاؔ کا اصلی نام میرزا کاظم ہے۔ نواب منصور خاں صفدر جنگ نے ان کو 'مردان علی خاں' خطاب دیا تھا۔ نتائج الافکار (۱۲۵۷ھ) سے اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ اودھ کے کتب خانوں کی فہرست (۱۸۵۰ء) میں ڈاکٹر اشپرنگر نے مبتلاؔ کا نام مرزا کاظم، خطاب میر مردان علی خاں اور وطن دہلی بتایا ہے۔ بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ مبتلاؔ کا نام میرزا کاظم اور خطاب 'مردان علی خاں' تھا۔

مبتلاؔ کی ولدیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اُس نے خود اپنے فارسی گو شعرا کے تذکرے میں اپنے والد کا نام محمد علی بن محمد المشہدی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ بادشاہ نے اُن کے نام پر 'خان بہادر' کا اضافہ کر دیا تھا، اس لیے وہ محمد علی خاں بہادر مشہور ہوئے۔ نشترِ عشق، نتائج الافکار اور سراپا سُخن میں ان کا نام 'محمد علی خاں' لکھا گیا ہے۔ فہرستِ اشپرنگر، سُخنِ شعرا اور نزہتِ سُخن میں 'نواب محمد علی خاں' ہے۔ مبتلاؔ نے اپنے والد کو پنج ہزاری منصب پر سرفراز بتایا ہے[1]۔ نشترِ عشق میں ہے کہ محمد علی خاں نواب برہان الملک کی سرکار میں منشی تھے۔ ان کی وفات کے بعد جب ان کے داماد منصور خاں صفدر جنگ کو بارگاہِ سلطانی سے منصبِ وزارت اور صوبۂ اودھ مرحمت ہوا تو اُنھوں نے محمد علی خاں کی مستعدی، دولت خواہی اور حُسنِ خدمت کو دیکھ کر اُن کو حضورِ شاہی فردوس آرام گاہ سے پنج ہزاری منصب اور بہادری کا خطاب دلوایا[2] اور اپنی نیابت میں الہ آباد کا صوبہ دار مقرر کر دیا۔ اُس مردم شناس وزیر (صفدر جنگ) کے انتقال کے بعد محمد علی خاں نے بنگالے کا رُخ کیا اور نواب جعفر علی خاں اور نواب عالی جاہ قاسم علی خاں والیِ بنگالہ کی سرکار میں بڑی عزت اور اعتبار کے ساتھ

---

[1] مبتلاؔ نے فارسی گو شعرا کے تذکرے کے دیباچے میں لکھا ہے:

"والدِ عالی مقدارکہ بہ منصبِ پنج ہزاری سرفرازی دارند ۔۔۔"

[2] نتائج الافکار میں ہے، "از پیش گاہِ احمد شاہ بہ منصبِ پنج ہزاری و خطابِ بہادری امتیاز اندوخت۔"

عمر بسر کی، یہاں تک کہ ۱۰ رجمادی الاول سنہ [illegible]ھ میں سفرِ آخرت اختیار کیا اور شاہ ادزانی کی درگاہ میں دفن ہوئے۔

مبتلا کے دادا میرزا محمد مشہدی نواب برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری کے ہم راہ محمد معزالدین جہاں دار شاہ کے عہد میں دہلی میں وارد ہوئے اور فرخ سیر بادشاہ کے زمانے میں ملازمانِ شاہی میں داخل ہوئے۔ محمد شاہ کے عہد میں ان کا انتقال ہوا۔[1]

مبتلا لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔[2] اُن کی پیدائش کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی ہے لیکن انھوں نے فارسی گو شعرا کا تذکرہ سنہ ۱۱۶۱ھ میں تالیف کیا۔ اُس وقت انھیں کے قول کے مطابق "سنین عمر از بست تجاوز کردہ" یعنی ان کی عمر بیس سال سے اوپر تھی۔ اگر اس سے ان کی عمر اکیس برس مانی جائے تو ان کا سالِ ولادت سنہ ۱۱۴۰ھ قرار پاتا ہے۔ نشترِ عشق سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا کی نشو و نما دہلی میں ہوئی، علم رسمی مولوی وجیہ الدین نظام آبادی[3] سے حاصل کیا اور علم فقہ اور علم نحو میں امتیاز بہم پہنچایا۔ انھیں مولوی صاحب سے اپنے نظم و نثر کلام پر اصلاح لی۔ نسخ اور نستعلیق خط اچھا لکھتے تھے اور اُستادوں کے دیوانوں کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ نتائج الافکار میں بھی قریب قریب یہی سب باتیں لکھی گئی ہیں۔ صرف اتنا اور لکھا گیا ہے کہ مبتلا کی اکثر شعرائے مثل عبدالرضا متین وغیرہ کے صحبت رہی اور انھوں نے بارھویں صدی [ہجری] کے اواخر میں انتقال کیا۔

مبتلا نے فارسی گو شعرا کے تذکرے میں اپنے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ میں نے اپنی عمر فضلا اور اہلِ کمال کی خدمت میں گزاری اور ان کے فیض سے اپنی استعداد کے موافق بہرہ ور ہوا۔ والد پنج ہزاری منصب پر فائز تھے۔ مجھ کو دنیا داری کے اشغال میں مشغول نہیں ہونا پڑا۔ میں کبھی خطوں کی مشق کرتا اور میر عماد حسینی کا تتبع کرتا تھا۔ نسخ اور نستعلیق دونوں خط اچھے لکھنے لگا۔ کبھی بزرگانِ سابق کے دیوان دیکھتا اور شعرائے ہم عصر کی صحبت میں رہتا تھا۔ انھیں کے ارواحِ طیبہ اور انفاسِ عالیہ کی بدولت میری طبیعت شعر کہنے کی طرف مائل ہوئی اور میں نے اپنے برے بھلے اشعار مرتب کر ڈالے۔

قرینوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا کی عمر کا کچھ کچھ حصہ لکھنؤ، دہلی، عظیم آباد، مرشد آباد، غازی پور اور بنارس میں گزرا۔ نشترِ عشق میں ہے "تولدِ مردان علی خاں ۔ ۔ ۔ ۔ در لکھنؤ اتفاق اُفتاد۔" نتائج الافکار میں ہے "ولادتش در لکھنؤ رو نمود۔" تذکرۂ عشقی میں ہے "بہ دار الخلافت شاہ جہاں آباد نشو و نمائے بہم رسانید۔" سراپا سخن میں ہے "مبتلا خلفِ محمد علی خاں اُمرائے زمانۂ سابق سرکار غازی پور۔" اس سے مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمد علی خاں زمانۂ سابق میں سرکار غازی پور کے امیر تھے۔ شاید اسی بیان کی بنا پر صُحفِ شعرا میں مبتلا کو 'رئیس قدیم غازی پور' اور بزمِ سخن میں 'متوطن غازی پور' لکھا گیا ہے لیکن مبتلا کو غازی پور کا قدیم رئیس کہنا اور غازی پور کو اُن کا وطن قرار دینا صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ صُحفِ شعرا میں مبتلا کو 'مقیم بنارس' اور بہار سخن میں 'باشندۂ بنارس' لکھا گیا ہے۔ مبتلا کا قیام کچھ مدت تک بنارس میں رہا تھا، لیکن اس کی بنا پر اُنھیں بنارس کا باشندہ نہیں کہا جا سکتا۔ تذکرۂ عشقی (۱۱۹۴ھ یا بعد) میں ہے کہ وہ ان دنوں انقلاب زمانہ کی وجہ سے بنارس میں پریشان حالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے:

" الحال بسبب انقلاب روزگارِ غدار ۔ ۔ ۔ مبتلائے عسرت و فلاکت گردیدہ در شہرِ بنارس بہ تلخ کامی می گزارند۔"

مبتلا کے تذکرے گلشنِ سخن میں بعض شاعروں کے حالات میں ایسے فقرے آگئے ہیں جن سے ان کے دہلی، عظیم آباد اور مرشد آباد میں قیام کا پتا چلتا ہے۔ ذیل میں ایسے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا کا قیام دہلی میں رہ چکا ہے مگر اب نہیں ہے:

آثمی۔ فقیر ہم وے را در شاہ جہاں آباد دیدہ بود۔

تاباں۔ میر مسطور را فقیر ہم در عہدِ محمد شاہ مغفور دیدہ بود۔

رسوا۔ راقم وے را بارہا بہ ایں صورت در دہلی دید۔

مظہر۔ قبل ازیں مسموع شد کہ یکے از ساکنانِ دہلی وے را کشت

میر۔ مسموع شدہ کہ در شاہ جہاں آباد تا تحریرِ ایں گلشنِ سخن ۔ ۔ ۔ بہ سلامت استقامت دارد۔

ندیم۔ راقم در دہلی ایشان را اکثر دیدہ بود۔

---

[1] نشترِ عشق [2] نشترِ عشق و نتائج الافکار
[3] نتائج الافکار میں 'نظام آبادی جون پوری' ہے۔

غلام نبی بلگرامی۔ ہر روز در دہلی اتفاق ملاقات می شد۔

یقین۔ راقم وے را در دہلی بارہا دید۔

ذیل کی عبارتوں میں آمد اور آمدہ کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو لکھتے وقت مبتلا عظیم آباد یا مرشد آباد میں موجود تھے:

سلیمان۔ متوطن دہلی۔ در عظیم آباد آمدہ شاگردی اشرف علی خاں فغاں اختیار کرد۔

میر شاہ علی خاں دہلوی۔ بہ زمانۂ دولت نواب عالی جاہ میر محمد قاسم خاں بہ عظیم آباد آمدہ۔

درد مند۔ حسب الطلب نواب شہامت جنگ از دہلی بہ مرشد آباد آمد۔

ندیم۔ بہ عہد نواب میر محمد جعفر خاں از دہلی بہ مرشد آباد آمد۔

ذیل کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو لکھتے وقت مبتلا مرشد آباد سے کہیں اور جا چکے تھے:

صانع بلگرامی۔ در مرشد آباد ۔ ۔ ۔ ۔ اکثر با اتفاق ہم نوا بطرح می شد۔

بہر حال نشتر عشق کے مؤلف کا یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ "از لکھنؤ بہ عظیم آباد رفتہ اوقات می گزرانید"۔

مبتلا نے بعض لوگوں سے اپنی دوستی اور شناسائی کا ذکر کیا ہے مثلاً

اظہر دہلوی۔ شعر فارسی خوب می گفت۔ با فقیر ہم دوستی داشت۔

مرزا عباس علی خاں۔ با راقم خان مذکور دوستی و مہربانی مفرط داشت۔

فدوی۔ با راقم آشنا۔

فرحین۔ با فقیر رابطۂ اتحاد و دوستی دارد۔

انشا۔ راقم حروف ۔ ۔ ۔ ۔ بہ والد ایشاں آشنا بود۔

میر غلام نبی بلگرامی۔ با مؤلف رابطۂ دوستی بدرجۂ اتم بود۔

مبتلا نے اپنے قرابت داروں میں سے صرف دو کا ذکر ضمناً کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ذاکر اسمش میر حسین دوست ابن میر علی دوست متوطن مرادآباد سنبھل۔ چند سال در شاہ جہاں آباد میر سطور مدرس خسر پورہائے راقم مرزا محمد رفیع خاں و بدیع الزماں خاں بود"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا کے دو برادر نسبتی مرزا محمد رفیع خاں اور مرزا بدیع الزماں خاں دہلی میں رہتے تھے اور میر حسین دوست ذاکر سنبھلی نے کئی سال ان کو پڑھایا تھا۔

بدیع الزماں خاں شاعر تھے اور مخلص تخلص کرتے تھے۔ میر حسین دوست نے فارسی گو شاعروں کا ایک تذکرہ لکھا ہے جس کا نام تذکرۂ حسینی ہے۔ مگر مخلص کا اس میں ذکر نہیں کیا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ مخلص فارسی کے شاعر نہیں تھے۔ میر حسن اپنے تذکرے میں مخلص کے بارے میں لکھتے ہیں:

"بدیع الزماں خاں المتخلص بہ مخلص جوانے است حسین عمدۂ روزگار۔ اصل او از شاہ جہاں آباد است۔ مدتے در خدمت فراش خانۂ سرکار نواب عالیہ سرفراز بود۔ از چندے معزول شدہ بہ وطن خود رفت۔ از شاگردان شاہ واقف۔ جستہ جستہ خوب می گوید۔ با فقیر نیز آشنا است۔ خدا سلامت دارد"۔

میر حسن نے مخلص کو شاہ واقف کا شاگرد لکھا ہے۔ مبتلا لکھتے ہیں کہ واقف شاہ دہلوی کا نام میاں عاشوری تھا۔ وہ بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ میرے سالے بدیع الزماں خاں سے منسلک اور ان کے ہم مکتب رہے۔ انھیں کے گھر میں پرورش پائی اور ان کے معلم میر حسین دوست سے علوم رسمیہ حاصل کیے۔ فیض آباد کے قیام میں ان کے مزاج میں ایسی وحشت پیدا ہوئی کہ لباس ترک کر دیا لیکن دن رات بدیع الزماں خاں کے پاس رہتے تھے۔ مبتلا نے واقف کی استادی اور مخلص کی شاگردی کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔

مبتلا نے اپنے مذہب کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے لیکن مرزا مظفر کے حال میں چند جملے ایسے لکھ دیے ہیں جن سے ان کے متعصب شیعہ ہونے کا گمان ہو سکتا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ لکھا ہے کہ مرزا مظفر اپنے عصر کے نادرہ گویوں میں تھے۔ علم فقہ میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ فارسی میں عمدہ طرز کے شعر کہتے تھے۔ اردو کے اکثر شاعر ان کے شاگرد ہیں۔ مبتلا کے الفاظ یہ ہیں:

"از نادرہ گویان عصر خود بودہ ۔ ۔ ۔ ۔ در علم فقہ دست گاہ خوب داشت و شعر فارسی بہ روش و طرز نیکو می گفت۔ کثیرے از ریختہ گویان شاگرد او بودند"۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"تعصب مذہب سنت جماعت بدیں حد جائے گاہ در دلش نمودہ بود کہ مردم را منع از تعزیۂ سید الشہدا علیہ السلام می کرد۔ چند سال عمر یافت

"در ہمیں ضلالت بسر برد قبل از ین مسموع شد کہ یکے از ساکنان اہلی حوالے اکشت بہ منزلے کرد اش رسانید۔"

اِس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مبتلا کو مرزا مظہر سے سخت ناراضی اس بنا پر تھی کہ وہ لوگوں کو امام حسینؑ کی عزاداری سے منع کرتے تھے۔ اس میں مظہر کے سُنّی یا صوفی ہونے کو مطلق دخل نہیں تھا۔ مبتلا نے ایک دوسرے اہلِ سنت صوفی بزرگ خواجہ میر درد کی بڑے عقیدت مندانہ انداز میں جو تعریف و تحسین کی ہے وہ ان کی بے تعصبی کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"مرکزِ دائرۂ اہلِ کمال، سخن سنج، نکتہ رس، شیریں مقال۔ قطع نظر از مہارتِ فنونِ سخن کہ دراں مرتبۂ آں والا مقام است، در خدا پرستی و تحمل مصائب و تسلیم نوائب نظیر نہ دارد۔ سید عالی منزلت، مقیم گوشۂ عزلت، رہ روِ شہرستانِ تفرید و سائر کوچۂ تجرید۔ ... در شاہجہان آباد ... گوشۂ انزوا اختیار نمودہ بہرہ یاب فیضانِ نامتناہی الہی است۔"

دوسرے صوفی شاعروں کو بھی اچھے لفظوں سے یاد کیا ہے مثلاً

شاہ اجمل الہ آبادی۔ نجابت و مشیخت سلسلۂ ایشاں شہرتِ تمام دارد۔

شاہ قطب الدین مصیبت۔ برادر شاہ اجمل۔ مرد ستودہ اطوار است۔

اثر برادرِ درد۔ اوقات بکسب ریاضت بسر می برد و بیش تر در یادِ الہی مشغول می باشد۔ صاحب علم و عمل۔

الم فرزند درد۔ درویش مشرب و از مغتنمانِ زمانہ است۔

مبتلا کے ان بیانوں میں مذہبی تعصب کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

معلوم نہیں کہ مبتلا کبھی کسی شاہی منصب پر فائز ہوئے تھے یا نہیں۔ تذکرۂ عشقی میں ان کے بارے میں لکھا گیا ہے:

"در سرکار نواب برہان الملک و نواب صفدر جنگ بہادر بہ خدمتِ شائستہ عز اختصاص یافتہ۔"

اور یہی بات سخن شعرا کے مؤلف نے اپنی زبان میں یوں کہی ہے:

"نواب برہان الملک اور صفدر جنگ کی سرکار میں بڑا اقتدار رکھتے تھے۔"

یہ دونوں بیان کسی غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جو بات مبتلا کے والد محمد علی خاں کے بارے میں کہنا چاہیے تھی، وہ مبتلا کے لیے کہہ دی گئی ہے۔

برہان الملک کی وفات ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ میں ہوئی۔ اس وقت مبتلا کی عمر گیارہ بارہ برس[1] سے زیادہ نہ تھی۔ اس عمر میں مبتلا کا خدماتِ شائستہ سے اختصاص کی عزت پانا یا بڑا اقتدار حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔

مبتلا نے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ جو اکیس بائیس برس کی عمر میں تالیف کیا ہے اس میں اپنا بہت مختصر حال لکھا تھا اور اس کم عمری میں زیادہ حالات ہو ہی کیا سکتے تھے۔ اس کے ۳۳ برس بعد چون پچپن سال کی عمر میں اردو شاعروں کا تذکرہ گلشنِ سخن لکھا۔ توقع تھی کہ اس میں اپنا حال تفصیل سے لکھا ہوگا لیکن اس کے رام پوری نسخے میں مبتلا کے بارے میں صرف یہ چند لفظ ملتے ہیں:

"مبتلا تخلص این راقم آثم کہ مسمّیٰ بہ مردان علی خان است۔"

میں گلشنِ سخن کا ایک نیا ایڈیشن ترتیب دے رہا ہوں۔ اس ایڈیشن کے مقدمے میں مذکورہ کلام کے اس بے محل اختصار کے سبب سے بحث کی جائے گی۔ طوالت کے خیال سے یہاں وہ بحث چھیڑنا مناسب نہیں ہے۔

مبتلا کی تصنیفیں

(۱) فارسی دیوان۔ مبتلا گلشنِ سخن کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"مولف از آغاز شباب ... اوقات گرامی خود را ... بہ گفتن و خواندن کلام فارسی کہ زبان آبا و اجداد است، صرف نمود۔ ہنگامے کہ سنین عمر از بست تجاوز کردہ بود بادہ ہائے معنی از گلزار فکر چیدہ دیوانے منظم ساخت۔"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مبتلا جوانی کی ابتدا سے فارسی کلام پڑھتے اور فارسی میں شعر کہتے رہے۔ اس لیے کہ ان کے آبا و اجداد کی زبان فارسی تھی۔ جب ان کی عمر بیس برس سے اوپر ہو گئی تو انھوں نے اپنے اشعار جمع کر کے ایک دیوان مرتب کر دیا۔

نشترِ عشق میں ہے کہ مبتلا کے فارسی دیوان میں تقریباً چار ہزار شعر ہیں۔ معلوم نہیں کہ یہ دیوان اب کہیں موجود ہے یا نہیں۔ ذیل میں چند شعر نشترِ عشق اور نتائج الافکار سے نقل کیے جاتے ہیں:

آگاہ تا نشوی زخمِ انتظارِ ما ... نرگس دمد بجائے گیاہ از مزارِ ما
با آنکہ شد غبارِ من از آسماں بلند ... آگاہ نیستم کہ دلم خاکِ راہِ کیست
باز فریاد کنا میں دلِ شیدا برخاست ... کہ قیامت پے تعظیم وے از جا برخاست

---

[1] مبتلا کی ولادت سنہ ۱۱۴۰ھ میں ہوئی تھی۔

بجز مستی مرا از دلم نہ شد ظاہر — اگرچہ سنگ جفایت ہزار بار شکست
نگارزوئے این کہ بپنیم بشنے دوست — موہوم وماند در دل ما آرزوئے دوست
نہ بری نام من خستہ صبا بادت بلو — غنچہ در صحن چمن میل شگفتن دارد
یادم آید ز اسیری خود و نالہ کنم — چوں صفیرے شنوم کز قفسے می آید
دست اے صبا ز جور گلستاں نگاہ دار — جان ہزار بلبل نالاں نگاہ دار
کرد طرز ستم تازہ بپا صبا دم — رشتہ پیچیدہ بہ پائے من دکرد آزادم
زلیس آوازۂ حسنت گرفت اقصائے عالم را — بہ ہر دشتے ست مجنونے بہ ہر شہرے زلیخائے

(۲) شعرائے فارسی کا تذکرہ۔ جس زمانے میں مبتلا اپنا فارسی دیوان مرتب کر رہے تھے، اسی زمانے میں وہ فارسی گو شاعروں کا تذکرہ بھی لکھ رہے تھے۔ گلشن سخن کے دیباچے میں دیوان کی ترتیب کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ہم در آں ایام تذکرۂ مسمیٰ بہ گلدستۂ معانی کہ مشتمل بر انتخاب اشعار فارسی سخن پردازاں قدیم و جدید و اختصار بیان احوال آنہاست ترتیب دادہ"
(یعنی انھیں دنوں میں ایک تذکرہ گلدستۂ معانی کے نام سے ترتیب دیا، جو فارسی کے قدیم و جدید سخن وروں کے منتخب اشعار اور ان کے مختصر احوال پر مشتمل ہے۔)

مبتلا کے فارسی تذکرے کا ایک خوش خط قلمی نسخہ حافظ محمود خاں شیرانی کے پاس تھا۔ اس کے بارے میں مرحوم نے مجھے اپنے خط مورخہ اپریل ۱۹۲۳ء میں لکھا تھا:

"مردان علی خاں مبتلا کے تذکرے کا نام منتخب الاشعار ہے۔ منظوم معانی تاریخی نام ہے۔ تاریخ ۱۱۶۱ھ ہے۔ میرا مملوکہ تذکرہ نہایت خوش خط ۱۱۶۶ھ کا نوشتہ ہے۔ لیکن نہ وہ میرے پاس ہے نہ میری ملک رہا ہے۔ اب وہ پنجاب یونی ورسٹی لائبریری کی ملک ہے۔"

یہ نسخہ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کے کتب خانے میں موجود ہے۔ لیکن شاید ناقص الاول ہے۔ نہ اس کا سرورق محفوظ ہے نہ اس میں کوئی دیباچہ ہے۔ تذکرہ مولف کے کہے ہوئے قطعہ تاریخ پر ختم ہوتا ہے، جو حسب ذیل ہے:

معانیست زیں منتخب منتظم — شود ظاہرت گر بخوانی و دانی
موسوم بہ مستی جمع اشعار رنگیں — بہ رنگینیش می رسی گر بخوانی
شبے با دل خویش تاریخ اورا — بگفتم بگو با من از می توانی
مکن ہرزہ گردی کہ من فکر کردم — پے سال تالیف منظوم معانی

منظوم معانی سے تذکرے کا سال تالیف ۱۱۶۱ھ نکلتا ہے۔ تذکرے کے خاتمے پر اس نسخے کے کاتب نے حسب ذیل عبارت

"حسب الاشارۃ مجمع فضائل و کمالات مخدومی مولانا محمد این تذکرۃ الشعرا مسمیٰ بہ منتخب الاشعار کہ از مولفات خان فیض الجود والاحسان مردان علی خاں سلمہ اللہ الرحمٰن است سمر وکان ذالک فی سلخ محرم الحرام ۱۱۶۶ھ"

حافظ محمود خاں شیرانی نے مبتلا کے تذکرۂ شعرا کے بارے دی تھی وہ کاتب کی اس تحریر اور مولف کے قطعۂ تاریخ سے ماخوذ سلسلے میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ مولف کے قطعۂ تاریخ میں صرف مادۂ تاریخ ہے، جس سے تذکرے کا سال اتمام نکلتا ہے نے اور ان کی طرح کئی تذکرہ نویسوں نے منظوم معانی کو تذکرے فرض کر لیا ہے۔ نشتر عشق، نتائج الافکار اور شمیم ا[illegible] اس تذکرے کا ذکر اسی نام سے کیا گیا ہے۔ سراپا سخن، اور مزید سخن میں بھی اس تذکرے کا ذکر ہے مگر اس کا نام ہے۔ پنجاب یونی ورسٹی، لاہور کے نسخے میں کاتب نے تذکرے منتخب الاشعار لکھا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کہیں اور اس کا یہ نام خود مبتلا نے گلشن سخن کے دیباچے میں اس کا نام گلدستہ پنجاب یونی ورسٹی کا نسخہ بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت تو ظاہر ہے کہ یہ تالیف سے صرف چار پانچ سال بعد مولف نقل کیا گیا۔ دوسری وجہ وہ ہے جس پر ابھی تک کسی کی نظر نہ نشتر عشق میں ہے کہ مبتلا نے علم رسمی مولوی وجیہ الدین نظام حاصل کیا اور انھیں سے نظم و نثر پر اصلاح لی۔ نتائج الافکار مگر مولوی وجیہ الدین نظام آبادی کے ساتھ لفظ 'جون پوری' تذکرۂ مبتلا کے اس نسخے کی کتابت مولانا محمد وجیہ الدین کے اشارہ جن کو کاتب نے مجمع فضائل و کمالات لکھا ہے۔ تعلق غالب ہے وجیہ الدین ہیں جو مبتلا کے استاد تھے۔ اس خصوصیت نے تذکرہ مبتلا کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے۔

(۳) اردو دیوان۔ تذکرۂ شورش (۱۱۹۳ھ) اور تذکرۂ عشقی میں مبتلا کا ذکر ہے، مگر ان کے دیوان کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ

(۰۰-۱۲۴۸ھ) میں ہے، "گویند کہ مبتلا بپارسی صاحب دیوان است" یعنی کہتے ہیں کہ مبتلا فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ لیکن اردو دیوان کا ذکر نہیں ہے۔ سراپا سخن (۶۹-۱۲۵۹ھ) میں مبتلا کے "ایک دیوان" کا ذکر ہے اور سخن شعرا میں ان کو صاحب دیوان کہا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں تذکروں میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ مبتلا کا دیوان اردو میں ہے یا فارسی میں۔ صرف بزم سخن (۱۲۹۷ھ) میں ہے "در ہر دو زبان دیوان و تذکرہ دارد" یعنی وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں صاحب دیوان ہیں۔ اس تذکرے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولف تذکرہ نے مبتلا کا اردو دیوان دیکھا تھا۔ تذکروں میں ان کے اردو شعر نہ ہونے کے برابر ہیں۔ شورش نے صرف یہ ایک شعر نقل کیا ہے:

ماجرا دیوانگی کا دل سے پوچھا چاہیے　　تڑپنے کا مدعا بسمل سے پوچھا چاہیے

عشقی نے حسب ذیل دو شعر لکھے ہیں:-

بے طرح جوشش میں ہے دیدۂ گریاں میرا　　نوح کو آنکھ دکھاتا ہے یہ طوفاں میرا

مجھے زخم ہیم لگا دیکھیے تو　　میں مرتا ہوں کیوں کر بھلا دیکھیے تو

گلشن بیخار، طبقات الشعرا اور بزم سخن میں ذیل کا صرف ایک شعر نقل کیا گیا ہے:-

شیشۂ دل پٹک دیا تونے　　سنگ دل آہ کیا کیا تونے

سراپا سخن میں بھی ذیل کا صرف ایک شعر ملتا ہے:

کھنچی ہے جب کہ اس سر کی تاب آنکھوں میں　　نہیں ٹھہرتا ہے کچھ آفتاب آنکھوں میں

سخن شعرا میں مبتلا کے چار شعر ہیں، جن میں سے ایک تذکرۂ عشقی سے، ایک گلشن بیخار وغیرہ سے اور ایک سراپا سخن سے یہ تین شعر اوپر نقل کیے جا چکے ہیں۔ ذیل کا صرف ایک شعر زائد ہے:

دل کی تو تنے داغوں سے اب لاگ لگی ہو　　جی کیوں کے بچے جا اس طرف آگ لگی ہو

مبتلا کی اردو غزلوں کے چھ شعر جو مختلف تذکروں کی ورق گردانی سے دستیاب ہوئے ہیں وہ سب مطلع ہیں۔ خود مبتلا نے گلشن سخن میں اپنے بتیس شعر درج کیے ہیں۔ ان میں پانچ مطلع ایسے بھی شامل ہیں جو دوسرے تذکروں سے اوپر نقل کیے جا چکے ہیں۔ صرف یہ ایک مطلع تذکرۂ عشقی میں ایسا ہے جو گلشن سخن میں موجود نہیں ہے:

مجھے زخم پیہم لگا دیکھیے تو　　میں مرتا ہوں کیونکر بھلا دیکھیے تو

گلشن سخن سے وہ ستائیس شعر جو کسی دوسرے تذکرے میں نہیں ہیں یہاں پیش کیے جاتے ہیں:-

دیکھ کر تیری گلی میں مجھ کو حیراں ہو گیا　　صورت دیوار کے مانند بھی حیراں ہو گیا

اب تو آنکھوں سے لگے بہنے سرشک خونچکاں　　ہائے یہ ناسور زخم دل نمایاں ہو گیا

اپنے سب داغوں سے میں مینے ابتک پھول ہے　　کچھ کی رات تو آ دیکھ چراغاں میرا

عالم عشق سے رکھتا ہوں جنوں کی میں سند　　قیس سے جا کے کہو چھوڑے بیاباں میرا

دامن دشت کو وحشت نے مری گھیر لیا　　مبتلا ہاتھ جنوں کے ہے گریباں میرا

بیگانہ سب سے ہے وہ نہیں آشنا کسی کا　　جو اس کے دوست ہیں لگے دشمن وہ کس کا

ہو گیا ہوں خاک لیکن تیرے کوچے سے بھلا　　چاہیے ہوتا مجھے یاد صبا کا آشنا

تیری بے مہری کا شکوہ ہے عبث اے طور　　تو وہ کافر ہے، نہیں ہرگز خدا کا آشنا

کبھی جگر میں نگہ اور لبوں سے نکلی آہ　　کہاں سے گرد اٹھی اور کہاں خدنگ لگا

کیا مردم سے خالی خانۂ چشم آپ صاحب　　چمن میں مجھ کو اں ہو دل زدہ ہلا بیٹے صاحب

لیا مجھ سے یہ زور اور چاہتے ہو مفت میں کھوتا　　جیتے منا میں دونگا دل مجھ کو دیجے چاہیے صاحب

ہوا ہو چکا دل بیکھیے غمزۂ ظالم کے ہاتھوں سے　　خدا کے واسطے اس کی تو تہمت سمجھا دیجے صاحب

کھولو اس زلف گرہ گیر کے عقدہ دل سے　　ہوں اگر میں بھی سبک روح صبا کی صورت

مبتلا واسطے دیدار کے در پہ کہاں　　کوچۂ یار میں پھرتا ہے گدا کی صورت

ست دوانا ہے کے زلف یار کی تصویر کھینچ　　پہلے مانی اپنے دل کے پاؤں میں زنجیر کھینچ

ذکر چمن کے اوپر اس قدر صبا بیدار　　ہزار بلبل نالاں کا جی نہ دے برباد

کر علم تیغ کو آیا ہے وہ قاتل باہر　　جان سے ہاتھ میں تو بھی نکل اے دل باہر

نہ خوشی سے غرض اور نہ غم ایام سے کام　　جس میں ہو تیری رضا ہم کو اسی کام سے کام

ہم صفیر دم سے صیاد نے باندھے پر و بال　　تم کرو سیر گل و لالہ مجھے دام سے کام

محروم ہوں وصال سے فرقت میں داغ ہوں　　میں پر جلا پتنگ بہ پائے چراغ ہوں

کریں ہیں مشورہ ہی قتل کا مرے شب و روز　　یہی رہے ہے سوال و جواب آنکھوں میں

کبھی پھر آئے نظر خواب میں خیال اس کا　　ہمیشہ رہتا ہے مردم کے خواب آنکھوں میں

ہم اپنے مردمان چشم سے اب ہاتھ دھو بیٹھے　　کہ اس دریائے بے پایاں میں ہمدم نہنگ تنہا ہیں

مرے دل کے اوپر بجلی سی ہر دم ہے کڑک جاتی　　قیامت ہے کانوں میں یہ موتی جگمگاتے ہیں

گرچہ پروانے کا جل جانا ہے روشن آہ پر　　شمع کی دل سوزیاں محفل میں پوچھا چاہیے

سر کو تیغ اس کی سے جیوں زر ہدیہ کیجیے　　جی میں ہے تیغ جاں کند ہی کو شیریں کیجیے

مبتلا دم لینے کی فرصت مجھے ہرگز نہ دی　　ایسے قاتل کو کہو کیونکر نہ تحسین کیجیے

مبتلا کے یہ بتیس شعر جو سردست ہمارے علم میں تھے، ان کی زمینوں

پر نظر کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انیس غزلوں سے لیے گئے ہیں اور دوسری یہ کہ مبتلا نے اپنا اردو کلام ردیف وار مرتب کر لیا تھا۔ اس ترتیب کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ گلشن سخن کی تالیف کے وقت ان کا اردو دیوان مرتب ہو چکا تھا اور یہ شعر اسی دیوان سے لیے گئے ہیں۔

شعرائے اردو کا تذکرہ۔

مبتلا نے فارسی گو شاعروں کا تذکرہ سنہ ۱۱۶۱ھ میں ترتیب دیا تھا۔ اس وقت ان کی عمر بیس برس سے اوپر تھی۔ اس کے تینتیس برس بعد انھوں نے اردو گو شاعروں کا تذکرہ گلشن سخن[1] کے نام سے فارسی زبان میں تالیف کیا۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں :-

"چناں بہ خاطر رسید کہ از کلام ریختہ گویان سابق وحال کہ دریں زمان کمال اشتہار در قلمرو ہندوستان دارند... منتخب نمودہ صحیفہ جمع نماید تا از مطالعۂ آن شیفتگان محبوبان معنی حظے وافر بردارند۔ الحمد لواہب العطایا کہ در اندک زمان کامیاب گردیدہ بہ مقصد رسیدہ۔ چوں عقدۂ خاطر را بہ ناخن حسن انجام تالیف کشود مسمیٰ بہ گلشن سخن نمود۔"

(یعنی مجھے خیال آیا کہ سابق اور حال کے ریختہ گو جو اس زمانے میں ہندوستان میں بہت شہرت رکھتے ہیں، ان کے کلام کا انتخاب کر کے ایک کتاب تالیف کروں تاکہ 'محبوبان معنی' کے عاشق اس کے مطالعے سے بہت لطف اٹھائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تھوڑے سے وقت میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور جب یہ تالیف بخوبی انجام پا گئی تو اس کا نام گلشن سخن رکھا۔)

اس مقام پر مولف تذکرہ نے ایک قطعۂ تاریخ لکھا ہے جو حسب ذیل ہے :-

آب و رنگ اس کا ہے جوں باغ ارم ... کچھ نہیں اس کے مقابل گلشن
سال تالیف میں پوچھا ان سے ... جو تھے اس فن کے سخن سنج کہن
سب لگے کہنے کہ اک عمر کے بعد ... "آج پھولا ہے سخن کا گلشن"

اس قطعے کا آخری مصرع مادۂ تاریخ ہے جس سے اس تذکرے کا سال تالیف ۱۱۹۴ھ نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ پوری کتاب میں جہاں کہیں دوران تالیف

[1] سخن شعرا اور بزم سخن میں اردو شاعروں کے اس تذکرے کا ذکر ہے، مگر اس کا نام نہیں ہے۔ سلوپا سخن میں اس کا صحیح نام گلشن سخن بتایا گیا ہے۔ شعرالہند جلد اول میں اس کا نام گلستان سخن لکھا گیا ہے، جو قطعاً غلط ہے۔ گلستان سخن مرزا قادر بخش صابر کے تذکرے کا نام ہے۔

کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہاں 'الحال' 'تا حال' 'تا ایں ساعت' کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چار ہجری است" کا ہے۔ اس سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ اسی سال میں اسی میں ختم ہوا۔ جناب عرشی اس سلسلے میں لکھتے ہیں :-

"یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اسی ایک سال کے اندر کار تالیف سے مبتلا فارغ ہو گیا تھا۔"[1]

یہ تذکرہ تین سو ستر و شاعروں کے حالات اور ان کے منتخب اشعار ... اتنے شاعروں کے حالات، وہ مختصر ہی سہی، فراہم کرنے اور ان کے اشعار منتخب کرنے میں ایک سال سے زیادہ وقت صرف ہوا ہوگا ... فراہم کرنے کے بعد اس کو مرتب کرنا ایک سال کے اندر ممکن ہے ... ہے کہ سنہ ۱۱۹۴ھ مواد کی فراہمی کا نہیں، اس کی ترتیب کا سال ہے۔

تذکرے بالعموم غزل گو شعرا کے حالات پر مشتمل ہوتے ہیں ... نے غزل کے ساتھ ساتھ کسی دوسری صنف سخن میں بھی طبع آزمائی کی ... ان کے حال میں اس صنف کا بھی ضمناً ذکر آ جاتا ہے۔ گلشن سخن ... شاعروں کی مثنویوں، قصیدوں، ساقی ناموں اور مرثیوں کا ذکر ملتا ... نام اور کام حسب ذیل ہیں :-

مثنوی :

جعفر علی خاں ذکی: "مثنوی ریختہ دمشہور (است)"۔ میر ... شورش: "دیوانش چہار ہزار بیت از قصیدہ و مثنوی و غزل است ... مثنویات متعددہ در سلک نظم کشیدہ"۔ فدوی لاہوری: "گویند بزبان ریختہ نظم کردہ"۔

قصیدہ۔

سودا: "در جمیع فنون نظم خاصہ در قصائد قدرت بسیار ب..." شورش۔ مرزا جعفر علی حسرت: "صاحب قصائد و غزلیات"۔

ساقی نامہ :

فقیہہ درد مند: "ساقی نامۂ ریختہ او زبان زد انام ا..." حمایت علی مجنون: "ساقی نامہ بحکم نواب مبارک الدولہ ابن نواب ... خاں مرحوم کہ بالفعل ناظم بنگالہ است در سلک نظم کشیدہ"۔

[1] دیباچہ دستور الفصاحت ص ...

مرثیہ:

خواجہ امام بخش امامی عظیم آبادی: "در مرثیہ گوئی سید الشہدا مدتے اوقات بسر می برد"۔ خواجہ برہان الدین آشتی دہلوی: "مرثیہ ہندی خوب می گفت"۔ خلیفہ سکندر: "در مرثیہ گوئی سلیقۂ درست دارد"۔ محمد علی صبر: "اکثر مرثیہ حضرت ابا عبد الحسین علیہ السلام انشا می کند"۔ میر سنون حیران عظیم آبادی: "در مرثیہ گوئی مہارت خوب داشت و مظلوم تخلص می کرد"۔ شیخ حسن رضا نجات دہلوی: "مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام بیشتر می گوید"۔ شیخ علی قلی ندیم دہلوی: "اکثر مرثیہ و سلام حضرت سید الشہدا بزبان ریختہ می گفت"۔ مرزا اسحاق وصل لکھنوی: "اکثر مرثیۂ سید الشہدا تصنیف می نماید"۔ میر محمد اعظم ہویدا دہلوی: "اکثر مرثیہ امام ہمام علیہ السلام می گوید"۔ مصطفے قلی خاں یکرنگ دہلوی "در مرثیہ سید الشہدا علیہ السلام گفتہ":

زخمی بہ رنگ گل ہیں شہیدان کربلا   گلزار کی نمط ہے بیابان کربلا
کھانے چلا ہے تیغ ستم ظالموں کے ہاتھ   دھو ہاتھ زندگی ستی مہمان کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ   ہے سر بریدہ شمع شبستان کربلا

خواجہ آشتی کے فرزند میر آسی دہلوی مرثیہ گو تھے، مگر ان کے متعلق مبتلا نے صرف یہ لکھا ہے:

"در مرشد آباد بہ تعزیہ داری سید الشہدا علیہ السلام اشتغال داشت۔ مشہور است کہ شبے در عین تعزیہ بے ہوش گردیدہ بہ بہشت خرامید"۔
(یعنی مرشد آباد میں سید الشہدا کی عزاداری میں مشغول رہتے تھے، مشہور ہے کہ ایک رات کو اسی حالت میں بے ہوش ہو کر انتقال کر گئے۔)

مرزا ظہور علی خلیق دہلوی کے والد مرزا ہوشدار اپنے عہد کے نامی مرثیہ گو تھے۔ ظہور علی بھی مرثیہ کہتے تھے اور مرثیے میں ظہور تخلص کرتے تھے[1]۔ لیکن مبتلا نے ان کی مرثیہ گوئی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان کے بارے میں صرف یہ لکھا ہے:
"مرزا ظہور علی خلیق دہلوی خلف مرزا ہوشدار در علم موسیقی و مرثیہ خوانی دستگاہ تمام دارد"۔

میر یحییٰ مخاطب بہ عاشق علی خاں عاشق سوطن دکھن کا صرف ایک شعر نقل کیا ہے اور لکھا ہے "ایں بیت از خون از رگ دل می چکاند"۔ وہ شعر یہ ہے:

ہر شہید کربلا سب سرخ پوش   مصطفےٰ کی آل کا کیا رنگ ہے

یہ مرثیے کا شعر معلوم ہوتا ہے۔

مبتلا نے ذیل کے شاعروں کی نثر نگاری اور انشا پردازی کی بھی تعریف کی ہے:

میر جبار علی بسمل: "در نثر سلیقہ دارد"۔ محمد روشن جوشش: "در نظم و نثر رسا استعداد خوش وقت رائے شادابے انشا خوب می نوشت"۔ میر عوض علی مدعا۔
"در طبابت و انشا پردازی قدرت داشتہ"۔

واضح ہو کہ مؤلف تذکرہ جب 'انشا' کا لفظ 'ریختہ' کے ساتھ لاتا ہے تو ریختہ کے معنی اردو غزل اور انشا کا مفہوم لکھنا یا کہنا یعنی تصنیف کرنا ہوتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ٹیک چند بہار: "گاہے ریختہ ہم انشا نمود"۔ محتشم علی حشمت: "ریختہ ہم گاہے.... انشا می کرد"۔ محمد علی حشمت: "در انشائے ریختہ سلیقۂ نیکو داشت"۔
مبارک علی والہ: "انشائے ریختہ می نماید"۔
محمد اعظم ہویدا: "گاہے بہ انشائے ریختہ می پردازد"۔

انشا کا لفظ اسی معنی میں غزل اور مرثیے کے لیے بھی آیا ہے۔ مثلاً مرزا علی رضا تمنا: "گاہ گاہے غزلے انشا می کند"۔ محمد علی عنبر: "اکثر مرثیہ..... انشا می کند"۔

گلشن سخن سے پہلے اردو شاعروں کے کئی تذکرے لکھے جا چکے تھے، لیکن مبتلا نے صرف میر تقی میر کے تذکرے کا صرف دو جگہ ذکر کیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے "تذکرۂ مختصرے مشتمل بر احوال و اشعار ریختہ گویان تالیف نمودہ"۔ جنون دہلوی کے اشعار نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے: "ایں ابیات کہ از تذکرۂ میر محمد تقی میر نقل نمودہ بہ تحریر می آرد"۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مبتلا نے میر کا تذکرہ دیکھا تھا اور گلشن سخن کی تالیف کے وقت وہ ان کے پیش نظر تھا۔ کسی اور تذکرے کا ذکر نہیں ہے، البتہ مرزا سودا کے شاگرد میر فخر الدین فخر کے والد اشرف علی خاں کو 'تذکرہ نویس' لکھا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ یہاں تذکرے سے تذکرۂ شعرا مراد ہے یا کچھ اور۔

گلشن سخن کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے اور ایک نسخہ کسی بدخط اور غلط نویس کاتب کا لکھا ہوا رضا لائبریری، رام پور میں ہے اور غالباً اس تذکرے کے صرف یہی دو نسخے ہیں جو اس وقت موجود ہیں۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۹ پر)

---

[1] تذکرۂ عشقی مطبوعہ ص ۱۲۰

ہندوستاں میرا وطن

روش صدیقی

دل کا سکوں میرا وطن ، آرامِ جاں میرا وطن
ہر رنگ میں ہر حال میں راحت نشاں میرا وطن
ہندوستاں میرا وطن

رودادِ تہذیبِ کہن میرے وطن کی داستاں
جشنِ بہارِ نو بہ نو میرے چمن کی داستاں
گل پیکر و گل پیرہن گل کارواں میرا وطن
ہندوستاں میرا وطن

بیگانۂ وہم و گماں ، دل دادۂ حسنِ یقیں
کاشانۂ انسانیت ، آرام گاہِ عقل و دیں
آزادیٔ فکر و نظر کا پاسباں میرا وطن
ہندوستاں میرا وطن

نرمی میں رشکِ برگِ گل ، سختی میں اک کوہِ گراں
جب آئے وقتِ امتحاں ، بن جائے برقِ بے اماں
خارا شکن میرا وطن ، شبنم چکاں میرا وطن
ہندوستاں میرا وطن

میرے وطن کی ریت ہے ، انسانیت کی آبرو
میرے وطن کا گیت ہے ، صدق و صفا کی جستجو
جویائے حق میرا وطن ، منزل نشاں میرا وطن
ہندوستاں میرا وطن

مرثیے کی طرزِ جدید اور ضمیر لکھنوی

علی جواد زیدی

اُردو مرثیوں کا خیال آتے ہی ہمارا ذہن علی العموم انیس و دبیر کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور یہ رجحان بڑی حد تک موازنۂ انیس و دبیر کا مرہونِ منت ہے۔ شبلی نے مرثیہ کے ابتدائی دور کی طرف بہت کم توجہ کی تھی اور وہ بہت سا ابتدائی مواد جو آج ہمارے سامنے ہے، وہ یقیناً اُن کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ بعد میں آنے والے بھی مدتوں انھیں کے بنائے ہوئے دائرے میں چکر لگاتے رہے اور مرثیہ کی ترقی اور اُس کے طفیل میں دوسرے اصنافِ سخن کا فروغ اپنے صحیح تاریخی پس منظر میں جانچا نہیں جا سکا۔ اگرچہ ماضی قریب میں مرثیہ کے بارے میں کافی معلومات فراہم ہوگئی ہیں اور کچھ کتابیں بھی چھپ گئی ہیں لیکن بھرپور تاریخی تجزیہ اور مفصل تنقید کا کام ابھی سائنسی طور پر شروع نہیں ہوا ہے۔

مرثیہ اپنے موضوع کے اعتبار سے خالص رثائی یا اعتقادی اور مذہبی صنف سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے دامن میں رزم و بزم کے اتنے پہلو چھپے ہوئے ہیں کہ خالص ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی مرثیہ گویوں کے اکتسابات کا جائزہ لینا ضروری ہوگیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرثیہ کے ابتدائی سانچے اہلِ عرب نے بنائے تھے اور پھر ایرانیوں نے اُس میں کچھ تبدیلیاں اور ترمیمیں کیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ شہیدانِ کربلا کے مرثیے بھی پہلے عربی اور پھر فارسی میں لکھے گئے اور انھیں دونوں کی وساطت سے اُردو میں پہنچے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں آنے کے بعد مرثیہ کے رثائی اجزا، رزمیہ اور بینہ عناصر اور خالص بزمیہ اور ادبی گوشے نہ صرف بیرونی خدوخال کے اعتبار سے بلکہ بنیادی طور سے بھی اتنے بدل چکے ہیں کہ اردو مرثیہ ایک علیحدہ صنف ہی بن گیا ہے اور فارسی یا عربی مرثیہ سے اس کا تطابق کچھ زیادہ مفید نہیں ہوسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعد کی تبدیلیوں اور ابتدائی نقوش میں بھی گہرا ربط ہے۔

سوداؔ کے نئے تجربے

ہم اردو مرثیہ کی جس عظیم روایت سے آج آشنا ہیں اور جس کا بھرپور احساس ہمیں حالیؔ، آزادؔ اور شبلیؔ نے پہلے پہل دلایا، اُس کے سنوارنے اور اُبھارنے والے انیسؔ و دبیرؔ ہی تھے لیکن ان کے پس پشت صدیوں پرانی ہندوستانی روایت تھی جو دکن، برہان پور اور گجرات میں پرورش پاتی رہی۔ اور پھر سوداؔ کے زمانے سے تجدید کی ایک نئی لہر اُٹھی۔

پہلے مرثیہ میں صرف درد اور بین کے مضامین نظم کئے جاتے تھے اور رثائیت کے معاملے میں یہ صنف ابتدائی عربی شاعری کی تانی کرتی تھی۔ ابتدائی اردو مرثیہ گویوں کے سامنے قیس بن ساعدہ جیسے دورِ جاہلیت کے عربی شعرا تھے جن کے مرثیوں کی دردناکی ضرب المثل ہے۔ اس میں ابھی اموی دور کے انحرافاتِ شعری کی گنجائش نہیں نکلی تھی۔ اموی دور کے خصائصِ شعری کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "غزل اور تشبیب نگاری کا شوق اتنا زیادہ ہوگیا تھا کہ مرثیہ کا آغاز بھی تشبیب سے کرنے لگے جس کی ایک قدیم مثال درید بن الصمۃ کا وہ مرثیہ ہے جو اُس نے اپنے بھائی کے لئے کہا تھا۔"[1] جب بھی مدنی زندگی میں نیا پھیلاؤ

---

[1] تاریخ ادبیاتِ عربی ص ۵۸ (مطبوعہ "ادارہ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد)

اور نئی لچک پیدا ہوتی ہے تو اس طرح کی جدتوں کی طرف طبیعتیں منزو مائل ہوجاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دکن، گجرات اور لکھنؤ میں جب ایک نئی تمدنی حرکت نظر آئی ہوئی تو جدت آفرینیوں نے فروغ پایا۔

سودا کے زمانے تک آتے آتے اردو مرثیوں کی تاریخ ڈھائی سو برس پرانی ہو چکی تھی اور مرثیہ گویان دکن و گجرات و برہان پور زبان و اسلوب بیان کے اعتبار سے ترقی کی کچھ منزلیں پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ جب شمال میں خالص ریختہ گو مرثیہ نویسوں کا دور شروع ہوا تو مرثیوں کے ادبی عناصر میں بھی مزید اضافہ ہوا۔ مثال میں مصطفیٰ خاں یکرنگ کے وہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں جو میر تقی میر نے نکات الشعراء میں نقل کئے ہیں۔ میر نے غیر ارادی اور سودا نے ارادی طور پر اس ادبی رنگ کو چوکھا کرنے کی کوشش کی۔

دلی میں غزل ہی اردو شاعری کی کائنات بن کر رہ گئی تھی طویل کوششوں مثلاً مثنوی وغیرہ کی روایتیں، دکن کی مرکزیت کے خاتمے کے بعد، تقریباً محو ہو گئی تھیں اور اصناف و موضوعات کے اعتبار سے (قصائد کو چھوڑ کر) شاعری پھیلنے کی بجائے سکڑنے لگی تھی۔ لکھنؤ میں اسے پھر ایک نئی زندگی اور وسیع تر میدان ملا اور قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، نعت و سلام، ہجو و ہزل، واسوخت و رباعی، غرض شاعری کی تمام صنفیں برتی اور نثر میں داستانیں اور مذہبی کتابیں وغیرہ لکھی جانے لگیں۔

مرثیہ کی ادبی اہمیت کا احساس سب سے پہلے سودا کو ہوا، ورنہ اس کے پہلے تو شاعروں میں مرثیہ گو کو بگڑا شاعر سمجھا جاتا تھا اور مرثیہ خوان کو بگڑا گویا۔ دریائے لطافت میں جو باتیں انشا رواروی میں کہہ گزرے تھے اُس کی ناقدانہ تفصیل احمد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں دی ہے۔

"جماعت مرثیہ گویان و منقبت گویان ہندی کہ کلام ایشاں سرتاپا از قبایح لفظی و عیوب معنوی مملو و مشحون است و ہرگز ایشاں را نظر برآں نیست بلکہ فخر بہ نسبت خود بہ سکینیِ عاجز و ہوشدار بے ہوش و پیرن بے علم نمودہ، سندِ غلطی ہائے خویش از کلام ایں ہا می آرند و ہر یک را امام خود دریں باب می دانند کہ مرثیہ ہم یکی از اقسام شعر است بلکہ می گویند کہ چیزی کہ در شعر روا نیست در مرثیہ جائز است الحاصل اگر بنا بر حصول سعادت و ثواب یا برائے تکمیل کلیات خود از اقسام شعر کسی از شعراء مرثیہ بگوید لازم است کہ دریں میدان ہم برکیت ارادت رو تلاش بتقلید ملک الشعراء (اے سودا) جوید، تا را و فصاحت بیانی و صحت لفظی و معنوی غلط نکردہ باشد[1]"

یکتا کا یہ دعویٰ بے دلیل نہیں ہے۔ ابتدائی اردو مرثیہ، جس کا مقصد عوام کو رُلانا یا خود رونا ہوتا تھا، مذہبی فریضہ اور اسی لئے ایک ذاتی اور نجی سا فعل بن گیا تھا جس کی طرف تنقید اور تجزیہ کیلئے نظر نہیں اٹھتی تھی۔ غالباً سودا وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مرثیہ پر ناقدانہ توجہ کی لیکن اُن کی یہ کوشش اُن کی افتاد مزاج کے باعث ذاتی تنقیص کی حدوں سے بس ذرا ہی سا آگے بڑھ پائی۔ پھر بھی اُنھوں نے میر کے مرثیہ کی رد میں جو رسالہ "سبیل ہدایت" لکھا ہے اُس میں آنے والی تنقید کے لئے ایک نیا نقش ضرور اُبھرتا نظر آتا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:۔

"لیکن مشکل ترین دقایق، طریق مرثیہ کا معلوم کیا کہ مضمون واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے دیا چنانچہ اس کام میں کسی نے محتشم سا عز و قبول نہیں پایا ..... پس لازم ہے کہ مرتبہ مد نظر رکھ کر مرثیہ لکھے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے[2]"

اس طرح سودا نے ایک طرف تو معنی آفرینی کی گنجائش نکالی اور دوسری طرف حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے ایسے مضامین سے احتراز کیا جن سے گریہ کا مقصد تو حل ہو جائے لیکن ممدوحین کے کردار کے نقوش مدھم پڑ جائیں۔ سودا کو اپنے دور کے مرثیہ گویوں پر یہ اعتراض تھا کہ اُن میں سے اکثر حفظ مراتب کے بغیر صرف عوام کو رُلانے کی خاطر ہر رطب و یابس مرثیہ میں شامل کر لیا کرتے تھے۔

مرثیوں کا موضوع محدود تھا اور حفظ مراتب کے ساتھ ساتھ "مضمونِ واحد کو ہزار رنگ میں ربط معنی سے" دینا ہر موزوں طبع کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسی لئے ابتدا ہی سے مضامین غم و الم میں جدت آفرینی کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ محمد شاہ کے عہد کے تین

---

[1] دستور الفصاحت از احمد علی یکتا ص ۸ (مطبوعہ ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۳ء)۔ [2] رسالہ "سبیل ہدایت"۔

مرثیہ نگاروں، یعنی مسکین، حزین اور غمگین کا ذکر کرتے ہوئے نواب درگاہ قلی نے لکھا ہے کہ:-

"الفاظِ الم آمود بہ مضامین حسرت آگیں ایجاد می کنند..... طرز ہاس عجیب و تلاش ہای غریب در فکر این عزیزاں بنظر می آید، حق تعزیہ در کلام خود ادا می کنند..... از استماع مرثیہ ہائیش بہ ارباب تعاز میرسد کہ از روضۃ الشہدا و نہ از وقایع مقبل قدر دانان مراتب الم و حاشنی گیران مائدہ غم امتیاز می کنند۔"

"الم آود الفاظ" اور "حسرت آگیں مضامین" کی ایجاد اور "عجیب طرز اور غریب تلاشوں" کا مقصد صرف "حقِ تعزیت" ادا کرنا تھا اور اس طرح کہ غم والم کے مرتبہ داں اُس کو محسوس کریں اور انھیں یہ روضۃ الشہدا اور وقایع مقبل جیسی کتابوں کے مصائب سے نظر آئے۔ اس تلاش اور جدت آفرینی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو کے اِن ابتدائی مرثیہ گویوں کے یہاں ہندوستانی 'بھکتی' کی گہرائی اور توانائی کبھی نظر آنے لگی۔ مرثیہ کے کردار خانوادۂ رسالت کے افراد اور مومن و شہید تھے۔ اِن سے عقیدت عام تھی ہی، ہندوستانی مزاج نے اس عقیدت کو ہندوستانی سانچے میں ڈھال دیا۔ کربلا کے دل دوز مناظر کی مرقع کشی اور محاکات کے سلسلے میں معاشرتی اور نفسیاتی جزئیات اور ماحول کی تخئیلی تفصیلات میں جا پڑنے کی وجہ سے اردو مرثیہ کے کرداروں میں ماں، باپ، بھائی، بہن، بھانجے، بھتیجے، دوست اور عقیدت مند، عربی تاریخ کا جزو ہوتے ہوئے بھی انسانی جذبات و احساسات کی حد تک ہندوستانی مزاج کا نمونہ بن گئے اور ساری فضا پر ہندوستانیت کا پَرتو پڑنے لگا۔ پاسِ مراتب اب بھی تھا، لیکن عقیدت کچھ اور گہری ہو گئی تھی اور اس عقیدت کا خالص ہندوستانی رنگ صاف پہچانا جا سکتا تھا۔ عربی اور ایرانی خصوصیات میں ہندوستانی آب و ہوا، ماحول، کرداروں کے نفسیات و روایات مرثیہ کی وساطت سے داخل ہو گئے اور اس طرح گھل مِل گئے کہ ارباب نظر کے علاوہ دوسروں کو محسوس بھی نہیں ہو پایا۔

سودا کی طرح کے تاریخی حقیقت پسندوں کو یہ انحراف ضرور کھٹکتا ہے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ امن پسند اور روحانیت پرست ہندوستان میں واقعات کربلا کے مختلف تفصیلات کا اثر عرب کے مقابلے میں زیادہ شدید ہونا لازمی تھا۔ انھوں نے جب چند تاریخی واقعات کو صدیوں بعد تصوّر کی آنکھوں سے دیکھا تو اُس میں درد و غم کے ہزاروں نئے پہلو نکلتے گئے۔ سودا کی طرح کے صاحبانِ علم، عربی کردار، فلسفۂ شہادت حسین اور رعد و تعزیہ و مرثیہ پر زور دیتے رہے لیکن مرثیوں کا ہندوستانی رنگ گہرا ہوتا ہی گیا اور خود سودا بھی اس رجحان سے کلیتاً نہ بچ پائے۔ جن پابندیوں کے ساتھ وہ مرثیہ لکھنا چاہتے تھے، اُن کے لئے کافی علم اور وسعتِ نظر کی ضرورت تھی کہ نئے مضامین بھی نظم کئے جائیں اور روایات کے دائرے کے باہر قدم بھی نہ نکلنے پائے۔ پھر بھی، اُن کی پُروزن آواز کی گونج دیر تک سُنائی دیتی رہی۔ مثلاً علی میاں کامل (جو میر نفیس کے ہم عصر ہیں) اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ بنیہ عنا مرثوحوں اور مرثیوں میں روایات سے متضاد نہ ہوں۔

اس پابندی کیساتھ، سودا نے عربی مرثیوں سے تشبیب کا طریقہ اخذ کیا۔ غالباً قصاید کی ہیئت ترکیبی سے متاثر ہو کر اُنھوں نے رزمیہ مضامین بھی داخل مرثیہ کئے اور بقول یکتا فصاحت بیان اور صحت لفظی و معنوی کا ایک معیار بھی اُنھوں نے قائم کیا اور اُسے مرثیے میں بھی برتنے لگے۔ اُن کے مرثیوں میں ہمیں نادر تشبیہات اور استعارات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ مختصر یہ کہ اُن کی ایجاد پسند اور دقیقہ سنج طبیعت نئے نئے تجربے کرتی رہی۔ اُنھوں نے کبھی صرف بین کا مرثیہ لکھا، کبھی تشبیب کا بھی اضافہ کیا، کسی میں رزم کی جھلک دکھا دی۔ غرض اُنھوں نے مختلف طریقوں سے مرثیے کہے اور نئے نئے گوشے پیدا کئے لیکن کوئی طرزِ خاص اختیار نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مرثیہ گو جنھیں لوگ شعرا کی صف میں شامل کرتے گھبراتے تھے اور جن کے ذکر سے قدیم تذکرے خالی پڑے ہیں، اب مستند شاعروں کی صف میں شمار کئے جانے کے قابل ہو گئے۔ علم، فن، خلوص اور رثائیت کا امتزاج سب سے پہلے میر و سودا کے یہاں ملتا ہے۔ خاص کر سودا نے اسے خاصی اہم صنعتِ سخن سمجھ کر برتا۔ اُن کے کلیات میں اکیانوے مرثیوں کی موجودگی اُن کے اس احساسِ اہمیت کا

کا ثبوت ہے[1]۔

ہیئت کے اعتبار سے بھی سوداؔ کے پہلے ہی مرثیہ کئی مرحلے طے کر چکا تھا۔ ایک ہی بحر و ردیف و قافیہ میں نوحہ و سلام و درود باختلاف مضامین غزل کے ڈھانچے کا تجربہ تھے۔ مرثیہ گویوں نے اس کے علاوہ مثلث، مربع، مخمس، اور مسدس سبھی ہیئتیں برتیں اور بالآخر مسدس کی شکل پر آکر قرار لیا۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ مسدس کی شکل میں سب سے پہلے کس نے مرثیہ لکھا۔ کوئی کہتا ہے کہ میر مہدی تیقنؔ برہان پوری نے سب سے پہلے مسدس کی شکل میں سولہ بندوں کا ایک مرثیہ نظم کیا[2]۔ حکیم عبدالحی کا قول ہے کہ "پہلے مرثیے چو مصرعی ہوا کرتے تھے، سب سے پہلے سوداؔ نے مسدس لکھا[3]"۔ نصیر حسین کا خیال ہے کہ مسدس کی شکل میں مرثیے سب سے پہلے حیدری دکنی نے نظم کئے۔ انھوں نے ثبوت میں یہ بند درج کیا ہے[4]:

عزیزو آج ناموس نبی پر آفت آئی ہے   شب رخصت ہے بہنوں کو شہ دیں کی جدائی ہے
خصوصاً بی بی بانو نے عجب حالت بنائی ہے   سرہانے بی سکینہ کے کھڑی دیتی دہائی ہے
منہ اُس کا چومتی ہے اور یہ کہہ کہہ کے روتی ہے
اری اٹھ لاڈلی میری غضب کی صبح ہوتی ہے

اگرچہ نصیر حسین نے اپنے بیان کی بنیاد گارساں دتاسی کے بیان پر رکھی ہے لیکن اظہر علی فاروقی نے اس بنیاد پر اس کے قبول کرنے میں تامل کیا ہے کہ اس بند کی زبان اتنی قدیم نہیں معلوم ہوتی جتنی ولی اور رنگ آبادی کے ہم عصر کی ہونا چاہئے۔ لیکن اس کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ یہ کوئی دوسرا حیدری ہے جو میرؔ و سوداؔ کے بعد کا شاعر ہے اور

[1] بعض لوگوں نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ اس میں کچھ مرثیے سوداؔ کے شاگرد مہربان کے ہیں لیکن یہ شبہ صرف شبہ کی حد تک ہی رہنا چاہیے کیونکہ بعض ایسے خلوص کار شاگرد ہمیشہ ہوا کئے ہیں جنھیں استاد کا کلام عطیتہً مل جایا کرتا تھا۔ بعض اوقات یہ عطیات ہم عصروں کے علم میں بھی ہوتے تھے اور ترتیب کلیات یا نقل دیوان کے وقت وہ اپنے خیال میں حق کو حق دار تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

[2] اردو کی تنقیدی سرمایہ مرتبہ عابد علی عابد وغیرہ ص ۲۵۰ (مکتبۂ گل خندان لاہور)

[3] گل رعنا ص ۲۹۸ [4] دربار حسین ص ۳۱۲

جب تک ایسی کوئی قطعی شہادت نہیں مل جاتی اُس وقت تک
کے استعمال کے سلسلے میں اُس کی اولیت نہ سہی تو میرؔ و سوداؔ
کے دعوے کو کلیتہً مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ بعض نے مسدس
میں مرثیہ لکھنے کی اولیت کا سہرا ایک پنجابی شاعر سکندر کے
ہے۔ میر تقی میرؔ کے یہاں بھی مسدس مل جاتا ہے۔ لیکن یہ
بات کا تعین کچھ بہت زیادہ ضروری بھی نہیں ہے کہ سب
کس نے مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھا۔ شعرائے قدیم نے
عروضی شکل میں نظم کیا ہے۔ چو مصرعے، مخمس، مسدس، مثلاً
غرض کوئی شکل بچی نہیں ہے۔ خود سوداؔ کے یہاں بھی مسدس
دوسری ہیئتیں موجود ہیں۔ لیکن سوداؔ نے غالباً پہلی بار ایک
مرثیے مسدس کی شکل میں لکھے اور بعد میں یہی شکل مرثیوں کی
شکل قرار پاگئی۔

سوداؔ کے مرثیوں میں خلوص اور عقیدت کی کمی تو نہیں
لیکن لکھنؤ کے مسلمہ معیاروں کے مطابق مرثیہ پن ضرور ہلکا
پہلو پر اُن کی زندگی میں بھی اعتراض ہوا کرتا تھا جس کا
انھوں نے "سبیل ہدایت" میں بھی کیا ہے۔ اگرچہ سوداؔ
شاعر ہیں جنھوں نے خاصی تعداد میں مرثیے لکھے لیکن ہم ا
مرثیہ گویوں کی صف میں شمار نہیں کر سکتے۔ البتہ اُن کی موجو
سے چند نئے گوشے سامنے آئے اور اُن کی سمت میں مرثیہ
رہنمائی ہوئی۔ رونا اور رُلانا تو اب بھی مرثیے کا مقصد
عربی ادب کی اس خاص صنف کا یہی پیدائشی مقصد رہا ہے
کے ساتھ مرثیے کو "طلوع فکر و انبساط روح" کی منزل تک
کام شروع کرنے کے لئے سوداؔ نے راستہ ضرور ہموار ک
گوئی کے ماتھے سے وہ کلنک دور کیا کہ صرف "بگڑا شاعر"
ہو سکتا ہے۔

طرز جدید کی ابتدا

ابھی اس صنف شاعری کے ادبی خد و خال کا تعین با
یہ کام میر ضمیرؔ نے انجام دیا۔ مرثیوں کی دنیا میں میر ضمی
پسندی اور اولیت بسیار جہاتی ہے۔ وہ نہ صرف مرثیے

اردو شاعری میں ایک اہم تبدیلی کے نقیب ہیں۔ انھوں نے ایک بڑے پیش رو کا کام کیا اور ایک نئی طرز کی بنیاد ڈالی جس کی انقلابی حیثیت سے انکار ناممکن ہے۔ یہ انقلاب تھا مسدس کا باقاعدہ اور باضابطہ استعمال۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، سلام وغیرہ سبھی میں مفرد اشعار لکھے جاتے تھے قصیدہ اور مثنوی میں تسلسل بھی ہوتا تھا لیکن ایک میں ایک ہی ردیف و قوانی کی قید اور دوسرے میں چند بندھی ٹکی بحروں کی پابندی تھی۔ دوسرے ایک کلیتہً مبالغہ اور اظہار علم و فن کے لئے مخصوص ہو گیا تھا اور دوسرے میں افسانوی رنگ آ گیا تھا۔ واقعات کربلا کی بنیاد تاریخی تھی۔ غالباً اس لئے بھی مرثیہ کے لئے اپنا ایک مخصوص عروضی سانچہ ڈھونڈھنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور میر ضمیر نے بعض متقدمین، بالخصوص سودا سے اشارہ پا کر مسدس کو مرثیوں کے لئے مخصوص کر لیا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ ضمیر ہی نے مسدس کو مرثیوں کی مسلمہ ہیئتِ عروضی کی حیثیت سے تسلیم کرایا اور مسدس کی شکل میں طویل مرثیے تو سب سے پہلے یقیناً ضمیر ہی نے لکھے۔ امیر احمد علوی کا بیان ہے کہ:۔

”میر ضمیر نے روایتیں نظم کرنا شروع کیں تو مرثیہ پچاس بندوں سے بڑھ کر اسّی بند کا ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ تعداد سو سے بھی متجاوز ہوئی۔ انھوں نے شہزادہ علی اکبر کی شہادت کے بیان میں ایک مرثیہ ۱۰۱ بند کا کہا جس کا مطلع یہ ہے[1]:۔

کس نور کی مجلس میں مری جلوہ گری ہے — کس نور سے پُر نور یہ نورِ نظری ہے

آمد ہی میں حیران قیاس بشری ہے — یہ کون سی تصویر تجلّی سے بھری ہے

گو حسن کا رتبہ نہیں مذکور ہوا ہے

منبر مرا ہم مرتبۂ طور ہوا ہے“

ضمیر کے بعد مسدس ایک محبوب شعری سانچا بن گیا اور انیس و دبیر کے بعد طویل نظموں میں مسدس کا استعمال ایک نئی ادبی روایت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ حالی، آزاد، شبلی، اقبال، چکبست، جوش، مجاز، اختر شیرانی، صفی وغیرہ کا طویل قافلہ جس عروضی سانچے میں فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات اور عالی جذبات کو ڈھالتا رہا اُس کو تراش اور خراد کر انھیں مرثیہ گویوں نے معزز و محترم بنایا تھا۔ اس کی تکمیل میں سب سے پہلی اور کامیاب کوشش ضمیر لکھنوی ہی کی ہے۔ اگر ان پیش روؤں نے مسدس کو مانجھ کر اس قابل نہ بنا دیا ہوتا کہ سنجیدہ شاعری اسے اختیار کر سکے تو ممکن تھا کہ اردو شاعری غزل، قصیدہ اور مثنوی کے چکر میں چند دنوں اور پڑی رہتی۔ اُس کے بعد کیا ہوتا یہ قیاسات کی حدوں میں داخل ہے۔ لیکن مسدس کے ارتقا سے ہماری شاعری کو یقیناً بہت سے بیش بہا خزانے ملے اور غزل اور قصیدہ کے جدت شکن اثرات سے نجات کا ایک ذریعہ ہاتھ آیا۔

میر ضمیر کے دور تک آتے آتے غزل اور قصیدہ دونوں ہی بے جان سے اصناف بن چکے تھے۔ تازہ گوئی، تخئیل اور صنائع و بدائع کے نام پر اب بھی کچھ لوگ ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ لیکن اِن اصنافِ سخن کے لئے خصوصی انہماک ویسے بھی زیادہ دنوں تک باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثنویوں کی طرف پھر توجہ بڑھ رہی تھی۔ لکھنؤ کے شعرا میں ماضی سے کٹنے اور نئی راہ ڈھونڈھنے کا ولولہ بھی موجود تھا۔ اتفاق سے لکھنؤ میں سازگار مذہبی ماحول بھی مل گیا، اس لئے یہ یک وقت خلیق، ضمیر، دل گیر، فصیح اور کئی مرثیہ گو پیدا ہو گئے اور سبھی اسی مسدس کو برتنے لگے۔ جب مسدس کے استعمال کے معاملے میں بھی سب برابر کے شریک ہو گئے تو ضمیر کا ذہن مزید جدتوں کی طرف مائل ہوا۔

میر ضمیر شروع میں غزلوں کے علاوہ مثنویاں بھی کہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مرثیوں میں مثنویوں کے بہت سے مضامین شامل کئے اور پہلی بار اردو ادب کو ایک نئی خانگی محبت سے روشناس کرایا۔ ماں بیٹے کی محبت، چچا بھتیجی کی محبت، پھوپھی اور بھتیجے کی محبت، بھائی بہن کی محبت، زن و شو کی محبت، قاید و مقلد کی محبت۔ غرض محبت ارضی رہتے ہوئے بھی روحانی سطح پر آ گئی اور اسی کے ساتھ مذہبی عقیدت بھی منشخص ہو گئی۔ اس اعتبار سے مرثیہ کو قصیدہ پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

غزلیہ، بالخصوص لکھنؤ کی غزلیہ شاعری کے لئے یہ جو خطرہ

[1] یادگار انیس ص ۲۲

پیدا ہوگیا تھا کہ وہ کہیں ہوسناکیوں کے سیلاب میں بہ نہ جائے اُس کے لئے مرثیہ کی روحانی فضا بڑی روک بن گئی۔ یہ کام یقیناً میر ضمیر ہی کی طرح کے لوگ کر سکتے تھے جو اپنی ذاتی زندگیوں میں بھی پاک دامان تھے۔ مصحفی نے میر ضمیر کو "سرآمدِ صلحائے روزگار" لکھا ہے[1] اور اصغر حسین نظیر نے اُن کے بارے میں یہ معلومات بہم پہنچائے ہیں کہ وہ "نہایت متقی اور پرہیزگار شخص تھے"[2]۔ اسی ذاتی زہد و تقوی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے اخلاقی شاعری پر خاص توجہ مبذول کی اور بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی :-

"لکھنوی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل طور سے داخل کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اور کامیاب کوشش۔ جو لوگ پہلے ہزل، ہجو، ریختی اور اندر سبھا کی طرف مایل تھے اب اُن کی طبیعت اس سے فن کی طرف رجوع ہونے لگی"[3]۔

اس بیان میں ایک تاریخی غلطی بھی ہے جس کی طرف اشارہ ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس دور میں مرثیہ کی طرف توجہ کی اُن میں ضمیر و خلیق کی طرح بیشتر ایسے تھے جو غزل و مثنوی نگار تھے، ہزل گو یا ہجو نگار نہیں تھے۔ اندر سبھا کے مصنف امانت، اندر سبھا کی تصنیف کے پہلے بھی مرثیہ و سلام کہتے تھے اور اندر سبھا کے انداز کی شاعری کو اتنا ہی دونِ مرتبہ سمجھتے تھے کہ اس میں اپنا تخلص تک استاد ظاہر کیا۔

جذبات نگاری، منظر نگاری اور واقعات نگاری یہ بھی ہماری مثنویوں کی دین ہیں اور وہیں سے مرثیوں میں داخل ہوئی ہیں۔ لیکن اس باب میں بھی مرثیہ گویوں کے سامنے سخت مشکلیں تھیں۔ وہ جن لوگوں کے جذبات و حسیات نظم کرنا چاہتے تھے وہ ہندوستانی نہیں تھے عرب تھے۔ عرب ہونے کے علاوہ اُن میں بیشتر آلِ رسول تھے یا صحابی اور مومنِ کامل تھے۔ اُس دور کے مرثیہ نگار ان افراد میں سے بیشتر کو مافوق البشر سمجھتے تھے اور اُن سے میدانِ جنگ میں، مصلّوں پر اور بزمِ عام میں اُنھیں امور کی توقع رکھتے تھے جو معصوموں کے شایانِ شان ہوں۔ چونکہ نبی اور امام کو بھی موت سے مفر نہیں ہے اس لئے موت یا شہادت ہی ایک ایسا موضوع تھا جس میں تقاضائے بشری کے مطابق ان افراد کے عام انسانی جذبات کی تصویر کشی کی جا سکتی تھی۔ ایسے لمحوں کے حالات، اپنی تمام جزئی تفصیلات کے ساتھ کسی کتاب میں درج نہیں تھے۔ اس کمی کو شعرا نے زورِ فکر سے پورا کرنا چاہا اور اس کوشش میں انھیں ہندوستانی کرداروں کا سہارا لینا پڑا۔ شہادت پر خیمہ میں کہرام برپا ہوتا تھا لیکن اس کہرام میں بھی مرد اور عورتوں کا کردار جداگانہ ہے۔ عورتیں بین کرتی ہیں، آہ و بکا کرتی ہیں اور بے حد مضطرب ہوتی ہیں لیکن مرد کافی صبر و ضبط سے کام لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ہاں انسانی تقاضوں سے مجبور ہو کر محوِ گریہ بھی دیکھے جاتے ہیں۔ کرداروں کا فرق امام اور غیر امام، آقا اور غلام میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بات پر اکثر اعتراض کیا جاتا ہے کہ مرثیہ نویسوں نے مندرجاتِ کتبِ تواریخ و مغازی سے جابجا انحراف کیا ہے اور انتخابِ شاعرانہ ہی نہیں تخیلی تخلیق سے بھی کام لے کر ایسی گفتگوئیں نظم کر دی گئی ہیں یا کرداروں کو ایسے واقعات و حالات سے دوچار کیا گیا ہے جو حقیقت سے دور ہیں۔ بے شک یہ ایک کمزوری ہے، لیکن یہی کمزوری مرثیوں کی خوبی بھی بن گئی۔ خوبی کی شکل یہ نکلی کہ اسی کی بدولت مرثیوں نے رزمیوں کی شکل اختیار کر لی اور مرثیے کی ہیئت کذائی ہی بدل گئی۔ کہاں تو یہ عالم تھا کہ مرثیے صرف بین و بکا کے لئے لکھے جاتے تھے اور کہاں بین کا عنصر جزوی اور ذیلی ہوگیا، اور بیشتر حصہ رزمیہ اور بزمیہ اشعار میں مبدل ہوگیا۔ روایتیں اور واقعات نظم ہونے لگے اور خالص بین کی منزل سے نکل کر مرثیہ ایک طویل مذہبی اور نیم تاریخی رزمیہ ہوگیا۔

مذہبی رزمیوں کو کبھی بھی تاریخ کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا۔ مہابھارت اور راماین عظیم رزمیے ہیں لیکن اِن کے مصنفوں سے کوئی یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ اُنھوں نے تاریخی انحرافات کیوں کئے۔ رزمیہ کی بنیاد تاریخ کے علاوہ بھی، تصوراتی حقیقت پر بھی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو والمیکی کی راماین اور تلسی داس کے رام چرت مانس میں سوائے زبان کے کوئی فرق ہی نہ ہوتا لیکن قصہ اور افراد قصہ ایک ہوتے ہوئے بھی اِن میں بہت سے اختلافات و انحرافات ہیں۔ مرثیہ

[1] ریاض الفصحا ص ۱۸۱ [2] مختصر تاریخ ادب اردو از اصغر حسین نظیر ص ۱۵۱ [3] "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" ص ۶۸۰ (اردو مرکز لاہور)

بھی نہ تو سیرت ہے، نہ حدیث، نہ تاریخ۔ یہ ایسی خالص مذہبی تصنیف بھی نہیں ہے جس کا مقصد صرف حصول ثواب ہو۔ یہ دور میر تقی میر تک گزر چکا۔ بعد میں کسی قدر سودا نے اضافے کئے اور پھر میر ضمیر نے اسے جی کھول کر ایک ایسی ترقی یافتہ صنفِ ادب بنانے کی کوشش کی جس میں تمام مذہبی معتقدات سے دلچسپی نہ رکھنے والے بھی اپنی دلبستگی کا سامان پاسکیں۔ میر ضمیر اور اُن کے متبعین کے ہاتھوں یہ حقیقتاً ایسی ایک صنف بن گئی تھی جو مرثیہ کم اور رزمیہ زیادہ تھی۔ اس کو لوگ بدستور مرثیہ اس لئے کہتے رہے کہ یہ مجالسِ عزا میں پڑھا جاتا تھا اور اس میں بین کا عنصر بھی موجود تھا۔

بین اور بکا کے پہلو سے مجھے سروکار نہیں ہے لیکن کربلا کا سانحہ یقیناً ایک عظیم رزمیہ کا مواد ہے۔ رزمیہ کے لئے مرکزی کردار کی فتح ضروری نہیں ہے۔ خیر و شر کا یہ معرکہ عظمت موضوع کے اعتبار سے یقیناً رزمیہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فوجی پیمانوں سے ناپئے تو فتح یزید کو ہوئی، لیکن اگر اس پہلو سے غور کیجئے کہ یزید اپنے اصل مقصد یعنی حسین اور اُن کے رفقاء سے بیعت لینے میں کہاں تک کامیاب رہا تو کامیابی کا سہرا یقیناً اُن بہتر نفوس کے سروں پر نظر آئے گا جو کربلا میں بہیمانہ طور پر ذبح ہوئے۔ حسین نے اپنے ہی لفظوں میں "عزت" کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دی۔ لیکن یہ اقرار بھی ناگزیر ہے کہ ضمیر وغیرہ کے مرثیوں میں کربلا والوں کے کردار کا یہ پہلو اُجاگر نہیں ہو پایا۔

موت کا بیان رثائیت پیدا ہی کر دیتا ہے۔ مرثیہ نگار اس منزل سے بیگانہ وار نہیں گزر سکتا۔ اُدھر ماضی کی سیاسی قدغنوں کی بدولت حسین کے ذکر مصائب اور اُن پر بین کرنے کو ثواب عظیم کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا۔ اس لئے مرثیہ نگاروں نے ہندوستان کی آزاد فضاؤں میں شروع ہی سے، بین پر غیر معمولی توجہ دی اور یہ سلسلہ بعد میں بھی اس طرح جاری رہا کہ ان رزمیہ مرثیوں میں بین کا عنصر غیر متوازن ہو گیا۔

ان خامیوں کے باوجود، میں اسے بڑی بات سمجھتا ہوں کہ قصیدوں سے تشبیب اور مثنویوں سے سراپا، رزم اور بزم، مرثیوں سے بین اور رباعیوں سے اخلاقی عناصر لے کر میر ضمیر نے مرثیہ کو ایک بالکل ہی نئی صنف بنا دیا، جس میں رثائیت کا عنصر زیادہ تھا۔ ضمیر لکھنوی نے اس طرح اُردو مرثیہ کو عربی اور فارسی مرثیوں سے الگ ایک صنف بنا دیا۔ انھوں نے اس صنف میں کچھ خاص ایجادیں کیں اور کچھ پُرانے نشانات کے بھی نوک پلک درست کئے۔ اُن کی اتباع بعد میں آنے والے کرتے رہے اور انھیں کی قائم کی ہوئی بنیادوں پر نئی دیواریں اُٹھاتے اور محل تعمیر کرتے رہے۔ اس اعتبار سے، ضمیر کو اردو مرثیہ گوئی میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے کہ:۔

"اگرچہ یہ ترقی براہ راست مرثیہ کی ترقی نہ تھی بلکہ اردو شاعری میں ایک قسم کا ایجاد تھا کہ جس نظم کی بنیاد محض بین اور مرثیت پر ہونی چاہئے تھی اُس میں بین اور مرثیت کے علاوہ مدح اور قدح، فخر و مباہات، رزم اور بزم بھی نہایت شد و مد کے ساتھ شامل ہو گئی۔ مگر حق یہ ہے کہ اس طرز میں سب سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے میر ضمیر نے مرثیہ کہے ہیں، گویا وہی اس طرز کے موجد ہیں[1]۔"

انھیں خیالات کا اعادہ علامہ شبلی نے بھی کیا ہے کہ "میر ضمیر تک یہ فن گویا ابتدائی حالت میں رہا۔ سب سے پہلے جس شخص نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا وہ میر ضمیر، مرزا دبیر کے استاد ہیں[2]۔" حکیم عبدالحی نے گل رعنا میں، ڈاکٹر اعجاز حسین نے مختصر تاریخ ادب اردو میں، محمد احسن فاروقی نے اپنے مضمون "اردو مرثیہ" میں، اصغر حسین خان نظیر نے مختصر تاریخ ادب اردو میں، ابو اللیث صدیقی نے لکھنؤ کا دبستان شاعری میں اور شجاعت علی سندیلوی نے مقدمہ مرثیہ میں کم و بیش انھیں باتوں کو دُہرایا ہے۔ سب سے بڑا ثبوت خود ضمیر کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ مرثیہ گوئی میں ایک طرز جدید کے بانی ہیں۔ مثنوی "مظہر العجائب" میں انھوں نے بصراحت لکھا ہے کہ:۔

ہے وہ صد ہزار شکر خدا — کہ مری طرز ہے سبھوں سے جدا
طرز یہ مرثیہ کی ٹھہرائی — کہ سراپا ہو اور صف آرائی
پایا میرے کلام نے یہ رواج — کہ نہیں ہے بیان کا محتاج

اور حضرت علی اکبر کی شہادت کے مرثیے میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری طبع سوم ص ۲۰۰ (نیشنل پریس، الہ آباد)
[2] موازنۂ انیس و دبیر ص ۱۲-۱۳ (مطبع مفید عام، آگرہ)

جس سال لکھے وصف میم شکلِ نبی کے بارہ سو اُنچاس تھے ہجری نبوی کے
آگے تو یہ انداز سُنے تھے نہ کسی کے اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرزِ نوی کے

دس میں کہوں، نثو میں کہوں یہ درد ہے میرا
اس طرز میں جو جو کہے شاگرد ہے میرا

میر ضمیر کے اقتباس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اُن کی حیات ہی میں اس طرز کی تقلید کرنے لگے تھے۔ چنانچہ خلیق کے یہاں بھی ایسے مرثیے مِل جاتے ہیں جن میں اس طرز کی جھلک ہے۔ غالباً اسی کو دیکھ کر اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے مرثیہ کی طرزِ نو کی ایجاد میں خلیق کو بھی شریک کر لیا ہے۔ اُن کا قول ہے کہ "مرثیہ کے اس اسلوب کے موجد میر خلیق اور میر ضمیر تھے۔"[1] محمد طاہر فاروقی نے بھی گویا اِس میں ہاں ملائی ہے۔ "ضمیر و خلیق اور خاص کر ضمیر نے اس کی ماہیت بالکل بدل دی۔"[2] البتہ فاروقی نے دونوں کا یہ باہمی فرق بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے "خلیق نے رزمیہ مرثیے نہیں لکھے، رزمیہ مرثیے میر ضمیر کی ایجاد ہیں۔"

غالباً اِن حضرات نے یہ رائے خلیق کے وہ مراثی دیکھ کر قائم کی ہے جو میر خلیق کے بہ یک واسطہ شاگرد میر نواب نے ۱۲۹۶ھ میں گلبرگہ سے شایع کئے تھے۔ لیکن اس مجموعے کے بارے میں شبلی نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:-

"اس میں میر خلیق کے متعدد مرثیے ہیں، لیکن اکثر وہ ہیں جو آج میر انیس کے نام سے مشہور ہیں، اور یہ میر انیس کے چھپے ہوئے مرثیوں میں شامل ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو مطبوعہ مرثیوں میں شامل نہیں ہیں لیکن زبان اور طرزِ ادا سے قیاس ہوتا ہے کہ میر انیس ہی کے نتایجِ فکر ہیں۔"[3]

اگر خلیق کے مجموعہ مراثی میں شمولیت اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ مرثیے خلیق ہی کے ہیں تو انیس کے مجموعہ ہائے مراثی میں کسی مرثیے کا شامل ہونا اس بات کی دلیل کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ انیس ہی کا کلام ہے۔ خلیق اور انیس میں ایسا کوئی بعد مکانی نہیں ہے کہ اُن کی زبان میں نمایاں اختلاف ہو۔ اس لئے کم از کم وہ مراثی جو انیس کے مطبوعہ مجموعوں میں پائے بھی نہیں جاتے خلیق کی ملکیت سے بآسانی نہیں نکالے جا سکتے۔ میرا خیال ہے کہ جب میر ضمیر کی نئی طرز لکھنؤ میں مقبول ہوئی اور سرکاروں دربارروں میں بھی اُن کی شان قرار پائی تو جواباً خلیق نے بھی اسی طرز میں دو ایک مرثیے لکھ دئے ہوں گے اس سے جدت کا شرف میر ضمیر سے چھینا نہیں جا سکتا۔

ہاں میر ضمیر اور میر خلیق کی طرزوں میں نمایاں فرق پھر بھی رہ جاتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے اِن دونوں ہم عصروں کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں کی جداگانہ خصوصیتیں یوں گنائی ہیں:-

"اظہارِ کمال میں دونوں استادوں کی رفتار الگ الگ تھی، کیونکہ میر ضمیر تشبیہ علمی اور زورِ طبع کے بازوؤں سے بلند پروازی کرتے تھے اور پورے اُترتے تھے۔ میر خلیق مرثیت کے کوچے سے اتفاقاً ہی قدم آگے بڑھاتے تھے۔ وہ مضمون آفرینی کی ہوس نہ کرتے تھے اور ہمیشہ محاورے اور لطفِ زبان کو خیالاتِ دردانگیز کے ساتھ ترتیب دے کر مطلب حاصل کرتے تھے۔"[4]

اِس دور میں خلیق کے علاوہ فصیح اور دلگیر بھی مستند مرثیہ گویوں میں مانے جاتے تھے۔ اِن کے مرثیے موجود ہیں اور جگہ جگہ اِن کے یہاں بھی وہ رجحانات نظر آجاتے ہیں جن کو ضمیر نے التزام کے ساتھ برتنا شروع کیا۔ گویا طرزِ نو اُسی دور میں مستند ہو گئی تھی۔ اپنے ہم عصروں میں میر ضمیر وہ تنہا مرثیہ گو ہیں جس نے اس صنف کو حصولِ ثواب کے علاوہ، اظہارِ علم و فن کے لئے بھی استعمال کیا اور اِسے اس طرح برتا کہ یہ صنف ایک باقاعدہ ادبی صنف کا رُتبہ پا گئی۔

میر ضمیر نے مرثیہ کی فنی ہیئت کا تعین کیا۔ اُنھوں نے ترتیبِ مضامین قائم کی۔ پہلے تمہید، چہرہ، پھر میدانِ جنگ کے لئے رخصت، سراپا، میدان میں آمد، رجز خوانی، گھوڑے اور تلوار وغیرہ کا بیان، لڑائی، شہادت اور دعا پر خاتمہ۔ محاکات اور منظر کشی بھی موقع موقع سے شامل ہوئی۔ یہی وہ ڈھانچہ ہے جس کو ضمیر کے شاگردوں، یعنی دبیر اور انیس نے بھی برتا اور اسی میں اُنھوں نے نئے گوشے پیدا کیے اور شعری لطافتوں کا اضافہ کیا۔ امجد علی اشہری نے حیاتِ انیس

---

[1] مختصر تاریخ ادبِ اردو از اصغر حسین نظیر ص ۱۷۸

[2] اردو مرثیہ از محمد طاہر فاروقی (نقوش، جون ۱۹۶۰ء) ص ۲۰

[3] موازنہ انیس و دبیر ص ۱۲ (مطبع مفید عام آگرہ)

[4] آبِ حیات

میں لکھا ہے کہ :۔

"میر ضمیر مرحوم نے ایک مرثیہ لکھا'

کس نور کی محفل میں مری جلوہ گری ہے

اس میں شہزادہ علی اکبر کی شہادت کا بیان ہے۔ پہلے ایک تمہید سے مرثیہ کا چہرہ باندھا' پھر سراپا لکھا' پھر میدان جنگ کا نقشہ دکھایا اور بیان شہادت پر خاتمہ کر دیا۔ چونکہ یہ پہلا ایجاد تھا اس لئے تعریف کی آوازیں دور دور تک پہنچیں۔ تمام شہر میں شہرہ ہو گیا۔ یہ ایجاد مرثیہ گوی کے عالم میں ایک انقلاب تھا کہ پہلی روش متروک ہو گئی اور سب اس کی پیروی کرنے لگے[1]

شبلی نے لکھا ہے کہ :۔

"۴۔ (میر ضمیر نے) واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی' چنانچہ ایک ایک جزوی واقعہ کو تفصیل سے لکھا۔ ۵۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور' بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی۔ غلط الفاظ جو مرثیوں کے لئے گویا جائز مان لئے گئے تھے اکثر' ترک کر دئے۔ اُن کے عمدہ کلام کا اگر انتخاب کیا جائے تو میر انیس کا کلام معلوم ہوگا[2]"

صاحب خمخانۂ جاوید نے بھی یہی باتیں دُہرائی ہیں[3]۔ ابو اللیث صدیقی نے میر ضمیر کی خوبیاں ترتیب وار گناتے ہوئے' حسب ذیل ایجادوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے :۔

"۲۔ اُن سے پہلے مراثی کے جو نمونے ملتے ہیں وہ مختصر ہیں۔ ضمیر کے کلام میں ۸۰ ۔ ۹۰ بند کے مرثئے تو بکثرت ہیں اور اکثر مراثی تو ۱۰۰ بند سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ اِس پُر گوئی کے باوجود اُن کا کلام رطب و یابس سے پاک ہے۔

۳۔ مرثیے میں پہلے صرف واقعات شہادت کے بیان پر اکتفا کی جاتی تھی۔ انھوں نے مختلف موضوعات کو علیحدہ علیحدہ فنی خصوصیات کے ساتھ باندھا' مثلاً سراپا' گھوڑے کی تعریف' تلوار کی تعریف وغیرہ۔

۴۔ جذبات نگاری اور منظر نگاری' جس کی ایک صورت واقعہ نگاری بھی ہے اُن کے مرثیوں میں مستقل حیثیت رکھتی ہے۔۔۔

۶۔ لکھنوی شاعری میں اخلاقی شاعری کو مستقل حیثیت سے داخل کرنے کی یہ پہلی کوشش ہے اور کامیاب کوشش[4]۔۔۔۔"

یہ اوصاف گنوانے کے بعد ابو اللیث صدیقی نے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ "اس اعتبار سے وہ مرثیہ گوئی میں پہلے صاحب فن اور صاحب طرز ہیں اور اُن کے ہاں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو بعد میں انیس و دبیر اور اُن کے جانشینوں کے کلام میں ملتی ہیں"۔ اس میں تعجب بھی نہ ہونا چاہئے کیونکہ انیس و دبیر دونوں ہی نے براہ راست اور اُن کے بعد آنے والوں نے بالواسطہ مرثیہ کے فن میں ضمیر سے کسب فیض کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ایسے صاحب طرز' وسیع النظر اور باکمال شاعر پر ابھی تک خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ اُن کے حالات زندگی تک کہیں تفصیل سے نہیں ملتے۔ اگر کسی تذکرہ نویس نے ضمناً دو چار لفظوں میں ذکر دیا تو گویا احسان کیا۔ میں نے تلاش و جستجو کے بعد کچھ حالات جمع کئے ہیں جو نیا دور لکھنؤ کی کسی آئندہ اشاعت میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔

[1] حیات انیس از امجد علی اشہری ص ۱۶ [2] موازنۂ انیس و دبیر ص ۱۳ (مطبع مفید عام' آگرہ) [3] خمخانۂ جاوید ج ۵ ص ۲۷۶
[4] لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۶۲۸ ـ ۶۲۹



غزل

حبیب احمد صدیقی

تہمتِ آہ و رسا اور سہی — اُن کو اک عذرِ جفا اور سہی

آپ کا لطف و کرم دیکھ چکے — عہد و پیمانِ وفا اور سہی

تابکے شکوہ ہی رہے گی کس کو — کچھ دنوں مشقِ جفا اور سہی

رنگ و رامش کی طرب گاہوں میں — دلِ مضطر کی صدا اور سہی

رنج کیا میری تباہی کا انھیں — ایک بے برگ و نوا اور سہی

جاں نثاروں میں ہمیں تھے کل تک — آج اربابِ وفا اور سہی

دل ابھی واقفِ انجام نہیں — کوئی دن نغمہ سرا اور سہی

کم نہ ہو جائے یہ آشفتہ سری — عشوۂ ہوش رُبا اور سہی

یہ تو ہے میرے گناہوں کی سزا
بے گناہی کی سزا اور سہی

ماگھ ۱۸۸۵

۲۶ جنوری ۱۹۶۴ء

انسانی حقوق

اور

ہندوستان

ہمایوں کبیر

ہماری موجودہ صدی عام انسان کا دور ہے۔ انسانی تاریخ میں اس سے پہلے عمومی شہری کے فرائض و حقوق کا اتنا زیادہ اعتراف شاید کبھی نہیں کیا گیا۔ مذہب کی تلقین کے باوجود ماضی کی تمام سوسائٹیوں میں مورثیت نمایاں رہی ہے اور اقلیت نے اکثریت کے سر پر مراعات حاصل کی ہیں۔ فرقوں اور سماجوں میں نسل، رنگ اور جنس کی بنا پر امتیاز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ عدم مساوات اس لیے بھی شدید سے شدید تر ہوتی رہی کہ علاقائی تمدن قائم تھے اور کوئی عالمی تمدن موجود نہ تھا۔ انسانی حقوق کے مختلف اور اخلاقی تصورات بہ یک وقت رائج تھے اور ایک علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کے تصورات سے نابلد تھے۔ آج کی دنیا میں ایسے حالات سوچے بھی نہیں جا سکتے۔ دنیا کے ایک کونے میں کوئی بات واقع ہوتی ہے تو فوراً ہی اس کے دوسرے کونے میں اس کا ردعمل نمایاں ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی تمدن کے مقفل نظاموں کے لیے اب کوئی جگہ نہیں نہ حقوق انسانی کے اخلاقی تصورات کے لیے کوئی جگہ ہو سکتی ہے۔ انسانی حقوق کا کوئی بھی منشور اب سارے عالم کو محیط کیے بنا نہیں رہ سکتا۔

فرد کی عظمت ۔ دنیا کے عظیم مذاہب نے ابتدا ہی سے انسان کے حقوق و فرائض کی یگانگت کو تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ ہندوستانی تاریخ کے شروع میں ذات پات کو ہند سماج کے ستون کا مقام حاصل ہو گیا لیکن ہندومت کے فلسفے نے انسان کی روح کو برہم سے وابستہ کر دیا۔ بدھ مت کا مسلسل تبدیلی کا فلسفہ اور نروان کا تصور، عیسائیت کا خدا کی سرزمین کا نظریہ اور اسلام کا عالمی اخوت پر زور دینا اسی نکتے کی مزید اور پُر زور صراحت کے برابر تھا۔

تمام مذاہب متفق ہیں کہ ایک انسان کے خلاف زیادتی سارے انسانوں کے خلاف زیادتی کے برابر ہے۔ بھارتی مذاہب نے اس پر زور دیا اور واضح کیا کہ جانور اور پودے کو بھی ضرر پہنچانا گناہ ہے۔ مذہبی تصورات سے ہٹ کر ذاتی مفاد نے بھی ابتدائے آفرینش ہی سے انسان کو سکھایا ہے کہ جو کچھ وہ خود اپنے لیے پسند نہیں کرے گا وہ دوسروں کے ساتھ بھی نہیں کرے گا۔ "فرد دیگر" کے اس خیال و احترام کے بغیر کوئی شہری سماج قائم نہیں رہ سکتا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ باہمی حقوق و ذمہ داریاں انسانی تعلقات کی اساس ہیں، انسان حقوق کا طلبگار رہا اور فرائض کی دوسروں کی جانب سے تعمیل کا متمنی رہا۔ لیکن آج کل تمام ترقی پسند ملکوں نے اپنے آئین میں فرد کی عظمت کی حفاظت کرنے اور تمام کو سماجی انصاف دلانے کے لیے چند بنیادی اصول وضع کر رکھے ہیں۔

آئینِ ہند کے رہنمایانہ اصول ۔ ان بنیادی اصولوں کا بھارتی آئین کی تمہید میں ذکر ہے :۔

تمام شہریوں کو سماجی، اقتصادی و سیاسی انصاف حاصل ہوگا۔

تمام شہریوں کو عقیدے، ایمان، عبادت، خیال و اظہارِ خیال کی آزادی حاصل ہوگی۔

تمام شہریوں کو مرتبے اور ذات کی مساوات حاصل ہوگی۔

تمام شہریوں کے مابین بھائی چارگی قائم کی جائے گی۔

فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد کا تیقن دیا جائے گا۔

ہمارے ہاں ان بنیادی اصولوں کی تصدیق ضروری تھی کیونکہ ہم نے ان سے اکثر افسوسناک طور پر گریز کیا ہے۔ یہاں میں صرف ان محرومیوں کا ذکر کروں گا جو ذات پات کے نظام کا انجام تھیں۔ اپنے آغاز و مقصد کے اعتبار سے (اگرچہ عملی طور پر نہیں) ذات پات مختلف نسلوں کے افراد کو ہم آہنگی کے ساتھ رہنے میں مدد دینے کا ذریعہ تھی۔ شروع شروع

میں خاندان اور افراد اپنی ذاتیں بدل سکتے تھے۔ اس بات کا ثبوت یہی ہے کہ آریائی دیومالا میں جب دراوڑی دیوتاؤں کو شریک کر لیا گیا تو دراوڑ پجاری کو بھی براہمن کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ اپنے اولین دور میں ذات پات نے اقتصادی کشمکش سے بھی ملک کو بچایا جبکہ انیسویں صدی کے یورپ میں اس نے بڑی تفریق پیدا کی۔

مگر اس کی غایت اور موزونیت کچھ ہی کیوں نہ ہو، ذات پات کا نظام جہاتما گوتم بدھ کے زمانے تک جبر و استبداد کا ڈھانچہ بن چکا تھا اس کے خلاف اٹھنے والی بغاوت کی ان کی پہلی آواز تھی جس کے بعد سے ہندوستان کے ہر مذہبی مصلح اور آچاریہ نے اس بغاوت کو جاری رکھا۔ روایت ہے کہ شنکر اچاریہ نے جنھیں قدامت پرست ہندومت کا مبلغ مانا جاتا ہے، ایک ایسے اچھوت کو عزت دی جو ہندو سماج کی سب سے نچلی ذات سے متعلق تھا۔

اسلام کا اثر۔ عہد وسطیٰ میں اسلام کے اثر سے ذات پات کے خلاف جد وجہد کو مزید تقویت حاصل ہوئی اور عظمت آدم پر مبنی مذہبی احیاء کا آغاز ہوا۔ تمام بڑے بڑے مصلح مثلاً رامانند، کبیر، نانک اور چیتنیہ نے ذات پات کی تعصبوں کو پاٹنے اور فرد کی اپنی اصلیت کی بناء پر جانچ کرنے کی کوشش کی۔

بھارت میں اہل یورپ کی آمد نے بھی ذات پات کی پابندیوں کو توڑنے میں مدد دی۔ راجہ رام موہن رائے اور ان کے بعد کے کئی ایک سماجی سیاسی و مذہبی لیڈروں نے ذات پات کی بندشوں کو توڑنے کی جد وجہد جاری رکھی۔ اس سلسلے میں ودیا ساگر، راناڈے، شردھانند اور ویکانند جیسے نام ہمارے ذہنوں میں آتے ہیں۔ ٹیگور نے گیتانجلی کی ایک نہایت پرتاثیر نظم میں بھارت کی بدنصیبیوں کا سبب ذات پات کو ٹھہرایا ہے۔ گاندھی جی نے تو ذات پات اور چھوت چھات کے مقابلے کے لیے اپنے آپ کو پورے طور پر وقف کر دیا اور ہندو سماج کے تمام لوگوں کے لیے مذہب کی پیروی میں آزادی و مساوات پیدا کرنے کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کر دی۔ لہذا یہ اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے ذات پات کی تفریق کو ختم کرنا اپنے بنیادی نصب العین میں شامل کر رکھا ہے۔

اس لحاظ سے آئین ہند میں تمام شہریوں کے حقوق و [illegible] گوتم بدھ کے زمانے سے بزرگانِ ہند کی تعلیم کا براہ راست نتیجہ [illegible] میں دنیا کے تمام ملکوں کے رضاکار اداروں نے ایک نئی [illegible] جو انسانی مساوات کی بنیاد پر قائم ہو پیدا کرنے کی کوشش کی [illegible] خود ہندو فرقے کے روشن خیال طبقوں کی تائید سے آئین ہند [illegible] کو جوم قرار دیا۔

بہر حال یہ یقینی ہے کہ ٹکنالوجی کی جدید ترقی [illegible] ایسی صورت حال پیدا کر دی ہے جس میں ذات پات [illegible] چھات قصۂ پارینہ ہو کر رہ گئی ہے۔ نقل و حمل کے جدید طریقوں [illegible] جاتیوں، فرقوں، نسلوں اور عقیدے کے لوگوں کو ایک د[illegible] قریب لانے اور قریبی تعلقات قائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے [illegible] نے مردوں اور عورتوں کو خواہ وہ کسی فرقے سے تعلق رکھتے ہو[illegible] رہنا سکھا دیا ہے۔ شہروں کی ترقی کے باعث نہ صرف بھا[illegible] ہے بلکہ لوگوں کو چھوت چھات کے تعصبات کو ترک کرنے کا [illegible] حقوق و مساوات۔ یہی وجہ ہے کہ آئین ہند میں [illegible] کے تصور اور افراد کے لیے احترام میں بہ یک وقت نظریاتی [illegible] کار فرما نظر آتے ہیں۔ آئین میں انسانی حقوق سے متعلق جو [illegible] ان میں مندرجہ ذیل خصوصی دلچسپی کے حامل ہیں:

آرٹیکل نمبر ۱۵۔ (۱) ریاست، مذہب، نسل، ذات، جنس [illegible] کی بنا پر کسی شہری سے امتیاز نہیں کرے گی۔

(۲) کسی شہری کو محض مذہب، نسل، ذات، جنس [illegible] پیدائش کی بنا پر مندرجہ ذیل امور کے تعلق سے کسی قسم [illegible] پابندی یا شرط کا مجبور نہیں کیا جائے گا۔

(الف) دکانوں، عام ریسٹورانوں، ہوٹلوں اور [illegible] اداروں میں داخلہ۔

(ب) کنوؤں، تالابوں، اشنان گھاٹوں، سڑکوں [illegible] طور پر یا سرکاری سرمایے سے قائم کیے ہوئے یا عوام الناس [illegible] عوامی اجتماع گاہوں کا استعمال۔

آرٹیکل نمبر ۱۶۔ (۱) تمام شہریوں کو ریاست کے تحت [illegible]

یا روزگار میں مساوی مواقع حاصل رہیں گے۔

(۲) کسی بھی شہری کو محض مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش یا سکونت کی بنا پر کسی سرکاری عہدہ یا ملازمت پر تقرری کے لیے غیر مستحق قرار نہیں دیا جائے گا اور نہ اس کے خلاف اس سلسلہ میں کوئی امتیاز برتا جائے گا۔

آرٹیکل نمبر ۱۷۔ "چھوت چھات" ختم کی جاتی ہے اور کسی بھی صورت میں اس پر عمل کرنا ممنوع قرار دیا جاتا ہے۔ "چھوت چھات" کی بنا پر کسی کو کسی حق سے محروم کر دینا ایک جرم سمجھا جائے گا جس کے لیے قانون کے تحت سزا دی جا سکتی ہے۔

آرٹیکل نمبر ۱۹۔ (۲) حکومت کی طرف سے چلائے جانے والے یا ریاستی فنڈ سے امداد پانے والے کسی تعلیمی ادارے میں کسی شہری کو مذہب، نسل، ذات یا زبان کی بنا پر داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

آرٹیکل نمبر ۴۶۔ عوام کے کمزور طبقوں، خاص کر درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے تعلیمی، اقتصادی مفاد کو ترقی دینے پر ریاست خاص توجہ کرے گی اور کسی قسم کی سماجی بے انصافی یا استحصال کے خلاف ان کا بچاؤ کرے گی۔

اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آئین میں تمام افراد کے لیے حقوق و مواقع کی برابری کے وعدے کے ساتھ ساتھ سماج کے کمزور طبقوں بالخصوص درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے اشخاص، خاص کر پسماندہ طبقوں کی عورتوں اور بچوں سے مقررہ عرصے کے لیے ترجیحی سلوک کا بھی تحفظ کیا گیا ہے۔

چھوت چھات سے متعلق قانون۔ نام نہاد نچلے طبقوں کی سماجی محرومیوں کے انسداد کے لیے مزید اقدام کے طور پر چھوت چھات (جرائم) ایکٹ ۱۹۵۵ء (۱۹۵۵ء کا بائیسواں ایکٹ) یکم جون ۱۹۵۵ء میں قانون بن گیا۔ اس میں چھوت چھات برتنے پر سزا دینے، چھوت چھات کی بنا پر اس سے محرومی ختم کرنے، اور اسی سے متعلقہ امور سے نپٹنے کی گنجائش فراہم کی گئی۔ اس قانون کے تحت چھوت چھات پر عمل کرنے والوں کو سزائے قید بھی دی جا سکتی ہے۔

آئین ہند کی رو سے درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے لیے ایک کمشنر مامور کیا گیا جو آئین میں فراہم کردہ تحفظات سے متعلقہ تمام امور کی چھان بین کرتا ہے اور ہر سال پارلیمنٹ کے سامنے رپورٹ پیش کرتا ہے جس میں اس ضمن میں کی ہوئی پیش رفت کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے مزید اقدام تجویز کیے جاتے ہیں۔

مسئلہ تعلیم۔ اس سلسلے میں سب سے اہم اقدام تعلیم کے سلسلے کے ہیں۔ جمہوریت میں آئین سازی بھی اسی وقت موثر ہو سکتی ہے جب کہ اس میں عوام کی مرضی اور پسماندہ طبقات کا عزم شامل ہو کیونکہ تعصبات جلد ختم نہیں ہوتے اور نتائج پلک جھپکتے ہی حاصل نہیں ہوتے لہذا سب سے یقینی اور زود اثر طریقہ وسیع اساس پر تعلیم کی اشاعت ہے، تاکہ نظر انداز کیے ہوئے طبقات بھی تعلیم سے مالا مال ہو سکیں اور انھیں عام، ٹیکنیکل اور پیشہ ورانہ علم کے فائدے حاصل ہو سکیں۔ اس سلسلے میں آئین کی منظوری سے پہلے ہی ایک پروگرام شروع کر دیا گیا تھا جسے آئین کی منظوری کے بعد تیز تر کر دیا گیا۔

آزادی کے وقت مرکزی سرکار نے پانچ لاکھ روپے کے لگ بھگ ایک رقم درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے طالب علموں کو اسکالرشپ دینے کی اسکیم کے لیے منظور کی اور ۱۹۵۲ء تک مرکز کی طرف سے اس پر دو کروڑ روپے دیے جا چکے تھے۔

مذکورہ کمشنر نے ۱۹۶۱-۶۰ء کی رپورٹ میں بتایا ہے کہ دوسرے منصوبہ کی مدت میں (۱۹۵۶ تا ۱۹۶۱ء) ان طبقوں کو فراہم کی جانے والی سہولتوں پر تخمینی اخراجات ۲۰ کروڑ، پانچ لاکھ ۱۲ ہزار روپے ہوں گے۔ تیسرے منصوبہ کی مدت کے لیے یعنی ۱۹۶۱-۶۶ء میں ۴۳ کروڑ ۴۵ لاکھ روپے اس غرض کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں۔

دوسرے منصوبہ میں درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کے طالب علموں کو علی الترتیب ۴۶۶۸۷۵۰ اور ۲۴۴۱۰۶ اسکالرشپ منظور کیے گئے۔ چند بیرون ملک تعلیم کے لیے بھی تھے۔ ان ذاتوں اور قبیلوں کے ۴۵۴۵۰۷۰۱ لڑکے اور ۳۲۱۱۸۰۰ لڑکیاں ۱۹۵۸-۵۹ء میں اسکولوں اور کالجوں میں جن میں پیشہ ورانہ تعلیم کے کالج بھی شامل ہیں، پڑھ رہے تھے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۳۲ پر)

جشنِ جمہور

نازش پرتاپ گڑھی

ہر دورِ زندگی میں نمایاں رہے ہیں ہم — ہر فصلِ گل میں جانِ بہاراں رہے ہیں ہم
آئینہ دارِ گردشِ دوراں رہے ہیں ہم — افسانۂ حیات کا عنواں رہے ہیں ہم
جھکے وہاں گلاب تو پھولی شفق وہاں
انھوں سے ہم نے پونچھ کے چہرے کا عرق جہاں

کھینچی ہے ہم نے خونِ رگِ سنگ سے شراب — شعلوں سے ہم نے ڈھال لیے موجِ دِ رباب
کانٹا ملا تو ہم نے بنایا اُسے گلاب — سولی پہ چڑھ کے دیکھ لیا زندگی کا خواب
محفل ہو کوئی دل کو اُچھالے رہے ہیں ہم
ہر دور پر زمیں کو سنبھالے رہے ہیں ہم

ندیوں کے رستوں کو بدلتے رہے ہیں ہم — پربت کی چوٹیوں کو کچلتے رہے ہیں ہم
شعلوں کو لے کے ہاتھوں میں چلتے رہے ہیں ہم — تقدیرِ انقلاب میں ڈھلتے رہے ہیں ہم
محنت کی جب نگاہِ جگر دار اُٹھ گئی
دلّی میں لال قلعے کی دیوار اُٹھ گئی

تخریبِ حادثات کے گو سلسلے رہے — تعمیرِ زندگی کے گلستاں کھلے رہے
یوں اپنی جراتوں کے دِیے قافلے رہے — بن کر قطب کی لاٹ جواں حوصلے رہے
رشتے وفا میں رنگِ عمل بھر چکے ہیں ہم
پتھر کو حسن کے تاج محل کر چکے ہیں ہم

آؤ، پھر عزمِ تازہ کو بڑھ کر پکار لیں — چہروں پہ اب جہدِ عمل کا غبار لیں
زہرِ حیات پی کے بھی کچھ دن گزار لیں — شنکر نہیں، جٹاؤں میں گنگا اتار لیں
ماضی کی عظمتوں کو سنبھالے ہوئے بڑھیں
ہندوستاں کا نام اُجالے ہوئے بڑھیں

قصبوں کو حسنِ گنبد و مینار بخش دیں — شہروں کو کارخانوں کے انبار بخش دیں
شہروں کو رنگِ جلوہ گہِ یار بخش دیں — گلیوں کو آدمصر کا بازار بخش دیں
ہر برگ ہو بہار کی تصویر تو سہی
سارا وطن ہو وادیِ کشمیر تو سہی

ہر خارِ راہ دلکش برگِ گلاب ہو — ہر شوقِ زیست اپنی جگہ
ہر آرزو دعا کی طرح مستجاب ہو — تیشہ وہ کوہ کن دے کہ دل
محنت کے ابروؤں پہ جہاں کوئی بل پڑے
سینے سے پتھروں کے اجنتا نکل پڑے

فطرت چلے اُدھر کو روانہ جدھر ہوں ہم — بجلی رہے ہماری نگاہوں
فولاد سے کہیں کہ گلے اک اشارے پر — پانی کو حکم دیں کہ بہے
فطرت کے حسنِ سادہ کی تسخیر یوں کریں
کاشی کی صبح شام کی کماری میں دیکھ لیں

ہیرے کی طرح ترشا ہوا ہو جو سنگ ہو — سینے میں ہر پہاڑ کے
تیشے میرا ور کوہ میں پھر کوئی جنگ ہو — کاٹیں وہ بے ستون کہ
اس ڈھنگ اس ادا سے کریں راج دوستو
اُبھریں پہاڑ گرے سے کئی "تاج" دوستو

اپنا طریقِ کار ہو، اپنی پسند ہو — راہِ حیات شوق کی
میدانِ زندگی میں ہر اک فتح مند ہو — کوئی رہے نہ پست
وقت آئے یوں شگفتنِ گل ہائے ناز کا
محمود سے بلند ہو رتبہ ایاز کا

ہاتھوں میں زندگی کے نیا ساز چاہیے — ہر سانس میں حیات
تخئیل نو میں قوتِ پرواز چاہیے — بات ایک اور ایک
اجسام مختلف ہوں مگر جان ایک ہو
مذہب الگ الگ رہیں انسان ایک ہو

اس مرحلے پہ منزلِ جشنِ عوام ہے — اس مرحلے سے قبل
سب ختم ہو چکا ہی تھوڑا سا کام ہے — ہاں دوستو! یہ معرکہ
اپنے وطن کو خلد سے بہتر بنائیں گے
اور ساتھ ساتھ جشنِ مسرت منائیں گے

اتر پردیش کے پرانے قلعے

(فارسی تاریخوں کی روشنی میں)

صباح الدین عبد الرحمٰن

اتر پردیش کے متعدد پرانے قصبوں اور شہروں میں ایک قلعہ یا اس کا کھنڈر نظر آئے گا۔ اس میں سے ہر قلعہ کے پیچھے ایک تاریخ ہے، جس کی تفصیل تو اس مضمون میں لکھنا ممکن نہیں لیکن ان قلعوں کا ایک اجمالی ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

آئین اکبری میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے بیشتر قلعوں کا ذکر آیا ہے۔ اکبر کے عہد میں موجودہ اتر پردیش کے تین حصے تھے، الٰہ آباد، اودھ اور آگرہ۔ یہ تینوں علٰحدہ علٰحدہ صوبے تھے۔ ان میں جن جن قلعوں کا ذکر آئین اکبری میں آیا ہے ان کو ہم علٰحدہ علٰحدہ قلم بند کرتے ہیں۔

صوبہ الٰہ آباد میں حسب ذیل مقامات پر قلعے تھے ۱۔ الٰہ آباد ۲۔ بھدوہی ۳۔ سنگرور ۴۔ کنتت ۵۔ کھارا گڈھ ۶۔ شسنہ ۷۔ کیتھرہ ۸۔ جونپور ۹۔ مڑیٹ ۱۰۔ سکندر پور ۱۱۔ اروَل ۱۲۔ جلال پور بلکھر ۱۳۔ کنتوٹ ۱۴۔ جائس ۱۵۔ دلمؤ ۱۶۔ رائے بریلی ۱۷۔ سلون ۱۸۔ مانک پور ۱۹۔ چنادہ ۲۰۔ اگواہستی ۲۱۔ ایچ گڈھ ۲۲۔ سیتھدا ۲۳۔ سمونی ۲۴۔ کھریلہ ۲۵۔ مہوبہ ۲۶۔ مودہا ۲۷۔ شادی پور ۲۸۔ جاجمؤ ۲۹۔ کواڑہ ۳۰۔ کرٹہ ۳۱۔ کراری ۳۲۔ کوڑا ۳۳۔ راری۔

اودھ کے قلعے حسب ذیل جگہوں پر تھے ۱۔ اہونہ ۲۔ بلہری ۳۔ دریاآباد ۴۔ رودولی ۵۔ سیلک ۶۔ سلطانپور ۷۔ ساتن پور ۸۔ کشنی ۹۔ اترولہ ۱۰۔ بنایک پور ۱۱۔ تیل پور ۱۲۔ چلوپارہ ۱۳۔ دریاپارہ ۱۴۔ دیواپارہ ۱۵۔ گنگولا ۱۶۔ کٹھلا ۱۷۔ کھلاپارہ ۱۸۔ مہولی ۱۹۔ گرد رتن پور ۲۰۔ بہرائچ ۲۱۔ حسام پور ۲۲۔ فخرپور ۲۳۔ فواگڈھ ۲۴۔ فیروزآباد ۲۵۔ کہرونسہ ۲۶۔ بسوہ ۲۷۔ بہوا مؤ ۲۸۔ سانڈی ۲۹۔ گوپامؤ ۳۰۔ کھیری ۳۱۔ کھیری گڈھ ۳۲۔ نیم کھار ۳۳۔ انام ۳۴۔ امیٹھی ۳۵۔ اسولی ۳۶۔ بلگرام ۳۷۔ بنگرمؤ ۳۸۔ دیوی ۳۹۔ رن پرپوہ ۴۰۔ رام کوٹ ۴۱۔ سندیلہ ۴۲۔ امیٹھی ۴۳۔ کرسی ۴۴۔ کاکوری ۴۵۔ ملیح آباد ۴۶۔ موہان ۴۷۔ مورانوہ ۴۸۔ ملاوی ۴۹۔ ہڑپ ۵۰۔ فتح پور۔

صوبہ آگرہ میں حسب ذیل مقامات پر قلعے پائے جاتے تھے ۱۔ اٹاوہ ۲۔ بجوارہ ۳۔ بیانہ ۴۔ جلیسر ۵۔ دھول پور ۶۔ راپری ۷۔ فتح پور ۸۔ جہادان ۹۔ متھرا ۱۰۔ ہنکانت ۱۱۔ راٹھ ۱۲۔ بھوگاؤں ۱۳۔ قنوج ۱۴۔ اہار ۱۵۔ پٹیالی ۱۶۔ سکندرہ راؤ ۱۷۔ سورون ۱۸۔ کول ۱۹۔ نوح ۲۰۔ اتونی ۲۱۔ بدر ہٹھ ۲۲۔ جھلوڈا ۲۳۔ سرہنڈہ ۲۴۔ جلاپور ۲۵۔ کیتولی ۲۶۔ پرہار ۲۷۔ جھترا ۲۸۔ ریابانہ ۲۹۔ کھنڈولہ ۳۰۔ کونچ ۳۱۔ کھنکیس ۳۲۔ کھاپڑہ ۳۳۔ جنورا ۳۴۔ رتن گڈھ ۳۵۔ سوہنڈی ۳۶۔ کھیود ۳۷۔ بھجارہ ۳۸۔ مئو ۳۹۔ بردلی ۴۰۔ بولی ۴۱۔ سیورپوری ۴۲۔ کولارس ۴۳۔ زردرہ ۴۴۔ ادنگرہ ۴۵۔ ایلدہ ۴۶۔ بیارٹ ۴۷۔ حاجی پور ۴۸۔ گھاٹ سورن ۴۹۔ منڈاور ۵۰۔ ہاپڈ ۵۱۔ پنگوان ۵۲۔ بنوہرا ۵۳۔ تجارہ ۵۴۔ جھرادت ۵۵۔ فیروز پور ۵۶۔ کوٹلہ ۵۷۔ بابائی ۵۸۔ جھوجیون ۵۹۔ کوٹ پوتلی ۶۰۔ نارنول ۶۱۔ زہرہ ۶۲۔ بسہار (آئین اکبری جلد دوم ص ۹۳ - ۷۹)۔

ان قلعوں میں میرٹھ کے قلعہ کا ذکر نہیں کیوں کہ عہد اکبری میں اس کا نام ونشان باقی نہیں رہ گیا تھا، حالاں کہ عہد وسطیٰ میں یہ بڑا ہی

مضبوط اور شاندار قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ میرٹھ کا شہر بہت پرانا ہے۔ کہا جاتا
ہے کہ یہ اشوک کے زمانے میں آباد ہوا۔ یہاں جو قلعہ بنایا گیا اس کے
چاروں طرف زبردست فصیلیں تھیں اور ان میں نو پھاٹک تھے۔
تاج المآثر قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ-۶۰۷ھ، ۱۲۰۶-۱۲۱۰ء) کی خواہش پر لکھی گئی
اس کے مصنف حسن نظامی نیشاپوری نے اس قلعہ کا ذکر تاج المآثر
میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ قلعہ اپنی بلندی اور مضبوطی کے لحاظ
سے ہندوستان کے مشہور قلعوں میں ہے۔ اس کی دیواریں شہر کے
چاروں طرف تھیں جن کے باہر خندقیں تھیں۔ ان خندقوں کے
بارہ میں مصنف مذکور رقمطراز ہے کہ وہ سمندر کی طرح چوڑی اور گہری
تھیں، اسی لیے بڑے سے بڑے حملہ آور اس پر حملہ کرنے میں ہچکچاتے تھے۔
یہ ڈور راجپوتوں کی حکومت کا صدر مقام تھا جو یہاں سے برن
(موجودہ بلند شہر) کول (یعنی علی گڑھ) متھرا اور ایٹہ تک کے علاقوں پر
حکمرانی کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک نے اس کو اپنے زیر نگیں کیا تو
دریائے جمنا کے پوربی علاقہ کے لیے یہ قلعہ ایک زبردست
فوجی چھاؤنی بن گیا اور پھر اسی کو اس نے اپنا محاذ بنا کر گھنڈ والہ
راجپوتوں کے علاقہ پر لشکر کشی کی۔ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے عہد میں
منگولوں کی یورش کو روکنے میں یہ قلعہ بہت ہی کارآمد ثابت ہوا۔ منگول
حملہ آوروں کا سردار ترمہ شیرین نے بہت بڑے لشکر کے ساتھ
اس پر یلغار کی لیکن وہ اس کی فصیل کے اندر داخل نہ ہو سکا۔ شرف الدین
علی یزدی نے تیمور کی تاریخ ظفر نامہ لکھی تو اس قلعہ کا ذکر کرتے ہوئے
لکھتا ہے کہ "از قلعہائے مشہور کشور ہند میرٹ بود" (ظفر نامہ۔ ص ۱۲۹)
اور وہ بہت فخر کے ساتھ یہ بھی تحریر کرتا ہے کہ جس قلعہ کو ترمہ
شیرین فتح نہ کر سکا اس کو تیمور نے فتح کر کے اپنی حربی اور فوجی
قوت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن تیمور نے اس کو فتح کرتے وقت ایسا
مسمار کیا کہ یہ بالکل کھنڈر ہو گیا۔ اس کے بعد مورخین اس کا ذکر
نہیں کرتے۔ عہد اکبری آتے آتے اس کا نام و نشان بھی مٹ گیا تھا۔
میرٹھ سے دکھن طرف تیرہ میل کے فاصلہ پر شروا یا سروا میں
بھی ایک قلعہ تھا۔ زین الاخبار کے مؤلف محمود گردیزی نے محمود
غزنوی کی مہم کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے (دیکھو ص ۷۶)۔ اس

قلعہ کے بھی آثار اب باقی نہیں ہیں۔
قنوج سے پورب جانب چالیس میل کے فاصلہ پر با
قلعہ تھا۔ البیرونی نے اس قلعہ کا ذکر کیا ہے (ہسٹری آف
از سر ہنری الیٹ جلد اول ص ۵۴)۔ یہ عرصۂ دراز تک
پایۂ تخت بھی رہا۔ محمود غزنوی نے اس کو بھی تسخیر کیا تھا۔
عہد غزنوی کے مورخ عتبی نے اپنی تاریخ یمینی میں ق
پاس قلعہ آسی کا بھی ذکر کیا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ اس ق
چاروں طرف بڑے گھنے جنگل تھے جس میں سانپ بھر
تھے اور یہ اتنا تاریک تھا کہ چاند کی روشنی بھی یہاں آکر
تھی۔ اس کے چاروں طرف بڑی چوڑی اور گہری خندقیں
(الیٹ جلد دوم ص ۴۷)۔ اسی نام کا ایک قلعہ جونپور کے
تھا جو ظفرآباد کے گنڈ والا راجپوتوں کا زبردست جنگی مور
عتبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قنوج میں سات
جن کی فصیلوں سے گنگا کی موجیں ٹکراتی رہتی تھیں۔ یہ قلعے
کی شکل میں چار میل تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ شہر راٹھور او
راجپوت خاندانوں کی راجدھانی کی حیثیت سے بڑا نمایاں
تاج المآثر اور تاریخ مبارک شاہی (مؤلفہ یحییٰ بن احم
میں مہوبہ اور کالپی کا ذکر بہت آیا ہے۔ مہوبہ کالپی کا دار السل
جو اب ہمیرپور ضلع میں ہے۔ مہوبہ کا قلعہ مدن ساگر جھیل
واقع تھا جس کو چندیل خاندان کے پندرھویں راجہ مدن ور
کیا۔ یہ پہاڑی قلعہ اب بالکل کھنڈر ہو گیا ہے۔ اس کی بلندی
میں بڑی رونق آگئی تھی۔ کالپی میں بھی جمنا کے کنارے ایک
لیکن یہ بھی مسمار ہو چکا ہے۔
بعض قلعے بڑے ہی مضبوط، بلند اور عالی شان تھے۔
کے قلعہ کو دیکھ کر محمود غزنوی اور اس کے لشکری متحیر ہو گئے
دور کے مورخ عتبی نے لکھا ہے کہ اس کی تمام دیواریں پتھر
ہوئی تھیں۔ اس کے دو پھاٹک تھے جو دریا کی طرف کھلتے
شہر کے نیچے سے بہتا رہتا تھا۔ لیکن شہر کی بنیاد اتنی مستحکم اور
بارش یا دریا کا سیلاب اس کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ شہر

طرف ہزاروں مکانات اور بلند مندر بنے ہوئے ہیں اور لکڑی والے پتھروں سے بڑی بڑی برجیوں کے ساتھ بنائے گئے تھے۔ بیچ میں ایک بہت بڑا مندر تھا جس کی مضبوطی اور بلندی تحریر کے ذریعہ بیان نہیں کی جا سکتی ہے۔ اس کو دیکھ کر خود محمود غزنوی متحیر ہو گیا تھا اور اس نے اپنے ایک امیر کو غزنی لکھ بھیجا تھا کہ اب اگر کوئی ایسی عمارت تعمیر کرنی چاہے تو لاکھوں سرخ دینار خرچ کرنے پر بھی وہ دو سو برس میں تیار نہیں ہو سکتی ہے۔ (الیٹ جلد ۲ ۔ ص ۴۴)

دوسرا مستحکم اور زبردست قلعہ کالنجر کا تھا جو قصبۂ باندہ سے ۳۳ میل دور دکھن کی طرف ہے۔ یہ وندھیاچل کی پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کی بلندی ۱۲۰۳ فٹ تھی۔ اس کا دائرہ چار میل تک پھیلا ہوا تھا اور پچیس پچیس فٹ کے پتھر کی چٹانوں سے فصیلیں بنی ہوئی تھیں جو ۱۸۰ فٹ تک اونچی تھیں۔ ان چٹانوں کی جوڑائی میں سیمنٹ وغیرہ استعمال نہیں ہوتی تھی۔ اس کے گرد ایک کھائی تھی جو ۱۲۰۰ گز چوڑی تھی۔ اس قلعہ کی بلندی اور مضبوطی کو دیکھ کر سلاطین سور حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ تاج المآثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ اس کی شہرت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی اور یہ سد سکندری ہی کی طرح مضبوط تھا منتخب التواریخ جلد اول میں ملا عبدالقادر بدایونی نے لکھا ہو کہ کالنجر "از قلاعِ مستحکم مشہور ہندوستان است"۔ (ص ۳۷۱)

شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء۔۱۵۴۵ء) نے اس قلعہ کی تسخیر کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دی پھر بھی اس کو زیرنگیں نہ کر سکا۔ ہمایوں بارہ برس تک اس قلعہ کو اپنے قبضہ میں لینے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ابوالفضل نے حیرت زدہ ہو کر لکھا تھا کہ یہ قلعہ سپہر کا ہم سنگ ہے یعنی آسمان کے برابر ہے اور پھر یہ اشعار لکھے ہیں۔

راہ جوید اجابت از پے آن ۔ بر فرازش اگر کنند دعا
تا ببالا نہ رفتنش بینند ۔ ہمہ امروزش از پس فردا

(اکبرنامہ جلد دوم ص ۳۴۰)

چنار کے قلعہ کی بھی بڑی اہمیت تھی اور یہ بھی ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ یہ گنگا کے کنارے ۵۰ گز کی بلندی پر واقع تھا۔ اس کی فصیل بعض جگہ تین سو گز چوڑی تھی۔ شیر شاہ سوری (المتوفی ۱۵۴۵ء) کے قبضہ میں یہ قلعہ آیا تو اس نے اس کو دفاعی طور پر اور مستحکم کیا۔ ہمایوں جب شیر شاہ کے لڑکے جلال خاں سوری سے برسرپیکار ہوا تو اس قلعہ کو چار مہینے کے محاصرہ کے بعد ہی حاصل کر سکا۔ انگریزوں نے ۱۷۶۴ء میں اس کا محاصرہ کیا تو اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے لشکریوں نے ان کے چھکے چھڑا دیے۔ وہ فصیل پر سے بڑے بڑے وزنی پتھر انگریزی فوج پر پھینکتے تھے جن سے موخرالذکر نہ صرف سراسیمہ ہو جاتے تھے بلکہ ان کے لشکری کچل کر رہ جاتے تھے۔

بعض قلعے مٹی کے بھی ہوتے، مثلاً کول یعنی علی گڈھ کا قلعہ مٹی ہی کا تھا اور اب تک اس کی دیوار کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا ہے، گو پورا قلعہ اب خستہ حال میں ہے۔ یہ اس وقت تعمیر ہوا تھا جب ڈور راجپوتوں کی حکومت اس علاقہ میں تھی۔ سلاطین دہلی کے عہد میں یہ بڑا اہم قلعہ سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ تاج المآثر کے مؤلف نے لکھا ہے کہ یہ ہندوستان کے مشہور قلعوں میں ہے۔ ۷۴ فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں بھی اس قلعہ کی بڑی فوجی اہمیت تھی۔ مرہٹوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں اس کو بڑا فوجی اڈہ بنا لیا تھا۔ شروع سے اس کی اہمیت اس لیے رہی تھی کہ متھرا اور آگرہ سے جو راستے دہلی اور روہیلکھنڈ کی طرف جاتے تھے، ان کی ناکہ بندی اس قلعہ کے ذریعہ سے ہو جاتی تھی۔

فرخ آباد کا قلعہ بھی مٹی ہی کا تھا جو عرصہ دراز تک فرخ آباد کے نواب کا مسکن رہا۔

اس زمانہ میں چھوٹا قلعہ گڑھ کہلاتا اس سے بھی چھوٹے کو گڑھی کہتے تھے۔ وہ قلعہ بہت ہی مستحکم سمجھا جاتا جو کسی پہاڑ یا پہاڑی پر بنایا جاتا۔ اتر پردیش کے مذکورۂ بالا قلعوں میں کالنجر، کھارا، گڈھ، کھیوڑ اور الور کے قلعے پہاڑیوں ہی پر تھے۔ پہاڑی چٹانوں اور پتھروں سے بھی قلعے بنائے جاتے۔ ان کی دیواریں بہت مضبوط ہوتیں۔ چناڑا، سینھدا، مہوبا، مودہا، بجوارہ، اونٹ گرا، بیراٹ، ہنگواں، جھم اوٹ، بابائی، جھوجیون، بتوہرا، نارنول اور تہر کے قلعے پتھر ہی کے تھے۔ جو قلعے دریا کے کنارے بنائے جاتے ان کے لیے دریا خود مدافعت کا ایک اہم ذریعہ بن جاتا۔ اتر پردیش کے قلعوں میں قنوج، الہ آباد، کڑہ، جاجمؤ، کشت، چنار اور شمس آباد گنگا کے ساحل پر تھے۔

متھرا، آگرہ، کراری، کالپی اور راٹھا دہ کے قلعے جمنا کے کنارے بنائے گئے تھے اور جونپور کا گومتی پر تھا۔ ان کی تعمیر میں انجینیرنگ کا بڑا فن دکھایا جاتا۔ پہاڑ یا دریا نہ ہوتا تو پھر سطح مرتفع پر قلعہ بنایا جاتا اور اس میں اینٹیں لگائی جاتیں۔

اوپر جن قلعوں کی فہرست دی گئی ہے وہ زیادہ تر اینٹوں ہی کے تھے۔ ان کی مدافعت کے لیے چاروں طرف خندق کھود دی جاتی۔ پہلے ذکر آیا ہے کہ مبرکٹھ کے قلعہ کے اردگرد جو خندق تھی اس کی گہرائی اور چوڑائی کو دیکھ کر صاحب تاج المآثر نے حیرت میں لکھا تھا کہ یہ خندق سمندر معلوم ہوتی تھی۔ بعض اوقات خندق کے پانی کو زہریلا بنا دیا جاتا جس کی وجہ سے غنیم ڈر کر اس کو عبور کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ کبھی قلعہ کے چاروں طرف دشوار گذار جنگل یا بانس کے درخت لگا دیے جاتے۔ قلعہ کے پھاٹک پر نوک دار سلاخیں اور کیلیں لگا دی جاتیں تاکہ غنیم اس کو توڑنے سے زخمی ہو جائے۔ پھاٹک کے اندر داخل ہونے کے بعد راستے میں کچھ ایسا پیچ و خم دے دیا جاتا کہ غنیم اپنی پوری فوج کے ساتھ یورش نہ کر سکے۔ قلعہ کی فصیل پر بڑی بڑی توپیں نصب رہتی تھیں جو دشمن پر گولہ باری کرتیں۔ فصیل میں جا بجا سوراخ بھی ہوتے جس سے نفط اندازی اور تیر اندازی کی جاتی۔ قلعہ کے اندر آلات حرب کے علاوہ تمام ضروریات زندگی کا سامان بھی مہیا رہتا۔ مثلاً آٹا، گیہوں، جو، لکڑی، گوشت، کھٹائی، شیرینی، اچار، ادویہ، چراغ کا تیل، پلیتہ، مشعل، دیوٹ، ایندھن وغیرہ محاصرہ کے وقت طبیب، منجم، باورچی، کمان بنانے والے، تیرگر، کمان گر، بڑھئی، زرہ ساز، زین ساز، لوہار، صیقل گر، جراح، حجام، درزی، دھنیا، کمہار، دھوبی، نعل بند، حلال خور وغیرہ بھی جمع کر لیے جاتے۔ ان کے رہنے کے لیے علٰحدہ علٰحدہ جگہیں مقرر ہوتیں۔ کنوئیں اور باؤلیاں بھی ہوتیں تاکہ پانی کی کمی نہ ہو۔

ہندوستان کے ہر حصہ میں قلعوں کا ایک جال سا جو بچھا ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حربی قلعوں کی تعمیر میں ہندوؤں نے غیر معمولی ترقی کی تھی۔ ان کا یہ فن دنیا کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ سندھ میں برہمن آباد کے قلعہ کا دور چار میل

تھا۔ محمد بن قاسم کو اسے فتح کرنے میں چھ مہینے لگے تھے۔ گوالیار کے متعلق تاج المآثر کے مصنف کا بیان ہے کہ یہ اتنا اونچا تھا کہ تیر بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ رن تھمبور کی اونچائی کو دیکھ کر ابوالفضل متحیر ہو گیا تھا اور آکبرنامہ جلد سوم میں لکھتا ہے کہ خیال کی منجنیق بھی اس کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتی۔ چتوڑ کے قلعہ کو دیکھ کر سلاطین عسکری اور اہل قلم سب ہی مت... یہ پہاڑی قلعہ ۱/۲ ۳ میل کی اونچائی پر واقع تھا۔ نیچے آٹھ میل اور قلعہ کی دیوار ۵۰۰ فٹ تک اونچی تھی۔ آسام کے قلعوں میں ... کا قلعہ برہم پتر کے کنارے واقع تھا اس کا دور ایک کوس ... تھا۔ دکھن طرف دریائے برہم پتر سے محفوظ تھی اور پورب کی دریائے مناس قلعہ کی دیوار سے گذرتا ہوا برہم پتر سے جا ملتا۔

غرضیکہ ہندو اپنے اعلیٰ فن تعمیر سے کام لے کر پہاڑ و در... چاک کر کے قلعے بناتے اور دریاؤں کی لہروں سے کھیلتے ہوئے ... کی تعمیر کرنے میں نہ ہچکچاتے۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے قلعے بنوانے کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی کیوں کہ وہ میدان میں لڑنے کے زیادہ عادی رہے۔ پھر انھوں نے جن علاقوں کو فتح ... ان کو قلعے خود بہ خود مل جاتے جو ان کی حربی ضروریات کو پورا ... اسی لیے اتر پردیش میں بھی مسلمان حکمرانوں کے بنائے ہوئے ... تعداد زیادہ نہیں ہے۔ پھر بھی انھوں نے جو قلعے بنائے ان کی ... میں درج ہے۔

سلطان غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء۔۱۲۸۶ء) نے ... کی غارت گری کی روک تھام کے لیے ایٹہ ضلع میں دو چھوٹے ... اور پٹیالی میں بنوائے اور وہاں فوجیں تعینات کیں۔ اس ... علاقہ کی قزاقی اور غارت گری رک گئی۔ (تاریخ فیروز شاہی ضیاء الدین ...) فیروز شاہ تغلق (۱۳۵۱ء۔۱۳۸۸ء) نے ۱۳۶۰ء میں ... شہر بسایا اور اسی کے ساتھ اس کا قلعہ بھی بنوایا۔ جونپور میں ... کی حکومت قائم ہوئی تو اس قلعہ کے اندر بہت سی عمارتوں ... ہوا لیکن سکندر لودی (۱۴۸۹ء۔۱۵۱۷ء) نے اس قلعہ ... برباد کیا۔ ہمایوں (المتوفی ۱۵۵۶ء) نے اس کی از سر نو ...

۱۵۳۵ء - ۱۵۱۶ء میں بہادر خاں کی ماں کو یہاں قید میں ڈال
دیا تو بہادر خاں نے ماں کو آزاد کرانے کی کوشش میں اس قلعہ کے
پھاٹک کو جلا دیا۔ اکبر کے سپہ سالار منعم خاں خانخاناں نے اس
قلعہ کے لیے دوسرا پھاٹک بنوایا۔ لیکن یہ قلعہ ۱۵۷۵ء میں نذر آتش
ہوا اب اس کے زیادہ تر کھنڈر باقی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ
پوپل عمارت تھی اس کی کرسی مٹی ڈال کر اونچی کی گئی تھی اور فصیل
کی دیواریں پتھروں سے بنوائی گئی تھیں۔ اس کے اتر طرف دریائے
گومتی بہتا تھا۔

تاریخ فرشتہ میں ہے کہ حسین شاہ شرقی نے ۱۴۶۶ء میں
بنارس کے قلعہ کی مرمت کرائی (جلد دوم ص ۳۱۰) اس سے پتہ
چلتا ہے کہ وہاں بھی کوئی قلعہ تھا لیکن اب وہاں نہ کسی قلعہ کے اور نہ
کسی حصار کے آثار ہیں۔

رائے بریلی میں بھی ایک قلعہ تھا۔ اس کو جونپور کے حکمران ابراہیم
شاہ شرقی نے ۱۴۳۳ء میں بنوایا تھا۔ امپیریل گزیٹیر کے بیان سے
معلوم ہوتا ہے کہ اس میں جو اینٹیں لگائی گئی تھیں وہ دو فٹ لمبی
ڈیڑھ فٹ چوڑی اور ایک فٹ موٹی تھیں۔ اس کے بیچ میں ایک کنواں
تھا جس کا دورہ ۱۰ گز تھا۔ اب یہ قلعہ بھی مسمار ہو چکا ہے۔ اس کے
پھاٹک کے بغل میں حضرت مخدوم سید جعفری کا مزار مبارک ہے۔

سکندر لودی (۱۴۸۸ء - ۱۵۱۷ء) نے آگرہ میں جمنا کے کنارے
ایک قلعہ بنایا۔ پہلے یہاں راجپوتوں کا ایک پرانا قلعہ تھا جو بادل گڑھ
کے نام سے مشہور تھا۔ اکبر نے بھی اسی جگہ اپنے ذوق کے مطابق ایک قلعہ بنانا
شروع کیا۔ پہلے یہ اینٹوں سے بنایا گیا لیکن پھر اس میں سنگ سرخ لگا
گیا۔ اس کی بنیاد بہت ہی گہری کھودی گئی تھی۔ ابوالفضل کا بیان
ہے کہ اس میں تین چار ہزار کاریگر اور مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔
اس کے سرخ پتھر آپس میں اس طرح جوڑے جاتے تھے کہ دو پتھروں کے
درمیان باریک سا بال بھی نہیں جا سکتا۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں
لکھا ہے کہ اس کی تعمیر میں ۳۵ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ اس کے
دونوں مثمن مینارے ایک محراب سے ملائے گئے۔ اس کی پشت
کا حصہ کھلا رکھا گیا جس میں جا بجا برجیاں، کوشک اور کنگورے
بنائے گئے۔ سنگ سرخ کے ساتھ سنگ مرمر دے کر اس کا
حسن نکھارا گیا۔ اس کا دورہ ڈیڑھ میل تھا اور اس میں دوہری دیوار
تھیں۔ بیرونی دیوار زمین سے ۴۰ فٹ اونچی تھی اور اندرونی دیوار
بیرونی دیوار سے ۳۰ فٹ اور بلند تھی۔ دو خندقیں بھی تھیں اندرونی
خندق ۳۰ فٹ چوڑی تھی۔ اس کے پاس ایک پل تھا جس کے بعد ایک
بڑا پھاٹک تھا۔ اس کی دیوار دس فٹ چوڑی تھی۔ اس کے
دو طرف سنگ سرخ کے ہشت پہل بڑے بڑے دو مینارے تھے
جن میں جا بجا سنگ مرمر لگے ہوئے تھے۔ یہ چیزیں اب بھی دیکھی
جا سکتی ہیں۔ اس قلعہ کے اندر خاص محل، ایوان ملکہ، دو راں،
انگوری باغ، شیش محل، مثمن برج، دیوان عام، دیوان خاص
اور موتی مسجد وغیرہ میں صناعوں اور کاریگروں نے نقش و نگار،
منبت کاری، پرچی کاری وغیرہ میں جو چابک دستی، جو پاکیزگی، نفاست اور
لطافت دکھائی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حربی قلعہ کے
بجائے ایک محل تھا جس میں جنگی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا گیا
تھا (اس محل کی تفصیل کے لیے دیکھیے اکبرنامہ جلد دوم ص ۲۲۹-۲۳۰۔
تزک جہانگیری ص ۳۔ بادشاہ نامہ جلد ا۔ حصہ ۲۔ ص ۲۲ - ۲۳۸)۔

اکبر نے فتح پور سیکری میں جو عمارت بنائی اس کی بھی یہی نوعیت
تھی۔ فتح پور سیکری کا محل قلعہ بھی کہا جا سکتا ہے جو کچھ تو پہاڑی
پر اور کچھ پہاڑی کے نیچے ہے۔ پہاڑی کے تین طرف کنگورے دار
فصیل بنائی گئی تھی جس کا دورہ چھ میل تھا۔ شمال و مغرب میں ایک
سرے سے دوسرے سرے تک پہاڑی کے اوپر دو منزلہ سے لیکر
نو منزلہ تک عمارتیں بنائی گئیں۔ اس لیے اس طرف فصیل بنانے کی
ضرورت نہیں ہوئی فصیل کے ہر موڑ پر برج بنائے گئے تھے۔ اس
میں آٹھ بڑے بڑے دروازے تعمیر ہوئے جن کے اندر محافظوں
اور پہرہ داروں کے لیے عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر
بیگمات کے لیے جو رہائشی مکانات مثلاً محل خاص، مکان ترکی سلطانہ،
محل مریم زمانی بیگم، مریم کا محل، جہانگیری محل، پنچ محلا اور جودھا محل
وغیرہ بنے ہیں، وہ اکبری عہد کے طرز تعمیر کے عجیب و غریب نمونے ہیں۔
اکبر نے ۱۵۸۳ء میں گنگا اور جمنا کے سنگم کے پاس الہ آباد میں

بھی ایک شاہی محل بنوایا جو الہ آباد کے قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک حصار کے اندر تھا۔ حصار کے بنوانے سے پہلے ایک مستحکم بند تیار کیا گیا جو ایک کوس طویل، چالیس گز عریض اور چار گز بلند تھا۔ حصار کے اندر چار حصے تھے۔ ایک میں دولت خانۂ شاہی تھا، دوسرے میں بیگمات اور شہزادوں کی رہائش تھی، تیسرے میں اعزا، اقربا اور ملازمین کے مکانات تھے اور چوتھے میں لشکر کے رہنے کی جگہ تھی۔ جابجا باغات بھی تھے۔ یہ قلعہ اپنی دل آویزی اور مضبوطی کے لیے مشہور تھا۔ لیکن انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اس کے زیادہ تر حصے کو مسمار کر دیا (تفصیل کے لیے دیکھیے اکبر نامہ جلد ۳۔ ص ۱۶۔۱۵م۔ عالمگیر نامہ ص ۱۲۶۔ منتخب اللباب حصہ اول ص ۲۲۶)۔

جہاں گیر کے عہد میں اتر پردیش میں کوئی قلعہ نہیں بنا۔ لیکن شاہ جہانی عہد میں اس کے ایک منصب دار بہادر خاں نے اس کے نام پر شاہ جہاں آباد کیا تو وہاں ایک قلعہ بھی دیوہا اور گھنوت ندیوں کے سنگم پر تعمیر کیا۔

شاہ جہانی عہد ہی میں رستم خاں نے اپنے شاہی آقا شاہجہاں کے لڑکے شہزادہ مراد بخش کے نام پر مراد آباد آباد کیا اور ایک قلعہ بھی بنوایا جس کے آثار اب بھی وہاں باقی ہیں۔ اسی ضلع میں سنبھل میں بھی ایک قلعہ تھا جس کے کھنڈر جھلیسو اور بھکیسو کے نام سے اب تک موجود ہیں۔

سہارن پور میں بھی ایک قلعہ ہے جو اٹھارویں صدی میں تعمیر ہوا تھا۔ یہ روہیلوں کا بڑا جنگی محاذ بنا رہا۔

اعظم گڈھ میں بھی ایک قلعہ تھا جو تونس ندی پر بنایا گیا تھا۔ اب اس کی دیواریں جو ندی کے کنارے تھیں باقی رہ گئی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے شروع میں راجہ مہابت خاں نے یہ قلعہ بنوایا تھا۔ اس ضلع میں جب بھروں کی حکومت تھی تو اس وقت اس کے مختلف حصوں میں چھوٹے بڑے ۲۵ قلعے تھے۔ ان میں سب سے بڑا قلعہ گھوسی میں تھا جس کو راجہ گھوس نے تعمیر کرایا۔



انسانی حقوق اور ہندوستان

(بسلسلۂ صفحہ ۲۵)

پارلیمنٹ میں نشستوں کی تخصیص۔ آئین سازی کے زمانے میں اس بات سے اتفاق کیا گیا کہ دس سال کے عرصے کے لیے ریاستی لیجسلیچروں اور پارلیمنٹ میں درج فہرست جاتیوں اور قبیلوں کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔ لیکن بعد میں اس میں مزید دس سال کی یعنی سنہ ۱۹۷۰ء تک توسیع کر دی گئی۔ اس مدت تک ان لوگوں کی تعلیمی اقتصادی و سماجی ترقی کے اقدامات کے نتائج کے طور پر یہ اس قابل ہو چکے ہوں گے کہ دوسرے شہریوں کے ہم پلّہ ہو جائیں۔

تعلیمی سہولتوں کی ہمہ جہتی توسیع اور صنعتوں اور شہروں کے پھیلاؤ کے سبب پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ چھوت چھات بہت جلد ناپید ہو جائے گی۔ نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی بڑی ذمہ داری ٹیچروں پر عائد ہوتی ہے۔ انھیں نوخیز نسلوں کے ذہنوں میں قول و عمل کے ذریعے حقوق انسانی کا احترام پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کام میں منشور اقوام متحدہ ان کا موثر ہتھیار بن سکتا ہے۔

غزل

میکش اکبرآبادی

دیکھ کر مجھ کو سنوارا احسنم گیسو اپنا

اُن کے جادو پہ بھی کیا چل گیا جادو اپنا

کیا یہ ویرانہ رہا ہے کبھی مقصودِ بہار

جی بھر آتا ہے کیوں دیکھ کے پہلو اپنا

جھلک اُٹھتی ہے تری چشمِ تغافل اس میں

خندۂ گل سے ہے پیارا مجھے آنسو اپنا

پھر کیے دیتے ہیں شرمندہ یہ آنسو مجھ کو

پھر مری آنکھوں پہ رکھ دیجیے گیسو اپنا

ڈھانک لے گا کسی منزل پہ مجھے دامنِ گُل

کبھی بھر جائے گا پیمانۂ لب جُو اپنا

فتنۂ حشر وہیں لے کے کوئی ٹوٹ پڑا

جب میں سمجھا کہ ہوا اب دل پہ ہے قابو اپنا

حافظ شیراز کے شباب کا ایک افسانہ

حافظ کے اشعار کی روشنی میں

ابو ہاشم سید یوشع

خواجہ حافظ شیرازی کا نام محمد اور لقب خواجہ شمس الدین تھا۔ نو عمری ہی میں حافظِ قرآن ہو گئے تھے اس لیے لوگ انھیں "حافظ" پکارا کرتے تھے۔ بعد میں تخلص بھی انھوں نے حافظ ہی اختیار کیا۔ خواجہ حافظ کا سنِ ولادت ۷۲۶ھ یا ۷۲۹ھ ہے۔ انھوں نے ۷۹۱ھ میں وفات پائی۔ اُن کے والد شیخ کمال الدین اپنے وقت کے علما و فضلا میں شمار کیے جاتے تھے۔ اتابکانِ شیراز کے عہد میں انھوں نے شیراز آکر تجارت شروع کی۔ شیخ کمال الدین نے اپنی وفات کے وقت ایک بیٹی اور تین بیٹے چھوڑے جن میں خواجہ حافظ سب سے چھوٹے تھے۔ خواجہ حافظ اگرچہ فارسی کے شاعر اور ایران کے رہنے والے تھے لیکن ہندوستان کے اُردو داں طبقے میں بھی مشکل سے کوئی ایسا ہوگا جو اُن کے نام سے واقف نہ ہو۔ بعض گھروں میں تو اُن کے دیوان سے فال نکالی جاتی ہے۔ اس لیے اُردو داں طبقے کے لیے حافظ کی بعض غزلوں اور اشعار کی روشنی میں اُن کے عنفوانِ شباب کے متعلق ایک "افسانہ" پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

خواجہ حافظ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا کلام اُن کی شخصیت اور اُن کے نجی حالات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اُن کے اشعار سے یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اُن کا رنگ روپ کیسا تھا، لباس کیسا پہنا کرتے تھے، مکان شیراز میں کس مقام پر اور کس نوعیت کا تھا، اُن کی رفیقۂ حیات بہ لحاظ صورت و سیرت کیسی تھیں۔ متاہلانہ زندگی کیسی گزری، کس بادشاہ اور کس وزیر سے اُن کے روابط کیسے تھے، اُن کی زندگی کس دور میں کیسی رہی، وغیرہ وغیرہ۔ ان کیفیتوں اور اُن کے زمانے کے تاریخی واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے استنباط قیاسی و احتیاط تمیزی سے کام لے کر اُن کی غزلیں بہ ترتیب سنین مدوّن کی جا سکتی ہیں اور اس تدوین کے ذریعے اُن کی زندگی کے مختلف پہلو اُجاگر کیے جا سکتے ہیں۔ مگر ایسی تدوین و ترتیب بظاہر قابلِ اعتماد کیوں نہ معلوم ہو، ایک بڑی حد تک مبنی بہ حدسیات ہی ہوگی اور اس کے لیے نہ کوئی ثبوت فراہم کیا جا سکے گا اور نہ اُس پر اعتماد ہی کیا جا سکے گا۔

راقم السطور نے ۱۹۳۲ء میں خواجہ حافظ کی غزلوں کو بہ ترتیب سنین آٹھ ادوار میں تقسیم کیا تھا۔ اب اسے اپنی تالیف حافظ شیراز کے حالیہ ایڈیشن میں شامل کیا ہے۔ اسی جرأتِ رندانہ نے ایک اور اقدام پر آمادہ کیا جو زیرِ عنوانِ بالا ناظرین کے پیش نظر ہے۔

حافظ کے عشق کے افسانے کئی تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ بعضوں نے اس غزل کی بنا پر انھیں "فرخ" کا عاشق ٹھہرایا ہے:

دلِ من در ہوائے روئے فرخ　　بود آشفتہ ہم چوں موئے فرخ

(میرا دل فرخ کے دیدار کی آرزو میں، فرخ کی کاکلوں کی طرح پریشان رہتا ہے۔)

ممکن ہے حافظ نے اپنی محبوبہ کو یہ فرضی نام دیا ہو۔ بعضوں نے "شاخِ نبات" کو ان کی معشوقہ قرار دیا ہے۔ یہ اسمِ مرکب دیوانِ حافظ میں غالباً تین جگہ آیا ہے۔ ہر جگہ اس سے مراد ہری بھری پتیوں والی شاخ (یعنی کلکِ ساحرانۂ شاعری) جس سے لذیذ میوے ٹپکتے ہیں، لی گئی ہے۔ مثلاً

حافظ چہ طرفہ شاخِ نباتست کلکِ تو　　کش میوہ دل پذیر تر از شہد و شکر ست

یعنی حافظ کے دستِ شاعری میں معمولی قلم بھی آ کر ایک عجیب سرسبز و شاداب شاخ بن جاتا ہے اور اس میں سے شہد و شکر سے بھی زیادہ لذیذ میوے ٹپکنے لگتے ہیں۔

حافظ اپنے عنفوانِ جوانی میں "چناں کہ افتد و دانی" عاشق مزاج تھے۔ خود بھی فرماتے ہیں :

حافظ چہ شد ار عاشق و رند است و نظرباز

بس طورِ عجب لازمِ ایامِ شباب است

(اگر حافظ بھی عاشق و رند و نظر باز ہے تو کیا ہوا ، ایامِ شباب میں لازمی طور پر سبھی کے رنگ ڈھنگ انوکھے ہوا کرتے ہیں۔)

بہرحال ایک غزل سے' جو ابتدائے جوانی کی معلوم ہوتی ہے' ظاہر ہوتا ہے کہ ایک کم سن ماہ پارہ حافظ کی منظورِ نظر تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے :

مجمعِ خوبی و لطف است عذارِ چو مہش

لیکنش مہر و وفا نیست' خدایا بدہش

(اُس کا چاند سا چہرہ لطف و خوبی کا ایک دل پذیر مجموعہ ہے' لیکن (ایک چیز کی کمی ہے یعنی) مہر و وفا اس میں نہیں۔ یارب یہ کمی بھی پوری ہو جائے۔)

حافظ کے ایامِ شباب کی متعدد غزلیں ذوقِ اشتیاق و تمنائے محبوب میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ غزلیں اسی نازنینِ دل رُبا کی محبت نے لکھوائی ہوں۔ مثلاً دو نمونے یہاں پیش کیے جاتے ہیں :

(۱) یارب آں شمعِ شب افروز ز کاشانۂ کیست

دلِ ما سوخت' بپرسید کہ جانانۂ کیست

(یارب! وہ شمعِ شب افروز (اندھیرے کو اُجالے سے بدل دینے والی نازنین) کس گھر کا اُجالا اور کس خاندان کی رونق ہے ؟ ہمارے دل میں اُس نے ایک آگ سی لگا رکھی ہے' ذرا پوچھو تو کہ کس کی قرۃ العین اور کس کے دل و جان کی ٹھنڈک ہے ؟)

(۲) عاشقِ روئے جوانے خوشِ نو خاستہ ام

وز خدا صحبتِ اورا بہ دُعا خواستہ ام

(ایک نو عمر خوب رو نازنین کو میں نے دل دیا ہے' اور درگاہِ الٰہی میں دست بدعا ہوں کہ یہ میری ہم نشین و ہم صحبت ہو جائے۔)

اب ایک غزل ذیل میں پیش کی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آرزوئیں ساحلِ مراد کو پہنچ چکی ہیں اور اب "صدفِ دیدۂ حافظ" اس "دُرِّ دُردانہ" کی آرام گاہ بنی ہوئی ہے۔ یعنی اُسی لڑکی سے حافظ کا عقد ہوا اور اُسے اب اپنے گھر لائے ہیں۔ یہاں محبوبہ کا بے مثل حسن و جمال دیکھنے کا کافی موقع ملا ہے۔ اس ضمن میں اپنے تاثرات کا یوں اظہار کرتے ہیں :

مرا در خانہ سروے ہست کاندر سایۂ قدش

فراغ از سروِ بستانی و شمشادِ چمن دارم

(میرے گھر میں ایک (نہایت حسین و جمیل) سرو ہے جس کے قد کے سایے تلے مجھے دلی آسودگی حاصل ہے۔ اب میری نظر نہ سروِ بوستانی کی طرف اُٹھتی ہے نہ شمشادِ چمن کی طرف' اور نہ اب اُن کے سایے تلے بیٹھنے ہی کو جی چاہتا ہے)(حافظ کے زمانے میں بوستانِ شیراز کے سرو و شمشاد کی بہار بڑی دل آویز تھی)

گرم صد لشکرِ خوباں بقصدِ دل کمیں سازند

بحمد اللہ والمنہ بتے لشکر شکن دارم

(اگر پری وشوں کے سو لشکر میرے دل پر قبضہ کرنے کی خاطر گھات میں بیٹھیں بھی تو انھیں کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اللہ کے فضل و کرم سے مجھے ایسی محبوبہ ملی ہے جس کا حُسن و جمال ایسے سیکڑوں لشکروں کو شکست دے سکتا ہے۔)

صفائے خلوتِ خاطر ازاں شمعِ چگل جویم

فروغِ چشم و نورِ دل ازاں ماہِ ختن دارم

(محبوبہ کے حُسنِ ظاہری سے میرے چشم و دل کو نور و رونق حاصل ہے۔ مجھے اُمید واثق ہے کہ اُس کے حُسنِ باطنی کا پرتو ہمیشہ میری خلوت گاہِ خاطر کو روشن و پاکیزہ رکھے گا۔)

چو در گلزارِ اقبالش خراماں بحمد اللہ

نہ میلِ لالہ و نسریں نہ شوقِ یاسمن دارم

(بحمد اللہ اس کے ورود سے میرا گھر ایک بہارستانِ حسن و جمال بنا ہوا ہے اور میں ہر وقت اس میں مشغولِ سیر و تماشا رہتا ہوں۔ اب میرا دل نہ لالہ و نسریں کی طرف مائل ہے نہ یاسمن کی طرف۔)

شرابِ خوش گوارم ہست و یارے مہرباں ساقی

ندارد ہیچ کس یارے چنیں یارے کہ من دارم

(ایک ایسی پیکرِ خوبی مجھے ملی ہے کہ اس کا وجود میرے لیے ایک شرابِ نشاط آور بنا ہوا ہے اور اس کی دل داری و نظرِ التفات ساقی بن کر اس شرابِ خوش گوار کے جام پر جام مجھے پلا رہی ہے۔ ایسی رفیقۂ حیات نہ کبھی کسی کو ملی ہے اور نہ مل سکتی ہے۔)

اس طرح حافظ کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی چند روز انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ گزرنے پائے ہوں گے کہ بعض شریر النفس لوگوں نے اس میں خلل ڈالنے کے لیے طرح طرح کی تہمتیں اُن پر لگانی شروع کیں۔ حافظ اس پر یوں روشنی ڈالتے ہیں :-

بکام و آرزوئے دل چو دارم خلوتے حاصل
چہ باک از خبثِ بدگویاں میانِ انجمن دارم

(جب کہ جائز طور پر اپنی محبوبہ کے ساتھ خلوتِ یک جائی بھی میسر ہے، بدگویوں کی تہمتیں نہ میرا کچھ بگاڑ سکتی ہیں؛ نہ سماج میں بدنامی ہی کا مجھے کچھ اندیشہ ہو سکتا ہے۔)

سزد کز خاتمِ لعلش زنم لافِ سلیمانی
چو اسمِ اعظمم باشد چہ باک از اہرمن دارم

(اگر یہ دعویٰ کروں کہ سلیمانِ وقت ہوں تو بے جا نہ ہوگا، کیوں کہ میرے پاس بھی مُہرِ سلیمانی جیسی چیز ہے۔ جب کہ یہ اسمِ اعظم میرے پاس ہے، شیطانوں کی شیطنت کا مجھے ڈر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ کنایۃً خاتمِ لعل کہہ کر لبِ لعلِ محبوبہ کو پیش کیا ہے کہ اس کے ذریعے ان تہمتوں کی پوری طرح تکذیب ہو سکتی ہے۔)
خاتمِ سلیمان، حضرت سلیمان کی انگوٹھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے نگینے پر کوئی اسمِ اعظم لکھا ہوا تھا جس کی تاثیر سے وہ جنوں اور دوسری مخلوقات پر حکم راں تھے۔ اسے مُہرِ سلیمان بھی کہتے ہیں۔

غالباً بعض فتنہ انگیزوں نے حافظ کے سسرالی بزرگوں کے آگے ان کی رندانہ شاعری کو پیش کر کے انھیں رند و شراب خوار ٹھہرایا تھا اور ان بزرگوں نے ان کی بدگوئیوں کو باور بھی کر لیا تھا۔ عجب نہیں کہ یہ لوگ اپنی بدگمانیوں کے سبب حافظ کے مخالف ہو گئے ہوں۔ حافظ نے اسی غزل کے مطلع میں اس مخالفت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے:

مرا عہدیست با جاناں کہ تا جاں در بدن دارم
ہوا دارانِ کویش را چو جانِ خویشتن دارم

(اپنی محبوبہ سے میرا یہ عہد و پیمان ہے کہ جب تک میرے جسم میں جان ہے اس کے عزیز و اقارب کو (خواہ میرے مخالف ہی کیوں نہ ہو جائیں) اپنی جان کی طرح عزیز رکھوں، یا شرطِ محبت و وفاداری یہ ہے کہ اپنی محبوبہ کے عزیزوں کو ان کی مخالفت کے باوجود، دل و جان سے عزیز رکھوں۔)

اشعارِ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سسرال سے ایک بزرگ خاندان حافظ کے گھر آ کر اپنی بدگمانیوں کا اظہار کرتے ہیں۔ حافظ ان کا یوں جواب دیتے ہیں:

الا اے پیرِ فرزانہ مکن عیبم ز میخانہ
کہ من در ترکِ پیمانہ دلی پیماں شکن دارم

(شراب پینے کا بہتان مجھ پر نہ باندھیے۔ تعجب ہے کہ آپ جیسا عاقل و معمر بزرگ بھی یہ عیب مجھ پر لگاتا ہے ــــ رندانہ رنگ میں غزل کہتا ہوں تو یہ لازمی نہیں شراب خوار بھی ہوں۔) بہر حال، آپ بزرگوں کی بدگمانیوں کا حال سن کر فی الحال اس رنگ میں غزل کہنا ترک کر رکھا ہے مگر رندانہ رنگ کی غزل مجھے اس قدر پسند ہے کہ جی چاہتا ہے پھر اسے اختیار کر لوں۔)

بہ رندی شہرہ شد حافظ پس از چندیں ورع اما
چہ غم دارم چو در عالم قوام الدین حسن دارم

(اس قدر پرہیزگاری کے ساتھ زندگی گزارنے کے باوجود مجھ پر رندی کی تہمتیں لگائی جا رہی ہیں اور اس طرح مجھے ناحق بدنام کیا جا رہا ہے۔ مگر مجھے کیا غم ہو سکتا ہے جب کہ ان الزامات کی تردید و تکذیب وزیرِ سلطنت خواجہ قوام بہ خوبی فرما سکتے ہیں۔)

(خواجہ حافظ کے ایامِ شباب میں شاہ شیخ ابو اسحٰق اینجو شیراز کا بادشاہ اور حاجی قوام الدین حسن (حاجی قوام) اس کی سلطنت کے وزیر تھے۔ قوام ایک نہایت متمول، دریا دل و پاکیزہ صفات انسان تھے۔ حافظ پر خاص نظرِ عنایت تھی۔ ان کی مجلسوں میں حافظ کو امتیازی خصوصیت تھی اور وہاں وہ اپنی لطیفہ گوئی و بذلہ سنجی کے جوہر دکھایا کرتے۔ شعرائے شاہی میں بھی وہ منسلک تھے۔

حاجی قوام ایک عالی شان قصر میں رہتے تھے جس کے گرداگرد باغ تھا۔ قصر کے سامنے ایک وسیع چبوترہ زیرِ سایہ بنا ہوا تھا جس پر ہر شام کو ان کی نشست ہوا کرتی اور شام کا کھانا بھی اپنے احباب کے ساتھ کھایا کرتے۔ ان کے خوان سالار کو روزانہ حاضری دینے والے احباب کا کافی اندازہ تھا اور اسی حساب سے کھانا تیار کرایا جاتا۔ اقسام کی نعمتیں پر چنی جاتیں لیکن غذا کا دار و مدار تمام تر روٹی اور شوربے پر ہوتا۔ اتفاقاً ایک دن شام میں احباب کی تعداد بڑھتے بڑھتے عین کھانے کے وقت معمول سے دونی ہو گئی۔ قوام نے خاصہ طلب کیا۔ روٹیاں تو دسترخوان پر حسبِ ضرورت لائی جا سکتی تھیں لیکن عین وقت پر بازار سے گوشت لا کر شوربا تیار کرنا ممکن نہیں تھا۔ خوان سالار کو اس موقع پر اور تو کچھ نہ سوجھی، کافی مقدار میں پانی ملا کر شوربا پیالوں میں دسترخوان پر چن دیا۔ اتفاق سے اس وقت پانچویں یا چھٹی کا چاند آسمان پر نمودار تھا۔ حافظ اپنے آگے رکھے ہوئے پیالے سے شوربا پینے کو جھکے تو شوربا بہت پتلا ہونے کے سبب پیالے میں انھیں آسمان کا چاند

صاف نظر آنے لگا۔ فی البدیہہ اُنھوں نے یہ شعر موزوں کرکے سُنایا :

دریائے اخضرِ فلکت و کشتیِ ہلال
ہستند غرقِ نعمتِ حاجی قوام ما

(آسمان کا یہ سبز سا سمندر اور اس کے ساتھ ہلال کی کشتی دونوں ہمارے حاجی قوام کی نعمت میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں)

اِس شعر پر حاجی قوام اور اہلِ مجلس پھڑک گئے اور اس بدیہہ گوئی و بذلہ سنجی کی خوب داد دی۔ اس سے حاجی قوام و حافظ کے باہمی روابط کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ کو اپنی ظرافت و شوخی کے جوہر دکھانے کی کس قدر آزادی حاصل تھی۔)

غرض حافظ کے سمجھانے بجھانے اور لڑکی کی طرف سے اُس کی توثیق ہونے کے بعد وہ "پیر فرزانہ" گھر جاکر سارا ماجرا سُناتے ہیں۔ (غالباً حافظ نے مذکورۂ بالا غزل اسی واقعے کے بعد لکھی ہے۔) مگر افرادِ خاندان میں سے کسی کی حاجی قوام کے یہاں رسائی نہیں تھی۔ وزیرِ سلطنت جیسی بڑی ہستی سے اس بارے میں کچھ پوچھتے پُچھتے انھیں ڈر لگتا تھا۔ کسی نے نہ وزیرِ سلطنت کے یہاں جانے کی جرأت کی اور نہ لڑکی کے بیان کو باور کیا۔ آخر باہمی مشورے کے بعد سب کی یہ رائے ہوئی کہ فی الحال لڑکی کو حافظ کے گھر سے اپنے یہاں لے آنا چاہیے۔ چناں چہ ذکور و اُناث میں سے پھر کسی بزرگِ خاندان کو بھیج کر حافظ سے یہ درخواست کی گئی ہوگی کہ چند دنوں کے لیے لڑکی کو اُس کے میکے بھیجیں۔ حافظ ایک نیک نہاد پاکیزہ صفات آدمی تھے۔ اپنی بیوی سے اُنھیں والہانہ محبت تھی، اس کو بہ طیبِ خاطر منظور کر لیا۔ لڑکی کو اپنے یہاں لانے کے بعد سسرال والوں کے تیور بدل گئے۔ ممکن ہے خلع و علیحدگی کے مشورے کیے جانے لگے ہوں گے۔ حافظ نے جب یہ دیکھا ہوگا کہ اُن کی سسرال والے لڑکی کو اُن کے گھر بھیجنا نہیں چاہتے تو اپنی محبوبہ کے پاس یہ غزل لکھ بھیجی ہوگی:

از من جدا مشو کہ توام نورِ دیدۂ
آرامِ جان و مونسِ قلبِ رمیدۂ

(مجھ سے جدا نہ ہو جانا کہ تم ہی میری آنکھوں کا نور، جان کا آرام اور میرے وحشت زدہ دل کی مونس ہو۔)

پایم نمی رسد بہ زمیں دیگر از نشاط
تا سوئے من بہ لطف و عنایت تو دیدۂ

(انتہائے مسرت سے میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹھہرتے، جب اس کا خیال آتا ہے کہ (چلتے چلتے) تم نے مجھے کس محبت کی نظر سے دیکھا تھا۔)

از دامنِ تو دست نہ دارند عاشقاں
پیراہنِ صبوری ایشاں دریدۂ

(حافظ کو اپنی ماں اور بہن سے بڑی محبت تھی اور یہ دونوں انھیں کے یہاں رہتی تھیں۔ حافظ کی دولہن کے حسن و جمال و صفاتِ پسندیدہ کو دیکھ کر وہ دونوں اِن کی گرویدہ ہو گئی تھیں۔ اس لیے حافظ کہتے ہیں: تم نے اُن کو اپنا ایسا گرویدہ بنا رکھا ہے کہ تمھاری کنارہ گیری ان پر بے انتہا شاق گزر رہی ہے اور اب اس سے زیادہ تمھاری جدائی اُن کے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔)

از چشمِ زخمِ دہر مبادت گزند زانک
در دل بری بہ غایتِ خوبی رسیدۂ

(تیرا حسن و جمالِ ظاہری و باطنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے، اسی لیے مجھے اندیشہ ہونے لگا ہے کہ کہیں تجھے زمانہ کی نظر نہ لگ جائے۔)

فتنہ انگیزوں کی بدگوئیاں بدستور جاری رہتی ہیں اور حافظ کی سسرال والوں کی بدگمانیاں کم نہیں ہوتیں۔ ایک مدت تک لڑکی کو حافظ سے جدا رکھا جاتا ہے۔ اس مدتِ فراق میں حافظ نے متعدد غزلیں یکے بعد دیگرے لکھ کر بطور نامہ و پیام کے اپنی رفیقۂ حیات کے پاس بھیجی ہیں۔ ان میں سے چند غزلوں کے منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں :

باز آ و دلِ تنگِ مرا مونسِ جاں باش
ویں سوختہ را محرمِ اسرارِ نہاں باش

(واپس آجاؤ اور پھر میرے دل و جانِ حزیں کی مونس بن جاؤ اور پہلے کی طرح اس سوختہ دل کی محرمِ راز بنی رہو۔)

آں یار کہ گفتا بہ توام دل نگران است
گو می رسم اکنوں بہ سلامت نگراں باش

(میری محبوبہ نے میرے پاس کہلا بھیجا ہے کہ تیری طرف دل لگا ہوا ہے اور منتظر آمد ہوں۔ اے نامہ بر! اُن سے کہنا کہ اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ لائیں میں ابھی آتا ہوں)

تا بر دلش از غصہ غبارے ننشیند
اے سیلِ سرشک از عقبِ نامہ رواں باش

(اے آنسو! سیلاب بن کر میرے نامے کے پیچھے رواں ہو جاؤ اور کسی قسم کا غبار

رنج و ملال اُس مجھے دل پر آنے نہ دو۔)

اے خرّمم از فروغِ رخت لالہ زارِ عمر
باز آ کہ ریخت بے گلِ رویت بہارِ عمر

(تمھارے چہرے کی بہار سے میری عمر کا لالہ زار تر و تازہ ہو گیا تھا۔ لوٹ آؤ کہ تمھارے پھول سے چہرے کے بغیر میری عمر کی بہار خزاں زدہ سی ہو گئی ہے۔)

از دیدہ گر سرشک چو باراں رود رواست
کاندر غمت چو برق بشد روزگارِ عمر

(تمھاری جدائی کے غم میں میرے آنسو مینھ کی طرح بہنے لگیں تو نا روا نہیں کیونکہ "روزگارِ عمر" یعنی زمانۂ وصال گویا بجلی جیسا تھا کہ ایک آن کی آن میں آیا اور گزر گیا۔)

حافظ زمانۂ فراق کو عمر میں شمار نہیں کرتے:

بے عمر زندہ ام من و زیں بس عجب مدار
روزِ فراق را کہ نہد در شمارِ عمر

(اب میں عمر کے بغیر زندہ ہوں، اس پر تعجب نہ کرو۔ زمانۂ فراق کو کون عمر میں شمار کرتا ہے؟)

ایں یک دو دم کہ وعدہ دیدار ممکن است
دریاب کام دل کہ نہ پیدا است کارِ عمر

(یہ جو چند سانسیں مجھ میں رہ گئی ہیں اس میں بھی نوید دیدار کا امکان ہے۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ دلی مراد بر آئے۔ ورنہ جینے کا بھروسا کیا ہے۔)

از خونِ دل نوشتم نزدیکِ یار نامہ
اِنِّیْ رَاَیْتُ دَھْراً مِنْ ھِجْرِکَ الْقِیٰمَۃ

(میں نے اپنے خونِ دل سے اپنی محبوبہ کو نامہ لکھا، اور اس میں یہ لکھا کہ تیری جدائی مجھے ایک قیامت نظر آ رہی ہے۔)

پرسیدم از طبیبے احوالِ دوست، گفتا
فِیْ بُعْدِھَا عَذَابٌ فِیْ قُرْبِھَا السَّلَامَۃ

(میں نے ایک طبیبِ عشق سے اپنی محبوبہ کے بارے میں پوچھا۔ اُس نے کہا اُس کی دوری میں عذاب اور اُس کی قربت میں ندامت ہے۔)

گفتم ملامت آید گر گردِ دوست گردم
وَاللہِ مَا رَاَیْنَا حُبّاً بِلَا مَلَامَۃ!

(میں نے کہا کہ محبوبہ کے گھر کے چکر لگاؤں تو لوگ ملامت کریں گے۔ اُس نے کہا واللہ ہم نے محبت کو کبھی بلا ملامت نہیں دیکھا!)

از غمِ خویش چناں شیفتہ کردی بازم
کز خیالِ تو بہ خود نیز نمی پردازم

(تمھارے غمِ جدائی نے مجھے کچھ ایسا دیوانہ بنا رکھا ہے کہ بس تمھاری ہی طرف خیال لگا ہوا ہے اور کسی بات کی سدھ بدھ نہیں۔)

گفتہ بودی کہ خبر دہ کہ بہ ہجرم چونی
آں چنانم کہ بہ بینی و نہ دانی بازم

(تم نے کہلا بھیجا تھا کہ بتاؤ میری جدائی میں اب تمھارا کیا حال۔ حال بتاؤں، اب میری کیفیت یہ ہے کہ تم مجھے دیکھ بھی تو پہچان نہ سکو۔)

اس کے سوا اور بھی کئی غزلیں ہیں لیکن بخوفِ اطناب ان سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایک خاصی مدت گزرنے کے بعد سسرال والوں پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حافظ پر جھوٹے بہتان جوڑے گئے تھے اور وہ ایک متقی و پرہیزگار آدمی ہیں۔ وہ سب اپنے کیے پر نادم ہو کر مصالحت کی طرف مائل ہوتے ہیں حافظ کو شاید اُن کی محبوبہ کی طرف سے یہ خبر ملتی ہے اور مشورہ دیا جاتا ہے کسی معقول آدمی کو بھیجیں تو آپس میں میل ملاپ ہو جائے گا۔ حافظ ایک معتبر و سنجیدہ شخص کو بھیجتے ہیں اور وہ وہاں سے مصالحت کی خوش خبری لے آتا ہے۔ اس پر حافظ یوں غزل خواں ہوتے ہیں:—

مژدہ اے دل کہ دگر بادِ صبا باز آمد
ہدہد خوش خبر از طرفِ سبا باز آمد

(اے دل تجھے خوش خبری سناتا ہوں کہ ہمارا قاصد نویدِ مصالحت لے کر وہاں سے واپس آگیا۔ گویا کہ ہدہد سبا کی سرحد سے خوش خبری لے کر آیا ہے۔)

شاید اس کے بعد حافظ سسرال بلائے جاتے ہیں اور پھر وہاں آپس میں روابطِ محبت و دوستی مربوط ہو جاتے ہیں اور بالآخر حافظ اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ اپنے گھر آتے اور یوں غزل سرا ہوتے ہیں:—

دلا چندم بریزی خوں ز دیدہ شرم دار آخر
تو نیز اے دیدہ خوابے کن مراد دل برآمد آخر

(اے دل! آخر کب تک تو میری آنکھوں سے خون کے آنسو جاری کراتا رہے گا تجھے

(بقیہ مضمون صفحہ ۴۲ پر)

ہنستے آنسو

حیات اللہ انصاری

(۱)

"کیوں جھگڑو، اگر تم کو پڑھاؤں تو پڑھو گے؟"

"مجھے پڑھاؤگے بابو!! مجھے!!"

عمر قید کی سزا بھگتنے والے جھگڑو نے چکی روک کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"کیوں اس میں کیا خرابی ہے؟"

"مگر یہ تو بتلاؤ کہ پڑھاؤگے کیا؟"

"تاریخ، جغرافیہ، سیاست۔ اپنے ملک کے بڑے لوگوں کی باتیں"

جھگڑو بڑے زور سے ہنسا۔ ہنسی کے مارے اس کا سینہ گھڑا کی طرح دیر تک کھلا رہا اور اس سے کئی اونچی نیچی آوازوں سے بنی ہوئی ہنسی آتی رہی۔

"کیا کہا۔ تاریکھ، جگرا پھا اور کا اور کا۔ ای تم ہم کا پڑھی ہو؟ واہ بابو۔ ہم تو دوئی کھشر بھی ناہیں جانت ہے۔"

مجھے اس کی اس بات پر حیرت ہوئی "مگر تم تو اپنا جیل کا کارڈ اپنے اور ساتھیوں کے کارڈوں سے جب چاہتے ہو الگ کر لیتے ہو۔"

"ان پر تو ہم لوگوں نے خاص خاص نشانیاں لگا رکھی ہیں۔ یہاں پڑھنا کون جانتا ہے؟"

"اچھا کوئی بات نہیں۔ میں پہلے پڑھنا لکھنا سکھلاؤں گا۔"

"ہم کو سکھلاؤگے پڑھنا لکھنا! میری کھوپڑی تو بہت موٹی ہے۔"

"کون کہتا ہے۔ تم تو سب باتوں میں بہت ہوشیار ہو۔"

"مگر بابو، جہاں کتاب کا سامنا ہوا میں بدھو بن جاتا ہوں۔"

"تو چلو میں اس طرح پڑھاؤں گا کہ کتاب کا سامنا ہی نہ ہو۔"

جھگڑو کو گھر بہت یاد آتا تھا اور وہ ہر وقت اسی یاد میں گم رہتا تھا لیکن پھر بھی وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ پڑھانے کا طریقہ میں نے یہ نکالا کہ میں پسے ہوئے آٹے پر حرف بنا دیتا اور پھر اسی پر اس کی مشق کراتا رہتا۔

جھگڑو کو قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ تھا بہت جھگڑالو قیدی۔ اور شاید اسی وجہ سے جیلر نے اس کو میرا ساتھی بنا دیا تھا۔ لیکن مجھ سے اس نے کوئی جھگڑا نہیں کیا بلکہ چکی پیسنے میں وہ سارا زور خود لگاتا تھا اور کہتا تھا کہ بابو تم صرف ہاتھ چلاتے رہو۔

مجھے عدالت نے تو "بی" کلاس دیا تھا، لیکن میرا جیلر سیاسی قیدیوں کے بارے میں خاص خیالات رکھتا تھا۔ کہتا تھا کہ "اے" کلاس کے ہوں چاہے "بی" کلاس کے ان سے مشقت لینا ضروری ہے۔ ورنہ پھر یہ بغاوت کی اسکیمیں بنائیں گے اور جیل کے خلاف سازشیں کریں گے۔ میں نے اس سے ذرا بحث کر لی تھی۔ اس پر وہ کہنے لگا "تمہارا بابوپا زور نکال دوں گا۔ تم کو ایسے شخص کے ساتھ چکی پسواؤں گا جو مزاج درست کر دے گا۔"

شروع شروع میں تو جھگڑو چکی چلانے کا سارا زور میرے اوپر ڈال دیتا تھا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ سیاسی قیدی کون لوگ ہوتے ہیں تو پھر وہ اک دم سے میرے اوپر مہربان ہو گیا اور چکی کا سارا زور خود لگانے لگا۔

"کیوں بھئی سبق یاد ہو گیا؟"

"کل والا؟ نہیں۔ پرسوں اور نرسوں والا یاد ہے۔"

"خیر، کچھ تو یاد ہے۔"

جھگڑو کا اصرار تھا کہ پڑھنا تو ضرور اچھی چیز ہے، لیکن لکھنا سیکھ کر کیا کریں گے۔ "کون اپنے بیٹھا ہے جسے چٹھی لکھیں؟"

"تم تو گھر بہت یاد کرتے ہو۔"

"ہاں بابو بہت۔"

"جسے یاد کرتے ہو، اسی کو لکھنا۔"

"نہیں بابو۔ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔"

"کیوں؟"

"اب کیا بتلاؤں۔"

آٹے میں حروف بنتے رہے۔ اس کے بعد پھر ان سے الفاظ بننے لگے جب جھگڑو الفاظ پڑھنے لگا تو اس کے چہرے پر ایک عجیب تازگی اور امید آگئی اور اس کی دلچسپی بھی بڑھ گئی۔

الفاظ کے بعد آٹے پر عبارتیں لکھی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ جھگڑو ان کو بھی پڑھنے لگا۔

ایک دن میں نے کہا۔ "جھگڑو بھیا، تم کو پڑھنا آگیا۔ اب تم چٹھی تو پڑھ سکتے ہو۔"

جھگڑو نے اک دم سے ہاتھ روک دیا۔

"میں چٹھی پڑھ سکتا ہوں!"

"ہاں!"

اس کی کالی رنگت میں سرخی دوڑ گئی۔ سانس تیزی سے چلنے لگی اور ہاتھ کانپنے لگے۔

"میں چٹھی پڑھ سکتا ہوں! سچ؟"

"ہاں جھگڑو، تم چٹھی پڑھ سکتے ہو۔"

وہ حیرت اور خوشی سے میری صورت تک رہا تھا اور اس کے چہرے پر خوشی کے وہ خطوط ابھر رہے تھے جو یا تو کبھی ابھرے ہی نہیں تھے، یا ابھرنا بھول چکے تھے۔ اس وجہ سے وہ سہما سا لگ رہا تھا۔

"دیکھو بابو۔ سوچ کر بات کہو۔ ایسا نہ ہو کہ میں چٹھی پڑھنے بیٹھوں اور نہ پڑھ سکوں۔"

"نہیں جھگڑو، اگر چٹھی صاف لکھی ہوئی ہے تو ضرور پڑھ لوگے۔"

جھگڑو کی خوشی فکروں، اور خیالوں میں ڈوبنے لگی۔ اور وہ ذہن غائب ہو بالکل غائب ہو گئی۔ چکی گزر گزر چلتی رہی اور پوری رفتار سے چلتی رہی۔ اور سے زور لگانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جھگڑو کی آنکھیں ماضی کے دھندلکوں میں اتنی گہری ڈوب گئیں کہ مجھے ان کی طرف دیکھنے سے وحشت ہونے لگی۔

دوپہر سے سہ پہر تک جھگڑو کی عجب حالت رہی۔ پھر اک دم سے اس نے کہا کہ بابو تھوڑی دیر کے لیے آگیا دے دو۔

"ہاں۔ ہاں۔"

جھگڑو ایک دیوار کی آڑ میں چلا گیا۔ میں چکی پیستا رہا۔ اتنے میں جھگڑو کے زور زور سے باتیں کرنے، رونے اور ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں کچھ ایسی عجیب بلکہ وحشت بھری تھیں کہ میں نے جیل کے قاعدے کی خلاف ورزی کی اور چکی چھوڑ کر اس کے پاس چلا گیا۔

جھگڑو ہاتھ میں ایک پرچہ لیے پڑھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"وہ مرگئی تو مرگئی۔ پر میری رہ کر مری۔ مرتے سمے بھی میری تھی اور اب بھی میری ہی ہے۔ میری ہے۔ ہاں۔"

اب وہ رونے لگا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس وقت میرا قریب جانا مناسب نہ ہوگا۔ میں دور کھڑا رہا۔ جب جھگڑو کا رونا ذرا تھما تو میں نے اسے پکارا۔ "جھگڑو، جھگڑو!"

لیکن جھگڑو بدستور اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ جب میں بار بار پکارنے گیا تو اس نے کہا۔

"بابو، تم چکی چلاتے رہو۔ نہیں تو ہم دونوں کو کوڑے پڑیں گے۔ مجھے آپ سے وہ بات معلوم ہوگئی جس کے معلوم کرنے کے لیے میں پانچ سال سے تڑپ رہا تھا۔ مگر مجھے کون بتاتا۔"

مجھے اس کی ان باتوں سے یقین ہو گیا کہ پاگل نہیں ہوا ہے۔ پھر میں آکر چکی پیسنے لگا۔

(۲)

دوسرے دن جھگڑو جب آیا تو اس کے چہرے پر غم بھی تھا۔ سکون بھی تھا اور ایک مسکراہٹ بھی تھی۔ لیکن اب اس کی آنکھوں میں وہ سونا پن نہیں تھا جو مجھے ان میں ہمیشہ نظر آیا کرتا تھا۔

میں نے جھگڑو سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے۔ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس دن شام کو جب چلنے لگا تو اس نے بہت ادب اور

اُتر پردیش

کی

دفاعی تیاریاں

(اوپر)
برف پوش پہاڑوں کے لیے اسپشل پولس فورس

(داہنی طرف)
بخشی کا تالاب لکھنؤ میں شہری دفاع کی ٹریننگ

(نیچے)
لکھنؤ میں این، سی، سی کیڈٹوں (لڑکیوں) کو رائفل ٹریننگ دی جارہی ہے

مادرِ وطن کے دفاع میں
اُتر پردیش کسی سے پیچھے نہیں رہا

ں، روپیوں اور فوجی تیاریوں کی شکل میں اُس نے کوششوں میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ہماری سرحدوں پر چینی حملے کے بعد سے لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو تربیت دی جارہی ہے۔ عوام نے نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دل کھول کر چندہ دیا ہے اور خاصی تعداد میں ہلکے نوجوان فوج میں شامل ہوگئے ہیں۔

اتر پردیش

کی

ترقیاتی سرگرمیاں

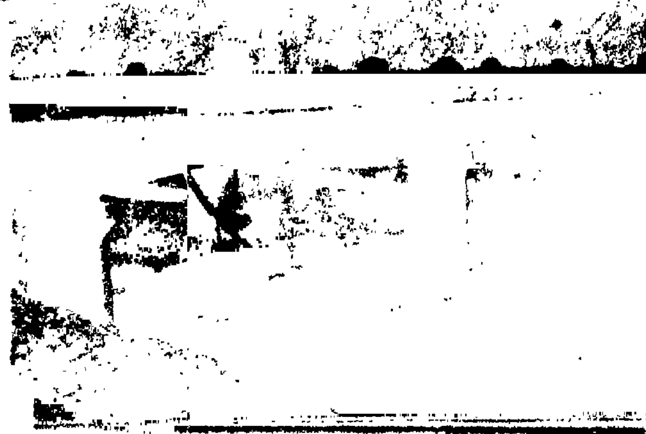


(اوپر)
انڈین ٹرپنٹائن اور روزن فیکٹری، کلٹر بک گنج، بریلی کی توسیع

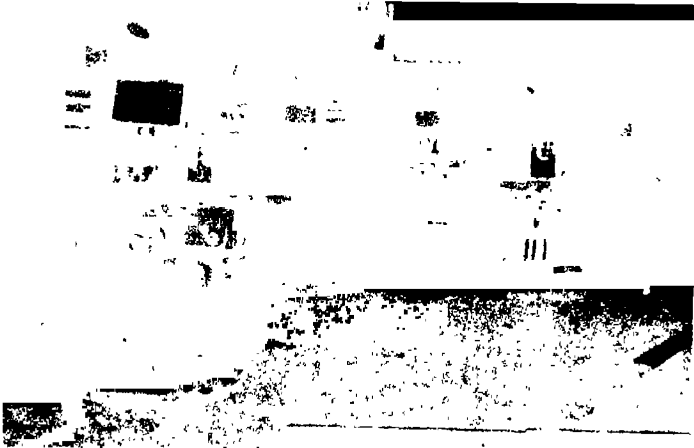


منسیاری ضلع پتھورا گڑھ کے ترقیاتی بلاک میں تبت سے لائے گئے یاک کی پرداخت

(نیچے)
آگرہ شمس آباد سڑک پر اوٹنگن پل تکمیل کے قریب



اتر پردیش کی ترقیاتی سرگرمیاں



(اوپر)
بھاری بجلی کی مشینوں کی تربیت کا مرکز (ہردوار)



مانک پور (ضلع باندہ) ترقیاتی بلاک میں مین کی بازیابی

(نیچے)
موتی لعل نہرو انجینیرنگ کالج (الہ آباد) کا ورکشاپ



ہندوستان اور ایم، سی، سی کے درمیان سنہ ۱۹۶۱ء میں کانپور کے سرکاری ٹسٹ میچ میں ہندوستانی کھلاڑی
ایم، سی، سی کے ایک کھلاڑی کے خلاف کاٹ بہائنڈ ہونے کی اپیل کر رہے ہیں۔ ہندوستان نے یہ سیریز جیت لی تھی

ہندوستان اور انگلستان کے درمیان لکھنؤ میں ۵ جنوری کو پانچویں ہاکی ٹسٹ میچ میں
ایک ہندوستانی کھلاڑی گول بنا رہا ہے



عقیدت سے میرے پاؤں چھوئے۔ پھر دوسرے دن صبح کو بھی یہی کیا اور شام کو بھی۔

تین چار دن کے بعد جھگڑو مجھے اسی طرح ڈنڈوت کر کے کہنے لگا۔

"بابو تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے کہ میں سات جنموں میں بھی اسے اتار نہیں سکتا ہوں۔ اگر جیل کے باہر ہوتا تو ایک کام ضرور کرتا۔ وہ یہ ہے کہ تمہارے تمام دشمنوں کو ٹھکانے لگا دیتا۔"

"میرا کوئی دشمن نہیں ہے۔ لیکن تم یہ تو بتلاؤ کہ تم کو ہوا کیا ہے۔ تم خوش ہو یا غمگین؟"

"میری سمجھ میں خود نہیں آ رہا ہے۔ تم کو کیسے بتلاؤں۔"

"اچھا یہ بتلاؤ تم اس وقت جب چکی میرے اوپر چھوڑ کر گئے ہو، کیا پڑھ رہے تھے؟"

"ایک چٹھی۔"

"کس کی چٹھی؟"

"اسی کی۔ اپنی بتنی کی۔"

"بتنی کی؟ تم تو کہتے تھے کہ تمہارے کوئی ہے نہیں۔"

"اب وہ کہاں ہے بابو۔ وہ تو بھگوان کے گھر ہے۔"

"بھگوان کے گھر! پھر اس کی چٹھی تم کو کیسے ملی؟"

"وہ تو پانچ سال ہوئے جب آئی تھی۔ بتنی کو مرے ہوئے بھی دو سال ہو گئے"

"چٹھی پانچ سال سے آئی ہوئی تھی۔ پھر تم نے کسی سے پڑھوا کر سن تو لی ہوگی۔"

"یہی تو نہیں کر سکا۔"

"نہیں کر سکے!"

"ہاں۔ وہ یوں ہی میرے پاس پانچ سال حفاظت سے دھری رہی۔"

میرا دل دھڑک کر بولا۔ پانچ سال! پانچ سال! گذشتہ پانچ سال میں کیا کیا ہو گیا۔ مجھے ملازمت ملی۔ شادی ہوئی۔ میرا بڑا لڑکا اسکول میں پڑھ رہا ہے۔ میں نے ملازمت چھوڑی اور ۴۲ء کی تحریک میں حصہ لے کر جیل میں آ گیا۔

ان پانچ سالوں میں ہندوستان میں کیا انقلاب ہو گیا۔ ریاستوں میں کانگریسی وزارتیں آ گئیں۔ یعنی وہ لوگ جن کو گنڈہ سمجھا جاتا تھا وہ حکمراں بن گئے۔ تعلیم کا نظام بدلا گیا، کسانوں کی بے دخلی بند ہوئی۔ اس سے ان کی زندگی کا ڈھانچہ بدل گیا۔ یہ سب کچھ ہو گیا ان پانچ برسوں میں جب کہ یہ چٹھی جھگڑو کے پاس اَن پڑھی پڑی رہی۔

"اوہ!! پانچ سال"

جھگڑو کہنے لگا۔

"اگر ایسی ویسی چٹھی ہوتی تو میں پڑھوا لیتا۔ مگر یہ تو اور ہی طرح کی چٹھی تھی۔ مجھے کبھی تو یہ ڈر لگتا تھا کہ کہیں چٹھی میں ایسی ویسی بات نکلی اور چٹھی پڑھنے والا ہنس دیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں۔ اور کبھی یہ کہ اگر چٹھی کی بات ادھر ادھر چل نکلی اور یہ قیدی ٹھٹھولی کرنے لگے تو میں دو ایک کو تو مار ہی ڈالوں گا۔ بھیا مجھے اپنے غصہ سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اسی نے تو مجھے اس جیل خانہ میں پہنچایا ہے۔

"میں نے چٹھی پڑھوائی تو نہیں، پر وہ میرے سینے پر سِل کی طرح دھری رہی۔ ہر وقت ہوک اٹھتی تھی کہ جانے اس میں کیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ جس دن جیل سے نکلوں گا، اسٹیشن پر پہنچتے ہی کسی بھلے مانس سے کہوں گا کہ بھیا تو اس چٹھی کو پڑھ دے۔"

"پھر تم نے چٹھی پڑھوا لی؟"

"ہاں بابو۔ پڑھوا لی۔ اور پڑھ کر معلوم ہوا کہ مری بتنی میری تھی اور میری ہی رہی۔ مجھے وشواس ہے کہ وہ مرتے سمے بھی میری ہی رہی ہوگی۔"

"تم کو اس پر شک کیوں ہوا؟"

"تم کیا جانو لمبی سزا کیا ہوتی ہے۔ جب عمر قید کی سزا ہوئی تو میں جوان تھا اور وہ تو بچہ ہی تھی۔ میں نے سزا سنتے ہی پنچوں کو گواہ بنا کر کہہ دیا کہ میری بتنی جس کے گھر چاہے بیٹھ جائے۔ میری طرف سے وہ آزاد ہے۔ پھر وہ جب بھی جیل میں ملنے آتی میں اس سے یہی کہتا کہ تو یہ جوانی سر دھنا کیسے بتائے گی مورکھ؟ جا کسی کی ہو جا۔ مگر بھگوان جانتا ہے کہ اس بات کے کہتے سمے میرا کلیجہ پھٹ جاتا تھا۔ پھر میں اپنے جی سے کہتا کہ تیرا کلیجہ پھٹتا ہے تو پھٹ جائے، مگر یہ تو سوچ کہ یہ چھوکری عمر قید والے کی بتنی بن کر جیے گی تو کیسے جیے گی۔ تم تو نہ جانتے ہوگے کہ جوانی کے شکاری کہاں کہاں ہوتے ہیں اور کیسے کیسے ہوتے ہیں اور جوانی کہاں تک اس کا سامنا کر سکتی ہے۔ پر میں ان باتوں کو جانتا ہوں۔ ایک دن میں دل کڑا کر کے اس پر بہت بگڑا کہ تو میرا ساتھ کہاں تک

دے گی اب نہ آیا کر۔ جا اور کسی کے گھر بیٹھ جا۔ پھر وہ نہیں آئی۔ جب ملاقات کا دن آتا' میں بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتا۔ پتہ میں نے کسی سے سندیسہ بھیج کر اسے بلایا اور نہ وہ آئی۔ میں بہت بیدیلا پھر اپنے سے کہا کہ مورکھ تو ہی تو اسے آنے سے روکتا تھا۔ تو ہی تو اسے آپا دیتا تھا کہ پرائی بن جا۔" اس نے اس پر بھی تیرا بہت ساتھ دیا۔ اب اگر وہ ساتھ نہ دے سکی اور جیسا تو کہتا تھا ویسا ہی اس نے کر دیا تو کیوں روتا ہے؟

"پھر بھی میری آس نہ ٹوٹی۔ میں نے کہا ہو سکتا ہے کہ کبھی میری یاد آجائے اور وہ اپنے 'مردہی' کے ساتھ میرے گئے چلی آئے۔ اسی طرح کئی برس بیت گئے۔ آخر ایک دن یہ چٹھی آئی۔ میں اسے لے کر منشی کے پاس چلا کہ پڑھوا لوں۔ مگر تھوڑا دور جا کر خیال آیا کہ اس میں ہوگا کیا۔ یہی نا کہ وہ پرائے گھر بیٹھ گئی۔ یہ پڑھ کر منشی ہنس دیا تو؟ کیا جھگڑو یہ ہنسی برداشت کر سکے گا؟ اس بات کا خیال آتے ہی میرا خون کھولنے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ ما نو منشی نہ ہنسا۔ لیکن یہ بات چھپی نہ رہی، ضرور پھوٹ نکلے گی۔ اور پھر قیدی ادھر ادھر مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسیں گے۔ اسے میں برداشت کر سکوں گا؟

"میں نے چٹھی ویسی ہی رکھ لی۔ اور پھر رکھے رہا۔ آخر ایک دن خبر ملی کہ وہ مر گئی۔ یہ سن کر میرے دل کو بہت چوٹ لگی' پر میں رو نہ سکا کیوں کہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس کی ہو کر مری۔

"جب تم نے کہا کہ پڑھنا سیکھ لو' اس وقت یہ بات میرے دھیان میں آئی کہ میں اتنا پڑھ سکوں گا کہ چٹھی پڑھ لوں۔ میرے گاؤں میں ایسے کئی آدمی تھے جو پاٹھ شالہ میں پڑھ چکے تھے' پر نہ وہ چٹھی پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔ یہ دونوں کام وہ دوسروں سے لیتے تھے۔ اور کبھی کبھی توان کے گھر آئی ہوئی چٹھیاں بھی مہینوں اس انتظار میں پڑی رہتی تھیں کہ کوئی پڑھنے والا آئے تو اس سے پڑھوائی جائیں۔"

"جب تم نے کہا کہ تم چٹھی پڑھ سکو گے......"

"تو مجھے یقین نہ آیا۔ پھر میں نے تم سے الگ جا کر یہ چٹھی نکالی۔ پڑھی تو پڑھتا چلا گیا۔ جب چٹھی پڑھی تو اس کی موت پر رو دیا اور اس بات پر خوش ہوا کہ وہ میری ہی رہی۔"

"پھر وہ تم سے ملنے آئی کیوں نہیں؟"

"بابو اس کی دونوں ٹانگیں بیکار ہو گئی تھیں۔ آتی کیسے۔ جانے وہ کس حال میں زندہ رہی۔ کہیں بھوکوں تو نہیں مر گئی!"

جھگڑو جیب سے چٹھی نکال کر دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں درد بھرے آنسو تھے اور ہونٹوں پہ فاتحانہ مسکراہٹ!



حافظ شیراز کے شباب کا ایک افسانہ

(بسلسلہ صفحہ ۳۸)

کچھ تو شرم آنی چاہیے۔ اے میری آنکھو! تم بھی مراد پوری کر لو اور پھر آرام کی نیند لو)

قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حافظ اپنے زمانۂ شباب یعنی دَور زنارت جانبی آم میں کافی مرفہ الحال تھے' اپنے لیے ایک چھوٹا سا خوش نما قصر بھی تعمیر کرایا تھا اور اُسے ایک پُر فضا باغ سے زینت بھی دے رکھی تھی۔ شاید اسی بنا پر فرماتے ہیں:

آمرزشِ نقد است کسے را کہ دریں جا
باغے است چو حورے و سرائے چو بہشتے

(جس شخص کی رفیقۂ حیات حور جیسی اور گھر بہشت جیسا ہو' یہ سمجھنا چاہیے کہ اُس کی بخشائش قبل از آخرت یہیں دُنیا میں ہو چکی ہے۔)

حافظ کی غزلوں کی سال ماہی ترتیب (مبنی بر استنباط قیاسی) اور اُن کے اشعار کے مطالب کے تار و پود سے یہ افسانہ بانی ہوئی ہے۔ یہ افسانہ قرینِ قیاس سہی' پھر بھی قرائن و قیاسات لائقِ اعتماد نہیں ہو سکتے۔ راقم السطور کے نزدیک اس قصے کی اہمیت ایک افسانے سے زیادہ نہیں۔ اُمید ہے کہ ناظرین کرام بھی اس افسانے کو افسانہ ہی تصور فرمائیں گے۔

اتر پردیش میں اردو نثر

محمد حسن

اردو نثر سے اتر پردیش کا بڑا پرانا رشتہ ہے۔ دکن اور دہلی کے بعد اسی صوبے کو اردو نثر کی خدمت میں امتیازی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ سید انشاء اللہ خاں کی "رانی کیتکی کی کہانی" کی تصنیف اسی سرزمین پر ہوئی۔ اس کے علاوہ مرزا قتیل کے تعاون سے انشا نے دریائے لطافت کی تدوین وتالیف بھی کی۔ اس میں بول چال کی زبان کے متعدد نمونے شامل ہیں جو اردو نثر کے نمائندہ کہے جاسکتے ہیں۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے "قصہ چہار درویش" کا ترجمہ اردو نثر میں نوطرز مرصع کے نام سے سنہ ۱۷۹۸ء میں شجاع الدولہ کے عہد میں مکمل کیا۔ اس کے علاوہ فورٹ ولیم کالج میں جن لوگوں نے اردو نثر کی تشکیل نو کے فرائض انجام دیئے ان میں بھی متعدد اہل قلم اسی سرزمین سے علاقہ رکھتے تھے۔ میر شیر علی افسوس کا قیام ایک مدت تک لکھنؤ ہی میں رہا۔ مرزا کاظم علی جوان، گو اصلاً دہلی کے باشندے تھے مگر لکھنؤ میں سکونت اختیار کرچکے تھے۔ سید جعفر علی رواں تو لکھنوی تھے ہی۔ اس دائرے کے باہر رہ کر بھی اردو نثر کی مشاطگی اتر پردیش کے رہنے والے ادیب اپنے طور پر کرتے رہے۔ فقیر محمد خاں گویا نے انوار سہیلی کا ترجمہ بستان حکمت کے عنوان سے کیا جس کی عبارت رجب علی بیگ سرور کی طرح مقفیٰ اور مسجع نہیں ہے۔ اس کے علاوہ متعدد قصے اردو نثر میں بیان ہوئے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے کلیلہ دمنہ، گل بکاؤلی، گلشن نوبہار اور خورد تی مصنفہ محمد بخش مہجور شاگرد جرأت کے نام گنوائے ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں ٹائپ کا ایک مطبع کھولا جاچکا تھا۔ اس میں عربی اور فارسی کی بعض مشہور کتابیں چھپیں۔ ان میں علم تاریخ، علم ہیئت اور لغات نحو قواعد کی بعض کتابیں شامل تھیں۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں لیتھو کا ایک چھاپہ خانہ کانپور میں قائم ہوا جس کی مطبوعات میں سائنس کے "فوائد اعمال" پر ایک انگریزی کتاب کا صاف اور سلیس اردو ترجمہ بھی شامل تھا۔ ایک مورخ کے قول کے مطابق سنہ ۱۸۴۸ء میں لکھنؤ میں بارہ چھاپے خانے لیتھو کے موجود تھے جن میں مطبع میر حسن اور مطبع مصطفائی بہت مشہور تھے۔

نصیر الدین حیدر ہی کے زمانے میں مرزا رجب علی بیگ سرور کا قصہ فسانۂ عجائب مکمل ہوا۔ سرور کے طرز کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں۔ یہ اسلوب نہایت پر تصنع، آراستہ پیراستہ، مقفیٰ، مسجع اور غیر حقیقی ہے۔ اس کا حسن محض رنگ و روغن کا ہے۔ خیال کی رعنائی اور جذبے کی دل فریبی سے اسے زیادہ لگاؤ نہیں۔ انداز بیان ہی اس کے لیے سب کچھ ہے۔ اسی بنا پر اسے اچھی معیاری نثر کا نمونہ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اس کا انکار ممکن نہیں کہ وہ اپنے دور کے ذوق کا آئینہ دار ہے اور اس بات خاص میں اسے تمام معاصر تصانیف کے مقابلے میں ترجیح حاصل ہے۔ وہ اپنے دور کی کمزوریوں اور سربلندیوں کا غماز ہے اور اس کے تصنع اور تکلف، اس کی شائستگی اور اس کے کھلنڈرے پن

کا عکاس ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جب فورٹ ولیم کالج سے سادہ نثر کی آواز بلند ہو چکی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد دہلی کالج کا قیام عمل میں آیا اور ماسٹر رام چندر نے اپنے مضامین میں سادہ نثر لکھنے کا چلن اختیار کیا تھا۔ یہی نہیں شاعری ہو یا نثر انھوں نے ادب کے ہر شعبے میں تصنع، عبارت آرائی اور مبالغے کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ پھر غالب نے اردو میں مکتوب نویسی کی ابتدا کی اور سادہ زبان میں وہ رنگینی اور پُرکاری پیدا کی کہ یہ خطوط اردو نثر کا تاریخی صحیفہ بن گئے۔ سرسید نے اس روایت پر ایک عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال دی اور پہلی مرتبہ اردو میں اس قدر وسیع پیمانے پر نثری ادب کی تخلیق ہوئی۔

شاعری میں جب لکھنؤ کی مرکزیت ختم ہوئی تو اس کی میراث رام پور تک پہنچی۔ اسی طرح نثر میں جب لکھنؤ کی مرکزیت ختم ہوئی تو اس کا فیضان علی گڑھ اور اعظم گڑھ تک پہنچا۔ اس میں شک نہیں کہ اپنے دور میں سرسید احمد خاں کی تحریک اس قدر چھا گئی تھی کہ اس دور کی باقی تحریکات یا میلانات بہت کچھ دب کر رہ گئے تھے لیکن لکھنؤ میں برابر نثری ادب کی تخلیق کا کام جاری تھا مثلاً اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے زیر اثر ناول، مزاحیہ اور طنزیہ مضامین صحافی مقالے، قصے برابر لکھے جا رہے تھے۔ لکھنؤ چونکہ اس دور میں ادبی اور تہذیبی رہنما کی حیثیت رکھتا تھا اس لیے اتر پردیش کے دوسرے حصوں کی ادبی سرگرمیاں لکھنؤ کی تخلیقات کی طرح سامنے نہ آسکیں۔ لیکن اتر پردیش کے دور افتادہ مقامات پر بھی قابل توجہ نثر نگار ملیں گے۔ اودھ پنچ اور اودھ اخبار سے لے کر حال کے اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کی جائے تو اتر پردیش کے دور افتادہ قصبوں یا شہروں کے رہنے والے مضمون نگاروں کے متعدد نام نظر سے گذریں گے۔

اودھ پنچ اور اودھ اخبار کے سیاسی نظریات سے قطع نظر ان اخبارات کے نثری اسلوب کی نمائندگی تین کتابوں سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ سجاد حسین کا حاجی بغلول، پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اور چکبست کے مضامین۔ سجاد حسین پرانی چال کے بزرگ ہیں۔ مشرقی تہذیب کے دلدادہ، مغربیت سے بیزار، ہندو مسلم اتحاد کے رسیا، کانگریس کے ہمدرد۔ ان کے لیے نہ سرسید کی تحریک اصلاح ذریعۂ نجات ہو سکتی ہے نہ کٹر ملائیت۔ ان کے لیے لکھنوی تہذیب ہی سب کچھ تھی۔ اس کا رنگ و آہنگ، عیش و نشاط، رندی اور تماش بینی، شائستگی اور وضعداری — ان کے نزدیک ہندوستانیت اور مشرقیت کے اجزائے ترکیبی یہی تھے۔

سرشار کا اسلوب تمام تر سادہ نہیں۔ انھوں نے سرور اور سرسید کی درمیانی راہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن رندی، مستی، چلبلے پن اور مزاح کے رنگ کو مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں انھوں نے اس طرح سمویا ہے کہ آراستگی بیان وبال جان بننے کے بجائے اس دور کی کھوکھلی شکوہ پرستی پر طنز بن جاتی ہے۔ سرشار کی نثر نگاری میں سادگی اور پُرکاری، تصنع اور بے ساختگی دونوں سے کام لیا گیا ہے اس میں ضرب الامثال، محاورے، بول چال کے رواں اور بے ساختہ جملے بھی ملیں گے اور مقفیٰ اور مسجع عبارتیں بھی پھبتیاں اور ضلع جگت بھی۔ سرشار نے فکری اعتبار سے بھی عہد جدید سے مفاہمت کی ہے۔ آزاد اپنے آخری خطبہ میں مغربی تہذیب کی خوبیوں کو اس طرح اپنانے کی دعوت دیتے ہیں کہ مشرقیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یہ گویا سجاد حسین سے آگے کی منزل ہے جب نہ صرف انداز نثر نگاری میں بلکہ انداز نظر میں بھی عہد جدید کے تقاضوں کا اثر نمایاں ہونے لگا تھا۔

تنقیدی شعور اور شفاف نثر کے اعتبار سے چکبست کے مضامین اس دور کے نمائندہ مضامین ہیں۔ چکبست نے علمی نثر کو نکھارا ہے اور اس میں دلکشی اور رنگینی برقرار رکھی ہے۔ سرشار اور خاص طور پر دیا شنکر نسیم کی حمایت میں ان کے مضامین اس دور کی تنقیدی بصیرت کے غماز ہیں۔ وہ شاعری میں تاریخی صداقت اور اخلاقی اصلاح کے قائل معلوم ہوتے ہیں لیکن حالی کی پوری طرح ہم نوائی نہیں کرتے۔ ان کی شفاف نثر میں خیال کی وضاحت اور علمی انداز ہے۔ وہ اس پر انداز بیان کے رنگین پردے نہیں ڈالتے۔ اپنی بات کو اس وضاحت، استدلال اور قوت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس میں دلکشی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

سرسید کی تحریک میں بھی اتر پردیش کے باشندوں کا بڑا حصہ رہا ہے۔ سرسید احمد خاں یوں تو دلی میں پیدا ہوئے مگر ان کے تمام عملی اور فکری کارناموں کی سمت غازی پور، بجنور اور مرادآباد کے زمانۂ قیام میں متعین ہوئی ہے۔ پہلے مدارس انھوں نے یہیں قائم کیے۔

تلامذہ جنود اور اسباب بغاوت ہند بھی تصنیف ہوئیں۔ سائنٹفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد بھی رکھا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور اس کے بعد رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجرا اتر پردیش ہی کی سرزمین سے ہوا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کی شکل میں اسی سرزمین میں قائم ہو کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی منزل تک پہنچا۔ ان کے ساتھیوں میں محسن الملک اٹاوہ کے رہنے والے تھے۔ نواب وقار الملک امروہہ (ضلع مراد آباد) کے، مولوی نذیر احمد ضلع بجنور کے، مولانا شبلی نعمانی ضلع اعظم گڑھ کے، اور سید علی بلگرام کے۔ اس طرح اردو ادب کے عناصر خمسہ میں سے کم سے کم دو کا تعلق اتر پردیش سے تھا۔

محسن الملک، وقار الملک، اور خاص طور پر شبلی اور نذیر احمد کے نثری اسلوب پر کچھ لکھنا بے محل ہے۔ ان سب کا شمار ہمارے ادب کے اہم نثر نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ شبلی کے اسلوب سے بعد کے انشا پردازوں نے اپنے چراغ جلائے۔ سرسید اور حالی کا اسلوب نہایت سادہ اور پرزور تھا مگر اسے برتنے کے لیے مقصد کا جوش اور اصلاح کا ولولہ ضروری تھا ان کے بغیر اس کی سادگی بے نمکی میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اسی لیے حالی کا اسلوب صرف مولوی عبدالحق کے طرز کو جنم دے سکا۔ مولانا محمد حسین آزاد کی مرصع نگاری کی تقلید آسان نہ تھی اور علمی موضوعات کو ادا کرنے میں یہ انداز ساتھ نہ دیتا تھا۔ اس لیے یہ بھی زیادہ دور نہ چل سکا۔ ہاں اس کا اثر کہیں کہیں دوسرے نثر نگاروں میں نظر آ جاتا ہے۔ شبلی کا اثر البتہ سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس قدر شگفتہ اور رنگین تھا کہ عہد جدید نے بھی اسی اسلوب کو اپنے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ قرار دیا۔ چنانچہ شبلی کے شاگردوں میں ایک طرف مولانا ابوالکلام آزاد کی آتشیں نثر ہے جو شاعری کے مقدس آتش کدوں سے تپ کر نکلی ہے اور دوسری طرف سید سلیمان ندوی کا عالمانہ اور ستھرا انداز تحریر ہے۔ یہ دونوں انداز شبلی کے نہیں مگر شبلی کے اسلوب سے متاثر ضرور ہوئے ہیں۔

مولوی نذیر احمد کے طرز کو بھی کوئی پوری طرح نہ اپنا سکا۔ کہیں کہیں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس کا چربہ اڑایا اور بڑی خوبی سے اڑایا ہے۔ لیکن ناول نگاری کا جو اسلوب انھوں نے پیدا کیا تھا وہ بہت مقبول ہوا۔ ان کے قصے اخلاقی تھے لیکن ان کے قصوں کی دل کشی اخلاقیات کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے مکالموں کی بنا پر قائم ہے۔ ان میں متوسط طبقہ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے کسی نے روزمرہ کی گھریلو گفتگو کو ٹیپ ریکارڈ کر لیا ہو۔ نذیر احمد پہلے نثر نگار ہیں جنھوں نے اپنے اسلوب کو روزمرہ کی زندگی اور اس کے مسائل سے رنگ و آہنگ بخشا۔ اسی لیے ان کے بعض کردار زندہ، ان کے مکالمے بے ساختہ اور بے محابا اور ان کے واقعات کی ترتیب فطری معلوم ہوتی ہے۔

سرسید کی تحریک نے اردو نثر نگاری کا نیا اسلوب پیدا کر دیا لیکن اس دائرے سے الگ رہ کر بھی اتر پردیش نے کم سے کم دو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ایک نول کشور پریس کا قیام ہے اور دوسرا اردو میں ناول نگاری کا ارتقا۔

نول کشور پریس ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا۔ منشی نول کشور ۱۸۳۶ء میں بستوئی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے مطبع نے اردو ادب میں ایک زبردست تخلیقی لہر پیدا کی۔ ان ادبی اور علمی خزانوں کو جو چند قلمی ذخیروں تک محدود تھے منشی نول کشور نے گھر گھر پہنچا دیا۔ ان کی طباعت کا معیار اچھا نہ تھا۔ کاغذ بھی ارزاں قسم کا تھا مگر ان کا نہایت عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو اور فارسی کے تمام کلاسیکی ادب کو سستے ایڈیشنوں میں چھاپ کر مقبول بنا دیا۔ الف لیلیٰ، بوستان خیال، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، قصہ حاتم طائی، باغ و بہار، گل بکاؤلی، طوطا کہانی، بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی سے لے کر شعراء کے دواوین، مجموعہ ہائے مراثی، مثنویات، واسوخت اور اندر سبھا تک نول کشور کے مطبع کے ذریعے چھپ کر مقبول ہو گئے۔ اس اعتبار سے اگر کسی کو اردو ادب کی روایت کا صحیح معنوں میں امانت دار اور مجدد کہا جا سکتا ہے تو وہ منشی نول کشور ہیں۔ نول کشور پریس ہی سے اودھ اخبار نکلا جس میں نہ صرف فسانہ آزاد بالاقساط شائع ہوا بلکہ اس اخبار کے ذریعے متعدد مشاہیر ادب متعارف ہوئے۔

اردو ناول نویسی کو جو توجہ اتر پردیش میں نصیب ہوئی اسی کی بنا پر اسے ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا

اور پریم چند اردو ناول کے عناصرِ خمسہ قرار دیے جاتے ہیں اور یہ سب اسی سرزمین سے اٹھے۔ شرر نے لکھنوی تمدن کے آغوش میں پرورش پائی تھی۔ دل گداز کے پرچوں میں ان کے ترقی پسند خیالات کا عکس جگہ جگہ نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ پردے کے مخالف اور تعلیم نسواں کے علم بردار ہونے کے باوجود شرر کو مشرقی اور خصوصاً ایرانی اسلامی تہذیب اس درجہ عزیز تھی کہ ماضی کی داستانوں کو انھوں نے اپنے زورِ تخیل سے دوبارہ زندہ کر دیا۔ تاریخ ان کے لیے شوکتِ پاستاں کی مظہر اور مردہ حقائق کی فہرست ہونے کے بجائے جیتی جاگتی دنیا تھی۔ انھوں نے حال کی نکبت کا نعم البدل ماضی کی شوکت میں تلاش کر لیا اور مسلمانوں کو ان کے درخشاں ماضی کی داستانیں سنائیں۔ ان کی قومی حمیت کو پھر سے بیدار کرنا چاہا اور ان کی عزتِ نفس، خودداری اور حریت پسندی کے جذبات کو للکارا۔ یہ سب کچھ شستہ، صاف، آسان اور رواں نثر میں لکھا جو قصہ گوئی کے لیے نہایت موزوں تھی۔ رسوا کا ناول امراؤ جان ادا اجڑتے ہوئے لکھنؤ کی تصویر ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اس کی اہمیت اس بناء پر قائم ہے کہ اس میں پہلی بار ایسے کردار کا تصور ملتا ہے جو بظاہر بد ہے مگر اس کی ظاہری بدی میں بھی ایک باطنی نیکی اور انسانیت کے جوہر چھپے ہوئے ہیں۔ اپنے بعض بے ربط حصوں کے باوجود وہ ہمارے ابتدائی ناولوں میں ناول کہلانے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ ان کی نثر بیک وقت سادہ بھی ہے اور رنگین بھی۔ مگر یہاں رنگینی محض الفاظ کے پینتروں سے نہیں آئی ہے بلکہ نفسِ مضمون کی لطافت سے جھلک اٹھی ہے۔ پریم چند تک پہنچتے پہنچتے ہمارا ناول صرف اخلاقی، سماجی یا تاریخی نہیں رہ گیا تھا بلکہ صحیح معنوں میں عوامی ہو گیا تھا۔ پریم چند نے اس کا دائرہ متوسط طبقہ سے آگے بڑھا کر کسانوں اور مزدوروں تک وسیع کر دیا اور اس دائرے میں وہ تمام سیاسی اور سماجی تحریکیں آ گئیں جو اس وقت کے ہندوستانی سماج کو جھنجھوڑ رہی تھیں۔ پریم چند بنیادی طور پر انسان دوست ادیب ہیں۔ وہ گاندھی جی، ٹیگور اور شرت چندر چٹرجی سے بھی متاثر ہیں اور اشتراکی تصورات سے بھی۔ وہ فلسفیانہ اعتبار سے ان مختلف فلسفوں کا کوئی معقول اور متوازن مرکب تیار کرنے میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں مگر انھوں نے اردو ناول میں پہلی مرتبہ دیہات کا اس قدر سچا اور بے پیچ کیا حقیقت پسندانہ اور عوام دوستی کی اس قدر کھری روایت قائم کی اور اس کی فضا کو پہلی بار اس قدر وسیع کر دیا کہ اس کے موضوعات میں فلسفہ، سیاست، اصلاحِ مدن اور اقتصادی زندگی کی پیچیدگیاں تک شامل ہو گئیں۔

اس کے پہلو بہ پہلو "ادبِ لطیف" یا "انشائے لطیف" کے تصورات سے متاثر ہو کر خالص جمالیات پرستی کے نقطۂ نظر سے لکھنے والوں میں بھی اتر پردیش کے متعدد مصنف شامل تھے۔ خود سجاد حیدر یلدرم جو اس "تحریک" کے بانی کہے جا سکتے ہیں اسی صوبے سے متعلق رہے ہیں۔ مہدی افادی جن کے مضامین الفاظ کے حسنِ انتخاب اور بیان کی شائستگی، جمال پرستی اور حسن کاری کے نادر مجموعے قرار دیے جا سکتے ہیں اسی سرزمین سے نسبتِ خاص رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بعد میں اس مسلک کو اور زیادہ شد و مد سے لکھنے میں نیاز فتح پوری کا حصہ تھا۔ اسی ضمن میں سجاد انصاری کا ذکر بھی آتا ہے جن کے چمکاتے ہوئے جملے اور چونکا دینے والے "اقوالِ محالیہ" آسکر وائلڈ کی یاد دلاتے ہیں۔ سجاد انصاری کی تربیت علی گڑھ میں ہوئی جو اس زمانے تک نئے ادب کا مرکز بن چکا تھا اور اس نئے ادب نے جمالیات کو "مذہب" کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ جب اس غلو میں کچھ اعتدال پیدا ہوا تو جمالیات کے ساتھ ساتھ سماجی معنویت اور مقصدیت کو بھی ادب میں شامل کیا جانے لگا۔ اس نئے میلان کے سربراہ بھی اتر پردیش ہی سے اٹھے۔ قاضی عبد الغفار اسلوب کے اعتبار سے "رومانی" ہیں۔ ان کا جوشِ تخیل، ان کی شاعرانہ نثر، ان کی پر زور خطابت، ان کا بھرپور 'انا' اور ان کی بت شکنی سب میں رومان پرستوں کا سا انداز ہے مگر لیلیٰ کے خطوط محض جمال پرستی نہیں۔ اس میں انھوں نے ایک سماجی مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس آویزش کو پیش کیا ہے جو لیلیٰ کے سینے میں طوائف اور ماں، محبوبہ اور گھریلو عورت کے درمیان برپا ہے یا یوں کہیے کہ حسن اور اس کے سماجی روابط کے درمیان برپا ہے۔ اسی طرح مجنوں گورکھپوری کے افسانے، خصوصاً "زیدی کا حشر" اس بات کے گواہ ہیں کہ اب رومان پرستوں میں بھی سماجی معنویت کا احساس پیدا ہونے لگا تھا۔

ترقی پسند تحریک کی ابتدا بھی ۱۹۳۶ء میں اسی صوبے سے ہوئی۔ اس تحریک کے سرگرم کارکن بھی اسی صوبے کے لوگ تھے۔ سجاد ظہیر "لندن کی ایک رات" لکھ کر نام پیدا کر چکے تھے۔ اس تحریک نے اردو ادب کو ایک ایسے موڑ پر حقیقت نگاری سے روشناس کرایا جب وہ جمال پرستی کے سہارے بت شکنی اور عصبیت دشمنی کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ اپنے طور پر یلدرم، سجاد حسین اور نیاز فتحپوری بھی باغی تھے۔ اسی لیے ترقی پسندوں کے پہلے منشور پر دستخط کرنے والوں میں نیاز اور قاضی عبدالغفار کے نام بھی ملتے ہیں۔ مجنوں آگے چل کر ترقی پسند تنقید کے میدان میں نمایاں ہوئے۔ ترقی پسندوں کے اس قافلے میں لاتعداد نوجوان شاعر اور ادیب شامل ہوئے۔ "انگارے" شائع ہوئی جس کے افسانوں نے ملک میں زبردست ہیجان پیدا کر دیا۔ ان افسانوں میں بہ یک وقت مذہب، خدا اور سماج سے بیزاری اور جنسی معاملات سے کھلے عام دلچسپی کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے لکھنے والوں میں بھی اتر پردیش کے کئی نوجوان شامل تھے جن میں رشید جہاں اور سجاد ظہیر کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں جن نثر نگاروں کے نام سامنے آئے ان میں سبط حسن، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر عبدالعلیم نمایاں تھے۔ جوش ملیح آبادی نے کلیم نکالا۔ بعد کو سردار جعفری، مجاز اور سبط حسن کے اشتراک سے لکھنؤ سے نیا ادب جاری ہوا اور یہ نئی تحریک، نئے جوش و خروش سے آگے بڑھی۔ یہاں اس تحریک کے محاسن اور معائب سے بحث کرنا یا اس کے ادبی مرتبے کا تعین مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ ہر ادبی تحریک کی طرح اس میں بھی اتر پردیش کے فرزندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آزادی کے بعد اردو ادب کی مشاطگی میں اتر پردیش کے رہنے والوں کا حصہ کم نہیں ہوا۔ حصول آزادی سے قبل ہی ایسے ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد پیدا ہو چکی تھی جن میں بعض نے ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہ کر، بعض نے اس سے الگ رہ کر اپنے لیے ایک نہایت ممتاز ادبی مقام حاصل کر لیا تھا۔ ان میں ہر طرح کے لکھنے والے تھے۔ ترقی پسند تحریک کا زور زیادہ تر افسانوی اور تنقیدی ادب پر تھا، اسی لیے زیادہ تر افسانہ نگار ترقی پسند تصورات سے متاثر ہوئے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنا چراغ پریم چند کے چراغ سے جلایا تھا۔ ان میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حیات اللہ انصاری اور اختر انصاری نے ایک نئے انداز سے اس اثر کو قبول کیا۔ اختر انصاری یوں تو دہلی کے رہنے والے ہیں لیکن ان کا تعلق اتر پردیش سے بڑا گہرا اور پرانا ہے۔

تنقید کے میدان میں جعفر علی خاں اثر، نیاز فتحپوری، حامد حسن قادری، عبدالسلام ندوی، عبدالباری آسی، مرزا محمد عسکری، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ اور دوسرے متعدد حضرات قدیم طرز اسلوب کے امانت دار کہے جا سکتے ہیں۔ ان میں اثر صاحب نے ذوق سلیم اور روایت شعری کی روشنی میں بعض اصول تک پہنچنے کی بھی کوشش کی۔ حامد حسن قادری اور عبدالسلام ندوی کی خدمات مورخ ادب کی حیثیت سے ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا حسرت موہانی کے رسالے اردوئے معلیٰ اور ان کے مختصر رسائل کی اہمیت کا انکار ممکن نہیں۔ مولانا شاعر کی حیثیت سے تو ایک بلند پایہ مقام رکھتے ہی ہیں لیکن تنقید شعر میں بھی ان کا کارنامہ قابل لحاظ ہے۔ ترقی پسند تنقید کے جلو میں تنقید نگاروں کا جو قافلہ نمایاں ہوا ان میں مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، اعجاز حسین، احتشام حسین، آل احمد سرور، علی جواد زیدی، ممتاز حسین، مجتبیٰ حسین، عبادت بریلوی، خواجہ احمد فاروقی، وقار عظیم اور سردار جعفری کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض ایسے لوگوں کے نام بھی شامل ہیں جو اب اتر پردیش سے بہت دور ہیں لیکن ان کی تربیت اسی سرزمین میں ہوئی ہے اس لیے انھیں یہیں کا سمجھنا چاہیئے۔ تنقید نگاروں میں چار نام خاص طور سے قابل توجہ ہیں۔ مجنوں گورکھپوری، فراق، سید احتشام حسین اور آل احمد سرور۔ ان کے تنقیدی نظریات و اسالیب نے نئے دور کو متاثر کیا ہے۔

نئے لکھنے والوں میں خورشید الاسلام، باقر مہدی اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی تنقید نگار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا۔

تحقیق کی طرف ۱۹۴۷ء کے بعد خاص طور پر توجہ مبذول ہوئی۔ یوں تو جعفر علی خاں اثر، سید مسعود حسن رضوی اور امتیاز علی عرشی اس مبارک روایت کو قائم کر چکے تھے لیکن نئی نسل میں اسے مقبولیت اسی زمانے میں زیادہ حاصل ہوئی۔ سید مسعود حسن رضوی اور مولانا عرشی نے صحت متن، مقابلہ و موازنۂ مخطوطات، صحت روایات کے تعین کے اصول

کو پیش نظر رکھ کر اردو میں تحقیقاتی کام کیے۔ ان کے علاوہ اختر علی تلہری، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، خلیق احمد نظامی، صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر گیان چند جین، شاہ معین الدین، ڈاکٹر نذیر احمد نے تحقیق کے میدان میں آگے قدم بڑھائے اور متعدد علمی اور ادبی مسائل پر مقالے اور مضامین لکھے۔ لسانیات کے سلسلے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اردو زبان کے صوتیاتی تجزیہ اور دیگر لسانی مسائل پر مفید کام کیا۔ ڈاکٹر یوسف حسین، مصنف روح اقبال نے بھی ایک نئے انداز نظر کی بنیاد ڈالی اور اقبال کے فن پر نئے زاویے سے روشنی ڈالی۔

یوں تو رشید احمد صدیقی کا نام آتے ہی ذہن طنز و مزاح کی طرف منتقل ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ رشید صاحب کی سب سے زیادہ نمایاں حیثیت صاحب طرز انشا پرداز کی ہے۔ طنز یہ مزاح نگار کی حیثیت سے وہ بہ قول نیاز، ہمیں غور و فکر پر مجبور کرتے ہیں۔ صاحب طرز انشا پردازوں میں عبدالماجد دریابادی کو بھی شمار کرنا چاہیے۔ ایک اور اہم نام چودھری محمد علی مرحوم کا ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری اور مضمون نگاری میں ایک مخصوص اسلوب برقرار رکھا ہے۔ ان کی نثر میں ان کی شخصیت کا جادو ان کے ایک ایک لفظ میں بولتا ہے۔ ان کا طرز مزاح کی ایک ہلکی سی چاشنی سے آراستہ ہے۔

مزاح نگاروں میں ایک اور اہم نام شوکت تھانوی کا ہے۔ ان کے مضامین ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرتے تھے اور ان میں سے بعض میں ظرافت کے اعلیٰ عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ عہد حاضر میں فرقت کاکوروی اور بعض دوسرے مزاح نگاروں نے اس روایت کو قائم رکھا ہے۔

ذاکر صاحب نے بہت کم لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے اس میں بچوں کے ادب اور تعلیمی خطبات کا حصہ زیادہ ہے۔ بچوں کے لیے جو کہانیاں انھوں نے رقیہ ریحانہ کے نام سے لکھی تھیں ان میں بھی ان کی نثر کی شگفتگی قائم رہی۔

نئے لکھنے والوں میں کچھ اور بھی ہیں جن کی تحریروں کو حال ہی میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان میں سے اکثر اتر پردیش کی سرزمین سے متعلق ہیں۔

ڈرامے کو بھی افسانوی ادب ہی میں شامل کر لیا جائے تو اس میں بھی اتر پردیش کے مصنفین کے کارنامے قابل لحاظ ہیں۔ اردو کا پہلا ڈرامہ خواہ واجد علی شاہ کے "رادھا کنھیا کا قصہ" کو تسلیم کیا جائے یا امانت کی اندر سبھا کو دونوں اتر پردیش ہی میں لکھے گئے۔ اتر پردیش کے باہر جا کر جن مصنفوں نے اردو ڈراموں کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں احسن لکھنوی، بے تاب، طالب بنارسی اور خود آغا حشر (جو اپنے کو کاشمیری لکھتے تھے) سب اسی سرزمین سے متعلق تھے۔ جب اردو ڈرامے کا تعلق اسٹیج سے ٹوٹا اور علمی ادبی سیاسی اور سماجی مسائل کا عکس پڑنے لگا تو بھی عبدالماجد دریابادی نے "زود پشیماں" سے، نیاز اور مجنوں نے اپنے بعض تراجم سے اس سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

غرض تمام ادبی اصناف میں اس صوبے کے فرزندوں نے قابل لحاظ کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کا دامن عصبیت سے ہمیشہ پاک رہا ہے اس میں صوبائی تعصب اور تنگ نظری کے بجائے رواداری وسعت نظر کے آثار زیادہ نمایاں رہے ہیں۔ اس کی نثر عام طور پر زیادہ صاف سادہ اور رشستہ رہی ہے اور ابتدائی دور یا رومانی ادیبوں کی مختصر ٹولی کو چھوڑ کر نثر کا عام میلان "مغرس و معرب" عبارت کی طرف نہیں رہا۔ اسی طرح مغربی ادب کے اثر کے باوجود اتر پردیش میں مشرق اور خصوصاً ہند ایرانی روایت کا اثر زیادہ گہرا رہا ہے۔ اسی لیے ہم ادب میں گو تجربات کی لے اتر پردیش کے علاقے سے بھی اٹھی ہے مگر وہ کبھی روایت سے یکسر بے نیاز نہیں ہو سکا۔

آج ادبی ٹکسالوں کا زمانہ نہیں ہے۔ علاقائی حد بندیاں ٹوٹ چکی ہیں اور ملک صوبائی وحدتوں کے بجائے وسیع تر وحدتوں کے نقطۂ نظر سے سوچنے پر مجبور ہے۔ ساری دنیا ایک خاندان بنتی جا رہی ہے۔ عالمی تحریکوں کا اثر ہر ملک میں محسوس ہوتا ہے اور سارے صوبوں، ملکوں اور براعظموں کے باہمی ملاپ سے ایک عالمی تہذیب اور ایک عالمی طرز فکر کا جلد یا بدیر پیدا ہونا ناگزیر معلوم ہوتا ہے اس صورت حال میں ایک صوبے کے کارناموں کا شمار ایسا ہی ہے جیسے ایک کرن سورج کے ذخیرۂ نور میں اپنی ضو کا حساب کرے۔ یہ صوبہ بھی ایک عظیم تہذیبی کارواں کا حصہ ہے۔ اب یہ اس کے فرزندوں کا فریضہ ہے کہ وہ ماضی کی شاندار روایت کی روشنی میں مستقبل میں اپنے صوبے کے شایان شان خدمات انجام دیں۔

میرا وطن

سعادت نظیر

حکومتِ حیات میں جہانِ ممکنات میں
حدودِ شش جہات میں تمام کائنات میں

مرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمین ہے

یہ سقفِ انجم و قمر یہ منزلِ شب و سحر
یہ ارتقا کی رہ گزر یہ مرکزِ دل و نظر
یہ علم و فن کی انجمن یہ ارضِ حکمت و سخن
یہ "سورداس" کا گگن یہ "میر و داغ" کا چمن
یہ دل فروز مدرسے یہ "کام گھر" یہ محکمے
یہ مسجدیں یہ بت کدے یہ شان دار مقبرے
یہ مہر و مہ کا آستاں یہ "قطب بھاگ" کا مکاں
یہ "نل دمن" کا گلستاں یہ "ہیر رانجھے" کا جہاں
یہ شہر، گاؤں، بستیاں یہ رسمساتی وادیاں
یہ پستیاں، بلندیاں ہمالیہ کی چوٹیاں

یہ نقش سب وطن کے ہیں
یہ گل مرے چمن کے ہیں

ہر ایک پھول ہے حسیں نظر فروز و دل نشیں
فضا ہے کیف آفریں یہاں کہیں خزاں نہیں
کہیں پہ آبشار ہے کہیں پہ جوئے بار ہے
کہیں پہ سبزہ زار ہے چمن چمن بہار ہے
کلی کلی پہ تازگی نفس نفس میں راگنی
نظر نظر میں روشنی قدم قدم پہ زندگی
سبھی مگن ہیں بھاگ میں کھلے ہیں پھول آگ میں
لہک نئی ہے راگ میں بلندیاں ہیں بھاگ میں
پرند چہچہا اٹھے کہ باغ مسکرا اٹھے
کسان گنگنا اٹھے کہ کھیت لہلہا اٹھے

مرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمین ہے

وفا کا پاسبان ہے کہ قائل اک جہان ہے
عجیب اس کی شان ہے انوکھی آن بان ہے
سلامت اس کا بانکپن سلامت اس کی انجمن
نثار اس پہ جان و تن شگفتہ اس کا ہر چمن

مرا وطن حسین ہے
گلوں کی سرزمیں ہے

۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء

بگڑھ ۱۰۰۰۵

گلشن ہفت رنگ

عبدالقادر سروری

اردو ادب کی تاریخ میں کشمیر نژاد ادیبوں اور شاعروں کا بہت نمایاں مقام ہے۔ پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، ڈاکٹر سر محمد اقبال، پنڈت بشن نرائن در، پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت کشن پرشاد کول وغیرہ کے کارناموں کے تذکرے کی یہاں ضرورت نہیں، لیکن ان کی ایک خصوصیت کی طرف اشارہ کیے بغیر رہا نہیں جاسکتا کہ اس گل زمین کے سارے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ذہانت نے رفتارِ ادب کو نئی راہوں پر ڈالا، نئے موڑ عطا کیے اور فکر و ذہن کے لیے نئے منظر کھولے۔ کم و بیش یہی حال جموں کا بھی ہے۔ اس سرزمین نے بھی اردو کی عمدہ ادبی روایات کی پرورش کی۔ محمد عمر نور الٰہی کے کارنامے ناٹک ساگر نے ایسے وقت اردو ڈراما کے ماضی کے سرمائے اور مستقبل کے امکانات کی طرف اہلِ اردو کی توجہ منعطف کرائی جب کہ شاید بعض لوگوں کو اس کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ اردو ڈرامے کا بھی ایک ماضی ہے اور اس کے مستقبل کے امکانات روشن ہیں۔

ذہانت کی طرح 'ایک مہم پسند فطرت اور ایک بے چین طبیعت' بھی اہلِ کشمیر کے حصے میں آئی ہے۔ چنانچہ ان کے گروہ کے گروہ وطن سے نکلے اور کئی تہذیبی مرکزوں میں پھیل گئے۔ ان کی طبیعت کے جوہر وطن سے زیادہ پردیس میں چمکے۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور میں انھوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں، جو "کشمیری محلوں" کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔ دہلی اور لکھنؤ کو انھوں نے خاص طور پر اس لیے منتخب کیا کہ یہ اہلِ کمال کی بستیاں تھیں، اور کمال کی کسوٹی ہی پر ان کے جوہر بہ آسانی شائستہ پرکھے جاسکتے تھے۔ اردو تہذیب اور اردو کی ادبی روایات گویا ان کے خمیر میں تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ باہر کی ادبی فضا نے انھیں متاثر کیا لیکن یہ بھی غلط نہیں ہے کہ شائستہ ادبی روایات کو ترقی دینے میں ان کا بڑا حصہ رہا۔ نسیم نے ایک مخصوص اسلوبِ مثنوی نگاری کی داغ بیل ڈالی۔ سرشار نے ناول کی روایات کی نیو رکھی۔ چکبست فطری شاعری کو فروغ دینے والے شعرا کی صفِ اول میں ہیں اور قومی شعور اور وطنی روایات کو شعور کا روپ دینے میں بھی وہ سرِفہرست ہیں۔

کشمیر سے نکلے ہوئے خاندانوں میں سے ایک پنڈت امرناتھ ہالو آشفتہ کا خاندان بھی تھا۔ ان کے دادا کشمیر سے دہلی آئے تھے۔ ان کے شعر و سخن کے فطری ذوق کو دہلی کی صحبتوں نے اور بھی چمکا دیا۔ لالہ سری رام ان سے واقف تھے اور ان کا مختصر سا حال اپنے تذکرہ میں لکھا ہے۔ خمخانۂ جاوید کی تصنیف کے وقت اُن کی عمر پچاس برس کی تھی۔ اس حساب سے ان کا سن پیدائش ۱۸۲۵ء ہوتا ہے۔ اُس وقت وہ صوبہ پنجاب میں منصف کے عہدہ پر مامور۔ اور علی پور واقع ملتان میں متعین تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۵ء کے قریب ہوا۔

لالہ سری رام نے ان کے خاندانی نام "ہالو" کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھیں آشفتہ کی تصنیف گلشن ہفت رنگ کا بھی علم نہیں تھا۔ ان کی غزل گوئی کی لالہ نے دل کھول کر داد دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی مثنوی گلشن ہفت رنگ جس میں آشفتہ نے حاتم طائی کی مقبول داستان کو منظوم کیا ہے اُن کے دیوانِ غزلیات سے زیادہ اہم اور قابلِ ذکر کارنامہ ہے۔ یہ مثنوی آج سے کوئی تین چوتھائی صدی قبل چھپی تھی اور اتفاق سے ایک کشمیری ادیب پنڈت ہرگوپال خستہ نے اپنے مطبع رادی بینظیر میں اس کو چھاپا تھا۔ اب یہ کمیاب ہے۔ پنڈت ہرگوپال خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالگ رام تاک دونوں اردو کے ادیب اور شاعر تھے اور دونوں کے دونوں اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔

گلشن ہفت رنگ، ڈیمائی سائز کے ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے مثنوی میں اس صنف کی ساری روایات کی پوری نگہداشت کی گئی ہے۔ ہمارے قدیم اساتذہ نے بعض وقت روایاتِ شعر کی پابندی کو اس لیے ضروری سمجھا تھا کہ مقابلے سے ان کے جوہرِ طبع کا اندازہ بہتر طور پر ہوسکتا تھا ورنہ ان کی طبیعتیں جدت سے بالکلیہ بے گانہ نہیں تھیں، اور ہو بھی نہیں

سکتی تھیں۔ پنڈت آشفتہ کے یہاں بھی مثنوی کی مسلمہ روایات اسی لیے قابلِ احترام تھیں۔ چنانچہ مثنوی کا آغاز حمدِ باری سے ہوتا ہے پھر وہ بارگاہِ ایزدی میں مناجات پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد سببِ تالیف کی تفصیل، ایک اچھا خاصہ باب ہے۔ ایک عنوان "در بیانِ سخن" کا اور ایک اپنے استاد کی توصیف کا بھی ہے۔ اس کے بعد داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

قدیم مثنوی نگاری کے فن کو میر حسن نے معراجِ کمال پر پہنچا دیا تھا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ سحرالبیان کے بعد کوئی مثنوی اس پایہ کی نہیں لکھی گئی۔ اور جب مثنوی کا کوئی کارنامہ ہمارے سامنے آتا ہے، تو ہمارے ذہن میں منظوم داستان ہی کا تصور آتا ہے۔ ایسی منظوم داستان، جو ایک واضح اور مکمل قصے پر مشتمل ہو۔ ہر مثنوی کو اسی معیار پر جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

کارناموں کی مقبولیت اور شہرت کے اسباب کئی ہوتے ہیں۔ لیکن ایک بنیادی بات غالباً یہ ہے کہ ایک واضح موضوع، کارنامے کی کامیابی کی آدھی ضمانت ہے۔ باقی حسنِ اسلوب اور لطفِ زبان کا حصہ ہوتا ہے۔ مثنوی گلشنِ ہفت رنگ غالباً اسی لیے شہرت حاصل نہ کر سکی کہ یہ ہمارے قارئین کے روایتی معیار کے مطابق نہیں تھی، حالانکہ شعریت کے روایتی معیار کے اعتبار سے یہ مثنوی قطعاً کم رتبہ نہیں ہے۔ اس کا موضوع بھی واضح اور متعین ہے، گو یہ محض ایک واحد داستان نہیں۔ مصنف کو بیان پر بھی قدرت حاصل ہے، بلکہ میرے خیال میں اس کا اسلوب اِس کا زیادہ مستحق تھا کہ مثنوی کی شہرت کا باعث ہوتا۔

آشفتہ نے سببِ تالیف کے سلسلے میں اپنے جو حالات لکھے ہیں ان میں بتایا ہے کہ میرے بزرگوں کا اصلی وطن خطہ کشمیر ہے، لیکن میرے دادا نے دہلی کو اپنا وطن بنایا۔ دہلی اُس زمانے میں بڑی آباد تھی۔ اس کی عمارتوں کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ بچپن سے مجھے سیر تماشے کا شوق تھا۔ دن عید رات شبِ برات تھی۔ زندگی آرام سے بسر ہوتی تھی۔ دربارِ شاہی میں مجھے بار نصیب تھا اور فکرِ معیشت سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اگر کوئی فکر تھی، تو فکرِ شعر کی۔ اپنے زمانے کے شعرا سے میرے روابط تھے اور اکثر ان کی صحبتوں میں بسر ہوتی تھی۔ اربابِ نشاط کی محفلوں میں بھی اُن کا آنا جانا تھا۔ لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ "اُن کی اکثر غزلیں اربابِ نشاط کے منہ سے نکل کر موسیقی کی تاثیر کو دوبالا کرتی اور عاشق مزاجوں کو بن چھری ذبح کر دیتی ہیں۔" آشفتہ نے بھی اربابِ نشاط کی محفلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اربابِ نشاط ان کی غزلیں اکثر گایا کرتے تھے۔ لالہ سری رام کی فراخ دلانہ توصیف سے قطعِ نظر بھی، آشفتہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کے مدِ نظر، اس سے شاید انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غزل صاف ستھری کہہ لیتے تھے اور یہ غزلیں بعض حلقوں میں مقبول بھی تھیں ـــــ لیکن میری نظر میں ان کا زیادہ قابلِ اعتنا کارنامہ ان کی مثنوی ہے۔

آشفتہ نے لکھا ہے کہ زمانہ کا انقلاب ہوا، کئی مہینے تک ظلم و ستم کا سلسلہ جاری رہا اور "بیت الاساس" لُٹ گیا تو لوگ وطن کو خیرباد کہنے لگے۔ اسی زمانے میں میں نے یہ یادگارِ سخن لکھا۔ انھوں نے اپنے پنجاب جانے کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے، ممکن ہے، اسی زمانے میں وہ بھی ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہوں۔

انقلاب کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اب دنیائے دوں کی لگن دل سے دور ہونے لگی اور یہ خیال ذہن میں بس گیا کہ دنیا سے جی لگانا فضول ہے، کوئی سلسلہ ایسا نکالا چاہیے جس سے نام باقی رہ جائے۔ جب اس کارنامے کو نظم کرنے کا خیال آیا تو دل میں یہ بات بھی آئی کہ مجھے بیان پر قدرت نہیں، میں کاسدانِ سخن کا پس رو ہوں۔ اہلِ کمال کی نظر میں میری نظم کیا جچے گی!

اس کے بعد وہ سخن کے اعجاز بیان کرتے ہیں اور خدا سے تابِ سخن کی دعا کرتے ہیں۔ کچھ شعر حسبِ ذیل ہیں :۔

قدیمی بزرگوں کا اپنے وطن   وہ ہے خاص کشمیر رشکِ چمن

....

پر اب عہد جدی سے اپنا وطن   ہوا گلشن آباد ہے بے سخن

....

کہا جب سے پیدا ہوا سن تمیز   تماشوں میں گذری یہ عمرِ عزیز
نہ تھی کچھ بھی فکرِ معیشت مجھے   کہ تھی حسبِ قسمت فراغت مجھے
مجھے بار دربارِ شاہی میں تھا   مرا بہرہ سرکارِ شاہی میں تھا

ہر اک طرح کی گھر سے آسودگی　　سدا بہرہ ور نیند سے دل بستگی
یہاں بچہ سیر چمنوں میں بہلا دیا　　نہ تھا شعر گوئی سوا کوئی کام
سخن پروروں سے تھا مجھ کو ملنا　　شناسان معنی سے تھا مجھ کو کہنا

زمانے کے انقلاب کے بارے میں لکھتے ہیں :-

زمانہ کا ایسا ہوا انقلاب　　کہ وہ ہو گیا سارا نقشہ خراب
کئی ماہ پیہم تطاول رہا　　ترقی عالم تنزل رہا
غرض لٹ چکا جب بیت الاماں　　نہ آئی ہوائے وطن پھر تو راس
چلے چھوڑ کر سب دیارِ وطن　　کہ جیسے خزاں میں بہارِ چمن
جو اہلِ وطن ہو گئے بے وطن　　لکھا میں نے یہ یادگارِ سخن

اپنے نام اور لقب کا تذکرہ کرتے ہیں :-

کریں مجھ کو اہلِ وطن جب طلب　　کہیں ہیں امرناتھ ہالو لقب
اگر ہو کہیں محفلِ شاعری　　کہیں مجھ کو آشفتۂ دہلوی
جو ہو مجلسِ نغمۂ انبساط　　تو رنگیں پیا کہو یہی نشاط

آشفتہ حافظ قطب الدین تنویر کے شاگرد تھے۔ استاد سے انھیں بڑا اعتقاد تھا۔ چودہ شعر ان کی توصیف میں لکھے ہیں جن کا عنوان ہے :-

"در توصیف جناب فیض مآب استاد جامع الکمالات، حافظ قطب الدین صاحب متخلص بہ مشہور میاں خدا بخش صاحب تنویر"

استاد کی تعریف میں وہ اس طرح رطب اللسان ہیں :-

مناسب ہے اے کلکِ مدحت نگار　　کہ ہو وصفِ استادِ عالی تبار
کلیدِ درِ گنجِ علم و ہنر　　وہ ہیں منبعِ فیض و عالی گہر
سپہرِ سخن کے وہ ہیں آفتاب　　انھیں سے سخن پروراں فیض یاب
وہ ملکِ سخن میں رئیسِ سخن　　مضامیں فدا ان پہ شیدا سخن

مثنوی حمد، مناجات، 'سبب تالیف کتاب'، 'بیان سخن'، 'توصیف استاد' کے علاوہ 'ذکر حاتم طائی رئیس یمن' کی ایک مختصر تمہید اور سات حصوں کی تفصیل پر مشتمل ہے۔ آخری باب "بیان احوال شادی شاہزادہ منیر شامی اور حاتم کے اپنے وطن کو رخصت ہونے اور خاتمہ کتاب" کا ہے۔

مثنوی کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آشفتہ نہ صرف داستان گوئی کے لطف سے واقف تھے، بلکہ ان میں قدیم اساتذہ جیسی اچھی شعری صلاحیتیں موجود تھیں۔ بیان کے کلاسیکی انداز پر انھیں قابو حاصل تھا، اور حسنِ گفتار پر بھی وہ دسترس رکھتے تھے۔ عنوانات فارسی میں ہیں اور مثنوی کے مطالعے کے دوران میں کلاسیکی کارناموں کی فضا ذہن پر چھائی رہتی ہے۔

سبب تالیف کے سلسلے میں انھوں نے اپنے اصلی وطن کشمیر اور اختیاری وطن دہلی کی تعریف بھی لکھی ہے۔ دنیا کے حسین ملکوں میں سے شاید کشمیر شعرا کا سب سے زیادہ دل کش موضوع رہا ہے۔ محض فارسی شعرا نے اس سرزمین کی توصیف میں جو نظمیں لکھی ہیں، وہ ایک اچھی خاصی کتاب کی صورت میں جمع کی جا سکتی ہیں۔ اردو میں بھی کچھ کم شاعروں نے اس پر طبع آزمائی نہیں کی ہے۔ اس میں آشفتہ کا قلم بند کیا ہوا مرقع ایک مستحسن اضافہ ہے۔

وہ کشمیر ہے خطۂ دل پذیر　　فلک جس کو کہتا ہے جنت نظیر
وہاں قدر جو لالہ رونق پذیر　　وہاں فیضِ شادابی جوئے شیر
وہ آبِ رواں تازگی رواں　　ملے جس سے داغِ دلِ عاصیاں
خدا نے کیا اس کو قدسی اساس　　کہ جیسے وہ ہے دیوتاؤں کا باس
وہ ہو سرزمیں پر تقدس تمام　　کہ ہی اس میں روحانیوں کا مقام
سراسر ہوا وہ گل زمیں صاف و پاک　　وہ پر نور ہوا از سمک تا سماک
غرض موجدِ عقل ہے مرز بوم　　وہیں سے ہیں ایجاد جملہ علوم

آشفتہ کا دہلی کا بیان، رجب علی بیگ سرور کے لکھنؤ کے بیان کی یاد ذہن میں تازہ کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں :-

عجب پُر فضا گلشنِ لالہ زار　　وہ دلی کہ دلہا ہے صد باغ و بہار
مصفا در و بام رنگیں تمام　　ہر اک خشت پر لاجوردی کا کام
ہر اک ریختہ گچ کے دیوار و در　　صفائی سے نقش میں پائے نظر
وہ رستہ وہ بازار رشکِ قصور　　دکانیں ہر اک کہ بین السطور
وہ نہر ایسی بازار کے درمیاں　　فلک پر ہو جیسے خطِ کہکشاں
صفائی ہر ایک شے میں ایسی ظہور　　نظر کو طراوت ہو آنکھوں کو نور
طرحدار کمرے سرِ رہ گذر　　اور ان میں وہ رشکِ پری جلوہ گر
وہ ڈھلتے ہی دن ان کا آ بیٹھنا　　وہ جوبن کی رنگت جما بیٹھنا
گیا جنس سوئے بازار جو　　رہا بس وہیں نقشِ دیوار ہو
وہ گذری کا عالم وہ ٹھنڈی سڑک　　مٹے جس سے تفتہ دلوں کی دھڑک

نرالا تھا ہر ایک سے ایک کا ہر اک اپنی اپنی طرح خوشنما
عجب نمو میں ہے کرامت نما گویا ہند کی ہو وہ جائے نخاد
دہاں کی کھو ں کیا عجب ہے زباں کہ تنگ دہن گویا شکر فشاں
وہ گفتار شیریں وہ رمز سخن فصاحت طلب شاعران زمن
وہ تھیر یاؤ ستوں کا اور وہ ترّی وہ آنکھوں میں ٹھنڈک کی جلوہ گری
وہ تیرتھ کہ یا کٹوروں میں آب لبالب ہوں جوں چشمۂ آفتاب
سر چوک وہ ساقیوں کی قطار وہ حقوں کے دھوئیں بوا مشک بار
صف گل فروش ایک شو پُر فضا گویا نکہت گلشن دل کشا
وہ گجرے وہ کنٹھے وہ پھولوں کے ہار کہ قرباں ہو جس پر نسیم بہار
وہ میوہ فروشوں کی دینی صدا ہوا انگور کا رنگترے میں مزا
گنڈیری فروشوں کے شیریں کلام وہ رس وار مصری کی ڈلیاں تمام
عجب سوہن حلوا کا شیریں مزا ملے اور شہروں میں ممکن ہو کیا
وہ شیرینیوں کے عجب ذائقے کہ ہیروں تلک ہونٹ چاٹا کرے

یقیناً آشفتہ کے ذہن میں تیرو رکا کھینچا ہوا لکھنؤ کا نقشہ تھا، جب یہ شعر ان کے قلم سے نکل رہے تھے۔

نہیں تھا یہی لکھنؤ کی سی شان کہ بیچے تو پکوان اونچی دکان
وہ لچھے وہ برفی، قلاقند و قند کہ ہو جائیں لب جس سے مصری کے بند
وہ بیسن کی وہ کھر چن اور روغنیات کہ ہوں جس سے تحفہ کے پیڑے بھی مات
وہ کوٹھوں پہ تعلیم اہل نشاط شاہد وہ تسلیم اہل نشاط
خوش گلو وہ صدائے بتاں نیازی ہوئی دل کش عاشقاں
کیا بے نیازی نے کار نیاز ہوا اک محبت کا رستہ دراز
وہ پل پر پری پیکروں کا ہجوم پرستاں کا عالم ساحت کی دھوم
وہ اتوار کی سیر رشک چمن وہ طغیانی آب رود چمن
وہ مندروں کا میلوں میں روز و شب وہ مے خانوں میں مے پرستوں کا جوش
کہیں عرس درگاہ صاحب کمال کہیں وجد میں صوفیوں کا وہ حال
وہ برسات میں پھول والوں کی سیر عجب دلکشا جھالوں کی سیر
وہ پنکھے کا چڑھنا بہ مستی بھرا وہ شہنائیوں سے صدائے طرب
وہ موسم بہاری وہ آواز طیر وہ چکھوں سے آگے تفنگوں کے فیر
چھٹائی کے میلے وہ چھڑیوں کی دھوم وہ درگاہ میں ستر دیں کا ہجوم

وہ رقص اولیاؤں کی درگاہ میں کہ ہوں جیسے جیسے کہیں بیاہ میں
بسنتوں کے میلے بسنتی لباس وہ بزم ہولیوں کی ست اساس
وہ سلطان جی اور بنی جی کریم وہ بارہ دفاتوں کے میلے عظیم
نہ ہے طالع و بخت و قسمت نصیب تماشوں میں سیر زیارت نصیب
وہاں کا اگر حال کیجیے بیاں نہ ہوئے کبھی ختم یہ داستاں

یہ تفصیلات دل چسپ بھی ہیں اور معلومات آفریں بھی۔ یہ شاعر کے عہد کی دہلی کا ایک جیتا جاگتا مرقع ہے۔ یہ تفصیل اگر جزئیات پر زیادہ حاوی ہوتی، تو دہلی کے مرقع کے طور پر کلاسیکی مقام حاصل کر لیتی۔ بہ حالت موجودہ بھی، یہ پڑھنے کے قابل ہے۔

سخن کی تعریف میں وہ لفظ سخن کو شاعری اور کلام دونوں معنوں میں برتتے ہیں۔ اس بیان کے آخر میں خدا سے اپنے لیے تاب سخن کی التجا خدا سے کرتے ہیں:

الٰہی مجھے دے وہ تاب سخن کروں جس سے میں انتخاب سخن
الٰہی تو ہو نطق بخشش زباں تو دے بے زباں کو زبان بیاں
الٰہی مجھے ربط تقدیر دے قلم کو وہ یارائے تقریر دے
الٰہی وہ دے مجھ کو زور کلام کروں جس سے حاتم کا قصہ تمام
کروں تر زبان و کویں ریختہ دل ناظریں تا ہو آویختہ
میں کم مایہ اور داستاں ہو طویل یہ فکر جہاں چند و فرصت قلیل

مثنوی میں شاعری کا حُسن، بیان کی خوبی اور تفصیل نگاری کی مہارت دونوں سے بڑھتا ہے۔ آشفتہ کے بیان کا انداز میر حسن سے زیادہ متاثر ہے، حالانکہ وہ نسیم سے زیادہ قریب تھے۔ سادگی زبان اور سادگی بیان، ان کی خصوصیت ہے۔ نسیم کا پرتو اگر کہیں ان پر پڑا ہے تو کچھ بگڑ پڑا ہے۔ بحر انھوں نے سحر البیان ہی کی اختیار کی ہے۔

گلشن ہفت رنگ سے مرقع نگاری کا یہ نمونہ شاعر کی جزئیات نگاری اور روانی بیان کے اندازہ کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ شاہ خراسان کی فوج کا یہ نقشہ ہے:۔

مظفر وہ بانکی دلاور سپاہ گویا دل کی دل جیسے ابر سیاہ
سواروں کا دستہ پیادوں کی فوج ظفر مند و نصرت اثر موج موج
ہر اک لشکری اس کا جیسے دلیر کہے عرصۂ رزم میں کار شیر

وہ زنجیر فیلاں کہ فتح کفیل　　سمندوں کی تیزی صبا کی دلیل

بہر زرغ سوداگر انتقال کے وقت اپنی لڑکی کو معہ مال و متاع بادشاہ کے سپرد کرتا ہے۔ باپ کے انتقال کے کچھ دن بعد، لڑکی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی اور دایہ سے مشورہ کرتی ہے:۔

کہا ایک دن دایہ سے ناگہاں　　کہ اے میری مادر مہرباں
نہیں دار فانی کا کچھ اعتبار　　نہیں ایک سی دیکھی لیل و نہار
کبھی کی صدا زندگانی نہیں　　کسی کو یہاں جاودانی نہیں
یہ دولت جو ہے پاس بے انتہا　　کروں صرف اس کو براہ خدا
مگر ڈھنگ ایسا نکالو کوئی　　کہ تا ہووے دنیا سے دامن کشی
تھا ایسی تدبیر اسے ہوشیار　　رہوں لوٹ دنیا سے تارستگار

بادشاہ نے جب سوداگر کی لڑکی کو شہر بدر کر دیا، تو اس کی جو حالت ہوئی اس کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے:۔

یہ باغ وطن سے چلی زار و زار　　کہ جیسے خزاں میں گل نوبہار
جو بیٹھے بٹھائے مصیبت پڑی　　تحیر کے عالم میں ششدر رہی
سرشک اس کی آنکھوں سے یوں ڈھل چلے　　کہ جوں موتیوں کے منہ کھل گئے
وہ اس ڈھب سے رونے لگی زار زار　　ہوا کہکشاں سو فلک سینہ چاک
ہوئے خشک لب چشم تر ہو گئے زرد　　جگر میں خلش غم سو پہلو میں درد
جو رخسار گلگوں تھے نازک تمام　　ہوئے دھوپ کی تاب سو مشک فام
جو لغزش سو چلنے کی عادت نہ تھی　　مصیبت کی ماری چلی بیٹھتی
قدم لڑکھڑاتے سر گام گام　　سنبھلتی تھی گر گر کے گھٹنوں کو تھام

رزمیہ شاعری کی طرح، مثنوی کی شاعری کی بھی کئی جہات ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک مکالمے بھی ہیں۔ گلشن ہفت رنگ کے مکالموں میں موقع محل کی موزونیت کے علاوہ بول چال کی راست زبان کی ساری خصوصیات موجود ہیں۔ حسن بانو کے سوالات کا جواب دینے کے مقصد سے شہزادہ خوارزم آتا ہے۔ حسن بانو سے اس کے سوال جواب ہوتے ہیں:۔

جو پہنچا پس پردہ در تلک　　کہا حسن بانو نے ہو بے دھڑک
کہو کون ہو کس لئے آئے ہو　　کہ یا کچھ کسی کی خبر لائے ہو
کہا بندہ ہوں مہر شاہی ہے نام　　مجھے اپنا ہی آپ سمجھیں غلام
جگر گوشہ شاہ خوارزم ہوں　　پہ رکھتا ترے وصل کا عزم ہوں

دیا حسن بانو نے اس کو جواب　　کہ اے صاحب عشق خانہ خراب
یہ ہے بوالہوس تیرا باطل خیال　　مرا ہاتھ آنا بہت ہے محال
عبث لے جاں تو گرفتار ہے　　کہ حل سوالات دشوار ہے

آشفتہ کے زمانے میں نسیم کی مثنوی کی بھی کافی شہرت تھی اس مثنوی کو خواہ مخواہ سحر البیان سے ٹکرایا گیا۔ چونکہ سحر مقبولیت حاصل ہو چکی تھی اور گلزار نسیم، سحر البیان نہیں اس لیے گلزار نسیم کا حسن اور خوبی معرض بحث میں آ گئی: کہ گلزار نسیم کا فن سحر البیان سے مختلف ہے، اور اسے سے جانچنا چاہیے۔ گلزار نسیم کا آرٹ، اس کا ایجاز ہے اور ساتھ لفظی رعایتیں، اس کے آرٹ کو ایک پیچیدہ آرٹ بنا دیتی نگاری بھی ایک آرٹ ہے، اور اس کے حسن استعمال کے لیے ذہنیت درکار ہے۔ یہ نسیم کی خصوصیت تھی۔ اسی کا پرتو گلشن میں بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ مثلاً

کہا اس نے یا مرد، کہو تو سہی　　یہ کیوں گریہ و زار ہے کچھ کہو
کہا سن کے حاتم نے توبہ کرو　　یہ تم کیسے کافر مسلمان
کئی ماہ پیہم تطاول رہا　　ترقی عالم تنزل
نہیں جیب اعمال میں یک درم　　کہ ملے جس سو ہو راہ سخت
عبارت کو ہم سلک موزوں کروں　　ڈر نثر کو جلوۂ نظم
کروں نثر اردو کو میں ریختہ　　دل ناظریں تا ہو آویختہ

لیکن گلزار نسیم کے پیچیدہ آرٹ کے مقابلے میں، یہ انداز ہلکا۔ اردو کی اچھی مثنویوں کا ایک اہم پہلو ان کے وہ اشعار ہیں، جن میں کائناتی صداقتیں موجود ہوتی ہیں اور حقائق کے اظہار ہیں۔ گلشن ہفت رنگ میں بھی ایسے اشعار کافی مل جاتے ہیں زندگی اور کائنات کے مضامین بندھے ہیں۔ کچھ مثالیں یہاں پیش

یہ دنیا نہیں کچھ بھی جائے قیام　　فقط آمد و رفت کا ہے مقام
بھروسا ہے کیا اپنے دم کا یہاں　　جو کچھ آج حاصل ہو سو کل کہاں
کسی کی سدا زندگانی نہیں　　کسی کو یہاں جاودانی نہیں
نہیں دار فانی کا کچھ اعتبار
نہیں ایک سی دیکھی لیل و نہار

غزل

نشور واحدی

شیشوں میں شرابِ سحر و شام پڑی ہے — اے ساقیِ مے خانہ تری بات بڑی ہے

یہ شام بھی تاریخِ شبِ غم کی کڑی ہے — ہر ایک ستارے سے یہاں آنکھ لڑی ہے

ہر لحظہ یہاں تُلتے ہیں اعمالِ خلائق — ہر لمحہ یہاں جیسے قیامت کی گھڑی ہے

تو دَورِ خزاں دیکھ کے بھولی ہو ہر اک شاخ — غنچوں کی یہاں عمر بہاروں سے بڑی ہے

یہ خاکِ کفِ پا ہو، مٹائے نہ مٹے گی — تو کس لیے اے گردشِ تقدیر، اَڑی ہے

اے گوشہ نشینانِ زیارت گہِ تہذیب — نکلو، کہ یہاں فصلِ جنوں اب بھی کھڑی ہے

ممکن ہے کہ یہ تیر نشانے پہ نہ پہنچے — بازو میں سکت کم ہے کماں اپنی کڑی ہے

گُل اپنے تبسّم میں مگن ہیں تو کہوں کیا — غنچوں کو کہاں یاد کہ اُس لب پہ دھڑی ہے

شاعر ہے نشور آج زمانے کا پیمبر

خاموش کہ اس دَور میں یہ بات بڑی ہے

سیاسی آزادی سے معاشی آزادی کی طرف

عشرت علی صدیقی

آزاد ہندستان کے آئین میں جس کا نفاذ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے شروع ہوا ہے، سرکاری پالیسی کے ہدایتی اصول بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ریاست عوام کی فلاح کے لیے کوشش کرے گی اور اس کے لیے ایک ایسے سماجی نظام کے قیام اور استحکام کا انتظام کرے گی جس میں سماجی معاشی اور سیاسی انصاف قومی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و ساری ہو۔ آگے چل کر اس کوشش کی صراحت اس طرح کی گئی ہے کہ ریاست اپنی پالیسی اس طرح بنائے گی کہ۔

"(ا) تمام شہریوں کو جن میں مردوں اور عورتوں کی مساوی حیثیت ہوگی، گزربسر کے کافی ذرایع حاصل کرنے کا حق مل جائے۔

"(ب) قوم کے مادی ذرایع کی ملکیت اور کنٹرول کو اس طرح تقسیم کیا جائے کہ سب کا بھلا ہو۔

"(ج) معاشی نظام کی کارکردگی کا یہ نتیجہ نہ ہو کہ دولت اور پیداوار کے ذرایع کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو جائیں اور مشترکہ مفاد کو نقصان پہنچے۔"

پھر جب دسمبر ۱۹۵۴ء میں پارلیمنٹ نے "سوشلسٹ نمونے کے سماج" کو سماجی اور معاشی پالیسی کا نصب العین قرار دے کر ان اصولوں کو ایک ٹھوس شکل دے دی تو ترقیاتی منصوبوں کی سوشلسٹ رنگت نمایاں ہو گئی۔ اس طرح ترقی کا مقصد پیداوار میں اضافہ اور نئے کارخانوں کے قیام تک محدود نہیں رہا۔ اگر پنج سالہ منصوبوں کو انھیں باتوں تک محدود رکھا جاتا تو ترقی کے ساتھ ساتھ دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو جاتی۔ امیر اور زیادہ امیر اور غریب اور زیادہ غریب ہو جاتے، منافع کا حصول معاشی سرگرمیوں کا اصل محرک بن جاتا اور سماج میں خودغرضی آجاتی۔ ایسی ترقی محض سطحی ہوتی اور ملک کو سیاسی آزادی حاصل ہو جانے کے باوجود عوام معاشی آزادی سے محروم رہتے۔ یہ صورت حال سیاسی آزادی کے حق میں بھی مضر ہوتی اس لیے کہ سیاسی آزادی محض ایک مقصد نہیں بلکہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ بھی ہے اور وہ مقصد ہے سماجی اور معاشی آزادی کا حصول سوشلزم۔ تب اور اب۔

اس مقصد کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں نے کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں اور سوشلزم کی آواز دوسرے ملکوں میں بھی اٹھائی جا چکی ہے۔ مارکس کے نظریے اور بعض ملکوں کے تجربے نے اسے ایک اصطلاحی اور عملی شکل دے دی ہے۔ اس اصطلاح میں ایک طرح کا کٹرپن آگیا ہے اور سوشلزم کے بعض علمبرداروں نے اسے ایک ترقی پذیر اور حقیقت پسند نظام کے بجائے جامد اصولوں کا ایک مجموعہ بنا دیا ہے۔ ہندستان نے سوشلزم کو اس کے نادان دوستوں اور خودغرض دشمنوں دونوں سے نجات دلانے کی کوشش کی ہے۔

مارکس کا نظریہ اس زمانے کے حالات پر مبنی تھا جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تھا۔ وہ قلت اور مسابقت کا زمانہ تھا اور سیاسی سماجی اور معاشی تبدیلی کے لیے تشدد کو واحد راستہ خیال کیا جاتا تھا۔ مادی ترقی کو منزل مقصود سمجھا جاتا تھا اور انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس لیے سوشلزم کے ابتدائی تصور میں بھی ان شعبوں کو نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ مقصد کو ذرایع پر اولیت دی جاتی تھی اور ذرایع کے اچھے یا برے ہونے کی کوئی خاص پروا نہیں کی جاتی تھی۔ یہ رجحان یورپ کے اس زمانے کے حالات کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔

ہندستان اگرچہ اپنی آزادی کے بعد صنعتی انقلاب کے دور میں نیا نیا داخل ہو رہا تھا مگر اس کے حالات یورپ کے سابقہ حالات سے مختلف تھے۔ دنیا میں جمہوریت جنم لے چکی تھی اور حکومتوں کی پرامن تبدیلی کی راہ نکل آئی تھی۔ چنانچہ ہندستان نے بڑے پیمانے پر تشدد استعمال کیے بغیر اپنی آزادی حاصل کر لی تھی۔ اس کے قومی مزاج میں مادیت کے علاوہ روحانیت کا جز بھی شامل تھا۔ اخلاقی قدروں کو زمانۂ قدیم سے جو اہمیت حاصل تھی اسے ختم کر دینے کی کوشش اول تو کامیاب نہ ہوتی اور دوسرے ایسی کوشش سے ہندستانی سماج کی جڑیں کمزور ہو جاتیں۔ بیسویں صدی کے مادی حالات بھی انگلستان کے صنعتی انقلاب کے زمانے والے حالات سے مختلف ہیں۔ اگرچہ قلت اور مسابقت اس وقت بھی پائی جاتی ہے مگر سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے افراط کے امکانات پیدا کر دیے ہیں۔ ان نئے حالات میں سوشلزم کو ایک نیا مفہوم حاصل ہو گیا ہے۔

اور اس کے حصول کے لیے نئی راہیں نکل آئی ہیں۔ جن ملکوں نے سوشلزم کے پرانے مفہوم کو مشعل راہ بنایا تھا اور اسے پرانے ڈھنگ پر حاصل کرنے کی کوشش کی تھی ان میں سے بیشتر اب یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اسے نئے ڈھنگ سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ تشدد سوشلزم کے حصول کا واحد ذریعہ نہیں رہ گیا ہے اور ہندستان نے اسے جمہوری اور پرامن طریقوں سے حاصل کرنے کا جو بیڑا اٹھایا ہے وہ اس ملک ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں ایک نئے تجربے کی نشان دہی کرتا ہے جس کے نتائج بہت ہی دور رس ہوں گے۔

اخلاقی قدروں اور جمہوری طریقوں کو اہمیت دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض اخلاقیات کے پرچار پر اکتفا کیا جائے اور سماج کی تبدیلی کے لیے صرف اس پرچار پر انحصار کیا جائے۔ جیسا کہ گاندھی جی نے کہا تھا بھوکے آدمی کو خدا بھی روٹی کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد محض روٹی کا حصول نہیں ہے۔ مگر یہ بھی صحیح ہے کہ روٹی کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اور اسی لیے ملک کے تمام رہنے والوں کے لیے کھانے کپڑے مکان تعلیم و دوا علاج کی سہولتوں کا بندوبست ترقیاتی منصوبوں اور سوشلسٹ منصوبہ بندی کا بنیادی مقصد ہے۔ اس مقصد کو اولیت حاصل ہو جانے سے ملک کی سیاست معاشی پالیسیوں کے محور پر گھومنے لگی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوگوں کے دماغ فروعی باتوں کی طرف سے ہٹنے لگے ہیں۔

جمہوریت کی ضرورت۔

ایسی باتیں ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں اور جمہوری ڈھنگ سے جو تبدیلیاں آتی ہیں وہ تدریجی ہوتی ہیں۔ تبدیلیوں کی سست رفتاری بعض اوقات کھلنے لگتی ہے۔ لیکن جمہوری طریقوں کے بالائے طاق رکھ دیے جانے سے بہت سی دوسری خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ ایک دو اور ایک فوجی ڈکٹیٹرشپ بن جاتی ہے۔ اور کوئی پارٹی گروہ یا فرد اپنے ارادے اور عمل کے اعتبار سے چاہے جتنا نیک ہو مگر اقتدار کے اس کے ہاتھوں میں مستقل طور پر مرکوز ہو جانے سے دوسرے لوگوں میں محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ڈکٹیٹر اس بات کی ضمانت نہیں کر سکتا کہ اگر وہ نیک ہے تو اس کے جانشین بھی نیک ہوں گے۔ اسی لیے مطلق العنان وراثتی بادشاہت کا رواج تیزی سے ختم ہو رہا ہے اور حکومتوں کو بنانے اور بگاڑنے کا اختیار عوام کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ ہندستان کے آئین میں جسے عوام کے منتخب نمائندوں نے تیار کیا ہے عوام ہی کو اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے اور اس طرح جمہوریت آئین کا ایک بنیادی ستون بن گئی ہے۔ سب لوگوں کو جماعت سازی کی اور سب جماعتوں کو اظہار خیال کی آزادی حاصل ہے۔ اگرچہ اس آزادی کا استعمال بعض اوقات نامناسب طور سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر انسان نقصان اٹھا کر جو سبق سیکھتا ہے وہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتا ہے اور مختلف جماعتوں کی آویزش سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ زیادہ مستحکم ہوتا ہے۔ آزادانہ الکشن میں جسے جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے، سب جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر عوام کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اس طرح عوام کو مختلف راہوں کا جائزہ لے کر ان میں سے ایک کے انتخاب کا موقع مل جاتا ہے۔ بعض اوقات ان کو چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھانے اور بنیادی مسئلوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن معاشی مسئلوں کو اولیت حاصل ہو جانے سے اس کوشش کی ڈھٹائی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور مذہبی، نسلی، علاقائی اور لسانی تعصبات کے پھیلنے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

دو طرفہ تائید۔

جب عوام کی نظروں میں معاشی مسئلوں کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ ہر نعرے اور ہر پروگرام کو اس کسوٹی پر کسنے لگتے ہیں کہ اس کے معاشی مضمرات کیا ہوں گے۔ اس طرح کھوٹے کھرے کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے سوشلزم کی براہ راست مخالفت کم ہوتی جا رہی ہے اور جو لوگ سوشلسٹ اصطلاحات سے بدکتے ہیں وہ بھی سوشلسٹ مقاصد کی مخالفت زیادہ شدت سے نہیں کر پاتے۔ عوام میں ان مقاصد کی مقبولیت مسلم ہے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے منصوبہ بندی کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اسے دنیا کے سوشلسٹ اور غیر سوشلسٹ دونوں طرح کے ملکوں کی تائید اور تعاون حاصل ہے۔ یہ دو طرفہ تعاون اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ ہندستان کے سوشلزم کی نوعیت تقلیدی نہیں بلکہ اجتہادی ہے۔ اس میں تنگ نظری نہیں بلکہ وسیع النظری ہے۔ اور مروجہ کتابی نظریوں کو نہیں بلکہ حالات کے تقاضوں اور موجودہ حقیقتوں کو دیکھا جاتا ہے۔

ان تقاضوں اور حقیقتوں کے احساس نے منصوبہ بندی کو ایک طرح سے علم ریاضی کا حل بنا دیا ہے۔ رقموں کے جوڑ گھٹاؤ اور ضرب تقسیم کے اعتبار سے نہیں بلکہ نشانوں کے تعین اور ان کے حصول کی تدابیر کے اعتبار سے۔

یعنی یہ بات واضح طور پر دیکھ لی جاتی ہے کہ ملک کی ضروریات کیا ہیں، اس کے ذرائع کتنے ہیں، کس کام کا کیا نتیجہ نکلے گا، اور ایک قدم کے بعد دوسرا قدم کیا ہونا چاہیے۔ ہندوستان کی بیشتر آبادی کا انحصار زراعت پر ہے اور اس لیے پہلے پانچ سالہ منصوبے میں زراعت کی اصلاح و ترقی کو اولیت حاصل ہونا ایک قدرتی چیز تھا۔ زراعت کی یہ اہمیت تیسرے منصوبے میں بھی تسلیم کی گئی ہے اور اجتماعی ترقی کے پروگرام میں جو دوسرے پانچ سالہ منصوبہ کے دوران شروع ہوا تھا اب زراعت کی ترقی کو مرکزی حیثیت دے دی گئی ہے۔ لیکن آج کی دنیا میں خوش حالی، افراط اور معاشی استحکام صنعتی ترقی کے بغیر ناممکن ہے اسی لیے دوسرے منصوبے سے صنعتوں، خاص کر بھاری اور بنیادی صنعتوں کو جن سے دوسری صنعتیں ترقی کرتی ہیں اہمیت دی جانے لگی۔ فولاد سازی، مشین سازی، تیل کی تلاش اور بجلی پیدا کرنے اور کارخانوں کے قیام میں جو ترقی ہوئی ہے وہ منصوبہ کی صنعتی ترقی کی نشان دہی کرتی ہے۔

قومی دائرہ کار کیوں؟

بہت سے کارخانے۔ خاص کر جہاں تک بھاری صنعتوں کا تعلق ہے۔ حکومت کی طرف سے کھولے گئے ہیں اور اس دائرہ کار کو سرکاری یا قومی دائرہ کار کہا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے کاروبار چند افراد کی نجی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہوتے ہیں۔ اس طرح کے قومی ملکیت والے کاروباری اور صنعتی ادارے صرف سوشلسٹ بلکہ غیر سوشلسٹ ملکوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ہندوستان میں بھی آزادی سے پہلے ریلوے اور اسلحہ سازی سرکاری دائرۂ کار میں شامل تھی۔ ایسے ادارے سرکاری یا قومی دائرہ کار میں اپنی بنیادی اہمیت کی بنا پر رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ایسے اقدامات کے بعض دوسرے اسباب بھی رہے ہیں۔ یہاں عوام کی طرح خواص کے مالی ذرائع بھی بہت ہی محدود ہیں۔ اس طرح اگر بھاری صنعتوں کے قیام کا پروگرام محض نجی دائرہ کار میں چھوڑ دیا جاتا تو وہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکتا تھا۔ ذرائع کی کمی کی علاوہ متوقع منافع کی کمی اور اس کے حصول میں تاخیر بھی سرمایہ لگانے والوں کو بعض اہم صنعتوں کی طرف سے بے پروا رکھتی۔ یہ بات قیاس پر نہیں بلکہ تجربوں پر مبنی ہے۔

سرمایہ لگانے والوں کو پہلی فکر اپنے منافع کی ہوتی ہے۔ اور اگرچہ ان کے منافع کا ایک حصہ ٹیکس کی شکل میں حکومت کی معرفت عوام پر خرچ ہو جاتا ہے لیکن ٹیکس کی پوری ادائی نہ ہونے اور بعض دوسری وجہوں سے ان کو زیادہ منافع کمانے کا موقع ملتا رہتا جس سے امیروں کی غریبوں کی خوبی بڑھتی رہتی اور پیداوار میں اضافے کے باوجود پسماندگی باقی رہتی۔ قومی دائرہ کار میں توسیع کی پالیسی ترقی کے پن کو روکنے کے لیے اختیار کی گئی ہے۔

نابرابری کا علاج

اس سے نابرابری کو کم کرنے میں کئی طرح سے مدد ملے گی۔ تو بھاری صنعتوں اور ان سے فروغ پانے والی دوسری صنعتوں سے لوگوں کو روزگار مل جائے گا اور دوسرے قومی ملکیت والے کاروباری اداروں کا سارا منافع حکومت کی معرفت ملک کی صرف ہوگا۔ یہ بات بجلی اور فولاد کے کارخانوں، تیز اسٹیٹ ٹریڈنگ کے قیام اور اسٹیٹ بینک اور زندگی بیمہ کے کاروبار کے قومی ملکیت لیے جانے کے تجربوں سے پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ ملک کی آمدنی میں حکومت کا حصہ جو ۱۹۶۰ء میں ۲ فی صدی سے کم تھا منصوبے کے اختتام تک تقریباً ۲۵ فی صدی ہو جائے گا اور ... کے میدان میں یہ ایک تہائی سے اوپر نکل جائے گا جبکہ پہلے آغاز میں اس کا تناسب دسویں حصے سے بھی کم تھا۔

قومی دائرۂ کار کی توسیع پر زور دیتے ہوئے تیسرے منصوبہ میں کہا گیا ہے کہ "جیسے جیسے قومی دائرہ کار کا تناسب بڑھتا ویسے ہی ویسے معاشی ترقی میں اس کی اہمیت بڑھتی جائے (حکومت) کو اس بات کا پہلے سے زیادہ موقع مل سکے گا کہ نظام کی نوعیت اور کارکردگی کا تعین کر سکے"۔

پچھلے سال کمپنیوں کو دیے جانے والے سرکاری قرضوں کو بدل لینے کا جو اختیار حکومت نے ایک قانون کے ذریعے حاصل کیا سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ایک فلاحی ریاست میں عوام کے محافظ کی حیثیت سے حکومت کو یہ مواقع حاصل ہونا ہی چاہیے۔ سلسلے میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ریاست کا ملک کے باشندے، حکومت کوئی زبردستی مسلط ہو جانے والا عوام کا اپنا منتخب کیا ہوا ایک ادارہ ہے جسے انھوں نے اپنے

مؤثر کیا ہے اور اسی طرح برطرف بھی کر سکتے ہیں۔ اس طرح ایک آزاد ملک میں سرکاری دائرہ کار کی توسیع ایک مطلق العنان ملک میں ہونے والی اس قسم کی کارروائی سے سو فی صدی مختلف شے ہے۔ اس توسیع کو فاشسٹ کارروائی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

نجی دائرہ کار کی آمد

ہندستان کی منصوبہ بندی میں قومی دائرہ کار کی توسیع کے باوجود معاشی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ نجی دائرہ کار کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ زراعت کے سرکاری فارم معدودے چند ہیں اور یہ پورا میدان نجی ملکیت کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ صنعت و حرفت کے میدان میں بھی چھوٹے اور متوسط پیمانے کی تمام صنعتوں کے علاوہ بڑے پیمانے کی بھی بہت سی صنعتیں نجی دائرۂ کار میں ہیں اور بنیادی قومی مفاد اور پالیسی کے دائرے میں رہتے ہوئے وہ نہ صرف ترقی کر سکتی ہیں بلکہ حکومت سے ان کو ہر طرح کی امداد بھی مل رہی ہے۔ یہ امداد سرکاری قرضوں اور حفاظتی درآمدی محصولوں تک محدود نہیں ہے۔ اس میں فنی معلومات اور قومی ملکیت والے کارخانوں کی بنائی ہوئی بجلی، فولاد اور مشینوں کی فراہمی بھی شامل ہے جو سرکاری امداد گویا قومی امداد ہے اور اس امداد کے معاوضے میں یہ مطالبہ بے جا نہیں ہے کہ نجی ملکیت والی صنعتیں قومی مفاد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیے جانے والے ضابطے کی پابند ہیں۔ اس ضابطے میں پیداوار کے نشانوں اور تقسیم کے قاعدوں کے علاوہ ٹیکس کی دیانتدارانہ ادائی بھی شامل ہے۔ اگر اس ادائی میں دیانت داری نہ برتی جائے تو اس سے ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں۔

خامیوں پر بحث

جمہوری نظام حکومت کی وجہ سے عوام اور مجالس قانون ساز میں تعمیر و ترقی کی بعض دوسری خامیوں پر بحث کرنے کا پورا موقع ملا ہے۔ اس بحث سے اصلاح کی صورتیں نکلی ہیں۔ مگر یہ اصلاح اسی طرح ہو سکتی ہے کہ منصوبوں کے نشانوں اور منصوبہ بندی کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے۔ ان اصولوں میں ہندستان کی قدیم روایات اور مستقبل کے متعلق اس کی تمناؤں کا عکس ملتا ہے۔ ان تمناؤں کا پورا ہونا آسان نہیں ہے۔ لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔ جیسے جیسے منصوبہ بندی آگے بڑھتی ہے ویسے ہی ویسے نئے نئے مسئلے پیدا ہوتے جاتے ہیں مگر سابقہ تجربوں کی بدولت آیندہ مسائل سے نپٹنے کے طریقے بھی معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر زرعی پیداوار کی کمی نے منصوبے کے نشانوں کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالی ہے تو اس پیداوار میں اضافے کی تدابیر بھی دریافت کر لی گئی ہیں۔ اور اگر فولاد اور بھاری مشینوں کے کارخانوں کی تعمیر سے حکومت کے ترقیاتی اخراجات اور عوام کے بار میں اضافہ ہوا ہے تو ان کارخانوں میں تیار ہونے والے سامان سے منافع بخش روزگار کی نئی راہیں بھی پیدا ہوئی ہیں۔

ترقی کا سفر

ترقی کے سفر کو مہینوں اور برسوں میں ناپا نہیں جا سکتا۔ یہ سفر سدا جاری رہتا ہے اور ایک منزل پر پہنچ کر دوسری منزل سر کرنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اگرچہ منصوبہ بندی کے پچھلے تیرہ برس میں روزگار کے مواقع اور سفر، تعلیم اور دوا علاج وغیرہ کی سہولتوں میں اتنا اضافہ ہوا ہے جتنا کہ آزادی سے پہلے کے تین سو برس میں بھی نہیں ہوا تھا لیکن آگے بڑھنے اور مزید سہولتیں حاصل کرنے کی خواہش پہلے ہی جیسی بلکہ پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ خواہش ایک صحت مند رجحان کا پتہ دیتی ہے۔ اس معاملے میں کسی قدر بے صبری بھی جائز ہے۔ لیکن بے ضابطگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بے ضابطگی کی روک تھام منصوبہ بندی سے ہوتی ہے اور ہندستان میں منصوبہ بندی اب قومی مزاج کا جزبن گئی ہے۔ یہ بات اس ملک کے روشن مستقبل کی ضامن ہے۔ تمام انسانی کاموں کی طرح منصوبہ بندی میں کامیابیوں کے ساتھ ناکامیاں بھی ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ ان دونوں کے جائزے سے آگے کے سفر میں فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اگر یہ سفر ترک کر دیا گیا یا اگر اس کا رخ ٹیڑھا ہو گیا تو خوش حالی کی منزل جو دور ہونے پر بھی اب بہت دور نہیں ہے کبھی حاصل نہیں ہو سکے گی۔ منصوبہ بندی میں عوام کا تعاون اس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اور اس تعاون کی ایک شکل امداد باہمی کی تحریک ہے جس کی گنجائش اور ضرورت ہر کارخانے ہر دیہات اور ہر محلے بلکہ ہر گھر میں پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ ہندستان جس اکائی کا نام ہے وہ چالیس کروڑ انسانوں کے مجموعے سے بنی ہے جو مختلف کارخانوں، دفتروں اور کھیتوں میں کام کرتے ہیں جن کی متحدہ کوشش سے ملک کو سیاسی آزادی ملی ہے اور جو اسی قسم کی کوشش سے معاشی آزادی حاصل کر سکتے ہیں۔

نسیمِ صبحِ آزادی

انیس ابن مسیح بنارسی

بہار آئی ہے اور آئی ہے پیرہن کر دلھن ساقی
چمن پر آج چھایا ہے غضب کا بانکپن ساقی

وطن آزاد ہے، آزاد ہے اپنا چمن ساقی
بہارِ زندگی ہے اب خزاں پر خندہ زن ساقی

تری بے لوث نیت نے کیے یوں رنگِ بہار آیا
کہ جیسے ہو گیا سارا چمن گل پیرہن ساقی

برستا ہے چمن پر آج پیہم نورِ یزدانی
خود اپنے سے ہے شرمندہ نگاہِ اہرمن ساقی

ترے حسن تصرف کا یہ نظارہ کوئی دیکھے
گلے مل مل کے خوش ہوتے ہیں شیخ و برہمن ساقی

وطن کے واسطے لائے ہیں جو بے شیرِ آزادی
ترے حلقے میں ہیں کتنے ہی مردِ کوہ کن ساقی

مسرت ہی مسرت اب لیے پھرتے ہیں زندانی
کہاں طوق و سلاسل اور کہاں دار و رسن ساقی

فضا پر وجد طاری ہے کہ سازِ برگِ گلشن پر
نسیمِ صبحِ آزادی ہے ہر سو نغمہ زن ساقی

زہے جامِ فطرت ہے بلا نوشانِ الفت کو
بڑھا ساغر، بھلا دیں آج سب رنج و محن ساقی

پلا وہ بادۂ صافی کہ جس سے ہو نظر روشن
نظر آجائے رندوں کو بھی شاہِ ذوالمنن ساقی

نظر میں عظمتِ دیرینہ کا پھر جائے پھر نقشہ
ملا دے ساغروں میں بادۂ گنگ و جمن ساقی

ہمالہ کی بلندی ہو کہ ہو کشمیر کی رفعت
ترے مے خانے پر ہیں آج تک سایہ فگن ساقی

مزا آجائے مے نوشوں کو جدت اور
نئے ساغر میں ڈھالی جائے صہبائے کہ

اچھالا جائے مے کو اس طرح رنگیں فضاؤں میں
کہ ہر قطرہ اجالا کر دے بن بن کر کرن ساقی

یہاں ہر رند پی لینے پہ بھی باہوش ر
نرالی ہے زمانے بھر سے تیری انجمن

روش بدلی ہے دنیا کی، بدلتی جائے گی لیکن
زمانہ ایک دن اپنائے گا تیرا چلن ساقی

محبت جس کا مقصد ہو، مروت جس کا
تری محفل میں باقی ہے وہی رسم

تری چشمِ کرم ہے لطف کا لبریز پیمانہ
ترے دل میں ہے دریائے محبت موج زن ساقی

تری تدبیر کے ناخن سے ہر عقدے کو کھ
سلجھ جائے گی گیتی کی بھی زلفِ پرشک

زباں سے تیری جب نکلی تو دل کی بات ہی نکلی
زمانہ کس لیے پھر ہو نہ تیرا ہم سخن ساقی

کوئی گل ریز ہے تجھ پر کوئی گل پاشر
نچھاور کرتے ہیں ہم تجھ پہ اپنا حسن

انیس وقت بن کر زندگی رندوں تک آئی ہ
اسے تو جاوداں کر دے، کچھ ایسا کر جتن ساقی

زمین ہی پر زندگی کیوں ؟

محمد اسحاق صدیقی

ہماری زمین دراصل نو سیاروں میں سے ایک ہے جو سورج کے گرد گردش کرتے ہیں یہ سیارے حسب ذیل ہیں: (۱) عطارد (۲) زہرہ (۳) زمین (۴) مریخ (۵) مشتری (۶) زحل (۷) یورینس (۸) نیپچون (۹) پلوٹو۔ ان میں سے ہر سیارہ زمین کی طرح ایک دنیا ہے کوئی چھوٹی اور کوئی بڑی۔ لیکن ان میں سے کسی پر بھی زمین کے ایسے جاندار آباد نہیں ہیں۔ صرف مریخ پر کہیں کہیں ہریالی نظر آتی ہے جس کا شمار سائنسی تحقیقات کے مطابق معمولی نباتات میں کیا جا سکتا ہے۔

ہماری زمین کے چاند کی طرح ہر سیارے کے چاند ہیں۔ زمین کا تو ایک ہی چاند ہے لیکن مریخ کے دو، نیپچون کے دو، یورینس کے پانچ، زحل کے نو اور مشتری کے بارہ چاند ہیں۔ گویا کل ۳۱ چاند ہیں جس طرح سیارے سورج کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں اسی طرح یہ چاند اپنے اپنے سیاروں کے گرد گشت کرتے رہتے ہیں لیکن ان میں سے کسی چاند پر بھی جاندار نہیں پائے جاتے۔

سورج گرم گیس کا ایک گولا ہے جس کی سطح کی گرمی کا اندازہ ۱۲۰۰۰ درجہ فارن ہائٹ[1] کیا جاتا ہے اس لیے اس پر جانداروں کے ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ لیکن کائنات میں یہی ایک سورج نہیں ہے۔ دراصل آسمان پر جتنے بھی ستارے نظر آتے ہیں سبھی سورج ہیں۔ کوئی ہمارے سورج سے بڑا ہے اور کوئی چھوٹا۔ اور خود ہمارا سورج اتنا بڑا ہے کہ اس میں ۱۲ لاکھ زمینیں سما سکتی ہیں۔ ستارے چوں کہ زمین سے بہت دور ہیں اس لیے بڑی سے بڑی دوربین سے بھی وہ محض روشنی کے نقطے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ ستارے کھربوں کی تعداد میں ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ستاروں کے بھی سیارے ہیں تو ان پر جاندار ضرور آباد ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ محض قیاس ہے۔ ہمیں اپنی موجودہ معلومات کی بنا پر یہی کہنا پڑتا ہے کہ کائنات میں ہماری زمین ہی ایک ایسا انوکھا سیارہ ہے جس پر جاندار آباد ہیں۔

ہماری زمین پر دو طرح کے جاندار پائے جاتے ہیں ایک کو نباتات کہتے ہیں اور دوسرے کو حیوانات۔ دونوں کا جسم بے شمار خلیوں (cell) کا بنا ہوتا ہے۔ خلیہ جاندار جسم کے سب سے چھوٹے ٹکڑے یا ذرے کو کہتے ہیں۔ خلیہ "پروٹوپلازم" (PROTOPLASM) کا بنا ہوتا ہے جس کا مفہوم ہے "زندگی کا بنیادی مادہ"۔ یہ مادہ تقریباً ۲۴ عناصر کے ملنے جلنے سے بنتا ہے۔ ان کے علاوہ اس میں ۸۰ فی صد پانی شامل ہوتا ہے۔

یہاں لفظ عناصر کی وضاحت ضروری ہے کیوں کہ بعض لوگوں کو اس کے بارے میں بڑی غلط فہمی ہے۔ زمانۂ قدیم کے لوگوں کا خیال تھا کہ آگ، ہوا، پانی اور مٹی چار عناصر ہیں اور انھیں چاروں کے ملنے جلنے سے

---

[1] تھرما میٹر یعنی گرمی ناپنے کے آلہ کی ایک قسم ۳۲ درجہ فارن ہائٹ پر پانی برف بن جاتا ہے اور ۲۱۲ درجہ پر ابلنے لگتا ہے۔

تمام چیزیں بنتی ہیں۔ لیکن جدید تحقیقات سے یہ بات غلط ثابت ہو چکی ہے۔ ان چاروں چیزوں کا شمار عناصر میں نہیں کیا جا سکتا۔ پانی آکسیجن اور ہائڈروجن دو گیسوں کے ملنے سے بنا ہے۔ ہوا میں کم سے کم آٹھ عناصر ملے ہوئے ہیں اور مٹی درجنوں عناصر کا مجموعہ ہے۔ آگ بذات خود کوئی عنصر نہیں بلکہ جب آکسیجن (ایک قسم کی گیس) بعض دوسرے عناصر سے ملتی ہے تو گرمی اور روشنی پیدا ہوتی ہے اور اسی کو آگ کہتے ہیں۔

زمین پر تقریباً ۱۰۰ عناصر پائے جاتے ہیں۔ لوہا، سونا، چاندی ٹھوس عناصر ہیں۔ آکسیجن اور ہائڈروجن گیس ہیں جن کی صورت دھوئیں کی سی ہوتی ہے۔ عناصر سیال بھی ہو سکتے ہیں مثلاً جب آکسیجن گیس کو بہت ٹھنڈا کیا جاتا ہے تو وہ پانی کی طرح بہنے لگتی ہے۔

سورج کی روشنی کی جانچ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ سورج میں وہ تمام عناصر پائے جاتے ہیں جو زمین پر پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین دراصل سورج کا ایک ٹکڑا ہے جو اب سے تقریباً ۵ ارب سال پہلے اس سے الگ ہو کر رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے گرد گھومنے لگا۔ زمین کی طرح دوسرے سیارے اور چاند بھی دراصل سورج کے ٹکڑے ہیں۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں بھی وہی عناصر پائے جاتے ہوں گے جو زمین پر پائے جاتے ہیں لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ کسی بھی سیارے یا چاند پر زندگی کی وہ چہل پہل نہیں ہے جو زمین پر پائی جاتی ہے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟

دراصل زندگی کا انحصار پانچ چیزوں پر ہے (۱) آکسیجن (۲) درجہ حرارت (۳) پانی (۴) غذا (۵) ہوا اور پانی کا دباؤ۔ ان میں سے ہر چیز جانداروں پر الگ الگ طرح سے اثر انداز ہوتی ہے اور زندگی کے لیے ان میں سے ہر چیز کی موجودگی ضروری ہے۔ مگر یہ تمام چیزیں سوائے زمین کے کسی اور سیارے یا چاند میں نہیں پائی جاتیں۔ کہیں بہت زیادہ سردی ہوتی ہے، کہیں بہت زیادہ گرمی۔ کہیں ہوا نہیں پائی جاتی اور کہیں پانی نہیں پایا جاتا۔ اگر ہوا پائی جاتی ہے تو زہریلی ہے اور اگر پانی پایا جاتا ہے تو بہت کم ہے اور کہیں ہوا اور پانی کا وجود ہی نہیں ہے۔

زمین پر جاندار ہوا میں، پانی میں اور خشکی پر پائے جاتے ہیں۔ زمین کی سطح کا ۷۱ فی صدی حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے اور صرف ۲۹ فی صدی حصہ خشکی ہے۔ خشکی کے چند فٹ نیچے کسی طرح کے جاندار نہیں پائے جاتے۔ زندگی زمین کی سطح پر ۵ میل کی بلندی اور ۵ میل کی گہرائی تک (سمندر میں) محدود ہے۔

آیئے اب دیکھیں کہ جن چیزوں پر زندگی کا انحصار ہے اور جن کا ذکر اس سے پہلے کیا جا چکا وہ ہیں کیا؟

(۱) آکسیجن۔ یہ ایک بے رنگ اور بے ذائقہ گیس ہے جو زمین پر تقریباً ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ زمین کی جس بلندی اور جس گہرائی تک جاندار پائے جاتے ہیں وہاں تک یہ عام طور پر ملتی ہے۔

زیادہ بلندی پر اور سمندر کی گہرائی میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔ سمندر کی سطح پر جتنی آکسیجن پائی جاتی ہے ۱۸۰۰۰ فٹ کی بلندی پر اس کی آدھی رہ جاتی ہے۔ اسی لیے وہاں جسم کو ضرورت بھر آکسیجن پہنچانے کے لیے پھیپھڑوں اور دل کو دگنا کام کرنا پڑتا ہے۔ بہت زیادہ جسمانی محنت کرنے پر انسان کے جسم میں آکسیجن کی کھپت معمول سے ۳ یا ۴ گنا بڑھ جاتی ہے۔

خشکی پر رہنے والے جاندار (اور پانی کے بعض جانور جیسے وھیل) خالص آکسیجن ہوا سے حاصل کرتے ہیں۔ سطح سمندر سے ۵ میل اوپر آکسیجن کی مقدار بہت کم ہو جاتی ہے۔ یہ زندگی کی حد ہے جس کے اوپر کوئی پرندہ اڑتا ہوا نظر نہیں آتا۔ پہاڑ کی اونچی چوٹیوں، مثلاً ایورسٹ، پر چڑھنے والے لوگ اپنے ساتھ آکسیجن خاص طرح کی بوتلوں میں لے جاتے ہیں جو نلکیوں کے ذریعہ ان کی ناک تک پہنچتی رہتی ہے۔ اگر وہ یہ ترکیب نہ کریں تو ان کا دم گھٹ کر رہ جائے اور وہ مر جائیں۔

خشکی کے جاندار ناک یا منہ کے ذریعہ اپنے پھیپھڑوں میں آکسیجن گیس لیتے ہیں جہاں وہ خون میں مل جاتی ہے۔ خون کو صاف کرنے کے بعد وہ گندگی لے کر باہر آتی ہے۔ یہ گندی ہوا جسے کاربن ڈائی آکسائڈ کہتے ہیں نباتات کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وہ اسے پتیوں کے ذریعہ جذب کرتے ہیں اور آکسیجن گیس کی شکل میں بدل کر خارج کرتے ہیں۔ گویا نباتات کا سانس لینے کا عمل حیوانات کا الٹا

ہوتا ہے۔

کسی چیز کو جلانے کے لیے بھی آکسی جن نہایت ضروری ہے۔ موم بتی کو آکسی جن ملتی رہتی ہو اس لیے وہ جلتی رہتی ہے۔ جب اسے آکسی جن ملنا بند ہو جاتی ہے تو اس کا شعلہ جھلملا کر بجھ جاتا ہے۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو آکسی جن پھیپھڑوں میں جاکر خون میں مل جاتی ہے۔ خون میں ملتے ہی وہ سارے جسم میں دورہ کرتی ہے اور خون کی گندگی کو جلا دیتی ہے۔ یہ گندگی سانس کو خارج کرنے پر باہر نکل جاتی ہے۔

پانی میں گھلی ہوئی بیشتر آکسی جن ہوا سے آتی ہے۔ جب ہوا پانی کی سطح کو چھوتی ہوئی گزرتی ہے تو پانی اسے کسی قدر جذب کر لیتا ہے۔ اگرچہ یہ عمل مسلسل ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی رفتار اتنی سست ہے کہ پانی کے جانداروں کو کافی آکسی جن نہیں مل پاتی۔ لہریں اور آبشار البتہ پانی میں آکسی جن کو گھولنے میں بڑی مدد کرتے ہیں۔ بل کھاتی ہوئی لہریں جب بلند ہو کر گرتی ہیں تو کچھ ہوا ان کی گرفت میں آجاتی ہے اور پانی میں داخل ہو جاتی ہے۔

پانی میں کتنی آکسی جن سما سکتی ہے، اس کا انحصار پانی کے درجۂ حرارت اور نمک کی مقدار پر ہے۔ گرم پانی میں اتنی آکسی جن نہیں سما سکتی جتنی ٹھنڈے پانی میں سما سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحر آرکٹک میں جو قطب شمالی پر ہے اور بر اعظم اینٹارکٹکا میں، جو قطب جنوبی پر ہے، پانی میں رہنے والے جانداروں کی کثرت ہے لیکن بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان منجمد علاقوں میں جانداروں کا ہونا محال ہے۔ اسی طرح سمندر یا جھیل کا پانی، جو بہت کھاری ہو، دریاؤں کے میٹھے پانی کے مقابلے میں کم آکسی جن روک سکتا ہے۔

خط استوا کے پاس سمندروں میں ۱۰۰۰ فٹ کی گہرائی تک تھوڑی سی آکسی جن پائی جاتی ہے۔ آکسی جن کی اس کمی کا سبب پانی کا گرم ہونا ہے۔ آکسی جن کے لحاظ سے بحر آرکٹک اور اینٹارکٹکا کے پاس سمندر کے تین طبق ہیں: بالائی طبق میں زیادہ، درمیانی طبق میں نسبتاً کم اور نچلے طبق میں ضرورت بھر آکسی جن پائی جاتی ہے۔ زیادہ گہرائی میں بالکل آکسی جن نہیں ہوتی۔

قدرت نے پانی کے جانداروں میں سانس لینے کے لیے خاص اعضا پیدا کیے ہیں مثلاً مچھلیاں سانس لینے کے لیے گلپھڑے استعمال کرتی ہیں۔ جب پانی مچھلی کے منہ میں جاکر گلپھڑے کے پاس سے گزرتا ہے تو پانی میں ملی ہوئی آکسی جن خون میں جذب ہو جاتی ہے، اور اس کو صاف کرنے کے لیے دل اسے بار بار گلپھڑوں میں بھیجتا ہے۔

(۲) حرارت۔ زمین پر گرمی کا اصل ماخذ سورج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورج کے غروب ہونے کے بعد سے سردی بڑھنے لگتی ہے اور راتیں دن کے مقابلے میں عموماً سرد ہوتی ہیں۔ زمین کے ہر حصے کو سال بھر میں برابر کی گرمی ملتی ہے۔ خط استوا پر سورج کی کرنیں سیدھی پڑتی ہیں، اس لیے وہاں زیادہ گرمی ہوتی ہے۔ جو حصۂ زمین خط استوا سے جتنا دور اور سطح سمندر سے جتنا اونچا ہوتا ہے وہاں گرمی اتنی ہی کم ہوتی ہے۔

ہوا کے مقابلے میں خشکی اور پانی سورج کی گرمی کو زیادہ جذب کرتے ہیں۔ جب سورج کی روشنی ہوا سے گزر کر زمین کی سطح تک پہنچ جاتی ہے تو وہ ہوا کے ساتھ ساتھ خشکی اور پانی کو بھی گرم کر دیتا ہے۔ کیونکہ ہوا کے مقابلے میں خشکی اور پانی زیادہ گرم ہو جاتے ہیں اور اس لیے وہ از خود اپنی اس زیادہ گرمی کو خارج کرتے ہیں جس سے گرمی کی لہریں اٹھتی ہیں، ہوا کے دباؤ میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ ان باتوں سے اور زمین کی سالانہ گردش سے موسم بدلتے رہتے ہیں۔

جتنا ہم زمین کے اوپر جاتے ہیں، سردی اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہم خلا میں پہنچ جاتے ہیں جس کا درجۂ حرارت فارن ہائٹ تھرمامیٹر کی ناپ کے مطابق صفر سے ۴۵۹ درجہ نیچے ہے۔

---

[1] ہوا زمین سے تقریباً ۱۰۰ میل کی بلندی تک پائی جاتی ہے لیکن جیسے جیسے اوپر جائیے اس کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے۔ تقریباً ۱۰۰ میل اوپر وہ اتنی کم ہو جاتی ہے کہ نہیں رکھا ہے۔ خلا کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

منطقۂ حارہ میں یعنی خط استوا کے نزدیک ۱۶۰۰۰ فٹ کی بلندی سے نیچے برف نہیں پائی جاتی جب کہ بحر آرکٹک میں سطح سمندر تک برف جمی رہتی ہے۔ زمین کی جس بلندی پر برف جمنا شروع ہوتی ہے اسے "خط برف" (snow line) کہتے ہیں۔ خط برف کے اوپر اتنی سردی ہوتی ہے کہ کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

فضا کے درجۂ حرارت پر سرد اور گرم ہواؤں کا اثر پڑتا ہے۔ سطح زمین پر بھی درجۂ حرارت میں بڑا فرق پایا جاتا ہے جو کہ صفر سے ۱۳۰ درجہ نیچے سے لے کر ۱۳۹ درجہ اوپر (فارن ہائٹ) تک ہو سکتا ہے۔ سمندروں میں پانی کا درجہ حرارت ۲۷ درجے سے لے کر ۸۰ درجے (فارن ہائٹ) کے درمیان رہتا ہے جب کہ زندگی کا وجود کم سے کم ۲۳ درجہ اور زیادہ سے زیادہ ۱۵۰ درجہ (فارن ہائٹ) کے درمیان ممکن ہے۔ اس سے کم یا زیادہ گرمی جانداروں کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔

یہاں یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جانوروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے گرم خون والے اور ٹھنڈے خون والے۔ گرم خون والے جانوروں کا درجۂ حرارت باوجود موسم کی تبدیلیوں کے مستقل رہتا ہے جس کی وجہ سے اندرونی اعضا ایک مستقل رفتار سے کام کرتے رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے ٹھنڈے خون والے جانوروں کی جسمانی حرارت ماحول کے درجۂ حرارت کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ گرمی یا سردی کی زیادتی کے لحاظ سے ان کے اندرونی اعضا کے عمل میں تبدیلی ہو جاتی ہے مثلاً سردی کے زمانے میں ان کے اندرونی اعضا کا عمل سست ہو جاتا ہے۔

(۳) پانی۔ سورج کی گرمی سے پانی بھاپ بن کر اٹھتا ہے اور بلندی پر جا کر سرد ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بارش اور برف کی شکل میں نیچے گرتا ہے۔ اس بارش سے جانداروں کو زندہ رہنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک لطف کی بات یہ ہے کہ خالص پانی کہیں نہیں پایا جاتا۔ اس رقیق مادے میں گرد و غبار، جانداروں کی غذا اور ان کا فضلہ دونوں گھلے رہتے ہیں۔ اگرچہ پانی کی دو قسمیں مانی جاتی ہیں، میٹھا اور نمکین، لیکن نمک دونوں میں ہوتا ہے۔ ہاں نمک کی مقدار میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ مزید وضاحت کے لیے یہ سمجھ لیجیے کہ جو پانی ہم پینے کے کام میں لاتے ہیں اسے میٹھا پانی کہا جاتا ہے مگر نمک اس میں بھی ہوتا ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ اب سے دو ارب سال پہلے زمین پر زندگی کا آغاز پانی میں ہوا تھا۔ بعد میں جن جانداروں کا ارتقا ہوا وہ پانی سے نکل کر خشکی پر آئے۔ خشکی پر ہوا پائی جاتی تھی اس لیے وہ اب ہوا میں گھر گئے مگر ماحول سے متاثر ہو کر انھوں نے بجائے پانی میں سانس لینے کے ہوا میں سانس لینا سیکھ لیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ نہ صرف ان کے جسم کی باہری بناوٹ میں بلکہ اندر بھی کئی تبدیلیاں ہوئیں۔ لیکن سمندر کو چھوڑنے کے بعد بھی وہ اپنے ابتدائی ماحول یعنی پانی سے اپنا رشتہ نہ توڑ سکے۔ جانداروں کا خون دراصل پانی کی بدلی ہوئی صورت ہے جس میں کچھ نمک ملا ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح سمندر کے پانی میں نمک ملا ہوتا ہے۔ ہر جاندار کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے جسم میں پانی کی ایک خاص مقدار وقتاً فوقتاً پہنچتی رہے۔

(۴) ہوا اور پانی کا دباؤ۔ جانداروں پر ہوا اور پانی کا دباؤ پڑتا ہے۔ ہوا کو ہم لوگ اتنی لطیف شے سمجھتے ہیں کہ ہمارے تصور میں بھی یہ نہیں آتا کہ اس کا کوئی دباؤ ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا بھی دباؤ ہوتا ہے۔ یہ دباؤ سطح سمندر پر ½ ۱۴ پونڈ فی مربع انچ ہوتا ہے[1]۔ جتنا ہم اوپر جاتے ہیں ہوا کی مقدار کم ہونے کی وجہ سے دباؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم خلا میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں دباؤ بالکل نہیں ہے۔

ہوا کے مقابلے میں پانی کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ پانی کے ۳۴ فٹ اونچے اور ایک انچ چوڑے ستون کا دباؤ ½ ۱۴ پونڈ فی مربع انچ ہوتا ہے۔ جیسے جیسے ہم زیادہ گہرائی میں جائیں گے جسم پر پانی کی مقدار بڑھتی جائے گی اور اسی لحاظ سے پانی کا دباؤ بھی بڑھتا جائے گا اور

---

[1] اس سے مراد یہ ہے کہ جہاں تک ہوا پائی جاتی ہے اگر وہاں سے سطح سمندر تک ایک مربع انچ چوڑا ستون قائم کیا جائے تو اس ستون کا دباؤ سطح سمندر کی ایک مربع انچ جگہ پر ½ ۱۴ پونڈ ہوگا۔

اس زیادہ دباؤ کی وجہ سے ہم کو تکلیف بھی زیادہ محسوس ہوگی۔ پانی کا دباؤ اتنا زیادہ ہو جاتا ہے کہ اس کا حساب پاؤنڈ کے بجائے ٹنوں میں کیا جاتا ہے۔ (ایک ٹن تقریباً ۲۰ من کے برابر ہوتا ہے۔) ہر جاندار کے جسم کے اندر خون اور ہوا کی وجہ سے ایک دباؤ پایا جاتا ہے۔ جب تک یہ اندرونی دباؤ ہوا یا پانی کے بیرونی دباؤ کے برابر رہتا ہے، ایک توازن قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے جاندار کو تکلیف نہیں ہوتی اور اسے کسی طرح کے دباؤ کا احساس نہیں ہونے پاتا۔ یہ توازن بگڑ جائے تو جاندار کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ مثلاً اگر سمندر کی گہرائی سے کسی مچھلی کو اوپر لایا جائے تو اس کا جسم بیرونی دباؤ کے کم ہونے کی وجہ سے پھٹ جائے گا۔ اسی طرح اگر ہم خلا میں پہنچ جائیں تو ہوا کا بیرونی دباؤ نہ ہونے کی وجہ سے ہوا اور خون کے اندرونی دباؤ سے ہمارا جسم بھی ضرورت سے زیادہ پھلائے ہوئے غبارے کی طرح پھٹ جائے گا۔

جو جاندار بہت تیزی سے کبھی اوپر جانے اور کبھی نیچے آتے ہیں جیسے مچھلیاں، انھیں دباؤ کے توازن کو قائم رکھنے کے لیے خاص اعضا کی ضرورت پڑتی ہے۔

(۵) غذا۔ زندگی کے لیے غذا نہایت ضروری ہے۔ غذا فراہم کرتی ہے (۱) جسم کے کل پرزوں کو چلتے رہنے کے لیے طاقت (۲) جسم کی نشوونما کے لیے کیمیادی عناصر (مثلاً لوہا، چونا وغیرہ) (۳) جو خلیے کچھ عرصہ کے بعد تلف ہو جاتے ہیں ان کو بنانے کے لیے مادہ۔

جاندار کو اپنی غذا کے لیے پانی، نمک، وٹامن، پروٹین (لحمی اجزا) کاربوہائڈریٹ (نشاستہ)، چربی اور تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ نباتات کی نشوونما کے لیے مٹی میں ملے ہوئے بعض عناصر، ہوا، پانی اور دھوپ نہایت ضروری ہیں۔ پیڑ پودوں کی جڑیں اپنی نشوونما کے لیے مٹی سے ضروری چیزیں حاصل کرتی ہیں۔ یہ چیزیں پانی کے ذریعہ پتوں تک پہنچتی ہیں اور پتوں کا سبز مادہ جسے کلوروفل (CHLO- [illegible]) کہتے ہیں ان چیزوں کو سورج کی روشنی یعنی دھوپ میں غذا میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس طرح سے سورج کی کچھ طاقت نباتات میں سرایت کر جاتی ہے۔ سبزی خور جانوروں کے جسم میں طاقت نباتات کے استعمال سے آتی ہے اور گوشت خور جانوروں کے جسم میں سبزی خور جانوروں کے کھانے سے۔ گویا گوشت خور جانوروں کے لیے سبزی خور جانور سبزی کو گوشت میں تبدیل کرنے کے کارخانوں کا کام دیتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حیوانات و نباتات دونوں اپنی جسمانی طاقت کے لیے سورج کے محتاج ہیں۔

سبزی خور جانور اس بلندی یا گہرائی تک محدود ہیں جہاں تک پیڑ پودے پائے جاتے ہیں لیکن گوشت خور جانور نباتات کی اس حد سے اکثر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ سمندر نباتات کی نشوونما کے لیے اتنا مناسب نہیں جتنا کہ خشکی کیوں کہ پانی میں سورج کی روشنی زیادہ گہرائی تک نہیں پہنچ پاتی۔

دوسرے سیارے اور زندگی

زندگی کا انحصار کن چیزوں پر ہے اور وہ زمین کے جانداروں کی کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں اس کا جائزہ لینے کے بعد آیئے اب یہ دیکھیں کہ دوسرے سیارے زندگی کی ان بنیادی ضرورتوں کو کیوں نہیں پورا کرتے۔

سورج سے نزدیک ترین سیارہ عطارد ہے۔ اسے سورج کا ایک چکر کرنے میں ۸۸ دن لگتے ہیں اور اتنا ہی وقت اسے اپنی کیل پر ایک بار گھومنے میں لگتا ہے[1]۔ اسی لیے اس کے ایک حصے میں ہمیشہ دن رہتا ہے اور ایک حصے میں رات۔ دن والے حصے میں ۷۷۰ درجہ فارن ہائٹ گرمی ہوتی ہے۔ یہ اتنی گرمی ہے کہ اس میں سیسہ خود بہ خود پگھل جائے گا۔ رات والے حصے میں سردی صفر سے ۴۰۰ درجہ نیچے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی سردی گرمی میں

---

[1] ہر سیارہ لٹو کی طرح اپنی کیل پر گھومتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سورج کا چکر لگاتا ہے۔ سیارے کی کیل ایک فرضی لکیر ہے جسے "محور" بھی کہتے ہیں۔ محوری گردش سے دن رات ہوتے ہیں یعنی جو حصہ سورج کے سامنے آ جاتا ہے ادھر دن ہوتا ہے اور جو حصہ اس حصے کے پیچھے ہوتا ہے ادھر رات ہوتی ہے۔ جو وقت سیارے کو سورج کا ایک چکر کرنے میں لگتا ہے اسے سال کہتے ہیں۔ سیارے کی سالانہ گردش سے موسم بدلتے رہتے ہیں۔

کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا۔

عطارد پر گرمی بہت زیادہ ہونے کے دو سبب ہیں۔ (۱) یہ سورج سے نزدیک ترین سیارہ ہے۔ (۲) اس پر ہوا نہیں ہے جس سے گزر کر اس کی سطح تک پہنچنے والی دھوپ کی تیزی کم ہو۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ جتنی دھوپ زمین کو ملتی ہے اس کی دس گنی عطارد کو ملتی ہوگی۔

عطارد پر پانی بھی نہیں ہے۔ ہوا اور پانی نہ ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ یہ سیارہ سب سے چھوٹا ہے اسی لیے اس کی کشش بھی بہت کم ہے۔ اگر اس پر کبھی ہوا اور پانی کا وجود رہا بھی ہو تو اب نہیں ہے۔ (یہاں "کشش" کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔ وہ قوت جو کسی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے اسے کشش کہتے ہیں۔ کشش کا انحصار چیز کی جسامت اور ٹھوس پن پر ہے۔ جو چیز جتنی بڑی اور ٹھوس ہوگی اس میں کشش بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اگر زمین میں یہ طاقت نہ ہوتی تو کوئی چیز زمین پر ٹکی نہ رہتی بلکہ خلا میں اڑ کر چلی جاتی۔)

عطارد کے بعد زہرہ سیارہ ہے۔ یہ زمین کے مقابلے میں سورج سے نزدیک ہے اس لیے یہاں گرمی بہت ہوتی ہے۔ اس کی سطح کی گرمی کا اندازہ ۷۰۰ درجہ فارن ہائٹ کیا جاتا ہے۔ یہ سیارہ زمین سے چھوٹا ہے اس لیے اس کی کشش زمین کے مقابلے میں کم ہے۔ یہاں آکسیجن گیس اور پانی کی بھی کمی ہے۔

سورج کی طرف سے گننے پر تیسرا سیارہ زمین ہے جو زندگی کی تمام شرطیں پوری کرتی ہے۔

زمین کے بعد مریخ ہے جو زمین سے چھوٹا ہے۔ اس پر ہوا اور پانی کا وجود ہے لیکن زمین کے مقابلے میں کم۔ اس کی فضا میں آکسیجن گیس کی کمی ہے۔ چوں کہ یہ سیارہ زمین کے مقابلے میں سورج سے دور ہے اس لیے یہاں سردی بہت ہوتی ہے۔

جو سیارے مریخ کے آگے ہیں (یعنی مشتری، زحل، یورینس، نیپچون) اور پلوٹو وہ سورج سے اتنی دور ہیں کہ وہاں کا درجہ حرارت ہمیشہ صفر سے ۲۰۰ درجہ نیچے رہتا ہے۔ اس سردی کی وجہ سے وہاں کی ہوا اور پانی دونوں منجمد ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں، ان کی فضا میں امونیا اور میتھین گیسیں پائی جاتی ہیں جو زہریلی ہوتی ہیں۔ یہ بھی سردی کی شدت سے منجمد ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زہریلے اور منجمد ماحول میں زندگی ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

سیاروں کے مقابلے میں چاند بہت چھوٹے ہیں۔ صرف زحل کے ایک چاند پر جس کا نام "ٹائٹن" (TITAN) ہے ہوا پائی جاتی ہے مگر وہ زہریلی ہے۔ اس کے سوا کسی سیارے کے چاند پر ہوا اور پانی کا وجود نہیں ہے اور اس کی وجہ کشش کی کمی ہے۔

اس سرسری جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زمین کے علاوہ کسی دوسرے سیارے پر زندگی کیوں نہیں پائی جاتی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ زمین کے بعد کسی سیارے کے حالات زندگی کے لیے کسی قدر سازگار ہیں تو زہرہ اور مریخ کے ہیں۔ اسی لیے سائنس داں اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان سیاروں پر طاقت ور راکٹ کے ذریعہ خود کار تجربہ گاہیں بھیج کر یہ معلوم کیا جائے کہ ان پر جاندار آباد ہیں یا نہیں اور اگر آباد ہیں تو انھیں کس طرح مقید کر کے زمین پر لایا جا سکتا ہے تاکہ پتہ چل سکے کہ وہ زمین کے جانداروں سے کن باتوں میں مشابہ یا مختلف ہیں۔ بعض ہیئت دانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ نظام شمسی کے ماورا جو دوسرے ستارے ہیں ان میں سے بعض کے سیاروں پر انسان جیسی ذی عقل مخلوق کا آباد ہونا ممکن ہے اس لیے ہمیں ان سے میل جول پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ خیر یہ تو ناممکن سی بات معلوم ہوتی ہے اتنا یقینی ہے کہ انسان دیر یا سویر میں زہرہ اور مریخ تک ضرور پہنچ جائے گا اور اگر وہاں جانداروں کا ہونا ثابت ہو گیا تو زندگی کی کہانی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔



عزائم

روشن پٹیالوی

نیکی کا اور دستورِ اُلفت کا
ہوتا ہو جہاں اظہار نفرت کا
ن دریائے بے پایاں محبت کا
رکا جس جگہ ہو بو رفاقت کا
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

جہاں ہو نغمہ پیرا راحت باطن کی شہنائی
وفا کے آستانے پر ہوں سب محوِ جبیں سائی
ضیائے سرفروشی کی جہاں ہو جلوہ آرائی
خلوصِ قلب کے خورد و کلاں ہوں سب تمنائی
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

ن فریاد پر ہر دل مچل جائے
نسب ضرورت فائدہ پائے
را، نادار، مفلس پیٹ بھر کھائے
و دستِ رحمت جس جگہ آئے
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

نہ جھگڑے ہوں جہاں مذہب کے اور فتنے سیاست کے
جہاں احکام بے جا ہوں نہ غیروں کی حکومت کے
نہ چرچے جس جگہ ہوں باہمی رنج و کدورت کے
جہاں کے رہنے والے سر بسر پیکر ہوں اُلفت کے
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

ہوں جس جگہ ہر شخص کے رہبر
ل پر ہو سب کے صدق کا اختر
ر جادوں گل زار ہستی پر
ہر دل میں خیال فرض رہ رہ کر
ہم اپنے عزم سے ایسی نیا دُنیا بسائیں گے

نہ ہوگا جس جگہ مطلب پرستی کا کوئی چرچا
نہ ہوگا حوصلہ سرمایہ داروں کو مظالم کا
جہاں ایمان فروشی کا نکل جائے گا دیوالا
جہاں کم زور کے قبضے میں ہو جرأت کا سرمایا
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

د جس جگہ پر بھوک سے نالاں
ں کے باعث نظر آئیں تن عریاں
نی بچے جہاں کم زور کے ارماں
ں شدت کرے نادار کو حیراں
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

جہاں ہوں دُودھ گھی کی ندیاں چاروں طرف جاری
ہر اک انسان کے دل میں ہو اخلاص و رواداری
جہاں گبر و مسلماں کو نہ ہو رنجِ دل آزاری
فضا پر ہو جہاں اک نشے کی سی کیفیت طاری
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

جہاں اُلفت ہو اُلفت سے جہاں نفرت ہو نفرت سے
محبت ہو محبت سے، عداوت ہو عداوت سے
ٹپکتی ہو جہاں معصومیت ہر نقشِ فطرت سے
فرشتے دیکھنے آئیں گے جس کو ارضِ جنت سے
ہم اپنے عزم سے ایسی نئی دُنیا بسائیں گے

دو جمہوریتیں ـــــ ایک تقابل

بھارت اور چین دونوں کثیر آبادی کے ملک ہیں اور دونوں کو جمہوریہ کہا جاتا ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے ماتحت چین نے اکتوبر سنہ ۱۹۴۹ء میں اپنے آپ کو جمہوریہ قرار دیا اور بھارت کے جمہوریہ ہونے کا اعلان جنوری سنہ ۱۹۵۰ء میں کیا گیا۔ زراعت ابھی تک دونوں دیشوں کی معاشی زندگی کا اہم ترین جز ہے۔ آزادی حاصل ہونے تک دونوں کا معاشی نظام خستہ ہو چکا تھا اور اب دونوں معاشی ترقی کے منصوبوں پر عمل کر رہے ہیں۔ (گو دونوں کے طریق کار جدا ہیں) لیکن اس سے زیادہ دونوں دیشوں کے حالات میں کوئی اور مشابہت نہیں پائی جاتی اور دونوں دیشوں کے لوگوں کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

بھارت میں ہر شہری آزاد ہے، اسے کسی قسم کا خوف نہیں، اسے شخصی نشو و نما کی آزادی حاصل ہے جب کہ چینی جمہوریہ میں، [illegible] کروڑ لوگ جو کہ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ ہیں، غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

کاغذی حقوق

چین کے آئین میں بھی تقریر و تحریر کی آزادی، جلسے کرنے کی آزادی اور کاروبار کی آزادی کا ذکر موجود ہے لیکن پچھلے چودہ برسوں کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ حقوق صرف کاغذ ہی پر موجود ہیں۔ اس کے برعکس بھارت میں ہر شہری کو حقیقی معنوں میں بنیادی حقوق حاصل ہیں اور کبھی اس کے بنیادی حقوق پر زد پڑتی ہے تو اسے ان کی حفاظت کے لیے لڑنے کا قانونی حق حاصل ہے لیکن چین میں صورت حالات اس کے برعکس ہے۔ چین میں کسی شخص کو اپنی رہائش گاہ یا کام کرنے کی جگہ کو ترک کرنے کے لیے پہلے سیکورٹی افسر سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ کچھ عرصہ کی بات ہے کہ چین کے صوبہ کوانگ تنگ میں ایک کسان نے اپنے پروڈکشن ٹیم لیڈر کو اطلاع دیے بغیر اپنے ایک بیمار رشتہ دار کی مزاج پرسی کے لیے جانے کی جسارت کی اور اس کی سزا کے طور پر اسے اس قدر پیٹا گیا کہ اس نے دم توڑ دیا۔

مذہب پر پابندیاں

بھارت میں لوگوں کو اپنے مذہبی عقائد پر کاربند رہنے اور ان کا پرچار کرنے کی آزادی حاصل ہے بشرطیکہ اس سے امن عامہ میں خلل نہ پڑے اور لوگوں کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے لیکن چین میں مذہبی آزادی برائے نام ہے۔ وہاں ہر مذہب ایک سرکاری ایسوسی ایشن کے کنٹرول میں ہے جو نہ صرف مذہبی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتی ہے بلکہ ہر مذہب کو سرکاری پالیسیوں کے پرچار کے لیے کام میں لانے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ جو لوگ اس سرکاری ایسوسی ایشن کے احکام کی تعمیل نہیں کرتے انھیں سزا دی جاتی ہے۔ حال ہی میں ایک چینی پادری کو محض اس جرم میں عمر قید کی سزا دی گئی کہ وہ اپنے چرچ کو مذکورہ سرکاری ایسوسی ایشن کے کنٹرول سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ یہی حال چین کے مسلمانوں کا ہے۔ تقریباً پچاس ہزار چینی مسلمان ظلم و ستم سے تنگ آکر روس بھاگ گئے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ تمام بودھی عبادت گاہوں کو ان کے اثاثہ سے محروم کر دیا گیا ہے۔ مذہبی کتابوں کو بوٹوں کے تلے تیار کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ بودھوں کو روایتی بودھی زندگی ترک کرنے اور مہاتما کی تعلیمات کا پرچار نہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

بھارت میں تمام لوگ قانون کی نظر میں مساوی درجہ رکھتے ہیں لیکن چینی جمہوریہ میں ایسا نہیں۔ چین میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کو دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل ہے۔ ان سے غلطی ہو جائے تو بھی اسے غلطی نہیں سمجھا جاتا کیونکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ غلطی کر ہی نہیں سکتے۔ اس کے برعکس دوسرے لوگوں

سے کوئی غلطی ہو جائے تو انھیں فوراً اصلاح کے لیے مزدوری کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ درحقیقت چین میں شخصی آزادی کے احساس کو ہی غیر قانونی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چین میں لوگوں کو شخصی راز داری تک کا ابتدائی حق بھی حاصل نہیں۔ چین میں کوئی بھی فرد کسی معاملے کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے اور حکومت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ماؤسی تنگ کے کارکن کسی بھی وقت کسی کے گھر میں داخل ہو کر کسی بھی چیز پر قبضہ کر سکتے ہیں۔

بھارت میں ہر شہری کو اپنے بنیادی حقوق کی حفاظت کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔ بھارت میں سپریم کورٹ سرکاری اثر و رسوخ سے بالکل آزاد ہے لیکن چین میں لوگوں کو جو بنیادی حقوق دیے گئے ہیں وہ بیکار ہیں کیونکہ شہریوں کے لیے ان حقوق کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا۔ چینی شہریوں کو درحقیقت اپنے ملک کے سیاسی نظام میں ایک پرزے سے زیادہ وقعت حاصل نہیں۔ کمیونسٹ چین میں آج عدالتیں بھی حکومت کے ماتحت ہیں۔ سزا عام طور پر جماعتی تقاضے کے نظریے کے مطابق دی جاتی ہے۔ عدالتیں ہمیشہ استغاثہ کے دلائل کو درست تسلیم کرتی ہیں اور اگر کوئی وکیل ملزم کے بچاؤ کے لیے دلائل پیش کرے تو اس پر رجعت پسند وکیل ہونے کا الزام اس کے سر تھوپا جاتا ہے۔ چین میں قانونی سسٹم ایسا ہے جس کے تحت دنیا کی ایک چوتھائی آبادی کو غلامی کی حالت میں رکھا گیا ہے۔

نہ صرف یہ کہ چین کے لوگوں کو شخصی آزادی نہیں بلکہ چودہ سال سخت محنت کرنے اور قریب قریب فاقوں مرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک اس حالت میں نہیں کہ انھیں پیٹ بھر کھانا مل سکے۔ ان ناکامیوں کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کو اپنی حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کیونکہ انھیں حکومت کے کاموں میں کوئی دخل حاصل نہیں۔ وہاں کے لوگ اپنی حکومت کا انتخاب خود نہیں کرتے جیسا کہ بھارت میں ہوتا ہے۔ تیسری صدی میں ایک چینی فلاسفر سن سنو نے کہا تھا کہ عوام پانی ہیں اور حکومت ایک کشتی ہے۔ پانی کشتی کو سہارا دے سکتا ہے اور اسے ڈبو بھی سکتا ہے۔ لیکن چینی حکمرانوں نے اس دانش مندانہ قول کی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

بھارت نے حصول آزادی کے بعد جو مسلسل معاشی ترقی کی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ترقیاتی سرگرمیوں کی پوری طرح تشہیر کی جاتی ہے۔ اس کے برعکس چین کی معاشی ترقی ایک بند کتاب کی مانند ہے جس کے بارے میں اصلیت صرف چوٹی کے چند افراد کو ہی معلوم ہوتی ہے۔

بھارت میں دوسرے پانچ سالہ پلان کے اختتام تک قومی آمدنی میں ۴۲ فی صدی اضافہ ہوا اور آبادی میں اضافے کے باوجود فی کس آمدنی ۲۸۴ روپے سے ۳۳۰ روپے تک پہنچ گئی۔ زرعی پیداوار میں ۴۱ فی صدی اور صنعتی پیداوار میں ۹۴ فی صدی اضافہ ہوا۔ فولاد کی پیداوار دوگنا ہو گئی۔ اس کے برعکس چین میں فولاد کی پیداوار میں ایک کروڑ ٹن کی کوئلے کی پیداوار میں ۲۱ کروڑ ٹن کی اور بجلی کی پیداوار میں ۱۳ ارب کلوواٹ کی کمی ہوئی ہے۔ پچاس لاکھ سے لے کر ایک کروڑ بیس لاکھ چینی مردوں، عورتوں اور بچوں کو "چینی مارکہ سوشلسٹ نظام" کے قیام کے سلسلے میں جان سے ہاتھ دھونے پر مجبور کیا جا چکا ہے۔

یہ سوال تمام دنیا کے لوگوں کو پریشان کر رہا ہے کہ وحشیانہ قوت پر مبنی یہ نظام چین میں کب تک قائم رہے گا۔



میرزا کاظم مخاطب بہ مردان علی خاں مبتلا

(بہ سلسلہ صفحہ ۱۱)

مبتلا تخلص کا ایک دوسرا تذکرہ نگار بھی گزرا ہے جس کا نام غلام محی الدین وطن میرٹھ اور دوسرا تخلص عشق تھا۔ اس کے تذکرے کا تاریخی نام طبقات سخن ہے جس سے اس کا سال تالیف ۱۲۲۲ھ نکلتا ہے۔ اس تذکرے کی زبان بھی فارسی ہے اور اس کے دو حصے ہیں، جن کو مولف طبقوں کا نام دیتا ہے۔ طبقۂ اول میں اردو شاعروں کا حال اور منتخب کلام ہے۔ طبقۂ دوم اشعار فارسی خود بہ ضمن خاتمہ بعضے احوال پر مشتمل ہے۔ اس تذکرے میں محمد شاہ کے عہد سے اکبر شاہ ثانی کے جلوس کے پہلے سال تک کے شاعروں کا ذکر ہے۔

طبقات سخن ابھی شایع نہیں ہوا ہے لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ جو گاندھی فیض عام کالج، شاہجہاں پور میں محفوظ ہے، اس کا خلاصہ عزیزی ڈاکٹر محمد حسن نے انجمن ترقی اردو کے ہفت روزہ اخبار ہماری زبان میں ۱۵ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء سے ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء تک بارہ قسطوں میں شایع کر دیا ہے۔

چودھری کی کہانی
شیروانی کی زبانی

عبدالمجیب سہالوی

چودھری شرافت کو میں اُس وقت سے جانتی ہوں جب ان کے بڑے بھیا کی شادی ہو رہی تھی اور اب اس واقعہ کو تقریباً بیس برس گزر چکے ہیں۔ مجھے یہ بیہودہ آنکھوں کی دیکھی کہ اس موقع پر چودھری صاحب نے بنگلو پور کے گاؤں میں اپنی زمینداری کا حصہ بیچ ڈالا تھا اور شادی کے سلسلے میں ایسے اہتمام کئے تھے کہ سارے جوار میں برسوں تک اس کا چرچا رہا۔ بڑی سے بڑی ملانے کی غرض سے شادی قریب ہی کے ایک گاؤں میں اپنے کنبے ہی کے ایک گھرانے میں کی تھی اگرچہ لڑکی والے چودھری صاحب کے پلے کے زمیندار تو نہ تھے لیکن پٹی داروں میں ان کی جوڑ کا جوار میں کوئی نہ تھا۔ ایک ہی لڑکی تھی۔ وہ بھی حوصلہ نکالنا چاہتے تھے اور بڑی برات کی مانگ کی تھی۔ چودھری صاحب کے یہاں براتیوں کی کیا کمی تھی۔ ہاتھی' گھوڑے' رتھ' لہڑو' ادھے اور گاڑیوں کی قطار دولہا کی چوپال سے لے کر دولہن کی چوکھٹ تک لگی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں گیس اور مشعلوں کی حرکت کرتی ہوئی لمبی لائن دور سے ایسی معلوم ہوتی جیسے کوئی فوج گڑھی پر حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہی ہو۔

چودھری صاحب نے شادی کے موقع پر سبھی گھر والوں اور نوکروں چاکروں کے جوڑے بنوائے تھے اور اسی سلسلہ میں نومبر کے مہینے میں لکھنؤ آکر ایک بڑے "کلاتھ مرچنٹ" کی دوکان پر میرا کپڑا انھوں نے تھان سے نکلوایا اور یہاں کے شیروانی سینے والے مشہور و معروف درزی سے مجھے اپنے جسم کے سانچے میں ڈھلوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ اس دن سے اُن کے آخری وقت تک میرا اُن کا ساتھ نہ چھوٹا۔ چودھرائن بلڈ پریشر میں مبتلا ہو کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ بڑے بھیا نے بال بچے والے ہو کر الگ گھر بسایا۔ زمینداری اور اُس کے خاتمہ کے ساتھ نوکر چاکر بھی الوپ ہو گئے۔ مگر ساتھ ان کے رشتۂ جاں ٹوٹنے تک رہا۔

چودھری صاحب نے پہلے سال تو مجھے ایسے دلار پیار سے رکھا کہ کسی نئی نویلی دلہن کا کیا ہوتا ہوگا۔ چودھری صاحب سامنے بڑی احتیاط سے کپڑے میں مجھے لپٹوا کر اپنے بڑے بکس میں رکھواتے۔ خاص ہی خاص موقعوں پر مجھے اُس مانجھے سے نکالا جاتا جہاں مجھے دلہن بنا کر رکھا جاتا تھا۔ میرے نرم اور نازک جسم کو کیڑے مکوڑوں کی دست درازی سے بچانے کے لئے مجھے نیفتھلین کی گولیوں اور نیم کی پتی کی نگرانی میں آرام کرنے دیا جاتا۔ میں بدقسمت اس دور میں پیدا ہوئی تھی جہاں تیز خوشبو سے بیگمات کو چھینکیں آتی ہیں۔ موئی فنائل کی گولیاں میری زندگی اجیرن کئے ہوئے تھیں۔ سانس لینا محال تھا' ناک بند کئے کئے دم گھٹنے لگتا مگر سال کے دورے اور تعلقہ دار صاحب کی آمد پر ہی مجھے اس کال کوٹھری سے کچھ دیر کے لئے بڑے بکس سے رہائی ملتی۔ اس کے بعد پھر وہی کنج قفس پھر وہی "فولاد" کا گھر۔

زمینداری کے خاتمہ کے بعد جب چودھری صاحب تو

والے مقدمہ کی پیروی کے لئے کچہری جاتے تو مجھے بھی دنیا دیکھنے کو ملتی۔ میں بڑی بے چینی سے پیشی کے دن اس طرح گنا کرتی جیسے پرانا قیدی اپنی رہائی کے دن گنا کرتا ہے۔ جب چودھری صاحب پیشی پر جانے کیلئے تیار ہوتے تو مجھے بھی بڑے اہتمام سے بڑے بکس سے نکالتے۔ اور جب وہ مجھے پہن کر کھڑے ہوتے تو سیر و خود کاشت کی طرح بچا کھچا ان کا پرانا نوکر نقابی برش لے کر میری یا یوں کہئے کہ چودھری صاحب کی پیٹھ پر اس طرح برش پھیرنے لگتا جیسے وہ اگلے وقتوں میں چودھری صاحب کی کالی گھوڑی کے کھریرا کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد چودھری صاحب آئینے کے سامنے گردن کڑی کر کے یوں کالر ٹھیک کرتے جیسے معلوم ہوتا کہ ان کی گئی جائداد اور بیتی جوانی دونوں ساتھ واپس آ گئیں۔ اور پھر چودھری صاحب کا ہاتھ بے ارادہ مونچھوں پر پہنچ جاتا لیکن تاؤ دیئے بغیر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کمرے سے باہر چلے جاتے جہاں ایک چھپر کے نیچے کھڑی ان کی ٹوٹی ٹم ٹم ان سے معذرت کرتی ہوئی اور بغل میں کھڑے ہوئے اڈے پر سوار ہو کر اسٹیشن جانے کا اس طرح مشورہ دیتے معلوم ہوتی جیسے پہلے چودھرائن چادر کے مطابق پیر پھیلانے کا مشورہ دیا کرتی تھیں۔

باہر آکر چودھری صاحب جب اڈے پر سوار ہونے لگتے تو وہ میرے دامن سمیٹ کر جیبوں میں کر لیتے کہ کہیں اڈے کے پہیوں کی مٹی لگ کر انہیں داغ دار نہ کر دے۔ اڈے کے بیل چودھری صاحب کے ہمعصر ہونے کی بنا پر نہایت بے تکلفی سے اپنی دم ہلاتے اور مکھیوں کی گستاخی پر کان پھٹپھٹاتے، زمانہ کی تیز رفتار کے خلاف بطور احتجاج سست رفتاری سے چلتے رہتے تھے اور چودھری صاحب بیتے دنوں کی یاد میں گم ہو جاتے تھے۔ اگر بیل کبھی ایک پگڈنڈی کی طرف مڑنے لگتے تو گاڑی بان انہیں سیدھے راستے پر لگا دیتا۔ پگڈنڈی کی طرف بے اختیار بیلوں کے مڑنے پر چودھری صاحب چونک کر ایک آہِ سرد بھرتے کیونکہ یہ پگڈنڈی ان کی جوانی کی ٹیڑھی لکیر کی طرح گھومتی ہوئی اس گاؤں میں جاتی تھی جہاں ان کا یہ اودھا جوانی میں اکثر چودھرائن کی لاعلمی میں گیا تھا۔ بوڑھے بیل پرانی پگڈنڈی کی طرف مڑنے کی غلطی کا احساس کرتے ہی تیزی سے اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگتے اور چودھری صاحب اپنے دل کا بار کم کرنے کے لئے میرے جسم پر پڑی دھول جھاڑنے لگتے لیکن اسٹیشن پہنچنے تک نہ میرے جسم کی دھول کم ہوتی اور نہ ان کے دل کا بار۔

چودھری صاحب نے شہر میں ایک مقدمہ دائر کر رکھا تھا مقصد یہ تھا کہ بڑے چودھری یعنی ان کے باپ نے جو تھوڑی سی جائداد اپنے سالانہ فاتحے اور غریب بچوں کی تعلیم کے لئے گاؤں میں ایک مکتب کھولنے کی غرض سے وقف علی الخیر کی تھی وہ وقف ثابت نہ ہو اور اس کے بانڈ بھی چودھری صاحب کے نام بن جائیں کیونکہ بڑے چودھری کی عاقبت بنانے سے زیادہ چھوٹے چودھری کو اپنی دنیا سنوارنے کی فکر تھی۔ اس مقدمہ کی آخری پیشی کا آپ بھی حال سنئے کیونکہ یہ پیشی چودھری صاحب اور میرے دونوں کے لیے اہم ترین پیشی تھی۔

اسٹیشن پر اترنے کے بعد چودھری صاحب کچہری جانے سے پہلے وکیل صاحب سے ملنے کے لئے ان کے گھر جانے کے ارادے سے اسٹیشن کے باہر آئے۔ انھیں دیکھ کر دو ایک رکشے والے لپکے اور ایک نے چودھری صاحب کے ہاتھ سے بیگ چھین کر اپنے رکشے پر رکھ لیا۔ چودھری صاحب رکشے پر بیٹھ کر سیدھے اپنے وکیل کے گھر پہنچے۔ وکیل صاحب کے دفتر میں کچھ لوگ پیر سمیٹے اور کچھ پیر لٹکائے بیٹھے ہوئے بیڑی سگریٹ پی رہے تھے، مگر فیس کی فوری ادائیگی کے سلسلہ میں سب فکر مند تھے اور منشی جی کو پان سگریٹ پیش کر کے ہموار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن منشی جی اپنی ایک کمانی والی عینک کی طرح ایک ٹانگ کا مرغا بنے ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ چودھری صاحب کو دیکھ کر منشی جی نے اپنی عینک کا تاگا کان میں لپیٹتے ہوئے بڑی للکار سے آداب عرض کیا اور بیٹھنے کے لئے کرسی خالی کر دی۔ منشی جی نے پان کھا کر کرسی میں جو ہاتھ پونچھا تھا اس کا چونا ابھی تازہ تھا۔ چودھری صاحب نے یہ دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ میلا دامن چونے کتھے سے بچانے کے لئے کرسی پر بیٹھنے کے بجائے انھوں نے اس پر ایک پاؤں ٹکا کر اور اس کا تکیہ پکڑ کر کھڑے ہونا ہی مناسب

خیال کیا۔ واقعی انھیں اپنے آرام سے زیادہ میری حفاظت کا خیال تھا کیونکہ میں ان کی آن بان کے ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری کرن تھی جس پر وہ میل آنے نہیں دینا چاہتے تھے۔

تھوڑے انتظار کے بعد وکیل صاحب گھر سے برآمد ہوئے اور اپنے کمرے کی چوڑی میز کے بیچ میں رکھی ہوئی اونچے تکیے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ وکیل صاحب کو دیکھتے ہی وہ موکل جو برآمدے اور صحن میں اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے سمٹ کر ٹوٹی کرسیوں اور ثابت بنچوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ منشی جی بھی عینک سنبھالتے اور بھی ہوئی بیڑی ہاتھ سے پھینکتے ہوئے وکیل صاحب کے قریب والی کرسی پر بیٹھ کر فائلوں کو اِدھر سے اُدھر رکھنے لگے۔ وکیل صاحب، چودھری صاحب کو دیکھ کر بڑے تپاک سے بولے: "آپ نے کیسے زحمت کی؟" چودھری صاحب نے اسی تپاک سے لیکن کچھ پریشانی کے ساتھ کہا کہ آج وہ وقف والے مقدمے کی پیشی ہے نا! اس پر وکیل صاحب اس طرح چونکے جیسے ان کے حافظے سے چودھری صاحب کا مقدمہ اسی طرح غائب ہو گیا ہو جیسے پچھلی پیشی پر ان کی فیس۔ لیکن جس طرح اُنھوں نے پچھلی پیشی پر چودھری صاحب سے فیس نہیں مانگی تھی اسی طرح اُنھوں نے آج بھی یہ ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ ان کی پیشی کی تاریخ ڈائری میں لکھ کر بھول گئے ہیں، بلکہ منشی جی سے کہا کہ آپ نے چودھری صاحب کے مقدمہ کی فائیل بستے میں رکھ لی ہے نا! اس پر پہلے تو منشی جی کچھ گڑبڑائے لیکن پھر سنبھل کر بولے: "وہ تو میں نے آپ کے دیکھنے کے بعد رات ہی کو بستے میں کچہری لے جانے کے لئے رکھ لی تھی۔" اس طرح اُنھوں نے نہ صرف اپنی مستعدی ظاہر کر دی بلکہ وکیل صاحب کی فرض شناسی کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ یہی وہ حاضر دماغی تھی جس کی بنا پر وکیل صاحب منشی جی کی اور دوسری کوتاہیوں کے باوجود انھیں اپنے یہاں سے کسی طرح جانے نہ دیتے تھے۔ اس کے بعد منشی جی چودھری صاحب کو اشارے سے بلا کر کمرے سے باہر نکل آئے اور ان کے ساتھ ہی چودھری صاحب بھی باہر آ گئے۔

چودھری صاحب کی عمر بھی بقول شخصے اسی دشت کی سیاحی میں گذری تھی۔ وہ منشی کے اشارے کا مطلب فوراً سمجھ گئے اور باہر نکلتے ہی اُنھوں نے میری جیب سے بڑی احتیاط سے دو روپے کا نوٹ نکال کر ان کے حق سے پہلے ہی سبکدوش ہونے کے لئے ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر بے تکلفی سے منشی جی کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ کر رازداری سے بولے کہ وکیل صاحب کی پچھلی پیشی کی فیس کچہری میں دوں گا۔ منشی جی اپنا حق تو پا ہی چکے تھے اس لئے وکیل صاحب کی فیس کے متعلق خاموش رہ کر نیم رضامندی کا اظہار کرنا ہی مناسب خیال کیا اور چودھری صاحب بھی جواب کا انتظار کئے بغیر میری؟) خالی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کمرے کی طرف کچھ سوچتے ہوئے اس طرح بڑھے جیسے ان میں فیس کی رقم تلاش کر رہے ہوں۔ وکیل صاحب کو منشی جی کا مطمئن چہرہ دیکھ کر اپنی فیس کی طرف سے بھی اطمینان ہو گیا اور وہ دوسرے موکلوں سے مقدمہ کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔

چودھری صاحب نے اپنی فائل منشی جی سے اپنے سامنے الماری سے نکلوا کر آج کچہری جانے والی فائلوں میں رکھوا دی اور اس طرف سے اطمینان کر کے کہ اب وکیل صاحب پیشی پر پہنچنا نہ بھولیں گے منشی جی سے رخصت ہو کر کچہری جانے کے لیے باہر آ ہی رہے تھے کہ منشی جی نے لپک کر بڑی رازداری سے کہا کہ: "دیکھئے وکیل صاحب کی فیس کا خیال رکھئے گا۔ پچھلی پیشی کی فیس آج ضرور ادا ہو جانی چاہئے ورنہ وکیل صاحب بیٹھے سے اکھڑ جائیں گے۔" چودھری صاحب بولے: "دیکھئے منشی جی آج کی پیشی گول نہ ہونے پائے، فیس کا انتظام تو میں شام تک کر ہی دوں گا۔ اسی پھیر میں کچہری جا رہا ہوں۔ آج خزانہ زمینداری بانڈ کی قسطیں مل گئیں تو فیس بھی ادا کر دوں گا اور آپ کو گرم چائے اور چٹپٹے دال موٹ بھی کھلواؤں گا۔" منشی جی تصور میں چائے اور دال موٹ کا مزا لیتے ہوئے بولے: "پیشی کی طرف سے بےفکر رہیے۔ عدالت پر آپ چاہے پہنچیں یا نہ پہنچیں آپ کا کام سولہ آنے کیا سوا سولہ آنے پورا ہو گا۔"

چودھری صاحب جاتے جاتے پلٹے اور کہا کہ "ہاں! دیکھئے منشی جی ایک بات تو بھولا ہی جا رہا تھا۔ کیا کہوں بڑھاپے کا اثر معلوم ہوتا ہے سب سے پہلے یاد ہی پر پڑتا ہے۔" "جی ہاں! اسی

تو آپ کبھی کبھی وکیل صاحب کو فیس دینا اور وکیل صاحب آپ کی بیتی پر جانا بھول جاتے ہیں۔" منشی جی مسکراتے ہوئے بولے "مگر منشی جی! تمہارا حافظہ تو بڑھاپے میں بھی ویسے ہی جوان ہے۔ میرے یار تم تو کبھی اپنا حق وصول کرنا نہ بھولے" چودھری صاحب نے جواب دیا۔ منشی جی نے فوراً جواب دیا "چودھری صاحب یہ تو کاٹھی کی بات ہے" اس پر دونوں ہنس پڑے۔ اس کے بعد چودھری صاحب قسطیں وصول کرنے کے چکر میں کچہری اور منشی جی اپنا حق وصول کرنے کے پھیر میں موکلوں کو پھسلانے چلے گئے۔

چودھری صاحب تحصیل کی کچہری پہنچے تو دیکھا کہ اسٹامپ فروش منشی چنی لال کچہری کے پھاٹک کے پاس نیم کے درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھے ٹکٹوں پر جلدی جلدی خریدنے والے کا نام لکھ رہے ہیں اور زبان پر ٹکٹ رکھ کر وکالت ناموں اور درخواستوں پر چپکا رہے ہیں۔ جب چودھری صاحب قریب پہنچے تو انھوں نے اپنی ناک کی پھنگی پر رکھی ہوئی عینک کے اوپر سے دیکھا اور بڑی للکار سے آداب عرض کر کے ٹکٹ خریدنے والوں کو بقیہ دام واپس کرنے میں پھر لگ گئے۔ منشی چنی لال اپنے اصول کے بڑے پابند تھے۔ چاہے جتنی جان پہچان ہو لیکن دام پہلے وصول کر لیتے، ٹکٹ بعد کو دیتے۔ چودھری صاحب بھی رسمی مزاج پرسی کے بعد آگے بڑھ گئے کیونکہ بانڈ کی قسطیں لینے کے لئے انھیں اسٹامپ کی تو ضرورت تھی نہیں لیکن پھر خیال آیا کہ رسیدی ٹکٹ تو لیتے چلیں، وہ تو لینا ہی پڑیں گے۔ چنانچہ انھوں نے دو رسیدی ٹکٹوں کے لئے منشی چنی لال سے کہا۔ خیر وہ چودھری صاحب کی مروت میں یا معمولی رقم کی بنا پر پیسے ہاتھ میں پہنچے بغیر ٹکٹ صندوقچے سے نکالنے لگے مگر چودھری صاحب منشی جی کے اصول سے واقف تھے اس لئے انھوں نے ان کے ٹکٹ دینے سے پہلے ہی چونّی ان کے سامنے فرش پر ڈال دی اور پانچ نئے پیسے کی واپسی کے لئے ذرا اوپر رُکے۔ لیکن منشی چنی لال پیسے واپس کرنے کے بجائے پھر ٹکٹوں پر تھوک لگا کر درخواستوں پر چپکانے میں اس طرح مشغول ہو گئے جیسے کہہ رہے ہوں "کیا میرے تھوک کی اتنی بھی قیمت نہیں؟ اگر آپ رسید کا فارم لائے ہوتے تو کیا میں اس پر ٹکٹ نہ چپکا دیتا؟"

مگر معلوم یہ ہوا کہ ٹکٹوں کے دام یہاں تک آتے آتے بغیر تھوک کی قیمت ملائے یوں ہی بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے بعد چودھری صاحب منشی چنی لال کے چبوترے کے قریب تخت پر موکلوں کی تاک میں بیٹھے اور پان کھا کھا کر وقت گذاری کرنے والے ایک وکیل صاحب کی لمبی پیک سے میرا دامن بچاتے ہوئے معاوضہ دفتر کی طرف بڑھ گئے۔

یہاں انھوں نے دیکھا کہ ان کے جیسے بہت سے سابق زمیندار جوتوں پر سفر کی گرد جمائے اور بغلوں میں بانڈ دبائے سالانہ قسطیں لینے آئے تھے۔ ان میں سے اکثر کی قمیص کرتے میں اور شیروانی بند گلے میں تبدیل ہو چکی تھی اور جو دو ایک چودھری صاحب کی طرح زیادہ ضعیدار قسم کے لوگ تھے تو ان کی شیروانیاں تو نہیں بدلی تھیں لیکن ان کا رنگ اور روپ اتنا بدل گیا تھا کہ شیروانی کے بجائے شیروانی کا سایہ معلوم ہوتی تھیں جو پُرانے خیالات کی طرح ان کے پیچھے لگا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان میں نہ تو سب چودھری صاحب تھے اور نہ چودھری صاحب کی طرح محتاط جو اپنی شیروانیوں کو زمانے کے جھونکوں سے بچانے کے لئے فنائل کی گولیوں کی چھاؤں میں ہمیشہ رکھتے۔ اپنے بھائی بندوں کی بد وضعی دیکھ کر چودھری صاحب کو بُرا تو ضرور معلوم ہوا لیکن جب میرے لرزتے ہوئے دامن پر ان کی نظر پڑی تو انھیں بھی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ان کی سکڑتی ہوئی جیب کے ساتھ ساتھ ان کی شیروانی بھی سکڑ کر بنڈی میں تبدیل ہونے کی فکر میں ہے اور وہ زبردستی اس کا دامن پکڑے ہوئے ہیں۔

لیکن یہ محض ان کا وہم تھا۔ میں اب بڑھاپے میں کوئی نیا چولا بدلنے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ میرا جوڑ جوڑ جواب دے رہا تھا۔ میرا رویاں رویاں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ مجھ میں اب زیادہ زندہ رہنے کا یارا نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر انسانوں کی زندگی بھی زبردستی اتنی طویل کر دی جائے جتنا چودھری صاحب نے میری زندگی کو طول دے دیا تھا تو شاید وہ بھی جینے کی دعائیں مانگنے کے بجائے مرنے کی تمنا کرنے لگیں۔ مجھے یقین تھا کہ چودھری صاحب میرا آپریشن کرا کے بنڈی کے روپ میں مجھے نیا جنم دینے کی کوشش نہ کریں گے۔ انھیں میرا چھریرا اسڈول بدن بہت پسند تھا۔

بہرحال چودھری صاحب ابھی بانڈ کے دفتر پہنچے نہ تھے کہ منشی جی بغل میں بستہ دبائے منکر نکیر کی طرح آ پہونچے۔ پیشی کی پکار میں ابھی دیر تھی اس لئے منشی جی نے چودھری صاحب کی ہمدردی میں نہیں بلکہ چائے اور دال موٹ کے لالچ میں اور وکیل صاحب کی فیس کی ادائیگی کے لئے معاوضہ دفتر میں لوگوں سے مل ملاکر بانڈ کی قسطیں دلوانے میں جلدی کرادی۔ لیکن ابھی رسید پر وکیل صاحب کی تصدیق کا مرحلہ باقی تھا جو ذرا ٹیڑھی کھیر تھی اس لئے کہ وکیل صاحب یہ معلوم کرکے بہت جزبز ہوئے تھے کہ ابھی تک منشی جی نے چودھری صاحب سے ان کی پچھلی فیس بھی نہیں جمع کرائی ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ وکیل کا منشی بھی وکیل سے کچھ کم نہیں ہوتا بلکہ شاید دو چار ہاتھ آگے ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ منشی جی نے گدّی کھجلاکر دماغ پر ذرا سا زور دیا کہ ترکیب سمجھ میں آگئی اور وہ رسید لے کر تصدیق کے لئے وکیل صاحب کی تلاش میں بھاگے۔

وکیل صاحب ایک عدالت میں کھڑے فریق مخالف کے ایک گواہ کا بیان سُن رہے تھے اور جرح کے لئے پَر تول رہے تھے کہ منشی جی نے پیچھے سے ان کی کالی شیروانی کا لمبا دامن گھسیٹا۔ خیریت یہ ہوئی کہ یہ وکیل صاحب کی جوان شیروانی تھی، چودھری صاحب کی بوڑھی شیروانی نہ تھی ورنہ وہ گرکر مٹی میں مل بھی جاتی اور وکیل صاحب کو خبر بھی نہ ہوتی۔ وکیل صاحب نے منشی جی کی طرف مڑکر کڑوی نگاہ سے دیکھا مگر عدالت کے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے انھیں ڈانٹنے کے بجائے تھوڑا سا کھسک کر ان کی طرف کان بڑھادیا۔ منشی جی نے کان میں چپکے سے کہا جلدی سے چودھری صاحب کی رسید پر تصدیق کر دیجئے ورنہ دیر ہوجائے گی تو خزانے سے روپیہ نہ مل سکے گا اور آج بھی فیس گول ہوجائے گی۔ وکیل صاحب نے بغیر کچھ کہے جلدی سے فاؤنٹن پن نکال کر تصدیق کردی اور منشی جی کی اس طرح باچھیں کھل گئیں جیسے وکیل صاحب کی فیس کے ساتھ ساتھ انھیں بھی اپنی پیروی کا محنتانہ ملیگا۔ لیکن چونکہ وہ چودھری صاحب سے اپنا حق الخدمت پہلے ہی وصول کرچکے تھے اس لئے تصدیق کرائی کا مزید محنتانہ وصول کرنے کے لئے وہ منہ بنائے ہوئے چودھری صاحب کے پاس پہنچے اور کہا کہ وکیل صاحب تو تصدیق کا نام سنتے ہی الف ہوگئے اور کہنے لگے "میں اب یہ نہیں کرنے کا۔ آپ کو چودھری صاحب کا بڑا خیال ہے تو کسی کو دو روپئے دے کر تصدیق کرا دیجئے۔" میں نے بنا بنایا کھیل بگڑ دیکھ کر وہی دو روپئے والا نوٹ جو آپ نے مجھے کچھ دیر ہوئے دیا تھا صاحب کی جیب میں رکھ دیا اور معاملہ سر کرلیا۔"

اب چونکہ وکیل صاحب کی فیس کے علاوہ اپنے دو روپئے وصول کرنے تھے اس لئے منشی جی نے خزانچی صاحب سے کہہ سُن کر جلد روپیہ برآمد کرادیا اور وکیل صاحب کی فیس اور اپنا محنتانہ وصول کرنے کے ساتھ ساتھ چائے اور دال موٹ پر بھی ہاتھ صاف کیا اور چودھری صاحب کو یہ اطمینان دلاکر کہ جب مقدمہ کی پکار ہوگی تو میں آپ کو بُلالے جاؤں گا رخصت ہوگئے۔ پھر چار بجے کے قریب یہ خوشخبری لے کر آئے کہ آج ڈپٹی صاحب دورے پر چلے گئے ہیں اس لئے پیشی اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کے لئے بڑھادی گئی۔

چودھری صاحب فیس دے کر اور پیشی کی تاریخ لے کر کچہری سے شہر کی طرف روانہ ہوگئے لیکن عادت کے خلاف وہ اپنے ہاتھ جیبوں میں رکھنے کے بجائے اس طرح الگ لٹکائے ہوئے تھے جیسے اب مجھ سے دستبردار ہونا چاہتے ہیں۔ وہ یکّے پر جانے کے بجائے پیدل ہی شہر جا رہے تھے۔ اُس وقت خیالات میں ایسے ڈوبے ہوئے کہ معلوم ہوتا تھا وہ پیدل اسی لئے چل رہے ہیں کہ انھیں سوچنے کا موقعہ زیادہ مل سکے۔ شاید وہ کوئی بڑا فیصلہ کرنے والے تھے۔ حسب معمول گھر لے جانے کے لئے پھل، بسکٹ اور چائے وغیرہ خریدنے کے بجائے بزازے کی طرف تیزی سے بڑھ گئے۔ عادت کے مطابق۔ چھان بین کرکے کپڑا خریدنے کے بجائے وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح پہلی ہی دوکان پر بیٹھ گئے اور بنڈی بنوانے کے لئے کچھ کپڑا دیکھنے کو مانگا۔ کپڑا خرید کر وہ تیزی سے درزی کی دوکان کی طرف بڑھے جیسے وہ بنڈی سلوانے نہیں کفنی سلوانے جا رہے ہوں اور میت اُٹھانے میں دیر ہو رہی ہو۔

درزی کی دوکان پر پہنچتے پہنچتے ان کی سانس تیزی سے...

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۰ پر)

اُتر پردیش شاہراہ ترقی پر

سنہ ۱۹۶۳ء — تعمیری سرگرمیوں کا سال — مشرقی اُتر پردیش کی ترقی — گنّے کی کاشت کے علاقوں کے لیے ٹیوب وِل — مزید ضلعوں کو بجلی — متفرقات

اتر پردیش کے لیے سنہ ۱۹۶۳ء اختیارات کی لامرکزیت اور پیداوار بڑھانے کے لیے عوام کے عزم مصمم کا سال تھا۔

زیر نظر سال کے دوران ضلع پریشدوں کا قیام عمل میں آیا جو پنچایتی راج کا ایک اہم جزو ہے۔ ضلع کی سطح پر بیشتر سرکاری کام ضلع پریشدوں کو سونپ دیے گئے۔

سال رواں میں ۸۰ء۵۰ لاکھ ٹن کی زرعی پیداوار کے نشانہ کے حصول کے لیے کسانوں کی ہمت افزائی کے پیش نظر حکومت نے دور رس فیصلے کیے۔ کیمیاوی کھاد کی تقسیم کسانوں کو دیے جانے والے مختصر مدت کے قرضوں سے مربوط کر دی گئی۔ مزید برآں تقاوی کے طور پر کیمیاوی کھاد دینے کے لیے ۴ کروڑ روپیہ کی رقم مقرر کی گئی۔ زرعی سامان کی فراہمی کے انتظامات کو بہتر بنانے کے لیے زرعی سامان کی فراہمی سے متعلق ایک تنظیم قائم کی گئی۔

خدمتی امداد باہمی انجمنوں کے دائرہ عمل میں ۴۰۸۷ سے زیادہ مواضعات آ گئے۔ آب پاشی کے موجودہ وسائل کو بہ سرعت کام میں لانے کے لیے ایک مہم چلائی گئی اور سریع نتائج حاصل کرنے کے لیے آب پاشی کی چھوٹی اسکیموں پر زیادہ زور دیا گیا۔

دیہی رضاکار فورس کی اسکیم میں مزید توسیع کی گئی اور ۴۵۲۵ گرام پنچایتوں نے اس شرم دان کو کام میں لانے کے لیے پلان بنائے جن کی پیش کش ڈیفنس لیبر بینکوں کو کی گئی۔ ان بینکوں کو ۱۵ء۴۲ کروڑ کام کے دنوں کی پیش کش کی گئی۔ علاوہ ازیں شرم دان کے عوض ۲۱ء۴۰ لاکھ روپیہ سے زیادہ جمع کیا گیا۔

صنعتی ترقی کے میدان میں آجروں اور مزدوروں کے درمیان تعلقات خوشگوار رہے۔ ضلع سہارنپور میں سرسوال میں ایک نئی امداد باہمی شکر فیکٹری قائم کی گئی جس کی پیداوار کی صلاحیت ... ٹن یومیہ ہے۔ ضلع مرزاپور میں ایک نئی سرکاری سیمنٹ فیکٹری کے لیے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں نئے سامان کی تیاری کے لیے دو سرکاری کارخانوں، چرک سیمنٹ فیکٹری اور گورنمنٹ پریسیزن انسٹرومنٹ فیکٹری کی توسیع کی گئی۔ زیر نظر سال کے دوران نئے اداروں کے قیام کے لیے ۷۹ نئے لائسنس بھی منظور کیے گئے۔

ریاست کے بجلی کے عظیم پروجیکٹ ریہاند کا وزیر اعظم نے افتتاح کیا۔ ریہاند کو اور گورکھپور کے اسٹیم پاور اسٹیشنوں سے ملانے کے علاوہ اس سال اکتوبر تک اس کو کانپور سے ملانے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ بجلی کے دیگر تین بڑے پروجیکٹوں یعنی جمنا۔ ماتا ٹیلہ اور ہردوا گنج میں رات دن کام جاری رہا۔

زیر نظر سال کے دوران تعلیم کی تیز تر توسیع کی گئی۔ داخلوں کی خصوصی مہموں کے نتیجہ میں ۶ سے ۱۱ سال تک کے اسکولی بچوں کا فی صد بڑھ کر ۵۲ ہو گیا جو گزشتہ سال ۴۸ تھا۔ سیکنڈری اسکولوں میں سائنس پڑھانے کی مزید سہولتیں مہیا کی گئیں اور بے روزگار اور بیرونی امیدواروں کے لیے نئے تربیتی کورس شروع کیے گئے۔ اتر پردیش میں تمام انڈر گریجویٹ طلباء کے لیے این۔ سی۔ سی ٹریننگ لازمی کر دی گئی۔

ریاست میں ڈاکٹروں کی کمی دور کرنے کے لیے حکومت نے میرٹھ میں جلد ایک نیا میڈیکل کالج قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں اور

موجودہ کالجوں میں داخلہ کی ۲۵ فی صدی گنجائش بڑھادی ہے۔ زیر غور سال کے دوران خاندانی منصوبہ بندی کو مقبول بنانے کے لیے دیہی علاقوں میں مزید ۲۰۰ اور شہری علاقوں میں ۱۰ مرکز قائم کیے گئے۔

حکومت نے آئندہ اپریل میں لوکل باڈیز کے انتخابات منعقد کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ میونسپل نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے میونسپل سروسوں کو صوبائی بنانے کے اقدامات کیے گئے۔

منصوبہ بندی کمیشن اور ریاستی حکومت کی مشترکہ اسٹڈی ٹیم نے مشرقی اتر پردیش کی ترقی کے لیے ایک سات سالہ جامع منصوبہ بنایا ہے۔ مذکورہ ٹیم نے محکمہ منصوبہ بندی میں مخصوص علاقوں سے متعلق ایک مرکز کے قیام کی تجویز بھی رکھی ہے جو دوسرے پسماندہ علاقوں کے لیے بھی اسی قسم کے منصوبے بنائے گا۔

پارلیمنٹ میں اتر پردیش کے متعدد مشرقی اضلاع کی پسماندگی پر بحث و مباحثہ کے بعد سال رواں کے شروع میں یہ ٹیم مقرر کی گئی جس کے چیئرمین منصوبہ بندی کمیشن کے مشیر شری۔ بی۔ بی۔ پٹیل ہیں۔ ٹیم نے تقریباً قریب اپنا مطالعہ مکمل کر لیا ہے۔

تمام سیکٹروں میں ٹیم کی سفارشات پر عملدرآمد کرنے پر تقریباً ۸۴ کروڑ روپیہ خرچ ہونے کا امکان ہے جس میں سے ۱۰ کروڑ روپیہ منصوبہ کے بقیہ برسوں میں اور ۷۴ کروڑ روپیہ چوتھے منصوبہ کے دوران خرچ کیا جائے گا۔

ریاستی وزیر اعلیٰ شریمتی سوچیتا کرپلانی نے گذشتہ ۱۸ نومبر کو ٹیم سے تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا تھا کہ مجوزہ منصوبہ کے لیے سرمایہ فراہم کرنا ریاستی حکومت کی استطاعت سے باہر ہوگا اور اس مقصد کے لیے مرکز کو منصوبہ کے لیے مقررہ رقومات کے علاوہ مزید امداد دینا ہوگی۔

ٹیم نے اپنی سفارشات میں زرعی پیداوار کو نمایاں اولیت دی ہے۔ اس علاقہ کی فی کس آمدنی کو ملک کی موجودہ فی کس آمدنی یعنی ۳۲۰ روپیہ کی سطح تک لانے کے لیے زرعی پیداوار کو دوگنا کرنا پڑے گا۔ اس مقصد کے لیے بہت بڑے پیمانہ پر آبپاشی دوہری فصل۔ کیمیاوی کھاد کے

تتمہ

استعمال اور امدادباہمی قرضوں کی ضرورت ہوگی۔ ٹیم کے کہنے کے مطابق ۶۰ فی صدی مزید علاقہ کو سیراب کرنے کی کوشش کی جانا چاہیے جبکہ اب تقریباً ۳۰ فی صدی علاقہ سیراب کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کے وسائل مہیا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ریاست کی آبپاشی کی اسکیموں کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس سلسلہ میں نجی کوشش بھی کی جائے۔ ٹیم نے تقاوی قرضوں کی شرائط کو آسان بنانے۔ قرضوں کی ادائیگی کی مدت میں توسیع اور نجی آبپاشی کی پروگرام کے لیے ۵۰ فی صدی تک مالی امداد دینے کی بھی سفارش کی ہے۔

آب پاشی کے لیے سستی بجلی کی فراہمی کے لیے بجلی لائنوں کا سلسلہ قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے ریاستی بجلی بورڈ، قصبوں اور مواضعات کو بجلی فراہم کرنے کے لیے ایک سریع پروگرام شروع کر رہا ہے۔

اسٹڈی ٹیم کی ایک دوسری اہم سفارش رسل و رسائل اور نقل و حمل کے ذرائع کی توسیع سے متعلق ہے۔ اس علاقہ میں رسل و رسائل کے ذرائع اب بھی بہت زیادہ فرسودہ ہیں۔

ان ضلعوں کی بہت زیادہ دیہی آبادی اور پسماندگی کے پیش نظر اسٹڈی ٹیم نے رسل و رسائل کے ذرائع کو بہتر بنانے اور اس سلسلہ میں بالخصوص پلوں اور سڑکوں کی تعمیر کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

سماجی خدمات کے ضمن میں اسٹڈی ٹیم نے لڑکیوں کی تعلیم کی توسیع اور خاندانی منصوبہ بندی پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم کے معاملہ میں یہ علاقہ بہت زیادہ پیچھے ہے اور چھ سے گیارہ سال تک کی عمر کے گروپ میں تقریباً ۹۰ فی صدی لڑکیوں کی تعلیم کی سہولتیں حاصل نہیں ہیں۔ اس طرح اس علاقہ میں آبادی کے اضافہ کے مسئلہ کو بھی نمایاں اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔ اسٹڈی ٹیم دیہی علاقوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی توسیعی خدمات کو تقویت پہنچانے کی تدابیر پر غور و خوض کر رہی ہے۔

اسٹڈی ٹیم نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے گورکھپور ڈویژن میں دیوریا اور اعظم گڑھ اور وارانسی ڈویژن میں جونپور اور غازی پور کے ضلعوں کو منتخب کیا۔ یہ اضلاع اس لیے چنے گئے کیونکہ ان کے جائزہ سے مشرقی اتر پردیش کے مسائل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

...مجھوہی ... اگرچہ ان تمام ضلعوں میں تین پنچ سالہ منصوبے
... پروگرام کے مصارف میں برابر اضافہ ہوتا رہا ہے لیکن
... سے پہلے ان علاقوں کی ترقی کے مسائل کو عرصہ دراز تک نظرانداز
... نے سے ان علاقوں اور دوسرے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ علاقوں
... اقتصادی حالات میں کافی فرق رہا ہے۔ پہلے پنچ سالہ منصوبہ کے دوران
... ملا میں فی کس صرف محض ۱۴ روپیہ تھا۔ دوسرے پنچ سالہ منصوبہ میں
... بڑھ کر تقریباً ۵ء۲۶ روپیہ ہو گئی۔ اسٹڈی ٹیم کے نظرثانی شدہ
... کے مطابق تیسرے منصوبہ کے تحت تقریباً ۳۹ء۵ کروڑ روپیہ
... فی کس ۵۰ روپیہ سے زیادہ) صرف ہونے کا امکان ہے مشرقی
... دیش میں آب پاشی، انسداد سیلاب اور بجلی کے بہت سے منصوبوں
... در آمد کیا گیا لیکن ان میں سے بیشتر سے ابھی پورا پورا فائدہ اٹھایا
... جا سکا ہے۔

... گنے کی کاشت کے علاقوں میں ۱۲۸۰۰ ایکڑ آراضی کو آبپاشی
... سہولتیں فراہم کرنے کے پیش نظر ۳۲۴ ٹیوب ویل تعمیر کیے جائیں
... ان میں سے ۱۰۰ ٹیوب ویل ریاست کے مشرقی اضلاع میں
... بنے جائیں گے جن سے ۱۲۲۵۶۰ ایکڑ آراضی کے لیے آبپاشی کی سہولتیں
... ہو جائیں گی۔

یہ اطلاع نائب وزیر آبپاشی شری شانتی پرپنہ شرما نے دھان سبھا
... والات کے وقفہ میں دی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ یہ سہولتیں ان
... کے علاوہ ہوں گی جو تیسرے منصوبہ کے تحت عمل درآمد کیا جا رہا
... اور جن کے تحت ۴ ۹۵۲۹۰ ایکڑ آراضی کو بڑی اسکیموں کے ذریعہ
... ۲۷۲۳۴ ایکڑ کو چھوٹی اسکیموں کے ذریعہ آبپاشی کی سہولتیں فراہم
... نے کی تجویز ہے۔

شری شرما نے مزید بتایا کہ مشرقی اضلاع میں مزید ۱۱ ٹیوب ویل
... بنے جائیں گے جن سے ۱۳۸۰۰۰ ایکڑ آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم
... ہو جائیں گی۔ اس کام پر ایک کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔

نائب وزیر نے کہا کہ ان اسکیموں سے جونپور، گورکھپور، دیوریا، بستی،
... گونڈہ، فیض آباد، وارانسی، غازی پور، بلیا، سلطان پور، الہ آباد، مظفر نگر،
میرٹھ، بجنور، بہرائچ، مراد آباد، سیتاپور، رام پور اور بارہ بنکی کے اضلاع
مستفید ہوں گے۔

شری شرما نے مزید کہا کہ موجودہ ٹیوب ویلوں کی آبپاشی کی صلاحیت
میں اضافہ کرنے کے پیش نظر ۱۲۵ میل لمبی پکی اور ۲۰۰۴ میل لمبی کچی
نالیوں کی تعمیر کے لیے بھی احکام جاری کیے جا چکے ہیں۔ صرف مشرقی
اضلاع میں موجودہ منصوبہ کی مدت میں مذکورہ اسکیم پر تقریباً ۶ لاکھ
روپیہ کی لاگت آئے گی۔

حکومت اترپردیش نے ریاست میں تیئیس اضلاع کو مزید ۴۰۰ کلوواٹ
بجلی کی منظوری دی ہے۔ ان میں سے الہ آباد اور وارانسی کے ضلعوں
کو فوری طور پر دو دو ہزار کلوواٹ بجلی دی گئی ہے۔

بقیہ ۲۱ ضلعوں کو آئندہ ۲۱ اپریل سے جب ہردوا گنج میں ۳۰۰۰۰
کلوواٹ کے ایک دوسرے سیٹ کے چالو ہو جانے کی امید ہے فی ضلع ۵۰۰
کلوواٹ بجلی دی جائے گی۔ اگرچہ ان اضلاع کو واقعی بجلی آئندہ ۲۱ اپریل سے
فراہم کی جائے گی تاہم ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ اس تاریخ
قبل ہی مستقبل میں بجلی لینے والوں کے لیے تمام لوازمات اور کام مکمل کر لیں۔

علاوہ ازیں میرٹھ اور علی گڑھ کے اضلاع میں سے ہر ایک کو مزید
۵۰۰ کلوواٹ بجلی دی جا چکی ہے۔

جن اضلاع کو آئندہ اپریل سے بجلی دی جائے گی ان کے نام یہ ہیں۔
بلند شہر، مظفر نگر، مراد آباد، دہرہ دون، سہارنپور، متھرا، مین پوری، ایٹہ، بجنور، بدایوں،
رام پور، شاہجہاں پور، پیلی بھیت، فرخ آباد، اٹاوہ، نینی تال، ہردوئی، لکھیم پور کھیری،
سیتا پور، آگرہ اور بریلی۔

ان ضلعوں کے ضلع مجسٹریٹوں کو یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ ٹیوب ویلوں
کے لیے بجلی کی فراہمی سے متعلق درخواستوں پر جلد کارروائی کریں۔

متفرقات

فوجیوں اور سابق فوجیوں کو اولیت۔ نظامت پنچایت
ضلع منصوبہ بندی افسروں سے کہا ہے کہ وہ دیہی علاقہ ... ۱۸۸۵
اسکیم کے تحت قرضے دیتے ... موجودہ ...

اس اسکیم کے تحت کسی زر یا امداد باہمی انجمن کے ممبر کو پانچ روپیہ فیصد شرح سود پر دو ہزار روپیہ تک بہ طور قرضہ دیا جاتا ہے۔ یہ قرضہ سالانہ قسطوں پر ۱۰ یا ۲۰ برسوں میں وصول کیا جاتا ہے۔ قرضہ لینے والوں کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اسکیم کے تحت چیف انجینیر محکمہ دیہی اور شہری منصوبہ بندی کے مقررہ نقشہ اور رہنما اصولوں کے مطابق مکان تعمیر کریں۔

لوکل باڈیز کے ملازموں کی سبکدوشی کی عمر۔ حکومت اترپردیش نے ضلع پریشدوں، میونسپل بورڈوں اور کارپوریشنوں کے ملازموں کی ملازمت سے سبکدوشی کی عمر ۵۸ سے بڑھا کر ۶۰ سال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت کے فیصلہ میں یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے کہ حکام تقرری ان ملازموں کی ملازمت کی مدت میں ۶۰ سال کی عمر کے بعد دو سال کی توسیع کر سکتے ہیں۔ لوکل باڈیز سے کہا گیا ہے کہ وہ ان ملازموں کو جن کی عمر ابھی ساٹھ سال کی نہیں ہوئی ہے ملازمت سے سبکدوش نہ کریں۔

خچروں کی افزائش نسل کے لیے۔ حکومت اترپردیش نے خچر پالنے والوں کو اچھی نسل کی گھوڑیاں خریدنے کے لیے امسال مالی سال کے دوران ۰۰۰،۷ روپیہ کی مزید مالی امداد منظور کی ہے۔ اس مقصد کے لیے اس سے پہلے ۰۰۰،۷۵،۱ روپیہ کی رقم منظور کی جا چکی ہے۔ یہ مالی امداد زیادہ سے زیادہ ۳۵۰ روپیہ فی گھوڑی کے حساب سے دی جاتی ہے۔

اسکول کے بچوں کو مفت دودھ۔ ریاستی حکومت نے پرائمری اسکول کے بچوں کو مفت دودھ کی فراہمی سے متعلق اسکیم پر عمل درآمد کے لیے ۲ لاکھ روپیہ منظور کیا ہے۔

یاد ہوگا کہ اترپردیش کے ۱۰ اضلاع میں ۵۰ ہزار طلبا کو مفت دودھ فراہم کرنے کے پیش نظر ایک اسکیم یونیسف کے تعاون سے کچھ عرصہ قبل شروع کی گئی تھی۔



تصحیح: نیا دور (اکتوبر ۱۹۶۶ء) میں جناب متین سرورش کا نظم بعنوان "تجدید پیمانِ وفا" شایع ہوئی تھی۔ اس نظم کے کچھ مصرعے الفاظ پلیٹ پر حرف اُڑ جانے یا کتابت کی غلطی سے صحیح نہیں چھپے۔

دوسرے بند کا آخری شعر یہ ہونا چاہیے:

ہماری دادِ جاں بازی بقائے امنِ عالم پر ہماری فکر ہے روشن چراغ ذہنِ آدم

پانچویں بند کا پہلا مصرع یہ ہوگا: فضائے آرزو دیکھو او ر آتش ریز ہو

اسی بند کا آخری شعر اس طرح ہے:

ہمارے جوشِ خودداری کا ہر منزل پہ چرچا ہے ہمارے عزم و ہمت کا زمانے میں ہے



چودھری کی کہانی ___ شیروانی کی زبانی

(بسلسلہ صفحہ ۴۲)

گی۔ وہ ٹیلر ماسٹر کے سلام کا جواب مشکل سے دے پائے اور دم لینے کے لیے جلدی سے جوتا اُتار کر دکان کے کھمبے کی ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کئی بار کچھ کہنا چاہا لیکن الفاظ ان کی حلق میں کڑوے گھونٹ کی طرح اٹک کر رہ گئے۔ وہ بار بار میرے دامن پر اس طرح ہاتھ پھیر رہے تھے جیسے وہ چودھرائن کا سر اُن کے مرتے وقت سرہانے بیٹھے ہوئے سہلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کپڑا ماسٹر صاحب کی طرف اٹھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ اس کی بنڈی سی دیجئے۔ ماسٹر صاحب نے ایک نظر چودھری صاحب کے چہرے پر اور دوسری میرے بدن پر ڈالی جو چودھری صاحب کے چہرے ہی کی طرح نڈھال تھا اور پھر کچھ سمجھ کر خاموشی سے گز اُٹھانے کیلئے مڑے۔ میں چودھری صاحب بھی گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کھڑے ہونے کو کھڑے تو ہو گئے لیکن ان کی سانس پھر تیز پھولنے لگی اور جب ماسٹر صاحب نے مجھے اُتارنے کے لیے بٹن کھولنے شروع کیے تو چودھری صاحب کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا کہ میں سہم گئی اور ابھی پورے بٹن کھل بھی نہ پائے تھے کہ چودھری صاحب ایک پرانے درخت کی پرانی شاخ کی طرح زمین پر گر پڑے۔

فہرست تعطیلات اُتّر پردیش سنہ ۱۹۶۴ء

نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن	نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن
۱	یوم جمہوریہ	۲	۲۶ر اور ۲۷ر جنوری	اتوار اور دوشنبہ	۱۰	*بارہ وفات	۱	۲۲ر جولائی	بدھ
۲	شیوراتری	۱	۱۱ر فروری	منگل	۱۱	یوم آزادی	۱	۱۵ر اگست	سنیچر
۳	*عیدالفطر	۱	۱۵ر یا ۱۶ر فروری	سنیچر یا اتوار	۱۲	جنم اشٹمی	۱	۳۱ر اگست	دوشنبہ
۴	ہولی	۲	۲۷ر اور ۲۸ر فروری	جمعرات اور جمعہ	۱۳	مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش	۱	۲ر اکتوبر	جمعہ
۵	گڈ فرائیڈے	۱	۲۷ر مارچ	جمعہ	۱۴	دسہرہ	۲	۱۴ر اور ۱۵ر اکتوبر	بدھ اور جمعرات
۶	رام نومی	۱	۲۰ر اپریل	دوشنبہ	۱۵	دیوالی	۲	۳ر اور ۴ر نومبر	منگل اور بدھ
۷	*عیدالاضحیٰ	۱	۲۳ر اپریل	جمعرات	۱۶	کارتکی پورنیا گرونانک کا جنم دن	۱	۱۹ر نومبر	جمعرات
۸	*محرم	۱	۲۳ر مئی	سنیچر	۱۷	کرسمس	۱	۲۵ر دسمبر	جمعہ
۹	**بنک کی چھ ماہی حساب بندی	۱	۳۰ر جون	منگل	۱۸	**بنک کی سالانہ حساب بندی	۱	۳۱ر دسمبر	جمعرات

* مقامی طور پر چاند دکھائی دینے کے مطابق اور اگر ضرورت ہو تو ضلع مجسٹریٹ ان تعطیلوں کی تاریخ کا ازسرِنو تعین کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں وہ اسٹیٹ بنک کی مقامی شاخ سے، اگر کوئی ہو، یہ طے کرلیں گے کہ وہ بھی اپنے یہاں اسی تاریخ کو تعطیل رکھیں۔

** صرف خزانوں اور ذیلی خزانوں کے لیے۔

محدود تعطیلات کی فہرست جن میں سے ہر سرکاری ملازم کوئی بھی دو چھٹیاں لے سکتا ہے

نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن	نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن
۱	نیا سال	۱	پہلی جنوری	بدھ	۸	*محرم	۱	۲۲ر مئی	جمعہ
۲	مکر سنکرانت	۱	۱۴ر جنوری	منگل	۹	بدھ پورنیا	۱	۲۶ر مئی	منگل
۳	سنت روی داس کا جنم دن	۱	۲۸ر جنوری	منگل	۱۰	*چہلم	۱	پہلی جولائی	بدھ
					۱۱	ناگ پنچمی	۱	۱۲ر اگست	بدھ
۴	جمعۃ الوداع	۱	۱۴ر فروری	جمعہ	۱۲	مہالیہ اماوسیہ	۱	۵ر اکتوبر	دوشنبہ
۵	*عیدالفطر	۱	۱۶ر یا ۱۷ر فروری	اتوار یا دوشنبہ	۱۳	دسہرہ	۱	۱۳ر اکتوبر	منگل
۶	ویساکھی	۱	۱۳ر اپریل	دوشنبہ	۱۴	دیوالی (بھیا دوج)	۱	۶ر نومبر	جمعہ
۷	مہابیر جی کا جنم دن	۱	۲۴ر اپریل	جمعہ	۱۵	*شب برات	۱	۲۰ر دسمبر	اتوار

* مقامی طور پر چاند دکھائی دینے کے مطابق لیکن ضرورت پڑنے پر ضلع مجسٹریٹ ان تہواروں کی تاریخ کا ازسرِنو تعین کر سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا عام اور محدود تعطیلات کے علاوہ مندرجہ ذیل تعطیلات بھی اس طرح کہ تمام دفتروں اور اداروں میں بجز خزانوں اور ذیلی خزانوں کے رہیں گی۔

نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن	نمبر شمار	نام تعطیل	تعداد تعطیل	تاریخ	دن
۱	ہولی	۱	۲۹ر فروری	سنیچر	۲	دیوالی	۱	۵ر نومبر	جمعرات

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء

ملک کی حفاظت کے لیے ضرورت ہے

بڑے پیمانے پر نئے اسلحہ جات کی

اور

تیزی سے صنعتی ترقی کی

دونوں کاموں کے لیے کثیر سرمایے کی ضرورت ہے

ہمیں کیا کرنا ہے؟

"ہم زیادہ سے زیادہ پیسہ بچائیں،
اُسے ڈیفنس بانڈوں میں لگائیں

اور

ملک کی حفاظت کے کام کو آگے بڑھائیں"

——— جواہر لعل نہرو

زیادہ سے زیادہ بچت کیجیے اور بچت کا روپیہ

قومی حفاظتی بچت اسکیموں

- دس سالہ ڈیفنس ڈپازٹ سرٹی فیکیٹ
- بارہ سالہ نیشنل ڈیفنس ڈپازٹ سرٹی فیکیٹ

میں لگائیے

بچت اسکیموں میں لگایا گیا روپیہ آپ کے اور ملک کے کام آتا ہے

محکمہ اطلاعات اتر پردیش

Regd. no. L-319